

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224497

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۲۰۳۰۵ ۸۹۱۵ ۲۳۰۵ Accession No. ۱۷۵۵۹

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

سری گورو گوانند سنگھ صاحب



گذارش

معزز ناظرین کو سال ۱۹۳۱ء اور اپنے رسالہ رہنمائے تعلیم کی جوبلی مبارک ہو!

ناظرین بامکین!

خداے پاک کا شکر یہ کہ کس زبان سے ادا کروں جس نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کو اس ذرہ بمقدار اور ناچیز کو یہ شرف بخشا۔ کہ اس نے اپنے خیال کے موافق جس رسالہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اسے نہ صرف اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائی بلکہ ناظرین کرام کا منظور نظر بنایا۔ بلکہ آج اسے اپنی جوبلی منانے کا زریں موقعہ عطا فرما کر سمجھتوں اور ہم عصروں میں ممتاز فرمایا۔ رسالہ کے اجرا پر یہ شان و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ پروان چڑھ کر ایک دن ایسا رنگ لائیگا۔ کہ ادبی اور تعلیمی دنیا اسکی کامیابی کو سراہیگی۔ اور اسکی ذات احباب کیلئے مایہ ناز ہوگی۔ اسکی شان جہی کے صد قے میں آج اس قابل ہو اہوں۔ کہ کسی استاد کے اس شعر کو اپنا ترجمان کر سکوں۔

حاصل عمر شمار پئے یارے کردم شادم از زندگی خویش کہ کاہے کردم

مجھے رسالہ کی پچیس سالہ زندگی میں اسکی خدمتگزاری کیلئے جس صبر و استقلال سے کام لینا پڑا ہے وہ ایک طویل داستان ہے۔ صرف یہی کہنا کافی ہوگا۔ کہ ڈاک کے جواب اور تعمیل کے ساتھ نیچر کے کلم فرالغض کا بار مجھے ہی اٹھانا پڑا۔ اور بلا امداد احد سے دفتر کی تمام ضروریات اور احباب کی فرمائش بہم پہنچانا رہا۔ شاید یہ اسی خدمتگزاری اور نفس کشی کا نتیجہ ہو۔ کہ خداے پاک نے اپنی عنایات بے غایات سے مجھے یہ سنہری موقعہ عطا فرمایا اور میرے لگائے ہوئے پورے

کو بار ورفرمایا۔

حضرات جوبلی نمبر کا اعلان اکتوبر ۱۹۲۹ء میں کیا گیا۔ اور باوجود کافی تک و دو سال ۱۹۳۰ء کی پہلی سہ ماہی تک یہ تشویش بلائے جا رہی تھی۔ کہ اعلان کے موافق جوبلی کی شان کے شایاں سامان کیونکر مہیا ہو سکیگا؟ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کہیں جگ ہنسائی نہ ہو۔ مگر احباب کی عنایات اور رسالہ کے سرپرستوں اور بھی خواہوں کی توجہات میرے آڑے آئیں۔ جنہوں نے مجھے یہ عزت بخشی۔ کہ اتنا ضخیم رسالہ نذر ناظرین کرتے ہوئے بھی کئی کرمفرماتقا ضا کر رہے ہیں کہ ہمارا کوئی مضمون جوبلی نمبر میں کیوں نہیں دیا۔

چونکہ جوبلی نمبر کیلئے یہی مناسب سمجھا گیا تھا۔ کہ اسکے تمام مضمون مکمل۔ جامع اور باقی آئندہ کے اثر سے نمبر اور پاک ہوں۔ اسلئے ہر شعبہ کے کئی مضامین باہر مجبوری نہ دیئے جاسکے۔ اور قابل مضامین نگار اصحاب کے بچے شرمساری نصیب ہوئی۔ اور بعض حالات میں رقم معذور بھی تھا۔ کہ کئی مضمون وقت پر نہ آئے۔ بلکہ بہت دیر سے موصول ہوئے۔ بائیں ہمہ ارکان ادارہ اور میرے اکثر کرمفرما اس امر پر مسر ہیں۔ کہ اتنا ضخیم اور قابل قدر پرچہ اس قدر اخراجات کثیر کا متحمل ہو کر مفت اور ایک ہی دفعہ ہم پہنچانا جہاں تجارتی اصولوں کے منافی ہے۔ وہاں رسالہ اور اس کے پروپرائیٹرز کی نفوذ خرجی پر ڈال ہے۔ اگرچہ وہ درستی پر ہیں۔ مگر میری حمیت گوارا نہیں کرتی کہ اعلان کر کے بہت کا قدم آگے بڑھانے کی بجائے پیچھے ہٹایا جائے۔ رسالہ اپنے مستقل خریداروں کی خدمت میں بدستور سالانہ پرچوں کی ذیل میں ہی حاضر کرتا ہوں۔ ممکن ہے یہ شعر اس کے حال پر صادق آ سکے۔

سرمہ مفت نذر ہوں میری قیمت یہ ہے کہ سب سے خیردار پہ احسان میرا
البتہ اس میں صرف ایک ایذا دی کی ہے کہ رسالہ محفوظ پہنچانے اور اپنا ہاتھ بٹانے کی

غرض سے دی پنی ارسال کرتا ہوں۔ تاکہ پنجابی مثل "جنے جنے کی لاکڑی ایک جنے کا بوجھ" کے مطابق مجھے مالی اخراجات سے گو نہ سہولت ہو جائے۔ اور آپ کو رسالہ بلاخدر شہ پہنچ جائے اکثر اصحاب کا سابل خریداری جنوری کے علاوہ دیگر مہینوں سے شروع ہوتا ہوگا۔ ان کی طمانیت کیلئے یہی کہنا کافی ہوگا۔ کہ سال ۱۹۲۱ء کا رسالہ بدستور ان کے اپنے مہینے میں دی پنی کیا جائیگا گویا وہ اس عرصہ تک سالہ کے خریدار متصور ہونگے اور رسالہ ان کی خدمتیں برابر پہنچتا رہے گا۔

رسالہ کی ضخامت کو مد نظر رکھ کر اب میں اختصار سے کام لیتا ہوں۔ اور اپنے اُن مرتبوں کا جنہوں نے مجھے نہایت قیمتی مضمون عطا فرمائے۔ اور رسالہ کے تمام محصوروں کا، جوبلی نمبر کے اعلان کی اشاعت کے علاوہ معاصرانہ امداد اور مضامین کی عطائیں کیلئے نہایت صدقل سے شکریہ بجا لاتا ہوں۔ اور اپنے اُن کہ مغرباؤں سے جن کے مضامین جوبلی نمبر میں بامحبوبی نہ دیئے جاسکے۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ اُن کی طمانیت کیلئے یہ ضرور کہوں گا۔ کہ اُن کے مضامین شائع شدہ تمام مضامین کی طرح نہایت قابل قدر اور سر آکھوں پر لینے کے قابل تھے۔ مگر عدم گنجائش اور رسالہ کی بے حد طوالت مانع آئی۔ انشاء اللہ عنقریب دیگر نمبروں میں نہایت ممتاز جگہوں پر ان کی اشاعت سے سرخرو ہوں گا۔

جوبلی نمبر کا ملاحظہ اس امر کا ثبوت ہوگا۔ کہ اسکی تکمیل پر کس قدر زور کثیر صرف ہوا ہے احباب کی دریا دہلی اور عنایت سے توقع ہے کہ وہ اسکی مالی حالت کو محفوظ رکھنے اور مجھے کسی کا دست نگر ہونے کی عار سے بچانے کیلئے جہاں اسکے دی پنی وصول فرمائیں گے۔ وہاں اپنے حلقہ احباب سے کم از کم ایک ایک خریدار ہم پہنچا کر مجھے مام منوں فرمائیں گے۔ اور اپنے رسالہ کی دلچسپیوں کو مزید بڑھائیں گے۔ مختصر نوٹ اور کاروائیوں کے کالم بھی جوبلی نمبر کی اعتدال سے بہت متجاوز ضخامت کے باعث اس نمبر میں نہ دیئے جاسکے۔ کہ ممبر اصناف

رکھیں۔ ان کی کارروائیاں اگلے نمبر میں شائع کی جائیں گی۔

میرا بیان ادھر وار ہے گا۔ اگر میں اپنے معزز ہمراہیوں کی توجہات اور دلی امداد کا اعتراف نہ کروں۔ جوبلی نمبر گزرا مکمل نہ ہو سکتا۔ اگر وہ اس قدر دلچسپی کا اظہار نہ فرماتے۔ دیا رتھی جی اتنی مسافت سے باوجود ناسازی طبعیت محض جوبلی نمبر کی تکمیل اور دید کے شوق سے لاہور پہنچے حضرت جوش میانی نے خانگی تکالیف اور علالت کے ہوتے ہوئے بھی جوبلی نمبر کو اس کی شان کے شایاں بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر سجدیو ابھی اپنے سب سے چھوٹے بچے کی طویل علالت اور تکلیف کے باوجود معجزی ہمراہی کا دم بھرتے رہے۔ اور ہرام میں میکے دست راست بنے رہے۔ رسالہ کے سرپرست تاج الشعرا حضرت نوح کی عنایات جو رسالہ اور میرے حال پر مبذول ہیں۔ میرے لئے خضر راہ ثابت ہوئیں۔ اور جوبلی نمبر کی شان کو چار چاند لگانے کا موجب ہوئیں۔ خدا کے پاک تمام اصحاب کو محبت اور موقع عطا فرمائے کہ وہ اپنے رسالہ کو آئے دن بہتر سے بہترین صورت میں جلوہ گر کرتے رہیں۔

خادم
جگت سنگھ

مینجنگ پریپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم۔ رام گلی
لاہور

پیشکش

بشہرا محمد ہر اس چسپ نہ کہ خاطر میخواست

آخر آمد ز نپس پر وہ قفسد بر پدید

غالباً ملک بھر کے تعلیمی رسائل میں رہنمائے تعلیم کی خوش قسمتی قابل رشک ہے جسے پچیس سالہ نمایاں خدمات کی بجائے آویزا کا فخر حاصل ہے۔ اور وہ اس خدمتگزاری کی خوشی میں اپنی جوبلی سنار ہے۔ یوں تو ہر سال اس کا سالگرہ نمبر ایک قابل دید نمبر ہوا کرتا تھا مگر جوبلی نمبر کو جس پر بلا سبالغہ یہ مقولہ صادق آتا ہے ”وہ عوم ہے گلشن آفاق میں اس نمبر کی۔“ پیش کرتے ہوئے ہمیں دلی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ رسالہ ہڈانے جیسا کہ اس کے مختصر دور حیات میں عرض کیا گیا ہے جہاں اپنے ناظرین میں اخبار بینی اور مضمون نگاری کا مذاق پیدا کیا وہاں اپنے احساس خدمتگزاری سے اپنے مہربوں اور کرم فرماؤں کے دلوں میں گھر کیا جن کی عنایت اور پرورش کا بدیہی نتیجہ اس کے جوبلی نمبر کے نایاب اور بے مایہ نمایاں ہیں جو سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر بے نظیر اور نہایت قابل قدر و مفید ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کا بار بار کا مطالعہ ناظرین کرام کی دلچسپی اور دوستی کا موجب ہو گا۔ اور ہر مکمل اور تعلیمی انسی یوشن میں اس نمبر کی موجودگی بلا سبالغہ ایک تعلیمی انسائیکلو پیڈیا کا کام دیگی اور تعلیم یافتہ بزرگوار کی میز پر علمی خواندگی کی موجودگی کا ثبوت ہو گی۔ اور اپنے لئے جذبہ قدر وافی پیدا کرنے کی قدر تائش اور اپیل ہو گی اُسے اپنے معصروں سے جو دستور کے موافق اپنے عظیم الشان سالگرہ نمبر شائع کیا کرتے ہیں اس وجہ سے خصوصیت حاصل ہے کہ وہ محض ایک شعبہ علمی یا ادبی تک اپنی کوششیں محدود رکھتے ہیں برصافات رہنمائے تعلیم کے جو مختلف شعبوں کی نہایت دلچسپ مجموعہ ہو کر بجائے خود کئی سالگرہ نمبروں کا مجموعہ ہو رہا ہے طوالت کو پسند نہ کرتے ہوئے ہم مختصر اُس کے مضامین کا ذکر خیر کرتے ہیں۔

تعلیمی شعبہ میں ”بہشت کی تلاش“ اس کے دلی کرم فرما خان صاحب راجہ فاضل محمد خاں صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس جالندہ کے تجربات کا بہترین نمونہ ہے راجہ صاحب ماشاء اللہ افسران معائنہ میں سے ایک مقتدر و مسلمہ قابلیت کے مالک ہیں اور آپ کا مضمون اساتذہ کرام کے لئے عموماً اور پیڈ ماسٹر صاحب کے لئے مخصوصاً مشعل ہدایت ہے ہم آرزو مند ہیں کہ تمام استادا صاحب راجہ صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں جن کے لئے مدرسین کے پیہر طریقت کا خطاب بجا طور پر موزوں ہے اپنے سکولوں کو حقیقی معنوں میں بہشت بنا کر زیر تربیت بچوں اور نوجوانوں کو قابل شہری بنا کر ملک اور قوم کا بیڑا ہار کرنے میں سماجی مشکور کو کام فرمائیں اور ہم خرم و ہم ثواب کا مصداق ہوں۔

لیڈ زٹریننگ کالج میں جناب شیخ خادم محی الدین صاحب ایم۔ اے۔ ڈی نے اپنے چشمیدہ واقعات اور کالج کے طریق تعلیم کو نہایت واضح الفاظ میں سپرد قلم کیا ہے کالج کے متعلق مختلف تصاویر مضمون کی خوبوں میں مزید اضافہ کا موجب ہو رہی ہیں اور مذہب مالک کے اساتذہ پیدا کرنے والی انسٹی ٹیوشن کی خصوصیتوں کی نشا بدھال ہیں۔

تدریس اردو۔ صوبہ میں پنجابی زبان گھروں میں بولی جاتی ہے۔ اس لئے بعض حلقوں میں اردو زبان بھی غیر زبان ہو کر اساتذہ کی راہ میں مشکلات کا روڑا اٹکائے ہوئے ہے۔ رسالہ کے ادبی مشیر اور دلی عنایت فرما صوفی غلام مصطفیٰ صاحب نے اپنے اعلیٰ مضمون میں اردو زبان کے اساتذہ کی پورے طور پر رہنمائی کی ہے زیر تربیت اور اردو زبان سے مذاق رکھنے والے نوجوان بھی اس سے بہت حد تک مستفیض ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی تعلیم اور اس کے طریقہ تعلیم میں پرشین ٹیچروں کے مایہ ناز مولوی امام الدین صاحب مثنیٰ فاضل نے اپنے تجربات تعلیمی کو بمبدأق "صلائے عام ہے یاران محنت و اس کے لئے" فارسی خوان دنیا اور فارسی تعلیم کے ذمہ دار مدرسین پر باب حکمت کھول دیا ہے۔ زبان فارسی کی اہمیت اور ضرورت کو نہایت برجستہ اور روشن الفاظ میں ادا فرما کر اس کی وکالت کا حق نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔

جناب لالہ موہن لعل صاحب بھلے نے عملی ہندسہ کے ایک سوال کی خامی کو واضح فرما کر جیومیٹری پڑھانے والے اساتذہ اور طلباء متعلقہ پر خاص احسان فرمایا ہے۔ سوال کی محنت کے دوران میں جن قواعد کی توضیح فرمائی ہے ان سے کئی دیگر مشکل سوالات کے حل کا طریق واضح کیا گیا ہے اور انہیں مزید احسان مند فرمایا ہے۔

مولانا محمد حبیب صاحب کیلانی نے اپنے فاضلہ مضمون میں فن تحریر کی ضرورت اور اہمیت کو نہایت خوبی سے واضح فرمایا ہے اور حق یہ ہے کہ اپنی قابلیت کا سکھ بہترین طور پر ناظرین کے کلوں پر بٹھایا ہے فن تحریر کی ابتدا اور اس میں مختلف تمہیدیوں کو بتدریج جس دلچسپ طریق پر آپ نے جلوہ گر فرمایا ہے بل مبالغہ ایک بحر ذخار کو کوئے میں بند کر دیا ہے آپ کی بڑی اور عنایت کے ہم خاص ممنون ہیں۔

لالہ رامچند صاحب ڈسٹرکٹ انپیکٹر مدارس کی مدرس و طلباء سے دو دو باتیں زیر تربیت نوجوانوں کی زندگیوں کو سانچے میں ڈھلنے اور انہیں اپنے فرائض سے باخبر کرنے اور بہترین شہری بنانے کیلئے ناص مشفق کا کام دینگی اور مدرسین کیلئے بلاشبہ فخر راہ ہوگی۔ کیا ہمارے نوجوان ان باتوں سے متاثر ہو کر ان پٹیل پیرا ہونا فرض وقت خیال کریں گے؟

حیدر آباد وکن اردو یونیورسٹی کے قیام اور اردو کی غور پر دہشت کے دیگر ساز و سامان سے جو خدمت اردو زبان کی بجا لا رہے مختلف بیان نہیں عثمانیہ یونیورسٹی کے مایہ ناز فاضل پرنسپل صاحب جس فاضلہ پیرائے میں وہاں کے تعلیمی مستقبل کو بیان فرمایا ہے اس امر کا بجا نشانہ ہے کہ حیدر آباد وکن اردو زبان کی شادابی میں ملک کے تمام صوبہ جات سے گئے مسبقیت بجا آئیگا۔ اور اسے پائیدار بنانے میں ہم معصروں سے قابل رشک پوزیشن حاصل کریگا۔

ہمارا ذریعہ تعلیم مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈریٹر مکتبہ حیدر آباد کوکن پبلشنگ صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کی طرح چوٹی کے ادیب ہیں جن پر سرزنشہ تعلیم دکن کا ناز کر سکتا ہے اپنے اپنے قابل قدر مضمون میں جو کام کی باتیں واضح فرمائی ہیں تعلیمی دنیا کی رہنمائی کا موجب ہیں حتیٰ کہ ذریعہ تعلیم ہی تعلیم کی اہمیت و عظمت سے زیر تربیت تلامذہ کو کامل طور پر بہرہ ور کر سکتا ہے غلط ذریعہ تعلیم تو یہ ہستی سے اندھے کی طرح ادھر ادھر ٹھونانا ہے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے صحابہ اس مضمون کے ذریعہ حقیقت سے آگاہ ہو کر صحیح غلط ذریعہ تعلیم میں امتیاز کہہ گئے اور بہت کے حصول کے لئے آواز بلند کریں تو بہتر ہوگا۔

قصر تعلیم کا سنگ بنیاد میں مولوی عبدالغنی صاحب نے جماعت کی تعلیم پر موقوف سائے زنی ہی نہیں فرمائی بلکہ مذہب و دین اور میڈیا سٹر صاحب کے لئے ایک شاہراہ مستقیم قائم کر دی جس سے ہر وہ صاحب مفید مطلب نتائج اخذ کر سکتے ہیں ایک ضروری گزارش کے ذریعے سردار مجرم سنگھ صاحب ڈسٹرکٹ اسپیکٹر مدراس نے اساتذہ کی توجہ نہایت ضروری امور پر دلائی ہے جو ہر سب اساتذہ کی فوری توجہ کے قابل ہیں سردار صاحب افسران معائنہ میں اعلیٰ پایہ و عظمت کے مالک ہیں اور ہماری آرزو ہے کہ متعلقین آپ کی گزارش کے مفید نتائج سے جلد از جلد متمتع ہوں۔

پنجاب میں لڑکیوں کی تعلیم پر لالہ تلوک چند صاحب نے خوب زور قلم دکھایا ہے اور تعلیم نسواں کی موجودہ و سابقہ حالت کا موازنہ سرکاری رپورٹوں سے کر کے اس کی ضرورت کو پبلک میں پیش کیا ہے کسی ملک کی حالت سدھ نہیں سکتی تاوقتیکہ نصف نازک کو بھی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا پورا موقع نہ دیا جائے وہ صداقت ہے جس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں اور حق یہ ہے کہ لالہ صاحب نے اپنے جامع مضمون میں تعلیم نسواں کے ہر پہلو پر کافی سے زیادہ توجہ دلائی ہے۔ ہمارا تعلیم حضرت کھوسٹ کے قلم مجرم زخم کی شرمندہ احسان ہے جن کے طرز تحریر سے آشنا خود بخود بھانپ لینے کو ن شوق ہے اس پردہ زنگاری میں

۶

آپ جس پیرائے میں درود لکھا اظہار کیا کرتے ہیں آپ ہی کا حصہ ہے چنانچہ موجودہ تعلیم کے حسن و قبح پر اپنے بلا مبالغہ و کش طوطی میں اصل حقیقت کو واضح فرمایا ہے اور کامل فن جراح کی طرح اس کے فضول مادوں کو طشت از باہم کر کے مفید اور ضروری امور کے اجراء کی آرزو کی ہے۔

سید اشفاق حسین صاحب نے ہلے امتحانات کا صحیح خاکہ پبلک کے سپیشل کیا ہے اگرچہ آزمائش کیلئے امتحانات کا جو جو بے حد ضروری اور منفعت بخش ہے مگر موجودہ امتحانات جو مراد لی جا رہی ہے۔ اکی حقیقت آپ کی تحریر سے صاف طور پر عیاں ہو رہی ہے اگر آپ کی رائے سے اتفاق کر کے امتحانات میں ضروری زبریم و منہج روا رکھی جائے تو بہت حد تک مناسب معلم اور معلمین کی بنیاد و معیاریت کے ساتھ و سرکار اسپیکٹر مدراس نے تسلیم کے وہاں بالتفصیل بیان کیے معلم کیلئے رہنما کر دیا ہے کہ ان غم کے طلباء کا کھلم کھری لکھے کہ وہ راہ راست پر رہ کر باوجود اعتدال سے سرمو اخراجات نہ کر سکیں اور معلم کا طریق تعلیم ایسا موثر کھلائے کہ ہر کہ و مر اس کا نا دیدہ غلام اور اس کی خوبیوں کا معترف ہو جائے۔

تعلیم میں جس مذہبی کی پروا نہ تھی سید اصغر علی صاحب بی۔ بی۔ ٹی نے اپنے تجربات کی بنا پر مذہبی تعلیم کی ضرورت اہستہ اور فائدہ پر اظہار خیال فرمایا ہے موجودہ تعلیم میں یہ نقص ضروری ہے کہ طلباء بہت حد تک اپنے آپ کو بھی نہیں جانتے مذہبی تعلیم اس پہلو میں ضروری ہے آپ کا فاضلہ طریقیان تعلیم سے مستغنی ہے

جناب پینڈت مرلی دھر صاحب مودگی ڈسٹرکٹ انسپکٹر ادرس نے جو سکاؤٹنگ کی دنیا کے درخشندہ کونیا ہیں اپنے مضمون "سکاؤٹ کیا ہوتا ہے" میں اس مشہور عالم تحریک کے فوائد پر طے طور پر بیان فرمائے ہیں اور بنی نوع انسان کی خدمت کی بجائے ادری میں اپنی عظمت کے راز کو جلوہ گر دکھایا ہے صرف سکاؤٹس اور سکاؤٹ ماسٹر صاحب ہی اس سے بہرہ مند نہ ہوں بلکہ اساتذہ کرام تمام طلباء کو یہ مضمون سنا کر انہیں دل سے اس تحریک کا قایل کریں۔

قدیم ہندوستان میں ہندوؤں کا طریقہ تعلیم۔ سید خادم حسین صاحب رضوی نے اس مشہور عالم طریق پر جس کی دید اس وقت کی مذہب دنیا کے سیاحوں اور شتاؤں کو ہندوستان میں کھینچ لاتی تھی نہایت مناسب طریق میں لائے زنی کی ہے اور اس طریق کی حقیقت کو منکشف فرماتے ہیں کوئی کسر اٹھا نہیں سکتی۔

حساب کی درست تعلیم۔ پروفیسر رکت رام صاحب کھوسلہ نہ صرف حساب کے ماہر ہیں بلکہ اس فن کے کامل استاد ہو کر کئی مفید کتب حساب کے مصنف ہیں جو آپ کی حسابی جھپیوں کی زندہ شہادت ہے ایسے کامل فن استاد نے ایسے ضروری مضمون کی درست تعلیم کے لئے جو ہدایات درج فرمائی ہیں حساب کے اساتذہ اور تمام تلامذہ کے لئے خضر راہ ہیں یقین ہے کہ ان سے وہی فائدہ حاصل کیا جائیگا جس کے لئے وہ مخصوص کی گئی ہیں۔

تعلیم چمکان۔ مسٹر ہرنچند رسگل نے پرنسپل ٹیوٹی صاحب کے تجربات تعلیمی کو واضح فرما کر اپنے مضمون کے اساتذہ سے بجا آرزو کی ہے کہ وہ بھی ان تجربات فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو نای اور اپنے شاگردوں کو مفید امور رات سے مالا مال فرمائیں۔

ان مٹی جینس ٹیسٹ اور پہلیوں کے ذریعے جناب ڈیڑ پال صاحب چوڑہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر ادرس نے اساتذہ اور افسران عائن کیسا سننے ایکنیا تجربہ پیش کیا ہے جو صرف تجربہ ہی نہیں بلکہ اس حقیقت کا انکشاف ہے جو چند سال پہلے ہمارے ہاں عام طور پر رائج تھی اساتذہ اگر عقداں سے انحراف کر کے اس تجربہ کی تیسل میں طلباء سے مشق کرائیں تو ان کے حافظہ کو بھلا کر نیکی ملا دیں میں سوچے کا مادہ پیدا کرینگے اور فن تقریر کی تعلیم دے کیگئے طلباء کیلئے ریسی کی بجائے دل لگی کا بہترین مشغلہ ہوگا افسران عائن بھی بچوں کی حوصلہ افزائی اور شوق پیدا کر سکی خاطر اس تجربہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جسے بہر نفع مفید پائیں گے۔

تعلیم کا اصل مدعا۔ چوہدری برانڈ صاحب اے ایم کے کے ذریعے کا بہترین نتیجہ ہے کہ نیت فاضلہ طریق سے اس کا کو واضح فرمایا ہے اور بلا سبب مضمون کے اندر فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس سے ہر ایک مضمون ناظر کی کم سے کم بے اختیار خارج تھیں وافر میں مل کرینگے۔

ہمارا تعلیمی معیار کیوں رہا ہے۔ کنیز عروان جناب ایس ایس ٹی صاحب نے حق نشا گیتن الا ایشکار کے مضمون کی صداقت کو ظاہر کیا

اساتذہ کی معمولی اور سوائے نام تو انہوں سے حقیقت میں جو نقصان عظیم ملک و قوم کو برداشت کرنا پڑا ہے بڑی وضاحت دکھایا ہے کیلئے یہ قابلِ افسوس نہیں کہ ہم اپنے گھوڑوں کے سدھانے کیلئے بہترین چابک سوار تلاش کریں اور بچوں کیلئے جو چاہے جائز وراثتِ دوزخ کر دینے میں سستے اور کم قیمت استاد تلاش کریں جسے پاک تعلیقین اور حقیقت سے کشائی کی طاقت عطا کریں۔

اسکو نو تعلیم مضامین کی تقسیم۔ ٹیوٹیوٹام ناصر خان صاحب نے اپنے مضمون میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے جس سے تجربہ کار استاد آشنا ہیں ہر ایک کا اپنا مذاق الگ ہے کسی کو زمانہ دینی سے محبت ہے کسی کو حساب کی کھانسی سے نفرت ہے لیکن گاہے کبھی جنرل راج سے اسلئے ہلستا دکھائے مذاق کا مضمون یا سکول طلباء اور اس استاد سے لطافت نامہ رشتہ منویٰ جبر ہوگا انہی میٹروں کے خاص نعمان ہوگا بیڈ سر صاحب کا اور متوجہ ہوا تو سچے دیہاتی رقبہ میں جماعت اول کی حالت لاہر کم کن تھا۔ دھندہ نے جیل پت سے اس حالت کو پیش کیا ہے انکی حصہ پہلا صاحب اول جماعت کی بنیادی جماعت مانکر اسکی ترقی تعلیم کیلئے جوئے سے نئے طریق اور دھیمی کے مشغلے رہنا تعلیم کے مصلحت میں پیشتر ازین نذر ناظرین کے لئے ہے یہی متعلقین سے خراج تحسین حاصل کئے بغیر نہیں دے سکے ہمارے یقین ہے کہ آپ کی کوشش بھی بدستور سرآمد ہوگی۔

اساتذہ و قومی ترقی میں استاد و دانشگر دیکھنا ہی تعلقات کا ذکر کر کے چور ہری محمد عبداللہ صاحب نے اسوجے کو صفا ہر کئے ہیں اور قوم سے بحیثیت مجموعی اس کی ہے کہ اساتذہ کی رکاوٹوں کا اندازہ کیا فرض ہے طلبہ کے والدین اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے بھی غرضاً خلافِ اہم اور عقیدہ معجزہ کے اثرات وغیرہ کو مد نظر رکھیں ٹیوٹیوٹام نے منہ فرما کر ناظرین کی توجہ کے قابل بنایا ہے اور بلاشبہ اپنی اشاعت پر از کی شہرت ہے اساتذہ کے نقطہ نظر زیادہ مسئلہ فیتنا غورث کا ریاضی پر احسان ٹیوٹیوٹام محمد عزیز الدین صاحب موجودہ تعلیمی نیامیں ریاضی کی خاص قابلیت کے ایک ہیں یا انکی مشکلات کی لڑکائی میں ملتی ہے آپ فرماتے ہیں مختلف بیان نہیں جوبلی نمبر بھی خوشی کی بات ہے کہ آپ کے مفید تجاربے محرم نہیں ہوں اور آپ ایک ضروری مشورہ پر جس غیب و درخش پیرایہ میں حاضر سائی کی جتنے ظنون کی گچھی کا خاص موجب ہوگی۔

تعلیمی پورٹ سر شہنشاہ تعلیم پنجاب کی خدمت گزار کی صبح نو اور ریچرڈ پیش کرتی ہے طریق تعلیم کی ترقی میں مختلف طریقوں کا مجملہ ذکر کیا گیا ہے اور ہر ایک کے حق قطع پرانے ذوق کی گئی ہے اس طرح پنجاب کی تعلیمی حالت اسکی موجودہ رگڑاری کا خاکہ پیش کر رہی ہے لہذا ہر اہل صاحب ان پر ضروری مضامین کی تیاری کیلئے ہلکے دلی ٹھیکر کے مستحق ہیں۔

اڑو اشاعت پر از کی تعلیم و تدریس میں نیا فتح محمد صاحب نے اپنے حتمی نتائج کا پورا ثبوت ہم پہنچایا ہے اور نشا پڑائی ایسے ضروری مضمون کے متعلق اساتذہ کی پوری رہنمائی فرما کر انہیں اپنا گرویدہ کیا ہے آپ کا طرز بیان بہت پُرلپٹ و مؤثر ہے۔

سر شہنشاہ تعلیم پنجاب کی ہسٹری مضمون نے ۱۹۲۲ء تک کیلئے مجملہ مجموعہ ہے جو مطالعہ سر شہنشاہ کے تمام لایٹ اگاہی موجب ہوگا۔ شعبہ ادب و اخلاق کو گواہی دینے میں ادبی رسائل کیلئے مخصوص کیا جاسکتا ہے مگر سب سے تعلیم کی ادبی مہمیں اور اسکے اساتذہ و تدریس کا جذبہ ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے نفس طبع کیلئے اس شعبہ میں بہتر مضامین مہیا کرے ہے اور اس حیثیت میں بذات خود ایک ادبی رسالہ کا وجود پیش کر رہا ہے چنانچہ ذیل کے قیمتی مضامین ہاں حال سے ان کی تائید کریں گے۔

حضرت اشع کے حالات مولانا عبدالحق صاحب نے خوب اچھی اور فصاحت سے تبلیغ فرمائی ہیں ادبی دنیا میں بھی پسند کئے جائیں گے اور نثر

رہنمائے تعلیم کے لی کر مغزا اور اسکے ادبی شعبہ کیلئے وقتاً فوقتاً اعلیٰ پایہ کے مضامین بہم پہنچا کر اُسے مستحق فرمایا کرتے ہیں۔

کامیابی معزز ہمعصر سالہانہ کانپوز کے محترم ایڈیٹر منشی میڈرائٹ صاحب کلم بی کے تبرکات سے ہے آپ نے کامیابی اور اس کے ذرائع پر نہایت عمدگی سے اظہارِ خیالات فرمایا ہے۔

مولوی محمد نوح صاحب نوح - رہنمائے تعلیم کے سرپرست تاج الشعرا حضرت نوح نادری کے سوانح حیات اور ادبی شاعری پر تبصرہ ہے جسے سالہ کے مایہ ناز ناٹل بے بدل دید حضرت جوش مسیانی نے اپنی تحریر یابی اور جادو کا قلم سے تیار فرمایا ہے جس کیلئے ہی کہنا اسکی خوبیوں کی کافی ہے فرد کر نہایت کڑے حضرت جوش کے اپنے نمک میں لگا ہوا ہے جس سے بہتر رنگ نیا بیسی نہ آسکتا۔

نیکٹ بدکی تمیز پر وفیسر محمد الدین صاحب تیریم - کا اعلیٰ علمی شاہکار ہے اور مجھے کام کی چیز ہے کہ مطالعہ فطرت عالم طاری اسجیات یعنی حضرت صلیب کی شاعری پر ہمارے لی کر مغزا سیدل محمد صاحب نقی علی لکھنویوں کا بہترین نتیجہ ہے قابلِ مضمون ہمارے نہایت کاوش اور کوشش سے مضمون کو لکھنوی کا فخر بنادیا ہے جس کا مطالعہ جی میں انگ اور نیا جوش پیدا کرتا ہے اور حضرت صلیب کے سراپا عجاز کلام سے پوری واقفیت بخشتا ہے۔

ارمغان عزیز عزم - بر لکھنوی کے کلام پر سالہ کے جذبہ محترم سرپرست حضرت نوح کے تبرکات کا بہترین کرشمہ اور ادبیات کی جان ہے رہنمائے تعلیم کی خوش قسمتی قابلِ ادا ہے جسے حضرت نے اپنی سرپرستی میں لیا ہوا ہے بعدی صاحب کا مفلور اسکے حسب حال ہے ۵

چرخ دیوار اُمت راکر باشند چوں توپشتیاں چہ باک از موج بحر ان کہ دارد نوح کشتیاں
رام گلی مصروف حضرت اجمل صلیب لکھنوی کے تبرکات سے ہے اس کی آج رہنمائے تعلیم کے مجوزہ سو سے شہرہ فاق ہو کر حضرت کی نظر کیا اثر میں بیچ گئی ہے سچ ہے صحبت صلیب تر اصل کد۔ رام گلی کی خوش قسمتی قابلِ رشک ہے کہ وہ مصروف حضرت صلیب تبرک سے متبرک ہو گئی ہے۔

بچے اپنے بڑوں سے جو آرزوئیں کر سکتے ہیں ان کا بہترین غلامہ سر منصور احمد جانیٹ ایڈیٹر ہمایون کلم جادو قلم کا عطیہ ہے میری حماقتیں سید خورشید حسن صاحب کی ترجمان اور حقیقت و صداقت سے مملو ہیں۔

اخلاق و معظمت شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی ان کر مغزاؤں سے ہیں جو رہنمائے تعلیم کی بہتری اور فلاح دل سے چاہتے ہیں اپنے جہاں جولائی نمبر کیلئے مغنیہ مشوروس مال مال فرمایا دیاں اسکیلئے نہایت کارآمد اور اعلیٰ پایہ کے مفید مضامین بھی عنایت فرمائے جو تمام کمال سید و مہر آپ کی محنت پسند طبیعت کے بہترین شاہد ہیں اخلاق و معظمت ان میں سے یک ادبی شاہکار ہے اور بلاشبہ سالہ کے ادبی شعبہ کی بوع رواں ہے۔

شریر لڑکے کے طرح مدھر کتے یا لڑکوں کا بوسیلہ کہ طرح شرارت کے خزاں پر چڑایا جاتا ہے بھائی بھائی اس صاحب کی ایم کے تجربہ کار شاہد ان تخیل کے کرشمے دور مرا ادبی مضمون ہے جو ہمارے محترم رہنما حضرت جوش مسیانی کا عطیہ ہے اور ہماری تعریف سے مستفی ہے۔
صوفی نوح اور محسن نوح محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے گرامر کی سرپرستی کا پورا ثبوت دیا ہے جسے موجودہ دنیا تقریباً کیا

پشت رکھے ہوئے ہے۔ ایسے ضروری مضمون پر روشنی ڈالنا خواجہ صاحب کے کمال کا شاہکار اور ادبی دنیا کی رہنمائی کا موجب ہے۔
تعلیم و ہنر کو جس فصاحت اور ظرافت سے ضیاء الملک حضرت ملا رموزی نے لازم و ملزوم ثابت کیا ہے زیرِ نزہت اور
فارسِ اتحیصیل فوجان اس سے یکساں مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ انہیں ہنر کی عظمت جتلا کر کسی کی کسی کسبِ ہنر میں رجوع کرنے
کی دعوت دیتا ہے ملک کی بدقسمتی ہے کہ فوجان ملا زمست کے ہاتھ تک چکے ہیں یہ مضمون انہیں گمراہی کے تاریک گڑھے سے نکال کر
راہِ رست پر گامزن ہونے کی تلقین کرے گا۔

صحیح مقدم ہے یا تہذیب کے مصنف ربیعہ غفرلہ علی صاحبہا بی بی ہے جس کی مقبول عالمِ نظم مدرس کے کھانے کو کافی ہوا ہے
بہت ناظرین مطالعہ کر چکے ہیں آپ کی نوادر باری لباس میں اس زمانہ کی یادگار ہے حبیبِ بیگم جو بی بی ہائی سکول المیر کوٹ میں لازم
تھے اگرچہ اس مضمون کو بھی تصویر کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے، مگر ہم اسے ڈاکٹر جو بی ہائی سکول کی رعایت بھی رسالہ کے جولائی نمبر میں ہدیہ
ناظرین کہتے ہیں آپ مضمون بھی مفید اور ضروری ہے ناظرین کو گرام اس کے مطالعہ سے بہت محظوظ ہونگے اور مستفیض بھی۔

دیہات سدھار کے شعبہ میں اگرچہ مین مضمون ہی شائع ہوئے ہیں مگر وہ سب بڑے کام کے اور اس شعبہ کی جان میں سٹریٹس سابق
ڈپٹی کمشنر جنٹل مین کے جو کلام نام نہانی ہی دیہات سدھار کی کافی سے بڑھ کر ضمانت ہے اس مضمون کیلئے شاید آپ سے بڑھ کر کوئی
مستند اہلِ ارے صوبہ میں نہ ہونے سے نہ مل سکیگا بیوی فضل محی الدین صاحبہ ری نے بھی اپنے مضمون میں جس تحقیقات اور کوشش کا
ثبوت ہم پہنچایا ہے آپ ہی کا حصہ ہے اسی طرح انہی موزوں صاحبہ کے مفید نکات بھی دیہات سدھار کے مفید مطلب امور کے لئے بیک وقت ضروری
ہیں اور بلا سائلہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شعبہ کیلئے جو بہترین مضمون ہم پہنچائے گئے ہیں جن سے بہتر کیا کوئی بیان کرے گا۔

تایخ و سیر کی ذیل میں ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم بی ایچ ڈی نے شہرِ آگرہ جہانگیر کے عہد میں ناظرین کی مہیاں طبع کیلئے صفحہ
قرطاس پر جلوہ گرہ دکھایا ہے جس کا مطالعہ انہیں آگرہ کی اس عظمت اور عروج کی سیر کر ایسا جو اس نے شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں حاصل کیا تھا
تعلیم و جغرافیہ میں کھلے میدان میں کام کرنے اور سیر سیاحت کرنے میں اہمیت کے ذریعہ ایسا صاحبِ دل سوچ لعل صاحب نے پھینکا
جغرافیہ میں نئی جان اور روح پھونک دی ہے۔ ایک نئے تجربہ کی دعوت دی ہے۔ اور اس کا اہمیت کو ایسے سانچے میں ڈھالنا ہے کہ اس کے مطالعہ سے
طبیعت خود بخود غفلت و شادابی کو نفس مضمون کا حقیقی علت ثانی کی قائل ہو جاتی ہے ماشاء اللہ اپنے اس علم میں آپ ملک کے مستند اور مسلم الشہرت
استاذہ سے ہیں اور علم جغرافیہ کی روایت آپ سے بڑھ کر کون کر سکیگا؟

سیام کے رسم و رواج اور حالات کے بار آور پنڈت شونرائی صاحب سیم ایڈوکیٹ لاہور کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ پنڈت جی ادبی دنیا
میں اپنی شہرہ آفاق تعریفِ ایم لے بنائے کیوں میری مٹی پیدا کی کی وجہ سے نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ایک نیا آپ کے
فیضانِ صحبت سے مستفید ہونے کی متمنی رہتی ہے۔ رہنمائے تعلیم کی درخواست پذیرا فرما کر آپ نے ادبی دنیا کو مہربان منت بنا دیا ہے۔
ریاست ٹراونکور کے حالات۔ پادری جے علی بخش صاحب لاہوری نے ریاست کے چشمہ دیدیوب قابلِ دید حالات تحریر فرما
کر ناظرین کو گھر بیٹھے ٹراونکور کی سیر کرا دی ہے۔

غریب منزل مقصود میں منشی منہر لال صاحب طالب نے سفر کشمیر کے حالات حوالہ فلم کئے ہیں کشمیر جنت نظیر کی یہ قدرت کی دلغریب نیز نگینوں کا عجیب گشتہ دکھا کر شائقین کو سیر کرنے میں ترقی طالب صاحب کے کوشش کی ہے کہ اس سیر کا لب لباب اس کی دیکھ محرم احباب تک پہنچا کر انہیں دعوت دیں کہ فرصت کا وقت نکال کر کشمیر کی سیر سے محظوظ ہوں۔

قدیم ہندوستان کی خوفناک رسم سستی شیخ محمد انجیل صاحب بالی پتی نے اس مشہور عالم رسم سستی کی ابتدا و انتہا پر بہت فاصلہ طریق سے روشنی ڈالی ہے اور مشتاقان تاریخ کے لئے ایک کام کی چیز بہم پہنچائی ہے۔

مزار سعدی - حیات سعدی میں مولانا حالی مرحوم نے شیخ سعدی کی مزار کا کچھ ذکر فرمایا تھا فرید دوزان پر دہر سیر محمد شجاع صاحب منعمی نے گذشتہ تعطیلات گرامین شیراز سپیکر اسکی موجودہ حالت ناظرین پر کشفت فرماتی ہے اور اپنی دلچسپیوں کا ثبوت ہم بخلائیے پہاڑ کی سیر کے طفیل لالہ کو رام صاحب گپستان ناظرین کو اس سیر کے فوائد سے آگاہ کرنے اور انہیں اس سے متفق ہونے کے آرزو مند ہیں۔ پہاڑ قدرت کی نیز نگینوں کا مجید ذخیرہ لئے جوتے ہیں جن کی سیر سے انسان کئی تجربے اور صحت جسمانی کو صحیح کرنے کے کئی کر معلوم کر سکتا ہے۔

علمی مضامین کے شعبہ میں متحرک تصاویر دیکھا کو لالہ ہماری مسلسل صاحب ہگل نے سائنس کے فقط نگاہ سے پورے طور پر واضح فرمایا ہے۔ اور سائنس سے نا آشنا برادری پر باب حکمت کھول دیا ہے۔

مسٹر کا پر کی کہانی اسکی اپنی زبان سے سچ ہے تصنیف راصنف نیکو کند بیان تا نبیہ ایسی مفید دھات کی آپ بیتی اور سائنس میں اسکی ضرورت کو لالہ و لبرغ لائے صاحب نے ناظرین کی دلچسپی بڑھانے کیلئے وہ رنگ بیا ہے کہ اسکا مطالعہ گو ناگوں طبائع پر بھی اپنا پرتو ڈالے بغیر نہیں رہیگا۔

خوف جھٹھرتی بی بی - ڈاکٹر کے علمی مذاق کا گواہ ہے جسے فلسفیانہ طرز میں بیان کر کے اور اسے خاص غالب ہے بکتر سر کے معنوی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔

میں کون ہوں - نیز نگ خیال کے قابل مدیر کی علمی قابلیت کا مرقع ہے اور مطالعہ کے از بس قابل مضمون کی ماہیت مطالعہ کے بعد خود بخود واضح ہو جائے گی اور ناظرین کے نفس طبع کا موجب ہوگی۔

معلومات کا ابتدائی ورق حضرت عشرت رحمانی رام پوری مدیر نیز نگ ہلی کے علمی دسترخوان کا عطیہ ہے جس سے انسان کی تقسیم اس کے سوچنے کا طریق اور سوچنے کے وقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

لاسلکی کے معجزے - وائٹس (بے تار برقی) کے معجزے اسکی ضرورت ابتدا اور فائدہ بخش حالات پر ناخدا نائے زنی ہوئی سپہر دہر سیر گہنی شاد اس صاحب کی توجہ سے سائنس دان و جوان خوب محظوظ ہونگے۔

حفظان صحت کے شعبہ کو مذکر ناظرین کرنے سے پہلے چہاں اس امر پر بجا انہوں نے کہ کہ لکھی محمد شریف صاحب قریشی کا مفید عالم منعم و تارو عالم نجاش کی بصیرت ہوا یہ مضمون اسکی کچھ شہور عالم مضمون مختلف مباحث کی طرح نہایت پسند کیا جاتا انشاء اللہ عنقریب شائع کیا جائیگا۔

صحیح طلب و تہمتی اور ضروری مضمون ہے جس سے تعلیمی نیادانیزا شاگرد کے سب یکساں طور پر بہرہ ور ہونگے اور مضمون کی مندرجہ ہدایات و لوگی پوری رہنمائی کا موجب ہوگی۔ لالہ مولیٰ صاحبہ ایم بی کی غنیات کا شکر و اجابت ہے جنہوں نے اپنے مفید اور قابل قدر مضمون سے جولائی نمبر کی دھمپیدیں میں خاص امتنا فرمائی ہے۔

چاء اور برف۔ ڈاکٹر شیااچرن صاحبہ ماسٹر نے تعلیم کے تعلیمی غنایت فرما اور اس کے شیطانی ہیں۔ ہر دو شبیات نہ کہ صدر گرجہ آجکل کے فیشن کا ضروری زمینیں گر کر پکے دئے ہے کہ وہ لوگی وہ لوہاری طابع کے سخت بر خلاف ہیں اور ان کا استعمال آخر ہماری صحت کو خراب کئے بغیر نہ رہیگا ضرورت ہے کہ فیشن پرست اچھا بھٹ پر باخبر ہوں کہ بعد میں انہیں بچانہ پئے اور آپ کے مفید مضمون سے مستفیض ہوں صنعت و حرفت اور زراعت کے شعبہ میں نصاب تعلیم اور اس میں ترقی کے فریضے سے رانیا صاحبہ لالہ مدن گوپال صاحبہ صنعت و حرفت کی ترویج پر خاص دروہا ہے اور ملک سے بے روزگاری دور کرنے کے حل میں لالہ ہیرام صاحبہ بدستور ایسے عمل طریق بیان فرمائے ہیں جن سے نوجوان اپنی حالت بہتر سے بہتر بناسکتے ہیں جناب لالہ لکھنڈاس صاحبہ اس مضمون پر پتہ کیا کہ دیگر ملالوں میں اعت کی تعلیم کی وساطت سے زراعت کی وکالت کا حق بخوبی ادا فرمایا ہے ہمہری فوری و جنہیں مژدوں کا شہنشاہ کننا بجا ہے ایک نئے مثال صنعت و حرفت سے ترقی حاصل کرنے کی سہا پ موجودہ وقت میں دنیا کے سب سے مالدار اور ارباب تہی میں جن کی ترقی کا ان معض صنعت و حرفت کی لچھی میں مضمر ہے پنڈت بالی گند صاحبہ عرش مسبانی جو رسالہ کے قابل مدیر حضرت جوش مسبانی کے خلعت اکبر اور ہم سب کے محبوباں مغلوب ہیں موثر دس کے اس شہنشاہ کے سوانح حیات سے نوجوانوں کے طابع میں انقلاب پیدا کرنے اور ملازمت کے غلط شوق سے ہٹا کر ملک کی صحیح خدمتگذاری پر لگانے میں مساعی جمید فرمائے ہیں آپ کی دھمپیدیں مضمون بلاشبہ مشہور اپنا رنگ لائیگا۔ اور نوجوانوں کے دلوں میں صحیح انقلاب پیدا کرے گی۔ یعنی وہ سب ہنر کے شہدائی ہو کر اپنی مولا آزادانہ طور پر حاصل کرنے کو ملازمت پر ترجیح دینگے۔

افسانے اور ڈرامے۔ آجکل کی ادبی دنیا کے بے حد منظور اور محبوب تہین چیزیں ہیں۔ رہنمائے تعلیم کی کوششیں قابل ادبیں جسے ان میں بھی چوٹی کے افسانہ اور ڈرامہ نویسوں کے اعلیٰ پایہ کے شاہکارے حاصل ہوئے ہیں چنانچہ شیشی پیم چند صاحبہ بی۔ اے لکھنوی کا تحریک نامی ڈرامہ اس امر کا شاہد ہے کہ انسانی زندگی میں تبدیلی روحانہ ہو کر اُسے کیا سے کچھ بنا دیتی ہے ایک نکما اور ناکارہ طالب علم جس سے تعلیم کا کے مرو دیوار پناہ مانگتے ہیں استاد بھی اُسے بلائے بنے رماں بتاتے ہیں طلبا بھی لرزہ بر اندام اور اسکے احکام کے برخلاف چون دچرا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے قدرت اس کی خضر راہ بنتی ہے اور اُسے ایک بے مال کے ماموں زاد بھائی کی سرپرستی سے کام کرنے کا ایسا شوق پیدا ہوتا ہے کہ ہوشیار طالب علم بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ آئے دن مجبور و محاسن ہوتا جاتا ہے اور وقت پاکر ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنی علمی قابلیت کی داد حاصل کرتا ہے یعنی انڈین سول سروس کا امتحان پاس کر کے ڈپٹی کمشنر ہوتا ہے اور اپنے حالات ایک استاد سے جو استاد سے پرنسپل اور پرنسپل سے تارک لہ دنیا بنتا ہے بیان کرتا ہے۔ جو نوجوانوں کے لئے مرنے عبرت اور ان کی تحریک کا موجب

ہے منشی صاحب ملک کے مسلمان افسانہ نویسوں کے مترج ہیں اور آپ کا شاہکارہ تعلیمی اور ادبی دنیا میں سید پسند کیا جائیگا۔
بھروسہ سیرمدن شرما کی جو لٹریچر کا بہترین شاہکاران کے ہم خیالوں کیلئے دلچسپیوں کا مخزن ہے۔

تمنا سردار رام سنگھ صاحب بی اے اور نرملے ڈی۔ آئی کا نہایت سبق آموز شاہکارہ ہے ایک نصیب باپ
بیوی کی وفات کے بعد اپنے دو نو بچوں کو کھو بیٹھتا ہے اور ان کی باز دید کی امیدیں زندگی کے پچیس سال نہایت انتظار
میں بسر کر کے حالت نزع میں بڑے بچے کو پا کر شادی کرگ جاتا ہے۔

امید بڑے آمد نے چھاندہ انکہ امیدیت کہ عمر گزشتہ باز آید

کے مقولہ کی صداقت صاف اس سے عیاں ہوتی ہے۔

مرحبان خانم محترمہ نقیس بیگم کے تخیلات کی بلند چرازی کا اپنی مثال آپ شاہکارہ ہے اور اس امر کا شاہد ہے کہ جب صنف
نازک بنی عفت اور مصمت کی حفاظت پر جو نوانی بے بہا زیور ہے۔ آمادہ ہوجاتی ہیں تو کوئی خطرہ یا عتاب انہیں متزلزل نہیں
کر سکتا۔ مرحبان خانم نے غلیظہ ہارون الرشید سے ازدواج کا وعدہ کر کے زمانہ کے جابر ڈاکو کی تختیوں کو پاؤں تلے روندنا اور اس
کی نعمتوں اور شان و شکوہ پر نگاہ ننگش کی اس کا قید سے نکلنا اور کرٹے پہرے سے مسج و سالم نکل کر غلیظہ کے برابر میں پہنچنا اور
ڈاکو لکھن کر دازنگ پہنچانا اگرچہ عجیب العقول نظر آتا ہے مگر بے اختیار یاد دلانا ہے کہ رکھنے اور حفاظت کی نیولے کے بچاؤ کے راہ
نیائے ہیں محترمہ ہمیشہ کی عنایت کے صدفے جو بی نمبر نوان کے فہم و فراست محروم نہ رہا بلکہ اسے وہ شاہکارہ حاصل ہوا جو
ادبی دنیا میں تسک مجانے والا ہے۔

درس عبرت کا نام ہی شاہد ہے کہ افسانہ کیا ہوگا مصوٰر جذبات اشرف قریشی لکھنوی نے فصاحت و بلاغت
کا علمی ثبوت پیش کر دیا ہے۔ افسانہ ایک اسم با سبھی افسانہ اور ناظرین کی دلچسپیوں کا لاتنا ہی سلسلہ ہے۔

سجدہ شکر۔ مرقع جہ ہے پہلی اولاد کی موجودگی میں جو باپ دوسری شادی کرنے میں اکثر اوقات وہ شادی نہایت
خانہ بربادی کا موجب ہوتی ہے۔ سجدہ شکر میں دو زندہ مثالیں پیش کی گئی ہیں جو دو خاندانوں کی بربادی کا عبرت بخش انجام
دکھاتی ہیں ایک نوجوان دوسرے ہمراہی کو اپنے سے بہتر سمجھ کر اس کی حالت پر رشک کرتا ہے مگر حقیقت سے آگاہ ہو کر
اسے اپنے سے زیادہ درو سیدہ اور مظلوم پاکر سرسجود ہوتا ہے اور سجدہ شکر بجالاتا ہے۔ شیخ محمد انعام الحق صاحب کی
شیوہ بیانی قابل داد ہے۔

مشاہیر عالم کی ذیل میں چند بزرگوں کے دلچسپ اور سبق آموز حالات عدم گنجائش کا شکار ہوئے اس شعبہ میں
شرعی کرشن جی کی لائف اور ان کی بے نظیر تصنیف گیتا پر جو ناقدانہ انکشافات ہوئے اسے مولوی محمد شریف صاحب قریشی
کی بے تقسبی اور علمی مذاق کا شاہد ہے اپنے اپنے دکش طریبان سے اس میں وہ جادو بھرا ہے کہ زبان بے اختیار
چٹھائے جیتی ہے۔ شرعی کرشن ایسی بے نظیر ہستی اور ان کی یگانہ روزگار تصنیف کو ان کا کوئی نام یو اقریشی صاحب

سے بہتر کیا تحریر کرے گا آپ نے یہ مضمون لکھ کر علمی دنیا میں ایک زندہ مثال پیش کی ہے اور اس امر کا بدیہی ثبوت دیا ہے کہ ہر ایک بزرگ کے خیالات کی قدر کرنا اور اس میں قویست اور ملت کو دخل نہ دینا حقیقت کے ہر متلاشی کا فرض ہے! اور "خذ ما صفا و ع ما کدس" کے مقولہ کا عامل و قائل ہونا اس پر واجب ہے۔

ہمارا کوئی کالید اس کے سوانح حیات کو بالتفصیل اور ان کی بے نظیر تصنیفات پر بالتوضیح اظہار خیالات کرنے کا سہرہ قدرت کی طرف سے ہمارے کرمفرما شیخ محمد اسماعیل صاحب کے سر بندھا گیا ہے۔ شیخ صاحب نے ملک اشعر کے حالات بیان کرنے سے اپنے ریسرچ سکالر ہونے کا بین ثبوت دیا ہے یہ علمی شاہکارہ زبان حال سے آپ کی علمی دھچپیوں کی شہادت ہے رہے تاریخ اور ادب کے شائقین اس سے بے حد متفیض ہونگے۔

سر سہفری ڈیوئی۔ قندیل اس کے موجد اور بانی کے حالات اور اس کی طفیل بنی نوع انسان کو جو عظیم فائدہ حاصل ہوا ہے پنڈت پریم پرکاش صاحب نے بیان فرما کر اپنی قابلیت کا بخوبی اظہار کیا ہے۔ سر سہفری ایسے بزرگوار زندہ جاوید ہوتے ہیں جو اپنی تحقیقات اور علمی قابلیت کو اپنا جنس کے مفاد کا موجب بناتے ہیں قندیل اس سے بلا شک و شبہ کان کنوں کو عام طور پر گرگڑنے کی کان میں کام کرنے والوں کو خاص طور پر فائدہ عظیم حاصل ہوا ہے۔ اور اس کے وجود سے تجارت صنعت و حرفت کو بے حد فائدہ پہنچا ہے۔

کستی پنوں۔ پنجاب کے مشہور عالم عشاق کی کسانیاں اور ان کے صحیح حالات کو جس تحقیقات سے جناب قاضی فضل حق صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج نے حوالہ دیا ہے آپ کے سابقہ مضمون ہیرا بھاکا کی یلہ دلاتا ہے جو رہنمائے تعلیم کے صفحات کی زینت ہو کر علوم کی رہنمائی کا موجب ہوا تھا! اور علمی و تحقیقاتی دنیا میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ ہیرا بھاکا کی طرح کستی پنوں کی سرگذشت بھی قابل شنید اور مرقع عبرت ہے جناب قاضی صاحب کو پنجابی شاعری سے جو شغف اور انماک ہے اس کا بہترین ثبوت آپ کے علمی شاہکارے ہیں جن کی ترتیب میں کار سے زیادہ چھان بین کی گئی ہے اور پہلک کو خاص تاریخی حوالوں اور مستند کتابوں کی امداد سے ان کی اصل حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے۔

اخیر میں سر سہفری صاحب کا نام سے معافی مانگنا ہے جبکہ معنایں یا تو بہت دیر کے بعد موصول ہونے یا ان کے ترجمہ میں جو جمع نے قضا سے کام لیا۔ اور یا بعض بہت طویل ہونے کی وجہ سے طباعت سے روکے گئے ورنہ ہم انہیں مطلوبہ معنایں سے کسی طرح بھی کمزوری نہیں سمجھتے۔ امید ہے کہ ہمیں اگر ستافی کیلئے معاف کیا جائیگا۔ بقایا معنایں جلد جلد آئندہ اشاعتوں میں چھپنا شروع ہوجائیں گے۔

لاہور نمائندہ تعلیم لاہور۔ بی۔ پی۔ ای۔ ایس۔ رموی محمد عبدالعلی صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس۔ پروفیسر فیروز حسن صاحب بی۔ اے۔

منشی انصیا لال صاحب پہلے حضرت نسیم ایڈیٹر انکشاف حضرت بدت جتتادی حضرت عشرت رحمانی پر ذریعہ الباسط اب اس کے
نھا کر ستیہ پال سنگھ جرنلٹ۔ سید محمود صاحب بی۔ حضرت خیر بہوروی۔ لالہ رتن چند بھن بی۔ بی بی حضرت جبرت ایڈیٹر
سروش۔ سید منظور حسن رتنوی جو ہدی سنت رام صاحب ٹائروپی۔ ای ایس حضرت ریاض خیر گادی۔ ماسٹر سنت رام صاحب کٹر
بی۔ پنڈت ولت رام صاحب شرما۔ مولوی ظفر اقبال صاحب ایم بی بی ای ایس پنڈت بھیر چند صاحب اختر ایم بی۔ قاضی نجیب اللہ صاحب اخبار
شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی کے آٹھ نہایت اعلیٰ پار کے تحقیقاتی مضامین میں سے صرف دو مضمون دئے جاسکے ہیں۔ امید کہ
یہ جلد صاحب ہمارے مجبوروں اور جو بی نمبر کی کافی سے زیادہ صفحات کو مد نظر رکھ کر ہمیں معاف کر دیں گے۔ (سمیچا دوا)

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی علمی شہرتی

ملفوں اور مصنفوں کی حوصلہ افزائی کیلئے ایک فنڈ قائم ہے تاکہ اس صوبے کی دیسی زبانوں یعنی اردو ہندی اور پنجابی کے ہر قلم کو مفید و دور
کتابیں لکھنے کی ترغیب اور تحریک ہو اور علم ادب میں ترقی ہو۔ یہ انعام صرف اس صوبے کے رہنے والوں کیلئے ہیں۔ اور صرف چار ہزار خاص تعریف کے
قابل کتابوں کیلئے دئے جاتے ہیں۔ ترجمے جینک غیر معمولی اور نوکمی بلت نہ ہوں۔ انتخاب انعام میں نہیں آسکتے۔ انتخاب انعام کی تعلق کمیٹی نے چند قواعد
ضوابط مرتب کئے ہیں اور انتخاب کے وقت ان پر عمل ہونا ہے ان قواعد کی نقل ہر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے دستیاب ہو سکتی ہے واضح ہو کہ انعام اپنے
کی غرض سے کمیٹی اپنی صاحبیت پر غور نہیں کرتی جس میں سیاسی اور مذہبی تنازع مسائل پر بحث مباحثہ ہو یا جو کئی غرض کی تعلق ہوں۔ یا انہیں ایسے
مضامین ہوں کہ جن کی سطح کو فوہوں میں باہمی لغت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ یا جن میں موجودہ فرقہ وارانہ سیاسی تنازع مسائل پر بحث کی گئی ہو۔ یا جو
در کتابیں ہوں۔ یا جن کا غرضی خاص پیشہ سے تعلق ہو۔ ترجمے کی کتاب دی جاتی ہے جو عوام الناس کو اسے مفید ہوں۔ اور جو عام فہم سائنس۔ تاریخ
سوانح عمری یعنی شہر اور ریاست کے تعلق رکھتی ہوں یا جن کا دعایہ ہو کہ مدرسوں بچوں کیلئے آسان مفید اور دلچسپ علم ادب میں کیا جائے۔ یا جو کہ
خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہوں۔

ہر سال کے آغاز میں ٹیکسٹ بک کمیٹی کتاب کے صلہ پر کیا کرتی ہے اس سال ۱۹۳۱ء میں بھی پچاس کتابیں برائے انتخاب فرمیں گے۔ ہر کتاب کو ایک ہزار روپے
موجود قواعد کے موافق ہر کتاب کے لئے انعام ہزار روپے تک ہو سکتا ہے اور کوئی انعام پانچ سو سے کم نہ ہوگا۔
تفصیل انعامات سال ۱۹۳۱ء حسب ذیل ہے۔

- | | |
|----------|---|
| ۵۰۰ روپے | ۱۔ ڈاکٹر دودھ راج چوہدری ایم۔ پی۔ سی۔ ایچ۔ بی مصنف مال اور منچ |
| ۵۰۰ | ۲۔ لالہ شام داس دھوا ایک سید لاہور۔ پبلشر پتھر مہاراج (ہندی) |
| ۵۰۰ | ۳۔ پنڈت وید دیاس ایم بی لاہور مصنف و شمال بھارت حصہ اول |
| ۵۰۰ | ۴۔ پنڈت من موہن دیوانہ مصنف ان دودھ موہی |
| ۵۰۰ | ۵۔ بھائی رام سنگھ گیانی ایم بی پر دینے خالصہ کالج امرت سر مصنف شہد جتکار |
| ۵۰۰ | ۶۔ لالہ ایشور چندر سندھ۔ ایم بی لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور مصنف و رتھریا بلی دوا ویاہ |

دیکھئے گلشن سخن کی بہار
 سخن ہے شاہد سخن پر ہند
 ہے فلک پر دماغ علم و ادب
 جمع ہیں خوش نوا و خوش گفتار
 مسند آرا میں حضرت
 رونق بزم میں جناب
 میں کمال سخن کے شیدائی
 نشہ شر میں جو ہیں شرار
 لوگ کہتے ہیں پیسہ میخانہ
 حضرت پڑھ رہے ہیں غزل
 معنی نو بہارِ باغ ہیں یہ
 ان کا دیوان ہر جگہ مشہور
 اس پتہ بان ہے چین کی بہار
 بزمِ انجسہم ہے انجمنِ پند
 خوش بیانی کا گرم ہے بازار
 بلند نشان
 تانِ محفل کی جن سے ہے تکمیل
 جانشین مبینائی
 ہیں یہی تو سرکار
 ہم سمجھتے ہیں میرے فائدہ
 وہ غزل دل کو جو کہے کہ سنبل
 جانشین جناب ہیں یہ
 ان کا طوفان ہر جگہ مشہور

شاعرِ باکمال اور بھی ہیں رونقِ بزمِ قال اور بھی ہیں
یادگارِ امیرِ مینائی یعنی حضرت صریرِ مینائی
ان کے پہلو میں حضرتِ اختر یادگارِ امیرِ شاعرِ گر
جلوہِ انس و زمیں گرا می بھی باسط و صفدِ عظامی بھی
نظمِ حیرتِ بدق جگرِ محروم جن کے فضل و کمال کی ہے دھوم
برقِ طائبِ انزلیشِ فیاں حکمتِ فن میں ہیں بڑے نباض
کوکبِ انصافِ دلِ ترقیِ نفیس شعر کہتے ہیں خوب صاف سلیس
فوقِ بسمل ہوئے ہیں نکتہ نواز گرم ہے ان میں بزمِ راز و نیاز
عرشِ طیش و مزاجِ دین و فضا کس ادا سے ہوئے ہیں نعمہ سرا
حُسنِ معنی دکھا دیا سب نے رنگ اپنا جما دیا سب نے
اب رہا میں گدائے خالکشیں پیشکش کوئی جس کے پاس نہیں
بے نواسے ہو کیا گھر باری کھا گئی مجھ کو شرمِ ناداری
جو کہا اُس کی مدح کی میں نے جو نہ اُس کی داد دی میں نے

اور کیا دے سکے عقیدتِ کیش
برگِ سبز است تحفہ درویش
چشمِ بزمِ

جوبلی نمبر

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا

سوا باریب عقیق کتاب نگین ہوا

رہنمائے تعلیم کے جوبلی نمبر کی تقریب پر جا بجا خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ جسے دیکھو خداں و خداں ہے۔ حلقہ آج اب میں اسی کا ذکر نہیں ہے۔ طلباء و اساتذہ بھی اسی کا نام لے رہے ہیں۔ سب بخا ہیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہر شخص پڑساں ہے۔ کہ کب اُسکے درشن ہونگے۔ اُسکی وجہ صاف ہے کہ جب کسی کا بچہ گور وکل یا کالج سے تحصیل علم سے فارغ ہو کر گھر آتا ہے۔ تو کس قدر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اُسکے ماں باپ کے غل تپا میں پھل لگتا ہے۔ اور وہ اُن کیلئے حقیقی سرگ مانتا ہے جس بچہ کی پرورش و نگہداشت ۲۵ برس کی گئی ہو اور جسے مانہ کی ہر سرد و گرم ہوا سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ اُسکے بالغ ہونے اور امور خانہ داری میں شمولیت پر کون ہے۔ جو اچھل نہ پڑے۔

رسالہ رہنمائے تعلیم کا عہد طفولیت اگرچہ گوشہ تنہائی میں گزر ا اور وہ بچہ ایک خصوصیت لئے ہوا تھا جسے اُس نے برابر قائم رکھا۔ اس زمانہ میں ماسٹر بگت سنگھ صاحب نے اسکی مناسب پرورش و پرداخت کی۔ ہر قسم کی قربانی و ایثار نفسی سے کام لیا۔ اُسکے ابتدائے شباب کو قریشی طالب علی پابند حال اڈیٹر اخبار تعلیم اور ماسٹر صاحب موصوف نے خوب بچایا۔ پنجاب بھر میں واحد تعلیمی رسالہ بنا رہا۔ کسی کو مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی جب اس کا شباب پورے جو بن پر آیا۔ تو اُس کا دور جدید شروع ہوا۔ اس میں ایک انقلاب عظیم اور کیا پیٹ کا معنیون ہوا۔ محض علمی دائرہ پر قانع نہ رہ کر ادبی دنیا کے رنگ میں رنگا گیا۔ جسے دیکھ کر کئی برساتی میٹک ٹرانے لگے۔ حدودِ عناد کی تار بیک گھٹائیں اُسکے سر پر منڈلانے لگیں۔ اس نوجوان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے مشورے ہوئے۔ شائد دشمن کامیاب ہو جاتے۔ لیکن ماسٹر بگت سنگھ صاحب مالک رسالہ کی بردباری و منتظر قربانی۔ انتہک کوشش۔ خندہ پیشانی اور سوخ کی مقناطیسی طاقت نے اسے منزل مقصود پر پہنچایا۔ اور وہ آج اپنی زندگی کی پہلی منزل کو طے کر کے دوسری منزل پر کھڑا ہے۔ اسے جس قدر شہرت۔ طاقت اور عزت حاصل ہے۔ وہ سب کچھ ماسٹر صاحب کی محنت و قربانی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان بھر میں اس کا وارہ اثر موجود ہے۔ برساتی میٹک ٹرانے رہیں۔ مشرت الارض کی طرح خود ہی رہ جائیں گے۔ کارکنان کو اس سے زیادہ

خوشی اور فخر ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے ماسٹر صاحب کی سپرٹ سے چند سبق سیکھ کر تعلیمی وادبی دنیا کی کچھ ادنیٰ خدمت کر دکھائی ہے۔

ہم ماسٹر صاحب کی خوشی میں بھی اُسی طرح سے شریک ہیں۔ اور اس ۲۵ سالہ جولائی نمبر کی کامیابی پر اُن کو تہنیت مبارک یاد دیتے ہیں۔

انجمنِ صاحبِ مالہ کی حوصلہ افزائی کے کبھی ممنون ہیں۔ اور اُن سے استمداد کرتے ہیں۔ کہ آئندہ بھی بہتور رسالہ کی امداد فرماتے رہیں۔

(چیف ایڈیٹر)

زندگِ جدید

کوئی جا پان کوئی روس کے ساتھ اور میں آپ کے جلوں کے ساتھ

وہ اس کا راز سمجھا وہ اس کا پیچ سمجھا دنیا میں جس نے رہ کر دنیا کو پیچ سمجھا

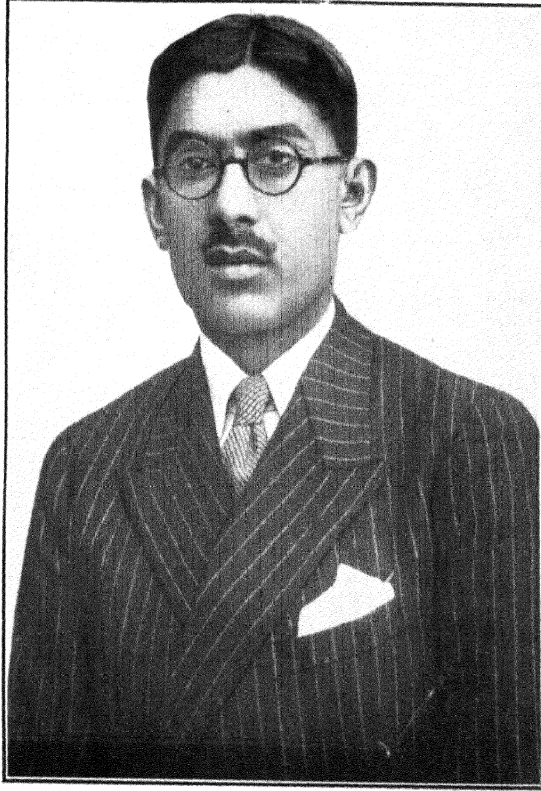
ہم نہ ہونگے نہ زمانے میں نشانی ہوگی زندگی اپنی کسی روزگمناں ہوگی

منہ سے ہم کہتے ہیں جگوان کا درشن مل جائے اور ہے پیٹ کا حکم کہ بھوجن مل جائے
کوئی ارماں نہیں اس کے سوا اے بسمل اُن کے فیشن سے ہم راکبیں فیشن مل جائے

(سبل آبادی)

رہنمائے تعلیم لاہور

جولائی نمبر ۱۹۳۱



آنوییل ملک فیروز خان نور-ایم اے (اوکسن) بار ایٹ لاء
وزیر تعلیم و صحت پنجاب

سررشتہ تعلیم پنجاب کے سرتاج

آزیزیل ملک فیروز خان صاحب فنان ایم اے بی بیٹریٹ لائبریری تعلیم پنجاب

کا

پیغام

آپ کی پندرہ ماہ سال کی سچی کا شکریہ صوبہ بھر کے تمام تعلیم و علم سے تعلق رکھنے والے اصحاب رسالہ پنہائے تعلیم کی قیمتی خدمات سے ہو وہ عامہ خلایق کی بالعموم اور معالین و متعلمین کی بالخصوص بجا لارہا ہے۔ لہجے طور پر باخبر ہیں ہیں آئی کامیابی کا خواہاں و ملک کی ترقی کی خدمت گزار کیلئے آپ کے رسالہ کی داری عمر کا آرزو مند ہوں!

دستخط انگیزی

Imfahen Now

قطعة تاریخ

جہلی نمبر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

جہلی نمبر ہے یا ہے باور ہمار
کھل گیا جس سے باغِ علم و ادب
رفعتِ پایہ مضامین سے
ہے فلک پر دماغِ علم و ادب
سالِ تاریخ بھی ہے نورانی
اب ہے روشن چراغِ علم و ادب

۱ ۲ ۹ ۱ ۶
جوش ملیح آبادی



**J. E. PARKINSON, Esq., M. A., I. E. S.,
PRINCIPAL, CENTRAL TRAINING COLLEGE LAHORE.**

پیغامات

آئریل ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ ایم اے پی ایچ ڈی - بیرسٹریٹ لاؤنڈری لوکل سیلف گورنمنٹ پنجاب -

آپ کا دیربانی نامہ ملا۔ آپ کے رسالہ کیلئے مضمون تحریر کرنے سے بوجہ عدیم الفرستی قاصر ہوں۔ مگر آپ کے رسالہ کی معرفت جو تعلیم کا اسم بامسمیٰ رہتا ہے۔ ہمارے بچوں کی تعلیم سے علاقہ رکھنے والے تمام بزرگوں کی توجہ مبذول کرتا ہوں۔ کہ محض دسی تعلیم ہمارے صوبہ کے مفید نہیں۔ ہمارے ہزار ہا بڑے نام تعلیم یافتہ نوجوان جو آٹھ سال سکولوں اور کالجوں سے کھتے ہیں اپنی معاش حاصل کرنے کیلئے اسے باوجود مکمل غیر کفایتی پائیں گے۔ پس یہ نہایت ضروری ہے کہ طریق تعلیم میں خاص تبدیلی رونما ہو اور محدود سے چند مالدار اور مستغنی اشخاص کو چھوڑ کر پبلک کو دستی کام سکھایا جائے۔ تاکہ وہ محض سرکاری ملازمت پر انحصار نہ کریں بلکہ آزادانہ ذرائع سے معاش حاصل کر سکیں۔ کیونکہ ہمارے نوجوان جب سکول اور کالج کو خیر باد کہتے ہیں۔ دستی کام کے بالکل نا قابل ہی ثابت نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اسے کسر شان سمجھتے ہیں۔ جو واقعات کی نہایت نا واجب صورت کا اظہار ہے۔ اور اگر آپ ان اصحاب کی توجہ کو جو ہمارے بچوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مخطف کر سکیں۔ تو آپ صوبہ کی حقیقی خدمت سر انجام دینگے

جناب دارمند واس صاحب بی اے اے کٹب، ایم اے پنجاب، بیرسٹریٹ لاؤنڈری کرسر شری تعلیم پکپور تھلہ

بوجہ عدیم الفرستی مضمون تحریر کرنے سے معذور ہوں۔ مگر آپ کے نامی رسالہ کی پچیس سالہ کامیاب زندگی کی تکمیل پر مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ اور آرزو مند ہوں کہ وہ عرصہ دراز تک بدستور مفید اور نمایاں تعلیمی خدمات سر انجام دیتا رہے۔

خان صاحب میر کریم بخش صاحب سکریٹریٹ پکپور تھلہ ایجوکیشن صوبہ سرحدی۔ پشاور

مہربانی نارسا شکریہ۔ جولائی نمبر کی کامیابی کا دل سے خوانا ہوں۔ آپ کے رسالہ نے شاندار تعلیمی خدمات انجام دی ہیں اور میں داعی ہوں۔ کہ وہ بدستور اپنے فرائض کو سر انجام دیتا رہے۔ اگر فرصت نے مساعدت کی۔ تو ان شاء اللہ کوئی مضمون بھی

آراء گرامی

عاجنباب خان بہادر شیخ نور الہی صاحب ایم اے آئی ای ایس ڈوئیرنل انسپکٹر
آف سکولز لاہور ڈوئیرنل -

”میں بلابالغہ رسالہ رہنمائے تعلیم کو بہتر مانا نہ کہتا ہوں۔ اور اس کے مفید خدمات کی بجا آوری پر تعین و آفرین کہے بغیر
نہیں رہ سکتا۔“

عاجنباب مسٹر من موہن ایم اے ڈوئیرنل انسپکٹر آف سکولز۔ جب الزہر ڈوئیرنل

رسالہ رہنمائے تعلیم اعلیٰ پایہ کا رسالہ ہے۔ اور مدرسین مدارس کے لئے نہایت مفید بلکہ مفید ترین رسالہ ہے۔ اس کے مضامین
ہمیشہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ اس کی صورت نہایت مطبوع اور پسندیدہ ہے۔ میں اس کی ہر گونہ انتہائی کاستمندی اور خواہاں ہوں۔“

عاجنباب شیخ عبد الحمید صاحب ایم اے۔ پی ای ایس ڈوئیرنل انسپکٹر آف سکولز
ملتان ڈوئیرنل

”رسالہ رہنمائے تعلیم عرصہ دراز سے تعلیم کے پورے کارکن کی اشاعت کر رہا ہے۔ وہ طلباء کا رفیق اور مددگار کا بجا وکیل ہے
اور طلباء کی ذہانت طبع کو بڑھانے کا حقیقی ذریعہ ہے۔ وہ تعلیمی اور اخلاقی ہر قسم کے مضامین ہم پہنچاتا ہے۔ اس کا ضمیمہ یعنی
مکمل شدہ اطفال پورے طور پر دلکش اور مفید ہوتا ہے۔ اس کے سالانہ چندہ کا جب اسکی خدمات، صفحات اور خوبول سے مقابلہ
کیا جاتا ہے۔ تو برائے نام اور قلیل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مالک کی ایشیا نغسی قابلِ داد ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ رسالہ
کو اپنے مددگارین نمایاں کامیابی حاصل ہو۔ اور وہ ہمیشہ شاہراہ ترقی پر گامزن رہے۔“

عاجنباب سردار دیوان سنگھ صاحب ایم اے پی ای ایس ڈوئیرنل انسپکٹر آف سکولز انالہ ڈوئیرنل

رسالہ رہنمائے تعلیم قومی طرفداری سے پورے طور پر بہرہ اور دلکش اور قابل دید مضامین کا بہترین مجموعہ ہوتا ہے۔ جو
نوجوانوں کو شاہراہِ ستقیم پر گامزن ہونے کا راہ دی اور رہنما ہے۔ سیکنڈری مدارس اور ڈیپارٹمنٹ کے لئے وہ بے حد مفید

اور منفعت بخش ہے۔

عالیجناب سردار بہادر سردار بشن سنگھ صاحب بی اے آئی ای ایس (ریٹائرڈ)
سابق ڈوئیزل انسپکٹر آف سکولز جالندھر ڈویژن پرنسپل خالصہ کالج امرتسر
آپ کے مفید ترین رسالہ کی نسبت میری رائے بدستور سابق نہایت اعلیٰ ہے۔ وہ صوبہ کے نہایت مفید رسائل سے ہے
ادبیاتی ادب سے آموز رسالہ ہونے کی وجہ سے حقیقی طور پر سراہنے کے قابل ہے۔ اور ہر خاص و عام کا منظور نظر ہے۔ میں اس کی
کامیابی کا تہ دل سے خواہاں ہوں۔

عالیجناب بے بہادر مسٹر اتھارام صاحب ایم اے آئی ای ایس (رخصتی) ڈوئیزل انسپکٹر آف
سکولز راولپنڈی ڈویژن

رہنمائے تعلیم کا مطالعہ نہایت مسرت بخش اور دلنوش کن ہوتا ہے۔ اس کی صورت نہایت دیدہ زیب اور اس کا وجود
امر کا ہی ثبوت ہے۔ کہ وہ اپنی خوبی اور مددگی کو پورے طور پر قائم رکھے ہوئے ہے۔ جب اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اسے
اسم بکشی اور علمی صیانت کا بے بہادر دسترخوان پاتا ہوں۔ اس کی خوشحالی اور کامیابی میرے لئے بے حد ملالت بخش ہوگی۔

جناب ملک غلام رسول صاحب شوق ایم اے پی ای ایس ٹرکٹ انسپکٹر مدراس ضلع
شاہ پور

”رہنمائے تعلیم بہت پانا اور مفید رسالہ ہے۔ محکمہ تعلیم کا مشیر اور مدین کا ہمدرد ہے۔ اسکی خدمات قابل قدر ہیں۔ میں ہمیشہ
اسے دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اور اسکی اشاعت کو مفید سمجھتا ہوں۔ آج کل کی مالی مشکلات میں ایسے رسالوں کے لئے کچھ رقم نکال لی
جائے۔ تو غنیمت ہے۔“

جناب لالہ رام چندر صاحب بی اے پی ای ایس ٹرکٹ انسپکٹر مدراس ضلع ملتان

”آپ کا رسالہ روز بروز معنائیں اور چھپائی کے لحاظ سے نمایاں ترقی پر ہے۔ اور مدین کے لئے بہت مفید ہے۔ یہ رسالہ
کافی عرصہ سے محکمہ تعلیم کی خدمت بجا لا رہا ہے۔ اور اس وجہ سے محکمہ مذکورہ کی امداد سب پرستی کا حقدار ہے۔“
خانصاحب مولوی الہ دین صاحب بی اے پی ای ایس ٹرکٹ انسپکٹر مدراس ضلع ہزارہ
”آپ کا رسالہ واقعی مفید ہے۔ معنائیں مہذب اور قابل قدر ہیں۔“

سال نو

(رفیع العطرنا خدائے سخن تاج الشعر حضرت نوح نامی)

پھر مشرودہ عید آیا	پھر سب عید آیا	خوش طرز واد منظر	خوش دمنع و خوش منظر
پھر وقت کشید آیا	پھر دور وحید آیا	اندوہ ربا نقشہ	تصویر نقشہ منظر
پھر لطف مزید آیا	پھر حکم اکید آیا	سہ جو دو عطا منظر	الواحد منظر
پھر سال جدید آیا		پھر سال جدید آیا	
گلشنِ نیکبہی چھوٹے	چھائی نہ کوئی کوٹے	عالم میں خوشی چھائی	دنیا نے پڑی پانی
دن رات منے ہوئے	کس واسطے دل ٹوٹے	نقد پیراڑا لائی	انداز پر انرا لائی
شاخوں درمخت ہوئے	کچھ اور آگیاں ہوئے	زحمت بڑی فرمائی	خود کستی ہوئی آئی
پھر سال جدید آیا		پھر سال جدید آیا	
آئین بدل جائیں	بیا رنگل جائیں	کیا خونے ڈھبیں	مصرفِ طرب سب ہیں
مغموم ہل جائیں	غم آپ ہی مل جائیں	ناشاد و حریف کتیں	ممنون کرم اب ہیں
ارمان پیل جائیں	فی الفور نکل جائیں	بے اذن یونہی جیتیں	فطرت کے یکر تب ہیں
پھر سال جدید آیا		پھر سال جدید آیا	
بادل کی سیہ پوشی	بجلی کی ضیا کو شہی	اے نوح نبی الفت	نفرت سے ہے نفرت
خورشید کی سرخوشی	مہتاب کی مدہوشی	ایک ایک کرے عزت	راحت سے ہر ساعت
انجم کی ہم آغوشی	رتال کی خاموشی	ملنے بڑھے قوت	ہوں رنج و الم خست
پھر سال جدید آیا		پھر سال جدید آیا	

کلامُ الملوک ملوک الکلام

(ہزار گز انیٹھ ہائی نرس علی حضرت حضور نظام نواب سر مرید عثمان علی خاں بہادر آصف سابع سلطان کن غلامد ملکہ و سلطنت)

گل تے عشق میں ہیں چاک گریباں کیا کیا دیکھ کر تجھ کو ہوا آئنے حیراں کیا کیا
پھر وہی چھیر ہے قاتل سے وہی خنجر پھر مے دل نے کئے قتل کے سماں کیا کیا
چشمِ جاناں کی محبت میں بست تھی کس کو دل پہ ڈھائیگی ستم گردشِ دوراں کیا کیا
یہ ادائیں، یہ کرشمے، یہ غضب کے انداز نظر آتے ہیں مری جان کے خواہاں کیا کیا
نہ بٹ کی تاب نہ خنجرِ قاتل نہ رہی تپشِ دل نے کیا مجھ کو پشیمان کیا کیا
کیا کہوں سنگ سے کیا عشوہ گری کا دل دھوکے دیتی ہے مجھے صورتِ جاناں کیا کیا

ہوں وصل کو تھوڑا نہ سمجھنا عثمان

رنگ دکھلائے گا یہ خواب پریشاں کیا کیا

RAHNUMA-I-TALIM'S

JUBILEE NUMBER.



سلطان العلوم حضور نظام شاہ دکن



خاندان شاہی

رہنمائے تعلیم کا دور حیات

بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ سررشتہ تعلیم پنجاب کی عدنان حکومت ڈاکٹر جے سالم صاحب مرحوم کے ہاتھوں سے ٹھکر سٹر ڈبلیو بیل کے سپرد ہوئی۔ آپ نے اپنے پیشرو کی لکیر کا فیتر نہ رہ کر ہر ضلع میں ایک ایک گورنمنٹ ہائی سکول قائم کیا اور حتی الامکان بہتر سے بہتر مشاٹ جیا کیا۔ ڈاکٹر سالم صاحب کا مقولہ کہ ۳۰ روپیہ ماہانہ یا ایک روپیہ روزانہ مہذب و ستائیل کے لئے شائز ادول کی خواہ کے برابر ہے۔ غلط کر دیا گیا۔ اور بیل صاحب نے بہت اعلیٰ خواہیں دے کر اس وقت کے حالات کے موافق نہ صرف موہ پنجاب سے بلکہ دیگر صوبہ جات سے بھی قابل آدمی تلاش کئے۔ اور ان گورنمنٹ ہائی سکولوں کو نمونہ کا سکول بنانے میں اپنی جانب سے کوئی کسر اٹھا دیکھی۔ انسران معائن کی ذیل میں ہر ضلع میں ایک ایک اسے ڈی آئی صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ گریڈ بندی نئی ہو کر ماتحت تعلیمی ملازمت کی سکیم شائع کی۔ اور کا یا پٹ کا نمونہ دھایا گیا سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں بھی جاں بلڈنگ میں توسیع و راکھی گئی۔ دال ممبران شاف کی اپزادی بھی عمل میں آئی۔ گویا ایک زندگی میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ چنانچہ اس نئے دور کے آغاز میں سر دار جگت سنگھ صاحب مالک رسالہ رہنمائے تعلیم کو سشن ۱۹۰۰ء اور سشن ۱۹۰۱ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج کی ایس وی کلاس میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ آپ نے سررشتہ کے نئے حالات اور اپنے کالج کے پروفیسر اصحاب کے اسباق اور فیضان محبت سے متاثر ہو کر جاں اپنی علمی قابلیت میں اضافہ کیا۔ دال یہ جذبہ بھی اپنے دل میں لیا۔ کہ نئے اصول تعلیم دکنڈ گارٹن۔ کئے موڈلنگ وغیرہ اور نئے تجربات جو تعلیمی دنیا میں عمل میں آ رہے ہیں۔ اپنے بھائیوں تک پہنچانے جائیں چنانچہ ہر کسے راہر کار سے سافقت کا مقولہ آپ کی ذات پر صادق آتا ہے۔ کیونکہ آپ نے برخلاف دیگر متعلین ایس وی۔ جے اے وی وایس اے وی اس جذبہ کو عملی صورت دینا شروع کیا۔ اور سنٹرل ٹریننگ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے وطن مالوٹ پنڈی گھپ سابق ضلع راولپنڈی حال ضلع ٹمک سے جو موہ کے ایک دور افتادہ گوشہ میں ہے۔ رسالہ رہنمائے تعلیم جاری کرنے کی عہانی۔ آپ کی نیک طبیعت اور جذبہ بخشنہ کا نتیجہ ہے۔ کہ رسالہ رہنمائے تعلیم جو اپنی قسم کا پہلا ہی رسالہ کہا جاسکتا ہے۔ سچ اس قابل ہے۔ کہ اپنی پچیس سالہ نمایاں خدمات کی خوشی میں اپنی جوبلی سارنا ہے۔

پنڈی گھپ میں پریس کا نام و نشان نہ تھا۔ آپ یکہ و تمنا سے تیار کر کے ہر ماہ راولپنڈی آکر اسے

زیور انبلیع سے مزین کر کے خریدالان تک پہنچاتے۔ اس وقت کے پرچے جن اصحاب کے مطالعہ سے گزے ہوئے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ رسالہ مختصر صورت میں ایک دل بھانے والی چیز کا آغاز تھا۔ چونکہ قدرت کو اسے پروان چڑھانا تھا۔ اس لئے اسکی بہتری کا سامان خود بخود ظہور میں آیا یعنی ایس دی میں اول رہنے کی وجہ سے سردار صاحب کو گورنمنٹ سروس میں لیا گیا۔ اور آپ سنٹرل موڈل سکول لاہور میں ورنیکلر ٹیچر ہو کر آگئے۔ لاہور میں جہاں ہر قسم کی فضا حسبِ نواہ میا ہو سکتی تھیں۔ آپ نے رہنا کے تعلیم کی حالت کو اس وقت کے موافق سدھارا۔ اور غریبوں کی دل چسپی کا موجب ہوتے رہے۔ جن اتفاق سے قریشی طالب علی صاحب پابند جوان دنوں غالباً معین العباد نامی رسالہ نکال کر تے تھے۔ آپ سے ملے۔ اور انہوں نے سردار صاحب رہنا کے تعلیم کی مشترکہ خدمت گزاری کی آزدگی۔ چنانچہ ہر دو اصحاب کے اتفاق سے رسالہ ۱۹۲۲ء تک سررشتہ تعلیم پنجاب کی خدمات۔ احمد سین بھائیوں کی وکالت کے فرائض سر انجام دیتا رہا۔ اس موقع پر یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ قدرت کی فیاضی اس بزمینار کے شامل حال رہی اور سررشتہ تعلیم کے حکام اعلیٰ نے اس کی سرپرستی فرما کر اسے مستقر فرمایا۔ اور جہاں بیل صاحب نے اس کے جاری رکھنے کی اجازت عطا کی۔ وہاں آئریل سٹریجے سی گاڈلے نے تمام سرکار سکولوں میں اس کی خریداری کے لئے خاص سرکار جاری فرمائے۔ اور ان ہدایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہنمائے تعلیم کی اشاعت میں آئے سال اضافہ ہوتا گیا۔ سردار صاحب اور قریشی صاحب کے مشترکہ عہد میں رسالہ کا دوا بنامبر اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر نمبر خاص نمبر تھے۔ جن کی مزارا کا پیاں سررشتہ اور پنجاب ٹیلیٹ بک کمیٹی نے خرید فرما کر موبہ کے سکولوں میں بھجوا دیے۔ اور اس طرح رسالہ کی سرپرستی فرما کر اسکی شہرت میں اضافہ کیا۔

اس عرصہ میں اگرچہ مختلف اوقات میں چند اور تعلیمی رسالے بھی معرض وجود میں آئے۔ مگر حالات کے موافق نہ ہونے سے اپنی زندگی قائم نہ رکھ سکے۔ اسے رہنمائے تعلیم کی خوش قسمتی کو یا اس کے مالک اور قابل اڈیٹر کی نیک نیتی اور جذبہ خدمتگزاری، کہ اس نے جہاں ملک میں مضمون نگاری اور انشا پر دازی کا مذاق پیدا کیا۔ وہاں اپنے حالات کو بہتر سے بہترین جا کر اپنی ذات کو آفات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار کیا۔ غرض کہا جاسکتا ہے کہ سررشتہ ۱۹۲۲ء تک کا عرصہ رسالہ کی واحد خدمتگزاری کا عرصہ تھا۔ اپریل ۱۹۲۲ء سے قریشی صاحب نے اپنا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ اور قدتاً اپنے کام کو جاری رکھنے کے لئے انہیں اپنے پیارے رہنمائے تعلیم سے بھینٹا پڑا۔

مگر اس کی خوش قسمتی قابلِ شک ہے۔ کہ ایک دیرینہ رفیق کی سرپرستی سے علیحدہ ہو کر اسے بہت دلیں بٹکانا پڑا۔ بلکہ سردار صاحب کے اظہارِ حال پر لالہ لچھی چند صاحب و دیار متی نے اس کی اعزازی خدمتگزاری کا بیڑا اٹھایا۔ راقم الحروف کو بھی جون ۱۹۲۲ء سے ہی ویدیار متی صاحب کی رفاقت کا فخر حاصل ہوا۔ اور

رہنمائے تعلیم کی کارگزاری دو دوستوں کی بجائے تین ہاتھوں میں آگئی۔ جس کا پہلا ادب یہی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی صفحات میں مستند برقی ہوئی۔ چنانچہ سلسلہ کے پہلے پانچ چھ پرچوں کے مقابل میں اس کے آخری چھ پیچے بہت منظم نکلے۔ اور ان میں حالاتِ حاضرہ کے تمام کوائف۔ تحریکِ علمی کی اشاعت اور مفید عامہ مضامین کے ساتھ زیرِ تربیت اطفال کی پرورش اور ان کے مذاقی تحریر میں دل چسپی بڑھانے کی خدمت اس نے اپنے ذمہ لی۔ اور اسے اور اس کے علاوہ موجودہ ایڈیٹوریل سہیات کو بجا و غیر ہے کہ گلدستہ اطفال نامی حصہ رہنمائے تعلیم کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ جس کی تقلید میں اب کوئی تعلیمی رسالہ یا اخبار اس حصہ سے غفلت نہیں۔ اس کے دیگر مضامین اور مسودے بھی محضوں کی رہنمائی کا موجب ہوتے رہے۔ بلکہ بعض اجاب نے تو اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ کی نقل کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔

چونکہ مویہ میں رہنمائے تعلیم کے کسی محضرِ عالم وجود میں آچکے تھے۔ اس لئے بعض حالات میں فیما بین مقابلہ اور رشک کے ساتھ ایک سرحدی جذبہ کا وجود بھی منصفہ شہود پر جلوہ افروز دکھائی دیا۔ مگر رسالہ کی خدمتگداری اور اس کے قابلِ مالک کی ایثارِ نفسی ہے کہ وہ ہر ایسے کڑے امتحان میں پورا اترتا۔ اور زمانہ باتوں زاد تو بازمانہ بساؤں کے مقولہ کا عامل و قائل رہا۔ اس دور میں جسے رسالہ کی کیا پلٹ کا دور کہنا ہرگز بے جا نہیں۔ صوبہ میں بدستوری یا خوش قسمتی سے فرقہ داری اور جنبہ داری کا جذبہ ظہور میں آیا۔ اور اگرچہ رسالہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہا۔ مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسکی خدمتگداری اور اس کے جذبہ کارگزاری کی قدر اور منزلت اس کے حالات کے موافق نہ ہوئی۔ بلکہ بعض حلقوں میں اسکی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اسکی سرپرستی سے اعراض کیا گیا۔ ہر حال خدا کے کریم کی عنایات کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ وہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں کسی محضر سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ اسے دن نہ صرف اجاب سے بلکہ افسرانِ اعلیٰ سے بھی خراجِ تحسین و آفرین حاصل کرتا رہا ہے۔

اگرچہ سردار صاحب کو سرکاری ملازمت میں داخل ہوتے ہی سٹریڈیلو بیل ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی بارگاہ سے رسالہ جاری رکھنے کے احکام مل چکے تھے۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے (جس کا انداز اس وقت مناسب نہیں) اس کا ذکر بمیلٹیو کونسل پنجاب میں بھی جا پہنچا۔ اور رع

”ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اسل منحل میں ہے“

کا مقولہ اسکی ذات پر صادق آیا۔ چونکہ رسالہ کے جسرا سے مالی منفعت مقصود نہ تھی۔ بلکہ عامہ خلائق کی رہنمائی اور سررشتہ تعلیم پنجاب کے اغراض و مقاصد کی بجا اشاعت کے ساتھ کس مہر پر فرقہ دہشتیں کی وکالت اس کا منشا کے مقصود تھا۔ لہذا اسکی ذات پر یہ حملہ جو اسکے دوست و اصحاب کی عنایات کا نتیجہ تھا

اسکی استقامت کا موجب ہوا۔ اہل "خدا شریعے برانگیز" کو غیر مادیال باشد" کے مصداق، گورنمنٹ پنجاب (مذارت تعلیم) کی بارگاہ سے اس کے اجرا پر تقدیر کی مرثبت کی گئی۔ اور سردار صاحب کو اسکی خدمتگزاری کی اجازت از سر نو عطا کی گئی۔

نئے دور کا دور جدید اسکی شکل و صورت میں اضافہ کے علاوہ فخر الشعراء حضرت جوش لسانی اور طالب کشمیری کی شمولیت لئے ہوئے ہے۔ گزشتہ سال سے تاج الشعراء فصیح العصر خدا کے سخن حضرت فوج ناروی جانی داغ مرحوم نے اسے اپنی خاص سرپرستی میں لیا ہے۔ دو تین سال مولانا ادیب لوگافوی نے بھی شامل ادارہ رہ کر اس کی خوبیوں میں اضافہ فرمایا۔ مگر اپنی مصروفیات کی وجہ سے اسکی ہمراہی کو قائم نہ رکھ سکے۔ موجودہ حالت میں تعریف و توصیف میرا منصب نہیں۔ بلکہ اس کے مرتبوں اور قارئین کرام کا کام ہے۔ ابستہ یہ کہنا ہے جانہ ہوگا۔ کہ وہ رسالہ رہنمائے تعلیم جس نے سو بہ کے ایک گوشہ میں جنم لیا تھا۔ اپنے قابل و فیاض مالک کی آغوشِ محبت میں تربیت پا کر اس قابل ہو چکا ہے۔ کہ تعلیمی رسائل کی صف سے ممتاز ہو کر اپنی خدمات کے لئے ادبی دنیا کا منظور نظر ہو گیا ہے۔ اور ہر ذائقہ کار و دو دال اس کے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہونا باعثِ فخر و شادمانی خیال کرتا ہے اور اسکی تعریف میں بے اختیار طرب اللسان ہوتا ہے۔

اس کا جولائی نمبر اس امر کی شہادت ہے۔ کہ وہ چوٹی کے ادیبوں اور ملک کے یگانہ رو نگار نامشروں اور نظموں کا منظور نظر ہی نہیں، بلکہ وہ اسے اپنے شاہکاروں کی اشاعت کا بہتر سے بہترین ذریعہ مانتے ہیں۔ اور اس کے عنایت فرماؤں کا حلقہ نہایت وسیع اور انکی عنایت اس کے حال پر اس طرح سے مبذول ہو رہی ہیں۔ کہ اس کے سران کے شکر یہیں خود بخود جھکا ہوا ہے۔ اور وہ مصداق "خاموشی اذ ثلثے توعد شائے شت" دل ہی دل میں ان کی توجہات کا شکر ادا ان کی ایزاد بی جاہ و جلال کا داعی ہے۔

(سچد پوا)

حضور گورنر پنجاب پر مہلک حملہ

۲۳ دسمبر ۱۹۳۱ء پنجاب یونیورسٹی کانفرنس کی صدارت فرما کر جب ہزار سالہ سنی ریحہ فری ڈی مانت غازی گورنر پنجاب چانسلر یونیورسٹی حسب معمول جلوس کی صورت میں یونیورسٹی ہال سے تشریف لے جانے لگے تو کسی شوریدہ سرنوجوان نے ہال کے اندر سے ہی خود بخود پستقل سے فائر کئے جس سے نواب حضور دالاکے بازو اور پشت پر زخم لگے۔ خوشی کی بات ہے کہ نواب گورنر بہادر اس مہلک حملے سے بال بال بچ گئے۔ جس پر حضور کی خدمت میں رہنمائے تعلیم اور اس کے کارکنان خصوصی دلی سے مبارک بلا عرض کرتے ہیں۔

اس مہلک حملے پر اظہارِ نفرت اور حضورِ رموز کی خدمت میں مبارک بلا عرض کرنے کے کئی دینرو بیوش محبوبہ کے سکولوں اور افسانہ تعلیمی کی کڑ سے محول ہوئے ہیں۔ مگر جولائی نمبر کے پریس میں جانچنے کی وجہ سے ہم تفصیلات اس جاننے سے محضوریں۔

(سچد پوا)

رہنمائے تعلیم

(فصیح العصر ناخداۓ سخن تلج اشعرا حضرت نوح ناروی جانشین جناب لغ دہلوی)

ساقی مرے حال پر نظر کر	ساقی نگہ کرم ادھر کر
ایک ایک ہوس نکال ساقی	میںاوس بونبھال ساقی
ساقی یہ نہیں مناسب ابے	ساقی یہ نہیں نہیں غصہ ہے
ناکام ہو شاد کام ساقی	دے دے مجھے کوئی جام ساقی
مطرب نہ زباں سے کچھ کہے کیوں	مطرب سر برزم چپ ہے کیوں
خاموش عبث ہے گائے مطرب	رُوپوش کہاں ہے آئے مطرب
مطرب کی صدا بھی قمر ڈھائے	مطرب کی ادا بھی قمر ڈھائے
اف غمزہ شوخ و ناز مطرب	گذری حدِ احتراز مطرب
زہاد سے رند لڑ چکے ہیں	توبہ کے قدم اکھڑ چکے ہیں
تقوے کا لحاظ و پاس کس کو	لے کون خبر حواس کس کو
بگڑی ہوئی عادتیں ہیں سب کی	بدلی ہوئی نیتیں ہیں سب کی
کل کے لئے فکر آج کیسی	مے خوار کو احتیاج کیسی

میں مخوش طبعینے والے پیتے ہیں شراب پینے والے
 بھٹی سے دھواں نکل رہا ہے پیمانے کا دور چل رہا ہے
 گردوں پر اٹھا وہ ابر کیسا جب ابراٹھا تو صبر کیسا
 جوشے ہے وہ حسبِ حال شے ہے شیشہ ہے جدید کہنہ مے ہے
 دم عیش و خوشی کا بھرنے والی بوڑھوں کو جوان کرنے والی
 دن رات تنگ اور دل ہے ہے دل کی امنگ اور دل ہے
 افکار سے دور ہے زمانہ ممنون سرور ہے زمانہ
 گلزارِ جہاں کے رنگ بدلے سورنگ سے رنگ ڈھنگ بدلے
 نکھر رہی بہت چمن کی صورت گویا ہے نئی دہن کی صورت
 ہر سمت صبا پکار آئی دوڑو چلو پھرو بہار آئی
 عالم ہے عجب کلی کلی پر نزہت ہے فدا شگفتگی پر
 لالے کے جگر کا داغ چمکا جو گل نہ ہو وہ چہرہ غم چمکا
 انگڑائیاں سبزہ لے رہا ہے شبنم کو دعائیں دے رہا ہے
 کیا خوب ہے سادگی سمن کی مرغوب ہے وضع سترن کی
 ظاہر میں حنا کا ڈھنگ کچھ اور باطن میں حنا کا رنگ کچھ اور
 سوسن کی زبان کھل گئی ہے پھولوں کی دوکان کھل گئی ہے

بیلوں میں ہے پیچ و خم بلا کا
 کس کام کے آبدار موتی
 شمشاد کا مرتبہ بڑا ہے
 حسرت نہیں خار کو غلش کی
 ٹھک جاتا ہے جس سے آسمان تک
 پتی جو ہے وہ ہری بھری ہے
 دنیا سے جدا انار کا حسن
 جوہی ہے کھلی چمیلیوں میں
 ریحان میں ہے آن بان کیسی
 بھونروں کا اڑھسرا دھر ہے مجمع
 گو حوض میں غرق سر بسر ہے
 چمپا کا بناؤ ہے نرالا
 موقع سے دھرے ہوئے ہیں گلے
 نکھت کا خزانہ کینکی میں
 گھنگھور گھٹا تر فلک ہے
 چھڑکاؤ کا لطف مل رہا ہے
 انداز ہے کامل دوتا کا
 میں موتیے پر نشا ر موتی
 پیرے کو یہ سنتری کھڑا ہے
 دل چپ روش روش روش کی
 ہے سرو میں سر کشی یہاں تک
 اک حور ہے دوسری پری ہے
 عالم سے الگ چنار کا حسن
 رانی ہے سکھی سیلیوں میں
 سنبل میں ہے کھینچ تان کیسی
 کم تر نہیں بیش تر ہے مجمع
 کب نقش بر آب نیلو فر ہے
 شبنم کا بھاؤ ہے نرالا
 پودوں سے بھرے ہوئے ہیں گلے
 مہتاب کا نور چاندنی میں
 بجلی کی تڑپ چمک دمک ہے
 فواروں کو جوش اگیا ہے

سب اونچے سمروں میں گلے ہیں بے پر کی طیور اڑا رہے ہیں
 کو کو بھی ہے اور پنی کماں بھی نغے کی ہے شکل میں فغاں بھی
 دنیا کی ہوا بدل گئی کیوں جو پچانس تھی وہ نکل گئی کیوں
 پہل سی مچی ہوئی ہے کیسی شادی سی رچی ہوئی ہے کیسی
 کیوں بزم ادب عروج پر ہے کیوں حسن خیال نظر ہے
 کیوں نظم کا قدر داں ہے عالم کیوں شرکامح خواں ہے عالم
 اسرار نہاں وہ کھولتا ہے جوتار رباب بولتا ہے
 محفل میں ہیں جمع اہل دل کیوں بیٹھے ہیں قریب و متصل کیوں
 تعلیم کی داستان زباں پر تعلیم کی خوبیاں زباں پر
 تعلیم کا ذوق ہر کسی کو تعلیم کا شوق ہر کسی کو
 تعلیم کے مرتبے بڑے ہیں تعلیم سے کام بن پڑے ہیں
 تعلیم وسیع سلطنت ہے تعلیم خراج مملکت ہے
 تعلیم نہیں تو کچھ نہیں ہے تعلیم نہیں تو کچھ نہیں ہے
 تعلیم سے باتھ دھو چکے تھے تعلیم کو لوگ رو چکے تھے
 رائج تھے وہی قدیم دستور نافذ تھے وہی قدیم دستور
 تہذیب جدید کی نئی شان ہر شان میں بھی کئی کئی شان

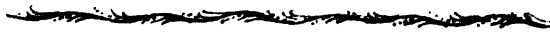
جو کورس ہے ٹھیکے پہچانے اسکول جو ہے بہت سہا ہے
اور اوراقِ کتاب پر نگاہیں تقسیم حساب پر لگا ہیں
جغرافیہ رٹ رہا ہے کوئی تاریخ السط رہا ہے کوئی
ہشیار تھے ماسٹر جگت سنگھ سمجھے اے پیشہ جگت سنگھ
ذی علم ہیں ذی ہنر بھی ذی جاہ ہیں اور ذی اثر بھی
سب طور طریق جانتے ہیں پایاب و عمیق جانتے ہیں
لذاتِ جہاں کے چکھنے والے کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے
کوشاں یہ ہوئے برائے تعلیم جاری کیا رہنمائے تعلیم
دل چسپی امتیازِ تعلیم سرگرمی سوز و سازِ تعلیم
ہمراہ میں وقت پر نکلتا افکار ہوں کچھ مگر نکلتا
حاضر ہے یہاں و ہاں سالہ جات ہے کہاں کہاں رسالہ
اربابِ غرور کا مدعا ہے یارانِ سخن کا آسرا ہے
مضمون کوئی ادق نہیں ہے دشوار کوئی سبق نہیں ہے
ان میں ہے وہی نفیس اردو کہتے ہیں جسے سلیس اردو
پاکیزہ ہے خط و عبارت اچھی اچھا ہے قلم و کتابت اچھی
پچیس برس گزر گئے ہیں آفاق میں نام کر گئے ہیں

ہے وجہ یہی ہنسی خوشی کی
یہ جشنِ طرب فزا مبارک
یہ عیش ہو جاوداں مبارک
و دیا رختی ہیں میرا اس کے
بے مثل و نظیر لکھنوی چمن
اقبال ہے خودنشاں ان پر
تکمیل کمال کس قدر ہے
آبادہ کار آگیا رام
سمجھاتے ہیں نیک و بد ہمیشہ
اخلاق و وفا سے کام لینا
طالب کی طلب کا پوچھنا کیا
مصرفِ توجہات رہنا
توسیعِ ہنر کی آرزو ہے
کیا وصفِ جنابِ جوش لکھئے
انذارِ کلام اثر میں ڈوبا
ہر مطلع ہے آفتابِ ان کا

تقریب ہے آج جوہی کی
یہ بزم جہاں منا مبارک
یہ وقت ہو یہ سماں مبارک
سو جی ہے میں دستگیر اس کے
حامی و مدیر لکھنوی چمن
ہے رحمتِ کردگار ان پر
بی اے ہیں یہ وصفِ مختصر ہے
باغزوہ باوقار آگیا رام
فرماتے ہیں رد و کد ہمیشہ
جو گرتے ہوں ان کو تھام لینا
اسلوب و سبب کا پوچھنا کیا
دن رہنا اسی میں رات رہنا
کھوئے ہوئے فن کی جستجو ہے
غارتِ گر صبر و ہوش لکھئے
نشر کی طرح جگر میں ڈوبا
ہر مقطع ہے لاجواب ان کا

جو مصرع ہے انتخاب سے، وہ جو شعر ہے کامیاب سے، وہ
 جو حرف وہ حرف دل نشیں ہے جو لفظ وہ لفظ نازنیں ہے
 ترتیب غزل ہو ست کیونکر تخیل ہو نادرست کیونکر
 خوش منکر میں خوش دماغ یہ ہیں شاگرد رشید و آغ یہ ہیں
 اسلاف کی یادگار ٹھہرے تاج سرافتخار ٹھہرے
 کتنا تھا جو کچھ وہ کہہ چکائیں اللہ سے مانگ لوں دُعا میں
 جاری رہے حشر تک رسالہ چھپتا ہے بے دھڑک رسالہ
 ہر باغ میں پھیلے نکمت اس کی ہر ملک میں پہنچے شہرت اس کی
 مشتاق لقا ہو سارا عالم قربان و فدا ہو سارا عالم
 یارانِ ادب رہیں سلامت سب غمیں رہیں سب رہیں سلامت
 پھر دیکھیں ہمارے جولائی کی پھر آئے گھڑی ہنسی خوشی کی

پھر لطف اٹھائے روح اپنی
 پھر دھوم مچائیں لوح اپنی



ارشاداتِ عالیہ

عالمِ انجمن جلیل القدر نواب فصاحتِ جنگ بباد حضرت جلیل اتذا السلطان فرمانروائے دکن

وہ اُن کا پیار سے ملنا وہ ہم آغوش ہو جانا
ہوا اچھا مرے حق میں جنوں کا جوش ہو جانا
عجب استاد ہے تھی جبری تیری جوانی بھی
کریں وہ قتل کیوں کر رشک سے دیکھا نہیں جاتا
دمِ نظارہ آجائے جیالے جاں تو آنے دو
بھلا دیتا ہے ساری کلفتیں شہائے جہاں کی
وہ زانو پر دھرے ہیں سرِ راقست یہ کہتی ہے
فقط شب بھر کی روف ہے یہ ساری بزمِ تہی کی
اثر ہو یا نہ ہو لے بلبلِ ناشاد کیسے کم ہے
رہے محفوظ رازِ بزمِ خلوتِ دعا یہ ہے
ترشکِ خیالی بھی نہیں کم تجھ سے شوخی میں
ابھی نظروں میں پھرنا اور ابھی روپوش ہو جانا

حقیقت میں پتہ دیتا ہے درپردہ محبت کا

جلیل اُن کا تھائے نام پر خاموش ہو جانا

RISALA "RAHNUMA-I-TALIM"
Ramgali, LAHORE.



استاذ السلطان نواب فضالت بیگ، پیر جلیل القدر حافظ جلیل حرم صاحب جلیل جان شین حضرت امیر متائی



فہرست مضامین

- بہشت کی تلاش نا نصاحب جعفر ناغل محمد خاں بی لے پنی ای ایس پی ٹی ایس پی ٹی
- ہیڈز ٹرننگ کالج شیخ خادم محمد الدین حبیب ایم پی ٹی (ہیڈز، بی لے بی ٹی ریجنل، ص ۵۴)
- تدریس اردو صوفی غلام مصطفیٰ صاحب قہتم ایم لے ص ۵۵
- ہندستان میں فنی تعلیم مولوی امام الدین صاحب فنی فاضل ص ۵۹
- جیومیٹری کا ایک اہم سوال لالہ موہن لعل صاحب بی لے بی ٹی پی ای ایس ص ۶۰
- فن تحریر مولوی محمد وحید صاحب کیلائی بی لے ص ۶۱
- مدرسہ طلبہ و دودو باتیں لالہ رام چند صاحب بی لے پی ای ایس ص ۹۱
- حیدر آباد دکن کا تعلیمی مستقبل خالصہ عبدالرحمن ایم لے - پرنس عثمانیہ یونیورسٹی ص ۹۲
- ہمارا ذریعہ تعلیم مولوی عبدالقادر صاحب سرور ایم لے ایل ایل بی ص ۹۹
- قصہ تعلیم کا سنگ نبیلو مولوی عبدالغنی صاحب اصغر ص ۱۱۰
- ایک ضروری گزارش سردار اکرم سنگھ صاحب بی لے بی ٹی پی ایس ص ۱۱۱

- ۱۳۶۔ پنجاب میں لڑکھنوی تعلیم - لالہ تلوک چند صاحب بی لے۔ بی ٹی
- ۱۳۷۔ ہمارے تعلیم - کھوسٹ
- ۱۳۸۔ ہمارے امتحانات - سید اشفاق حسین صاحب بی لے۔ بی ٹی
- ۱۳۹۔ معلم اور معلم - سو دھی جگت سنگھ صاحب بی لے۔ بی ٹی
- ۱۴۰۔ تعلیم میں حق سچائی کی پروا نہ تھی - سید اصغر علی صاحب بی لے۔ بی ٹی
- ۱۴۱۔ سکھوں کا کیا ہوتا ہے - پنڈت مرنی دھر صاحب موہن بی لے
- ۱۴۲۔ تدریس ہندوؤں کا طریقہ تعلیم - سید غلام حسین صاحب رضوی ایم لے
- ۱۴۳۔ حساب کی درست تعلیم - لالہ برکت رام صاحب کھوسٹ بی لے بی ٹی پی ایس ایس
- ۱۴۴۔ تعلیم بچکان - مشر ہریش چند سنگھ لکھل ایم لے۔ بی ٹی
- ۱۴۵۔ ابتدائی طبیعت اور مہیاں - لالہ ہر دیال صاحب چوہدری بی لے۔ پی ای ایس
- ۱۴۶۔ تعلیم کا اصل مدعا - چوہدری پران ناتھ صاحب دت ایم لے
- ۱۴۷۔ ہمارا لکھنوی تعلیم کیوں کر رہا ہو؟ - مشر ایس۔ ایس شرم ایم لے۔ بی ٹی
- ۱۴۸۔ اسکولوں میں مضامین کی تعلیم - مولوی غلام ناصر صاحب نگار بی لے
- ۱۴۹۔ دیہاتی ترقی و ترقی و ترقی - لالہ رام سنگھ صاحب دھندہ بی لے۔ بی ٹی
- ۱۵۰۔ استاد اور قومی ترقی - چوہدری محمد عبد اللہ صاحب بی لے۔ لاہور، بی ٹی
- ۱۵۱۔ معجزہ - لالہ ام ناتھ صاحب قدیش موہن بی
- ۱۵۲۔ مسئلہ نیا نخواست - مولوی محمد عزیز الدین صاحب سٹرل ماڈل سکول لاہور
- ۱۵۳۔ تعلیمی رپورٹ - لالہ ہادی لال صاحب علم ریاضی نورمل سکول حصار
- ۱۵۴۔ طریق تعلیم کی ترقی -
- ۱۵۵۔ پنجاب کی تعلیمی حالت -
- ۱۵۶۔ اردو نثر پر دہائی - قاضی مستح محمد صاحب فاتح منشی فاضل اے بی
- ۱۵۷۔ تعلیم پر سب کی سہمہ - سچدیا

بہشت کی تلاش

(خانصاحب راجہ فاضل محمد، خاں صاحب - بی۔ اے۔ پی۔ اے۔ ایس۔ ایس۔ ڈی اسپیکٹر مدراس جالندھر ویشن)
 کسی معلم کا قول ہے کہ ”اعلیٰ درجے کی نتیجہ خیز تعلیم وہ ہے جو کسی قوم یا جماعت کی اُس جدوجہد کی مظہر ہو۔ جس سے اُس کی تہذیب - اس کا تخیل اور اس کی تمثیل کا اثر آئینہ والی نسلوں پر پڑے۔“ یوں تو تعلیم بنی نوع انسان کی آفرینش کے وقت سے ہی اُس کے لوازمات زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ اور کمبتوں - پاٹ شالوں - مسجدوں اور مندروں کی تقدیس کا بنیادی پتھر ہی رہا ہے۔ مگر زمانہ کی بدلتی ہوئی ضروریات اور انسان کی نرت نئی خواہشات کے ساتھ ساتھ تعلیم کا نصب العین بھی تغیر پذیر ہوتا رہا۔ اگر کسی وقت تعلیم مذہب کے صحیح اور اک اور صفات الہیہ کے بالتوضیح انعکاس کیلئے ضروری سمجھی گئی تاکہ انسان حسن معاد کیلئے تیار ہو تو ایک وقت یہ بھی آیا کہ اُسے حصول معاش کا ذریعہ سمجھنا پڑا۔ یہ دونوں وقت آنا فانا دھل گئے۔ اور تعلیم کا نقطہ نگاہ وسعت پذیر ہونے لگا۔ اور وہ نسل انسانی کے بہترین ذرائع ارتقا کا مصدر سمجھی جانے لگی۔ الغرض اس کے مقاصد ضروریاتِ وقت کے لحاظ سے کسی نام سے موسوم ہوئے ہوں مگر حقیقتاً اس کا عام مدعا انسان کی حالت کو بہتر بنانا اور زندگی کو خوش اسلوبی سے بسر کرنا سکھانا ہے۔ چنانچہ نتیجہ خیز تعلیم وہی ہو سکتی ہے جس کا انجام اس مدعا کا حصول ہو۔ ایسی تعلیم جس قوم یا جماعت کے افراد کا مطلوب بنے اُن کی جدید سے اس امر کا پتہ ضرور چلنا چاہئے کہ اُن کی تہذیب ان کی سوچ بچار - اُن کا تفکر و تدبیر - اور اُن کا غور و خوض آئینہ والی نسلوں کی بہتری اور بہبود کیلئے ہے۔ اور اُن کے بچوں کی جسمانی - روحانی اور دماغی ترقی اُن کی دلی تمنا ہے۔

اس ملک میں موجود نظامِ تعلیم قریب قریب ایک صدی سے جاری ہے اور اب اس بات کے پرکھے کا وقت ہے کہ اس کے نتائج مذکورہ بالا معیار کے مطابق کس حد تک امید افزا ثابت ہوئے۔ بالفاظِ دیگر جاری بدلتی ہوئی تہذیب - ہمارا جدید تخیل اور ہماری نئی تمثیل آئینہ والی نسلوں پر کہاں تک اثر ڈالنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ آیا ہمارے بچے اور نوجوان اس معیار کے مطابق شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں اور آئینہ پیدا ہونے والے بچوں کے قابلِ باپ بن رہے ہیں؟ - تعلیم نے گزشتہ تیس سال میں کئی کی سی سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے۔ مگر کیا اُس کا انجام وہی نظر آ رہا ہے جو ہمارا مدعا ہے؟ پیشتر اس کے کہ اس قسم کے سوالات کے جوابات زیر غور ہوں۔ اور تعلیم حاضری کی خصوصیات کسی معیار پر پرکھی جائیں ہمیں دیانت داری سے سوچنا چاہیے۔ کہ آیا ہمارے تخیل کی پرواز بہارِ نصب العین سے بخوبی آشنا ہے۔ اور اُس کے مفہوم کو کما حقہ سمجھ کر اُس کے حصول کے ذرائع پر قائل و یافتمہ ہے کیونکہ

انسان کو کسی مدعا تک پہنچنے کے لئے بھی دو مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ یعنی تخیل مدعا اور تعین مدعا۔
تفصیل مدعا کے لئے جدوجہد ازاں بعد شروع ہوتی ہے۔ جب مدعا حاصل ہو جائے تو پھر اس پر پڑتال کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کہ آیا نتیجہ حسبِ مراد ہے اور ہماری تمنا برآئی ہے؟
نظر یہ امور بالا جو تعلیم ان خصوصیات سے معزا ہوگی۔ وہ تعلیم تعلیم کہلانے کی مستحق نہیں کیونکہ اگر ہماری موجودہ نسلوں نے اس تعلیم سے اُن باتوں پر عمل پیرا ہونا نہیں سیکھا تو ہماری آئینوالی نسلوں کی بہتری کا بیج ابھی نہیں بویا گیا۔ مدرسوں کے اجراء طلباء کا نام ہی تعلیم نہیں۔ گو اب تک لفظ تعلیم کا مفہوم یہی ہے۔ اور ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اسی غلطی میں مبتلا ہے۔ مدرسوں میں طلباء کا باقاعدہ جاننا اور دن کا کچھ حصہ مدرسے کے انضباط اوقات کے لحاظ سے وہاں گزارنا۔ چند مضامین کا رٹ لینا اور امتحان پاس کر لینا تعلیم یافتگی کی سند نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ صدیوں پہلے ایک بزرگ فرما گئے ہیں کہ کتابیں گدھے پر بھی لاد سی جاسکتی ہیں اور کتابوں کے زیر بار ہو کر گدھا انسان نہیں بن سکتا۔

لہذا صورت سوال یوں ہوتی۔ کہ صحیح معنوں میں تعلیم آئے تو کس طرح؟ اور موجودہ یا آئندہ نسلیں ان معنوں میں اصلی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں تو کس طرح؟ اس کا جواب راہنمایان تعلیم کے لائحہ عمل کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ اور انہیں اپنی اپنی ذات پر انکشافی نظر دوڑا کر دیکھنا چاہئے کہ وہ صحیح معنوں میں راہنما کہلانے کے مستحق ہیں۔ جس طرح ہر مدد تعلیم گاہ نہیں ہو سکتا اسی طرح ہر مدرس معلم نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ہر شخص صرف پودے کو پانی دینے اور کھاؤ ڈالنے اور ملائم موسم کی سختی سے اس کو بچانے سے باغبان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صحیح باغبانی کے لئے اس علم اور عمل کی ضرورت ہے جو پودے کے صحیح بیج کی شناخت۔ اس کے بونے کے موسم۔ اس کے نشوونما۔ اور اس کے پھل کے امتیازی علامات کے پیدا کرنے میں مدد ہو۔ اگر پودے کی آئندہ بہتری اور اس کی جنس کی ترقی باغبان کی محنت پر منحصر ہے تو انسانی بچے کی منازل ارتقاء حاکم کی جانفشانی اور جگر سوزی کی طالب علم کی تکمیل اگر طالب علم کا مدعا ہے تو اس مدعا کے حصول کا تخیل اور تعین معلم کے معلومات کا نقطہ نگاہ۔ جب تک کہ معلم ہمہ دانی کے بلند مینار سے اتر کر طالب علم کی پیچیدہ دلی کے تاریک و تاریک غار کے مختلف کونوں میں اس کی طبیعت کے جواہر ریزوں کی تلاش میں سر نہ مگرائے اور ان کو اپنے علم کی برقی تاثیر سے جلا دینے کی محنت شاقہ برداشت نہ کرے۔ اور طالب علم کو ارتقاء جسمانی اور روحانی کی سیڑھیوں پر نہ نہ چڑھائے۔ وہ معلم کہلانے کا مستحق کیونکہ ہو سکتا ہے۔ اگر مدرس یہ مصیبتیں ملک کے جوانوں پر نہ کرے تو مدرس کی سرزمین کے کسی نہ کسی گوشے سے اُس گمشدہ بہشت کا پتہ چلیگا جہاں تک پہنچنے کی مثالیں نوجوان محنت۔ جدوجہد و استقلال تخیل اور خود ضبطی کا زار و راہ ہٹا کر نے کی کوشش کرینگے۔ اور اُن کا سلجھا یا ہڈا و داغ اُن کے لئے خضر راہ کا کام دیکھا۔ وہ اپنے خواستِ محسوس کو صحیح طور پر استعمال کرنا سیکھینگے۔ اور محسوس

اور تحقیق کے دشوار گزار رستوں سے ابدی اطمینان اور اصلی تسکین کی وراثت حاصل کر بیگے خوش نصیب ہے۔ وہ ٹمک جس کو ایسے معلم حاصل ہیں۔ اور جس ٹمک کی قسمت میں ایسے مدرس نہیں۔ اور جہاں ایسے مدرس نہیں۔ اُن کے نوجوان ”گم شدہ بہشت“ کا پتہ لگانے میں سچی مدد حاصل سے کام لے رہے ہیں۔ اور وہاں آئینوالی نسلیں وراثتاً اس بہشت کو حاصل کرنے کے ناقابل۔

پس ہر مدرس کا فرض اولین جب وہ اس پیشے میں داخل ہو یہ ہونا چاہیے کہ وہ طلباء کو ایسے رستے پر چلائے جو سیدہ مذکورہ بالا منزل مقصود کو جاتا ہو۔ اس مطلب کے حصول کے لئے مدرس کو جہاں اپنے ذاتی علم کی وسعت کی ضرورت ہے۔ وہاں اس کے لئے ہر قدم پر اپنے طلباء کی فطرت۔ رجحان۔ طبیعت اور اُن کے میلان۔ جذبات کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاکہ ان قدرتی عطیوں کو وہ ایسے ڈھنگ سے استعمال کر سکے۔ کہ طالب علم کی طبعی جستی اور دلی شوق اس کے رفیقِ راہ بنیں۔ اور وہ دوسروں کے ساتھ ملکر ایسی خوش اسلوبی سے وہ راستہ طے کرنا سیکھے۔ کہ اس کے ہمراہی اُس کی مثال کی پیروی کریں۔ اور اس طرح سب ملکر ”بہشت“ میں داخل ہوں۔ یہ ہے۔ قومی یا جماعتی ترقی کا راز۔ اور مدرس ہے اس راز کے سنہری دروازوں کا کلید بردار۔

پس

اے بہشت کے کلید بردار! اپنی ذمہ داری سمجھو۔ اور بہشت کے ڈھونڈنے والوں کی حمایت کے فرض سے سبکدوش ہو کر بہشت کا وارث بن اور بتا۔ تاکہ تیری مقبوضہ دودھ کی نہروں سے موجدہ اور آئندہ نسلوں کی پیاس بجھے اور تیرے میوہ دار درختوں سے اُن کی بھوک کا علاج ہو۔ یہ ہے۔ تیری امانت۔ جس کا یادگار اُن تو نے برضاے خود اپنے کندھوں پر لیا ہے۔ اُس میثاق کو یاد کر۔ جو اس امانت کا زمین بننے وقت تو نے بنی اور اُس کے ساتھ باندھا تھا۔

سلک مروارید

- ۱۔ اگر کوئی غلطی تم سے ہوگئی ہے۔ تو اس کو حزبِ یاد رکھو۔ کہ آئندہ پھر نہ ہونے پائے۔
- ۲۔ تہذیب و اخلاق ایک انسانی جوہر ہے۔ جس کو انسان خود حاصل کر سکتا ہے۔
- ۳۔ نیک ذریعے سے اگر تھوڑا بھی ملے۔ تو اس کو بہت سمجھو۔

(گنگا رام عطیشی پور)

لیڈز ٹریننگ کالج

(جناب شیخ خادوم محی الدین صاحب - ایم - اسی ڈی انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور)

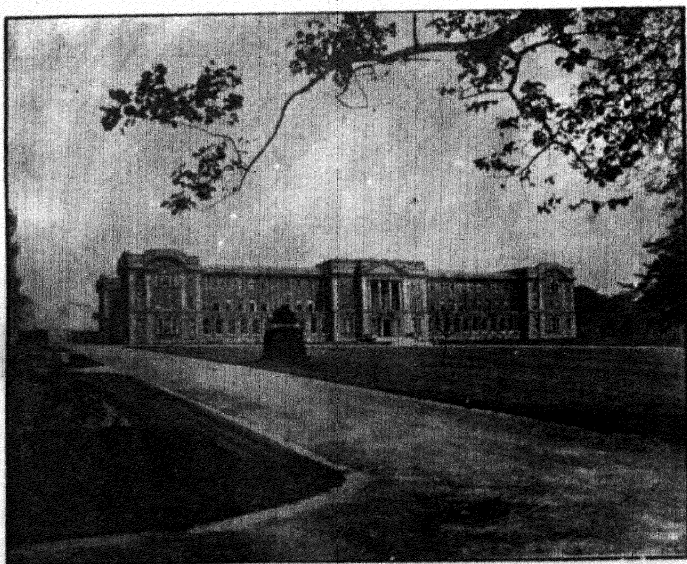
انگلستان میں لیڈز کا ٹریننگ کالج یورپ بھر میں اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ کالج اُن عورتوں اور مردوں کیلئے مخصوص ہے جو پبلک ایلیمنٹری (ابتدائی) سکولوں میں بحیثیت مدرسین کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اس کالج کی مجلس منتظمہ، لیڈز کی تعلیمی کمیٹی کے ماتحت ”ٹریننگ کالج سب کمیٹی“ کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۹۰۷ء میں وہاں کی تعلیمی کمیٹی نے ایک عارضی کالج قائم کیا۔ تاکہ اُس میں مدرسین تربیت پائیں۔ پہلے پہل وہاں کے ایک زنانہ ہائی سکول سے عارضی طور پر ٹریننگ کالج کا کام لیا گیا۔ بعد ازاں اسی کالج کی مستقل بنیاد قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اگلے ہی سال اس عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ ایک مخصوص کمیٹی کو کالج کے محل وقوع کا انتخاب کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اُنہوں نے شہر کے ایک پُر فضا حصے میں جس کا نام ”بیکٹ پارک“ ہے۔ ایک معزز رئیس سے چالیس ایکڑ زمین خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد کھیل کے میدانوں کے واسطے مزید زمین چیمپا کی گئی۔ اور اس وقت اس ٹریننگ کالج کی مجموعی جائیداد مع عمارات وغیرہ نوے ایکڑ زمینیں پھیلی ہوئی ہے۔

محل وقوع

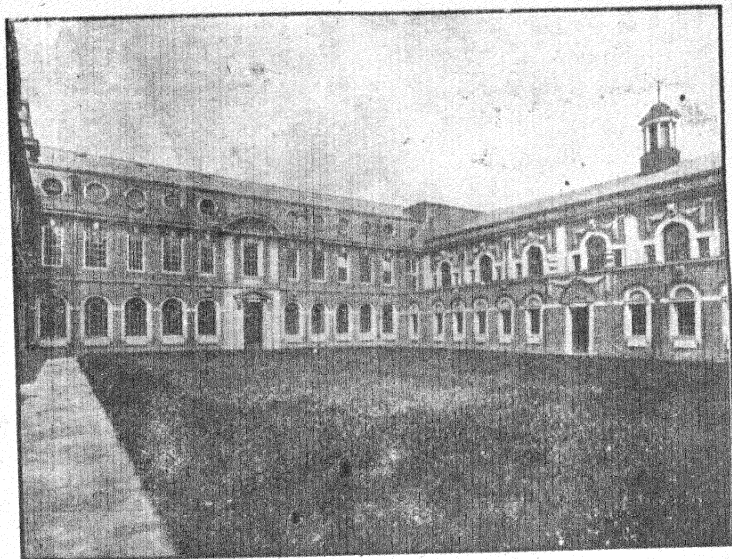
کالج کا محل وقوع ایک بلند اور صحت افزا مقام ہے۔ جو ایسی در سگاہ کیلئے خاص طور پر موزوں ہے۔ یہ کالج ۴۴ ایکڑ کے ایک وسیع اور پُر فضا پارک کے مرکز میں شہر کے رُخ پر واقع ہے۔ یہاں کی فضا خاموش ہے اور اس کے مشرقی شمال اور مغرب کی جانب میں میل کا ایک زراعتی رقبہ دوڑ نک چلا گیا ہے۔ کالج میں نیچر سٹڈی۔ باغبانی۔ نخل بندی۔ اور علم نباتات کیلئے ایک خوبصورت باغ ہے۔ طلباء کے کھانے کی سہولیات اُسی میں بولی جاتی ہیں۔ پانی کا انتظام خاطر خواہ ہے۔ یونیورسٹی، مدارس، مارکیٹ، غرض سبھی طرف سے یہاں تک پہنچنے کے راستے ہیں۔ سب سے پُر لطف نظارہ اس کے ارد گرد کے وسیع جنگلات ہیں۔ جن میں سے مختلف اطراف میں سیرک ہوں کے راستے نکلتے ہیں۔ جابجا درختوں کی بہتات ہے۔ جن کے نیچے ٹوہم گرمائیں طلباء بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ایک راستہ ”ملکہ کا راستہ“ کہلاتا ہے کیونکہ یہاں ۷ ستمبر ۱۹۱۷ء کو ملکہ وکٹوریہ آنجہانی لیڈز کے ٹاؤن ہال کا افتتاح کرنے کیلئے تشریف لائی تھیں۔ اسی طرح ملک معظم ایلڈورڈ، مہتمم اور ملکہ الگزینڈرا نے بھی اپنے ورور مسعود سے کالج کو شرف بخشا۔



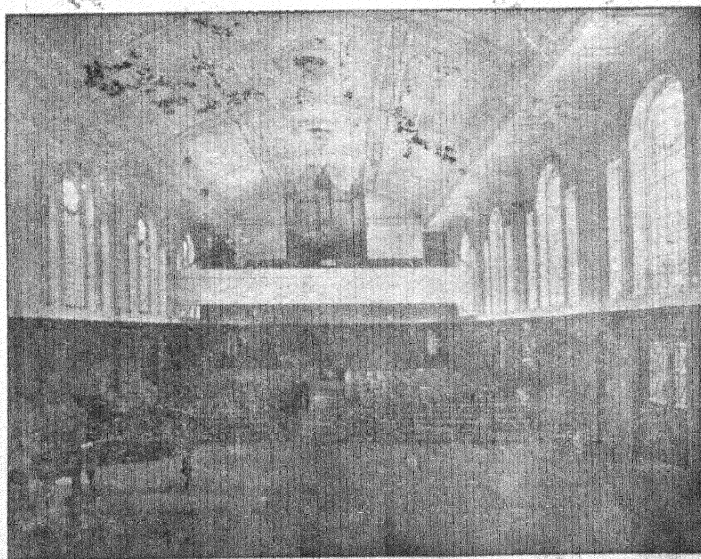
کھیلوں کے میدان کا داخلی راستہ



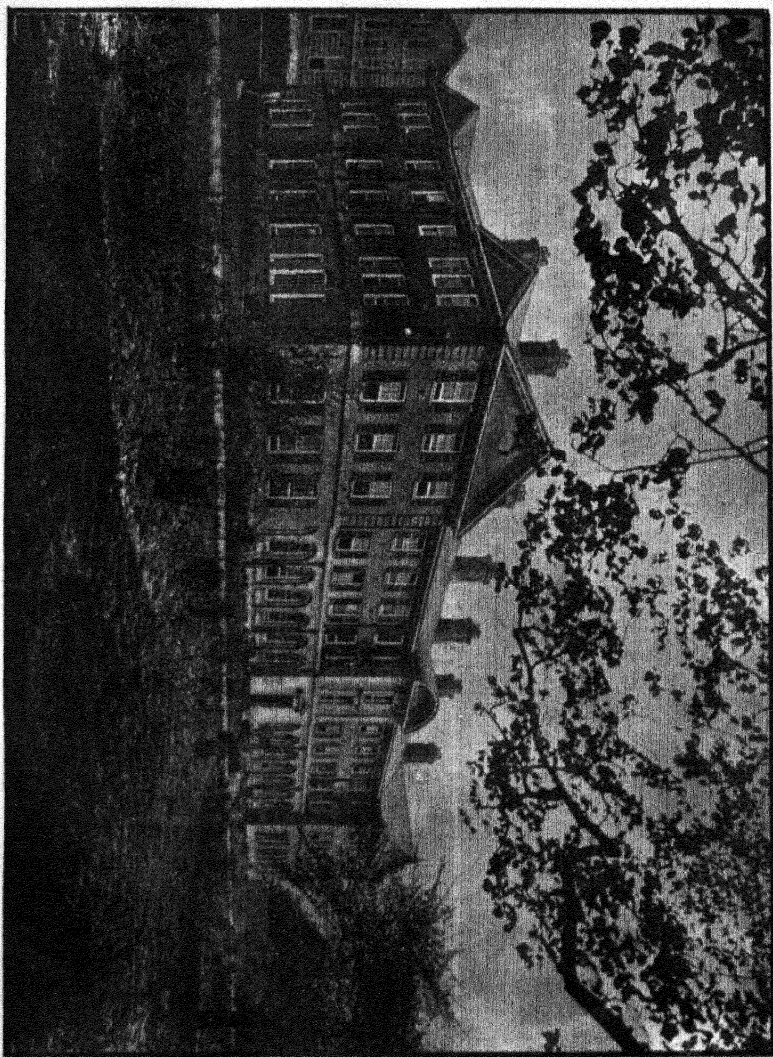
کالج کا بیرونی منظر



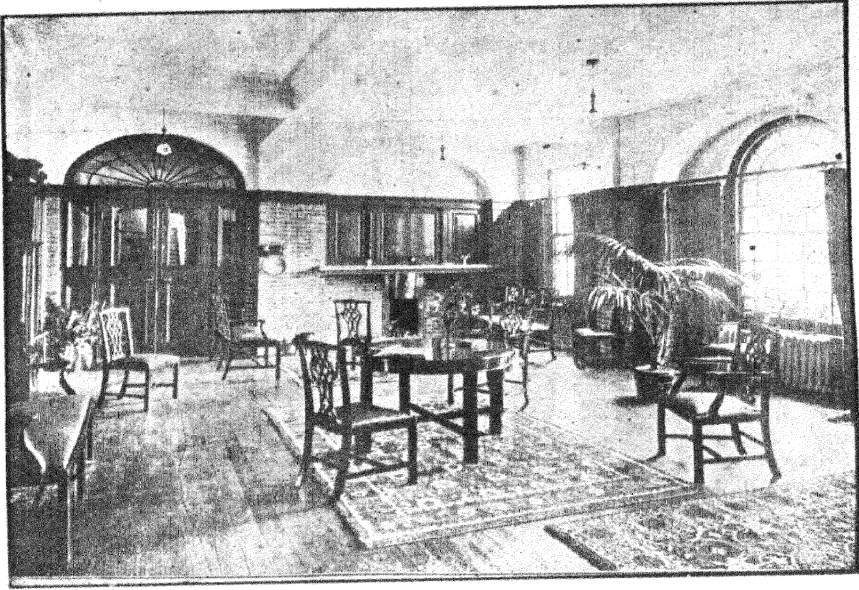
کالج کا اندرونی منظر



کالج کا حال کمرہ



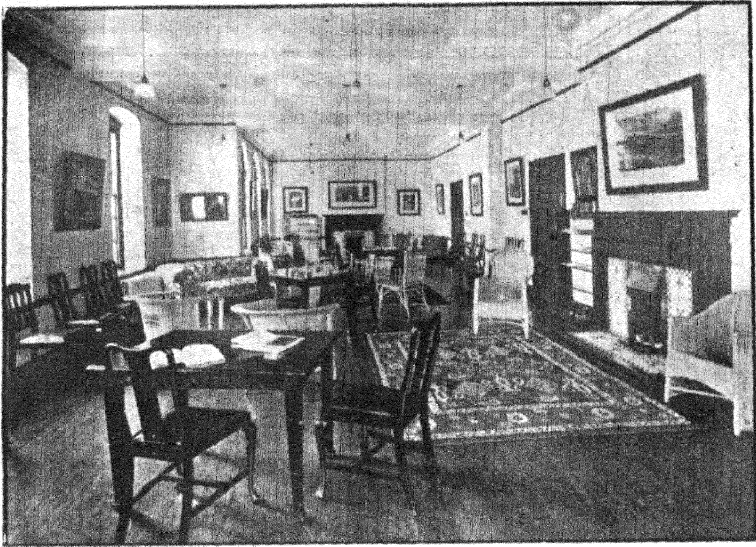
ایک درباری عمارت - لاہور



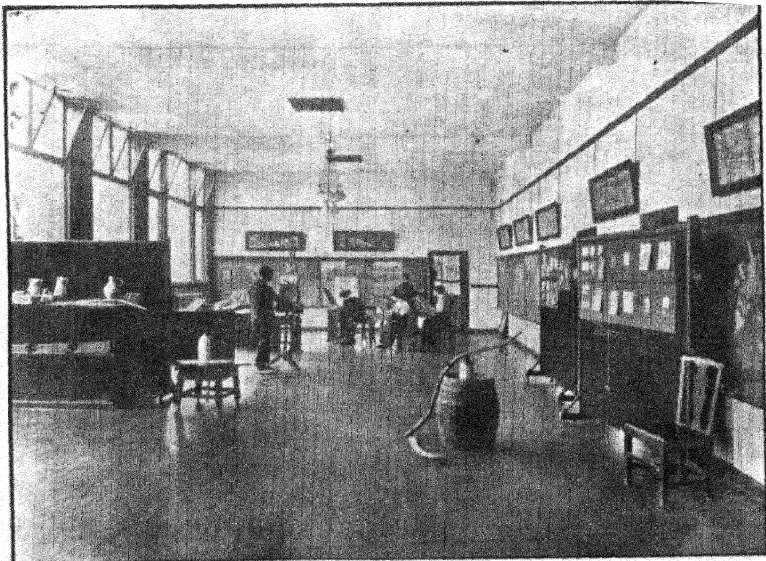
ایک دارالاقامت کا داخلی ہال کمرہ۔



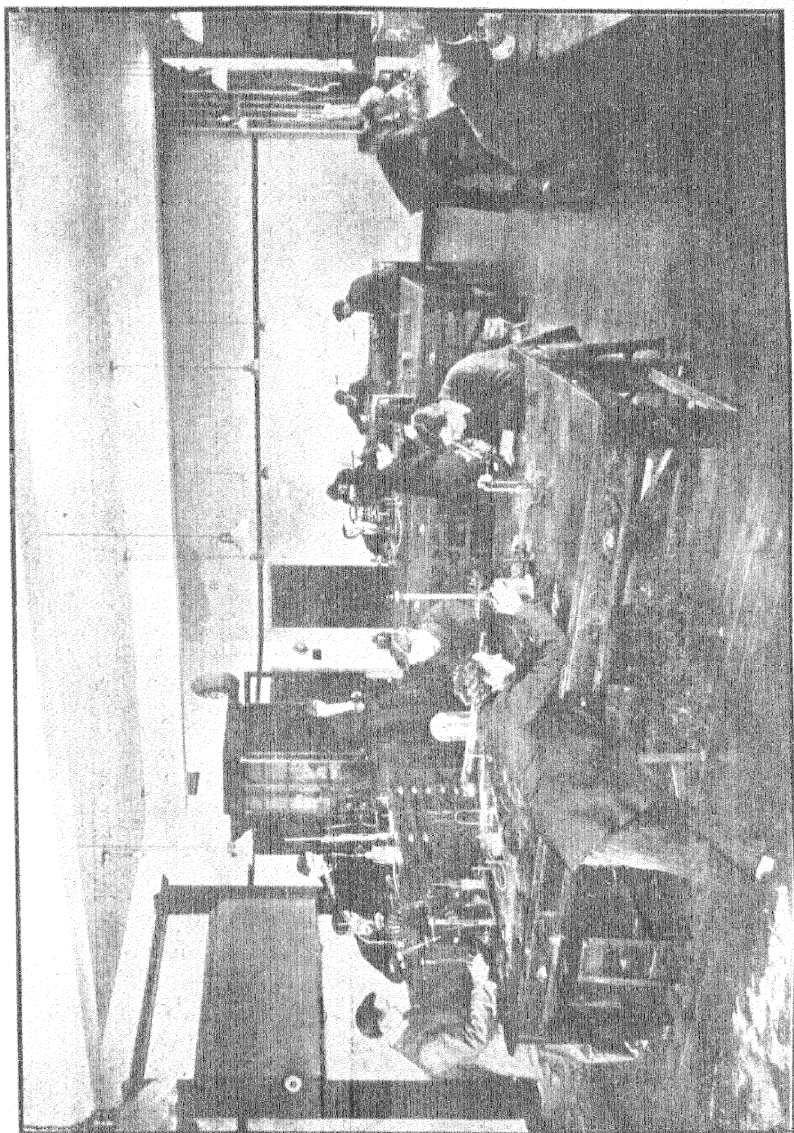
طالب علم کا مطالعہ اور سونے کا کمرہ۔



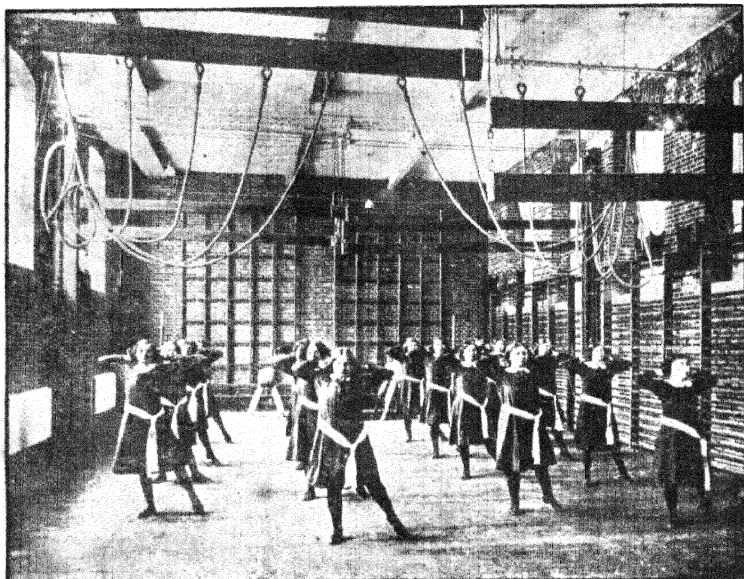
طلبہ کا مشترک کمرہ



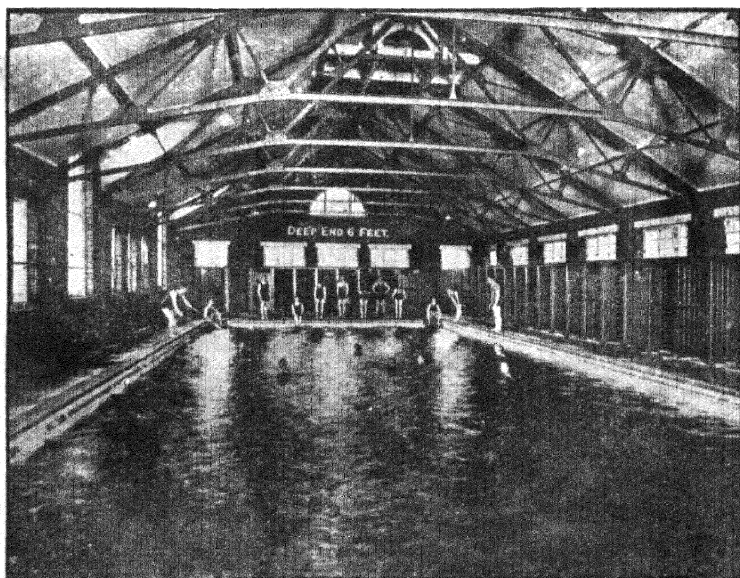
کمرہ نقاشی



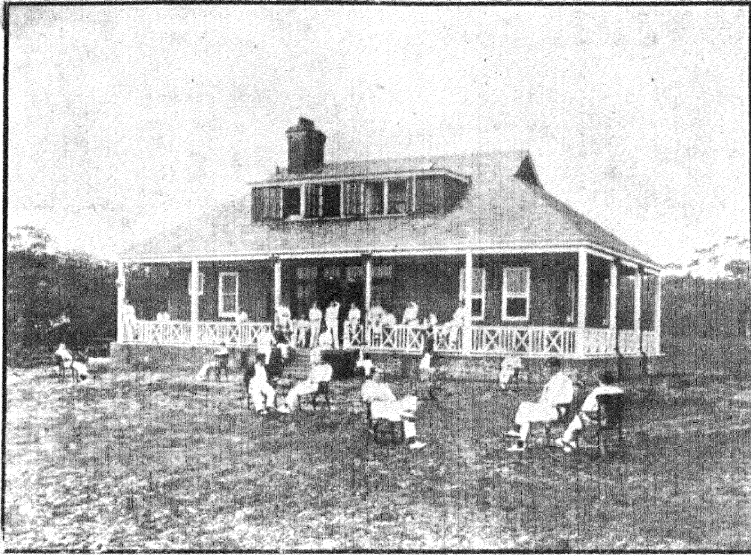
معیار طبیعات



لوٹھوں کا تالار ورزش



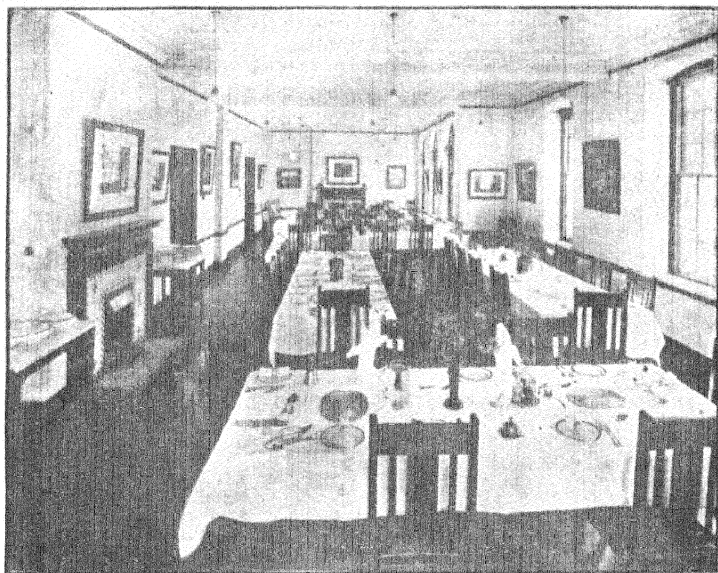
تیرنے کا تالاب



کھیلوں کی آرام گاہ



لڑکیوں کے کھیل کا میدان



کھانے کا قاعہ کمرہ



میر تقی میر



منزب کے ایک بہت بڑے مصور کا کارنامہ



ثروت راگ

ایک اٹالین مصور کا شاہد کار



حضرت عیسیٰ و مریم

کالج کی عمارات

اس کالج کی عمارات کی ترتیب اور آراستگی، مقامی تعلیمی کمیٹی اور ماہرین فن تعمیرات کی منتقدہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ کالج ایک بلند مقام پر واقع ہے۔ جہاں سے سب طرف کا منظر دکھائی دیتا ہے ان عمارات میں ایک بڑی ماڈنگ اور آٹھ رہائشی ہال یعنی بورڈنگ ہاؤس شامل ہیں۔ ان میں سے تین مردوں اور پانچ عورتوں کیلئے مخصوص ہیں۔ ان میں ۸۰ مہم طلباء یعنی ۸۰ مرد اور ۳۰۰ عورتوں کی گنجائش ہے۔ علاوہ ان میں پرنسپل و ایس پرنسپل کیلئے رہائشی مکانات بنے ہوئے ہیں۔ اور ایک تیرنے کا تالاب۔ دھوبی خانہ کھیلوں کی آرام گاہیں اور چکیاروں کے مکانات ہیں۔

کالج

کالج میں دو بڑے احاطوں کے ارد گرد زنانہ اور مردانہ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک بڑا ہال کمرہ آٹھ سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش رکھتا ہے جماعتوں کے لیکچر روم گشت وہ اور روشن ہیں۔ اور ان کے علاوہ علم کیما۔ علم طبیات۔ اور نیچر سٹڈی کے معلم ہیں۔ اور لیکچر تھیٹر، جغرافیہ اور تاریخ کے معلم۔ نسائیتی کمرہ۔ اسلامی کے کمرے موسیقی کے کمرے اور مردوں و عورتوں کے مجاہد اور ورزش کے تالار ایک کتب خانہ اور طالب علموں کے مشترکہ کمرے بھی ہیں۔

رہائشی ہال

کالج کے بالکل نزدیک ہاٹھ رہائشی ہال ہیں۔ ہر ایک ہال میں ٹیوٹر (تالین) اور خانگی اسٹاف کے علاوہ ساٹھ طالب علموں کی گنجائش ہے۔ ہر طالب علم کو ایک مطالعہ اور سونے کا کمرہ مع مخصوص فرنیچر کے دیا جاتا ہے۔ اور ہر ہال میں ایک لائبریری اور طلباء کا مشترکہ کمرہ ہوتا ہے۔ رہائشی ٹیوٹروں کے لئے خاص کمرے ہیں۔ اور ملاقاتیوں کا کمرہ مرکزی داخلی راستے کے ساتھ ملتی ہے۔ اسی راستے کے ساتھ ہی فواریے والے غسل خانے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے کمرے۔ صحت خانے۔ کپڑوں اور پوٹوں کے برش پھینے کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب صفائی کے کمرے اصل عمارت سے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ تاکہ گرد و آلودگی سے ہال رہائشی ہال سے دور رہیں۔

باورچی خانے موجودہ کیس اور تازہ ترین آتشنی آلات سے مزین ہیں تاکہ کھانا پکانے میں نفاست اور

کفایت شعاری ملحوظ رہے۔ یہ بار بار پڑھانے اور کھانے کے کمرے اصل عمارت سے ایک راستے کے ذریعے جدا کر دیئے گئے ہیں۔

کالج کی خانگی زندگی

رہائشی ہال اس طرح آراستہ کئے گئے ہیں کہ طلباء ان میں بلا تکلف گھر کی ہی بو و باش رکھیں۔ ہر ایک ہال دو رہائشی ٹیوٹر اور ایک محلہ کی نگرانی میں ہے۔ طلباء کا پڑھنے اور سونے کا کمرہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ دن کے وقت وہ ایک نشست گاہ دکھائی دے۔ ان پرائیویٹ کمروں کے علاوہ ہر بورڈنگ کی خیدگانہ لائبریری کھانے کا کمرہ اور مشرکہ کمرہ ہے۔ پس طلباء کو نہ صرف اپنے کام میں علیحدگی نصیب ہے۔ بلکہ منفرد زندگی کے مواقع بھی میسر ہیں۔

سٹاٹ

پرنسپل کیمبرج کا ایم اے۔ اور لندن کا بی ایس سی ہے۔ انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور نقاشی، سلائی، کام، دستکاری، موسیقی، طریقہ تعلیم، سائنس، باغبانی، بائی جین، ورزش جسمانی، اور فزیکس ان صوبہ مضامین کیلئے قابل پروفیسیہ موجود ہیں۔ طریقہ تعلیم کے گیارہ انگریزی کے چھ۔ سائنس کے چار تاریخ جغرافیہ کے چھ۔ نقاشی کے تین۔ اور ورزش جسمانی کے پانچ پروفیسر ہیں۔ باقی مضامین کیلئے ایک ایک دو دو پروفیسر ہیں۔ تمام سٹاٹ میں چوبیس عورتیں اور اکیس مرد ہیں۔

ٹریننگ کا کورس

(۱) ٹریننگ کا معمولی کورس دو سال کا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں اول وہ کورس جو ایسے طلباء کے واسطے مخصوص ہے جنہیں گیارہ سال تک کی عمر کے بچوں کو ایلیمینٹری اس میں اعلیٰ تعلیم دینا ہے۔

دوم وہ کورس جس میں طلباء ایسے ہی مدارس میں چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کو پڑھاتے ہوں۔ وہ کورس جو طلباء کو امجد خوانوں اور مختلف قسم کے جونیئر سکولوں کی تعلیم کے واسطے تیار کرتا ہے۔

(۲) جن طلباء نے قابل اطمینان طور پر دو سال کا کورس مکمل کر لیا ہو وہ تیسرے سال کا کورس بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اس تیسرے سال میں خاص خاص مضامین کا سپیشل کورس پڑھایا جاتا ہے۔ اور اس میں اصول

تعلیم کو اعلیٰ پایہ پر سیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اُس کے دوران میں طلباء کو مختلف قسم کے مدارس میں جا کر اُن میں نظم و نسق اور طریقہ تعلیم کو دیکھنے کیلئے معاشرہ کرنا پڑتا ہے۔

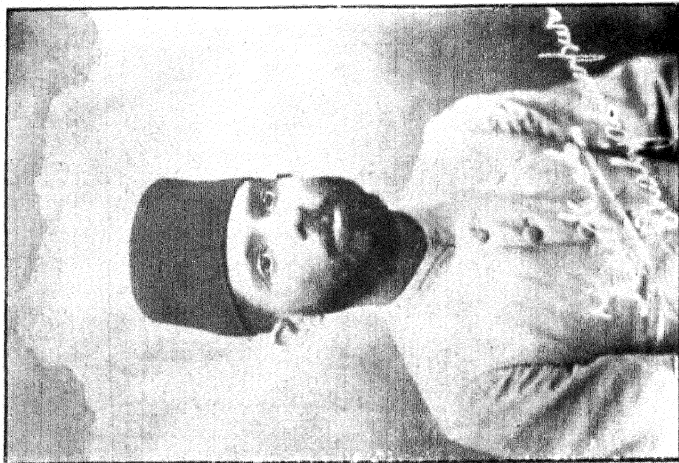
(۳) جو طلباء سند مدرسہ پہلے سے چکے ہوں۔ یا گزرتہ بوائیٹ ہوں اُن کیلئے ایک سال کا کورس بھی ہوتا ہے۔ مشقی اسباق کیلئے کالج کے طلباء ہر قسم کے مدارس میں مشق تعلیم یا مشاہدہ وغیرہ کے لئے آسانی سے طریقہ میں بیٹھ کر جا سکتے ہیں۔

کالج کا سال ہمیشہ ستمبر میں شروع ہوتا ہے۔ ہر سال کے تین حصے کئے جاتے ہیں۔ ہر مدت قریباً بارہ ہفتے کی ہوتی ہے۔ آخری امتحان جولائی کے پہلے ہفتے میں ہوتا ہے۔

صحت جسمانی

کالج میں داخل ہونے سے پہلے تمام طلباء کو میڈیکل افسر کی زیر نگرانی طبی امتحان پاس کرنا چاہیے۔ اگر وائٹوں کی حالت خاطر خواہ نہ ہو۔ تو داخل ہونے والے طلباء کیلئے ضروری ہے۔ کہ کسی ماہر دندان سائنسٹ کے لے کر آئے۔ ہر ٹرم کے آغاز میں طلباء کو اپنی صحت جسمانی کی سن پینٹ کرنی ہوتی ہے۔ جس میں یہ لکھا ہو۔ کہ وہ ایام تعطیل میں چھوٹ کی بیماری سے محفوظ رہے ہیں۔ کالج میں وقتاً فوقتاً طلباء کا طبی معائنہ ہونا رہنا چاہیے۔ جسمانی بیماریاں پیش کی جاتی ہے۔ اور اُسے درج رجسٹر کیا جاتا ہے۔ طلباء کے دورانِ فیاں میں اُن کی صحت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ اور انہیں صحت کو برقرار رکھنے کی عادات ڈالی جاتی ہیں۔ کیونکہ اُس کے بغیر صحت قائم نہیں رہ سکتی۔ کالج میں ورزش کی مختلف مجالس ہیں۔ مثلاً تیرنے کی کلب۔ فٹ بال۔ ہاکی۔ ٹینس۔ کرکٹ کی کلبیں۔ تعلیم کے لیکچر عموماً صبح سویرے ہو جاتے ہیں۔ یہ پہر کو ہفتے میں دو یا تین مرتبہ طلباء مدارس کا معائنہ کرتے ہیں۔ اور باقی دن سہ پہر کو کھیلوں اور ورزش میں صرف کرتے ہیں۔ ان تمام کھیلوں میں پرنسپل اور سٹاف کے لوگ پوری دلچسپی لیتے ہیں کھیلوں کی مجالس کے علاوہ بعض اور مجالس بھی ہیں۔ مثلاً نقاشی کی کلب۔ فوٹو گرافی کی کلب۔ طبیعیات کی کلب۔ ادبی اور بحث و مباحثہ کی کلب۔ موسیقی کی کلب، جسکے سلسلے میں کالج کا ایک بینڈ بھی ہے۔

طلباء کی مذہبی تربیت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس کے لئے روزانہ صبح شام نماز ہوتی ہے۔ لیکن یہ رسم خیر فرقہ دارانہ طور پر ادا کی جاتی ہے۔ اور طلباء پر اس کی حاضری لازمی نہیں ہے۔ اگر وہ چاہیں تو جس فرقے سے اُن کا تعلق ہو۔ اسی فرقہ کے گرجے میں جا سکتے ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے۔ کہ ہر اتوار کی شام کو جس گرجے میں جائیں۔ اس کی رپورٹ حاضری اپنے رہائشی ٹیوٹر کو دیں اس سلسلے میں طلباء کی مسیحی مجلس کی



مؤکب شاہ مہاراجہ دوس



مہاراجہ شاہ دلی پمپنر صاحب برہمہ
(انور) الی پمپنر "رہنما" " "



مدنی مقام مصطفی صاحب تبسم اہم اے لکچرار
ہنگول ٹریڈنگ کالج لاہور

تدریس اُردو

(جناب صدیقی غلام مصطفیٰ صاحب تیسرے ایچ ایم اے لکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور)

تدریس اُردو پر اظہار رائے کرنے سے پیشتر اس امر کا تصفیہ کر لینا ضروری ہے کہ اُردو زبان کو داخل نصاب کرنے کے وجوہات اور اُسے ثانوی مدارس میں رائج کرنے کے عملی مقاصد کیا ہیں۔

اُردو زبان کی اہمیت کے وجوہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) اُردو زبان ملک کی دینی زبان ہے۔

(۲) ثانوی مدارس میں ابتدا سے لیکر اخیر تک ذریعہ تعلیم یا وسیط تدریس ہے۔

(۳) اُردو زبان کا مطالعہ غیر زبان کے سیکھنے میں مدد ہے۔ چنانچہ انگریزی زبان سیکھنے کیلئے جس کی حیثیت ہندوستان میں ایک اجنبی غیر زبان کی ہے۔ اُردو زبان کی واقفیت بے حد ضروری ہے، انگریزی کیلئے صبح اور موثر طریق تدریس وہی ہوگا جس میں متعلمین کی اُردو کی قابلیت سے محمول استفادہ کیا جائے۔ علاوہ بریں یہ امر مسلم ہے کہ جو علم اپنی مادری یا دینی زبان کی خوبیوں اور نظم و نشر کی گونا گوں دلائلوں سے واقف نہ ہوں، وہ کبھی زبان کی نکتہ آفرینیوں اس کے انداز فصاحت و بلاغت، تشبیہات، استعارات، غرض ادب کی ہر قسم کی چاشنیوں سے کم اخذ لذت اندوز نہیں ہو سکتے، اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے اُردو زبان اور اس کی تعلیم کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

مذکورہ بالا امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ثانوی مدارس میں اُردو کا معیار کیا ہونا چاہیے؟

تدریس فارسی کا معیار جو ہندوستان میں کلاسیکل یا قدیم زبان کی حیثیت رکھتی ہے، ثانوی مدارس میں یہ ہے کہ طلباء فارسی ادب کی کتابوں کو دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔ انگریزی زبان کی تدریس کا معیار اس سے مختلف ہے، مدرسے فارغ ہونے پر متعلمین میں اتنی استعداد ہونی چاہیے کہ وہ اعلیٰ جماعتوں میں پہنچ کر نہ صرف مختلف مضامین کی کتابوں کو سمجھ سکیں بلکہ اپنے خیالات کو تحریر و تقریر کے ذریعے ظاہر بھی کر سکیں۔

ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اُردو کی قابلیت کا معیار کس قدر بلند ہونا چاہیے بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ اس زبان کی اہمیت کیا بلحاظ دینی زبان کے اور کیا بلحاظ مدتِ تعلیم کے بہت زیادہ ہے؟

(اُردو تدریس کی ابتدا پہلی جماعت سے ہوتی ہے اور تقریباً دس سال تک جاری رہتی ہے، دوسرے مضامین پر

اس قدر وقت صرف نہیں کیا جاتا، تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ طلبہ فارغ التحصیل ہونے پر اس قابل نہیں ہونے کے اُردو میں مقبول و تقریباً ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ غیر زبان بینی انگریزی میں تو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً انگریزی بول بھی سکتے ہیں لیکن اُردو میں یہ چیز بالکل مفقود ہے، زاید کتابوں کو پڑھ کر سمجھنا اور عنوانِ مفہوم سے لذت اندوز ہونا تو درکنار، طلبہ اپنی درسی کتابوں کو بھی پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے، اگر قدیم سے انہیں کسی غیر کتاب، ارسالے یا اخبار کے دیکھنے کا اتفاق ہو تو قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں، بیسیوں ایسے الفاظ جنہیں وہ پہلے پڑھ چکے ہیں پہچان نہیں سکتے، اور اگر انہیں کسی حکایت یا واقعہ اُردو میں بیان کرنے کیلئے کہا جائے تو مسلسل بیان نہیں کر سکتے، ان کے الفاظ ناموزوں، عبارت غیر مربوط اور بندش ٹھپس ٹھپسی ہوتی ہے، ہو سکتا ہے کہ ہمارے بعض بھائی ایسی مثالیں پیش کر سکیں جو ہمارے پیش کردہ دعویٰ کے خلاف ہوں، لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اگرچہ ہونا ہمارے اپنے ذاتی سماعی یا خانگی روایات و حالات کے ماتحت اس قابل ہو بھی جائیں کہ ان پر یہ الزام عاید نہ ہو سکے تو اس سے عام نقص رفع نہیں ہو سکتا۔

(پس معلوم ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان حالات پر غور کر کے تمام بنیادی اور فردی نقائص کو سمجھیں اور ان کے ارتفاع کیلئے حتی الامکان کوشش کریں۔)

اُردو ایک عرصے سے ہائی کلاسوں میں اقداری مضمون کی حیثیت سے پرمعاشی جاتی ہے یونیورسٹی کا فیصلہ کیسی ہی و دراندیشی اور بالغ نظری پر مبنی کیوں نہ ہو اس کا برا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ اُردو کی تعلیم و تدریس پر پڑا ہے جس نے ہماری نظریں اس مضمون کی وقعت کم کر دی ہے، اول تو طلبہ کی ایک کثیر تعداد اُردو زبان کو صرف اُسکے خیر یا کبریا دیتی ہے کہ ان کے نزدیک زندگی کے مختلف مشاغل میں اُردو کی نسبت دوسرے مضامین تاریخ، جغرافیہ، سائنس وغیرہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اگر کوئی طالب علم بڑے سے اُردو پڑھتا بھی ہے تو زیادہ تر اس خیال سے کہ یہ مضمون دوسرے مضامین کی نسبت آسان ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ اس کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں، مثال کی تہائی اور فوقانی جماعتوں میں بھی طلبہ اسی غلط خیال کا شکار ہوتے ہیں۔

تعلیم اُردو کے ناقص ہونے کی دوسری اہم وجہ تعلیم اور مدرسے کے افسر اعلیٰ یعنی ہیڈ ماسٹر کی بے توجہی ہے، اکثر یکساں تہے کہ معلمین اُردو کی علمی قابلیت بہت پست ہوتی ہے اور شوق مطالعہ کے فقدان کے باعث آئندہ کسی ترقی کی امید بھی نہیں ہوتی، ہیڈ ماسٹر اصحاب جنگی نظر میں اُردو نہایت کم یا چیز ہوتی ہے ان مدرسین کے کام کی نگوانی اپنی کسرِ شان خیال کرتے ہیں، عرضِ مدستہ میں ایسے اساتذہ سیاح و سفید کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی کارگزاریوں کا معیار بعض افسرانِ معائنہ کی رائے اور سالانہ امتحان کا نتیجہ ہوتا ہے۔

تیسری وجہ تدریس اُردو کا ناقص ہونا ہے، بعض اساتذہ سند یافتہ معلم ہونے کے باوجود اپنے فرائض کو

سراخجام دینے میں کوتاہی کرتے ہیں، نصاب کی کتابوں کو مقررہ میعاد کے اندر ختم کرنا ہی ان کا مطمح نظر ہوتا ہے، تعلیم و تدریس کے تمام اصول یکمیت فراموش کر دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ مضمون زیر بحث کی وقعت معلوم اور تعلیم و دونوں کی نظروں میں کم ہو جاتی ہے، اُردو کی گھنٹی یا تو تفریح کا وقت متصور ہوتی ہے یا بلالے ناگزیر۔

علاوہ بریں کتب نصاب کا انتخاب بھی معقول نہیں ہوتا، دوسرے مضامین کے مقابلے میں اس کی مقدار بھی کم ہوتی ہے، نظم کا حصہ بالعموم طلباء کی چلی استعدادوں اور طبعی لچسپیوں کے منافی ہوتا ہے، ابتدائی جماعتوں کی دوسری کتب میں بعض ایسی نظمیں درج کی جاتی ہیں جن میں ثقیل الفاظ، منغل تراکیب اور غیر قانونی تشبیہات، استعارات ٹھوس دیئے گئے ہوں۔ موضوع نظم کا خشک اور ٹھوس ہونا با اوقات بچوں کو کبیدہ خاطر کر دیتا ہے

ماہر ذہن موزون کتابوں کے انتخاب کا سوال گہنڈ اور تمدن قوم کیلئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، ہمارے ملک میں بھی ایک عرصہ سے اس مسئلہ پر غور ہو رہا ہے مشکلات کو مختلف النوع تدابیر سے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، شکر کا مقام ہے کہ معاملہ بڑی حد تک سچلے گیا ہے لیکن ابھی اس میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ ہماری اُردو زبان محکمہ تعلیم کے اصحاب فکر اور ارباب کار کی آئینہ توبہ اور مساعی کی خاص طور پر مستحق ہے،

تدریس اُردو کے مختلف پہلوؤں اور موجودہ نقائص پر غور کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان نقائص کے رفع کرنے کی اہم تدابیر پر بھی روشنی ڈالی جائے تاکہ وہ تعلیم سکایات جن کے ہم بڑی حد تک خود مہ دار ہیں دور ہو سکیں اس میں شک نہیں کہ موجودہ صورت حالات کو بدلنے کیلئے مستقل اور مسلسل مساعی کی ضرورت ہے تاہم مفید کار نجاؤں کا پیش کرنا کسی حالت میں ناموزوں نہ ہوگا۔

یونیورسٹی کے معاملات میں دخل دینا ہمارا کام نہیں، اس کے ارباب بست و کشاد تک کے نظام تعلیم اور اس کے تمام مسائل کو ہر لحاظ سے ہم سے بہتر سمجھنے کے اہل ہیں اور اپنی مفید آراء اور مساعی جلیلہ سے معاملات کو سلجھانے کی فکر میں رہتے ہیں تاہم ہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لکچرر سے کی اعلیٰ جماعتوں میں اُردو کو اختیاری مضمون قرار دینا کسی طرح بھی قیوں مصلحت نہیں ہو سکتا ممکن ہے کسی دور کی مصلحت نے انہیں اس بات پر مجبور کیا ہو کہ وہ تاریخ یا جغرافیہ کے مقابلے میں اس مضمون کو دوسرا درجہ دیں مگر اس کی روز افزوں ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اختیاری مضامین کی فہرست میں ایسی جگہ دیا جائے کہ کم از کم اس کا انتخاب لازمی ہو جائے۔

کالج کے مروجہ مضامین میں اُردو کے اضافہ کی اہمیت صرف اُسی حالت میں نمایاں ہو سکتی ہے کہ مدرسہ کی تمام جماعتوں میں اس کی تعلیم لازمی قرار دیا جائے ورنہ یہ خواہش کرنا کہ دیسی زبانیں سکولوں اور کالجوں میں ذریعہ تدریس بن جائیں کس قدر نحو ہے۔

تدریس اُردو میں بھی اصلاح کی گنجائش ہے جس طرح کسی زمانے میں جغرافیہ کی تعلیم کا مقصد نصی و دیاروں

پہاڑوں اور شہروں کے نام یاد کرنا سمجھا جاتا تھا اسی طرح ہمارے اساتذہ نے اُردو تعلیم کا مقصد صرف یہی سمجھا ہے کہ طلبہ مشکل الفاظ کے معنی یاد کر لیں عبارت کو پڑھ سکیں اور ایک آدھ مضمون لکھ لیں گفتگو کی طرف سے بے حد تغافل کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض نوجوان اساتذہ نے ابتدائی جماعتوں میں گفتگو کی اہمیت کو سمجھ کر اس سے کماحقہ استفادہ شروع کر دیا ہے، لیکن مدرسہ کی اعلیٰ جماعتوں میں یہ چیز عیار مطلوبہ سے کم درجے پر خیال کی جاتی ہے اور معلم اور متعلم اسے اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک گفتگو سبق کے ارتقائی مدارج میں سوال و جواب کا نام ہے، اس میں شک نہیں کہ سوالات و جوابات کا یہ تسلسل لڑکوں میں بڑی حد تک اظہارِ مافی الضمیر کی استعداد پیدا کرتا ہے لیکن ہمارا مقصد یہیں نہیں پورا ہو جاتا بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ لڑکے اُردو زبان میں مسلسل اور مربوط طریق پر گفتگو کر سکیں اس چیز کا اثر محض اُردو کی قابلیت پر نہیں پڑتا بلکہ دوسرے مضامین مثلاً تاریخ، جغرافیہ وغیرہ وغیرہ میں بھی طلباء اپنے خیالات کا اظہار آسانی کر سکتے ہیں۔ کسی موضوع پر اظہارِ رائے کیلئے خیالات کو مجتمع کرنا اور ان کو معقول پیرائے میں بیان کرنا بہت ضروری ہوتا ہے، اگر الفاظ یاد رہی نہ کریں۔ اور زبان ہر لفظ پر رُکے تو خیالات گفتگو کرنے والے کے ذہن ہی میں رہ جاتے ہیں اور سامعین کچھ نہیں سمجھ سکتے، خیالات کا ذہنی طور پر ترتیب دینا اور پھر ان کو موزوں الفاظ میں بیان کرنا دونوں چیزیں تقریباً و تخریب کی جان ہیں۔ ان دونوں میں جس قدر گہرا تعلق اور باہمی مناسبت ہوگی اسی قدر تقریب یا تخریب زیادہ مربوط، زیادہ پرمغز اور زیادہ فصیح ہوگی۔

گفتگو کے سلسلے میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ معلم کو اُردو کے سبق کا تمام کام اپنے ذمے نہیں لینا چاہیے بلکہ سبق کے تمام ارتقائی مراحل معلم و متعلم دونوں کی مشترکہ کوششوں سے طے ہونے چاہئیں۔ موزوں سوالات کے ذریعے خواندہ عبارت کے مفہوم کو کھلو کر اس کی توضیح اپنے الفاظ میں کرنی چاہیے تاکہ طلبہ کتاب کے محدود الفاظ ہی پر اکتفا نہ کریں، ان توضیحات کا فائدہ ایک یہ بھی ہے کہ طلباء نئے الفاظ اور انداز بیان سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے موقع پر معلم کا شہتہ کلام ہونا بے حد ضروری ہے، تاکہ طلبہ دلچسپی سے سُننے لگیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ معلمین اُردو تختہ سیاہ کا استعمال نہیں کرتے، حالانکہ خلاصہ تختہ سیاہ بھی توضیحات مرنے میں شمار ہوتا ہے، طلبہ کے اُردو الفاظ کے صحیح غلط لکھنے کا باعث یہی ہے کہ انہوں نے بہت سے الفاظ اپنے استاد کی زبان سے سُننے ہوتے ہیں دیکھے نہیں ہوتے۔ تختہ سیاہ پر لکھتے وقت خوش نویسی کو بالخصوص ملحوظ رکھنا چاہیے، تقسیم تختہ سیاہ کی موزونی اور اس کے معقول استعمال کا سلیقہ معلم کا قابلِ فخر کارنامہ ہے، الفاظ کی بھونڈی اور بھدی شکلیں، جبکہ کی ناموزون تقسیم اور بے ترتیب انداز تخریب طلبہ کی جس جہالت کے لئے سخت مفسر ہے لڑکوں کے بدخط ہونے اور ان کی بے پرواہی تخریب کی بڑی وجہ یہی ہے۔

تدریس نظم کا کام مقرر سے نسبتاً زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس میں اشعار کو صحیح طور پر پڑھنے کی دقتیں

شامل ہو جاتی ہیں، معلم عام طور پر نظم و نثر کے سبق میں امتیاز نہیں کرتے، مشکل الفاظ کی تشریح ہی کافی خیال کی جاتی ہے۔ اس کام کے لئے ضروری ہے کہ مدرس کا مذاق شعری بہت سلیم ہو، تاکہ اس کا اثر براہ راست طلباء پر پڑے، اور وہ موزونی الفاظ، روائی عبارت، سلاست، بیان، وزن، قافیہ اور ردیف غرض تمام شعری لوازمات کی اہمیت کو محسوس کریں، اکثر الفاظ کے صحیح تلفظ اور تذکیر و تانیث کا راز اشعار میں آکر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے، لغت نویس الفاظ کے استعمال کیلئے جب فصحا کی سند پیش کرتے ہیں تو وہ زیادہ تر اشعار ہی ہوا کرتے ہیں۔ کاشش بیک معلم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

اشعار کی شرح بیان کرتے وقت اکثر طلباء محض اُن کی نثر بنا دیتے ہیں، معلم بھی اُن کے اسی ادبی کارنامے سے خوش ہولیتا ہے حالانکہ نثر بنا نا کسی خاص ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا، ابتدائی جماعتوں میں اگر اسی پر اکتفا کی جائے تو کوئی ہرج نہیں لیکن بڑی جماعتوں میں طلباء کو اشعار کا مفہوم اپنے الفاظ میں پوری وضاحت کے ساتھ کرنا چاہیے، معلم فرض ہے کہ وہ طلباء کی تشریحات کی تکمیل نہایت جامع الفاظ میں کرے۔ قزات اشعار پر بھی بہت زور دینا چاہیے مشکل اشعار کی صورت میں معلم کو خود نمونہ پیش کرنا چاہیے یا کسی ہوشیار طالب علم سے ابتدا کر کے کمزور طلبہ کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہیے، موزوں اشعار یا نظم کا زبانی یاد کرنا بھی بسا اوقات مفید ہوا کرتا ہے، مصنف چہار مقالہ کا یہ خیال کہ شاعر کیلئے استعارہ کے بے شمار اشعار کا یاد کرنا لازمی امر ہے، بڑی حد تک درست ہے، اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اشعار یاد کرانے سے محض افسرانِ معائنہ کو خوش کرنا مقصود نہیں بلکہ اس بات کا تعلیمی فائدہ بھی ہے، اسلئے فردِ فرداً ایسے اشعار بھی یاد کرائے جاسکتے ہیں جن میں شاعر نے کوئی خاص محاورہ بندی یا بندش کی چسپی یا بلند خیالی کا اظہار کیا ہو، مگر یہ اشعار ایسے ہونے چاہئیں کہ طلبہ انہیں یاد بھی کھ سکیں، ان اشعار کا محض نصاً تک مدد دہونا ہی ضروری نہیں، معلم ضرورت کے وقت توضیحات و امثلہ کے طور پر ان کو پیش کر کے سبق کو دلچسپ بنا سکتا ہے۔

سبق کے دوران میں نثر نگار یا شاعر کا فوٹو دکھانا اس کے حالات مختصر بیان کرنا، اور اس کے طرزِ نگارش پر اظہارِ رائے کرنا بھی مفید ہے اسی سلسلے میں تاریخ ادبیات کا تصور دلانا بھی ضروری ہے، تاکہ طلباء مختلف شعراء اور نثر نگاروں کے عہد سے واقف ہو جائیں اور آئندہ مطالعہ کو جاری رکھتے ہوئے اردو علم ادب کی عہدِ بعہد ترقیوں کو سمجھ سکیں۔

تقریری کام کو حتی الامکان جماعت میں ختم کرانے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ طلباء گھر پر دوسروں کی مدد سے صلح ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایس دی کے طلبہ کی طرح اقبال کے متعلق یہی کہیں گے کہ ایک ایران کا اچھا شاعر ہو گا۔ راسخ بانی کے ایک جاہل طالب علم کے طرح یہ سوال کریں گے کہ عہدِ ہندی کون تھا؟ یا ایک گردیہ تہذیب نو کی طرح مسدس حالی کو ”پناب کا ایک شاعر تھا“ نہیں کہیں گے، نعوذ باللہ من ذلک

کام ختم کر لیتے ہیں اور ناجائز طریق پر استاد سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ استاد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات ایسے طلبہ کی طرف توجہ کرنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف طلبہ ذاتی سہمی و کوشش کے ناقابل ہو جاتے ہیں۔ جماعت میں کام کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ معلم محض نگرانی اور رہنمائی نہیں کرتا بلکہ اصلاح بھی کرتا جاتا ہے، معلم کو چاہیے جہاں تک ہو سکے اصلاح کا کام بھی طلبہ کی حاضری میں مکمل کر لے، کام کی قلیل مقدار کوئی بری بات نہیں، اصلاح کا نہ ہونا یا مجبوری کے عالم میں نامکمل اور غیر اطمینان بخش ہونا مضر ہے، مضمون نگاری یا المادہ وغیرہ کے سلسلے میں کامیابیوں کا انبار معلم کیلئے حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ اس طرح سے یہ شکایت بھی بڑی حد تک رفع ہو جائیگی +

مضمون نگاری میں تہیہ دی بحث و تمحیص بھی کارآمد ہوتی ہے، اس بحث و تمحیص کو مذکرہ کی صورت اختیار کر لینی چاہیے یعنی مضمون زیر بحث معلم اور معلم کی مشق تکرار ذہنی کوششوں کا نتیجہ ہو اس سے طلبہ کی جمیع رہنمائی بھی ہوگی اور کام بھی بڑی حد تک اصلاح کا منت کش نہ ہوگا۔ درست ہے، صحیح رسم الخط، موزوں وقفے عروس تحریر کا زیور ہیں۔ اس پر خوشنویسی یا مہر زیب کا حکم رکھتی ہے۔ یہ تمام چیزیں معلم کی درست رہنمائی پر منحصر ہیں۔ ایک چیز آجکل بالکل مفقود ہے، یعنی وقفے، اگر مفصلہ ذیل علامات استعمال کی جائیں تو عبارت کی شان و دیلا ہو جائیگی اور پڑھنے والے کو بھی آسانی ہوگی :-

- مکمل جملے کی علامت
- جملہ معترضہ یا جملے کے مختلف حصوں کی علامت ،
- + فضل اپیراگراف کی علامت
- تفسیری یا تفصیلی علامت
- “ ” اقتباس کی علامت
- ؟ استفہام کی علامت
- ! تعجب یا ندا کی علامت
- () توسیع وغیرہ وغیرہ

اس سبب یہ بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ پنجابی طلبہ بالخصوص اعداد کو پڑھتے وقت پنجابی عدد پکارتے ہیں اس کی طرف بھی خاص توجہ مبذول کرنی چاہیے :-

مدرسہ میں بلند آواز سے پڑھانے کا مطلب صحت روائی قراءت، تلفظ اور لہجہ کی درستی کے لئے ہونا ہے، لیکن فارغ التحصیل ہونے پر طلبہ خاموش مطالعہ کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں اسلئے اس کا آغاز بھی مدرسہ ہی میں

ہونا ضروری ہے، خاموش مطالعہ کی ابتدا بالعموم تیسری جماعت سے ہوتی ہے اور اسے دسویں جماعت تک جاری رکھا جاتا ہے لیکن معلمین اس کی باہمیت کو فراموش کر دیتے ہیں اور خاموش مطالعہ دفعہ وقتی خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ چیز معلم کیلئے بے حد مفید ہے اور اس کے تدریسی کام میں اس کی سب سے بڑی معاون ہے۔ اس کو کامیاب بنانے کے لئے حسب ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے :-

(۱) موزوں کتابیں انتخاب کی جائیں۔ جو لغوی مشکلات کے اعتبار سے درسی کتابوں سے نسبتاً آسان مضامین کے لحاظ سے زیادہ دلچسپ، اور صورتور بھی ہوں۔

(۲) اس عرض کے لئے جماعتی کتب خانے کو کھولے جائیں اور معلم خود کتابوں کا انتخاب کرے۔ ہر کتاب کے ایک سے زیادہ نسخے رکھے جائیں تاکہ تمام طلباء ایک وقت میں ایک ہی کتاب پڑھیں اس سے نگرانی کا کام آسان ہو جائے گا اور طلبہ کی رفتار مطالعہ کا اندازہ کرنا بھی سہل ہوگا۔

(۳) تمام کام معین وقت اور معلم کی رہنمائی میں ہو۔

(۴) خاموش مطالعہ کی معلومات سے مضمون نگاری، اور دیگر تحریری مشقوں میں استفادہ کیا جائے۔

(۵) بڑی جماعتوں میں ایک امر پر خاص طور پر زور دیا جائے اور کتابیں بلحاظ مضامین کے زیادہ موزوں اور دلچسپ ہوں، اور ان میں مفید معلومات کے علاوہ ادبی چاشنی بھی ہو۔

اخبارات اور رسائل کا مطالعہ بھی ایک لازمی امر ہے، اس کام کیلئے لڑکوں کو خاص ہدایت دینی چاہئیں۔ معلم خود اخبارات و رسائل کے مطالعہ کے بعد اپنے اپنے طلبہ کو چیدہ چیدہ مضامین دیکھنے کا حکم دے اور بعد ازاں امتحان بھی کرے کہ لڑکوں نے فی الواقعہ ان کا مطالعہ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ معلم اخبارات و رسائل سے مضامین کو لے کر اپنے تحریری کام کے لئے موزوں موضوع انتخاب کرے۔

طلبہ میں اردو کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر مدد سے میں طلبہ کی فکر قائم کی جائے اور وقتاً فوقتاً مناظرے کرائے جائیں ہیڈ ماسٹر اور دیگر اساتذہ اس کام میں خود بھی دلچسپی لیں تاکہ لڑکوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ اگر اس کام کے لئے ایک آدھ انعام بھی مقرر ہو تو مضائقہ نہیں ان مناظروں کیلئے تاریخی، جغرافیائی، لمباحث بہت مفید ثابت ہو گئے۔ اس سے دوسرے مضامین کو بھی تقویت ہوگی طلبہ کی استعداد کے مطابق محض ادبی مباحث بھی انتخاب کئے جاسکتے ہیں۔

نئے اسباق کی تیاری معلم اور معلم دونوں کے لئے ضروری ہے، علم التدریس کا اولین اصول یہی ہے کہ معلم سبق کی تیاری کے بغیر ایک حرف تک پڑھانے کی جرأت نہ کرے، اگر کبھی اتفاق سے معلم سبق تیار نہ کر سکا ہو تو اس کیلئے بہتر ہے کہ وہ اپنا وقت (دھڑ دھڑ کی باتوں میں صرف کر دے اور مختلف طریق تفریح سے لڑکوں کا دل بہلائے

لیکن سبق کا قصد نہ کرے، ورنہ اس کے وقار میں فرق آجائے گا اندیشہ ہے۔ طلبہ کو بھی چاہیے کہ وہ ہر نئے سبق کو ایک بار گھر سے دیکھ کر آئیں۔ بہت سی مشکلات سبق کو ایک دفعہ دیکھنے سے رفع ہو جاتی ہیں اور معلم کا کام بڑی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ طلبہ لغت کے صحیح استعمال کو نہیں سمجھتے خاموش مطالعات یا تیار علی اسباق اس کے لئے بہترین موقع ہے۔

میتھر اس کے کہ ہم اس مختصر سی بحث کو ختم کریں یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تدریس و تعلیم کا کوئی اصول کارا م نہیں ہو سکتا جب تک معلم میں فرض شناسی کا احساس بدرجہ اتم موجود نہ ہو اس کے بغیر ہر تجویز بے کار اور ہر مشورہ راہ گماں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے معلم بھائی ہماری ان ادنیٰ گذارشوں پر غور کریں گے اور ان تمام فرائض کو پوری تندی سے سر انجام دینگے جن سے عہدہ برآ ہونا ہم سب کا مشترکہ نصب العین ہے۔

لال قلعہ کی ایک جھلک

لال قلعہ کی تیز اور بات چیت میں اوشا جہان آباد کی تیز اور بات چیت میں فرق تھا۔ ایک بیاہ کی محل میں لال قلعہ کی نگلیں شاہجہان آباد کے اندر شریک نہیں محل کی انگنائی میں ایک چر کے پر شاہجہان آباد کی لوگیاں جن کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی دس پانچ بیٹی آپس پر کھیل ہی تھیں۔ ان ہی میں ایک قلعہ کی سہنے والی بادشاہزادی کی بیٹی تھی جن کی عمر بھی شہزادی لڑکیوں سے زیادہ نہ تھی۔ شہزادی لڑکیاں ”تو“ کہہ کر ایک دوسری سے اپنی تھیں اور قلعہ والی لڑکی کو ”تو“ کہنا نہیں بھانا تھا، وہ ان کی باتوں سے گھبرا گئیں تو تو تلی بولی میں کہنے لگیں ”بیگم“ تو ”نبین کہتے“ تم“ کہتے ہیں۔“ مگر نقارخانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے ان کے کہنے کا کسی نے خیال نہ کیا تو انہوں نے دوا سے کہا دو اتم مجھے گود میں اٹھا کر لے چلو۔ یہ پکارا تو مجھ سے نہیں سنی جاتی۔

بچوں کی زبان میں طاقت آنے کے لئے یہ کہ بات انہیں کہاتیں ”پ پر آسمانی چنے ٹکڑا روٹی لڑکی ڈلی“ اور بچوں سے کہا بنا لپ کہو تو ایک ہاتھ سے لپ بناؤ پھر مٹی چنے کہو تو مٹی بناؤ ٹکڑا روٹی کہو تو مٹی میں دو انگلیوں کو کھول اور انگوٹھا اس پر رکھ کر لڑکے کی صورت بناؤ لڑکی کی کہو ٹکڑہ کی اوڑھی کی دو انگلیوں اور انگوٹھے کو کھول کر ڈلی کی صورت بناؤ اور اس کہات کو جلدی جلدی کہو۔

ایک بیگم اپنی صاحبزادی کو اس طرح بلاتی تھیں ”بیوی تاج تاج ملو کو سر پر تاج نصرت بانو بیٹیاں شاہجہان“ ایک دن محل کے چوبڑے پر نہ بجا کا چڑنا تھا۔ کسی عرت سے بی آئی اور مرے کو زخمی کر گئی تو بیگم نے نصرت بانو کو اس طرح بلایا ”بیوی تاج تاج ملو کو سر پر تاج نصرت بانو بیٹیاں شلو بیویاں چھری ملاؤ مرغا مرغا ہے اس خطاب کو پورا پورا کرتے کرتے مرغا مرکا رہ گیا۔ اور چھری نہ آئی۔“

ہندوستان میں فارسی زبان

اوپر اس کا طریق تعلیم

(جناب مولوی امام الدین صاحب منشی فاضل اونٹیل ٹیچر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

ناظرین کرام! پیشتر اس کے کہ میں زبان فارسی کی تدریس پر اپنے خیالات پریشان کا اظہار کروں۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں زبان ہندو کو کی تحصیل کیوں ضروری ہے اور ہمیں اس کے حاصل کرنے سے کیا کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں؟

کسی ملک میں غیر زبان کے سیکھنے کے مندرجہ ذیل اسباب ہو سکتے ہیں۔

(۱) اُس زبان کے اہل زبان کا کوئی نہ کوئی تمدنی۔ معاشرتی۔ تجارتی و مذہبی تعلق اُس ملک کے ساتھ ہو۔ یا بخلاف اس کے اہل ملک کو اُس غیر زبان کے ملک والوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی واسطہ ہو۔

(۲) اُس غیر زبان کی تصنیفات ملک کے نصاب تعلیم میں داخل ہوں۔

(۳) اہل ملک میں کسی فرقے کی مذہبی یا علمی تصنیفات اُس غیر زبان میں ہوں۔

(۴) مصنفین یا مولفین کو ترجیحے یا تالیف کی غرض سے بعض غیر زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔

(۵) تاجروں اور سیاحوں کو غیر ملک کی زبان ضرورتاً سیکھنی پڑتی ہے۔

اسباب مندرجہ بالا کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم اپنے ملک میں زبان فارسی کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔

اور اس مسئلے میں جہاں تک غور کرتے ہیں دو باتیں ہمیں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو ہندوستان میں زبان فارسی کی تحصیل پر حاوی نہ ہو۔ ہم ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک زمانے میں فارسی کا ایسا نصرت اس ملک پر پاتے ہیں۔ کہ دفتری۔ درباری۔ کا۔ دباری اور تصنیفی زبان فارسی ہی نظر آتی ہے۔ مسلمان تو ایک طرف ہندو بھی فارسی میں انشا پر داری کو فرسبتے تھے۔ تصنیفات اس امر کی شاہد ہیں۔ چنانچہ سید محمد عبداللہ صاحب ایم۔ اے۔ پیر سراج سوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی نے ”ہندوؤں کا فارسی لٹریچر“ کے عنوان سے ایک تحقیقاتی

مضنون ادبی انٹل کالج میگزین بابت ماہ اگست ۱۹۳۳ء میں شائع کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ سلف میں قوم مذکور کو زبان فارسی سے کس قدر دلچسپی تھی انہوں نے از ۲۴۱ھ تا ۲۵۱ھ ہر گویا تقریباً ایک صدی کے فارسی لٹریچر کی مختصر فہرست جو ہنود نے لکھا حسب ذیل دی ہے۔

۳۷	علم تاریخ
۱۱	سوانح و سیر
۴	ریاضی
۱۲	تراجم
۹	قصص
۱۹	انشا
۳۵	شعرا
۱۲۶	

مسلمانوں اور سکھوں کے عہد حکومت کے بعد انگریزوں کی ابتدائی عملداری میں بھی دفتری زبان فارسی تھی اس کے بعد اگرچہ بظاہر اردو نے فارسی کی جگہ لے لی۔ لیکن فارسی زبان کے الفاظ نے اردو میں بکثرت داخل ہو کر اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ اردو زبان میں جو ہندوستان میں ہمہ گیر کاروباری زبان ہے فارسی الفاظ کا عنصر غالب ہے۔ اگر عربی الفاظ اردو میں ہیں تو اسلئے کہ وہ فارسی میں پہلے سے داخل ہیں۔ گویا وہ بھی اب فارسی کا مال ہیں اور زبان فارسی کے ساتھ شیر و شکر ہو چکے ہیں۔ اور ”تاکس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری“ کا مصداق بن چکے ہیں

نظر میں حالات ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی زبان کا ہند اور اہل ہند سے ایک دیرینہ اوپر گہرا تعلق ہے۔ اور اسی لئے یہاں کے صیغے ہائے محاورت نے اُس کو داخل نصاب کیا ہوا ہے اور اس کی تعلیم ابتدائی درجے سے انتہائی درجے تک دی جاتی ہے۔ منشی فاضل کا درجہ انتہائی تو پہلے تھا ہی۔ لیکن اب کسی سال سے پنجاب یونیورسٹی نے فارسی کا ایم۔ اے امتحان بھی مقرر کر دیا۔ اس وقت طلباء فارسی مشرقی اور مغربی دو طور پر قبول سے اس کی تحصیل کرتے ہیں گویا ایک فارسی فارسی خواں طبقہ ہے اور دوسرا انگریزی فارسی خواں فرقہ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس ملک میں زبان فارسی کی تحصیل کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب وہی پانچ اسباب ہیں جو سابق بیان کئے گئے۔

پہلی صورت ظاہر ہے کہ ہندی مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان رشتہ اسلام قائم ہے نیز فاتحین

اسلام کے ساتھ یہ زبان اس ملک میں آئی۔

دوسرا سب بھی برصداق ”عیان راجہ بیان“ تصنیفات زبان فارسی داخل نصاب ہیں اور یہ تصنیفات جلد علوم فنون مشرقی کی حامل ہیں مثلاً فلسفہ - منطق - طب - تاریخ - علم کلام - علم بیان وغیرہ۔ تیسرا پہلو کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ مسلمانوں کی ہر قسم کی کثیر التعداد کتب مذہبی زبان فارسی میں جو ہیں۔ جن میں قرآن مجید اور احادیث کی تفاسیر۔ فقہ تاریخ اسلام وغیرہ شامل ہیں جنہیں فارسی خوان مسلمان استفادے کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ ان علوم کے بے انتہا خزانے اس زبان میں موجود ہیں جن کی کمی فارسی زبان ہے۔

چوتھی وجہ بھی محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے اردو کی ترویج سے پہلے اکثر کتب مذہبی کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ تاکہ جو لوگ عربی خوان نہیں وہ ان ترجموں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ پانچویں جہت بھی مخفی نہیں ہے۔ ہندوستانی متیاح اور تاجر ایران میں جاتے رہے ہیں۔ اور اب بھی کم و بیش یہ سلسلہ جاری ہے خصوصاً مسلمانوں کا ایک جم غفیر زیارات مقامات مقدسہ کے لئے جاتا رہتا ہے۔

فارسی زبان کی اہمیت بلحاظ محاسن و خصائص

علاوہ ان اسباب کے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ زبان فارسی اپنے محاسن و خصائص کی وجہ سے بھی لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یورپ کے علمائے فلسفہ زبان (فیلالوجی) نے بالاتفاق اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے کسی نے فرینچ زبان سے نسبت دی ہے۔ چنانچہ ایک فرینچ اہل زبان لکھتا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ ”اس میں شبہ ہے نہ مبالغہ کہ فارسی عمدہ زبانوں میں سے دلپذیر ہے۔ وہ اپنے ذخیرہ الفاظ و محاورات سے ہر قسم کے مضمون کو مناسب اور نیا قالب میں ڈھال لیتی ہے۔ اور اسے مشرقیہ میں سے یہ زبان شاعری اور انشا پر دازی کیلئے بالطبع مناسب و موزوں ہے“ (اقتباس از دیباچہ مکالمہ فارسی مصنفہ موسیو مکولافنسل دولت فرانس مقیم طہران)

دیگر دانایان فنات بھی قریب قریب انہی الفاظ میں اس کی خوبی کا ذکر کیا ہے تفصیل کے لئے شائقین بحث فارسی حصہ دوم کے آٹھویں لکچر کا مطالعہ کریں۔

آزاد مرحوم صاحب جو فلسفہ زبان فارسی کا مصنف بھی ہے۔ اس زبان کی ممتاز خوبیوں کو اپنی سندان فارسی میں وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ خاکسار بالاختصار حوالہ نقل کرتا ہے۔

(۱) فارسی زبان نے دوسری زبانوں خصوصاً عربی کے الفاظ مفردہ اور فارسی الفاظ کے ساتھ ان کی ترکیب

اور خالص فارسی ترکیبوں سے وہ وہ نئے معانی اور معانی میں لطافت اور نزاکت پیدا کی ہے کہ عقل و دماغ اسے تشنگانِ تغصیلِ سخن دانِ فارس کے متذکرہ بالا لکچر کے چشمہ شہیر سے اپنی پیاس بجھائیں میں یہاں بغموائے ”مشتے نمونہ از خروارے“، مثلاً ایک دو باتیں عرض کرنے پر لکھنا کرنا ہوں۔

مثلاً ذوقِ عربی لفظ ہے جس کے معنی عربی میں چکھنے کے ہیں۔ فارسی زبان میں اگر ”ذوقِ کر دن“ نے کیا مزید ارمعتی پیدا کئے کہ اصحابِ مذاق کی زبانِ ذوقِ چٹخارے بھرتی ہے مگر زبانِ بیان نہیں کر سکتی۔ اس ذوق و شوق کی کیفیت کے مزے دل ہی لٹٹا ہے۔ بقول شخصے

حدیثِ سرِ دل دل اندویش زبان لب و راں محرم نباشد

مثلاً آزاد مرحوم اپنے سیاحت نامہ ایران میں لکھتے ہیں ”در شیراز روزے برقرار خواجہ حافظ رستم۔ فاتحہ میخواندم کہ مطلع خواجہ بخاطرم گذشت“ (مطلع)

در نماز خم ابروے تو نایا دآمد ملتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

کیفیت طاری شد کہ شرحِ آنرا حوصلہ بیان برنہ تابد۔ اس قدر سے دیدم کہ لب خندان است و دیدہ گریان و دل از ہر دو بر کران ناکہ بمنزل رسیدم میخواندم و ذوق ہائے کردم“

اب اس کی اپنی مختلف ترکیبوں پر غور کرو۔ وہی اسم اور امر ہیں کہ ملکر کبھی اسم فاعل اور کبھی اسم مفعول کبھی حاصل مصدر اور کبھی اسم ظرف اور گاہے اسم آلہ کے معنی دیتے ہیں۔ ایک ہی قسم کی ترکیب پانچ مختلف معنی دیتی ہے۔ لفظ ”دستگیر“ کو دیکھو۔ کہ معنی دست گیرندہ (مدد کرنے والا) اور دست گرفتہ (گرفتار) دونوں معنی ایک دوسرے کے متضاد۔ مگر عبارت میں بلحاظ سیاق عبارت ہر ترکیب اپنے معنی بر مل بناتی ہے۔ کیا مجال کہ دوسرے معنی لگ سکیں۔ مثلاً او در اں پریشاں عالی از راہِ ترجم اورا دستگیر شد (امد نمود) اور ”اور در جنگ بدست دشمنان دستگیر شد ہلاک گشت“ یعنی او بدست دشمنان اسیر یا گرفتار شد۔ اس کے سوا اور کچھ معنی نہیں ہو سکتے۔ دیکھو در اور بر افعال کے ساتھ عموماً زاید آتے ہیں۔ مگر کبھی معنی پیدا کرتے ہیں مثلاً در افتادن (اڑنا) اور بر افتادن (گر پڑنا) دیکھو و نواپنا جلوہ ایک ہی جگہ دکھاتے ہیں (ع)

باد و رکشاں ہر کدور افتاد و بر افتاد

دوسرا تہمیز و صفت یہ ہے کہ اس کے بہت سے الفاظ مفرد اور جاد معلوم ہوتے ہیں مگر مرکب اور مشتق نہیں نقل ہیں اصل معلوم ہوتے ہیں۔ اور محسوس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً کند۔ مبدل خند کہ اصل میں خم و نڈ تھا کہ خم والی چیز ہے۔ یا مثلاً تیغ مبدل تیز ہے۔ و تہ تسمیہ ظاہر ہے۔

ذرا محاورات پر غور کرو محسوس سے فصاحت اور وضاحت ٹپکتی ہے۔ مثلاً ”رغن از کدوئے خشک بجاؤ“

یعنی اپنی محنت اور تہمت سے ایسی جگہ سے مطلب نکال لیتا ہے جہاں سے مطلب برآری محال ہو۔ باد پیمودن۔ آہن سر و کوختن۔ دام برہو انداختن۔ تینوں محاورے فعل عربی کے معنوں کو کس وضاحت سے بیان کرتے ہیں کہ کسی ذلیفیم سے ان کا مفہوم بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔
تبسیرا وصف رنگین اور شیرینی ہے۔ اس کی تشبیہات اور استعاروں کی گھلاوٹ نے فارسی کو ایسا رنگین و شیریں بنایا ہے۔ کہ صاحبانِ ذوقِ سلیم کی آنکھوں میں کھبی ہوئی ہے۔ اسی وصف کی برکت سے دیکھش مناظر اور دلز با جذبات کی منہ بولتی تصویریں کھینچتی ہے۔

چون تھا وصف مبالغہ ہے کہ گو کلام کو اصلیت اور حقیقت سے دور بھینک دیتا ہے۔ اور صاحبانِ دیانت کے نزدیک کذب و افترا کی سرحد میں داخل کر دیتا ہے۔ مگر فارسی میں مبالغہ کس لطافت سے جوش تحریک پیدا کرتا ہے۔ ترغیب و تحریص دلاتا ہے۔ ادبِ فارسی میں اسی وصف کی بدولت جا بجا قومی اور ملکی بلند ہمتی اور غیرت کے دریا موجزن ہیں۔ دیکھئے ہم کہتے ہیں ”کیا کریں تن بہ تقدیر بیٹھے ہیں“ ایرانی کہتا ہے ”دست از جاں شستہ ام و نشستہ ام“ یا ”تن بہشتن دادہ ام“ وغیرہ کسٹنے والا کانپ اٹھے کہ جو شخص اس طرح مرنے مارنے پر تلاء بیٹھا ہے۔ جو کچھ کر بیٹھے سچ ہے۔ یا مثلاً ہم کہتے ہیں۔ ”اس سفر میں بڑی دشواری جہاز کی سواری کی ہے“ ایرانی کہتا ہے ”من جہاز را پر کا ہے نے گیرم“ دونوں کا مقابلہ کرو۔
 ”یہ ہیں تفاوتِ راہ از کجاست تا کجما“

یا بچواں وصف فصاحت و بلاغت ہے۔ کہ زبان کی جان ہے۔ فصحاءِ ایران نے اس میں وہ وہ کل افشائیاں کی ہیں کہ دیکھنے سے تعلق کھنٹی ہیں۔ ذرا اس روزمرہ گفتگو پر خیال کرو۔ ایک شخص نا شبانی سے روٹی لیتا ہے کہ روٹیاں ایران میں تُل کر کیتی ہیں۔ گاہک دکاندار سے کہتا ہے کم ہے۔ دکاندار جھٹ ترازو میں رکھ کر دکھاتا ہے کہ دیکھو۔ کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ دیکھئے ایرانی اس مطلب کو کیوں کر ادا کرتے ہیں۔
 (مشری باناؤ!) کم است آغا!

(ناناؤ!) (روٹی ترازو میں رکھ کر) انیک ترازو سلام مے کند (یعنی زیادہ ہے)
 اب بلبل شیراز کی نغمہ سنجی بھی سن لیجئے۔ جاڑے کی اندھیری رات میں جردوں کی زبانی کہتے ہیں۔ ”چہ حرام زادہ مروماند کہ سنگہار رابستہ و سنگبار اکشادہ“ اس فصاحت پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ اور ملاحظہ فرمائیے، بادشاہ ایک گدا سے کہتا ہے۔ ”دا“ن پھیلا۔ وہ کہتا ہے ”د“امن از کجا آرم کہ جبامندارم“ صاحبِ مظلوم کہتے ہیں کہ کاش سعدی میری ساری کتاب لے لیتے اور یہ فقرہ ویدیتے ”از بستر زمرش برخاستہ تر گزمرش نشاند“ فصاحت و بلاغت کی اس بہا کی سیر کے مشتاق گلستانِ سعدی کی سیر کریں۔

قدم قدم پر ”کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا ست“ اس گلستانِ سدا بہار میں چپے چپے پر خوش بیانی کے نکل بولے طیر کرنے والوں کے وماغوں کو معطر کرتے ہیں۔ اور انہی چیزیں دل نے غیر ملکوں کے لوگوں کے دلوں میں بلکہ آنکھوں میں جگہ دی۔ عرض فصاحت و بلاغت کے جواہرات سے فارسی کا مخزنِ ادب مالا مال ہے۔ جس سے لوگ نہال ہو گئے۔

حقیر نے اب تک جس قدر خامہ فرسائی کی محض اس لئے کہ ناظرین کرام پر روشنی ہو جائے کہ زبان فارسی کی تحصیل کبوں ضروری ہے اور یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس میں میرا روئے سخن محض اُن ناظرین کی طرف ہے جو مفصلات میں رہ کر ان حالات سے کما حقہ آگاہ نہیں (مجھے یقین واثق ہے کہ اُن میں سے اگر ہزاروں نہیں تو بلا مبالغہ سینکڑوں میرے شاگرد ہو گئے) ورنہ ایسی باتیں شہری اساتذہ و شیخ التقر کے پیش کرنا۔ ”چراغ پیش آفتاب روشن کردن“ یا حکمت بلقاء آموختن“ کا مصداق بننا ہے۔ دیہاتی معلمین جو اُن مدارس میں زبان فارسی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ انہیں شاید یہ مضمون فارسی کی تعلیم میں رہنمائی کر سکے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ فارسی زبان اُن بیشمار خوبوں کی حامل ہے جو ایک جہذب علمی زبان میں ہونی چاہئیں یہ امر مسلمہ ہے کہ ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ جس کی تکمیل کے بغیر طلباء دوسرے مضامین سمجھنے میں کما حقہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور اُردو زبان پر حاوی ہونا زبان فارسی کی تحصیل پر منحصر ہے۔ کیونکہ بقول آزاد مرحوم ”اُردو نے فارسی کا دو پی کر پورش پائی ہے“ جس کے معنی یہ ہیں کہ اُردو کے ذخیرہ الفاظ میں فارسی الفاظ اور عربی مستعملہ فارسی کا عنصر غالب ہے۔ پُرانے اُردو علم ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں بجز تھے۔ میں سے۔ اور وغیرہ افعال و روابط ٹھوس فارسی فقرات بھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً انشا مرزا جانانِ نظر کو لکھتے ہیں ”استشیاق بالایطابق تقبیل عقبہ عالیہ نہ بعدے تھا کہ سلکِ تخریر و تقریر میں منظم ہو سکے“ ذرا غور کرو کہ ازین قبیل اُردو عبارات کو سمجھنے کیلئے فارسی زبان پر کافی عبور کس قدر ضروری ہو۔ اس جملے میں اگرچہ جمیع الفاظ عربی ہیں مگر مستعملہ فارسی ہیں اور ترکیب فارسی کے ساتھ آئے ہیں۔ جملہ مذکور اب بھی اگر بولینگے تو کہیں گے ”مجھے آپ کی قدسوسی کا بید شوق اس قدر تھا کہ تخریر و تقریر میں ہما سکے“ اس میں بھی دیکھ لو کہ کس قدر فارسیت ہے۔ علاوہ ازین قواعد صرف و نحو کی اصطلاحات گو عربی ہیں اُردو نے فارسی سے لیں۔ اور فارسی کے محاورات اور ضرب الامثال کا ترجمہ کر کے انہیں اُردو کا لباس پہنایا جو زبان کی وسعت کا باعث ہوا۔ ایک فارسی خواں اُردو میں اُن کا مفہوم فوراً سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ فارسی میں اُس کے معنی سے وہ آشنا ہے۔

فارسی کی تدریس ہمارے مدارس میں

انکوں آدم بر سر مطلب۔ یعنی اب میں فارسی کی تدریس پر اپنے ناقص تئیل سالہ تجربہ کی بنا پر کچھ روشنی ڈالوں۔ کیونکہ مجھ سے فرمائش یہی کی گئی تھی۔ کہ فارسی کے طریقہ تعلیم کے متعلق کچھ خامہ فرسائی کر دوں۔ بقول غالب (مرحوم) (ع) ”منظور۔ ہے گزارش احوال واقعی“ نمود و نمائش منصوص و انہیں۔ کہیں ریو و یا کا شبہ نہ ہو۔ ناظرین باتگبین! ابتدائے ملازمت سے اب تک خاکسار کا واسطہ آر دو فارسی کی زبانوں کی تعلیم سے رہا۔ اس امر کا نہ تو مجھے دعویٰ ہے نہ فخر کہ مجھ سے ان کی تعلیم کا کما حقہ حق ادا ہوا۔ مگر اس امر سے ہمیشہ مطمئن رہا کہ اپنی بساط کے مطابق شوق سے پڑھاتا رہا۔ اور شوق ہی دنیا میں وہ چیز ہے۔ کہ بقول شخصے (ع) ”شوق در ہر دہل کہ باشد رہبرے در کار نیست“ ممکنہ تربیت (ٹریننگ) کے اصولوں کی اندھی تقلید نہیں کی۔ جس کا جہاں ہوزوں استعمال و کیہا استعمال کر لیا۔ میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی تربیت گاہ (ٹریننگ انسٹیٹیوشن) معلم نہیں بنا سکتی۔ جب تک اس میں تعلیم و تعلم کا طبعی ذوق شوق موجود نہ ہو۔ ہاں جس میں یہ مادہ ہوگا۔ تربیت سے ضرور جھپکے گا۔ اور اس کی جلا ہوگی۔ تربیت سے ہمیشہ ہر شخص حسب قابلیت کسب فیض کرتا ہے بقول شخصے ۷

باراں کہ در لطافت طبعش غلات نیست

در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

زمانہ سلف کے اساتذہ مشاہیر کو دیکھو کس ٹریننگ کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ مگر اپنے فیضانِ تعلیم سے ہزاروں شاگردوں کو استادِ زمانہ بنا گئے۔

تدریس زبان فارسی در ملک ہند

فارسی زبان جیسا کہ سطور بالا میں بار بار دہرا گیا ہے۔ ایک دلکش شیریں زبان ہے۔ پھر ہمارے مدارس میں طلباء کو اس سے کیوں لچپی نہیں۔ یہ تدریسی نقص ہے۔ ابتدائی تعلیم کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ طلباء ہمیشہ اسے روکھی پھکی زبان سمجھتے رہتے ہیں۔ بے صداق ۷

خشت اول چوں ہند مہمار کج

تاثر تیا مے رود دیوار کج

میں نے ابتدائے ملازمت میں وزیرِ کلر مکمل سکولوں کے بعض استادوں کو سنا اور کمرستنا۔ کہ انہیں کلر و کلر

سکولوں میں طلباء اردو فارسی میں شوق نہیں لیتے۔ اس لئے ہم تو وہاں جانا پسند نہیں کرتے مجھ سے میرے کئی دوستوں نے بار بار ازراہ استعجاب پوچھا۔ کہ یار تم انگریزی سکولوں میں کس طرح گزارہ کرتے ہو۔ میں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ مجھے تو کوئی شکایت نہیں میرے طلبہ میرے مضمونوں میں براہ کی دلچسپی لیتے ہیں۔ میرے متعلق فاضل افسران معائنہ کے یہ رسا کس فائل میں ہیں کہ ”مدرس زبان فارسی کی تعلیم کا بہت شوق رکھتا ہے“ مکر عرض کرتا ہوں کہ ناظرین ان باتوں کو خود مستاتی پر محمول نہ کریں۔

تدریسی نقائص میں محض اساتذہ ہی ذمہ دار نہیں ہیں۔ بلکہ اس بارے میں بہت سی ذمہ داریاں صبیحہ معارف پر بھی عاید ہوتی ہیں، مثلاً :-

۱۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کہ فارسی ہمارے مدارس میں چوتھی جماعت سے شروع ہو کر تہی تھی۔ جسے اب ساتویں جماعت سے شروع کیا جاتا ہے۔ (ع)۔ یہ ہیں تفادوت راہ از کجاست تا کجا سنا رسی کے اس تنزل سے اردو پر ہیست پڑا اور پڑنا چاہئے تھا۔ سکولوں میں پڑھاتو لے خوب واقف ہیں (ع) کیا دانندہ حال ماس بکسا دان رسا حلما۔ یہاں یہ جتنا دینا ضروری ہے کہ محکمے کے ارباب عل وعقد نے طلبہ کی نازک دماغی کو مد نظر رکھ کر ان پر رحم کیا ہے کہ ایک ہی وقت میں بہت سی زبانیں نہ سکھائی جائیں۔ بیشک طریقہ تعلیم کے فلسفیانہ اصولوں کے ضروریات خلاف ہوگی۔ جیسا کہ ایک فلاسفر کا قول ضرب النسل ہے ”حساب جو کا توں اور کلبا ڈو با کیوں“، مگر عملی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ طالب علم اچھی لیاقت کے طالب علم تھے جن پر وقت واحد میں متعدد زبانوں کے سیکھنے کا بار گراں پڑ جاتا تھا۔ جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی وہ ان سے بدرجہا اچھے تھے۔ طب کا مسئلہ ہے۔ کہ جس قدر ذہن مضبوط اور لطیف غذا کھائی جائے۔ کہ جس کے ہضم میں مددے کو بہت کم کام کرنا پڑے تو وعدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہمارے موجودہ طالب علموں کا ہے۔ یہ امر تغفیل طلب ہے۔ انشاء اللہ اسے الگ مضمون کی صورت میں محکمہ عالیہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

۲۔ نصاب تعلیم کے مقرر کرنے میں کافی اور ضروری احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ گلستان کے پہلے دو باب کا انتخاب جن کی طرز تحریر اور مضامین عالمانہ ہے۔ اور مصنف نے ان کے لکھنے میں پورا زور خرچ کیا ہے۔ کیونکہ ان میں بادشاہوں اور درویشوں کی طرف خطاب ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اور دوسرے ابواب کا انتخاب بڑی جماعتوں میں۔ جو طریقہ حلیم کے اس زیریں اصول کے صریح خلاف ہے کہ ”آسان سے مشکل کی طرف چلو“ اگر محکمہ عالیہ چند جدیدہ تجربہ کار اساتذہ زبان فارسی کی ایک کمیٹی انتخاب نصاب کیلئے مقرر کرے اور ماہرین زبان مذکور جو محکمے میں مناصب رفیعہ اور مدارج مینہ پر فائز ہیں اختساب کا کام کریں تو ایک فضول نصاب مقرر ہو سکتا ہے۔

۳۔ ہمارے مدارس ثانوی میں زبان فارسی اور دیگر اساتذہ شریفیہ (کلاسیکل لنگویج) کی ترغیب کے سامان مفقود ہیں پُرانا ذخیرہ ادب تو کم و بیش سب سکولوں میں موجود ہے مگر مبتدیوں میں شوق پیدا کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی سلیبس فارسی کتب لائبریری میں ہونی چاہئیں جن میں علاوہ سلاست عام فہم و کثرت مضامین۔ لطائف اور حکایات ہوں۔ اس نقص کی تلافی کے لئے محکمہ عالیہ ایران سے بہت سی نظم و نثر کی قدیم و جدید کتب جو اس مطلب کیلئے موزوں ہوں منگواسکتا ہے۔ اور یہاں بھی لکھی جاسکتی ہیں۔

۴۔ مدارس میں قابل ہیڈ ماسٹر صاحبان اور فاضل افسران معائنہ ان زبانوں کی تعلیم کو بہت ضروری خیال نہیں کرتے اور اسی لئے ان کی دیکھ بھال میں کما حقہ حصہ نہیں لیتے۔

۵۔ جے۔ وی۔ اور ایس۔ وی جماعتوں میں کم از کم فارسی زبان کی تعلیم کا معیار وہی ہونا چاہئے۔ جو آج سے پچیس تیس سال پہلے تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمیں ایس وی کلاس میں استاد نے علم و رض علم معانی بیان اور ضائع بدائع کے متعلق جو کچھ لکھوایا تھا۔ منشی فاضل کے امتحان میں اتنے ہی کی ضرورت تھی وہ کاپی میرے پاس اب تک موجود ہے۔ اور اب ایس وی کلاس کے پہلے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی حالت اور موجودہ حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس وقت کے ایس وی اب تک کامیابی سے باقی سکولوں میں کام کر رہے ہیں۔

اب وہ باتیں عرض کرتا ہوں جو معلمین زبان فارسی سے تعلق رکھتی ہیں۔

۱۔ عموماً الفاظ کے معانی اور عبارت کے ترجمے کے رٹولنے کی طرف زور دیا جاتا ہے۔ اور اسی کو اصل مقصود سمجھ لیا جاتا ہے۔ صرف و نحو کے قواعد بھی اسی طرح یاد کر لئے جاتے ہیں۔ عہد القیاس اُردو سے فارسی میں ترجمے کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ یعنی پیٹنٹ ترجمہ بلیک بورڈ پر لکھ دیا جاتا ہے۔ کطلبہ بچوں پر نقل کر لیں اور زیادہ سے زیادہ حفظ بھی کر لیں۔ لیکن اگر لڑکے نے ”تو نے کہا“ کا ترجمہ ”تو گنتی“ یاد کر لیا ہے۔ اگر اُس سے پوچھا جائے تو فرسٹ سنا دیتا ہے۔ لیکن اگر اُسے کہا جائے کہ ”میں نے کہا“ کا ترجمہ کرو تو نہیں کر سکتا۔ ”میں نے کہا“ کا ترجمہ ہائی کلاس چھوڑ کالج کے بعض طلبہ بھی ”من گفت“ کرتے ہیں۔ علاوہ انہی زبان فarsi میں جو اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ بھری ہوئی ہے خصوصاً گلستاں اور بوستاں ہیں۔ اس کی طرف طلبہ کی توجہ نہیں دلائی جاتی۔ ترجمے پر ہی اکتفا جاتا ہے۔ لیکن مطالب مذکور مزید تشریحات کے محتاج ہیں اور ساتھ ہی طرزِ بیاں مؤثر یہ کہ وہ باتیں دلنشیں ہو جائیں۔ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ بعض اوقات ایک پیرمڈ میں بوستاں کے ایک ہی شعر کی تشریح ہو سکتی ہے اور وہ بھی طلبہ کی استعداد اور ضرورت کے مطابق۔ ورنہ بلا سبالغہ بوستاں کے ایک ایک شعر پر اور گلستاں کے ایک ایک فقرے پر ایک مبسوط کتاب لکھی جاسکتی

ہے ہاں مقدار نصاب کے مقابلے میں قلت وقت کی شکایت ضرور ہے۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ معلمین زبان فارسی ایک زبان ہو کر اس کے لئے صدائے احتجاج بلند کریں۔ اور جب تک محکمہ عالیہ اس کی اصلاح نہ کرے گا ورنہ بلند کئے جائیں۔ اس بیماری کا مقامی علاج جو ہمارے بس میں ہے اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم تھوڑا پڑھائیں۔ مگر جس قدر پڑھائیں۔ اس طرح سمجھا کر کہ اس سے طلبہ میں شوق پیدا ہو جائے۔ ہر مضمون میں کامیابی کا واحد گزشتہ شوق کا پیدا کرنا ہے۔

کچھ دن ہوئے ٹریننگ کالج سے ایک سنیس مشرقی زبانوں کے نصاب متعلق آیا تھا۔ اس میں بدل کی جماعتوں کے لئے فی سال سو صفحہ تجویز کیا ہوا تھا جو مناسب و موزوں ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ سالیقہ سہ سالہ نصاب کی کتابوں میں سے سو صفحہ ساتویں کے لئے اور سو صفحہ آٹھویں کے لئے منتخب کر لیں۔ لاہور میں اوریٹل ایسوسی ایشن قائم ہے جس کی مساعی جیل سے میٹریکولیشن کے نصاب فارسی کی کچھ اصلاح ہو گئی ہے پنجاب کے دیگر اساتذہ اس سہ شرفیہ نے ایسوسی ایشن مذکور سے الحاق نہیں کیا۔ اگر ایسا ہو جائے تو ملکہ کچھ مفید کام ہوتا رہے۔ عنقریب رسالہ رہنمائے تعلیم کے ذریعے اوریٹل ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد شائع کئے جائیں گے۔

اب خاکسار اپنا دستور العمل جسے تعلیم میں مد نظر رکھتا ہے عرض کر کے مضمون ختم کرتا ہے۔

۱۔ ابتدائی جماعتوں میں الفاظ کے تلفظ کی صحت اور عبارات کی قرأت کے اصولوں کی پابندی کے علاوہ تراکیب فارسی اچھی طرح ذہن نشین کرائی جائیں۔ مثلاً مضامین مضامین البیہ۔ اشارہ مثلاً البیہ۔ جار مجرور وغیرہ۔
۲۔ افعال کی شناخت اور ان کے بنانے کے طریقے خوب سمجھا کر یاد کرائے جائیں۔ طوطے کی طرح رٹوائے نہ جائیں۔ ضمائر منفصل اور متصل کی اصطلاحیں تو شروع میں نہ بتائی جائیں۔ البتہ تصور ذہن نشین کر دیا جائے۔ ضمائر متصل فاعلی اور ضمائر منفصل فاعلی کی مطابقت سمجھا دی جائے۔ لڑکے طوطے کی طرح گردان رٹ لیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی صبیغہ کے معنی پوچھے جائیں تو نہ ارد۔ وہ یہ نہیں بنا سکتے کہ گفتند میں انہوں نے کس لفظ کے معنی ہیں۔ نہ ہی یاد م۔ یہ ضمائر متصل فاعلی کی شناخت خوب اچھی طرح کرائی جائے۔ اور ضمائر منفصل کے ساتھ مطابقت بھی اچھی طرح ہو جائے۔ مشتق کے لئے ماگفتم۔ تو گفتند شما گفتی کو درست کرایا جائے اور وجہ درست دریافت کی جائے۔ یہ بنیادی غلطیاں ہیں کہ اعلیٰ جماعتوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

۳۔ قرأت کی درستی کے بعد مشکلات کی تشریح ایسے پیرائے میں کی جائے جو کہ طلبہ کی دلچسپی کا باعث ہو۔ اسی ضمن میں صرف و نحو کے مسائل ضرور بھی بتائے جائیں۔ کہ وہ بھی مطالب کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً سبوا کے معنی صرف ”ایسا نہ ہو“ بتا دینے کافی نہیں اس کی پوری تشریح کی جائے۔ گریہ کا علیحدہ کوئی سبق نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ بعض اساتذہ ایک پیرائے میں گریہ کا نام نہیں لیں۔ کہتے ہیں۔ گریہ علی طور پر ریڈنگ اور ترجمے کے اسباق کے

ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے۔ ہر سبق میں ایک دو مسئلے مد نظر رہیں۔ جن میں باہم ربط بھی ہو۔ مثلاً اگر مرکب اضافی بتائیں تو اسی سبق میں دیکھیں کہ تک اضافت اور قاب اضافت کی صورت موجود ہے یا اقسام اضافت میں سے کوئی قسم بتائی جائے۔ کہیں علامات اضافت میں سے کوئی سمجھا دی جائے۔ غرض ”جو سندہ یا بندہ“ جب مدرس کو شوق ہو تو ایسا سلسلہ آپ سے آپ مل جاتا ہے۔ اگر آج ایک سبق میں ایک بات بتائی ہے۔ تو اگلے روز کے سبق میں ضرور پوچھنا چاہیئے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ طلباء اس پر جا دی ہو گئے ہیں۔ قرأت کے اسباق میں کئی شکل اور ضروری لفظ یا محاورے کے معنی اچھی طرح دلنشیں کرنے کیلئے ایک ایسا اردو فقرہ بنا کر اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا جائے۔ جس میں اس لفظ یا محاورے کا استعمال ہو جائے۔ مثلاً ”دل در کسے بند کہ دل بستہ تو نیست“ میں ”دل بستن“ محاورہ ہے۔ اب ایک تو دل بستہ سے حاصل مصدر اسی بنوایا جائے۔ اور ترجمہ کے لئے فقرہ دیا جائے ”دنیا دل لگانے کے قابل نہیں“ اسکا ترجمہ طلبہ ”دنیا قابل دل بستگی نیست“ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ دل بستگی دلنشیں ہو گئی ہو۔ پھر استاد ”دنیا دل بستگی را نشاند“ بھی بتا سکتا ہے۔ غرض قرأت صرف و نحو اور ترجمے کی تعلیم ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے۔

۴۔ بعض مشکل فقرات کو آسان فارسی الفاظ میں تبدیل کرنا چاہیئے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ طلباء ان کے مفہوم پر جا دی ہو گئے ہیں یا نہیں۔ مثلاً ”او غریق بحر فنا گردید“ اس کا ترجمہ ”وہ بحر فنا میں غرق ہوا“ یا ”وہ فوت ہو گیا“ اب طلبہ سے اگر کہا جائے کہ آسان فارسی الفاظ میں اس کو تحویل کرو تو وہ آسانی سے ”او فوت شد“ یا ”او مرد“ کر سکتے ہیں۔ یا مثلاً ”مگر از دست بر آید دہنہ شیریں کن“ کا مفہوم سمجھانے کے بعد طلبہ اس کو ”اگر بتوانی بہ کسے راحت رساں“ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اگر بالفرض طلباء آسانی سے آسان الفاظ میں تبدیل نہ کر سکیں تو استاد اس طرح بتا سکتا ہے ”سبق میں دلچسپی بھی ہوگی اور طلبہ کی رہنمائی بھی کہ وہ آئندہ اس طرح مشکل عبارات کو آسان لفظوں میں تبدیل کر سکیں گے میں نے عملی طور پر کر کے دیکھا ہے۔ کوئی دقت پیش نہیں آتی۔“

۵۔ بعض فارسی فقرات میں فعل یا اسم کے صیغوں میں تبدیلی کر کے عبارت درست کرائی جائے۔ اس سے بھی طلبہ کے دماغ پر زور پڑتا ہے۔ مثلاً ”تو باید کہ امروز بروی“ میں ”اگر تم کو مرا سے بدل دیں تو فقرہ کس طرح ہوگا۔ وغیرہ علاوہ ازیں غلط فقرات کی درستی۔ نامکمل فقرات کی تکمیل سوالات کے جوابات مغالی جگہوں کو پُر کرنا بھی حسب استعداد طلبہ پیش نظر ہے۔ یہ باتیں ”مشقے نمونہ خرواے“ میں۔ اگر استاد تندرہ اپنے دماغ سے کام لیں گے۔ تو انہیں ان سے بہتر اور بیشتر ملیں گی۔

جیومیٹری کا ایک اہم سوال

اول

اس کا نیا اور صحیح قاعدہ

(جناب لالہ موہن لال صاحب بھگتہ بی اے بی ٹی پی ای ایس ہیڈ ماسٹر سٹرل ماڈل سکول لاہور)
جماعت ہشتم کی ایک جیومیٹری کی کتاب میں مندرجہ ذیل سوال درج ہے جس کے حل کرنے کے قواعد اور جوابات میں لوگوں کا بہت اختلاف ہے ہم عام ناظرین کی تفریح اور اہل علم و افسانہ میں خاصہ حق رکھنے والے اصحاب کی طبیعت کے لئے وہ تمام اختلافات معاصر کے صحیح حل کے پیش کرتے ہیں۔

سوال۔ ایک مکعب صندوق کا کنارہ ایک فٹ ۱۵ انچ ہے۔ بتاؤ اس کی پینٹنگ کیلئے جبکہ ہر ایک پینٹل 7 انچ لمبی ہو۔ اور اس کے سرے کا قطر ۱۱ انچ ہو ($\frac{22}{7} = 11$)

سوال کی عبارت میں ایک سقم ہے۔ اور وہ یہ کہ صندوق کے کناروں کے متعلق صاف طور پر یہ ظاہر نہیں کیا گیا۔ کہ وہ اندرونی کنارے ہیں یا بیرونی۔ لیکن اگر بیرونی ہوتے۔ تو اس صورت میں لکڑی کی موٹائی بتائی جانی چاہیے تھی۔ چونکہ موٹائی نہیں بتائی گئی۔ اسلئے فرض کرنا پڑتا ہے کہ لمبائی اندرونی کناروں کی ہے۔ اس کے حل کرنے میں (۱) اکثر اصحاب یہ قاعدہ استعمال کرتے ہیں۔ کہ اقل صندوق کی کل جسامت معلوم کر لی۔ پھر ایک پینٹل کی جسامت دریافت کر کے صندوق کی جسامت کو ایک پینٹل کی جسامت پر تقسیم کر دیا۔ جیسا کہ حسب ذیل ہے:-

صندوق کی ہر طرف کا طول = ۱۵ انچ = 22 انچ

صندوق کی اندرونی جسامت = $22 \times 22 \times 2 = 10648$ مکعب انچ

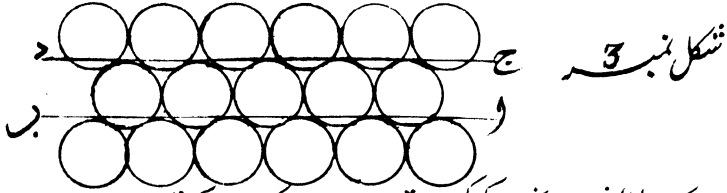
پینٹل کے سرے کی سطح کا رقبہ = $\frac{22}{7} \times \frac{1}{4} \times \frac{1}{4} = \frac{11}{56}$ مربع انچ

پینٹل کا طول = 7 انچ

پینٹل کی جسامت = $7 \times \frac{11}{56} = \frac{11}{8}$ مکعب انچ

کل پینٹلوں کی تعداد = $\frac{11}{8} \div 10648 = \frac{8}{4} \times \frac{968}{10648}$

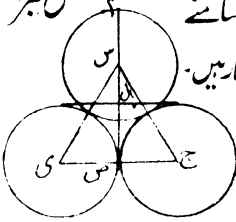
اور یہی جواب کتاب میں بھی درج ہے۔



اس طرح ہر تہ کی موٹائی نصف اینچ سے کچھ کم ہو جاتی ہے اور اسلئے مکمل تہوں کی تعداد ہم سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مندرجہ بالا دو سر قاعدہ بھی اور تعداد بھی غلط ہے۔
ہم اس تعداد کا صحیح صحیح اندازہ یوں لگاتے ہیں:-

سب سے پہلی تہ کی بلندی پورا نصف اینچ ہے۔ اوپر والی تہ کی بلندی ۱/۲ خط کے اوپر سے شروع ہو کر ۵ خط تک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اوپر کی تہ کا جو حصہ خط ۱/۲ کے نیچے ہے۔ وہ اسکی بلندی میں شمار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ پہلی تہ کی پنسلوں کے درمیان سما چکا ہے۔

اس کی صحیح بلندی معلوم کرنے کے لئے ہم پنسلوں کے دائروں کو ذرا بڑا بنا کر سامنے رکھتے ہیں۔ دیکھو۔ سلسلے کی شکل نمبر ۴ میں پنسلیں اسی حالت میں پڑی ہیں۔ یہی ہمیں درکار ہیں۔ تینوں پنسلوں کے مرکزوں کو ملانے سے ایک متساوی الاضلاع تھکن س ج ی پیدا ہو گئی۔ جس کے تینوں اضلاع نصف نصف اینچ ہیں۔ پس اس کا درمیانی عمود س ص



$\frac{1}{2} \times 0.866 = 0.433$ یعنی اینچ ہوگا۔

چونکہ ص ل = س م = $\frac{1}{2}$ اینچ

پس ل م بھی 0.433 اینچ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف پہلی تہ کی پنسلوں نے $\frac{1}{2}$ اینچ اونچی گولہ گیری ہے۔ باقی اوپر کی ہر ایک تہ 0.433 اینچ جگہ گیر گی۔ پس پہلی قسط کے بعد جو باقی اوپر کی $22 - 5 = 17$ اینچ۔

$$\begin{array}{r} 49 \\ 438 \overline{) 21500} \\ \underline{1732} \\ 4180 \\ \underline{3897} \end{array}$$

پس اوپر کی تہوں کی تعداد $433 \div 21500 = 0.433 \div 21.5 = 2$

$49 =$

پس پہلی تہ سمیت کل تہوں کی تعداد $50 = 1 + 49$

یہ بھی ظاہر ہے کہ سب سے پہلی تہ میں ۴۴ پنسلیں آئینگی۔ اور اس سے اوپر کی تہ میں ۴۳۔
اسی طرح تیسری تہ میں پھر ۴۴ پنسلیں آئینگی اور چوتھی میں ۴۵ علیٰ بذالقیاس۔
اس طرح ۵۰ تہوں میں ۲۵ تہیں تو ۴۴ پنسلوں والی ہوگی اور ۲۵ تہیں ۴۳ والی۔

پس ان تہوں میں پنسلوں کی تعداد $43 \times 25 + 44 \times 25 =$

$$87 \times 25 = (43 + 44) \times 25 =$$

$$2175 =$$

اور چونکہ صندوق کے پینے میں اس قسم کی 3 قطاریں ہیں۔ پس تینوں قطاروں میں پنسلوں کی تعداد

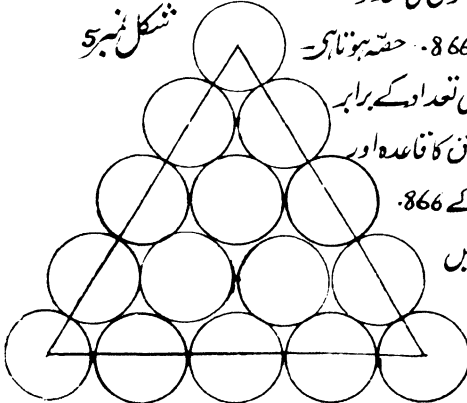
$$6525 = 3 \times 2175$$

اب ایک ایچ نمائی جگہ میں جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ جو پنسلیں ساتھ ساتھ رکھ کر کسی 3 قطاریں لسانی میں آنے سے ہرگز میں 6 پنسلیں اور آجائیگی۔ مگر یاد رہے کہ یہ تہیں ایک دوسری کے درمیان میں نہیں آئیگی۔ بلکہ ایک دوسری کے عین اوپر آئیگی اور اسلئے ان کی تعداد 44 سے زیادہ ہوگی۔ پس 44 تہوں میں پنسلوں کی تعداد $264 = 44 \times 6$ اب کوئہ دالی ایک ایچ مربع اور 2 ایچ اونچی جگہ میں 12 پنسلیں اور آجائیگی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ پس کل پنسلوں کی تعداد $6801 = 12 + 264 + 6525$ اور یہی تعداد صحیح ہے۔

اب مقابلہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلا جواب اصلی سے بقدر 943 زیادہ ہے۔ اور دوسرا جواب اصلی جواب سے بقدر 717 پنسلوں کے کم ہے۔

(۴) اس سوال کو ہم ایک اور آسان طریق سے بھی حل کر سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ پہلے اس اصول کو ذہن نشین کر لیں کہ جب گول چیمیں اس طریق سے قطاروں کی شکل میں نیچے اوپر لگائی جائیں۔ تو ان سے ایک مثلث متساوی الاضلاع پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ نچلی شکل نمبر 5 میں سروں والی پنسلوں کے مرکزوں کو ملائے سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں پنسلوں کی تہوں کی تعداد اتنی ہی ہے۔ جتنی پینے کی قطاریں پنسلوں کی تعداد۔

شکل نمبر 5



اور چونکہ مثلث متساوی الاضلاع کا عمود قاعدہ کا 866 حصہ ہوتا ہے۔

اسلئے بلندی کے 866 حصہ میں پینے کی پنسلوں کی تعداد کے برابر

قطاریں آجائیگی۔ اور چونکہ مندرجہ بالا سوال میں صندوق کا قاعدہ اور

بلندی برابر ہے۔ پس معلوم ہو سکتا ہے کہ جب بلندی کے 866

حصہ میں 44 پنسلیں آسکتی ہیں تو کل بلندی میں کتنی پنسلیں

سا سکیں گی۔

866 میں سا سکتی ہیں = 44 پنسلیں

$$= \frac{44}{866} =$$

تو 1

$$50 = \frac{44000}{866}$$

$$\begin{array}{r} 50 \\ 866 \overline{) 44000} \\ \underline{4330} \end{array}$$

پس ۵۰ تہوں میں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ ۲۵ تہیں ۴۴ والی ہونگی اور ۲۵ تہیں ۴۳ والی۔ اس سے آگے اسی طرح عمل ہوگا جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔

یہ سوال درحقیقت جماعت ہشتم کی قابلیت سے بہت ہی بالا ہے۔ اور اس جماعت کے طلباء اس کا صحیح جواب معلوم کرنے کے بالکل نا قابل ہیں۔ پس اس جماعت کی کتاب میں اس قسم کا سوال درج کرنا طلباء کو مطالعہ اور الجھن میں ڈالتا ہے۔ نہ ہی اس قسم کے سوالات کا تخمیناً جواب نکالنا سوال کے منشا کو پورا کرتا ہے۔

علاوہ ازیں اس قسم کے سوالات طلبہ کی علمی اور عقلی واقفیت میں، بجائے مطابقت پیدا کرنے کے تفاوت پیدا کر دیتے ہیں۔ جو تعلیم کے منشا اور مفاد عامہ ہر دم کے خلاف ہے کیونکہ اُن کی غلط رہنمائی کرنے والی عبارت (۲۲ = ۱۱) علمی کسوٹی پر انہیں پورا نہیں اترنے دیتی۔ اور اس وجہ سے اندیشہ ہے۔ کہ طلبہ علمی اور عقلی ریاضی کو دو مختلف مضامین خیال کرنے لگیں۔ حالانکہ یہ دو نو ایک ہی ہیں۔

یہ سوال درحقیقت ایک بڑے پائے کا سوال ہے۔ اگرچاس جماعت کے معیار سے بالا ہے۔ اگر یہ مناسب موقع پر درج کیا جاتا اور صحیح طریق سے حل کیا جاتا۔ تو اس کے صحیح حل کرنے سے جیسی دماغ کی تربیت ہوتی۔ ویسا ہی علمی واقفیت میں بھی معقول اضافہ ہوتا ہے۔



لطیفہ

ایک دفعہ ذکر ہے کہ ایک گویا کسی بوٹ شاپ کے مالک کے ہاں بطور ہمنام کا کاغذ خانہ نے ہمان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میزبان نے ہمان سے کہا کہ میاں آج کل تمہارے کانے کی بہت شہرت ہے۔ ذرا ہمیں بھی تو سناؤ چنا چچ گوٹے نے اپنی سریلی آواز سے کچھ ایسا اچھا گایا کہ مالک کا کاغذ خوشی کے مامے جھومے لگا۔ اتفاق سے کسی دن وہی دکاندار اسی گوٹے کے ہاں پہنچا۔ اُس نے بھی ہمان کی حزب آؤ بھگت کی۔ دعوت سے فارغ ہونے کے بعد گوٹے نے اپنا پھٹا پڑا بوٹ اپنے ہمان کے آگے رکھ دیا۔ دکاندار حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ میاں یہ کیا ماجرا ہے میزبان نے

جواب دیا کہ جب میں تمہارے ہاں ہمان تھا۔ تو تم نے مجھ سے گانا سنا اور اپنے تئیں خوش کیا۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ میں نے گانے میں ذرا بھی ناہل نہ کیا کیونکہ گوٹے کو گانے کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔ غم بوٹوں کے کاغذ خانہ کے مالک ہو اور میرا پھٹا پڑا بوٹ تمہارا

لطف سخن

(تلخ الشواہج اضرخا دے سخن حضرت نوح ناری جانشینِ دانغ مرحوم)

ملادی لے ہوں مٹی میں ساری آبرو میری بھل جا اب مے دل سونہ میں تیرا نہ تو میری
بنی تھی بات ضبطِ دردِ غم ہی چارو میری مگر اشکوں نے بہ کر ڈوبودی آبرو میری
وہ کیوں بوجھیں وہ کیوں سوچیں وہ کیا جانیں کینا مبارک ہو مجھی کو عشقِ مہر آرزو میری
کروں مٹی کی صورت گشت کیا بازِ عالم کا سمجھتا ہوں کہ ہے میری گرہ میں آبرو میری
جو غم نے ہر جانب سے دل کو گھیر رکھا ملے رستہ بھٹکنے کا تو بھٹکے آرزو میری
ہمیشہ اشکِ غم تکلیں جو دِ شوق سے پہلے نمازِ عشق ادا ہوتی ہے اکثر بے وضو میری
جنہیں انکھ ہے ملنے سوانے سے بلانے نکالیں گے وہی گن گن کر اک اک آرزو میری
اگر کوئی اسے سمجھے گا تو شاید وہ سمجھیں گے بٹھا کر حضرت موسیٰ کو سنئے گفت گو میری
پہلے کہ اپنے ہی ستم اپنا کر و شکوہ وہ اک تصویر رکھ دیتے ہیں میرے رویرو میری
ادھر آئی ادھر کلی تو یہ پاس و فک کیا جو میرے دل میں رہ جائے وہی جو آرزو میری

وہ کہتے ہیں تہا دے سوچ رکھوں میں جہ اب سکا شکایت کیا کر گیا داؤدِ محشر سے تو میری
ہزار قسموں اس بے قدری بازارِ الفت کی ہے کوڑیوں کے مولِ نول آرزو میری
جو ٹھہرا میں ہی سب کچھ تو کسی پرکھوں ڈالو کہ ہر صورت سے صورت ہوگی میرے دہری
ابھی ہیں آرزو کو دیکھ کر آنسو بہا ہوں کبھی میری طرح روئے گی مجھ کو آرزو میری
بڑھایا مرتبہ دل نے وفائے عشق نے غم انہیں چاروں شہرت سے جہاں میں چارو میری
جدا ہے ایک سے جب ایک تو اک ساتھ کیسے تنہا غیر کی حسرت تہا رسی آرزو میری
بہا عشق کو لے کر بہا رحن آئی ہے کھلے گا رنگ اُدھر تیرا اُدھر پھیلے گی بومیری
وہ کہتے ہیں زمانہ مان لے میں تو نہ مانوں گا کیسی بات تیرا موہاں میں آرزو میری
اُدھر یہ شوق ہے مجھ کو ملاؤں اُن سے ماتہ اپنا اُدھر یہ حکم ہے کمِ نجست انگلی بھی نہ چھو میری
کہیں غنچے کہیں گل کیف میں کیف عالم بٹی ہو چلو چلو کیا شراب رنگ بومیری

حرم میں کچھ نہ ہو عورت ہو لے فوجِ ہجر

بلا سے تنگدے میں تو بہت ہے آبرو میری

فنِ تحریر

ہمیں چونکہ بچپن ہی میں پڑھنا لکھنا سکھلا دیا جاتا ہے اسلئے ہمیں کبھی خیال نہیں آتا کہ فنِ تحریر کیسی حیرت انگیز چیز ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جو لوگ فنِ تحریر سے ناواقف ہیں۔ وہ ہمیں لکھتے دیکھ کر اسقدر حیران ہوتے ہیں؛ انگلستان کا ایک مشہوری (مبلغ) جان ولیمز تبلیغ مسیحیت کی غرض سے بحرِ اوقیانوس جنوبی کے ایک ایسے جزیرے میں قیام پذیر تھا۔ جہاں کے باشندے بالکل وحشی تھے۔ ایک روز جب وہ سمندر کے ساحل پر کسی کام میں مشغول تھا تو اُسے ہتھوڑے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہتھوڑا اسکی جائے قیام پر موجود تھا۔ اُس نے ایک سیاہ پتھر پر چاک سے کچھ لکھا اور وہ پتھر وہاں کے ایک وحشی کے ہاتھ اپنی بیوی کو بھجوا دیا۔ بیوی نے پیغام پڑھ کر ہتھوڑا اُس شخص کے حوالے کیا اور وہ اُسے انگریز کے پاس لے آیا۔

پادری یا اُس کی بیوی کیلئے تو یہ نہایت ہی معمولی بات تھی۔ اسقدر معمولی کہ انہیں اس کے متعلق خیال تک بھی نہ آیا ہوگا۔ لیکن اس وحشی کے لئے اس سے زیادہ کیا اہمیت ہو سکتا تھا کہ پتھر کے ایک بے جان ٹکڑے نے پادری کی بیوی کو پیغام کہہ سنایا اور اُس نے پیغام سن کر مطلوبہ چیز دیدی! اس کے بعد وہ وحشی اس پتھر کو عرصہ دراز تک اپنے گلے میں لٹکائے رہا۔ اس کے دل میں اس پارہ سنگ کی جو وقعت تھی اسے وہی کچھ جانستہ ہوگا!

اسی طرح افریقہ کا ایک حبشی کسی مقام سے ایک خط لارہا تھا۔ راستہ میں اُسے تمباکو پیسنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تمباکو تیار کرنے سے پہلے خط کو اُس نے ایک پتھر کے پیچھے دبا دیا۔ وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میں اسے چھپاتا دیتا تو وہ میری اس حرکت کی اطلاع یقیناً مکتوب الیہ کو پہنچا دیتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے۔ کہ ایسے کاغذ جب مکتوب الیہ کے پاس جاتے ہیں تو ”بائیں کر کے“ اسے تمام حالات سے مطلع کر دیتے ہیں! لیکن ہم لوگ جو لکھ سکتے ہیں ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اگر یہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فنِ تحریر فی الواقع ایک نہایت ہی حیرت خیز چیز ہے۔ اور جس شخص یا جن اشخاص نے اسے اختیار کیا ہوگا انہیں پہلے پہلے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا۔

فنِ تحریر جو آج مہذب ممالک میں رائج ہے معلوم نہیں کہ اس نذرِ دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ اس کا موجد کون تھا یا وہ کب وجود میں آیا یا ہاں تخلیقات جدید نے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچا دی ہے کہ دنیا میں جتنے تحریریں ہیں ان کی بنیاد نقوش اور تصاویر پر رکھی گئی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں

کہ وہ لوگ عکسی تصاویر سے کام لیتے تھے یا وہ اعلیٰ درجہ کے نقاش و مصور تھے۔ نہیں ان کی تصویریں نہایت بھٹی اور مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ اور باعتبار فن ہم انہیں تصویریں کہہ سکتے ہی نہیں ہاں اظہارِ مطلب کے لئے ان سے زیادہ اچھی تصویروں کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔

اس زمانہ میں بھی کئی ایسی قومیں موجود ہیں جو صرف نقوش و تصاویر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ تصویروں کے ذریعے سے اظہارِ خیالات کا طریقہ قدیم مصریوں کی جدتِ طبع کا مہر ہونی منت ہے۔ مصر کے قدیم معبدوں میں ان قوم کی لاتعداد تصویریں آج تک موجود ہیں۔ یہ درحقیقت مصریوں کا رسم الخط تھا۔ اس میں الفاظ کی بجائے مختلف نقوش و تصاویر سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً :-

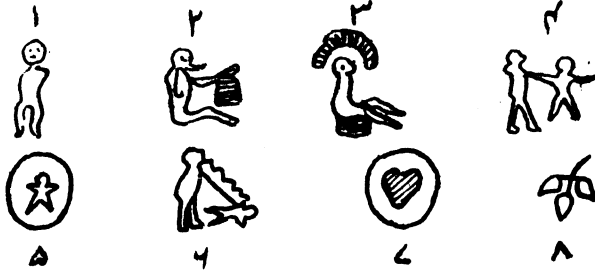


ملک بقائے دوام ردئی لڑکا مینڈھا عقاب عصائے شاہی مگرچہ
اسی طرح عرب میں ایک مقام پر اسی قسم کی تصویروں کے کتبے برآمد ہوئے ہیں۔ وہاں ایک وادی ہے۔ جسے عربی میں ”وادی مکاتیب“ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اُس وادی کی دونوں دیواروں پر صد ہا تصویری کتبے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے :-



یہ کتبے شکل و صورت میں مصری کتبوں کی طرح ہیں۔ لیکن حقیقتہً ان سے بالکل مختلف ہیں۔ اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤرخ الذکر سے صد ہا سال پیشتر کے ہیں۔ یہ کسی ایسی زبان میں لکھے ہیں کہ آج تک کوئی محقق انہیں پڑھ نہیں سکا۔ تصویر میں جس شخص کے گلے میں رسی بندھی ہے خدا جانے اس بد قسمت کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ شمالی امریکہ کے اصلی باشندے جنہیں ”ریڈ انڈینز“ (Red Indians) کہتے ہیں آج تک تصویری تحریروں سے کام لے رہے ہیں۔ تصویریں بنانے میں انہیں بید مشق ہے۔ اپنا مطلب ایسے واضح طریق پر ظاہر کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ہرگز کوئی وقت پیش نہیں آتی۔

ذیل کے مرفع میں ایک داستان عشق لکھی ہے۔



شکل نمبر (۱) ایک وارفتہ محبت اپنے آپ کو ایک دیوتا سمجھ کر اپنی مافوق الفطرت طاقتوں سے معشوقہ کو مرغوب کر رہا ہے۔

(۲) وہ گاربا ہے اور ایک طلسمی ڈھول بجارہا ہے۔

(۳) کھلی ہوا میں بیٹھ کر افٹوں پڑھ رہا ہے۔ اس کے سر پر جو ایک محراب سا ہے۔ اس سے آسمان مراد ہے۔

(۴) وہ اپنی معشوقہ سے ایک بازو سے وابستہ ہے۔ جن کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دونوں ایک ہیں!

(۵) وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کی معشوقہ خواہ کسی جزیرہ میں کیوں نہ چلی جائے۔ وہ اسے سحر کی طاقت سے ڈھونڈ نکالے گا۔ دائرہ جزیرے کو ظاہر کرتا ہے اور اس میں جو شکل ہے۔ وہ اس کی معشوقہ ہے۔

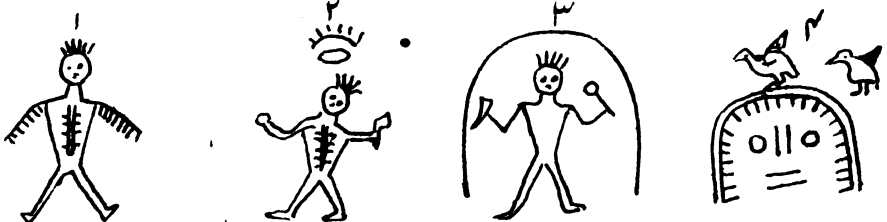
(۶) معشوقہ محو خواب ہے اور وہ خود عشقیہ گیت گارہا ہے۔ اُس کی محبت اُس کے دل سے نکل کر معشوقہ کے دل میں جذب ہو رہی ہے۔ اور طلسمی موسیقی کی آواز مرتعش ہو کر اس کے کانوں میں

داخل ہو رہی ہے۔

(۷) معشوقہ کا دل دکھایا گیا ہے۔

(۸) موسم بہار کے ایک رخت کے سہرے ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ عاشق فائز المرام ہو گیا ہے!

اب اس مرفع کو لیجئے۔ ایک ”افسانہ خنیں“ ہے جو امریکیہ کے انڈین لوگوں کی جنگجو یا نہ سپرٹ کا اظہار کرتا ہے۔





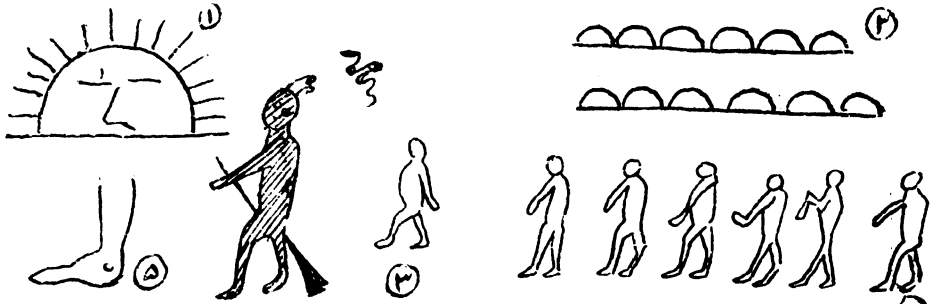
- (۱) ایک جنگجو شخص ہے جس کے بازوؤں پر پرنگے ہیں اس کی نمنا ہے کہ وہ اڑ کر میدان جنگ میں جا پہنچے۔
- (۲) وہ صبح کے ستارے کے نیچے مسلح ہو کر رقص کر رہا ہے۔
- (۳) ”تو سن فلک کے نیچے اپنے دشمن کو لٹکا رہا ہے۔“
- (۴) کشمٹوں کا گوشت کھانیوالے عذاب اور گدھ آسمان پر اڑ رہے ہیں۔
- (۵) بہادر جنگجو کے سینہ میں دشمن کا تیرہ پوسٹ ہے اور وہ مقتول پڑا ہے۔
- (۶) مقتول کی روح عالم ارواح میں صرخت پر داز ہے۔
- تسیرے مرفق میں سر اغراسانی کا ایک واقعہ ہے۔

۱۹۳۱ء میں انگلستان کا ایک خاندان کنیڈا میں جا بسا۔ ان دنوں اہل یورپ نئے نئے وہاں آباد ہو رہے تھے۔ وہاں کے اصلی باشندوں میں ایک شخص جو ”افعی قاہر“ کے نام سے مشہور تھا اس خاندان کا دشمن ہو گیا۔ اُس نے اپنی دشمنی کا اظہار اس طرح کیا کہ اس انگریز کے سب سے چھوٹے بچے ”پرسی“ کو چڑایا غریب باپ نے بہت تلاش کی۔ مگر بے سود۔

اس بات کو بہت عرصہ گزر گیا۔ ایک روز اس انگریز کو ایک بیمار انڈین عورت جنگل میں پڑی ملی۔ اس کا پاؤں زخمی ہو رہا تھا۔ انگریز نے عورت کو اٹھوایا اور اُسے اپنے کیسپ میں لے آیا۔ یہ عورت ”افعی قاہر“ کے چھتے میں سے تھی۔

انگریز چند روز تک اس عورت کا علاج کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ تندرست ہو کر وہاں سے چلی گئی اس کے ہاں تینے تیسرے روز بعد اس انگریز کا ملازم جو ایک وفادار انڈین تھا۔ کسی درخت کی چھال کا ایک ٹکڑا کہیں سے لے آیا۔ اور بڑے جوش و خروش سے کہنے لگا۔ ”اب آپ کا پرسی مل جائیگا“ اور یہ کہہ کر اُس نے چھال کا ٹکڑہ اتار کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

انگریز نے حیران ہو کر چھال کے ٹکڑے کو دیکھا تو اس پر کسی سیاہی سے یہ نقوش بنے تھے۔



(۱) ملازم چونکہ خود اندین تھا۔ اس لئے وہ ان نقوش کے معنی بخوبی سمجھتا تھا۔ اس نے ان کا سب ذیل ترجمہ کیا۔
 ”وہ عورت جس کا پاؤں زخمی تھا اطلاع دیتی ہے۔ کہ افعی قاہر
 تمہارے پرسی کو اسیر کر کے تمہارے مکان سے تقریباً
 ایک سو اسی میل جنوب مغرب لیگیا ہے۔ اس کے ہمراہ چھ
 مسلح آدمی ہیں۔ لیکن ان کے پاس صرف دو ہندو قیں ہیں۔“
 یہ تو تھا خط کا مفہوم۔ ہر شکل کی تفصیل یہ ہے۔

(۲) آفتاب دکھایا گیا ہے۔ چونکہ اس کا قرص نصف سے زیادہ زمین کے باہر ہے۔ اس لئے یہ مغرب کی سمت کو ظاہر کرتا ہے۔

(۳) اندین لوگوں کی جھونپڑیاں (Wigwams) دکھائی گئی ہیں۔ جو تعداد میں بارہ ہیں۔ ایک جھونپڑی سے دوسری تک تقریباً پندرہ میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ بارہ جھونپڑیوں کے فاصلہ کے برابر یعنی تقریباً ایک سو اسی میل کا فاصلہ ہے۔

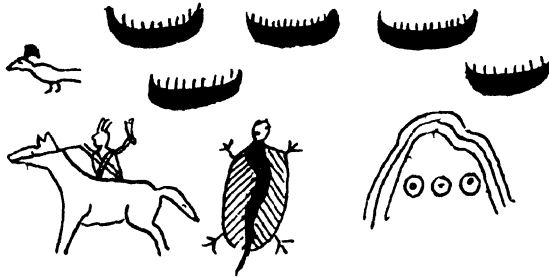
(۴) ایک شخص بندوق لے کر جا رہا ہے۔ اس کا ڈیل ڈول اور طرہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے جتنے کا سردار ہے اور چونکہ اس کے سر پر سانپ کی تصویر ہے۔ اس لئے اس سے ”افعی قاہر“ مراد ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص ہے۔ جس کے ہاتھ میں پشت بند ہے ہیں۔ یہ پرسی ہے جو اسیر ہو کر جا رہا ہے۔

(۵) چھ اشخاص ”افعی قاہر“ کے ہمراہ ہیں ان میں سے صرف ایک کے پاس ایک بندوق ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے گروہ کے پاس صرف دو ہندو قیں ہیں۔

(۶) ایک پاؤں کی تصویر ہے۔ جو اس عورت کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کے پاؤں میں زخم تھا۔ جس نے انگریز کی مہربانی کا یہ صلہ دیا کہ اُسے ایک سرسبز راز سے آگاہ کر دیا۔

اسی طرح ذیل کی تصویر میں ایک ہم کا حال بتایا گیا ہے۔ پانچ کشتیاں ہیں جن میں اکا دائی آدمی سواہیں

یہ سب ایک جھیل سے پار اتر کر دشمن پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ان کا سپہ سالار گھوڑے پر سوار ہے۔ اور اس کا نام ”درکشی مُنازی“ ہے۔ جس کے معنی ہماری زبان میں کٹھ پھوڑا کے ہیں۔ زمینی کچھو خشکی کو ظاہر کرتا ہے اور قوس کے اندر تین آفتاب ہیں۔ جسکے یہ معنی ہیں کہ جھیل کو عبور کر کے اس کے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں تین روز صرف ہوئے ہیں۔



اسی طرح ہزار ہا تصویری مرتعے موجود ہیں اگر ان سب کی کیفیت دی جائے۔ تو ایک ضخیم کتاب درکار ہو۔ یہ تصاویر ہمارے لئے بالکل لایینی ہیں لیکن انہیں جو جانتے ہیں وہ اس آسانی کے ساتھ ان کا مطلب حل کر لیتے ہیں کہ گویا وہ پورے الفاظ ہیں! لیکن اتنی وقت ضرور ہے کہ جو کام چند حروف کے مجموعے سے نکل سکتا ہے۔ وہ اس طرز تحریر سے نہیں نکل سکتا۔ یہاں ایک فقرہ کے لئے تصویریں بنانا پڑتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ممکن ہے کہ بعض آدمی ان تصاویر سے پورا مفہوم نہ لے سکیں۔

مثلاً مندرجہ بالا فقرہ میں جو کٹھ پھوڑا دکھایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کسی شخص کا نام نہ ہو۔ بلکہ اس سے اصلی پرندہ مراد ہو۔ تو اب انسان اور پرندے میں تمیز کرنے کے لئے کاتب کو ایک سوار کی تصویر کھینچنا پڑی اور اس سے سمجھ لیا گیا۔ کہ اس سے کوئی انسان مراد ہے۔

”تصویری تحریر“ کی ان وقتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ اب لوگوں کو ”صوت نویسی“ کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اصول یہ ہے کہ حروف کی آوازوں کی شکل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انگریزی زبان میں ”معما نویسی“ کو آج کل بڑا فروغ حاصل ہے۔ یہ بچوں کا ایک کھیل ہے۔ جس سے ان کی قوت تخیل کی نشوونما کی جاتی ہے ”معما نویسی“ کو اردو کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

مثلاً۔

جذباتِ عالیہ

راز ملک الشراعت غلام قادر گرامی مرحوم

زذوقِ بے خودی ازمن میریں تاچند است
 کہ سینہ چاک نظر ٹائے فتنہ پیوند است
 رخ تو عیدِ نظر است چند زیرِ نقاب
 درآ بجلوہ کہ یک شہر آرزو مند است
 تو مفت از کفِ من بردہ چہ مے دانی
 کہ قدرِ گوہرِ دل چیت قیمتش چند است
 چہ کہنہ زندِ نظر باز موند انستم
 کہ در نگاہ و تغافل بہم چہ پیوند است
 تو آرزوئے دل من ز من چہ مے پرسی
 ز دل بریں کہ چون ست آرزو چند است
 قبح تو بادِ گراں مے زنی و من مردم
 ز وعدہ ٹائے دروغی کہ راست مانند است
 عتابِ غمزہ بلا در بلا بہم چید است
 چگونہ نقشِ مرادم درست بنشیند
 خدنگِ آن نگہ ناز و رازل خوردم
 ہنوز برب زخمِ جگر شکر خند است
 وصالِ گرہِ عمر ست عمر یک نفس است
 بے بگشتم و جز ملکِ عشق کم دیدم
 شکایتِ بکھم از فلک و لے میرم
 فراقِ گر سر موئیت کوہِ الوند است
 ولایتِ کہ در اں بندہ بے خداوند است
 ازیں فسانہ کہ دشمنِ نو و ست خوردند است

بلا کشاں ز گرامی خبر کہ مے آرو

اجلِ گرفتہ بزنجیرِ بے کسی بند است

کہ پانی کی تصویریں بنا کر اسے ”آ“ پڑھتے ہیں کیونکہ میک میکو کی زبان میں پانی کا نام ”آ“ ہے۔ اُس کے بعد زیتون کی تصویر بنا دیتے ہیں۔ جسے وہ اپنی زبان میں ”می“ یا ”میں“ کہتے ہیں (عربی لفظ ”آمین“ یورپی زبانوں میں بھی موجود ہے)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ”صوت نویسی“ درحقیقت ایک نہایت ہی مشکل کام ہے۔ ہر حرف کی آواز تصویر سے ظاہر کرنا مطلقاً ناممکن ہے۔ اس لئے اب لوگوں نے فن تحریر کی طرف ایک اور قدم بڑھایا۔ اور جن حروف کی آوازیں تصاویر کے ذریعے سے ادا نہیں کی جاسکتی تھیں۔ ان کے لئے کچھ نقوش سے مقرر کر لئے۔ جس سے آہستہ آہستہ حروف بھی وجود میں آ گئے۔ اس نئی تحریر میں تصاویر و نقوش دونوں شامل ہو گئے۔ اور تحریر پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہو گئی۔ اس طرز تحریر کی کوئی مثال ہم پیش نہیں کر سکتے۔ ہاں تصور دلانے کی سز سے ذیل کے دو نام لکھے جاسکتے ہیں:-

دھڑکے + خال = مشیر خال + دان = قلمدان -

ان دو مثالوں میں ”خان“ اور ”دان“ کیلئے ہم نے نقوش نہیں لکھے۔ بلکہ الفاظ ہی لکھ دیئے ہیں۔ سبب یہی زبان کے حروف بھی دنیا بھر کی زبانوں سے زیادہ ہیں۔ وجہ یہ کہ اس زبان میں صرف حروف ہی نہیں بلکہ ”آواز“ ”صوت“ بھی بکثرت موجود ہیں۔ پہلے پہلے یہ زبان محض ”تصویر نویسی“ ہی مگر رفتہ رفتہ اس میں حروف بھی بنتے چلے گئے۔ جو آج تک موجود ہیں۔ مثلاً اس شکل میں چند تصاویر دکھائی گئی ہیں۔ جو حروف میں تبدیل ہو چکی ہیں:-

قدیم شکل	○	☾	叒	𠂔	𠂔
موجودہ شکل	و	م	ش	ک	د

چینی زبان میں ایک ہی نظم مستند معنی دیتا ہے۔ اسلئے چینی تصویر نویسی میں بعض اوقات نویسنہ کو بڑی مشکل پیدا ہوجاتی تھی۔ مثلاً لفظ ”چاؤ“ کے کئی معنی ہیں:-

(۱) جہاز (۲) رول کی سی نہ کوئی چیز (۳) شعلے کا بھر بھڑانا۔ (۴) برتن۔ (۵) گفتار۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں ”چاؤ“ اکیلا لکھا ہوگا۔ وہاں ضرور اشتباہ واقع ہو جائیگا۔ اس اشتباہ کو رفع کرنے کی غرض

سے چینی محاورہ ”چاؤ“ کی شکل بنا کر اس کے ساتھ مختلف خطوط ایذا کر کے حسب ذیل معنی پیدا کر لیتا ہے۔ مثلاً:۔
(۱) یہ شکل جہاں بنی ہوگی اس سے جہان کے معنی لئے جائینگے۔

(۲) اور جب اس شکل کے ساتھ پرندوں کے پروں کا ایک جفت ایذا کر دیا جائے۔ تو اسی لفظ کے معنی روئی یا اسی قسم کی کسی اور نرم چیز کے ہو جائینگے۔ اس حالت میں اس کی شکل یہ ہوگی۔
(۳) پھر اس کی شکل پر ”گ“ یا ”شعلہ“ کیلئے جو علامت ہے اسکا اضافہ کر کے اسے آگ کا بھڑبھڑانا بنالیا

جاتا ہے۔
(۴) شکل کے ساتھ (火) ملا کر اسے ”یرتن“ پڑینگے۔ یہ ساتھ کا نشان پانی کی شکل ہے۔
(۵) اخیر پر گفتگو کے نشان (言) کو ساتھ ملا کر (言) کو کلمہ۔ کلام۔ گفتگو کے معنوں میں استعمال کر لیتے ہیں۔

ان اشلد سے اگرچہ چینی زبان کی پیچیدگیوں کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ تاہم اس کی تصویر نویسی کا اصول سمجھ میں آجاتا ہے۔ چینی میں دو زبانیں رائج ہیں۔ ایک بولنے کی اور دوسری لکھنے کی۔ جو زبان بولی جاتی ہے وہ آسان ہے مگر جو لکھی جاتی ہے وہ سخت مشکل ہے۔ تحریری زبان سیکھنے میں ایک چینی بچے کو دنیا کے تمام بچوں سے زیادہ محنت درکار ہوتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُسے اپنی زبان کے کئی حروف و نشانات سے مدت العمر آگاہی نہ ہو سکے! ذیل میں دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے حروف تہجی کا نقشہ دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائیگا۔ کہ تعداد حروف کے لحاظ سے چینی تمام زبانوں پر فائق ہے

۳۲	مصری	حروف
۳۳	عربی	حروف
۳۸	آرمینی	حروف
۳۹	قفقازی	حروف
۴۰	رومانوی	حروف
۴۵	ژندی۔ ہندی۔ ہیلوی	حروف
۴۹	سنسکرت	حروف
بین ۵۰ ہزار	چینی	حروف

۲۱	اطالوی	حروف
۲۲	عبرانی	حروف
۲۳	لاطینی	حروف
۲۴	یونانی	حروف
۲۵	فرانسیسی	حروف
۲۶	انگریزی جرمن ولندیزی	حروف
۲۷	ہسپانوی	حروف
۲۸	عربی	حروف

درحقیقت چینیوں کی محنت قابل تحسین ہے۔ کسی زبان میں اتنے حروف کا داخل کر لینا اور پھر انہیں لکھ سنا بڑی ہی کاوش ہے۔ گو ہمارے نقطہ خیال سے چینی زبان قابل اصلاح ہے۔ مگر چینی لوگ اس میں اصلاح کرنا بمنزلہ کشاہ سمجھتے ہیں۔

جاپانی زبان بھی قریب قریب چینی زبان ہی کی طرح ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جاپانی میں صوت نویسی کا عنصر غالب ہے۔ اور اسلئے اس زبان میں چینی زبان کی طرح بہت پیچیدگی نہیں۔

تصویر نویسی کی ایک اور شاخ بھی ہے۔ اس میں حروف کی شکلیں میخوں کی شکل سے ملتی جلتی ہیں۔ اسلئے اسے ”میخی تصویر“ یا ”کیموئی اسی فارم رائٹنگ“ (*Canet or m Writing*) کہتے ہیں۔ قدیم فارسی اور کلدانی میں بھی رسم الخط تھا۔ لندن میں اس طرز تحریر کے صدہا کتب محفوظ ہیں۔ ذیل میں اس کا نمونہ دیا جاتا ہے۔

≡ ۲ < ۲ ۲ > ۶ > ۲ ≡ ۲ > > ۲ ≡ ۲ ۲ ≡ ۱ ۲ ۲ < ۲ ۲

≡ ۲ > ۲ ۲ ۲ > > ۲ ۲ ۲ ۲ ۱ < ≡ < ۲ < > ۶ ۲ ۲ >

(ترجمہ) آہو امروا۔ سب سے بڑا خدا ہے۔ اس نے یہ زمین پیدا کی اور آسمان پیدا کیا۔

اس طرز تحریر کا پڑھنا نہایت دشوار ہے۔ سب سے پہلا شخص ایک جرمن ڈاکٹر ”ڈگرائی فنڈ“ (*Dr. G. von*)

(*Lafund*) تھا جس نے مشاعرے میں اس قسم کے چند کتبے پڑھ کر ان کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ اہل بابل اور نینوا اس

طرز تحریر میں ہمارے لئے صدہا ”کتابیں“ چھوڑ گئے ہیں۔ مگر یہ کتابیں ہماری کتابوں کی طرح کاغذ کی نہیں ہیں۔

کاغذ اس زمانے میں ایجاد نہیں ہوا تھا۔ یہ مٹی کی بڑی بڑی تختیاں ہیں جنہیں پڑاؤں میں پکا یا گیا ہے۔ یا مٹی

کے عظیم الشان سیلوں کے سر ہیں۔ جن پر چاروں طرف حروف کندہ ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کی ”کتابیں“

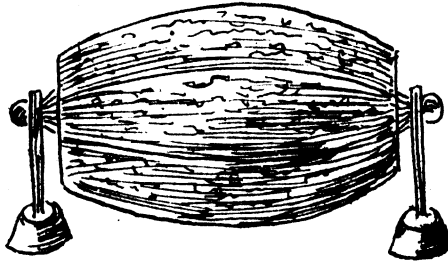
شہنشاہ اسیریا ”سنناچ“ (*Sennacherib*) کے کتب خانہ کی زینت بن کر رہی تھیں۔

اس قسم کی ایک کتاب کی تصویر ذیل میں درج ہے۔ یہ پختہ مٹی کا ایک بہت بڑا ڈھول سا ہے۔

جس پر بادشاہ کے احکام کندہ ہیں۔ یہ ڈھول وواستوائوں پر قائم ہے۔ اور اپنے محور پر گھوم

سکتا ہے۔ جوں جوں پڑھتے جاتے ہیں۔ ڈھول کو آہستہ آہستہ گھماتے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کی نہایت

ہی جیبرٹ انگیز کتاب ہے!



اس رسم الخط میں بظاہر تصاویر معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ طرز تحریر درحقیقت تصویر نویسی ہی کی ایک نرمیم شدہ شکل ہے۔ مثال کے طور پر اس تحریر میں جیسا کہ میں آفتاب کا نام آیا ہے اسے اس نشان  سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس زبان کے مقدس نوشتوں میں متعدد مقامات پر انسان کی تصویریں ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان غالباً مذکورہ ”معمالوہی“ کی طرز پر لکھی جاتی تھی۔

قدیم اہل مصر کی تصویر نویسی دو قسم کی تھی۔ ایک عام ضروریات کے لئے۔ دوسری صرف مقدس نوشتوں کیلئے۔ مؤخر الذکر مصری راہبوں کے علاوہ اور کسی شخص کو معلوم نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص اسے معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو اُسے فوراً قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس مقدس تصویر نویسی کو ”ہائی ایروگلفس“ (Hieroglyphs) کہتے ہیں اس میں قدیم تصویر نویسی کی نسبت بہت کچھ ترقی ہو چکی تھی ذیل کی شکل میں ایک خاصا طویل فقرہ ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ

”میں سورج و پوتا ہوں اور سورج کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اُفق کی جانب سے آ رہا ہوں۔“



اس مرقع کی پہلی تصویر میں سب سے اوپر کا نشان ”نُون“ ہے۔ درمیانی ”دک“ اور نچلا ”ایک“ کی علامت ہے۔ نمک قدیم مصری زبان میں ”میں“ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ”میں ایک“ (بصیغۂ واحد)
(”نمک“ کو بعض اوقات ”انک“ بھی بولتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ عربی کے لفظ انا بمعنی ”میں“ سے کچھ تعلق رکھتا ہو۔

دوسری شکل میں آفتاب دکھایا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک کلباڑی۔ کلباڑی کی علامت دیوتا ہے۔

مخصوص تھی۔ آفتاب کے ساتھ کھڑی کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ”سورج دلوں“ سے مراد ہے۔ مگر بصیغہ واحد کیونکہ یہاں بھی ایک کی علامت موجود ہے

تیسری شکل میں فوقانی علامت ف ہے۔ درمیانی ر اور تحتانی پاؤں سمیت دو ٹانگیں ہیں پہلے دونوں نشانوں کو ملا کر فرہڑا جائیگا۔ جسکے معنی ہیں ”چلنا“۔ مگر شاید اس لفظ کے معنی کچھ اور بھی ہوں گے۔ اسی لئے نیچے ٹانگیں اور پاؤں بھی بنا دیئے گئے ہیں تاکہ اس سے چلنا سمجھا جائے۔

(کیا آپ کو عربی کے لفظ فرار اور اس قرین کچھ تعلق نظر آتا ہے؟)

اب چوتھی شکل کو لیجئے۔ یہ ایک عقاب ہے۔ اور عقاب کو مصری زبان میں ”آسم“ کہتے ہیں۔ مگر یہ سے کے بھی معنی دیتا ہے۔

پانچویں شکل میں افق (بصیغہ واحد) لکھا ہے چھٹی شکل ر کی ہے۔ اسے ”ار“ پڑھتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں۔ ”خلاف“

ساتویں شکل میں پہلا نشان ر۔ دوسرا ف اور تیسرا ت ہے۔ ان تینوں کا مجموعہ ہے ”رفتو“ بمعنی ”دشمن“ اور اس کے ساتھ کے تین خطوط بصیغہ جمع کو ظاہر کرتے ہیں۔ بمعنی ”دشمنان“

آٹھویں تصویر میں ایک شخص کی تصویر دکھائی گئی ہے ایک خاص حالت میں بیٹھا ہے یہ جنگ کی علامت ہے۔ مطلب یہ کہ میں جنگ کیلئے تیار ہوں“

نویں شکل تنہا ف ہے جس کے معنی ہیں ”اس کا“ یا ”اس کے“

اب سارے الفاظ کو ملا کر پڑھئے تو مذکورہ بالا فقرہ بن جائیگا

ہم دیکھتے ہیں کہ اس عبارت میں نصاب ویر کے علاوہ حروف بھی موجود ہیں۔ گویا اہل مصر کی حدت طبع نے تصویر نویسی کو انڈین لوگوں کی تصویر نویسی سے زیادہ آسان بنا دیا۔ جب اہل مصر یہاں تک ترقی کر چکے تو اب ان کے لئے حروف بھی کا وضع کر لینا نہایت آسان تھا۔ لیکن چینیوں کی طرح یہ بھی اپنے معتقدات سے مجبور تھے دماغ حروف درحقیقت اہل فیثیالیا کی جدت کی شرمندہ احسان ہے۔

دیل کے نقشہ میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تصویر نویسی کس طرح بتدریج حروف تہجی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

مقدس تحریر تصویر نویسی کلدانی تحریر یونانی تحریر عربی تحریر



مقدس تحریر	تصویر نویسی	کلدانی تحریر	عبرانی تحریر	عربی تحریر
𐤀	𐤁	𐤂	א	ا
𐤃	𐤄	𐤅	ב	ب
𐤆	𐤇	𐤈	ג	ج
𐤉	𐤊	𐤋	ד	د

وضع حروف کی تاریخ نہایت ہی دلچسپ ہے مگر شکل یہ ہے کہ کہیں سے دستیاب نہیں ہوتی۔ محققین صرف چند حروف کا سراغ لگا سکے ہیں۔ ذیل میں عربی کے چند حروف کی مختصر سی کیفیت دی جاتی ہے۔

الف۔ عبرانی میں اسکی یہ شکل ہے۔ (𐤀) یہ ایک بیل کے سینگ ہیں۔ عبرانی میں بیل کو "الف" کہتے ہیں ان کے ہاں مذہبی قربانیوں کا بہت رواج تھا اسلئے انہیں بیل کی شکل میں بڑی قربت بنائی پڑتی تھی۔ مگر چونکہ وہ شکل تھی صرف سینگوں ہی کو کافی سمجھ لیا گیا۔ کثرت استعمال سے یہی شکل اس طرح 𐤀 ہو گئی۔ جو عربی میں ۱ یا ا میں تبدیل ہو گئی۔

ب۔ عبرانی میں اس حرف کا نام "بت" ہے جس کے معنی ہیں "گھر"۔ "مکان"۔ مگر اس کے نیچے نقطہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس کا لفظ عربی شراذ ہے۔ (عربی لفظ "بیت" بمعنی گھر عربی حرف "بت" سے نکلا ہے۔)

ج۔ عبرانی تصویر نویسی میں یہ نقش اونٹ کا سر اور گردن ظاہر کرنے کے لئے تھا۔ اور وہ اسے جل کہتے تھے۔ عربوں نے اس میں کچھ تصرف کر کے اے (جیم) بنالیا۔ (عربی میں اونٹ کو عجل کہتے ہیں) 𐤃

ح۔ عبرانی میں یہ حرف کھڑکی (دریچہ) کی شکل تھی۔ جسے وہ حے کہتے تھے اور اس کی صبیح شکل یہ تھی۔ عربوں نے اسے ح بنالیا۔ (عربی لفظ حے بمعنی پڑوس۔ ممکن ہے کہ اسی سے وجود میں آیا ہو)

د۔ اس حرف کی شکل مصری تصویر نویسی میں انسانی ہاتھ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ عبرانی میں اگر اس کی یہ شکل 𐤄 ہو گئی۔ دیکھئے اس کی شکل دروازے کے محراب سے ملتی جلتی ہے۔ اسی لئے عبرانی میں اسے "دالت" بمعنی دروازہ

کہتے تھے۔ یونانیوں نے اسی میں تصرف کر کے اے اس طرح بنالیا 𐤅 اور اس کا نام "ڈیلٹ" رکھ دیا۔ عربوں نے اس ثلث کا بائیں جانب کا ضلع اڑا کر اے اس طرح 𐤆 بنا کر اے وال کا نام دے دیا

(ذال اسی حرف پر نقطہ دیکر بنالیا گیا۔)

س۔ مصری تصویر نویسی میں اس حرف کی یہ شکل 𐤇 تھی اور اس کا لفظ 𐤇 (بوا و مہول) تھا۔ اور 𐤇

منہ کو کہتے ہیں (ممکن ہے کہ فارسی لفظ روم یعنی چہرہ اسی قدیم حرف سے نکلا ہوا) کچھ عرصہ کے بعد اس حرف نے پیشکل **و** اختیار کر لی اور جب کلدانیہ والوں نے اسے لیا۔ تو انہوں نے اس طرح **7** بنالیا۔

عربوں نے اسے پیشکل **و** دیدی (اسی حرف پر نقطہ دیکر بنالیا گیا)

س۔ مصری مقدس نویسی میں اس کی شکل تھی **س** بعد میں یوں ہو گئی۔ **س** کلدانی رسم الخط میں یہ اس طرح ہو گئی۔ اور عبرانی میں اس کی شکل اس طرح ہی۔ **س** حقیقت میں یہ گل نیلوفر کنول کی تصویر تھی۔

جسے قدیم مصری زبان میں "رسن" کہتے تھے۔ اور یہ پانی کے دیوتا کا مخصوص نشان تھا۔ عرب لوگ اسے سین کہنے لگے۔ (حسب ضرورت نقطہ دیکر اسے شین بنالیا گیا)

ک۔ عبرانی میں کاف ہاتھ کی ہتھیلی کو کہتے ہیں۔ اسی سے فارسی لفظ کف نکلا ہے۔ عبرانی میں اس کی شکل تھی **ک**۔ عربوں نے **ک** بنالیا۔

ل۔ مقدس نویسی میں اس حرف کی شکل شیر کی تصویر سے ظاہر کی جاتی تھی۔ تصویر نویسی میں **ل** کلدانی میں **ل** یونانی زبانوں میں **ل** عبرانی میں **ل**۔ عربی میں **ل**۔ عبرانی میں اس کا تلفظ "لمد" ہے جس کے معنی ہیں۔ بیلوں کو ہانکے کیلئے لوہے کی نیکی سلخ۔ آنکبس۔

م۔ عبرانی میں اس کی شکل **م** تھی اور یہ پانی کی علامت تھی۔ اس کا تلفظ "مم" تھا جس کے معنی پانی کے ہیں عربوں نے اسے **م** کا نام دیا۔ (عربی لفظ "ما" یعنی پانی غالباً اسی "م" کی ایک دوسری شکل ہے)

ن۔ عبرانی میں اس طرح **ن** لکھا جاتا تھا۔ اور "نُون" بولا جاتا تھا۔ "نُون" عبرانی میں مچھلی کو کہتے ہیں۔ عربوں نے اسے اس طرح **ن** بنالیا۔ مچھلی کو عربی میں بھی "نُون" ہی کہتے ہیں مثلاً حضرت ذوالنون کے نام سے بہت سے اصحاب واقف ہونگے۔

و۔ مصری شکل یہ ہے **و** کلدانی یہ **و**۔ اور عبرانی اس طرح **و**۔ عربوں نے **و** بنالیا۔ عبرانی میں اس کا تلفظ "وَو" ہے جس کے معنی ہیں مچھلی پکڑنے کا آنکڑہ۔

ہ۔ عبرانی میں یہ **ہ** نشان تھا۔ اور اسے اس طرح **ہ** لکھا کرتے تھے۔ اس کا تلفظ "ہست" تھا۔ عربی میں یہی لفظ "ہا" میں تبدیل ہو گیا۔ (انگریزی لفظ "ہیبتہ" (Heath) غالباً اسی لفظ سے نکلا ہے۔ انگریزی میں بھی اس کے معنی دشت و جنگل کے ہیں)۔

ی۔ یہ حرف عبرانی میں "انگشت" کے لئے لکھا جاتا تھا۔ اور اسے "یاد" یا "جاد" پڑتے تھے۔ عربوں نے اسے "یا" بنالیا (عربی لفظ یل بمعنی ہاتھ اسی لفظ کی ترمیم شدہ شکل معلوم ہوتی ہے)

یہ مضمون نہایت تفصیل طلب ہے۔ مگر امید ہے کہ یہ میل سالیان بھی دہری سے خالی نہ ہوگا۔ (محمد وحید گیلانی بی اے)

مدرس اور طلباء سے دو دو باتیں

(جناب لالہ رام چند صاحب - بی۔ اے۔ پی۔ ایس۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع ملتان)

متحدہ و مرتبہ اصحابِ تعلیم نے مدرس کی حقیقت و غیزہ کو مد نظر رکھتے ہوئے لاکھوں اوراق سیاہ کر ڈالے ہیں۔ جن کے حرف حرف سے بھی عرض و غایت رونما ہوتی ہے۔ کہ مدرس کا مدرسہ ریاضِ رضواں کی مثال ہو۔ اس کا ذرہ ذرہ گلطراز بلکہ گلغشاں دکھائی دے۔ ترقی۔ رہنمائی۔ فلاح و بہبودی کاراؤں میں مستغرق رہا جائے۔ خطہ سکول کا ہر کمرہ فرخندہ خصال اور صالح الاعمال بلکہ صاحبِ اقبال نظر آئے۔ نشاطِ زندگی کے باعث چہرہ بشارت اور ارغوانی ہو۔ اُس کی تعریف میں زمانہ کی مخلوق اُس کے ہر فن مولا ہونے کے باعث متعارف و آشنا ہو کر طب اللسان ہو۔ یعنی اُس سرزمین کے چشمہ فیض سے سب نے ایک نہ ایک جُڑے روح افزا نوش جان کر کے اپنی حسرت و دسوز و تشنہ کامی کو کا فور کیا ہو۔ ہر بچہ تہذیب و تمدن کا پتلا۔ نامراد خزاں کے عمل سے نا آشنا ہو۔ بلکہ چہروں سے تنویرِ سیرت کا نشان ہویدا ہو۔ اور زمانہ کی ہر آلودگی و آلودائش سے مبرا اور معزا ہو۔ صحت کے اصول و ترین سے آگاہی رکھتا ہو۔ مثلاً صبح صادق بسترِ راحت کو چھوڑ کر غسل کرنا پھر خدا کی یاد میں مشغول ہونا کہ وہ حقیقی معین و مستعان استعانت فرمائے۔ ورزش جو کہ اسرارِ تندرستی ہے۔ اُس کے طریق سے واقفیت رکھنا یا چھوٹ کی بیماریوں کے بواغ و بوجہ کا علم ہونا۔ صفائی لباس۔ صفائی بدن عمدہ تازہ اور سادہ خوراک کے فوائد سے باخبر ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔ متابعت یا فرمانبرداری جبلی عادت دکھائی دے۔ غفلت شکاری اور بیکاری کے زہر آمیز نتائج سے واقفیت رکھتا ہو۔ استاد کے ہر اشارہ کا منتظر۔ کام کا شوق باوثوق اور عارضی شوق عفا اور ناپید۔ "سیوا کرے۔ سو میوہ پائے" (ع) ہر کمرہ خدمت کردہ اہم و محترم شدہ کے مطالب و معانی۔ قصائص و لطائف و دلکش لکڑوں کو سنسن کر سمجھائے گئے ہوں۔ چنانچہ اخلاقیات شاعرانہ نہیں حفظ ہوں۔

زمانہ حال کی طرزِ معاشرت کا اثر جو ملک پر پڑا ہے۔ اُس کے حسن و قبح کے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہو۔ برطانوی عنایات و الطاف کی یاد۔ ملکی ہمدردی سادہ زندگی بسر کرنا۔ راستبازی۔ اور صفائی قلبی کی ضرورت فوائد ذہن نشین ہوں۔ صرف بے جا و فضول خرچی سے نفرت و اجتناب رکھتے ہوں۔ ذخیرہ معلومات کی توسیع سیر و تفریح سے متعلق ہو۔ انہیں عجاائب قدرت کا مطالعہ کر کر اُن کے دل

وماغ کی تربیت صحیح معنوں میں کرائی گئی ہو۔ متعدد صنائع کا علم ہو۔ کسب معاش و دیگر وسائل کا شوق ان کی رگ رگ میں موجزن ہو۔ چنانچہ اس بارہ میں ان کا میلان طبع تجارت و صنائع کے فروغ میں عاشق نظر آئے۔ لہذا انہیں زراعت۔ دستکاری اور بیوپاری کے فوائد سے آگاہ کیا گیا ہو۔ اُن تکمیلیت۔ مدغم بیوپار رکھ کر چاکری بھیک و داروغہ وغیرہ مقولے سنائے سمجھائے گئے ہوں۔ تعلیم کا حقیقی اور اصلی رازِ مستحسن پیش کر کے انہیں مادہ کا رصنت یا تجارت یا زراعت کیا گیا ہو۔ اس بارہ میں انبیاء۔ فقیروں۔ سادھوؤں وغیرہ کے حالات معاش بتلائے گئے ہوں۔ مثلاً دھنا بھگت و موسیٰ علیہ السلام کا جانور چرانا کبیر بھگت کی صنعت یا دستکاری۔ حضرت محمد صاحب کی بیوپاری کے قصائص سنائے گئے ہوں۔ ایسے باخدا خیر الناس کے قصے اور حالات زندگی سن کر انہیں اعلیٰ معیار کا آدمی بنا دیا گیا ہو۔ اُن کے طبع زاد ترقی کے ہر مرحلہ و مسئلہ کو بالائے طاق نہ رکھا گیا ہو۔ بے سودہ کو اس۔ عیاشی۔ بد اخلاقی۔ منشی اشیاء کے نقصانات۔ رشتہ یا استحصال با بھر وغیرہ وغیرہ زشت کاریوں سے نفرت دلائی گئی ہو۔ اس قسم کے واقعات عیرت خیز پیش کئے گئے ہوں۔ اس قسم کے عبرت ناک واقعات انہیں یاد کرائے گئے ہوں۔ عرضیکہ وہ ہر قسم کے عیوب و سبکدوش باو خزاں کے بھرنے کے محفوظ و مامون ہوں۔ کتب فحش و شرمناک کا مطالعہ ممنوع قرار دیا گیا ہو۔ بلکہ اسے مطالعہ سے دلی نفرت رکھتے ہوں۔ خطوط نویسی اور روزانہ لہین دین کے متعلق حساب کتاب جانتے ہوں۔ استاد و صاحب نقادانہ نظر رکھنے کے باوجود طلبہ کی کوئی درخواست استحقار سے نہ ٹھکراتے ہوں۔ ان کے ساتھ استاد کی خلوص دلی نیک ٹینتی صحیح معنوں میں آشکارا پائی جائے۔ نیز اس کی زبردست اصلاحیں ہر برگ و بار سے عیاں ہوں۔ یعنی مدرس کی اس حقیقی رہنمائی کی مساعی جمیدہ کا نتیجہ طلبہ کی دماغی۔ اخلاقی اور جسمانی ترقی سے ظہور پذیر ہو۔ اُس کے مقاصد مبارک و عزائم قابل عمل ہوں۔ عوام الناس کی نظروں کے سامنے اس کے خلاب کی حرکات سکنت تبلیغ و تلقین کا کام دے کر رشک و لارہی ہوں۔

حضرات!

ایسی صورتوں میں ہم کہہ سکتے ہیں۔ کفی الواقعہ مدرس اور اُس کے لڑکوں نے تعلیم کا حقیقی مقصد پاک حاصل کیا ہے۔ جبکہ وہ زمانہ میں اشکالِ مرغوب اور اعمالِ با تعریف و کھلا کر خدا سے ثوابِ عظیم کا مستحق و متوقع ہو۔



خان صاحب مولوی عبدالودود صاحب پرنسپل
عثمانیہ یونیورسٹی ہمدرد آباد مدنی

حیدر آباد دکن کا تعلیمی مستقبل

از جناب محمد عبدالرحمن خاں صاحب۔ اے، آر، سی، ایس۔ بی، ایس، سی لندن، ایف، آر، اے، ایس۔
(ایف، پی، ایس، ال، پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی کالج۔ حیدر آباد دکن)

خان صاحب ریاست حیدر آباد دکن کے سب سے بڑے سائیسٹ، ماہر تعلیم اور تعلیمات کے ذمہ دار افسر ہیں۔ آپ کئی دفعہ یورپ کا سفر کر چکے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم لندن میں پائی اور بڑے اعزاز حاصل کئے۔ لندن کی یونیورسٹی کی گذشتہ صد سالہ جوبلی کے موقع پر آپ خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے۔ آپ نے سائنس کی کئی انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔ آپ ایک آلہ سائنس، روحان و رتنی کل آپنی کل بیخ کے موجد ہیں جو انگریزی کی پہنی نے بنایا ہے آپ کی نظر ریاست اور ہندوستان کے تعلیمی مسائل پر بہت وسیع اور مستند مدعو عرصہ تک آپ تعلیمات کے ہر فیورہ چکے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور سائنس دانوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ گذشتہ مئی میں حیدر آباد کالج کیشل کانفرنس کے آپ پریذیڈنٹ منتخب ہوئے تھے۔ ہیں جو خطبہ پڑھا وہ ریاست اور بیرون ریاست کے اکثر تعلیمی مسائل اور ان کے حل سے ملو ہے۔ اس کا بہترین اقتباس بدیہ ناٹھون کیا جاتا ہے۔

ایڈیٹور

حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا دسترخوان ملک کی معمولی سے معمولی حیثیت اور اوسط قابلیت والے لڑکے کیلئے بھی بچھا دیا ہے۔ ملک کا ہر فرد بشر جس نے ملک میں نشوونما پائی ہے۔ اور اسی لئے زبان اردو سے واقف ہے۔ ادق سے ادق مضامین ایم اے اور سی۔ ایم ایس سی کی تحقیق معنوں میں تعلیم پاتا اور دگری حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سہولتیں طب انجمنی اور ایجوکیشن کے پیشوں کی تعلیم میں بھی جوتا ہو چکی ہیں۔ عثمانیہ فٹنل ایسٹیٹیوٹ کے مال شان مستقبل سے کوئی شخص ہے جو آشتیا نہیں زراعت، صنعت و

حرفیت وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کیلئے بھی کارروائی جاری ہے۔ اور امید ہے کہ چند سال کے بعد ہمیں ان مضامین میں بھی ٹرنش انڈیا کی محتاجی نہ رہے گی۔

اس بیان سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس حیرت انگیز ترقی پر نازاں ہو کر اپنی جگہ پر یہ سمجھ کر ٹنکن ہو بیٹھیں کہ بہت کچھ ہو چکا ہے۔ سب کچھ ہو رہا ہے، صرف وقت کا سوال ہے، کافی مدت میں ہم تعلیم کے نقطہ نظر سے کمال کو پہنچ جائیں گے۔ کمال تو کسی صورت میں ممکن نہیں یہ ریاضی کی وہ نامتناہی مقدار ہے جس کے صرف قریب تر ہونا ممکن ہے۔ لیکن جس کو پہنچ جانا ناممکن ہے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ہماری رفتار ہماری تمدن زندگی کیلئے کافی تیز ہے۔ ہم جو روپیہ صرف کر رہے ہیں اس کی تقسیم تعلیم کے مختلف شعبوں پر ان کی اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے صحیح اصول پر ہو رہی ہے یا نہیں میں نے اب تک صرف اعلیٰ تعلیم اور کچھ فنی تعلیم کا حال بیان کیا۔ دیگر شعبہ جات تعلیم کے متعلق بھی کیا ہماری ترقی کوئی حقیقت رکھتی ہے یا نہیں۔ سہولت کی خاطر تعلیم تذکرہ ذیل حصوں یا شعبوں میں تقسیم کر دیں تو بیجا نہ ہو گا۔

(۱) ابتدائی تعلیم جس کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں۔ ایک حصہ دیہی رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا دوسرا شہری رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا۔

(۲) وسطانی تعلیم۔

(۳) فوٹانی تعلیم۔

(۴) جسمانی تعلیم یا فزیکل ٹریننگ۔

(۵) تعلیمانات

(۶) اعلیٰ یا یونیورسٹی کی تعلیم۔

(۷) میکینیکل تعلیم جو دستکاری پر زیادہ زور دے۔

(۸) پرفیشنل یا فنی تعلیم مثلاً طب، انجینئرنگ، زراعت، صنعت، تجارت، قانون وغیرہ

(۹) ریسرچ یا اعلیٰ تحقیقات علمیہ

(۱۰) عمر اشخاص کی تعلیم اڈیٹ ایجوکیشن۔

(۱۱) مزدورین کی تعلیم جیسے اندھوں، بہروں اور گنگوں کی۔

۱۳۳۸ شرف کی رپورٹ سے جو زیر ترتیب ہے۔ میرے دوست مولوی فضل محمد خاں صاحب ناظم

تعلیمات نے مجھے ازراہ کرم جو اطلاع ہم پہنچائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکارِ عالی نے پبلک ایجوکیشن کی اہمیت کے ساتھ سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ بعض ابواب میں سرکارِ عالی کا فیاضانہ صرف

دیگر مالک کے لئے قابل تقلید سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ ابتدائی تعلیم مکمل تعلیم تعلیم نسواں سرپرست پر زیادہ روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارا موجودہ طریق تعلیم زیادہ تر برٹش انڈیا کے طریقہ تعلیم کی تقلید کرتا ہے۔ لیکن ہمیں توقع ہے کہ وہ دن قریب آنے والا ہے جب کہ یہ قدیم طریقہ ایک بڑی حد تک بدل دیا جائیگا۔ اور محض کتابی یا زبانی تعلیم کے عوض طلباء کو ملک اور خود ان کے ضروریات کے لحاظ سے ایسی تعلیم دلائی جائیگی جس سے کسب معاش و روزگار میں انہیں حالیہ تکالیف و پریشانیاں برواشت کرنی نہ پڑیں گی۔

ابتدائی تعلیم

اگر میں مذکورہ بالا (۱۱) ابواب پر تفصیل سے بحث کرنا چاہوں۔ تو اس کیلئے کئی لکچروں کی ضرورت ہوگی نہ تو اس کی ضرورت ہے اور نہ میرے پاس اتنا وقت یا آپ حضرات کو اتنی فرصت ہے کہ اس پر صرف ہو۔ صوف چند ابواب کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر کے آپ بزرگوں سے استدعا کروں گا کہ ان پر غور فرمائیں۔

متحدہ زندگی بسر کرنے کیلئے ملک کے تمام باشندوں کو لکھنا پڑھنا آنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ زندگی کیلئے کھانا پینا جو بیگ نوشہ و خوند سے واقف نہیں وہ متحدہ نہیں ہو سکتی۔ پس ابتدائی تعلیم کا لزوم ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا عوام کو لکھنا پڑھنا سکھادینے سے ان کو تہذیب سکھادی جاتی ہے کیا سرکار کا فریضہ اس معاملہ میں صرف اسی قدر ہے اور بس میں سمجھتا ہوں کہ ایسی ابتدائی تعلیم بالکل ناقص ہے اور آگے چلکر اس سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ ابتدائی تعلیم عام تو کی جائے۔ لیکن اضلاع کے لئے یہ ابتدائی تعلیم ایسی ہو کہ لوگ اپنے آبائی پیشوں کو ترک کر کے ملازمت کی تلاش میں شہروں کی طرف رخ نہ کریں اور دیہات کو بریل و بر باد نہ چھوڑ دیں۔ اسی طرح شہری رقبوں میں بھی ابتدائی تعلیم اگر طلباء کو صنعت و سودگاری سے نا فر بنا کر صرف پیشہ ملازمت سرکاری یا وکالت کو ہی معزز پیشہ تصور کراتی ہے۔ تو اس سے احتراز کیا جانا چاہیئے۔

مالک محروسہ میں سب سے زیادہ عام جو پیشہ ہے وہ پیشہ زراعت ہے۔ دیہاتی ابتدائی تعلیم کے نقصا میں زراعت کی تعلیم بطور جزو اعظم شریک کی جانی چاہیئے۔ تاکہ لڑکے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ جانے کے بعد اپنے آبائی پیشہ زراعت کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں اور دھوکے میں پڑ کر علم یا ملازمت کی خاطر شہروں میں چلے نہ پھریں جس سے نہ تو خود انہیں کوئی اطمینان کی زندگی میسر ہو سکتی ہے۔ اور نہ ان کے والدین یا سرپرستوں کو

اولاد کی پرورش و تعلیم سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اگر زراعت کا شوق دلائے۔ اور اُس کے متعلق صحیح اور مفید معلومات مہیا کر لے۔ تو اس سے بہتر کوئی تعلیم ہمارے ملک کی فلاح و بہبود ایک نوع انسان کی خوشحالی کیلئے نہیں سوچی جاسکتی۔ ایسی دیہی تعلیم کے ساتھ اضلاع میں کائی میکینیکل مدارس کا کھولنا بھی ضروری ہوگا۔ زراعت محض بیج بونا اور کھیتوں کو پانی پہنچانا نہیں ہے۔ اس کیلئے آلات کی بھی ضرورت ہے۔ وہ آلات ایسے ہونے چاہئیں۔ کہ آسانی سے کم قیمت پر بر وقت مہیا ہو سکیں ورنہ دقتا تریان از عراق آوردہ شود مارگزیدہ مردہ شود کی سی کیفیت پیدا ہو جائیگی۔ جب تک ملک میں میکینیکل انجینئرنگ عالمگیر نہ ہو جائے۔ آلات کا اس طرح ہم پہنچانا ناممکن ہے۔ عرصہ دراز تک جانوروں، گائے، بیل وغیرہ سے کام لینا پڑے گا۔ اور ان کی نگہداشت بغیر حفظانِ صحت اور ویٹرنری سرجری دشوار ہے۔ پس دیہات میں ایسے میکینیکل اور ویٹرنری مدارس کا زیادہ تعداد میں کھولا جانا بھی ضروری ہے۔

زراعتی تعلیم کے متعلق مجھ کو فنی تعلیم کے ساتھ بھی کچھ کہنا ہوگا۔ شہری رقبوں کی تعلیم میں زیادہ تر شہر کی ضروریات کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ اس رقبہ کے لوگوں کی نظر زیادہ تر ملازمت اور تجارت و صنعت و حرفت کی طرف لگی رہتی ہے۔ عام تعلیم تو قدیم یا موجودہ طریقہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن وسطانی اور قوافی مدارس میں اگر کمرشیل کلاسز میں ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ ہینڈ کی تعلیم بھی دلائی جائے اور مناسب صنعت و حرفت کے مدارس کھولے جائیں۔ تو شہروں میں بے روزگاری کا سوال زیادہ تشویش اور تکلیف کا باعث نہ ہوگا۔

جسمانی تربیت

میں نہایت خوف و حراس کے ساتھ چند سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ملک کے نوجوانوں اور خصوصاً طلبہ کی صحت جسمانی کھشتی جا رہی ہے۔ شہر کے لڑکے اور لڑکیاں خاص طور پر کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ مسئلہ حفظانِ صحت اور حیثیت کے عام مسائل کے ساتھ وابستہ ہے تمام ملک میں طبی یا طاعون اور ذق کے امراض پھیلے ہوئے ہیں۔ ہماری سکونت و بود و باش کے مقامات غیر سائنٹیفک طریقہ پر منتخب ہوئے ہیں اور سچ پوچھو تو بے صداق :-

”حیدر آباد گینہ — اندر مٹی اور پرچونا“

انسانوں کی بود و باش کیلئے اتنے موزوں نہیں ہیں۔ جتنے کہ چھ ہوں گھوٹسوں اور متحدی امراض کے لئے موزوں ہیں۔ یہیں دولت مند بزرگوں اور صاحب ثروت امراء سے معافی خواہ کر عرض کروں گا کہ ماحول کے اثر نے ان کے مکانات کو بھی جراثیم سے مسمون اور مضر انہیں رکھ چھوڑا ہے۔ حفظانِ صحت کی معمولی سے

معمولی سے واقفیت بھی اس شقم کو دور کر دیگی۔ آرائش بلدہ کی ایکیم سرعت کیساتھ جاری ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ عزیمت کی رہائش کا مسئلہ بھی خاطر خواہ طریقہ پر حل ہو جائیگا۔ یہ امور سررشتہ تعلیم کے دائرہ سے باہر ہیں سررشتہ تعلیم طلبہ کی اقامت خانوں اور طلبہ کی ورزش جہانی کی طرف توجہ کر سکتا ہے۔ اقامت خانوں کی زندگی، اخلاقی اصول کے تابع، ہمدرد اساتذہ کے زیر نگرانی ایک ایسی نعمت ہے جس کے فوائد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا اس کے ساتھ ساتھ اگر ورزش جہانی کا بھی انتظام کیا جائے تو ملک کے آئندہ شہری اپنی تندرستی کی وجہ زیادہ صحیح الدماغ و خوش خلق اور کار فرما و کارکن ثابت ہوں گے۔ ہوائے اسکائولس و مونٹ ٹریٹوریل کو سکا قیام اور طلبہ مدارس کی عام جسمانی تربیت کیلئے ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ تجربہ کار شخص کا تقرر حال ہی میں عمل میں آئے ہے۔ ہمیں اُمید دلاتے ہیں کہ طلبہ کی صحت جسمانی میں معتد بہ ترقی ہو جائیگی یونیورسٹی کے طلبہ کا سالانہ طبی معاینہ بھی منظور ہو چکا ہے اگر..... مدارس کی عمارتیں سائنٹیفک اصول کے بموجب بن جائیگی تو طلبہ کی اکثر و بیشتر جسمانی کمزوریاں مثلاً مینائی کا قصور، غیشومی نقائص وغیرہ بڑی مدت تک دور ہو جائیں گے۔

طلبہ کا فطرۃ ورزش جسمانی کی طرف میلان طبع ہوتا ہے۔ اسنفورڈ اور کیمبرج وغیرہ اقامتی جامعات میں سب سے بڑی تربیت کتابی علوم سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ کبیل ورزش جسمانی اور معاشرتی زندگی ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ ہم اپنے بڑے مدارس میں بھی ہم یہی بات دیکھتے ہیں۔ اس فطرتی شوق کی ایک مثال شفیع احمد صاحب سابق طالب علم کلیہ جامعہ عثمانیہ کی یہ لڑکی میں کامیابی ہے جیسا کہ اکثر حاضرین کو معلوم ہے۔ اسی فطری جذبہ نے شفیع احمد صاحب کو روبرو بار انگلستان کو عبور کرنے کی کوشش پر آمادہ کیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس عالیشان عزم میں کامیاب ہو جائیں۔

مکینکل تعلیم

مکینکل تعلیم پر میں نے اس سے پہلے بھی کچھ کہا ہے۔ کسب معاش کے نقطہ نظر سے اس کی ضرورت واضح ہے۔ لیکن یہاں یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مکینکل تعلیم کی کامیابی کیلئے اول تو ملک کی صنعت و حرفت کا وسیع پیمانہ پر موجود ہونا لازمی ہے۔ کارخانوں کے مالکوں کو ایسے ہونہار کار آموزوں کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیے جو وہاں جا کر نوکری کرنا چاہتے ہیں کار آموزوں کو بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے مدرسہ یا جامعہ کی سند ان کو اگر کسی چیز کا اہل بناتی ہے تو محض کارخانوں میں داخل ہو کر کام کیلئے کا اہل بناتی ہے..... اصل کام وہ کارخانوں ہی میں کیجیے گے۔ اگر سپرٹ

رہی تو ملک میں صنعت و حرفت کو بہت کچھ فروغ ہو گا۔ لیکن انڈسٹری یا صنعت میں کسی ملک کا حقیقی معنوں میں ترقی نہ ملے اس قسم کی تدابیر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے بعض معیشتی اور بین الاقوامی مسائل کا حل نہایت ہی ضروری ہے۔ برطانوی ہند کے معیشتی اور تکنیکل ماہر اعلیٰ الخصوص کمیٹ اس طرف توجہ کر رہے ہیں مجھے اپنی طرز زندگی اور مصروفیتوں کی وجہ سے ان مسائل پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ سر دست میں بھی مشورہ دلیکتا ہوں کہ ان حضرات کو جو اس مسئلہ کھل میں اپنے آپ کو مشغول بناتے ہیں تحقیقات کر لینے دیں اس کے بعد ہم ان کے نتائج پر تنقید کر سکیں گے۔ ہمارے ملک کی ترقی کا دار و مدار زیادہ تر زراعت پر ہے ہمیں چاہیے کہ سر دست زراعت ہی کے مسائل پر غور کریں۔ اور ان کے تمام حل ڈھونڈیں۔

جو کچھ بھی تکنیکل تعلیم ہم دے سکتے ہیں۔ اس کو کامیاب بنانے کیلئے طلبہ کو باطنی و دست کاری کی طرف مائل اور اس سے مانوس بنانا سررشتہ تعلیمات کا بڑا فریضہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے ابتدا ہی سے طلبہ کو دستکاری کا عادی بنانا ضروری ہے۔ پس مناسب ہو گا کہ دست کاری کو تعلیم کے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔ سائنس چونکہ ایک عملی علم ہے اس کو بھی ابتدا ہی سے نصاب تعلیم میں شریک کرنا لازمی ہو گا۔ جسے بھی علمی مضامین ہیں ان سب کی بنیاد طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور ریاضی پر قائم ہے۔ پس ان مضامین کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے۔ اور اعلیٰ تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ترقی و ترویج کا انتظام ہونا چاہیے۔

اعلیٰ تعلیم

اعلیٰ تعلیم ایک ایسی شے ہے کہ اس سے ملک کے بہترین و ماغوں کی پرورش بلکہ نکوین ہوتی ہے الحمد للہ ہمارے ملک میں اس کی طرف توجہ جامعہ عثمانیہ و نظام کالج وغیرہ کافی توجہ کی جا رہی ہے۔ دس بارہ سال کے اندر جامعہ عثمانیہ میں ایم اے اور ایم ایس سی تک کی جماعتیں کھل گئیں۔ ایل ایل بی کی تعلیم بھی اچھے اصول پر جاری ہے۔ جامعہ کے موزوں عمارت نہ ہونے سے ہمیں اس تعلیم سے وہ حیرت انگیز فائدہ حاصل نہیں ہو رہا جو جس کی ہمیں توقع ہے باوجود ان رکاوٹوں کے ہم نے حکام شروع کر دیا ہے اس کی اہمیت کو مالک غیر کے ماہرین نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ بلحاظ تعلق مجھے جامعہ عثمانیہ کے متعلق زیادہ نہیں کہنا چاہیے صرف اس بات پر اکتفا کرنا ہوں کہ حیدرآباد میں جامعہ کا قیام ایک فطری امر تھا۔ اور اسی طرح اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا بھی ہمارے لئے ایک فطری بات تھی۔ گذشتہ جلد تقسیم انعامات کے موقع پر میں نے بیان کر دیا ہے کہ اردو زبان میں تعلیم حقیقی باشندگان ملک کے تمام افراد کو بلا لحاظ قوم و ملت انگریزی کے ذریعہ تعلیم دلانے سے زیادہ مفید کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔ میں یہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ عثمانیہ میں ملک کی دوسری زبانوں مثلاً تلمک،

مرحی اور کنٹری کی بھی خاطر خواہ خدمت کیا جا رہی ہے۔ ان زبانوں میں ایم اے تک کی بھی تعلیم دی جاتی ہے لیکن ان کے پروفیسروں نے زمانہ کارنگ اور ہندو طلبہ کا طبعی رجحان دیکھ کر یہی مشورہ دیا کہ بجائے ونیکٹر زبانوں میں ایم اے کی جماعتیں کھولنے کے ریسرچ کی تعلیم دلائی جائے چنانچہ حال میں پچھتر پچھتر روپیہ کے تین وظائف ان زبانوں کی ریسرچ کیلئے منظور ہوئے ہیں۔ اور یہ کام آئندہ شہر یورسے شروع کر دیا جائیگا۔ سائنس میں ایم ایس سی کے ساتھ ریسرچ بھی شریک کر دی گئی ہے۔ تاریخ کے ایم اے میں پہلے ہی سے مقابلہ نویسی داخل تھی اب اردو میں بھی اُس کو لازمی کر دیا جانا تجویز ہوا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یہ بیان کیا تھا کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اس بارے میں میں ذرا زیادہ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

کسی قوم یا ملک کا وقار اس کے اعلیٰ ترین افراد سے ہوتا ہے وہ کون ہیں؟ ملک کے مدبر و عمائد سلطنت جو اپنی قابلیت، وفا شکاری، ہمدردی اور کارزاری سے ملک کا نام روشن کرتے ہیں امر و سر وایہ وارجو اپنے فضل و کرم جو دو سخا و ملک کی خدمت گزاری سے رعایا اور جاقعدوں کی اعانت و دستگیری کرتے ہیں ان کے سوا ایک تمبر لطیفہ بھی ہے جو زمانہ دراز سے دنیا پر اپنا اثر ڈالتا چلا آ رہا ہے اس طبقہ میں ملہب و ملت کے پیشوا اور علماء و فضلاء شریک ہیں۔ زمانہ حال کی ماوریت پرستی نے انہوں سے کیشویان مذہب و ملت کو خارج از بحث گردانا اس لئے میں ان کا ذکر اس جگہ مناسب نہیں سمجھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ علم و فضل الہی اس سرگرم شریک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے علماء فضل الہی کے متعلق بحث کرونگا۔ پہلے زمانہ میں خانگی تعلیم سے یا کسی مشہور و معروف استاد کی خدمت سے لوگ علم و فضل کے بلند ترین درجوں تک پہنچ سکتے تھے اب مادی علم اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ بغیر اعلیٰ ایمانہ پر باقاعدہ اور مسلسل کوشش کر کے ملک کا کوئی فروغی معنوں میں عالم و فاضل نہیں بن سکتا۔ نہ تو کادروازہ بند ہونے کو ہے صرف ماوریت میں ترقی اور حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے خواہ فنون کے شعبہ میں ہو یا سائنس کے شعبہ میں نام آوری کرنے کے لئے اعلیٰ ریسرچ کی سخت ضرورت ہے۔ ایسی تحقیق صرف بڑے پایہ کے کتب خانوں اور تجربہ خانوں ہی سے ممکن ہے۔ قابل سے قابل شخص ان کتب خانوں اور تجربہ خانوں کے بغیر گناہ رہ جاتا ہے اور اوسط ذہانت کا انسان بھی ان میں کام کر کے کبھی کبھی بڑے اہم اور نمایاں ایجادات و انکشافات سے دنیا کو مسخر کر لیتا ہے۔ کتب خانوں اور تجربہ خانوں پر سرکار یا قوم کی طرف سے جتنا بھی روپیہ خرچ ہو فائدے سے خالی نہیں ان میں کام کرے والوں کو اطمینان قلب نصیب ہونا چاہیے۔ اگر ایسی ہمدردیاں قائم کر دی جائیں اور ان پر ملک کے قابل ترین اشخاص مامور کئے جائیں تو مالک محروسہ میں بھی اسی پایہ کی ایجادات و انکشافات دیکھنے میں آسکیں گی جیسی کہ برطانوی ہند کے بعض حصوں میں

اب نمایاں ہو رہی ہیں اور جن کا چہ چار دانگ عالم میں ہو رہا ہے۔ سر رائنڈر ناتھ ٹیکوڑ میگزین "سایا" اور سر سی دی راسن وغیرہ کی وسیع علمی دنیا میں ہند کو ان دنوں میں جو شہرت نصیب ہوئی ہے وہ بیس سال قبل لوگوں کے دہم و گمان سے بھی باہر تھی۔ کوئی دہ نہیں کہ دنیا کے سربراہ اور وہ ماہران علوم و فنون میں حمید آباد کے منتخب افراد کا نام داخل نہ ہو۔ ایسے کام کرنا بولے یہاں ڈھونڈنے سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کو موقع دیا جانا چاہیے۔ ایک بار جب وہ اطمینان کے ساتھ کام پر لگ جائیں گے تو ان کے زیر اثر ملک کے ہر نہار طبقہ سے بھی ایک ایسی جماعت ایسے محققین کی پیدا ہونے لگیگی۔ میں نے کوڈائی گنڈل (Kodai Gendal) کی رصد گاہ شمسِ طبیعیات (Solar physics observatory) میں ریسرچ کی اجازت اپنے طالب علموں کیلئے حاصل کر لی۔ پروفیسر ساہانے ہمارے ایک ایم ایس سی کے طالب علم کو الہ آباد کی فزکس لیباریٹری میں (Spectroscopy) پر کام کرنے کی دعوت دی ہے نظام کلچ کے ایک ہونہار گریجویٹ نے پروفیسر راسن کے تجربہ خانہ میں قابلِ تعریف کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں میں جامعہ عثمانیہ کے ان لائبریری طلبہ کا ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے یورپ کی جامعات میں قابلِ تحسین کامیابی حاصل کی ہے اور کہہ رہے ہیں اسلئے کہ متعدد موضوعات پر میں نے تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کر دیا ہے اگر ہم اپنے تجربہ خاںوں کو ترقی دیکر اطمینان کے ساتھ اعلیٰ تحقیقات کا کام کرنا شروع کر دیں تو ہمارے طلبہ کو باہر جانیکی ضرورت نہ ہوگی۔ اور تحقیقات میں جو کچھ کامیابی حاصل ہوگی اس کا کریڈٹ ہمارے ملک ہی کر لے گا۔

تعلیم نسواں

اب میں تعلیم نسواں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر ہم گزشتہ چند سال سے ہم نے انات کی اعلیٰ تعلیم پر کافی روپیہ صرف کرنا شروع کر دیا ہے اور مستورات کو یورپ بھیج کر تعلیم دلانی جا رہی ہے۔ لیکن یہ حیثیت مجموعی تعلیم نسواں پر اس سے بہت زیادہ روپیہ اور توجہ صرف کرنے کی شدید ضرورت ہے عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم سے کہیں زیادہ روزمرہ کی معمولی اور ان کے ضروریات کے مناسب تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے ہر تعلیم یافتہ شخص کو روز روشن کی طرح معلوم ہے کہ عورتوں کے لئے خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو بلند طبقہ کی ہوں یا پست طبقہ کی نہ صرف لکھنے پڑھنے کی بلکہ اچھے اور اونچے معیار تک کی تعلیم دلانا۔ کس لئے ضروری ہے اگر ہندوستان مہذب دنیا کی نظروں میں عزت کا مقام چاہتا ہے تو اسے بہت جلد اپنے انات کو تعلیم یافتہ بنادینا چاہیے لیکن اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ لڑکیوں کو ان کے مفید طلب اور کارآمد تعلیم دلانی جائے لوگوں کیلئے لڑکوں کی تعلیم کا نصاب ایسا ہی غیر موزوں ہے جیسے کہ فوجی ملازمت اگر مطیع نظر ہی ہے۔

کہ لڑکیاں بھی سب کی سب لڑکوں کی طرح میٹرکوبلیٹ انٹرمیڈیٹ پاس یا بی اے ایم اے بن کر تعلیم چھانوں سے نکلیں تو میں بلا تامل اپنے آپ کو ایسے ماہرانِ فہمِ تعلیم کے زمرے سے علیحدہ کر لوں گا جن کا یہ مطمح نظر ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق بارہا انات کی تنہیم سے سرپرستوں اور مہتمموں سے گفتگو کرتے رہا مجھے موقع ملا۔ میں نے جب دریافت کیا کہ انگلستان کے مدارس میں اعلیٰ تربیت انات کے اصول پر تعلیم کیوں نہیں دی جاتی تو یہی جواب ملا کہ اگر ایسا کیا جائے تو بہت کم لڑکیاں ہمارے مدرسوں میں شریک ہو سکیں گی کیونکہ سرکاری یا یونیورسٹی کی سند کی رشوت کے بغیر اکثر و بیشتر والدین اپنی بچیوں کو مدرسہ بھیجنا عیث سمجھتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ بہت جلد یہ خیال پبلک کے دلوں سے دور ہو جائیگا اور تعلیم کے اصل منشا و مقصد کی طرف مائل ہو جائیں گے۔

یہ سرکاری اور یونیورسٹی کی سندیں ہیں جو غالباً انات کو بھی انہیں نصاب کا پابند کراتی ہیں جو مردوں کیلئے تجویز ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید مسٹر کاروے (Mr. Carrowe) کی بنائی ہوئی مستورات کی جامعہ نے حصولِ سند کے شوق کو مفید مطلب نصاب کے ساتھ ایک حد تک سناہ دیا ہے۔ لیکن بذراثرِ غائر اگر یہ دیکھا جائے تو بالآخر اس صورت کے جب کہ عورت کو مجبوری یا محض شوق کی خاطر نوکری اختیار کرنا پڑتی ہے حصولِ سند کی خواہش ضروری ہے اور اگر درس چکا ہیں صحیح اصول پر باقاعدہ طریقہ سے انات کی ضروریات ہی سے متعلق نصابِ تجویز کے تعلیم دینا شروع کریں۔ تو میرا خیال ہے کہ بیشتر وشن خیال والدین اپنی بچیوں کو ایسے ہی مدرسوں میں بھیجنا پسند کریں گے اور تعلیم یافتہ انات کی تعداد میں معتد بہ ترقی ہوگی ایسی تعلیم یافتہ لڑکیاں یقیناً اپنے ماں باپ کے گھر میں بھی خوش رہیں گی اور شادی کے بعد شوہر و زن میں بھی بخوبی اتفاق رہیگا۔ اگر کوئی غیر معمولی ذہانت والی یا اعلیٰ تعلیم کی دلدادہ لڑکی محض اکتسابِ علم کی خاطر یونیورسٹی کا کورس اختیار کرنا چاہتی ہے تو ایک دوسری ہی بات ہے ایسی لڑکی کو جس قدر بھی اس کے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے مدد دی جائے اچھا ہے ہمیں توقع ہے کہ ہمارے ملک سے ایسی چند لڑکیاں نکلیں گی اور اپنے ماں باپ اور وطن کا نام روشن کریں گی۔

اگر انات کو سینا، پرونا کشیدہ کاٹھنا اور کھانا پکانا سیکھ لینے کے بعد حفظانِ صحت ڈوسٹنگ اکانومی، بیالوجی یا طب خصوصاً (Midwifery) دیا کریں اور نرسنگ (Nursing) کا شوق دلایا جائے تو وہ ملک و قوم کے لئے نہ صرف مفید بلکہ مایہ ناز بھی ہوگی۔ آخر الذکر دو شعبوں میں ہندوستانی عورتوں اور علی الخصوص مسلمان عورتوں کی اس قدر قلت ہے کہ ان کیلئے سرکار اور پبلک کی جانب سے خاص طور پر کوشش کی جانے کی ضرورت ہے۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ پردہ مانعِ تعلیمِ اناث ہے اور جب تک کہ نہ اٹھ جائیگا ہندوستان میں تعلیم یافتہ عورتیں عقابِ ہی عقاب میں گی۔ پردہ کی حقیقت یا اس کی ضرورت وغیرہ ضرورت کا سوال معاشرتی ہے خالصاً تعلیمی نہیں لہذا میں اس کے حسن و قبح پر اس مغل میں بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ پردہ کا عذر بتا کر جو لوگ تعلیمِ اناث سے غفلت کرتے ہیں اور اس کو کریں بیٹھے ہیں کہ پردہ اٹھا دیں بعد کو عورتوں کی تعلیم شروع کریں۔ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں کے گھروں کا پردہ تو غالباً اٹھ جائیگا۔ لیکن اس میں تسلیم داخل نہیں ہوگی۔

ایسی پردہ نشین شادی شدہ ستورات کی تعلیم کیلئے جو اپنے گھر کے کاروبار اور دیگر ضرورتوں کی وجہ سے مدرسے جا کر علم حاصل نہیں کر سکتیں مسٹر اسکر نے ایک اسکیم تجویز کی ہے جو خلوں اور خاندانوں کے اتحاد و عمل پر مبنی ہے جب وہ اسکیم مکمل صورت اختیار کر کے حیدر آباد کن کی انجمن خواتین *women's association* کی منظوری حاصل کر دیگی تو امید ہے کہ اس سے بہت خاندان استفادہ کر سکیں گے کیا عجب کہ اپنے خطیب میں محترمہ مسٹر ستم جی اس مسئلہ پر بحث کریں۔

تعلیمِ نوان کے کئی اور مسائل حل طلب ہیں مثلاً یہ کہ آیا چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مقررہ عمر تک مدارس میں ایک ساتھ تعلیم دلانا مناسب ہے یا یہ کہ لڑکیوں کو انگریزی کی تعلیم دلانا زیادہ مفید ہو گا یا اپنی مادری زبان کی تعلیم مسائل بہت دلچسپ اور ان پر خالصاً تعلیمی نقطہ نظر سے اچھی بحث کی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ خوش نصیبی سے محترمہ مسٹر ستم جی مونیس تعلیمِ نوان پر تقریر کر رہی ہیں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ کہ اس مسئلہ کو اب ختم کر دوں۔

اب میں مختصر طور پر بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ تعلیم کی سپرٹ کیا ہونی چاہیے مجھے یہ کہنے میں مطلقاً تامل نہیں کہ وہ تعلیم جو اخلاق کی نگہداشت نہ کرے عبث اور بے سود ہے۔ انسان میں اخلاق حمیدہ جب تک نہ پیدا ہوں وہ بہائم سے ملجھہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ مختلف زبانوں اور تمدن میں اخلاق کی تسلیم و مخالفت طرزوں پر رہی ہے لیکن ہر صورت میں اس کا کوئی معین نصاب نہیں رہا ہے یہ زیادہ تر اساتذہ کے اخلاق اور ملک کے اخلاق پر ہی مبنی رہا ہے قدیم زمانے میں شاگرد اساتذہ کو اپنے ہر کاروبار میں پیشوا اور ہادی سمجھتے تھے اور اساتذہ کو بھی اپنے شاگردوں سے ایسی محبت اور انسیت تھی جیسی کہ اپنی اولاد کے ساتھ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں تعلیم مفت و سبائی تھی یا اساتذہ کا معاوضہ اوقات یا اسٹیٹ کی دیگر پوشیدہ امدادوں کے ذریعہ سے کچھ ایسے غیر محسوس طریقہ پر ادا ہوتا تھا کہ تعلیم مفت ہی منظور ہوتی تھی۔ زمانہ میں رفتار کے ساتھ اس طرزِ تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ موجودہ تنخواہ یا ب۔ اساتذہ کا کم از کم ایشیائی ممالک میں وہ احترام نہ رہا۔

جو پڑانے ہمد کے اساتذہ کو نصیب تھا۔ لوگ یہی سمجھنے لگے کہ اسناد کو اگر ہماری فیس سے روپیہ نہیں ملتا ہو تو کم از کم سرکار سے توجہ و معاوضہ ادا ہوتا ہے۔ پس ہم پراحسان ہی کیا۔ معمولی تعلیم کی حد تک تو ایسے یا ان سے مختلف خیالات کا اثر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ جب اعلیٰ تعلیم و تحقیقات عالمیہ کا سوال پیدا ہو تو اساتذہ نے یہ محسوس کیا کہ ان اواب میں طلبہ کی رہنمائی ایک ایسی چیز ہے جس کا معاوضہ روپیہ پیسے سے کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی معاوضہ ہو سکتا تو وہ اپنے صرف شاگرد کی عقیدت، فرمانبرداری اور سعادت مندی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے طلبہ نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا اور جن جامعات میں آئے دن نئی نئی تحقیقات و انکشافات کی بارشیں برس رہی تھیں وہاں اسناد اور شاگردوں میں ایسے ہی تعلقات پائے جاتے ہیں جو زمانہ قدیم میں دیکھے جاتے تھے۔ کیا جذبہ ہوتا کہ یہ درجہ کی تعلیم میں بھی اس قسم کا تعلق برقرار رہتا۔ زمانہ گذشتہ کی اس خبری کو کم کر حاصل کرنے کیلئے اساتذہ کو زیادہ ایشیاء سے کام لینا ہو گا۔ اور شاگردوں کو زیادہ سعادت مندی اور اطاعت گذاری اختیار کرنی ہوگی جو کا سبب اسناد میں وہ اب بھی پیشہ تعلیم کو حصول زر کی خاطر نہیں اختیار کرتے بلکہ محض علم کی محبت میں اختیار کرتے ہیں جو جہاں طلبہ ہیں اس میدان میں زیادہ دن رہنے نہیں پاتے وہ یا تو اپنا پیشہ ہی بدل دیتے ہیں یا زمانہ انہیں ایشیاء سے نکھادینا ہے۔ یہ تو اساتذہ کے متعلق واقعات ہیں۔ طلبہ میں جب تک سعادت مندی نہیں اختیار کرتے انہیں علم نہیں نصیب ہوتا۔ اور اگر نصیب بھی ہوا تو اس کے مناد سے محروم رہتے ہیں۔ پس یہ اساتذہ و طلبہ دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ نوع انسان کے ارتقاء و صلاح و بہبود کی خاطر وہ زمانہ ماضی کے ان مبارک اخلاق و اطوار کو اپنا نصب العین بنالیں جس سے معلم و متعلم دونوں کی عزت افزائی ہوتی تھی اور دونوں کو ہر دن از قیاس فائدہ پہنچتا تھا۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں اسناد ہیں وہ اپنے ہونہار شاگردوں کے مفاد کے لئے اگر ضرورت ہو تو تمام دنیا سے بگاڑ کر لینا پسند کرتے ہیں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ شفقت اسناد کی بدولت کند ذہن سے کند ذہن طلبہ علم بھی کیتا ہے روزگار میں لگے ان کی دنیا اور عاقبت دونوں ہی اچھی رہیں۔ پس اسناد کا احترام اور اس کے ساتھ وفا شکاری شاگرد کے لئے ایک ایسا اخلاقی فریضہ ہے جو مذہبی حکم کی وقعت رکھتا ہے۔

مہر لوگوں کی تعلیم

بائیلٹ ایجوکیشن ایک زمانہ سے زور دیا جا رہا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ایسے مفرد الحال لوگ جو قیمتی ہے اوائل عمر میں اچھی تعلیم نہ پاسکے اور پھر ایسے ہی ناقص تعلیم میں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کا تندر زیادہ تر تعلیم پر توجہ دے۔

اور تعلیم عمر اور دیگر قیود سے بری ہے۔ عمر شخص کیلئے امتحانات کا سیلاب کرنا یا ڈگریاں لینا اگر ممکن نہیں تو محض علم کی خاطر تحصیل علم چنداں مشکل نہیں۔ انسان کی قوت ارادی فضا اور وقت دونوں پر غالب آسکتی ہے۔ علم کے ایسے طلب کار کتب خانوں، ٹائٹ کلاسوں اور پاپور یا ایکٹشن لکچروں سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ پس اسید کی جانی ہے کہ سرکار یا دولت مند پبلک کی طرف سے انسٹیوشن زیادہ تعداد میں اور سرعت کے ساتھ زیادہ قائم ہو جائینگے۔ پبلک کتب خانوں کا اثر ملک کی خواندگی پر انتہا درجہ کی اہمیت رکھتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بلڈ و مصنفات میں ہمارے ملک میں بھی ایسے کتب خانے بڑی تعداد میں قائم ہونے لگے ہیں اگر ان کتب خانوں کے سرپرست یا مہتمم محض اشاعت تعلیم ہی اپنا نصب العین رکھیں۔ اور سیاسی یا سازشی آلاتوں سے ان کو پاک صاف بنائیں تو ملک علم کی تنویر سے منور ہو جائیگا۔ اور فرقہ بندی کے جھگڑے آپ سے آپ رفع ہو جائینگے۔

اشاعت تعلیم میں صاحب ثروت امر اور دولت مند اشخاص کا اثر

اب تک ہم نے جو کچھ کہا وہ زیادہ تر سرکاری انتظامات تعلیم ہی سے متعلق تھا۔ ہمارے ملک ہند میں پبلک کو ابھی سرکار کا ہاتھ بٹانے کا خیال نہیں پیدا ہوا ہے۔ اگر پبلک بھی ایسے تعلیمی اور رفاه عام سے متعلق کاموں میں محض زبانی نہیں بلکہ دام و درم کے ساتھ دلچسپی لے تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا ملک تعلیم میں کسی دوسرے مہند ملک سے پیچھے نہیں رہیگا۔ امر اگر کاربائے تعلیم میں لچھی نہیں لیتے ہیں تو کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ کم ان کو دلچسپی دلانے کی کوشش کریں۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگرچہ ہمارے ملک حیدر آباد میں لائق اور نام آور استاد وغیرہ بہت گزرے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے کسی طبقہ امر یا صاحب ثروت حضرات پر اپنے علمی کاموں کا ایسا گہرا اثر نہیں جمایا جس سے ان بزرگ ہمنوں کو کم از کم وظائف یا انعام تعلیمی کے ذریعہ ان سائڈ کی یاد گاریں قائم کرنے کا کچھ بھی احساس پیدا ہوا ہو۔ جو یاد گاریں قائم ہیں وہ زیادہ تر سرکاری کی رقم سے قائم ہیں۔ پبلک فنڈ سے اگر کوئی یاد گاریں قائم ہیں تو ان کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا دونوں مساوی ہیں۔ نیچے اندیشہ ہے کہ اس قدر کی وجہ زیادہ تر خد اہل علم کا باہمی حسد یا سہل انگاری ہے۔ یس اسید کرتا ہوں کہ وہ اب ان کمزوریوں کو رفع کریں گے اور طبقہ علماء کی فضیلت کو ملک سے منوا کر انہیں اس بلند مرتبہ پر پہنچا دیں گے جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔

مطابع اور ان کا اثر اشاعت تعلیم پر

مطابع خواہ انگریزی ہوں یا اردو یا دیگر ملی زبانوں کے مدارس سے بھی زیادہ علم کی اشاعت کرتے ہیں ان

کے ذریعہ ہزار ہا معلومات، دور و دراز مقامات تک اور عام طور پر بہترین پیرایہ میں پہنچائی جاتی ہیں۔ مطابع کے مالک اور علمی اخبارات و رسائل جات ایک طرح سے علم کے سرپرستوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ انہیں اپنی اس قوت کا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی اس قوت کو اچھے ہی کاموں میں صرف کریں گے۔ ان کے پاس ایک نہایت ہی تیز شمیر ہے جس سے وہ اگرچہ اپنی توجہ اور دروغ کو دنیا سے نیت دنا ہو کر دیں یہ نہیں چاہتے کہ اس ہتیار کو صرف نیک کاموں کی تائید میں استعمال کریں۔ فائیت غسٹا بیانی اور غیر محققہ اطلاعات کی اشاعت سے پرہیز کریں ورنہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا وہ مشہور شعر ان کے حسب حال سمجھا جائیگا۔

ترا تیشہ داوم کہ ہینم شکن
نیگفتہ کہ دیوار مسجد بکن

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک اب ایسے مدیر پیدا کرنے کی طرف مائل ہو رہا ہے جو اس شعر کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور واقعات کے بیان اور رازوں کے اظہار میں حق شناسی اور نیک نیتی سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت میں سیاسیات کو نظر انداز کر کے مطابع کے ان کاروبار سے بحث کر رہا ہوں جو علمی رسائل اور کتابوں کی طباعت سے متعلق مناسب رسالوں اور کتابوں کی اشاعت سے ہر گھڑ مدرسہ یا دارالتعلیم بن سکتا ہے اور ان کا ہر مطالعہ کرنیوالا ایک گھریلو یونیورسٹی کا طالب علم تصور ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری اقتصادی کمزوری اجازت نہیں دیتی کہ ملک میں مطابع کی کافی تعداد مہیا ہو جائے۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ ہمیں انگریزی اور اس میں بھی ریاضی اور سائنس کی کتابوں کی طباعت میں غیر معمولی دقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں خدا کرے کہ طباعت کتب کے لئے حیدرآباد میں جلد مدارس میں بھی ٹھکانہ وغیرہ ڈال دیں۔ سہولتیں پیش ہو جائیں تاکہ مصنفین کو نصیحت تابعت کی مزید سہولت ہو اور پڑھنے والوں اور علمی انصاف طلباء کی سستہ دماؤں اور عمدہ چھاپائی کی کتابیں مل سکیں۔

یہاں اردو ناٹپ اور تعلیق وغیرہ کا سوال بھی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ مال ہی میں نستعلیق کا نفرین کے اجلاس منعقد ہوئے تھے اور اس کا مسئلہ زیر سرپرستی سرکار عالی، ایک منتخب کمیٹی کے سپرد ہوا ہے اس لئے تیز صرف اتنا بیان کر کے اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ سرکار عالی نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش میں کئی ہزار روپیہ خرچ کر دیا ہے اور خرچ کرنے پر آمادہ ہے جس سے اس کی سرپرستی عام کا ایک مزید ثبوت ملتا ہے۔

تعلیمی نمائشیں اور ان کے فوائد

سابق میں ہماری تعلیمی کانفرنس کے جلسوں کے ساتھ علمی نمائشیں بھی منعقد ہونے لگی ہیں۔

حقى الامكان ایسی بنائشوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں ان کے قیام و انتظام پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے اس وقت میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ بیان کروں کہ اگر ہر سال بلکہ کے علاوہ اضلاع میں بھی ایسی نمائشیں منعقد کی جائیں اور دیگر ممالک کے مدارس و اساتذہ وغیرہ کو ان میں شرکت کی دعوت دی جائے تو شوق مسابقت اور باہمی ارتباط نہ صرف تعلیم کی ایفیشنسی (Efficiency) یعنی استعداد کو ترقی دینا بلکہ آپس کا اتحاد بھی بڑھا دیگا جس کی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے ایسی نمائشوں میں سینما کے ذریعہ تاریخی و اخلاقی مطالب پر بھی بہت کچھ روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اور سائنس کی جدید ترین تحقیقات اور اس کے نتائج سے چھوٹے اور بڑے بچے اور بڑھے سب کے سب بوقت واحد واقف کرائے جاسکتے ہیں۔

فوٹو گرافی اور پینٹنگ

اسی ضمن میں میں نقاشی و عکاسی یعنی پینٹنگ اور فوٹو گرافی کی ضرورت تعلیم کی جانب آپ کو متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ملک کو عمدہ پینٹروں اور فوٹو گرافروں کی سخت ضرورت ہے سیر و سیاحت کے ذریعہ انسان اپنے اور پرانے ملکوں کے خوشنما مناظر سے آگاہ ہو جاتا ہے اور ان کا خوشگوار اثر اس کے جہالیاتی حواس کو تقویت بخشتا اور اس کی اخلاقی زندگی کو فروغ دیتا ہے لیکن محاذ پہاں تک اور کب تک کام لے سکتا ہے ان چیزوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے عمدہ فوٹو یا تصاویر لی جائیں بعض صورتوں میں فوٹو گراف کے ذریعہ اشیا کی تفصیل خاطر خواہ نہیں کی جاسکتی مجہد اچھے سے اچھے فوٹو گراف زیادہ دیا جائیں ہوتے اس لئے پینٹنگ یا ڈرائنگ اور فوٹو انگریزنگ کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں مہذب دنیا کے ان مشہور و معروف کمالات کا شوق پیدا کرنے کیلئے مناسب ہو گا کہ ان کی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ اگر ہر سال چند ہونہار طالب علم اعلیٰ یا دیگر مشہور ممالک یورپ کو فنون لطیفہ کی تعلیم کیلئے بھیجے جائیں تو ملک کو اس سے بڑی تقویت ہوگی ان کمالات کے کہ سب انسان کی حب الوطنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذی اثر اور صاحب ثروت لوگ ممالک خیر کی خوبیوں کو دیکھ کر اپنی بود و باش کے شہروں کو بھی خوشنما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیر و سیاحت (اکسکرسن)

شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے :-

گر بہ دکان خانہ در گردی — ہر گز اے خام آدمی نشوی
برو اندر جہاں تفریح کن — پیش از ان در کجیاں نہوی

کون ایسا شخص ہے جو سیر و سیاحت کے فوائد سے انکار کرتا ہے یا اس کا لطف اٹھانا نہیں چاہتا کسی عمر میں بھی ہول سیاحت مختلف طریقوں سے منفعت بخش ہوتی ہے لیکن نوعمری اور طالب علمی کے زمانہ میں جب کہ انسان کے حواس مشاہدہ قوی تر اور اس کی آئندہ زندگی کو ایک خاص شکل میں ڈھلنے کے مواقع بیشتر اور بہتر ہوتے ہیں سیر و سیاحت زیادہ فائدہ بخش ہوتی ہے انگلستان کے مدارس (صاحب ثروت اور علم و دست اصحاب کی مدد سے جو کیا عجب کہ انہی مدارس کے طلباء تعلیم میں سے ہوں) طلبہ کی سیر و سیاحت کا خاص طور پر انتظام کرتے ہیں سولہ سترہ سال کے لڑکے چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں دورانِ مدتی تعلیم میں دنیا کا سفر کر کے اپنے اپنے مدرسوں کو واپس لوٹتے ہیں بوائے اسکالرش کے منتظین بھی اس قسم کے کاموں میں عہدہ دارانِ مدارس کا ہاتھ بٹاتے ہیں ایسے اسکالرش جہتِ قسم کے جوتے ہیں اور سب کے سب دلچسپی سے ملو ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی پاسبانہ ملک کا سفر کرتے ہیں کوئی سائیکلوں پر اگر دور کا سفر مطلوب ہے تو ریل یا جہاز کے ذریعہ سیاحت کرتے ہیں ارباب پول کے فرزند موٹر کاروں میں گھوم کر آتے ہیں شاید چند سال کے بعد ہوائی جہازوں کے ذریعہ بھی طلبہ سیاحت کر سکیں چونکہ طلبہ کو اس امر کی تلقین کی جاتی ہے کہ اس قسم کا سفر مدرسہ کی زندگی کا ایک جزو ہے۔ اور ڈسپلن یعنی ضبط کی محنت ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس لئے دو اوجھڑوں کی ہونٹوں پر بات و وقوع میں آنے نہیں پاتی اگر آتی ہے تو خاطر کی کوپوری سزا دیکر واپس بھیج دیا جاتا ہے جب نوعمر طالب علم ایسے باقاعدہ طریقہ پر دنیا کی سیر کرتا ہے اس کے مختلف ممالک پہاڑ، دریا، جنگل، میدان، شہر اور قصبے دیکھتا متعدد اقوام کی پیشہ مار و رنگا ہوں پر نظر ڈالتا، ان کے ہم عمر بچوں کے ساتھ گفتگو کرتا اور کھیلتا ہے۔ تو دنیا اس کے انداز میں چھوٹی ہو جاتی ہے اور انسان کا غرور و وقار اور اس کے ساتھ ہی خدا کی قدرت اور عظمت کا تینفن اس کے دل میں بڑھ جاتا ہے اگر سبب نوع انسان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا مقصود ہے تو شاید اس سے بہتر کوئی طریقہ دستیاب نہیں ہو سکتا۔

کھیل

کھیلوں کے متعلق جسمانی تربیت کا ذکر کرنے وقت میں کچھ زیادہ نہ کہہ سکا ابھی ابھی سیر و سیاحت کے بیان میں میں نے کھیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے طلبہ کیلئے کھیل بھی ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کہ درس اس دعوے کے ثبوت میں مجھے کوئی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہر کس و ناکس مدارس کیلئے کھیل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے کیا خوب ہوتا کہ ہمارے تمام یا کم از کم بڑے بڑے مدارس اور کالج اپنی اپنی زمین رکھتے اکثر صورتوں میں تو مدرسہ کو خود اپنا مکان نصیب نہیں تو زمین کہاں سے آتی ”جامہ ندیم، دامن از کجا آرم“ لیکن جب کرایہ کے مکان میں مدرسہ کھولا جاتا ہے تو کھیل کیلئے زمین بھی کرایہ یا اجازت سے لی جاسکتی ہے اور اکثر صورتوں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے آگسٹ فورڈ اور کیمبرج کی جامعات والا سلطنت سے دور واقع ہونے میں انہیں یہ بڑا فائدہ ہوا تھا آیا کہ ان کے پھیلنے میں موانعات کم تھے ہیں۔

اور ان کو کھیل کود کے لئے سطح میدان کے وسیع رقبہ بہ آسانی مل گئے اور مل جاتے ہیں لندن اور دوسری شہری جامعات کو یہ قدرتی مواقع نصیب نہ ہوسکے اس پر بھی لندن کے کالج اور مدارس شہر کی آبادی سے باہر مناسب میدان کرایہ یا اجازت سے لیکر رکھتے ہیں اور شوقین طلبہ موسم بہار و گرما میں وہاں ریل وغیرہ کے ذریعہ پہنچ کر کھیل کا لطف اٹھاتے ہیں سررشتہ تعلیمات اگر اس قسم کی سہولتیں اپنے علاقہ کے تمام مدارس کیلئے مہیا کرنے کی کوشش کرے تو نہ صرف طلبہ کی صحت ہی ترقی کرے گی بلکہ تعلیم کے ساتھ عام تربیت بھی اچھی ہو جائیگی۔

تعلیم اور بے روزگاری

اکثر اصحاب تعلیم کی عمومیت کیلئے جب کوئی تحریک کی جاتی ہے تو بے روزگاری کا سوال پیش کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تعلیم عام ہونے سے پڑھے لکھے آدمی بہت ہو جائینگے اور ان سب کو چونکہ نوکریاں نہیں مل سکتیں اس لئے ان میں بے چینی پھیل جائیگی۔ صحیح اعداد و شمار کے بغیر کسی بھی مسئلہ کے متعلق کوئی رائے قائم کر دینا مناسب نہیں ہے۔ برطانوی ہند میں ضرور ایسا ہوتا ہو۔ لیکن ابھی حیدر آباد میں تعلیم کی ایسی عمومیت نہیں ہے کہ اس قدر خدشہ پیدا ہو۔ صرف اتنا سمجھ کر خاموش بیٹھ جانا بھی تدبیر نہیں ہے۔ پہلے تو ہمیں چاہئے کہ ایسے طریقہ تعلیم ہی اختیار نہ کریں جن سے بیروزگاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہو۔ یا نہ ہو ملازمت کی تعداد تو محدود ہی رہیگی۔ ممکن ہے کہ تعلیم زیادہ ہونے سے نوکریوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ ہو جائے لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص سرکاری یا خانگی نوکری حاصل کر لے گا اور ساتھ ہی ہر زندہ انسان کو اپنا پیٹ پالنا اور اپنے متعلقین کی پرورش کرنا ناگزیر ہے۔ اس خطبہ کے ابتدائی حصہ میں میں نے جس قسم کی تعلیم کی سفارش کی ہے اگر وہ اختیار کر لی جائے تو بے روزگاری اور بے چینی کا خطرہ کم رہیگا۔ بحالت موجودہ جب کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص مثلاً گریجویٹس وغیرہ کی تعداد ہمارے ملک میں چار پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور ہر سال ہماری اور دیگر جامعات سے ڈیڑھ دو سو سے زیادہ ملکی گریجویٹ نہیں نکلتے ہیں۔ تو باہر کے خصوصیت کے ساتھ لائق افراد کے تقرر کی گنجائش نکال کر بھی ہمیں شاید کافی تعداد میں ملازمت مل سکے اگرچہ ریاست کے تمام محکمات کا رفاہیات وغیرہ کی سرکاری اور غیر سرکاری خدمتوں کو شمار میں لے لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محض گریجویٹس کی تعداد کا خدمات کی تعداد سے مقابلہ کرنا درست نہیں امیدوار کیلئے خدمت کی موزونیت کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو یقیناً خدمت کیلئے امیدوار کی موزونیت کا تو لحاظ کرنا لازمی ہے۔ اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو اب بھی جبکہ گریجویٹس کی تعداد کم ہے ملک میں کافی نوکریاں نہیں مل سکتیں پس ضروری ہے کہ تعلیم کا طریقہ تعلیم تبدیل کیا جائے۔ مسئلہ سرکار کے زیر غور ہے اور امید کی جاتی ہے کہ بہترین مشوروں کے بموجب اس مسئلہ کا بہترین حل منظور ہوگا۔



خاں بہادر شمع نور الہی صاحب ایم اے بی ای ایس
ڈیٹم فل انسٹرمدارس لاہور

شہداءِ علماءِ مولوی لطافت حسین علی کی گائیڈنس

دو دریا عیان ہر انسان کی شان ہے

اگر دو دریا گوراج چھوڑتا ہے
شہرِ دہلی میں رواج کہ جو تیرا ہے
پیرِ حقیقی اس میں کاسنہ باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

دلی کی زبان کا سہارا تھا اس =
ادریکھنؤ کی آواز کا تارا تھا اس
دلی حریفی تو اس کی بہار
دہلی کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا اس

حالی

عکس تحریر

شمس العیسیٰ مولانا شبلی نعمانی

مرتبہ

آپ کو تو بہت کچھ خطا ہے شمس العیسیٰ
کو مبارکباد دیا ہوں کہ آپ کو خطا
کو غرت حاصل ہوئی۔
نہایت ہی حالت میں ہر قدر کھینچا۔

۳ جون ۱۹۳۱ء

عبد

عبد



شیخ عبدالحامید صاحب ایم ای ایس ڈیوٹی فیل
انجینئر مدارس ملتان



میں مکرر کہوں گا کہ ہمیں زراعت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ ہمارا تعلیم ہمیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنے کیلئے زیادہ قابل بنائے۔ کہیں بعض حضرات اس سے نتیجہ نہ نکالیں کہ اس تحریک سے میرا نشانہ یہ ہے کہ ہم لوگ صرف غریب کسان بن جائیں۔ نہیں! اس چاہتا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص زمیندار بنیں۔ جاگیردار اپنی جاگیروں کو آپ خود سنبھالیں۔ مقاطعہ دار بنفس نفیس اپنے مقطعوں کی نیکہ بھال کریں اور پٹہ دار و الغلام اپنے وسیع قبضعات پر صبح اور رات معلومت کے ساتھ زراعت اور باغبانی کریں۔ تعلیم یافتہ شخص اگر زراعت کی طرف توجہ کرے تو وہ کوکری سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

ہمارا ذریعہ تعلیم

(از جناب مولوی عبدالقادر صاحب سروردی ایم۔ اے۔ ایل ایل بی)

اس امر میں اب شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ تعلیم وہی مفید ہے جو بچوں کو ان کی مانوس زبان میں دیا جائے۔ یورپی ممالک میں تعلیم کی اشاعت اور ترقی کا ایک بڑا راز یہی ہے کہ وہاں بچوں سے لیکر بوڑھوں تک اور نہ صرف ملک کے ایک خطہ سے لیکر دوسرے خطے تک بلکہ نوآبادیات میں بھی ہر ایک کی توجہ ایک ہی اور اپنی زبان پر مبنی ہوتی ہے۔ بچے مختلف زبانوں کے سیکھنے کی الجھنوں سے بری ہیں۔ اپنی زبان پر قدرت حاصل کر لینے کے بعد وہ فوراً زیادہ اہم علوم و فنون کی طرف توجہ کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح کسی اجنبی زبان کے ذریعہ علم سیکھنے میں وہاں متعلمین کا وقت ضائع نہیں ہوتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان سیاسی اور طبعی طور پر ایک ملک کی تعریف میں آتا ہے، لیکن اس کی وسعت نے نہ صرف مختلف صوبوں کی آب و ہوا میں اختلاف پیدا کر دیا ہے، بلکہ اس کے طول و عرض میں سینکڑوں زبانیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ ان زبانوں میں بعض ایسی بھی ہیں جو کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ بعض محدود ہیں۔ لیکن ان کی ادبیات میں خاصی ترقی ہو چکی ہے۔ جیسے بنگالی زبان۔

آئندہ ہندوستان میں ایک اہم سوال مشترک زبان کا بھی پیدا ہونے والا ہے۔ جب تک یہ ممکن نہ ہو

کہ ہندوستان کے مختلف صوبے جن میں سے اکثر یورپ کے ممالک کی وسعت کے برابر ہیں، ضرورت اور سہولت کے لحاظ سے ایک ایک مملکت قرار دیئے جائیں، اس وقت تک مشترک زبان کی ضرورت اور اہمیت گھٹتی نظر نہیں آتی۔ فی الحال ہر صوبے کی زبان الگ ہے بلکہ ایک ایک صوبے میں کسی کسی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ سرحدی صوبے میں پشتو اور اردو، کشمیر میں اردو اور کشمیری، پنجاب میں اردو و گurmukhi اور پنجابی، دہلی میں اردو اور ہندی، یوپی میں ہندی اور اردو، سی پی میں ہندی۔ مرہٹی اور اردو، بنگال میں زیادہ تر بنگالی اور اردو، راجپوتانہ میں راجپوتانی اور اردو، سندھ میں سندھی اور اردو، بمبئی میں زیادہ تر گجراتی اور اردو اور پوربے کے سوا میں مرہٹی، مدراس میں تامل وغیرہ اور اردو، حیدرآباد میں تملی، مرہٹی، کنڑی اور اردو، ممبیسور میں کنڑی اور اردو، جنوب بعید میں تامل، ملیالم وغیرہ۔ ان سب پر طرہ یہ ہے کہ انگریزی حکومت کی زبان ہونے کی وجہ سے ہر صوبے میں تعمیم یافتہ طبقے اور دستروں کی زبان ہے۔

ان اختلافات کو نظر میں رکھتے ہوئے ایک معلم اور تعلیمی خدمت گزار کو اس گٹھی کے سلجھانے میں بڑی وقت پیش آتی ہے کہ کس صوبے کے لئے کونسی زبان مخصوص کی جائے۔ اور جہاں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں۔ اُن کا انٹ اختلاف کس طرح دور کیا جائے۔ اور پھر لطف یہ کہ ماورسی زبان کی تعلیم کا مطمح نظر سامنے سے ہٹنے نہ پائے، اس اصول سے ذرا بھر بھی انحراف نہ ہونے پائے اور ہر صوبے کا کوئی طبقہ بھی ناخوش نہ ہو۔

میرے خیال میں مذہبی تعصبات کا خاموش ہو جانا آسان ہے، لیکن لسانی اختلافات کا پہلے ہی پہل تصور ہی طور پر دور ہونا مشکل ہے۔ ہم بزرور یہ منوا سکتے ہیں کہ فلاں زبان اکثریت کی بدولت ایک خاص صوبے کی مقامی زبان سرکاری طور پر قرار دی جاتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے اقلیت پر اور خصوصاً ایسی جماعت کے کس کچوں پر جو بار پڑ چکا وہ ناقابل تلافی ہے۔ اس کے علاوہ یہ طرز عمل اس وقت تک اختیار نہیں کیا جاسکتا جب تک ہند کے ہر صوبے کی گورنمنٹ علیحدہ اور دوسری سے بے تعلق نہ بن جائے۔ بحالت موجودہ ہر صوبے کے اندرونی اور بیرونی تعلقات اور ایک صوبے کے لوگوں کی دوسرے صوبے میں روزانہ منتقل قیام اور کاروبار نے ایک مشترک زبان کے فروغ کو فطری طور پر ضروری بنا دیا ہے۔ ایسی زبان ظاہر ہے کہ وہی ہو سکتی ہے جس کو ضرورت نے پیدا کیا ہو، اور جس کا نشوونما اسی محرک قوت کی بدولت عمل میں آ رہا ہو۔

ماحول کی دقتیں یقیناً قابل اعتناء ہیں، لیکن اُن کا محض جاننا ہی اُن کا حل نہیں ہو سکتا۔ حل بہر حال سوچنا پڑ چکا۔ ممکن ہے کہ پہلے پہل کوئی مل ہمارے مذہب کو اپیل نہ کرے کیونکہ انسان ہر شے کو سب سے پہلے اپنے مذہب کی کوئی پر جانپنا ہے اور بعد کو مقبولیت سے مدد لیتا ہے۔ لیکن ضرورت رفتار زمانہ اور اوقات کے فطری اٹھان پر نظر رکھ کر جو چیز سوچی جائیگی اس کا مستقبل بعید ہی میں سہی، لیکن واقع ہونا ضروری ہے۔ چونکہ اجتماعی افعال اور معاملات بڑی

مدنک مصنوعی نہیں ہوتے، اسلئے اُن کی رو کو روکنے کی ہزار کوشش کریں۔ لیکن جو ناہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ یہاں ہمارے رد و ایک وسیع مملکت ہے، جس کے ہر صوبے میں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہیں، اور ہر زبان کے بولنے والے کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کی وکالت کرے اور اگر ممکن ہو تو اسی کو سارے ہندوستان کی مشترک زبان منوانے کی کوشش کرے خواہ وہ ہندوستان کے کسی سمدود حصے یا جنوب بعید کی ملیام اور تامل ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جب تک حالات مساعد نہ ہوں، بڑی سے بڑی تجویزیں بھی کاغذ کا نقش بن کر رہ جاتی ہیں۔

بعض لسانی ماہرین ایک نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔ ہندوستان کے صوبوں میں زبانیں جس طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا مشاہدہ کرنے اور اپنے عملی تجربہ سے مدد لیکر ہر زبان کی رفتار خصوصیات کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ متحد ہندوستان کی اگر کوئی مشترک زبان ہو سکتی ہے تو وہ ”ہندی“ یا ”اردو“ ہے۔ مسلمانوں نے اردو کی تائید کی اور ہندوؤں نے ہندی کی۔ اس اختلاف خیال نے بھی بعض جگہ باضابطہ کش مکش پیدا کر دی ہے۔ یک کش مکش اگر دور ہونے ہی کیلئے ہو تو ظاہر ہے کہ کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔

غرض یہ مسلم ہے کہ ہندوستان کی مشترک زبان انہیں دو میں سے ایک ہے یا دوسری ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے یہ ظاہر ہے کہ ہندی اور اردو میں کوئی اصولی فرق نہیں یہ اگر علیحدہ ہیں تو اسلئے کہ ایک ہی تنے کی شاخیں ہیں۔ ہندی اور اردو ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں۔ لیکن دو علاقائی یا اضافی نہیں بلکہ دو سنگے بھائی بھی جس طرح دو مختلف معلمین کے پاس پڑھ کر، یاد و مختلف ماحولوں میں نشو و نما پا کر عادات، اطوار اور بڑی مدنک ملمح نظر میں بھی ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح ان دو نو زبانوں میں بھی ظاہری اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ اختلاف فضا، مذاق اور لباس کے ہیں۔ اردو زیادہ تر مسلمانوں کے ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے لفظیات، عروض اور رسم الخط میں ہندی سے مختلف ہو گئی۔ یا جیسے سرگرم برسن اور کٹے کا خیال ہے اردو سے عربی اور فارسی الفاظ خارج کر کے، فارسی اصول عروض سے قطع نظر کر کے ہندی زبان بنائی گئی

یہ اختلافات یقیناً قابلِ نظر انداز نہیں یہی سبب ہے کہ بعض ہمدردانِ قوم نے، ملک کی بیشتر قدامت کو ان مسائل پر مضامین لکھ کر اس نزاع کے دور کرنے کی کوشش شروع کی ہے۔ یہ کوشش ایک مشترک ہندوستانی زبان کے پیدا کرنے اور اُس کو فروغ دینے متعلق ہے

ہندوستانی زبان در حقیقت ہندی اور اردو کی بین بیٹی شکل ہے۔ یہ کوئی نئی زبان نہیں بلکہ یہ وہی قدیم زبان ہے، جو لکھنؤ کی ادبی اور گرائمر اردو اور بنارس کی سنسکرت نما ہندی سے پہلے ہندوستان بھر میں رائج تھی۔ اور جو وہی اختلافات کے ساتھ کشمیر میں کشمیری، پنجاب میں پنجابی، راجپوتانے میں جہستانی، بنگال میں بنگالی،

گجرات میں گجراتی، جہاں اشتر میں مرہٹی، اور دکن میں دکھنی کے نام سے موسوم ہوئی۔ انہیں زبانوں کی ایک بہن جو میرٹھ اور دھلی کی نواح میں بولی جاتی تھی، اُردو اور و آجے میں ہندی کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد ان کی زبان یعنی فارسی کے اثر سے ہندی زبان کی جو مختلف شکلیں بنیں انہیں بعض علماء نے ”ہندو المانی“ بھی کہا ہے۔ کیونکہ یہ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہیں۔

قدیم زمانے کی سادہ اور ہندی سے مشابہ اُردو کیلئے ”ہندوستانی“ کا نام خاص طور سے استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہ تو مروجہ اُردو ہے، اور نہ موجودہ ہندی۔ قدیم مستشرقین جیسے ڈاکٹر جان گلکرسٹ، فلاٹ، شکسپیر، فیٹس سے لیکر حال کے علما تک نے اس زبان کو ہندوستانی ہی سمجھا۔ چنانچہ ان کی تصنیفات کے نام اس کے شاہد ہیں۔ قدیم پنجابی، گجراتی، دکھنی اور ہندی مطبوعات کی نہرستوں کیلئے ”ہندوستانی مطبوعات“ ہی کا نام استعمال ہوا ہے۔

عرض ہندوستانی کا نام اس زبان کے لئے بے حد موزوں ہے، جو رفتہ رفتہ ہندوستان کی مشترک زبان بن رہی ہے۔ اس نام کی بدولت یقین ہے، وہ نقصات بھی خاموش ہو جائیں گے، جو ہندی اور اُردو کے نام سے وابستہ ہو گئے ہیں

ہندوستانی کے متعلق ہم نے ابھی اوپر لکھا ہے کہ وہ ہندی اور اُردو کی بین بیینی شکل ہے۔ اس کی یہاں کس قدر وضاحت درکار ہے۔ ساخت کے لحاظ سے اُردو اور ہندی میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے لیکن رسم الخط، عروض اور الفاظ میں فرق ہے۔ ہندی شاعری کی بحر میں اُردو سے مختلف ہیں۔ اور رسم الخط بھی مختلف ہے بعد میں لکھنوی علماء اور بنارس پینڈتوں نے اُردو میں عربی اور فارسی اور ہندی میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ کر کے ان زبانوں کو ایک دوسرے سے بہت متغایر بنا نا شروع کر دیا تاہم ان میں سے کوئی اختلاف ایسا نہیں ہے، جو دور نہ ہو سکے چنانچہ بعض علماء اور ادارے اس خلیج کو پالنے میں مصروف ہیں۔ عرصہ پہلے سر سید احمد خاں نے سلیس اور سادہ نثر اُردو کو رواج دیکر قدیم لکھنوی طرز کی عبارت آرائی کے کم کو مصلوبی سید احمد دہلوی نے اپنی مستند لغت ”فرنگ آصفیہ“ کے ذریعہ اُردو میں عربی اور ہندی الفاظ کے تناسب کو ظاہر کیا تھا۔ حال میں مولوی وحید الدین سلیم مرحوم، مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو، مولوی عظمت اللہ خان مرحوم سرتیج بہادر سپرو اپنی نقیحات اور مثالوں سے ان اختلافات کو مٹانے میں ہمہ تن مصروف ہوئے۔ مولوی وحید الدین سلیم ہمیشہ اس دبستان خیال کے مخالف رہے، جو علمی تحریروں میں بھی عربی اور فارسی کے زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال کرنے کو اپنی نجات سمجھتا ہے۔ سلیم صاحب نے مضامین کے ذریعہ اس خیال کی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی۔ اور آخر میں ”وضع اصطلاحات“ لکھکر علمی اصطلاح سازی کیلئے ایک راستہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔

مولوی عبدالحق صاحب کی تحریریں تو سلیم صاحب کی تھوہروں سے زیادہ اس اصول کی پابند ہیں۔ مولوی صاحب کی عبارت معمولی بول چال کی زبان سے سرمو تبادلاً نہیں کرتی۔ علی اُردو بھی جس قدر سادہ سلیس ہو سکتی ہے۔ اور موٹے موٹے عربی فارسی یا سنسکرت کے لغات سے پاک رہ سکتی ہے۔ اس کا ایک اچھا نمونہ خود مولوی عبدالحق صاحب کی تحریریں ہیں۔ مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم نے نثر سے زیادہ نظم کی خدمت کی۔ اور اُردو میں ہندی بھروں کو نہایت عمدہ اسلوب میں استعمال کیا۔ ایک طویل مضمون بھی عرض پر لکھا تھا جو رسالہ اُردو لا اورنگ آباد وکن میں شائع ہوا۔ اس میں زیادہ تر ہندی بھروں کو اُردو میں شامل کرنے اور شاعری کے میدان کو زیادہ وسیع بنانے کی پُر زور شفا رس کی ہے۔ خان صاحب کی نظموں نے آئندہ شاعروں کے لئے اس راستہ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ چنانچہ اسپیدیوں شاعرانہیں بھروں میں کلام سوزوں کر رہے ہیں۔ بلکہ نئی نئی بھریں بھی مروج ہو رہی ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی نثر کی طرح خان صاحب مرحوم کی نظم سلیس اُردو نظم کا بہترین نمونہ ہے۔ سر تیج بہادر سپرو جب موقع ملتا ہے، اپنی اثر انداز تقریر کو اسی بیگانگی کے دور کرنے میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

ان انفرادی مساعی کے علاوہ بعض ادارے بھی آئندہ ہندوستان کی مشترک زبان کچھانے اور سنوارنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان اداروں میں ہندوستانی اکاڈمی (الہ آباد) انجمن ترقی اُردو لا اورنگ آباد وکن اور جامعہ عثمانیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کچھ سال ہوئے کہ یو۔ پی کے سربراہ آروہ علمانے ملکہ الہ آباد میں ایک علمی مجلس ہندوستانی اکاڈمی کے نام سے قائم کی تھی۔ یہ اکاڈمی اب اچھی طرح نشوونما پا چکی ہے۔ اس کا مطبع نظر بنانا شروع ہوتا ہے کہ ہندو کی دو بڑی زبانوں یعنی اُردو اور ہندی کی ترقی کے تمام وسائل پر غور کر کے کوئی لائحہ عمل بنایا جائے۔ ابتدا میں تو دو زبانوں کے نشوونما کی علیحدہ علیحدہ کوششیں ضروری معلوم ہوتی ہیں، لیکن ہمیں توقع ہے کہ آئندہ جلد یہ اکاڈمی اُردو اور ہندی کے جزئی اختلافات کو دور کرنے کی بھی کوشش شروع کرے گی۔ اور ان کو قریب سے قریب تر بنا کر، حقیقی ”ہندوستانی اکاڈمی“ ثابت ہوگی۔ انجمن ترقی اُردو عرصہ سے وکن میں اُردو زبان اور ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔ انجمن کے سرگرم مہتمم مولوی عبدالحق صاحب کا اسلوب خود اس امر کی توضیح ہے کہ انجمن کی مساعی کا رخ کدھر ہے۔

لیکن ہندوستانی زبان کی ترقی کا سب سے بڑا مرکز اور محرک جامعہ عثمانیہ ہے۔ اس کا ذریعہ تعلیم اُردو و شہود ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اُس کے توسیع کا مطبع نظر جس طرح ہندی زبان نہیں تھا، اسی طرح وہ اُردو بھی نہیں ہے، جس کے خلاف عام طور سے صدائے احتجاج بلند کی جا رہی ہے۔ اس ادارے کا مقصد ایک مشترک

ہندوستانی زبان کو ملک میں ترویج دینا ہے۔ اس کے کئی ثبوت ہیں۔ پہلے تو یہ کہ یہاں روز زبان کی تعلیم کیساتھ ہندی کی تعلیم بھی لازمی کر دی گئی ہے۔ بلکہ زیادہ صیح یہ ہے کہ یہ دونوں زبانیں ملکر نصاب پورا ہوتا ہے۔ گویا ہندی اور اردو کو ملا کر ایک زبان قرار دیا ہے تاکہ آئندہ مشترک ہندوستانی زبان کے نشوونما میں آسانی پیدا ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ جب تک مولوی وحید الدین سلیم زندہ رہے، نہ صرف یونیورسٹی کالج کی اردو پروفیسری کی خدمت انجام دیتے تھے، بلکہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی اصطلاحات کی تمام مجلسوں میں بھی شریک رہتے تھے۔ غایت یہ تھی کہ جامعہ کے طلبہ کے لئے جو کتابیں ترجمہ کی جائیں یا تالیف ہوں، وہ صحیح اصول سے مستفاد نہ ہو جائیں۔ مولوی سلیم صاحب کے انتقال کے بعد اردو پروفیسری کی خدمت پر مولوی عبدالحق صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ اس سے یقین ہے کہ زبان کی خدمت کا وہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو اپنے ایک خط میں جامعہ عثمانیہ کے کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دکن ہیرا اردو کے ایک شاندار ادب اور اسلوب کی پیدائش کی پیشین گوئی کی تھی۔ اس کا اشارہ درحقیقت جامعہ کی اسی ملکی اور لسانی خدمت کی طرف تھا۔

اس خاص نقطہ نظر سے ظاہر ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے کارکنوں کو کم از کم بیس سال تک ہندوستانی زبان کے نشوونما میں محنت شاقہ اٹھانی پڑیگی۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ کے متعلمین کے دلوں میں یہ حقیقت زور کے ساتھ بٹھائی جاتی ہے کہ ان کی تحریروں اور تقریریں اردو کی ساخت، اصیبت اور قومیت سے حتی الامکان تجاوز نہ کریں۔ اور عربی اور فارسی الفاظ کی زیادتی کے بجائے ٹھیٹھ ہندی الفاظ استعمال کئے جائیں، تاہم تمام قومی حاکمات کی طرح یہ پھیل بھی دیر رس ہے۔ اس طرح کی فضا تیار ہونے کیلئے کم از کم ایک نسل کی مدت درکار ہے۔

بعض ہمدردان قوم اور اہل رائے بزرگوں نے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی بعض علمی کتابوں کو پڑھ کر ان میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی زیادتی کی شکایت کی ہے۔ لیکن ان کے مطالعہ کے وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے۔ کہ ہندی جو ادبی زبان ہے اس میں کلیات کے وہ خزانے مفقود ہیں جو عربی اور فارسی میں ہیں۔ چونکہ زبان کا ایک عالمگیر اصول سہولت ہے۔ اسلئے فطرتاً مترجمین بھی ان باتوں کی سداً اصطلاحات کو استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یورپ کی اکثر زبانوں میں بھی ہوتا ہے۔ یورپ کی وہ تمام قومیں جو عربوں کے خلاف صلیب بلند کر کے حملہ آور ہوئیں انھیں بھی زبانوں میں عربی کی بہت سی اصطلاحات بلا تکلف استعمال کرنی ہیں عربوں نے اپنے وقت میں یونانی، مصری اجنبی اصطلاحات کو اپنی زبان میں جگہ دینے میں نامل نہیں کیا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

رسم الخط کے اختلاف کا سوال بظاہر بہت اہم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ دور ہو سکتا ہے۔ انگریزی زبان کے متعلمین کو وقت و ادب میں تین طرح کے محنت یکھنے پڑتے ہیں۔ ایک سیمپل،

دوسرے دوسرے تیسرے تیسری حروف۔ ان حروف میں بسا اوقات آسانہی فرق ہے جتنا فارسی اور ہندی کے حروف میں۔ پہلے ہی حرف کو دیکھئے "a, A, α" میں اس سے کم فرق نہیں۔ جتنا فارسی "ا" اور ہندی "آ" میں ہے۔ لیکن جب ہم نے کسی انگریز کو اس کی شکایت کہتے ہوئے نہیں دیکھا، تو پھر ہمارے طلباء کو ہندی اور اردو کے حروف ساتھ ساتھ سکھانے میں کیا امر مانع ہے؟ آئندہ پرائیری کتابیں اگر اس ضرورت کو ملحوظ رکھ کر لکھی جائیں، اور حکومت بھی اس تجربہ کو کامیاب بنادینے میں مدد دے، تو یقین ہے ایک بڑی نزاع کا آسانی سے فیصلہ ہو جائیگا۔ اور اس کا نتیجہ اس سے زیادہ مفید اور صحت بخش ہوگا جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ اگر عربی (نسخی) حروف بھی اس میں شامل کر لئے جائیں تو نہیں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی زبانوں کے لئے لاطینی رسم الخط کے استعمال کا سوال عرصہ تک پیدا نہ ہو سکیگا۔

اس بحث کا آخری، مگر اہم ترین جز یہ ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جنکی بنا پر یہ ہندوستانی زبان ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے؟

اس کے اسباب اس قدر واضح ہیں کہ ہر شخص ان سے بخوبی واقف ہے۔ بلکہ ایک سے زیادہ مرتبہ اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی بھی ڈالی جا چکی ہے۔ تاہم، اپنے سلسلہ کو قائم رکھنے کیلئے ہم انہیں یہاں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں کوئی بات نئی بھی نکل جائے۔

۱۔ ہندوستانی زبان کی پیدائش پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ساختہ اور مصنوعی زبان نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے وقت، یہاں کی مروجہ زبانوں میں سب سے زیادہ آسان، بلکہ سب کا خلاصہ اور سب سے زیادہ وسعت پذیر زبان تھی۔ یہ غیر سرکاری اور عام زبان تھی، چونکہ یہ گنگا کے میدان جیسے ملک کے مرکزی علاقوں میں رائج تھی اسلئے مثل فوجوں کی جو پہلے پہل اس زبان سے واقف ہو چکی تھیں۔ نقل و حرکت کی بدولت یہ ملک کے ہر گوشہ میں پہنچ گئی اور ہر جگہ کی مقامی خصوصیات سے متاثر ہو کر ایک خاص صورت پر نشو و نما پانے لگی۔ اب فوجی نقل و حرکت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے، لیکن چونکہ یہ معاملات کی زبان بن گئی ہے، اس لئے کاروبار کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ کے ساتھ، اس زبان کا نشو و نما بھی برابر ہو رہا ہے۔

۲۔ ہم نے ابھی لکھا ہے کہ یہ کاروباری زبان ہے۔ اس ضمن میں یہ حقیقت تعجب سے دیکھی جا چکی کہ جب دو آدمی جنکی کی زبان مختلف ہو، آپس میں کاروباری اغراض سے ملتے ہیں، اور ان میں کوئی دوسرے کی زبان سے واقف نہیں ہوتا، تو ان کا ذریعہ اظہار خیال عموماً یہی زبان ہوتی ہے۔ ہم نے بہت سے قائل اور کثری بولنے والوں کو کبھی غیر زبان والوں سے معاملے کے دوران میں اسی زبان کو استعمال کرتے سنا ہے۔ چنانچہ مدراس میں چینیوں سے معاملات کرتے وقت بعض دیہاتی برہمنوں کو بھی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات چیت کرتے سنا ہے۔

بلا سبالغہ ہندوستان کے ہر صوبے کی کاروباری زبان یہی ہے شمالی ہند میں تو یہ زبان بولی جاتی ہے، لیکن جنوب میں بھی جہاں بظاہر اس کے رواج کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، یہ بازاروں میں عام طور سے استعمال ہوتی ہے آپ اگر ہندوستان کے طوع عرض میں سفر کرنا چاہیں، تو صرف اس زبان کی واقفیت کی وجہ سے آپ کے کام کہیں بند نہیں رہتے۔ موبہ بی بی کے ہر شہر میں یہ زبان رائج ہے۔ لیکن مدراس کے بعض چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی آپ اس کی ضرورت محسوس کر سینگے۔ ان قصبوں میں اگر آپ ریل سے پہنچیں اور وہاں کی زبان سے آشنا نہ ہوں، تو آپ فکری پکار لئے وہ آجائیگا، آپ جو کچھ اس زبان میں سمجھائیں وہ سمجھ جائیگا۔ بلکہ ان میں سے اکثر اس زبان میں اچھی طرح بات چیت بھی کر لینگے گا ٹی بانوں میں تو یہ خوب رائج ہے۔ یہ واقعات ہیں ان کا تجربہ ہر وقت ہو سکتا ہے۔

۳۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ یہ زبان پہلے پہل کسی علمی، ادبی یا پرو پاغندی مطمح نظر سے نہیں پیدا کی گئی بلکہ یہ مختلف اقوام کے معاشرتی اور کاروباری اتحاد کا فطری اور لازمی نتیجہ بن کر پیدا ہوئی، معاشرتی اور کاروباری تعلقات اور اغراض ہمیشہ علمی، ادبی یا پرو پاغندی اغراض سے زیادہ اہم اور ناگزیر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ کسی خاص زبان کو ہم اپنی کوششوں سے ہندو اعلیٰ زبان بنانے میں کامیاب ہو جائیں، کیونکہ ہنگامی زبان کا حال ہے، لیکن انسان جو معاشرتی مخلوق ہے معاشرتی اغراض سے کبھی استغنی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں کہیں معاشرتی اور کاروباری تعلقات کی ابتدا ہوتی ہے یہ زبان ان کا واسطہ بن کر ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ چونکہ دنیا کا کوئی مقام اس قسم کے تعلقات سے خالی نہیں رہ سکتا، ہندوستان میں بھی یہ زبان طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق ہندوستان کے ہر صوبے میں پھرنے اور خرید و فروخت کرنے سے ہو سکتی ہے۔ پھر چونکہ یہ کاروباری زبان ہے، اسلئے ہندوستان کے جن مقامات میں کاروبار کی زیادتی ہے، وہاں یہ عام طور سے رائج ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں مل سکتا ہے۔

جامعہ ممبئی کے موجودہ وائس چانسلر نے گذشتہ خطبہ تقسیم اسناد کے موقع پر، اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ تحریک کی کہ صوبہ ممبئی میں تین یونیورسٹیاں قائم ہونی چاہئیں۔ جن سے ایک ممبئی میں قائم ہوگی، اس کا ذریعہ تعلیم اردو ہوگا ممبئی کو چھوڑے، مدراس بھی تجارتی مرکز ہے۔ سمعیا یہ جاتا ہے کہ اُسے اردو یا ہندوستانی زبان سے بہت کم واسطہ ہے لیکن حالات یہ ہیں کہ یہ زبان یہاں بھی علوم میں خصوصاً اور کاروباری اغراض کیلئے بازار میں عام طور سے مروج ہے۔ میسور اور بنگلور تو تجارتی شہر نہیں ہیں، لیکن یہاں کے باندلوں پر بھی اسی زبان کا تسلط ہے۔ تقریباً یہی حال جنوب کے ہر ترقی پذیر شہر کا ہے۔

۴۔ اس زبان کی یہی خصوصیت ہے، جو ہر انگریز عہدہ دار کو ہندوستان آتے ہوئے اس کے سیکھنے پر مجبور

کرتی ہے۔ آپ کسی عہدہ دار انگریز کو ہندوستان آتے ہوئے، سوائے اس زبان کے کسی دوسری زبان کو پرستے یا سیکھتے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ جہاں دوسری زبانیں محدود برہمن ہیں، یہ لامحدود ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور اہم امر قابل ذکر ہے۔ سسہ کے قریب، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں جب اس کمپنی کے عہدہ دار ڈاکٹر جان گلگرسٹ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ انگلستان سے آنے والے انگریز عہدہ دار ہندوستان کی زبان اور اس کے ذریعہ یہاں کے حالات سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو جائیں تو انہیں عرصہ تک اس پر غور کرنے کے بعد سوائے اس کے کہ کوئی اور چارہ نظر نہ آیا کہ ہندوستانی زبان کا ایک مدرسہ کلکتہ میں قائم کریں۔ آج کی طرح اس وقت بھی یہی ہندوستان میں عوام کی زبان تھی۔ کلکتہ کے مدرسہ کے ذریعہ انہوں نے اس زبان کی بڑی خدمت کی۔ اور ایک بڑی حد تک آئندہ شرکاء سنگ بنیاد انہوں ہی نے رکھا۔ اس وقت تک ہندوستانی اور اردو کوئی جدوجہد ازبائیں نہیں تھیں۔ اس سے اسی زبان کا فطرتی استحقاق ہندوستانی زبان بننے میں ثابت ہے۔

۵۔ ایک آخری خصوصیت اس زبان کی ساخت اور فطرت کے متعلق بھی بیان کرنی ضروری ہے۔ جس سے اس کی آئندہ روش ترقی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

اس زبان کی پیدائش ہی ایسے حالات اور ایسے فطرتی اصول کے تحت عمل میں آئی ہے۔ کہ اس پر غیر معمولی لچک اور وسعت پذیری پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر اس زبان سے یہ مستفید ہے، جس کے ساتھ برائے نام بھی اس کا تعلق رہا ہو۔ اس کے افعال جو فالص ہندی ہیں، ان کے ساتھ آپ جس زبان کے اسما چاہیں ملا کر، ایک مقرر جملہ بنا لے سکتے ہیں۔ کچھ اجنبیت نہیں معلوم ہوتی۔ زبان کے عام اصول آریائی زبانوں کی طرح اس قدر سادہ ہیں کہ ان کے سیکھنے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوتی۔

عرض اس زبان کی لچک، اس کی وسعت پذیری، اس کی عمومیت، ایسے امور ہیں جو خاموشی کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشہ میں اس کے لئے جگہ پیدا کر رہے ہیں۔ ہندی سمجھا کی سمجھی مدارس میں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ زبان خاموشی کے ساتھ دامن بھی پھیل رہی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے تمام صوبے جلد یادیر میں کم سے کم اس اصول پر ضرور متحد ہو جائیں گے۔

آخر میں انیسویں صدی عیسوی کے مشہور فرانسیسی سیاح ہندوستان ڈاکٹر گستاوولی بان کی رائے اسی مسئلہ کے متعلق پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

”مختلف محاوروں کو جو کوہنڈستانی اور رابطے کی سولہ زبانیں ہیں۔ ان میں سے ہندوستانی وہ زبان ہے جو

سیکھنا ضروری ہے۔ یہ گویا ملک کی دولتی زبان ہے۔ اسی میں بہت کچھ خط و کتابت ہوتی ہے اور اخبارات چھپتے ہیں۔ عرض جن اشخاص کو ہند کے لوگوں سے کام پڑتا ہے اُن کیلئے اُردو (ہندوستانی) کا جاننا لازمی ہے۔ یہ زبان باوجود ملک میں اس قدر عام ہونے کے بالکل جدید زبان ہے۔ اُردو پندرہویں صدی کی ابتدا میں قدیم آریا زبان، ہندی اور فارسی و عربی سے مرکب ہو کر بنی ہے۔ اس کی صرف و نحو سنسکرت سے مشتق ہے۔ اور یہ عموماً فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ یہ زبان زیادہ تر اُردو کے نام سے مشہور ہے۔ اُردو بالکل فطرتی طور پر اور محض ضرورت کے لحاظ سے بنی ہے۔ محققین ہند کو اس کی صرف و نحو کا مطالعہ کرنا ضرور ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی زبان کیونکر وجود میں آتی ہے۔ اُردو کے بعد ہندی کا درجہ ہے، جو ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔

قصہ تسلیم کا سنگین بیاد

یہ موضوع اس قدر فرسودہ اور پامال ہو چکا ہے کہ اب اسے کسی مضمون کا عنوان بنانا یا اس عنوان پر خامہ فرسائی کرنا۔ مضمون نگار کی بدذوقی خیال کیا جانے لگا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماضی اور حال کے نتائج کا مقابلہ و موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس باب میں ہنوز روزِ ازل کا معاملہ ہے۔ ”حال“ تا حال بدستور ماضی بنا ہوا ہے بلکہ اگر ”تعلیم“ کے صحیح مفہوم کو ”تدریس“ ہی تک محدود کر لیا جائے (ہندوستان میں تعلیم کا مفہوم علیٰ حیثیت سے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو علیٰ طور پر ابھی اس کا مفہوم تدریس ہی قرار دیا جا رہا ہے، جماعت بندی اور امتحانات کا موجودہ نظام عمل، طریق تدریس اور افسرانِ معائنہ کے مسائل کی پابندیاں اس امر کی شاہد ہیں) تو کسی حقیقت شناس اور سلیم الفطرت کو اس حقیقت کے اعتراف سے اعراض نہیں ہو سکتا کہ حال ماضی کے مقابلہ میں ترقی کرنے کی بجائے روز بروز رو بہ تغزل ہو رہا ہے۔ طلباء کی لیاقتیں ہست ہو رہی ہیں۔ زمانہ سابق میں طلباء تین چار سال تک زیرِ تعلیم رہ کر ”اُردو“ بلکہ فارسی تک میں انہماک و خیالات پر

قادروں کو جاکر تے تھے۔ مگر آج کل مڈل اور ایٹرنل پاس کر چکنے کے باوجود فارسی تو درکنار اردو بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔

تعلیم کی ترقی اور اشاعت کے سلسلے میں آٹھ ماہرین فن تعلیم کی طرف سے قابل قدر تجاویز پیش کی جا چکی ہیں اور محکمہ کی طرف سے بھی بڑے بڑے دعاوی کا نہایت بلند آہنگی سے اعلان کیا جا رہا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں وہ تجاویز اور کوششیں کسی تسلی بخش نتیجہ پر اختتام پذیر نہیں ہوئیں۔ شاید —————

۱۔ ”اصلاحی نقطہ نظر سے ان میں عمل کی صلاحیت نہیں“ + ————— یا —————

ب۔ ”مادی اور عملی نقطہ نظر سے ان میں اتنی دقتیں اور مشکلات ہیں کہ ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا“ + ————— یا —————

ج۔ ”ان پر عمل کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی“ +

اب بھی باوجود انتہائی کوششوں کے اہل ملک کی طرف سے عام طور پر مندرجہ ذیل شکایات سنی جاتی ہیں:۔

”مدرسہ میں طلباء کی لیاقتیں پست ہو رہی ہیں“

”حکومت کی طرف سے تعلیم پر بہت کم روپیہ صرف ہو رہا ہے“

”موجودہ تعلیم بیکاری کا پیش خیمہ ہے“

محکمہ بھی اس بات کا شراکی ہے۔۔۔ کہ:۔

ابتدائی تعلیم پر جو روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اس کا پچھتر فیصدی ضایع ہو رہا ہے کیونکہ اس تعداد کا پچھتر

چوتھی جماعت تک پہنچنے سے پہلے پہلے تعلیم چھوڑ دیتا ہے۔

تحقیقات حالات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ:۔

”موجودہ طریقہ تعلیم نہایت خشک اور غیر دلچسپ ہے جس کی لڑکے دو دو تین تین سال زیر تعلیم رہتے

کے باوجود بھی جماعت اول سے فارغ نہیں ہو سکتے“

گویا اس باب میں مندرجہ ذیل امور اصلاح و تکمیل طلب ہیں:۔

۱۔ ”حکومت کی مزید مالی امداد“

۲۔ بیکاری کا انسداد

۳۔ لایق اور طریقہ تعلیم سے کما حقہ ماہر مدرسین کی بہرہ رسانی

۴۔ طریقہ تعلیم میں تبدیلی۔

امور متذکرہ بالا میں سے ہر ایک بجائے خود ایک متقل مضنون کی حیثیت رکھتا ہے اور وقت اس

لال، جال وغیرہ

۳۔ الفاظ اسے منتخب کئے گئے ہیں، جن کی توضیح کیلئے، اصل اشیا یا تصاویر پیش کی جاسکیں۔

ب۔ لڑکوں میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے

اسباق مکمل، مسلسل، مربوط، اور دلچسپ فقرات سے شروع کئے گئے ہیں، اور کوشش کی گئی ہے کہ فقرات گفتگو یا ڈرامے کی شکل میں ہوں، جنہیں بچے عملی طور پر کر سکیں، تاکہ ان میں طلبہ کی توجہ کا مادہ پیدا ہو، گویا یہ اسباق انشا پر دازی کے ابتدائی اسباق ہیں، جنہیں کسی دوسرے طریق سے جماعت اول میں شروع نہیں کرایا جاسکتا۔

ج۔ آسانی پیدا کرنے کی غرض سے

۱۔ کوشش کی گئی ہے کہ ایک سبق میں زیادہ سے زیادہ تین یا چار نئے الفاظ آئیں تاکہ بآسانی یاد رکھیں۔

۲۔ ہر نئے سبق میں کثرت سے نئے الفاظ ایسے آئیں جو پڑھے ہوئے الفاظ کے اجزائے بنیں اور لڑکے انہیں استناد کی معمولی رہنمائی سے پہچان سکیں۔ اس طرح بچوں میں نئے الفاظ پہچاننے اور لکھنے کی قابلیت پیدا ہوگی۔

د۔ مکمل اصول سکھانے کی غرض سے

کوشش کی گئی ہے کہ :-

۱۔ الفاظ میں تمام مفرد اور مرکب حروف آجائیں اور اس انداز سے آئیں کہ :-

ا۔ ان کی سالم شکل اور آواز لفظ سے علیحدہ کی جاسکے۔

ب۔ مفرد اور مرکب تمام حروف اپنی تمام اشکال کے ساتھ آجائیں۔

۲۔ فتحہ، کسرہ، ضمہ اور آ۔ ای۔ او۔ اے۔ اے۔ تشدید وغیرہ کی آوازیں اور ان کے اصول

وقوع سکھائے جائیں۔

نوٹ: تین اسباق نذرِ ناظرین ہیں۔ امید ہے کہ ان سے مذکورہ بالا امور کا حقہ مستکشف ہو

ہو جائیں گے۔

سبق نمبر ۱



لوٹا



کوٹ

دو کوٹ

دو لال کوٹ

لال - کوٹ دو

لو - کوٹ لو

لال - لوٹا دو

لو - لوٹا لو

لال کو کوٹ لادو

لو - لال - کوٹ لو

لال کو لوٹا لادو

لو لال لوٹا لو

نتیجہ سی :- لوٹا - لو - ٹا

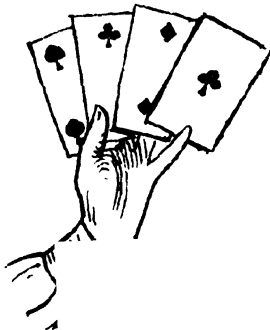
کوٹ - کوٹ - ٹ

لال - لا - ل

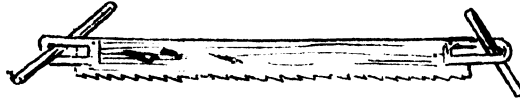
نئے اجزاء - لو - کو - لا - ٹا - دو - ٹ - ل

مشق - لالا - لاٹ - ٹال - ٹالو - ٹالا

سبق نمبر ۵



ایک تاش ہے



ایک آراہئے

لال جا ایک آرا لے آ

(لال جاتا ہے ایک آرا لے آتا ہے)

لو آرا لے لو

راج جا ایک تاش لے آ

(راج جاتا ہے ایک تاش لے آتا ہے)

لو تاش لے لو

تجزئی - تاش - تا - ش

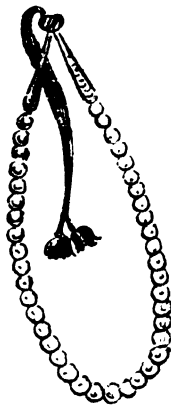
نئے اجزا - ہے - را - ش

مشق - لا - کا - جا - ٹا - آ - تا - چا - را - لو - کو - ل - ٹ - م

د - ج - ر - ش

کالا - آٹا - چارا - آتا - لال - لاٹ - لاو - کاٹ - کام - کاج - چال

سبق نمبر ۶



بابا

دادا

مالا

رام لال بابا کو مالا لا دو

(رام لال جاتا ہے مالا لے آتا ہے)

لے بابا مالا لے لے

راما چا چا کو آٹا وال لا دو

چا چا دام دو

لے راما دام لے جا

(راما دام لے جاتا ہے آٹا وال لے آتا ہے)

لے چا چا آٹا وال لے لے

تجڑی - بابا - با - با

واوا - دا - دا

مالا - ما - لا

نئے اجڑا - با - دا - ما

حروف کا اتصال (کے ساتھ) چار - ر - آرا - ریا - ر - را

زرد - د - وادا - وا - و - دا

را - ر - وا - د

جا - جو - ج - ما - م - م - ٹا - ٹ - ٹ - لا - ل - ل - با - ب

تا - ت - چا - چ - کا - ک

آ - ا - ا

حروف کی مختلف اشکال - جر - ب - مر - ٹ - چ - ک - تا - ر -

مشق - اما - چاچا - تالا - تارا -

آرام - بادام - تالاب وغیرہ -

نوٹ :- ۱۔ تجڑی کرانے وقت اجڑائے الفاظ میں سے مفرد حروف کے نام یعنی ٹے اور لام

وغیرہ نہ بتائے جائیں، بلکہ ان کی اصلی آوازیں ”ج“ اور ”کھ“ وغیرہ لڑکوں سے نکلوائی جائیں :-

۲۔ تجڑی کرانے وقت تختہ سیاہ کے ساتھ اگر ایسے تاش کا استعمال کیا جائے، جس کے پتوں میں

سے ہر ایک پر الفاظ کے اجڑاؤ ہو تو بہتر رہیگا، شروع میں ان پتوں کو اجڑا کی درست ترتیب کے لحاظ سے

ترتیب دیکر مکمل لفظ کی شناخت کروائی جائے، بعد ازاں آہستہ آہستہ پتوں کو ایک دوسرے سے

علیحدہ کرتے ہوئے مفرد اجڑاؤ حروف کی آوازیں نکلوائی جائیں -

۳۔ لڑکے کے سکول میں داخل ہوتے ہی یہ اسباق شروع نہ کر دیئے جائیں، بلکہ ابتدائی ڈیڑھ دو ہفتوں

میں انہیں گھر اور مدرسہ کے اندر اور باہر کی اشیاء کے متعلق پہلے پنجابی میں پھر پنجابی اور اردو کے مقابلے سے

اردو میں گفتگو شروع کر دی جائے حتیٰ کہ لڑکے ابتدائی اسباق کے فقرات کا مطلب سمجھنے کے قابل ہو جائیں؛

سبق پڑھانے سے پیشتر سبق کو گفتگو یا ڈرامے کی صورت میں لڑکوں سے عملی طور پر کر دیا جائے،

لکھنا

بیسویں صدی کے اوائل سے مدارس میں اردو کی کتابت اور خوشنویسی (خوشخطی) خاص طور پر منقطع ہوئی شروع ہو گئی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب ڈرائیج طباعت کی فزولانی کے علاوہ حوزہ مدرسین کے دماغ سے مذاق خوشخطی کا فقدان اور ان کی اپنی بدخطی ہے، اس وقت ہمارا موضوع بحث خوشنویسی کی ابتدائی تاریخ، اس کی اہمیت، قانون لطیفہ میں اس کا درجہ، اور اس کے عروج و انحطاط کے اسباب بیان کرنا نہیں، بلکہ مختصراً ایسی تجاویز پیش کرنا ہے، جن سے حسب اقتضائے ضرورت و وقت ابتدائی جماعتوں میں لکھنے اور خوشخطی کو موجودہ صورت سے بہتر بنایا جاسکے۔

اکثر اصحاب خوشخطی کو لکھنے پر مقدم خیال کرتے ہوئے، پہلی جماعت سے ہی اس کی باقاعدہ تعلیم دینے کے حامی ہیں، ان کے نزدیک طریق تہجی کو ذریعہ تدریس قرار دیتے ہوئے، حروف کی قرأت کے ساتھ ساتھ اصول خوشنویسی کے مطابق ان کی کتابت شروع کر دینا ضروری اور لابدی ہے، لیکن:-

۱۔ اس عمر میں بچوں کو اپنی انگلیوں کے عضلات پر اتنا قابو نہیں ہوتا، کہ وہ معیار فن کے مطابق حروف کی درست اشکال بنا سکیں،

۲۔ اور نہ ہی ان کا دماغ خوشنویسی کے باریک اصول سمجھ سکتا ہے، چہ جائیکہ ان پر عمل بھی کیا جاسکے،

۳۔ بے معنی حروف کا لکھنا جس میں کوئی بھی دلچسپی کا سامان نہیں، بچے کے لئے ایک بوجھ ہے، وہ غیروہمپ ہوئے کی وجہ سے وہ بار بار ایک ہی حرف کو لکھنے سے انگریز کرتا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ خوشخطی مشق کے بغیر نہیں آسکتی،

میرے خیال میں اگر اردو پڑھانے کے جدید طریق کو ذریعہ تدریس قرار دیتے ہوئے ابتدا میں مکمل الفاظ کا لکھنا اور الفاظ کی مجموعی شکل کا درست بنانا سکھایا جائے، اور آہستہ آہستہ فہم کی بناوٹ اس کی گرفت درست نشست، ہاتھ اور قلم کی حرکت، اور حروف کی درست بناوٹ کا ان کے ساتھ تعلق ظاہر اور ذہن نشین کئے ہوئے الفاظ میں کے مفرد حروف کی درست بناوٹ پر توجہ دینی شروع کی جائے، تو زیادہ بہتر ہوگا، حروف، ان کی مختلف اشکال، اور ان کے وصل کے قواعد کو چار درجوں میں تقسیم کر لیا جائے۔

پہلی اور دوسری جماعت میں، ان کے متعلق عام موٹی موٹی باتیں بتلائی جائیں، اور الفاظ کی درست بناوٹ پر زور دیتے ہوئے، ایک لکیر کو لکھنے کے متعلق ہدایات دی جائیں یعنی اُ او پر سے سیدھا نیچے اور ب ت گ ف“ وغیرہ لکیر کے ساتھ ساتھ دائیں سے بائیں ”ے“ بائیں سے دائیں وغیرہ۔

تیسری اور چوتھی جماعت میں، اصولی باتیں بتا کر ان کے مطابق مشق کرائی جائے، مثلاً 'ا' اُدھر سے سیدھا نیچے کو تین نقطہ ہوتا ہے، 'م' کا عمومی حصہ پانچ نقطہ، 'ب' پانچ، 'و' یا گیارہ نقطہ تک، 'د' اُسے چار نقطہ گہرے اور ساڑھے تین نقطہ چوڑے وغیرہ علاوہ ازیں وصل حروف کے متعلق عام باتیں بتائی جائیں۔ اس سے اگلی جماعتوں میں وصل حروف کے تمام طریق اور حروف نشست (کرسی) وغیرہ کی بابت ہدایات دیکر مشق کرائی جائے۔

انشاپروازی

آپ یقیناً جماعت اول کی تعلیم کے سلسلے میں انشا پروازی کی سُرخ دیو کا خیال نہ سمجھیں گے، لیکن اگر زبان کی صحیح تعلیم کے مفہوم پر غور کیا جائے، تو ماننا پڑے گا کہ کسی زبان کی مکمل تعلیم سے مراد ہے اُس کا پڑھنا، سمجھنا اور اس میں اظہار خیالات کر سکتا، اور زبان کی تعلیم کے سلسلے میں یہ امور ثلاثہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ ان میں سے پڑھنا اور سمجھنا مرکزی حیثیت رکھتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ بنیاد ہے اس زبان میں تحریری طور پر اظہار خیالات کر سکنے کی، بد قسمتی سے ہمارے سکولوں میں تعلیم زبان کی غرض سے انہیں ایک دوسرے سے اس طرح علیحدہ کر دیا جاتا ہے، گویا ان کا آپس میں دور کا تعلق بھی نہیں، اُردو کے وہ طریقے جن کے مطابق اُردو مطبوعہ قاعدے جن کے ذریعے تعلیم دے جاتی ہے، اس حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں کہ پڑھنا سکھانے کے موجودہ طریقوں کا مقصد محض حروف اور ان سے بننے والے الفاظ کی آوازوں کا ذہن نشین کرنا ہی قرار دیا گیا ہے، مطلب فہمی کو اس میں شامل نہیں کیا گیا، مجموعہ طریق تعلیم کے مطابق ہمارے سکولوں میں عام طور پر پڑھنا پہلی جماعت سے، سمجھنا دوسری اور تیسری جماعت سے اور اظہار خیالات کرنا چوتھی جماعت سے شروع کر دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ لڑکے عام طور پر پرائمری کی آخری جماعت تک مطلب فہمی میں کمزور رہتے ہیں۔ اور اظہار خیالات تو مڈل بلک انٹرنس پاس کر چلنے کے باوجود بھی اچھی طرح نہیں کر سکتے، اگر اُردو انشا پروازی سکھانے کیلئے ابتداء ہی سے زبان کی مکمل تعلیم شروع کر دیا جائے، اور اُردو پڑھنے کے مجوزہ اسباق کی طرح ایسے اسباق کو ذریعہ تدریس بنایا جائے، جن میں پڑھنا، مطلب فہمی اور اظہار مطلب ایک ہی وقت میں شروع ہو سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لڑکے پڑھنے تک ساتھ ساتھ مطلب فہمی اور اظہار مطلب میں کمزور رہ جائیں، اس کے علاوہ سب سے بڑی بات زبان اُردو کی ترقی و اشاعت کے سلسلے میں طلباء میں اُردو انشا پروازی کا صحیح مذاق پیدا کرنا ہے، اس کے لئے ذیل کا لائحہ عمل تجویز کیا اور معمول بنایا جاسکتا ہے،

۱۔ گفتگو

- ۱۔ مادری زبان کے مقابلے سے اردو میں چیزوں کے نام بتائے جائیں اور بعد میں شق کے لئے چیزیں دکھا کر ان کے نام اردو میں دریافت کئے جائیں۔
- ۲۔ مادری زبان کے افعال کے مقابلے میں اردو کے عام متعل افعال سکھاتے ہوئے اردو کے چھوٹے چھوٹے فقرات میں گفتگو کرائی جائے۔ یہ کیا ہے؟ یہ کوٹ ہے؟ کس کا کوٹ ہے؟ وغیرہ بعد ازاں سنا سکھاتے ہوئے، اسماء افعال اور ان سے بنے ہوئے فقرات پڑھائے جائیں (لڑکے دہ کچھ پڑھیں جو وہ پڑھنے سے پہلے گفتگو و مکالمات کے ذریعے عملی طور پر کر لیں)

ب۔ تحریری

- اس طریق تعلیم کے مطابق لڑکے اردو کے چھ سات سبق پڑھ کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ پڑھتے ہوئے اسماء و افعال کو لکھ سکیں، جب لڑکے اردو کے چھوٹے چھوٹے فقرات بولنے کے قابل ہو جائیں تو مندرجہ ذیل مراحل میں گذر کر اردو کے چھوٹے چھوٹے فقرات لکھنا سکھایا جائے۔
- ۱۔ مختلف چیزیں جن کے نام وہ پڑھ چکے ہیں، دکھا کر طلباء سے ان کے نام تئیتوں پر لکھنے کو کہا جائے۔
 - ۲۔ بعد میں ان اشیاء کے متعلق آہستہ آہستہ سوالات جو اب تک لکھنے شروع کر دیئے جائیں۔
 - ۳۔ ایک یا چند چیزیں کسی جگہ پر رکھ کر ان کے متعلق فقرات بنوانے اور انہیں درست طور پر ترتیب دینے کی مشق کرائی جائے، لڑکے صرف اشیاء کی تعداد رنگ اور محل وقوع ظاہر کریں، ابتدا میں ایسی مشقوں کے متعلق زبانی گفتگو کی جائے، پھر لکھوانا شروع کیا جائے، بعد میں آہستہ آہستہ لڑکوں کو خود دیکھنے اور فقرات مرتب کرنے کی مشق کرائی جائے،

ج۔ تصویر فہمی

- ۱۔ تہمتہ سیاہ یا کاغذ پر تصاویر بنا کر ان کے نیچے ایسے سوالات لکھ دیئے جائیں جن کے جوابات لڑکے تصویر پر سے دیکھ کر لکھ سکیں،
- ب۔ تصویر کے نیچے اس کے متعلق فقرات لکھ کر ان میں اسماء کی جگہ تصاویر بنا دی جائیں، لڑکے تصویر کی جگہ تصویر کا نام لکھتے ہوئے مکمل فقرات تختوں پر نقل کریں۔

ج۔ تصویر کے نیچے اُس کے متعلق فقرات لکھ کر ان میں سے ایسے اسماء کی جگہیں خالی چھوڑ دی جائیں جنہیں تصویر پر سے دیکھ کر پُر کیا جاسکتا ہے۔ لڑکے خالی جگہوں کو پُر کرتے ہوئے مکمل فقرات لکھیں۔
ان مشقوں کو جاری رکھتے اور حسب استعداد ان میں رفتہ رفتہ ترقی کرنے سے لڑکے جماعت چہارم تک پہنچتے پہنچتے بہت اچھے مضامین لکھنے اور نہایت خوبی سے اظہارِ خیالات کرنے کے قابل ہو جائیں گے،

ہندسہ

طریقہ تعلیم کی ان ہیئتاعداد کیوں سے قطع نظر جن کی وجہ سے بچوں کو اعداد کی قیمت کا صحیح تصور نہیں ہوتا ہندسہ لکھنے میں عام طور پر مندرجہ ذیل نقائص اور مشکلات دیکھنے میں آتی ہیں،
۱۔ ہندسوں کی معکوس اشکال بنانا، ۲ کو ۳، ۴ کو ۵، ۶ کو ۷ وغیرہ
۲۔ اعداد میں اکائی اور دہائی کے ہندسوں کو تبدیل کر دینا، ۳ کو ۳۱، ۴ کو ۴۱، ۵ کو ۵۱، ۶ کو ۶۱ وغیرہ۔

۳۔ ۱۹ کو ۲۹، ۲۹ کو ۳۹، ۳۹ کو ۴۹ وغیرہ کھدینا۔
اگر ہندسوں کی قرات مقرون اشیا کے ذریعے سکھائی جائے اور کتابت کا بھی اشیا کے ساتھ گہرا تعلق پیدا کر دیا جائے، تو کوئی وجہ نہیں لڑکوں کو اعداد کی قیمت کا صحیح تصور نہ ہو، اس کیلئے مندرجہ ذیل ذرائع اختیار کئے جاسکتے ہیں۔
۱۔ قرات سکھانے کے لئے مقرون اشیا فروا فروا کن کر لڑکوں کو دیجئے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تعداد باواز بلند پکارتے جائیے، لڑکے بھی آپ کے ساتھ ساتھ بولتے جائیں، پھر ان سے اسی طرح گنو گنو اگر وہ اشیا واپس طلب کیجئے۔
۲۔ ایک سے شروع کر کے بند رنج چیزوں کی تعداد کا ان کی اشکال تحریری کے ساتھ تعلق پیدا کر دیجئے اور مشق کیلئے :-

۱۔ چیزوں کی کوئی تعداد لڑکوں کے سامنے پیش کر دیجئے وہ ان کی تعداد :-

I گن کر بتائیں،

II خاموشی سے زمین یا تختی پر لکھ دیں،

ب۔ ایسے تاش تیکر ایجے، جس کے کچھ پتوں پر فروا فروا ایک سے دس تک نقطوں یا لکیروں کے نشانات ہوں اور اتنے ہی پتوں پر فروا فروا ایک سے دس تک ہندسے لکھے جائیں دو دو لڑکے اس تاش سے اس

طرح کھیلیں کہ ایک لڑکا نقطوں والا پتہ پھینکے اور دوسرا اس تعداد کے ہندسے والا پتہ پھینک کر وہ پتہ اٹھائے اس طرح کھیل جاری رہے،

۳۔ اگر کوئی لڑکا ہندسوں کو الٹا لکھے، تو اُسے تینٹی پرپنسل سے خود ہندسے لکھ دیئے جائیں، وہ سیاہی سے ان پر لکھے، اور ساتھ ساتھ ان کی تعداد کو بلند آواز سے پکارتا جائے،

۴۔ سنو تک ہندسے سکھانے کیلئے مندرجہ ذیل مدارج اختیار کرنا کافی اور دہائی کے ہندسوں کو تبدیل کرنے کا بہترین سہارا ثابت ہوا ہے،

I اسے ۱۰ تک کتابت،

II اسے ۱۰۰ تک صرف دہائیوں کی کتابت،

III اسے ۱۰۰۰ تک تمام ہندسوں کی کتابت، دہائیوں کے تعلق اور اجزائے ترکیبی سے مثلاً ۳۷۲ ہوتے

ہیں ۹۳۰ (تیس) اور ۷ (سات) پہلے تین لکھواں ۰ (صفر) کو ۷ (سات) بنا دو، علیٰ ہذا القیاس،

IV۔ اگر اس پر بھی لڑکے ۱۹، ۲۹، ۳۹ وغیرہ کی کتابت میں غلطیاں کریں تو ان کی مشق ایک علیحدہ سبق کی صورت میں کرائی جائے۔

پہاڑے

پہاڑوں کے متعلق بھی صحیح تصور نہ ہونے اور اُن کے عملی استعمال پر زور نہ دیئے جانے کا اعتراض کیا جاتا ہے، اگر پہاڑے مقرون اشعار اور بالفہم وغیرہ کے ذریعے سکھائے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں باہم بنانے کے لئے عملی سوالات پر زور دیا جائے، دلچسپی پیدا کرنے اور مشق کیلئے مختلف اصلی اشعار یا اُن کے نمونے تراز و اور باٹ لکھ کر کاغذ یا گتے کے بنے ہوئے سکے (جو بالکل اصلی سکوں کے مشابہ ہوتے ہیں) جبتا کر کے لڑکوں سے عملی طور پر خرید و فروخت کا کام کرایا جائے، تو موجودہ حالات سے بہترین نتائج کی امید کی جا سکتی ہے،

عبدالغنی ایس وی مدرس ٹیچر سکول

گھونڈ۔ ضلع لاہور

ایک ضروری گذارش

(جناب سرورِ ہیکم سنگھ صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع راولپنڈی)

یہ بات ظہر من الشمس ہے کہ ملک کی خدمت کا بہترین ذریعہ علم ہے۔ بغیر تعلیم کے کوئی ملک اور قوم بام ترقی اور اوج تہذیب تک نہیں پہنچ سکتی اور یہی وجہ ہے کہ ممالک مغربی میں اور سب باتوں کی نسبت تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ فی زمانہ جو ملک تعلیم میں پیچھے ہے وہ ترقی کے میدان میں بھی اور ملکوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائیگا۔ پس اگر ہندوستان بھی ترقی کے میدان میں آگے قدم بڑھانا چاہتا ہے تو اسے تعلیم کی طرف خاص توجہ منحطف کرنی چاہیے۔ تعلیمی ترقی میں سب سے بڑا محنت معلوم ہے۔ جس کے سپردان بچوں اور نو نہالوں کی تعلیم پر بیت ہے۔ جنہوں نے اس ملک کی آئینہ نسل بننا ہے اور ملک اور قوم کی حالت کو سدھارنا ہے۔ پس معلم کی شخصیت اور ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ ملک کی امید کا رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے اس کا پیشہ معزز اور قابلِ عزت ہے۔ کیونکہ یہ نئی نوع انسان کی خدمت کرتا ہے۔ اور یہی خدمت خدائے بزرگ و بالا کی نظروں میں وقعت رکھتی ہے۔ یہ وہی پاکیزہ پیشہ ہے۔ جو ہر ایک سستی کیلئے باعث افتخار و دو عالم تھا مگر آج اس کی حالت دیگر گوں ہے پبلک کے دلوں میں مدرسین کے متعلق وہ نفرت پھیل رہی ہے۔ کہ رونا آتا ہے۔ اور دل سے بے اختیار نکلتا ہے۔

ہائے وہ اوج ہمارا یہ ہماری ہستی نام کو رہ گئی دنیا میں ہماری ہستی

آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ باقی تو سارا زمانہ ترقی کرے اور مدرس جو دوسروں کی ترقی کا ذریعہ ہے خود قعرِ ہستی میں گرنا جائے۔ اس میں ہمارا ہی تصور ہے اور ہم ہی ہستی کے ذمہ دار ہیں۔

ہم میں افسوس وہ لگھے سے محاسن نہ رہے اہل ظاہر میں مگر صاحبِ باطن نہ رہے

میں نے اس کمزوری اور انحطاط و تنزل کے اکثر اسباب معائنہ کے موقع پر وقتاً فوقتاً دیکھے ہیں۔ اور اب میں

ان چند نقائص کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ تازہ نوخیز استاد جب نارٹل سکولوں سے فارغ ہو کر وہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ تو ساتھ ہی ان اصولوں کو جو انہوں نے سال بھر میں نہایت عرق ریزی و جان فشانی سے حاصل کئے تھے۔ وہیں بالائے طاق رکھ آتے ہیں سکول میں حاضر ہوتے پر وہ اپنے کام کی نہ کوئی سکیم یا سلیبس اور نہ ہی کوئی ناظم ٹیبل تیار کرتے ہیں روزانہ ڈائری کا تو ذکر ہی رہے دیکھیے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جن سے مدرس کی کامیابی کا بہت ساحتہ یقینی ہو جاتا ہے مگر آپ باوجود اس بات کا علم ہونے کے پھر وہی قدامت پسندانہ طریقہ تعلیم اختیار

کر لیتے ہیں جو نہایت ناواقف اور غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بچوں کو تعلیم سے نہ کوئی دلچسپی پیدا ہوتی ہے نہ شوق بڑھتا ہے۔ وہ جبراً اُپر مدرسے آتے ہیں اور خدا خدا کر کے اس وقت کو گزانتے ہیں۔

(۲) دوسرا سب سے بڑا نقص جو استادوں میں دیکھا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہیں کتب بینی اور مطالعہ سے نفرت ہے اور اوقاتِ مدرسہ کے بعد کتاب کو ہاتھ لگانا بھی خلافِ شان سمجھتے ہیں۔ اور ان کا مطالعہ درسی کتب تک ہی محدود رہتا ہے۔ گھر جا کر انہیں پڑھنے لکھنے سے گھن آتی ہے اور کتاب انہیں کاٹے کھاتی ہے۔ اس کا بڑا اثر طلبہ پر ہوتا ہے یعنی انہیں پڑھنا پسند نہیں آتا۔ شوق پیدا کرنے کیلئے استاد کو خود نمونہ بننا چاہیئے۔ اور مطالعہ کا عادی ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اپنے مدرسے کو دل میں زیادہ خوبیاں اور کام کی باتوں سے متصف بنانے کیلئے استادوں کو جدید تعلیمی تجربہ حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ صرف مطالعہ کے جاری رکھنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ”پیر شو بیاموز“ کے مفقودہ کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

(۳) تیسرا نقص جو عام پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مدرسہ کے قواعد کا احترام نہیں کیا جاتا اور پُرانے تجربہ کار مدرس کی ہدایت سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا مثال کے طور پر طلبہ کی حاضری کا دو وقت ہونا نہایت ضروری ہے۔ مگر اول تو معلم حاضری باقاعدہ لکھتا ہی نہیں اور اگر وہ لکھے بھی تو طلبہ کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا اور وہ غصہ سے زیادہ لڑکے ایسے ہونگے جنہیں بھی خبر نہیں ہوگی۔ کہ دوسرے وقت بھی حاضری ہوتی ہے۔ نتیجہ ضاعتِ عیاں ہے۔ تفریح کے بعد کثیر طلباء غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ یا دیر سے حاضر سکول ہوتے ہیں۔ علاوہ انہیں یہ مرض مدین میں بھی چھپکڑ رہا ہے۔ اندر میں حالات اگر وہ لڑکوں کی بے قاعدگی اور دیر سے آنے کا دونا روئیں تو بے جا ہی۔ لاپرواہ استاد بچوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ نہیں بن سکتا۔

(۴) بعض مدرسین اول مدرس کے حکم کی تضعیم اور تحقیق کو طلبہ کی ہر دلعزیزی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی کوتاہ اندیشی اور جہالت پر ان کو یہ خیال تک نہیں گزرتا کہ جب خود ان کے دل میں اپنے افسر کی عزت و توقیر اور اس کے احکام کا احترام نہیں ہے تو طلبہ سے تعظیم کی توقع رکھنا جو بکر گندم کاٹنے کا مصداق ہے۔ ایسے مدرسین اپنے آپ کو ہجمہ دیگر نے نیست اور بہہ دان تصور کرتے ہیں۔ پرانے تجربہ کار اور لائق سپرما سٹر کی ہدایات پر عمل کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں اپنے آپ کو اُس جیسا ہی ٹرینڈ اور یکساں سلطنت کا تصور کرتے ہوئے بھل مرکب کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تجربہ ہی ایک بڑا معلم ہے۔ اور فنِ استاد کی باریکیاں اور نفیس اور چیدہ اصول بہت محنت اور برسوں کی مشقت کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ابھی اس میدان میں طفلِ مکتب اور نوخیز ہیں انہیں اول مدرس کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے انسان کو علم اور تجربہ حاصل کرنے کیلئے اپنے سے کم عمر اور زیادہ علم تجربہ کو گونکے پاس جانے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیئے۔

• جب۔ ایک ہی سکول میں کام کرنے والے اساتذہ کی باہمی ریشیں ہیں جو تعلیمی کام میں مارج ہوتی ہیں۔ تمام استادوں کے درمیان سلسلہ اخوت کا ہونا نہایت ضروری اور لایہ دی ہے۔ اتفاق ہی طاقت ہے اور اتفاق ہی میں برکت ہے۔ اگر بغیر محال اساتذہ میں کسی طرح کا اختلاف واقع ہو بھی جائے تو اس کا طلبہ کے سامنے اظہار پہلے درجے کی حماقت اور نادانی ہے۔ اس سے اُن کی وقعت خاک میں مل جاتی ہے۔

(۵۱) اکثر نوجوان مدرسین علاقہ کے بار سوخ اور سر کرہ لوگوں سے میل جول رکھے سے کتراتے ہیں اور اُن کی مدد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے عکس وہ چند ایک نا اہل اور بد اخلاق اشخاص سے راہ و رسم پیدا کر لیتے ہیں مگر چونکہ انسان اس کی سوسائٹی سے بچنا جاتا ہے اس لئے پبلک اور افسران اُن کے اس رویہ سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ناراضگی اُن کی ترقی اور کامیابی میں سد راہ بن جاتی ہے علاوہ ازیں۔

پس فوج بادیان ہشت خاندان پنجو تش گم شد

کے مصداق ہیں اُن میں جو کچھ فطرتی سعادت ہوتی ہے وہ بھی ضائع ہو جاتی ہے اور بد اخلاقی تک نہایت پہنچ جاتی ہے اور اس کا معصوم بچوں پر جو اثر پڑتا ہے خدا اُس سے محفوظ رکھے۔ جہاں مدرسین کے لئے پبلک کیساتھ میل جول ضروری ہے وہاں کیلئے مقامی دھڑا بندی سے کنارہ کشی نہایت سفید ہے لوگوں کے ساتھ رسوخ پیدا کرنے کا احسن طریق اُن کے بچوں کی خیر و عافیت اور فلاح و بہبودی میں ذاتی حصہ لینا ہے۔

(۶) مدرسین کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ جس علاقہ میں تعینات ہوں اپنی طرور رہائش مقامی رسم و رواج کے مطابق اختیار کریں۔ نیز اس علاقہ کو اپنا گھر سمجھ کر پوری دلچسپی سے کام کریں۔ تاکہ وہ اُن کے درمیان رکہ اُن کی تنگ کا ذریعہ بن سکیں۔ طلبہ کو بدنی منراوینے سے اُن کو سخت گریز کرنا چاہیئے۔ اور اُن کی اخلاقی۔ جسمانی اور دماغی تعلیم کا یکساں خیال رکھنا چاہیئے۔

پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور بزرگی کو دوبارہ حاصل کریں اور کامیابی کا سہرا آپ کے سر پر بندھے تو ان نقائص کو دور کرنا چاہیئے آپ کو نمونہ کا استاد بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ آپ کی چال و حال وضع قطع۔ گفتگو اور چال چلن پاکیزہ اور دلکش ہو۔ زندگی بے لوث ہو۔ طبیعت میں چڑچڑاہٹ نہ ہو۔ زودرنجی۔ بے صبری اور لالچ نہ ہو۔ خندہ پیشانی آپ کی خاص صفت ہو۔ غرضیکہ مدرس حسن ہو۔ ہمدرد ہو۔ مہذب ہو۔ وعظ ہو۔ یعنی کہ جمع وصفات جو اور تمام اخلاق حسنہ کو اپنا ورثہ سمجھے مطالعہ کو جاری رکھے۔ مدرسہ کے قواعد کی یا بندی کو اپنا دھڑ اور اول مدرس کی امداد کو اپنا نصب العین قرار دے پھر دیکھے کہ سکول میں جو ایک باغیچہ ہے کیسی بہار ہوتی ہے۔ اور کامیابی کس طرح آپ کے پاؤں چومتی ہے۔ بشظرفست آئندہ بھی اس قسم کی ہدایات شایع کرتا رہوں گا۔ اسید ہے کہ مدرسین ان پرکار بند ہو کر ملک و قوم کے لئے باعث فخر ثابت ہونگے۔ فقط



مسٹر من مہین ایم۔ اے آئی ای ایس
ڈیڑل انسپیکٹر مدارس جالندھر

جذباتِ عالیہ

رازِ ملکِ اشعر اذیتِ نام نہادِ گرانی مرحوم

ز دوقِ بے خودی از من میرش تا چن است
 کہ سینہ چاکِ نظر نائے فتنہ پیوند است
 رخِ تو عیبِ نظر است چمنِ رزیزِ قنار
 در آجاوہ کہ یک شہر آرزو مند است
 تو صفتِ از کعبِ من بردہ پہ سے دانی
 کہ قدرِ گوہِ دلِ حسیست قیمتش چند بہت
 چہ کہ نہ زندِ نظر باز موند است
 کہ در نگاہِ تو تغافلِ ہم پہ پیوند است
 تو آرزوئے دلِ من ز من پہ سے پڑی
 ز دلِ من کہ چون ست آرزو چند است
 قبحِ تو بادِ گراں سے زنی و من مردم
 ز وعدہ نئے دروغی کہ راست مانند است
 عتابِ غمزہ بلا در بلا ہم چید است
 کتابِ صبر ورقِ در ورقِ پر گند است
 چگونہ نقشِ مرادِ در دست بنشیند
 حجابِ سائل و دلالہ سے چید است
 خدنگِ آن نگہ ناز در ازل خورد
 بنو زربِ زخمِ جگر شکر خند است
 وصالِ گرنبہ عمرت عمر یک نفس است
 فراقِ کر سز و نیست کوہِ الوند است
 بے گنجتم و جز ملکِ عشق کم دیدم
 و لایت کہ در داں بندہ بے خداوند است
 شکایتِ کمینم از فلک و لے میرم
 ازیں فسانہ کہ دشمنِ دوست خورد است

بلاکشان ز گرائی خبر کہ سے آرد

اجلِ گرفتہ بر پنجبیر بے کسی بند است

رباعیات

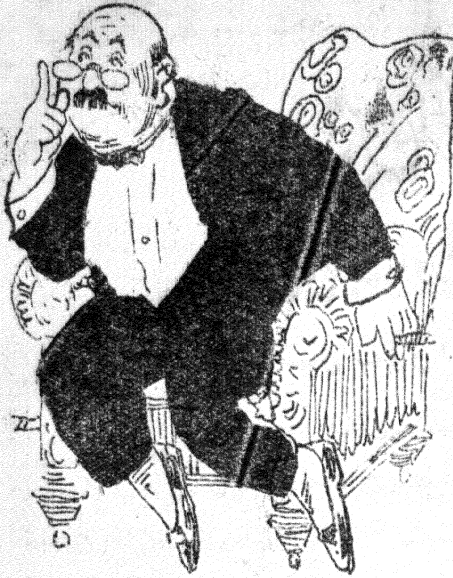
(از ملک اشعر حضرت گرامی مرحوم)

(۱)
دی روز رخ کی آرزو بخود دیم
امروز بدایغ نامرادی مودیم
مقل غلط انداز نیاورد بدست
آن چیکہ کہ از دست اجل جان بیدیم

(۲)
بہ محیط و نقابے دارد
ہر ذرہ دماغ آفتابے دارد
خسے از نور نظم ستی بر خوان
نقطہ ذرا غوش گشت بے دارد

(۳)
ما چہ زیبیاں ز لامکان آمدہ ایم
از کشور جاں بنامداں آمدہ ایم
استرگ کیچہ ز آستین ستیبار
دربہ ہجیم جبیاں آمدہ ایم

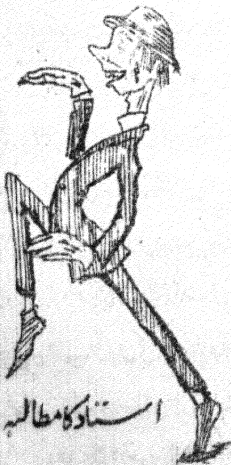
(۴)
مرد سر زوق اشق سے کردیم
از غوش بآہیم و کاسے کردیم
برای نفیس کہ بود سر ششم
در مسلمان لیل و نساں سے کردیم



تم کیوں نہیں کہتے ہو



ہنسوا اور موسے ہو جاؤ



استاد کا مطالعہ



جگڑے سے بچت

پنجاب میں لڑکیوں کی تعلیم

اُس کی ابتدا اور موجودہ حالت

(دلائل ملک چند صاحب بی اے بی ٹی رائے۔ ڈی۔ آئی سکولز حصار)

ابتدائی۔ قدیم ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانے میں تعلیم کس طرح پر دی جاتی تھی؟ ہم اس سوال کو اس جگہ چھیڑنا درست نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن یہ درست ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم جو انگریزوں کے زمانے میں شروع ہوا، اُس وقت رائج نہ تھا۔ اس طرح کے سرکاری مدارس تھے۔ اور نہ سرکاری انسپٹر۔ خاص حالات میں بعض بعض درسگاہوں کو گورنمنٹ کی امداد اور وہ بھی کسی باقاعدہ طریقہ سے نہیں شاید مل جاتی ہو۔ لیکن عیساکہ سرولیم ہنری نے کتاب ”موسومہ“ ہندوستان میں ”انگلینڈ کا کام“ میں لکھتے ہیں۔ ”کہ کسی نخل بادشاہ نے لوگوں کی تعلیم کو حکومت کا فرض بنایا اور کہا“ عام طور پر درست ہے۔

انگریزی حکومت نے بھی جھٹکا یہ عیسوس نہ کیا۔ کہ سرکاری ملازمتوں میں ایسی آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ تعلیم کے کام کو اپنے ہاتھ میں نہ لیا۔ ابتدا میں دو تین خاص درسگاہوں کو چند نوکریوں اور خاص کامیاداروں نے شروع کیا۔ سالہ میں ایٹ انڈیا کمپنی کے چارٹرڈ کی تجویز کے وقت ایک لاکھ روپیہ اشاعت تعلیم کے لئے مہیا کیا گیا۔ ۱۸۳۳ء میں سررشتہ تعلیم کی کمیٹی بنگال میں اور ۱۸۳۵ء میں مدراس میں قائم ہوئی۔ ۱۸۳۵ء میں ڈاکٹر ڈنٹ نے ایک درسگاہ جاری کی جس میں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے پیشہ گورنمنٹ کی درسگاہوں میں کئی عربی اور سکولز کی تعلیم ہی دی جاتی تھی۔ لارڈ بیکن نے اور لارڈ ولیم پینٹنگ ڈاکٹر ڈنٹ کی رائے سے متفق ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت شروع ہوئی۔

لیکن یہ سب لڑکوں کی تعلیم لیئے تھا۔ اس وقت تک لڑکیوں کی تعلیم کی بابت کوئی ذکر و کار نہ تھے۔ لارڈ ڈالہوزی کے زمانے میں رات کی سیاہی میں ایک مدم سی روشنی دکھائی دی۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں سر جیمز بیلن (Belhams) پریزیڈنٹ انجیلی کونسل بنگال نے خاص اپنے زبانت تمام امیروں کی لڑکیوں کی تعلیم لیئے ایک سکول جاری کیا۔ بیگم تابا ہندوستان میں گورنمنٹ کی طرف سے لڑکیوں کی تعلیم کی پہلی مثال ہے۔

پنجاب میں ۱۸۵۷ء کے بعد ہی لڑکیوں کے مدارس جاری ہوئے۔ ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں سکول ایسے تھے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کے پنجاب میں قائم ہو چکے تھے۔ ان میں سے اکثر ۱۸۵۷ء میں

اور ۱۸۹۶ء میں قائم ہوئے۔ جب یہ مدارس جاری ہوئے تو لوگوں نے انہیں بڑی مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ لوگ اپنے لڑکوں کو سرکاری مدرسوں میں بھیجنے سے ڈرتے تھے۔ دیسی سرکاری افسر بھی بعض اوقات اپنا رموخ سکولوں کے خلاف ہی استعمال کرتے تھے۔ جب لڑکوں کی تعلیم کا یہ حال ہو تو لڑکیوں کو کون سرکاری مدارس میں بھیجنے کو تیار ہو سکتا تھا؟ محکمہ تعلیم اس کام میں بالکل بے بس تھا۔ اب تعلیم شروع ہونو کیسے؟

ابتدا سر رابرٹ مننگہم کی جب لفٹیننٹ گورنر پنجاب مقرر ہوئے۔ تو انہوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اودہ کافی عرصہ سے پنجاب میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے سکولوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ انہوں نے موسیابی کے بڑے بڑے آدمیوں پر اپنا اثر ڈالا۔ اور انہیں تعلیم نسوان کی طرف رغبت دلانی بہت سے اضلاع کے ڈپٹی کمشنر اور دیگر افسران نے سر رابرٹ کے اشارے کو سمجھا۔ اور اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں کے مدارس قائم ہونے شروع ہوئے۔ لاہور۔ امرتسر۔ جالندھر۔ سیالکوٹ۔ گجرات اور اولپنڈی کے اضلاع میں نہایت زور سے لڑکیوں کے مدارس جاری ہونے لگے۔ یہ سب سکول پرائیویٹ آدمیوں کے زیر انتظام تھے۔ محکمہ تعلیم یا گورنمنٹ کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ کوئی باقاعدہ طریقہ تھا۔ اور نہ تعلیم کے معیار کو کوئی انتظام تھا۔ اور نہ اس بات کی کوئی گارنٹی تھی۔ کہ کچھ پڑھنا بھی جانتا ہے یا نہیں۔ نام یہ ترقی کی طرف براۓم تھا۔ لوگوں کا مشبہ دور کرنے کا بھی واحد طریقہ تھا کہ ہمارے اپنے آدمی ایسے مدارس جاری کریں۔

انتظام اور سلسلہ بندی ان سکولوں کو ایک سلسلہ میں باندھنے کی کوشش پہلے مسٹر ایچ سن اسوان کے نازک پودے کی چھانٹ اس روز سے شروع ہوئی۔ کہ پودے کی زندگی ہی خطرے میں پڑ گئی۔ لاہور کے سکولوں کیلئے ایک پوپین لیڈی سپرنٹنڈنٹ مقرر کی گئی اور سکولوں کی تعداد ۱۵ سے بڑھ کر دیکھی۔ اسی طرح امرتسر میں کیا گیا۔ مگر تحقیق اس زور سے نہ کی گئی۔ اور ۱۱۱ میں سے ۲۰ سکول قائم رکھے گئے۔ اضلاع جالندھر اور سیالکوٹ وغیرہ میں ۸۰ مدارس حکام ضلع کے ماتحت تھے۔ پرانے سکول جو بندہ روں اور مسجدوں میں جاری تھے ان کو بند کرنے کی کوشش کی گئی۔

مشن سکولز ۳۵ کے قریب تھے اور ان میں بارہ سو کے قریب لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بابا کھیم سنگھ سیدی نے اضلاع راولپنڈی اور جہلم میں ۵۱ مدرسے جاری کر رکھے تھے۔ اور انڈیا کے قریب لڑکیاں نہ تعلیم تھیں۔ کشیدہ اور بھلکاری کاڑھنا سینا پر وانا لڑکیوں کو خوب سکھایا جاتا تھا۔ اور تعلیم بھی بجا فانی تھی۔ لاہور۔ امرتسر۔ سیالکوٹ۔ جالندھر اور دھلی میں عورتوں کے نارمل سکول قائم تھے۔ بڑی عمر کی عورتوں کیلئے زمانہ کلاسز تھیں۔

ہندوستان کی با تعریف عورتیں

(1)



ہندوستان کا کچھ نہیں کو سکتا

(2)



(3)



(4)



(5)



(6)



- 1 ساری ملی اصابت۔۔۔ ملی اور پورستی کی ص سے ابھی لڑکی ہے جس نے
ہی اسے پاس کیا ہے
- 2 ساری ملی ساری رام بھاگتہی اصل چنگل ہات (مدراس) ایک تعلیم
محکمہ کی پڑھار ہیں
- 3 ساری ملی کلکو بائی جی ہی اسے کی ڈکری لکھ و لکھ سے کڈر لکھ
محکمہ کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کر کے ائی ہیں
- 4 ساری ملی صس جی جی بالی (بھائی) اب لے والی لکھ لکھ لکھ
کھا ہے
- 5 ساری ملی گلاب صیا (مدراس) پور سکر پور لکھ و لکھ لکھ
محکمہ کی پڑھار ہیں

ایک بد صورت عورت



یہ تصویر اُس عورت کی ہے جو سارے یورپ و امریکا میں بولے درجہ کی بد
مزاج-خصہ و -کنہہ دورے صورت اور بد صورت ہے جس کی زبان سے ہمیشہ زہر
الود باتیں نکلتی ہیں۔ ابھی تو انکس کو وجہ سے آج تک اسے بہار کی نظروں سے
نہیں دیکھا گیا کہ اسکو شامی ہی ہوگی ہے۔ عالم نسوانی کہ اس عورت سے بہت
حاصل کر لی چاہئے اور اُسکی ان بد عادات سے پرہیز۔

رہنمائے تعلیم لاہور ————— ۱۳۹ ————— جوبلی نمبر ۱۹۳۱ء

۹۶۰	۸۷۰	ٹریننگ سکولز
۱۰۶۸	۴۲	خاص سکولز
۱۴۰۱	۷۲	پرائیویٹ سکولز اونچے درجے کے
<u>۴۳۳۰۹</u>	<u>۱۰۶۸۷</u>	ابتدائی مدارس -
۴۰۰۸۳۸	۱۹۲۷۸۲	میسٹران -

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ ملک میں ۲,۷۷,۲۰۷ عورتیں ایسی تھیں جو سکولوں میں داخل نہ تھیں۔ لیکن لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ ۱۹۹۱ء میں یہ تعداد ۵,۴۳,۴۹۵ ہو گئی۔

۱۹۸۶ء میں پنجاب سے پہلی لڑکی نے انٹرنس پاس کیا۔ الغرض انیسویں صدی کے خاتمہ پر ہماری حالت یہ تھی کہ تمام صوبے میں ۲۲ بانی سکول ۸ مڈل سکول اور دیگر سب قسم کے سکول تھے۔ اور ان میں ۱۲۶۰۰ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ چند سالوں کے اندر مقابلہ کیلئے نیچے دیئے جاتے ہیں -

تعداد سکول	زیر تعلیم لڑکیاں
۳۱۵	۱۲۶۰۰
۵۶۱	۲۱۷۶۹
۱۹۱۱,۷۱۲	۳۶۶۴۰
۱۹۱۶,۷۱۷	۱۶۷۳۹
۱۰۲۰۰	۵۴۱۱۵
۹۷۲	۱۳۵۰۱
۱۱۴۳	۶۰۹۷۲
۱۳۳۶	۲۴۱۶۱
۱۳۶۷	۸۲۱۰۵
۲۲۰۶	۳۸۵۳۲
۱۵۸۶	۱۰۰۳۸۷
۲۵۱۲	۴۹۳۰۶

اس کے علاوہ کچھ لڑکیاں لڑکوں کے مدرسوں میں بھی زیر تعلیم تھیں۔ اس طرح سے کل تعداد زیر تعلیم اس

طرح تھی۔

۸۷۹۱۲	پہلی دوسری تیسری جماعتیں۔
۱۳۰۵۹	چہارم و پنجم
۴۴۲۹	ششم سے دہم تک
۱۴۳	کالج
۱۰۵۲۲۳	میزان

۱۹۱۴ء میں وکٹوریہ سکول گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لیا اس وقت ۶ ہائی سکول اور ۳۳ مڈل سکول تھے۔ یہ ہے ہماری لڑکیوں کی تعلیمی ترقی کا حال۔ اگر ۱۹۳۱ء کا موجودہ اعداد سے مقابلہ کیا جائے۔ تو مندرجہ ذیل ہے

تعداد لڑکیاں	آبادی کل	اوسط فی دس لاکھ
۹۶۹۱	۱۷۵۹۶۷۵۲	۵۲۸
۱۰۵۲۲۳	۲۰۶۸۵۰۲۴	۵۱۰۰

آئندہ کیا ہونا چاہیئے :-

بات صاف ہے کہ سنت کو شش کے بارچہ تعلیمی حالت لڑکوں کی بھی درست نہیں ہوئی۔ لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ زیر تعلیم لڑکے اور لڑکیوں کو ایک بہت بڑی تعداد ابتدائی چار جماعتوں کو عبور نہیں کر سکتی۔ اور چار جماعتوں کی تعلیم کا معیار جو ہے۔ وہ سب جانتے ہی ہیں۔ زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

گزشتہ تین سال سے لڑکوں کی تعلیم کی طرف خاص طور سے توجہ دیکھی گئی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ تعلیم کیوں نہ زیادہ ترقی کرے۔ اور لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح کافی تعداد میں سکولوں میں داخل ہوں۔

سلک مروارید

- (۱) کنواں کبھی بیات آدمی کے پاس نہیں آتا۔ پیاسا جی کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔
 - (۲) بزرگوں کی مجلس میں یہودہ طعنہ آمیز ہنسی مغزل کی گنگٹو کبھی نہ کرو۔
 - (۳) کسی کے نام کا خط بلا اس کی اجازت کے مت پڑھو۔
- (گنگکارام جی پور)

ہماری تعلیم

عام طور پر ہر ایسے آدمی کو کسی زبان بالخصوص اردو میں کسی قدر نوشت و خواندگی مہارت رکھنا ہوتا ہے تاکہ وہ دیا جاتا ہے۔ اور یہ راستی سے اتنا ہی دور ہے۔ جتنا نوہ سے سبب۔ اگر سچ پوچھو تو تعلیم کے نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ مقصد کو محض نوشت و خواندگی مہارت کے گھٹیا سے درجے تک گرا دینا۔ اُس کے گلے پر کنگن بھری پھیرنا ہے۔ کیونکہ تعلیم کا اصلی مدعا تو یہ ہے کہ :-

”اپنے طالب علموں کی تربیت اس نوع سے کی جائے جس سے بڑے ہو کر وہ :-

(۱) نیک و معزز شہری بنیں۔

(ب) عرصت تک تندرست زندگی بسر کریں

(ج) جائز ذرائع سے کم کم عمر فارغ البالی سے گزار سکیں

(د) اپنے وطن، اہل وطن اور نسل کے ہمدرد اور ممد و دگا ر ثابت ہوں۔“

تعلیم کے مدعا کی کوئی پراگرم اپنی تعلیم کو پرکھیں۔ تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ ایک قسم کا ملغ ثابت ہوتی ہے۔ جس کی ظاہریت تو موہنی ہے۔ لیکن حقیقت بنظر صفر۔ اگر تعلیم کا وہی مدعا لیا جائے۔ جو عامۃ الناس لینے ہیں۔ اور جسے میں نے شروع میں واضح کر دیا ہے۔ تو ہم تعلیم یافتہ ضرور ہیں۔ اور ہمارے ہائی تعلیم پڑے شد و مد سے ہو رہی ہے۔ لیکن اگر تعلیم کا مقصد وہ ہے۔ جو بعد میں بیان ہوا ہے۔ تو ہم تعلیم سے کوئیں دور ہیں۔ اور ہم تعلیم کے منہر اصحاب سے کہہ سکتے ہیں کہ :-

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی

کیں رہ کہ تو میری بزرگستان است

آؤ دیکھیں! کیونکر؟

تعلیم کا سب سے پہلا مقصد نیک اور معزز شہری پیدا کرنا ہے۔ اب ذرا غور سے دیکھو کہ دروغ بانی سخن سازی رشوت ستانی اجل سازی، مقدمہ بازی، چر شرارت بولیم کرنا۔ اور پھر اُن کا اخلاک طبقہ سے متعلق ہیں۔ کیا ہمارے ملک میں وہی مصومیت اور راستی اب بھی ہے جو آج سے پچاس سال پہلے تھی۔ عام میل جول اور معمولی سے معمولی بات چیت میں بھی جو قطع اور ریاضت ظاہریت اور احسنیت پائی جاتی ہے کیا وہ پہلے بھی تھی؟ یہ حسد و بغض، عناد اور مخالفت یہ نفسا نفسی اور خود پرستی یہ کبر اور غرور یہ افتراق و اختلاف یہ تعصب اور ضنبہ داری یہ دھڑ بندی اور فرقہ داری جس نے ہر خود و کلاں کو اپنے زیر اثر کر رکھا ہے کیا پہلے بھی اسی طرح تھی؟ موجودہ نسل جو اس وقت مدارس میں یا ایچ ایچ فارغ التحصیل ہوئی ہے

شاید محسوس کرتی ہو یا نہ کرتی ہو لیکن وہ بڑھے اور سال خیزہ لوگ جنگی ابتدا اور حالات میں ہوئی تھی۔ اپنی اس انتہا کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ اگر اس فرق کو نمایاں طور پر دیکھنا ہے۔ تو ان دو افتادہ مقامات کا جہاں بھی اس شمع کی روشنی جلوہ گر نہیں ہوئی۔ ان تعلیمی مراکز سے جہاں ہماری موجودہ تعلیم عامہ تمام ہو گئی ہے۔ تقابل کر کے دیکھ لو۔ آپ دونوں حالتوں میں بعد الشرفین پائیں گے۔ قانون پر مبنی دفعات بڑھ رہی ہیں۔ یا سوسائٹی کی اصلاح کا خیال خشتار و زبر و زحمتا بار بار ہے۔ یا اس بات پر دال ہے۔ کہ جرائم کی نوعیت بڑھ رہی ہے۔ اور سوسائٹی میں خرابیاں گھم کر رہی ہیں۔ کیونکہ جب تک کوئی بیمار نہ ہو۔ اس کے علاج کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہر بات میں سادگی اور سہانہ روی کو ہاتھ سے نہ دینا جن اہل ہند کا شعار تھا۔ وہ اب ہر بات میں بناوٹ اور مبالغہ پر اتر آئے ہیں۔ اور ان سب کے متعلق میں تو یہی کہوں گا۔ کہ ۔۔۔

اے باوصیا! اس ہمہ آوردہ کشت

حضرت آدمؑ کی طرح بہشت کی لہریں لے رہے تھے۔ اس تعلیم کا وہ کیا کھایا۔ کہ اپنی خربانی اور کم مائی کا احساس ہونے لگا۔ بجائے نیک اور اچھے شہری بننے کے وہ کچھ ہو گئے۔ کہ اب ہمارے نام سے وہ بھی لاجل پڑھتا ہے جس کے نام سے کبھی ہم لاجل پڑھا کرتے تھے۔

اب تعلیم کا دوسرا مدعا لو یعنی تندرست رہ کر عرصہ تک زندگی بسر کرنے کے قابل ہونا۔ اس کے دستاویزی ثبوت آپ کو ملیں گے۔ آج سے پچاس سال پہلے کی اوسط عمر کا آج کل کی اوسط عمر سے مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ پڑھے لکھے۔ اور ان پڑھ لوگوں کی عام صحت، شرح اموات، قد و قامت، شکل و شبہت، ڈیل ڈول اور زور و طاقت کا موازنہ کر لو۔ ہندوؤں کو فخر ہے۔ کہ تعلیمی حالت میں وہ اپنی ہمسایہ اقوام کے گویے سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن یہ فخر بھی ہندوؤں کو ہی حاصل ہے۔ کہ وہ بدن ان کی شرح اموات تو ہمسایہ اقوام کی شرح اموات سے بڑھ رہی ہے۔ اور شرح پیدائش کم ہو رہی ہے۔ جس سے ہندو قوم کے رہنماؤں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کہ پمفلٹ لکھ کر اس قوم پر واضح کریں۔ کہ اگر اس کے یہی ملے تلے رہے۔ تو اس کا نام صغیر ہستی سے مٹ جائیگا۔ دھرم پورا، سولن، ڈیرہ دون و دھرم سالہ بیوت ایسٹ آبادی اور کشمیر کو یہ رونق کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ جو آج حاصل ہے۔ پھر ان مقامات پر نوواردیاریوں کی مردم شماری کر کے دیکھ لو۔ آپ کو اپنی تعلیم کے کارنامے نمایاں و بین صورت میں نظر آجائیں گے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس پہلو پر مجھے زیادہ ثبوت یا شہادت گزارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ۔۔۔

طفل نکتہ فہم۔ ایسا ہے اُستادے بس است

رہا میسر مدعا کہ جائز ذرائع سے روزی کما کر زندگی فارغ البالی سے بسر کرنے کے قابل ہونا۔ اس کے لئے اہل ہند کا مسئلہ بیکاری بیوت میں ہے۔ پڑھے لکھے لوگ لاکھوں کی تعداد میں بیکار بیٹھے ملک و قوم پر گراںبار بوجھ ثابت

ہو رہے ہیں۔ اور سچ پوچھو۔ تو ملک میں جتنی بے چینی اور بد امنی کی وبا پھیلی ہوئی ہے یا آئندہ پھیلے گا اندیشہ ہے۔ اس کی تہ میں دان پڑے لکھے حضرات کا بیکار رہنا کام کرتا ہے۔ انہیں کام پر لگا دو۔ آج سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائیگا۔ اس وقت ایک روٹی کا مسئلہ ہے۔ جو نازک صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ تعلیم روٹی کے سوال کو بالکل حل نہیں کرتی۔ ہر پٹھا لکھا اپنے آپ کو ایک اعلیٰ طبقہ میں پاتا ہے۔ عام معمولی کام جو ان پڑھ لوگ کرتے ہیں۔ کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے۔ سرمایہ پاس نہیں ہوتا۔ اسلئے تجارت کر نہیں سکتے۔ ملازمت کے خواہاں ہیں۔ لیکن بڑی سے بڑی گورنمنٹ میں بھی یہ طاقت نہیں کہ حشرات الارض کی مانند پڑھے لکھوں کی جتنی تعداد سکولوں اور کارخانوں کو سلام کر کے نکلے ان کیلئے نئی سے نئی اسامیاں پیدا کرتی جائے جن پر فائز ہو کر وہ اپنے دلی مدعا کو حاصل کریں۔ کام وہ کرنا نہیں چاہتے یا ان سے ہونہیں سکتا۔ ملازمت مل نہیں سکتی نتیجہ یہ ہو رہا ہے۔ کہ جہاں ایک طرف ملک میں بیک منگوں اور سادھوؤں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ وہاں دوسری طرف پڑھے لکھے بیکار با بوؤں کی تعداد میں ترقی ہو رہی ہے جنہوں نے سب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور یہ بھی اسی شجر تعلیم کا شہر ہے۔

اب ذرا تعلیم کا چوتھا نمعا لو۔ یعنی اپنے وطن، اہل وطن اور انبائے جنس کے مؤمددگار ثابت ہوں۔ یہ مدعا ہماری تعلیم کہاں تک پورا کر رہی ہے۔ اس کے ثبوت میں ہندو مسلم، ہندو سکھ، دیہاتی و شہری، زراعت پیشہ وغیرہ زراعت پیشہ، برہمن وغیرہ برہمن، اچھوت وغیرہ اچھوت، ساہوکار وغیرہ ساہوکار، جھگڑے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ کسی جگہ چلے جاؤ۔ ان پڑھ طبقہ جو پڑھے لکھے لوگوں کے اثر سے باہر ہے۔ ان تنازعات سے بالکل بے خبر ہے۔ ہر جگہ آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے جن کا کام کچھڑوں کو ملانا، روٹھوں کو منانا، ٹوٹوں کو جوڑنا، اور پھٹوں کو سینا تھا۔ جن کے فتنے ان کی تعلیم نے یہ فرض عائد کیا تھا۔ کہ وہ دانوں کو خزن کی صورت میں لائیں۔ جہاں جہاں ہو سکتا ہے جڑے سروں کو الگ الگ کر رہے ہیں۔ دوستوں میں دشمنی اور عداوت بڑھا رہے ہیں۔ اور ایک کو ایک بنا کر (ع)

اکائی ذات میں میری ہزاروں تنگ ہیں پیدا

کے حقوے کو بڑے معنوں میں پیش کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں ذرا سا سوراخ پاتے ہیں۔ ایڑی چوٹی ٹمکے زور لگ کر سوئی کا زور قلم سے پہاڑ بنا کر دکھاتے ہیں۔ اور پہاڑ بھی ایسا جس سے گزرنے والا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ سائنسی اور انجینئرنگ کے وسیلے، شیعہ و سنی، احمدی وغیرہ احمدی پارٹیاں بنانا اور پھر ان پارٹیوں میں سرپھٹل کرانا اہل قلم کا کام ہے۔ نہ کہ بیچارے مغرب ان پڑھ لوگوں کا۔ کاش یہ تعلیم نہ ہوتی اور یہ افتراق دیکھنے میں نہ آتا۔ علم تو کہتا ہے۔ کہ

تو برے وصل کر دن آدمی

نے برے فضل کر دن آدمی

لیکن ہمارے لکھے پڑھوں نے اس کو یوں بدل دیا ہے۔ کہ

تو برے فعل کر دی آمدی

نے برے فعل کر دی آمدی

مجھے کہا جائیگا کہ جدوجہد اور اختلاف آرائے زندگی کی علامات ہیں۔ بے شک! میں اس راستی کو تسلیم کرتا ہوں بشرطیکہ اختلاف محض اختلاف آرائے تک محدود ہو۔ اور اس کی انتہا دوسروں کو صغیر ہستی سے محروم کر دینا نہ ہو ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ جواب بھی دیا جائے کہ ملک کی اقتصادی حالت نے یہاں تک ذہن پرستی پیدا کی ہے۔ اگر اقتصادی حالت آج بدل جائے۔ تو ملک سے ان تمام تنازعات کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ بے شک کسی حد تک یہ جواب درست ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پیچھے بیان کر آیا ہوں ملک کی اقتصادی حالت کو اس برے درجہ تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی تو تعلیم پر ہی عاید ہوتی ہے۔ پس بالواسطہ نہ سہی بلا واسطہ ہی سہی ذمہ دار تو ہماری موجودہ تعلیم ہے۔

ممکن ہے کچھ اصحاب وہ چند گنتی کی برگزیدہ ہستیاں بطور مثال پیش کریں۔ جو شہر تو اسی تعلیم کا ہیں۔ لیکن ان بڑے وقتوں میں بھی ملک کے نام کو چار چاند لگا رہی ہیں۔ اور جن کی مثال جنگل ہیں اگرچہ اُس گلاب کے پھول کی سی ہے۔ جو اپنی مہک سے جنگل میں جنگل کا سماں پیش کر رہا ہے۔ لیکن میں کہوں گا کہ وہ برگزیدہ ہستیاں فطرت سے طبیعت ہی ایسی لائی ہیں۔ تعلیم کے طمع کی شاہکار سی کا نتیجہ نہیں۔ اور اگر ان کی دیکھ بھال پھلوڑی کے تربیت یافتہ مالی کے ہاتھوں ہوئی۔ تو خدا جانے وہ کیا سے کیا کر دکھائیں۔ اور خود کیا بن جائیں۔

”پھر“

اگر موجودہ تعلیم تعلیم کے اصلی مدعا سے الٹ ہو رہی ہے۔ تو کیا تعلیم بند کر دی جائے؟ ہاں! مگر موجودہ تعلیم نہ کہ تعلیم جس کے متعلق شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرما گئے ہیں۔ کہ

بے علم نتوان خدا را شناخت

جس ڈائی نے باقی ممالک کی بیماری کا علاج کیا۔ کیا ہندوستان کی سرزمین کا باوا آدم ہی نہ لالہ ہے۔ مگر یہاں اگر اُس کی تاثیر ہی بدل گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ دو الی میں کچھ فرق ہے۔ ورنہ یہاں بھی وہی نتائج پیدا ہوتے جو باقی ممالک میں پیدا ہوئے۔ اب حیات جہاں کہیں ہے اب حیات ہی ہے۔ نہ کہ ایک جگہ آب حیات اور دوسری جگہ زہر ہلاہل۔

تفاوت کند ہرگز آب زلال

گرش کو زہر زریں ہو دیا سفال

تعلیم کے متعلق میری ذاتی رائے تو یہ ہے۔ کہ ہندوستان باقی ممالک کی صف میں اُس وقت تک کھڑا ہونے کا اہل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کا ایک ذوق بھی پڑھنے لکھنے کے فن سے عاری ہے۔ اس لئے

میرے خیالات سے کہیں یہ خیال نہ کر لیا جائے۔ کہ میں اہل ملک کو زمانہ قبل از تاریخ کی طرف لیجانا چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں۔ کہ میرے اہل ملک وہ تعلیم حاصل کریں۔ جو اس زمانے میں دیگر زندہ ممالک کے لوگ حاصل کر رہے ہیں۔ اس قسم کا پیچیدہ نصاب تعلیم امتحانات کی ایسی کڑی پابندیاں ایسا پھیکا اور خشک طرزِ تعلیم اور ایسے خواغواہ کے مدرس جو بقول شمسے

”مان زمان میں تیرا مہمان“

فن تعلیم سے کوئی اُنس رکھے بغیر کسی طرف بھی شکم پروری کی راہ نہ پا کر محض پیٹ پالنے کی خاطر تعلیم میں آگھے ہیں۔ کسی اور ملک میں نہ پاؤ گے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ ردی اور ناکارہ سسٹم جو ہمارے بچوں کو ناکارہ اور نا اہل بنا رہا ہے۔ فی الفور بدل دیا جائے۔

سب سے پہلے پرائمری تعلیم کو۔ یہ لازمی ہونی چاہیئے۔ اس کا موجودہ سٹینڈرڈ (معیار) بہت گھٹیا ہے۔ بڑھا دینا چاہیئے۔ ہمیں پرائمری تعلیم سے بچوں کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنانا ہے۔ تاکہ زندگی بھر وہ جو بھی کام کریں۔ اُس کی ضروریات کیلئے دوسروں کے دست نگر نہ ہوں۔ ہمارے موجودہ پرائمری پاس سکول سے نکل کر اُن پڑھ پڑھے ہوئے کہلا سکتے ہیں۔ جن کا شمار نہ خواندہ آدمیوں میں ہو سکتا ہے۔ نہ ناخواندہ آدمیوں میں۔ ایسے نیوٹر جنڈر (Neuter gender) (.....) بھلا کس کام کے؟ اتنا پڑھنے پڑان کا جو وقت اور روپیہ خرچ آیا۔ اور لوکل باڈیوں کی جو محنت اور لاگت خرچ ہوئی۔ کیا وہ ضائع نہیں گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پرائمری تعلیم نہایت گھٹیل باتھوں میں ہے۔ ہم کہنے کو تو کہتے ہیں ۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج

تاثرِ ثانیے رود دیوار کج

لیکن یہ خشتِ اول رکھنے کو معمار وہ لاتے ہیں۔ جنہیں نہ تعلیم نہ تربیت اور نہ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اس ابتدا پر کس اعلیٰ انتہا کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ اس لئے ہمارے کارفرمایان جبکہ تعلیم اگر دول سے ملک کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں۔ تو انہیں پرائمری تعلیم پر پوری توجہ دینی چاہیئے۔ اس کے لئے ۔

(۱) پرائمری تعلیم کا انتظام براہِ راست گورنمنٹ کی نگرانی میں ہونا چاہیئے۔

(۲) پرائمری کلاسوں کی تعلیم کیلئے اچھے اچھے استاد انتخاب کرنے چاہئیں۔

(۳) پرائمری جماعتیں چار کی بجائے پانچ ہوں۔

(۴) اُن کی تعلیم لکھنا۔ پڑھنا۔ ضروری حساب۔ معمولی ملکی حیرانہ اور علمِ الاخلاق تک محدود ہو۔ علمِ الاخلاق سے مراد اخلاقی کہانیاں اور ادب و آداب مجلس وغیرہ ہے۔ جیسا کہ فارسی کی کتابوں اخلاقِ جلالی یا اخلاقِ حسنی وغیرہ

کتاب میں درج ہے۔

سوال ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے جو ممکنہ کچوں کی ابتدائی تعلیم اچھی نگرانی میں نہیں کر سکتا۔ اُسے کیا حق حاصل ہے۔ کہ وسطی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پر روپیہ ضایع کر کے ملک میں بیکاروں کی تعداد میں اضافہ کرنا جائے۔ پس جب تک پرائمری تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو جاتا۔ تمام گورنمنٹ کالج گورنمنٹ ہائی سکول اور گورنمنٹ مڈل سکول بند کر دیئے جائیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک انٹر میڈیٹ کالج میں جہاں ایک سو پچاس طلباء زیر تعلیم ہیں۔ اس کی عمارت پر چار پانچ لاکھ روپیہ سے کم خرچ نہ آیا ہوگا۔ اس میں کثافت کے پندرہ نمبر ہیں۔ جنکی صرف سالانہ تنخواہ پر ۳۰۰۰۰ روپیہ سے زائد خرچ آتا ہے۔ اور اگر باقی اخراجات بھی شامل کر لئے جائیں۔ تو پچاس ہزار سالانہ سے کم خرچ کیا اٹھتا ہوگا۔ اس میں ۲۵۰۰۰ روپیہ عمارت کی رقم کاٹنا مل کر۔ تو صرف ۱۵۰۰۰ روپیہ سالانہ خرچ ہوگا۔ گویا نیا طالب علم ۵۰۰ روپیہ گورنمنٹ نے دیا۔ کیا پرائمری تعلیم پر اس کا سوال حصہ بھی خرچ ہوتا ہے۔ بہت سے پرائیویٹ کالج اور ہائی سکول و مڈل سکول کھل چکے ہیں۔ ان پر گورنمنٹ کی پوری نگرانی ہے۔ اس لئے وسطی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا کام ایسے سکولوں اور کالجوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اور پرائمری تعلیم کا کام گورنمنٹ اپنے ذمہ لے۔ خرچ کا حال فوراً حل جائے گا۔

پرائمری تعلیم کے بعد وسطیٰ مدارس کا نصاب تعلیم و حصوں میں بٹ جانا چاہیئے۔ وزیر کھل و زیکلور و زیکلور گویا اب بھی ہے۔ لیکن وہ نامکمل ہے۔ چونکہ ہندوستان ایک بڑی ملک ہے۔ اور اس کی آبادی کا ایک بڑا جزو زراعت کے کام میں کھپ سکتا ہے۔ اس لئے ہر تحصیل میں صرف دو وزیر کھل و زیکلور ہوں۔ جن کے ساتھ زراعتی فارم ہوں اور ایسے سکول صرف فن زراعت و باغبانی کی تعلیم کو ہی اپنا مقصد وجائیں۔ اور تعلیم کتابی نہیں۔ بلکہ عملی ہونی چاہیئے۔ زراعت اور باغبانی کے تمام تجربات لڑکوں سے کرائے جائیں۔ اور ملکی پیداوار کو بہتر اور زیادہ کرنے کے طریقے سکھا کر عمدہ آسان اور کاشتکار پیدا کئے جائیں۔ یہ قسمتی سے ملک میں خیال دن بدن عام ہوتا جا رہا ہے۔ کہ زراعت کوئی منافع کا پیشہ نہیں۔ اس لئے وہ لوگ بھی جو زراعت کا کام کر سکتے ہیں۔ اس کام کو چھوڑ کر ملازمت کی جانب جھکتے جا رہے ہیں۔ اور یہ اس ملک کے حق میں نیک فال نہیں ضرورت ہے کہ اس رجحان کو بدلنے کیلئے عملی قدم اٹھایا جائے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ وزیر کھل و زیکلور زراعتی سکول بنا دیئے جائیں۔ تو اس سے میرا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہاں سولے زراعت کے اور مضامین کی تعلیم دی ہی نہ جائے بلکہ یہ مطلب ہے کہ زراعت پر سب سے زیادہ توجہ دی جائے۔ اور باقی مضامین زبانی، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ اور ابتدائی سائنس سکھے جائیں۔ لیکن اسی حد تک

کہ زراعت کی تعلیم میں باارج ہونے کی جگہ اُس کے مہذہبیت ہوں۔ ان سکولوں سے جولہ کے خاص قابلیت کے ٹکلیں۔ انہیں فن زراعت کی مزید تعلیم دیکھائے اور مزید تجربات کیلئے اعلیٰ قسم کے کالج میں بھیجا جائے۔ لیکن شرط یہی کہ آخر تک اُن کی تعلیم وزیرِ کل زراعت میں ہو۔ انگریزی یا فرانسیسی یا کوئی اور زبان بھی ساتھ کے ساتھ پڑھائی جائے۔ تاکہ لکھا فارغ التحصیل ہو کر اس فن کی نگہی گئی کتابوں سے بھی مستفید ہو سکیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف علاقوں میں انہیں صرف زرعی تجربات کے فارموں میں لگایا جائے۔ اور اُن کے ذمہ یہ فرض بھی عاید کیا جائے کہ نواحی علاقے کے کاشتکاروں کی تربیت بھی کریں۔

اینگلو وزیرِ کل سکولوں میں انگریزی بطور دوسری زبان کے پڑھائی جائے۔ نہ کہ بطور ذریعہ تعلیم کے۔ ہر سکول۔ زمانہ ادنیٰ۔ ریاضی۔ تاریخ۔ جغرافیہ اور سائنس کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ایک صنعت لازمی طور پر سکھائے۔ مثلاً تحصیل میں ایک سکول اگر رنگ سازی کی تعلیم اپنے نصاب میں داخل کرنا ہے۔ تو دوسرا فن دباغت تیسرا اصالون سازی۔ چوتھا ٹھاری۔ پانچواں منسل سازی۔ کاغذ سازی۔ دیاسلائی بنانا وغیرہ سیکڑوں صنعتوں میں سے کوئی ایک صنعت لے لے۔ لیکن یہ ضرور ہو کہ تحصیل میں جو صنعت ایک سکول لیتا ہے۔ وہ دوسرا نہ لے۔

یہی تقسیم ہائی سکولوں پر عاید کی جائے۔ ضلع پھر میں صرف ایک سکول ہو۔ جو صرف لکڑی پیدا کرنے کو مقرر کیا جائے اور اس میں بھی داخلہ محدود ہو۔ جہاں لوگوں کو خط و کتابت، سٹارٹ، ہیمنڈ، ٹائپ رائٹنگ، بک بکنگ وغیرہ وغیرہ کمرشل مضامین کی تعلیم دی جائے۔

اعلیٰ تعلیم کیلئے جیسا کہ دوسرے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ ایک یونیورسٹی کے ماتحت ایک قسم کی تعلیم دینے کو ایک ہی کالج ہو۔ ہاں موقعہ اور محل کے مطابق یونیورسٹی اپنے ساتھ ان کالجوں کا الحاق کرتی جائے۔ جو کوئی خاص مدعا کو لے کر جاری ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کالج اگر سائنس کی اعلیٰ تعلیم دینے کو ٹھکتا ہے۔ تو اُس میں دی لڑکے داخل ہوں۔ جو سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ دوسرا کالج سنسکرت کی اعلیٰ تعلیم کیلئے ہو تیسرا عربی کیلئے۔ چوتھا طب کیلئے پانچواں انجیری کیلئے۔ چھٹا قانون کیلئے۔ ساتواں علم طبقات الارض کیلئے۔ آٹھواں مہیکہ کیلئے۔ غرضیکہ کالج تو جتنے ہیں اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں۔ لیکن ہر کالج کا ہتھیارے مقصود ایک خاص قسم کی تعلیم میں ماہر پیدا کرنا ہو۔ اور پنجاب پھر میں جتنے کاروباری محکمے ہیں۔ سب اپنی بھرتی یونیورسٹی کی معرفت لیں۔ اس سے فرقہ واری کے جھگڑے اٹھ جائیں گے۔ جو نوجوانوں کو کام مل جائیگا۔ اور ملک میں بے چینی اور بد امنی کی جو تباہ کن لہر پھیل رہی ہے۔ بند ہو جائیگی۔ لیکن کیا کوئی اس طرف توجہ دیکھا؟ افسوس کہ ہمارے ملک کی قسمت میں ابھی یہ وقت نہیں آیا۔ اسلئے بقول

ما نوزمان و جان جہاں اختیار ہے ہم نیک بد صنو کو سمجھائے جلتے ہیں

میں اپنا فرض ادا کر دیتا ہوں۔ اس کا کسی پر اثر ہو یا نہ ہو اس سے مجھے سروکار نہیں کیونکہ میرا رسولانِ بلاغ باشد میں

ہمارے امتحانات

(سید اشفاق حسین صاحب - بی۔ اے - بی۔ ٹی - ہیڈ ماسٹر)

اہمیت

یوں تو دنیا ہی میں اولہ الی آخرہ ایک نامتناہی سلسلہ امتحانات ہے۔ مگر تعلیمی دنیا کی چہل پہل تو تمام وکمال اسی پر منحصر ہے۔ معلم ہو یا متعلم۔ مدارس کے منیجر ہوں یا طلباء کے والدین۔ ملازم ہوں یا ملازم رکھنے والے۔ سب کی نظریں اسی سراب پر جمی ہوئی ہیں۔

ہمارے امتحانات سراب کی زیادہ حقیقت نہیں کھتے

آپ کہیں گے کہ امتحان ہی حقیقی شے کو سراب کی سی بے حقیقت اور نظر فریب شے سے تعبیر کرنا کقدرِ نوا اور لامعنی ہے۔ لیکن ذرا آپ اپنی حقیقت اس نگاہ پر غور و فکر کی۔ دور بین لگائیے اور سطحی امور سے آگے چلئے تو آپ کو واضح ہو جائیگا۔ کہ میں قابلِ ممانی ہوں۔ ذیل کے چند واقعات کو مشتبہ نمونہ از خروارے تصور فرما کر اُن کی روشنی میں ہمارے امتحانات کی بے حقیقتی اور یکطرفہ پن کو ملاحظہ فرمائیں ساتھ ہی اس کو مد نظر رکھیں۔ کہ یہ ممکنہ فیضِ واقعات اُن اقوام و ممالک کی تعلیمی دنیا کے ہیں۔ جو نہ صرف ہم سے تعلیم میں صدیوں آگے ہیں۔ بلکہ دورِ حاضرہ میں صحیح معنوں میں ہمارے معلم ہیں۔ اور جب اُن ائمہ تعلیم کی یہ حالت ہے۔ تو ہم جو اُن کے نام نہاد مقتدی ہیں کہاں ہوں گے۔ اس کا اندازہ آپ خود لگائیں۔

موجودہ امتحانات ذاتی قابلیت کے صحیح معیار نہیں

امتحانات کو عموماً طلباء کی علمی استعداد پر مبنی کافیۃً سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ نہایت ہی غیر صحیح آلے ثابت ہو رہے ہیں۔ اہم اس سے کہ یہ یونیورسٹیز کے بیرونی امتحانات ہوں یا مدرسوں

اور کالجوں کے اندر کوئی۔

اگر ایک لڑکے کے تذکروں کو پاجائے۔ اور دو مختلف اشخاص اس کام کو سرانجام دیں۔ اور ان میں ایک اُسے اڑھیس ایچ اور دوسرا اے اٹھاؤن ایچ بتائے تو ہم اُسے نہایت ہی مضحکہ انگیز خیال کریں گے اور یقینی طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان دونوں میں سے کس نے اس زبردست حماقت کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن کس قدر حسرتناک اور عبرت خیز بات ہے کہ ہم اپنے نوہالان وطن کی علمی استعداد کے ماپنے میں اس سے کہیں زیادہ مجرمانہ حماقتوں اور فحش خطرناک اور دور رس غلطیوں کا شب و روز ارتکاب کرتے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک تجربہ

امریکہ کی ریاستہائے متحدہ میں ایک ماہر تعلیم نے ایک امتحانی پرپے (جیو میٹری کا پرچہ تھا) کی چند نقول چربہ اتار کر کئی بڑے بڑے ہائی سکولوں کے نامی اساتذہ کے پاس ایک ایک کاپی نمبر لگانے کیلئے بھیج دی۔ کم سے کم جو نمبر دیئے گئے ۲۸ تھے اور زیادہ سے زیادہ ۹۲۔ دو اساتذہ نے ۹۰ سے اوپر انیس سے ۸۱ اور ۹۰ کے درمیان۔ چالیس نے ۷۱ اور ۸۰ کے درمیان پینتیس نے ۶۱ اور ۷۰ کے درمیان۔ چودہ نے ۵۱ اور ۶۰ کے درمیان اور چھ نے ۵۱ سے کم۔

ایک اور مضحکہ انگیز واقعہ

ایک ہیڈ اگزا میر صاحب نے جو حد درجہ اپنی ضمیر کے پابند اور عدل و انصاف قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ضمیر کی طمانیت کیلئے ایک موڈل پیپر بطور جواب خود لکھا اور اس کی متحدہ کاپیاں ایک ہی فلم سے نقل کر کر ان سب متعین کو اس غرض سے بھیجیں کہ اس کو معیار سمجھ کر نمبر لگانے جائیں غلطی سے ملازم نے اُس کی ہدایات پمیل نہ کیا اور وہ موڈل یعنی نمونہ کے پرچے امیدواروں کے پرچوں کے ساتھ مل گئے۔ اکثر اصحاب نے اُس پرچے کے لکھنے والے کو فیل کر دیا۔ اور باتوں نے ۸۰ سے ۸۰ تک مختلف نمبر دیئے۔

برطانیہ کے ایک مدرسہ کا تجربہ

ایک برطانوی درس گاہ میں ایک عنوان مضمون نویسی کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور سات طلباء نے اس طے سے آزمائی کی ایک ممتحن نے اُن پر نمبر لگائے۔ تو چالیس سے نوٹس تک مختلف نمبر دیئے۔ زناں بعد یہ ساتوں پرچے تیرہ تجربہ کار اور کہنہ مشق ہیڈ ماسٹروں کے پاس اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہ اُن کی جانچ کر نیکے بعد قابلیت کے لحاظ

سے ترتیب وار لگائیں۔ آپ پڑھ کر ہنسی گئے کہ ہر مضمون نوہیں اول دوم سوم چہارم پنجم ششم اور ہفتم نمبر پر رہا۔

ایک انگریزی کالج کے پرنسپل صاحب کا واقعہ

ایک پرنسپل صاحب کی زیر ہدایت دو طالب علم مضمون نویسی کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک انگریز تھا اور دوسرا ویلز کا رہنے والا۔ پرنسپل صاحب انگلستان کے طالب علم کے پرچہ پر تو بہت اچھا "اور ویلز دالے کے پرچے پر نہ خاصہ" کا حاشیہ چڑھایا کرتے تھے۔ گوان دونوں کے مضامین میں انہیں بیس کا فرق بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دن دونوں طالب علموں کو شرارت سوچی اور پرنسپل صاحب کی جانچ کی ٹھان لی۔ دونوں نے مضامین لکھ کر آپس میں بدل لئے اور تبدیل شدہ مضامین پر اپنے نام لکھ کر پرنسپل صاحب کی میز پر رکھ دیئے۔ لیکن جب کاپیاں واپس آئیں تو انگریز کا نام لکھے ہوئے پرچے پر نہایت ہی عمدہ "اور دوسرے پر خاصہ" کا نوٹ چڑھا ہوا تھا۔

اس قسم کے واقعات التادیر کا معدوم نہیں بلکہ روزانہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں آپ خود ہی اندازہ فرمائیں۔ کہ ہمارے امتحانات کا یہ سلسلہ واقعی ایک حقیقت ہے یا ایک سراب۔

امتحانات کو یکظم خیر باد نہیں کہا جاسکتا

امتحانات سراب سی۔ یکطرفہ سی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس سلسلہ کو یکظم بند کر دیا جاسکتا ہے؟ ان کے خلاف کتنا ہی کہا جائے۔ لیکن اس حقیقت سے ابھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ہیں نہایت ضروری انکی ضرورت اور اہمیت ایسی ہرگز نہیں کہ اس کو نظر انداز کیا جاسکے۔ ماہرین تعلیم کا متفقہ فتویٰ ہے۔ کہ ایک متغول اور منظم سلسلہ امتحانات ایک ایسا معیار ہے۔ جس پر پورا اتنا طلباء کی جدوجہد کا ایک مقصد غلطی ہے۔ اور فی الحقیقت ایک صحیح و مقررہ نمک سکول اور کالج کی چار دیواری میں رہ کر کام کرنے کی ایک زبردست تحریک

امتحانات کی کیوں ضرورت ہے؟

اس سلسلہ کی ضرورت کا نفساتی پہلو یہ ہے کہ ملازم رکھنے والا یہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کہ جس کو وہ ملازم رکھنے والا ہے۔ اور جس مقصد کے واسطے وہ اس کو لے رہا ہے اُس میں کس حد تک اپنے فرائض کی بجا آوری کی اہمیت موجود ہے۔ اور وہ اس کے مقصد کو کہاں تک پورا کر سکتا ہے۔

متعلمین کے زاویہ نگاہ سے

خود متعلمین مجبور کرتے ہیں کہ ہم نے ایک خاص مدت تک مدرسہ کی چار دیواری میں محبوس رہ کر محنت کی تھی اور اپنی عمر گزرا یہ کالیک مہمند ہر حصہ صحت کیا ہے۔ والدین کا طبع کیا ہے کاروبار کی طرح کیا ہے طبیعت کی خلاف اساتذہ کی جھڑکیاں اور چھڑیاں کھائی ہیں۔ اب ہم جب مدرسہ سے باہر نکل رہے ہیں۔ تو دنیا والے پوچھیں گے۔ کہ اتنا عرصہ کیا کیا۔ کیا قابلیت پیدا کی؟ اسلئے ضروری ہے کہ ہمارے پاس دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے کے واسطے کوئی نہ کوئی شہادت ہو کہ یہ شہادت وہ سرٹیفکیٹ ہے۔ جو درگاہ چھوڑتے وقت اس مدرسہ کا صدر عنایت کرتا ہے۔

سب مدارس کے سرٹیفکیٹ یکساں طور پر وقیع نہیں ہو سکتے

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ سارے پبلک مدارس گو وہ ایک ہی معیار اور ایک ہی نوعیت کے ہوں یکساں طور پر وقیع نہیں ہو سکتے۔ کسی درگاہ کی شہرت اچھی ہوتی ہے کسی کی بُری۔ ایک مدرسہ نیک نام ہوتا ہے۔ دوسرا غلام اس بنا پر ممکن ہے۔ جنہیں بلکہ اغلب اویقینی ہے۔ کہ ایک مدرسہ کے صدر اور اساتذہ کا دیا ہوا سرٹیفکیٹ ٹیپلک میں قابلِ قبول سمجھا جائے۔ اور اسی قسم کے دوسرے مدرسہ کے ہیڈ (جو خواہ انہی اسناد کا حامل ہو یا اُس سے بھی اعلیٰ اعلیٰ ڈگریا حاصل کئے ہوئے ہوں) کے سرٹیفکیٹ کو رُوئی کی ٹوکری کے لائق تصور کیا جائے۔

اندریں حالات ضرورت پیش آتی ہے کسی بیرونی جماعت کی۔ جو ایک عام امتحان منعقد کر کے اسناد عطا کرے۔

اعلیٰ درگاہوں کے ذمہ وار اساتذہ کے نقطہ نظر سے

اعلیٰ ادبی علمی اور صنعتی درگاہوں میں ضروری ہے کہ صرف وہ طلباء داخل کئے جائیں جو ایک خاص معیار پر پورے اترتے ہوں۔ تاکہ وہاں کی تعلیم و تربیت سے وہ کما حقہ متمتع ہو سکیں اگر داخل ہونے والے ایک معیار کے نہ ہونگے تو اُسی درگاہ کے مہملوں کا وقت اور انرجی بیکار ثابت ہوگی۔ اور داخل شدہ امیدواروں میں سے اُن کا جوہاں کی تعلیم و تربیت سے فائدہ اٹھانے کے اہل نہیں ہیں۔ وقت اور روپے کا خون ہوگا۔ اور وہ درس گاہ اُس مقصد کو پورا کرنے میں قاصر رہے گی۔ جو اس کے اجرا سے ہے محض اسلئے کہ نا اہل طلباء سب کے ساتھ نہ چل سکیں اور لائق اور قابلِ طلباء کیلئے بھی سنگ راہ ثابت ہوں گے۔ اس لئے بھی ضروری ہے۔ کہ امتحانات منعقد کئے جائیں۔

طلباء اپنی قابلیت کا اندازہ لگا سکیں

ایک امر اور بھی ہے کہ جو امتحانات کی ضرورت پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ طلباء اندازہ لگا سکیں کہ اُن کی علمیت اور ذاتی قابلیت میں کیا اضافہ ہوا ہے نیز یہ کہ وہ اپنے آپ کو انہی نظروں سے دیکھ سکیں۔ جن سے کہ لوگ انہیں دیکھتے ہیں۔ طلباء مختلف المراجح ہوتے ہیں بعض کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ لائق سمجھتے ہیں اور ایک ایسی تباہ کن غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جو یقیناً آخر میں لاعلاج ہو جاتی ہے اسلئے کہ

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند

و دہل مرکب ابد الدھر بماند

اسلئے بھی امتحانات ضروری ہیں کہ طالب علم اپنی قابلیت کے متعلق صحیح صحیح اندازہ لگائیں۔ اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی تباہی خیز غلطی کا ارتکاب نہ کرے۔

بعض طلباء اپنی قابلیت کا اندازہ لگانے میں کمی کی طرف غلطی کرتے ہیں۔ اس صورت میں امتحانات یہ نائدہ دیتے ہیں۔ کہ جو طلباء اپنے آپ کو ناکارہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے اس غلط خیال کو اُن کے دل سے محو کر کے انہیں آمادہ کار کرتے ہیں۔

اساتذہ اپنی کارکردگی کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں

اساتذہ کیلئے بھی اس باب میں امتحانات نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ امتحان کے نتائج کی بنا پر وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ علمی مسائل طلباء کے ذہن نشین کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کوئی غلط فہمی تو طلباء کو اس سلسلہ میں نہیں ہوتی۔ انکی روشنی میں طریقہ تعلیم کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

باہمی مقابلہ اور رشک

ایک اور عرض جو حامیان سلسلہ اس سے پوری ہونے کے مدعی ہیں وہ یہ ہے کہ طلباء میں باہمی مقابلہ کے خیال سے رشک پیدا ہوتا ہے۔ جو علمی ترقی اور آمادہ کار کرنے کا ایک بڑا کفیل ہے۔ رشک کا مادہ ہماری فطرت کی گہرائیوں میں مرکوز ہے اور ذرا سی تحریک سے یہ کام کرنے لگتا ہے۔ اسلئے جب امتحان کا نام سُنتے ہیں۔ تو رات کو ایسپ کی روشنی میں داؤ پیچ سے تیار ہو کر امتحان کے اکھاڑے میں خم شوک کر آتے ہیں۔ عموماً علم

اشتعال نائرہ رشک میں کافی سے زیادہ مہنک ہیں۔ لیکن یہ ہے نہایت حزم احتیاط کا منقضی اور اسی وجہ سے جب طلباء کے دلوں میں ایک دوسرے سے گئے سبقت لیجانے کا مادہ نہایت زوروں سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ محض اس بنا پر میدان کارزار میں آکر مصروف کار ہوتے ہیں۔ تو اخلاق کا معلم دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے ہوئے لنگھکیوں سے اُن کو دیکھتا رہتا ہے۔

آیا امتحانات خود اعتباری کا مادہ طلباء میں پیدا کرتے ہیں؟

[illegible]

علاوہ اس کے کہ روزانہ صد ہا نہیں ہزار ہا واقعات اس خیال کی تخلیق کرتے ہیں۔ نفسیات کا وہ مسئلہ جو اس کی بنیاد ہے۔ مرد و دو متروک قرار دیا جا چکا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ جس شخص میں خود اعتباری کا مادہ پہلے سے موجود ہو۔ اور اس کی مناسب تربیت بھی کی جائے۔ وہ جس طرح کہ امتحان گاہ میں حواس بافتہ نہ ہو کر دنیا کے حوادث میں بھی دلچسپی قائم رکھ سکے۔ لیکن یہ کہنا کہ چونکہ ایک طالب علم امتحان کے ہال میں اطمینان اور سکون سے کام کرتا ہے بعض اسی وجہ سے وہ امتحان گاہ دنیا میں بھی حادثات اور نازک مواقع پر بھی ہمت نہ ہار گیا۔ اور حوصلہ کو ہاتھ سے نہ دیگا۔ مبالغہ سے خالی نہیں۔

مندرجہ بالا اغراض و مقاصد ہرگز ایسے نہیں جو امتحانات کو لابی اور ضروری قرار نہ دیتے ہوں اس لئے یہ لازم ہوا کہ جو نقائص اور خرابیاں ہمارے نظام امتحانات میں ہیں۔ اُن کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔

امتحانات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیکاتی ہے

جملہ خرابیوں کی جڑ یہ خیال ہے کہ امتحان کی کامیابی اصل مقصد تعلیم و تعلم ہے۔ اصل الاصول یہ ہے کہ امتحان اس مقصد کے حصول کا ایک وسیلہ ہے۔ مثلاً ایک سو ایک دیگر وسائل کے جو تعلیم کا ہونا چاہیئے۔ اور فی نفسہ وہ مقصد تعلیم نہیں ہے۔

ہمارے اساتذہ و تلامذہ اسی غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ کہ کام ہی اس وجہ سے کیا جائے کہ امتحان میں کامیابی حاصل ہو۔ نہ کہ امتحان اسلئے ہے کہ کام بوجہ احسن انجام پائے۔

اس خطرناک غلط فہمی کے شکار نہ صرف اساتذہ و طلباء ہی ہو رہے ہیں بلکہ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے۔ تو تمام دنیا ہی اس میں مبتلا ہے۔ دفاتر کے نگران۔ محکموں کے اعلیٰ افسر اور فرموں کے منیجر وغیرہ وغیرہ امتحان کی کامیابی کو ہی واحد معیار قابلیت سمجھ بیٹھے ہیں۔

امتحانات طلباء کے چال چلن کے متعلق کچھ نہیں بتاتے

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرٹیفکیٹ کوئی شے ہے اور اس کا حامل اسکی ایک خاص حد تک وقیع ہے۔ لیکن یہ امر کہ چونکہ حامل سند ہڈانے انگریزی۔ ریاضی۔ اردو۔ فارسی۔ سائنس۔ اور علوم عامہ میں چالیس فیصدی سے لے کر نوے فیصدی تک نمبر حاصل کئے ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ یہ عملی زندگی میں بھی خاطر خواہ اپنے مفوضہ فرائض کی بجا آوری کر سکیگا۔ قابل قبول نہیں۔ ہمیں صرف اس کی ضرورت نہیں کہ سند یافتہ امیدوار کیا کیا جانتا ہے؟ بلکہ بڑی ضرورت اس کی ہے کہ متحن یہ بتائیں کہ وہ کیا کیا کر سکتا ہے؟

متحن یہ نہیں بتا سکتے کہ آیا اُن کا امیدوار صادق القول اور متدین ہے۔ یا نہیں؟ اس میں مستقل مزاجی عالی حوصلگی۔ اور وفاداری وغیرہ صفات موجود ہیں کہ نہیں آیا اُس میں اپنے ہم منصبوں کے ساتھ ملکہ کام کرنے کی قابلیت پائی جاتی ہے کہ نہیں۔ تاریخ میں اعلیٰ نمبر حاصل کرنا اس امر کا ثبوت نہیں۔ کہ دیگر اشخاص کے رویہ اور چال چلن اور عادات و خصائل کے متعلق اُس کا اندازہ صحیح بھی ہے۔ علم ہندسہ میں امتحانی کامیابی حاصل کرنے والیکے متعلق یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ عملی زندگی میں بھی اُس کا اندازہ اتنا ہی نیا نکلا ہوگا۔

رکن کا کیا اچھا مقولہ ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ طلباء کو جی ششیا کا علم نہ ہو اُن کا علم اُسے حاصل ہونے بلکہ یہ بھی ہے کہ جو رویہ جو سلوک۔ ان کا خدا کی دیگر مخلوق کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ وہی ہو بھی اور انہیں معلوم بھی ہو کہ اُن کا اس باب میں کیا فرض ہے؟

امتحانات اصل ذاتی قابلیت کی جانچ نہیں ہیں

اخلاق کی جانچ تو ہمارا موجودہ نظام امتحانات اصلاً نہیں کرتا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ذہنی اور دماغی قابلیت کا کس حد تک اُن سے پتہ چلتا ہے۔ یہ ستم بات ہے۔ کہ طالب علم کی اصل قابلیت ہے۔ کہ جو کچھ اُس نے مدرسہ کی چار دیواری میں تحصیل کیا ہے اس کو وہ کہاں تک استعمال میں لاسکتا ہے۔ بڑے بوڑھوں میں ایک مقولہ رائج ہے۔ کہ فسادات شخص پڑھ تو گیا۔ لیکن وہ گن نہیں۔ ان کا مطلب ”گننے سے یہ ہوتا ہے کہ اس کو محض کتابی علم ہے لیکن اس کو وہ اپنے کسی مصرف میں نہیں لاسکتا اور اسی کو شیخ نشیر از در چار پائے بروکتا ہے چند سے تعبیر کرتے ہیں۔

امتحان میں صرف حافظہ کی پوچھ ہے

موجودہ نظام امتحانات سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ واقعی ہمارے امتحانات اسی قسم کے ہیں۔ کہ ان کی تیاری کرنے والے طلبا صرف پڑھیں اور گڑھیں نہیں۔ ہمارے امتحانات اور معتمنین پریشاں بالکل صادق آتی ہے۔ ”دگو یا اُن کا یہ مقصد ہے کہ بھیدوں کو گھاس وغیرہ کھلانے کے بعد اُن سے گڈریا یہ توقع رکھے کہ وہ بجنسہ وہی گھاس جو انہوں نے چری چکی تھی اُسے دیں۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کے بدلہ میں اُون اور دودھ کی ایسی بیش بہا نعمتوں سے اس کو مالا مال کریں۔“

بالکل یہی حال ہمارے معتمنین کا ہے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں۔ کہ جب کچھ مدرسہ میں طلبا نے پڑھا ہے۔ کہ امتحانات میں وہ اُس کو کاغذ پر لکھ دیں۔ تو اُسے ذہنی کی تربیت یا تو اُسے آفہ ستلا لیکر نکالیں ہرگز ہرگز ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ اُن کا مقصد محض قوت حافظہ کی جانچ ہوتا ہے اور بس۔

ایک مثال

مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں۔ کہ ایک ہی جماعت کے دو طلبا شریک امتحان ہوتے ہیں۔ اُن میں ایک نہایت ہی طباع ذکی اور معتمنی ہے۔ لیکن دوسرا قابلیت اور لیاقت میں اس کا پاسنگ بھی نہیں۔ ہاں صرف اتنا ضرور ہے۔ کہ وہ گریڈ پر کہ جماعت کے ساتھ چل رہا ہے۔ اتفاقاً ایک دن اول الذکر بوجہ بیماری مدرسے سے غیر حاضر رہنے پر مجبور ہوا۔ اور اس روز اُس استاد نے جماعت میں اکبر کی پالیسی پر سبق پڑھایا اور موخر الذکر نے اس معنی سنکر اور نوٹ لیکر خوب یاد کر لیا۔ اور کوشش یہ کی کہ جہاں تک ممکن ہوا استاد ہی کے الفاظ اور خیالات کو قلب بند کے دماغ میں مستحضر رکھے۔ لیکن غیر حاضر طالب علم نے مین کا عنوان معلوم کر کے دو چار تواریخ کی کتابوں سے

اخذ کر کے اپنے ذاتی خیالات اور اے اکبر کی پالیسی کے متعلق اپنے الفاظ میں قلمبندی ۔

دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ یہی سوال امتحان میں پوچھا گیا۔ اور دونوں نے اس کا جواب دیا۔ -----
لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ اس طالب علم کو نمبر کم ملے گی جس نے وسعت مطالعہ، دائمی کلاوش اور قوت استدلال سے کام لیکر تاریخی واقعات سے نتائج اخذ کئے تھے۔ اور وہ طالب علم کہ جس نے محض اُستاد کے الفاظ اور خیالات کو رٹ لیا تھا۔ اُس سے بڑھ جائیگا۔

تھڑنگ کی رائے

مشہور ماہر تعلیم *The Ring* اس مضمون پر رقطراز ہے کہ ”طلبا امتحان میں محض آتش بازیوں بھڑاتے ہیں۔ جو دوسروں نے اُن کو تیار کر کے دیدی ہیں۔ اور محض حافظہ سے کلام لیتے ہیں۔ امتحان میں کسی مضمون کی اہمیت اس امر سے سمجھنی چاہیئے۔ کہ وہ طلباء کے قوائے و ماعنی کی کہاں تک جانچ کرتا ہے۔ مدرسہ کا مطلب طلباء کی تربیت ہوتا ہے۔ اسلئے امتحانات کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اُس تربیت کی جانچ کریں جو مدرسہ کی چار دیواری میں طالب علم کو ملی ہے۔ ضمنتاً یہ مقصد بھی ہوتا ہے۔ کہ طلباء کو کام کرنے کی تحریک ہو اور اساتذہ اندازہ لگا سکیں کہ ان کی سعی صواب کی جانب ہے یا نہ؟“

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے امتحانات زیادہ تر حافظہ کی جانچ کتے ہیں۔ اور طلباء کو مجبور کرتے ہیں۔ کہ وہ سوچنے اور سمجھنے کی جگہ طے کی طرح مضامین کی رٹ لگائیں۔ طلباء بھی اُس کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ جن امتحانات میں وہ شریک ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیت کیا ہے۔ اس لئے وہ بھی متنبین کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ صرف وہ مقامات رٹ لیتے ہیں۔ جنکے امتحان میں پوچھے جانے کی امید زیادہ ہوتی ہے۔ سالہائے گذشتہ کے بچوں کو سامنے رکھو وہ اندازہ لگاتے ہیں کہ کس قسم کے سوالات امتحانات میں اغلب ہیں۔

زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہم اساتذہ بھی طلباء کو اس ”جوئے“ میں امداد دیتے ہیں۔ ہم طلباء کو ”مشہور مقامات“ پر نشان لگواتے ہیں۔ انکو رٹواتے ہیں اور بس۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر طلباء ہر سال امتحان کے کمرہ میں سے سر بیٹھے نکلتے ہیں کہ ”ٹائپ ہی پرچہ کاشیا تھا“ سوال
 ہی بالکل نئی طرح کے تھے“

ہوتا کیا ہے کہ جب دو چار سال ایک ڈگر پر چلتے چلتے متعین کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب طلبہ کے چہرے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ وہ صرف اُن مقامات یا اُس طرز کے سوالات کو رستے ہیں۔ جو سالہائے گذشتہ میں پوچھے جاتے رہے ہیں۔ تو وہ اپنے طرز کو بدل دیتے ہیں۔

تعلیم کے نئے نظریے اور جدید طرق تعلیم

نتائج امتحان کی ذمہ داری اساتذہ پر ایک اور بڑا اثر ڈال رہی ہے جس کی وجہ سے ہماری ترقی تعلیم کی رفتار مسدود ہے۔ محکمہ درس کو امداد دیتے وقت یہ ضرور پوچھتا ہے۔ کہ نتیجہ فیصدی کیا رہا؟ مزید برآں افسران معائنہ کے امتحان اور معائنہ کا خوف اس پر تازیا نہ ہے۔ جو نئے جذبات نے ٹرینڈ اساتذہ لیکہ آتے ہیں۔ وہ ان دونوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

کسی استاد سے آپ کہیں کہ بھی آپ یہ وہ طریقہ تعلیم کیوں نہیں برتتے؟ جو طریقے تعلیم کے نئے نئے رائج ہو رہے ہیں۔ آپ اُن کے مطابق کیوں تعلیم نہیں دیتے؟ جواب ملتا ہے کہ صاحب وہ ”امتحان“ میں کام نہیں آتے۔

اور تو اور پرائمری بچوں کو لیجئے وہ غریب بھی امتحان کے بوجھ میں دبے جاتے ہیں۔ درجہ پرائمری میں ضرورت تو اس امر کی ہے کہ طالب علم کی شخصیت کی تربیت کی جائے۔ اس کے نہ صرف دماغ بلکہ جسم کی بھی تربیت کی اس درجہ میں بدرجہ اولیٰ ضرورت ہے۔ لیکن برائے العین ملاحظہ کیجئے ان غریبوں کو کمی تعڑھ ٹکے اور ڈنڈے سے اسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر اصحاب کی رضا جوئی کے واسطے ”مدد صافا“ پڑتا ہے۔

ہمارے امتحانات انفرادیت کی جڑیں کاٹتے ہیں۔

سب سے بڑی خرابی ہمارے موجودہ نظام امتحانات میں یہ ہے کہ وہ طلبہ کے فطری رجحانات کو فنا کرتے ہیں۔ تعلیمی دنیا کا جدید اہم ترین اصول یہ ہے کہ طالب علم صرف ساعت مہول کیلئے نہیں ہے بلکہ اس کی توت کار پر زیادہ تر اس کی تعلیم کا بار ڈالنا چاہیئے۔ معلم کے واسطے ضروری ہے کہ طلبہ کے طبعی رجحان کا پتہ چلا کر اس کی تربیت کرے کیونکہ ”ہر ایکے راہر کارے ساختند“ کے مطابق دنیا کی ترقی میں ہر فرد بشر کا حصہ ہے۔ اور اس میں ہری اس کی تخلیق کا موجب ہے۔ کہ وہ اپنی ذات سے کچھ نہ کچھ فائدہ دنیا اور دنیا والوں کو پہنچائے اور اسی بنا پر تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا جاتا ہے کہ انفرادیت کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ خود طالب علم کی ذات کو اور اس کی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بنی آدم کو پہنچ سکے۔

لیکن غور سے دیکھئے کہ ہم قدرت کے خلاف آمادہ پیکار ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک طالب علم کا طبعی رجحان ادب کی طرف ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ اس کے اس ذوق کی تربیت کرے۔ اگر اور طلبہ اس میں دو گھنے طرف کرتے ہیں۔ تو اسے مشورہ دے کہ اس میں چار گھنے صرف کرے۔ اس میں اعلیٰ لٹریچر کا مذاق سلیم پیدا کرنے کی کوشش

کرے۔ اویوں کے شامکارے اس کے سامنے رکھے۔ لائبریری کی ادبی کتابوں میں اسے چھوڑ دے۔ تاکہ وہ خود مختار نہ پڑے اور لٹریچر میں فرد فرید بنے لیکن اس کو خلاف ہم کرتے کیا ہیں۔ کہ اُسے منع کرتے ہیں۔ کہ کبھی تم زبانی میں تو پاس ہی ہو گے۔ تم بفضل خدا اس میں اچھے ہو نہیں فکر کرتی چاہیے حساب کی۔ زبانوں پر تم بالکل محنت کرو۔ ان میں وقت ضائع نہ کرو۔ حساب کرو۔ ورنہ تم فیل ہو جاؤ گے۔ حساب سے چمکے اس غریب کو س نہیں ہے۔ اسلئے اس پر اس کی محنت بالکل اکارت جانی ضروری ہے۔ اور جس مضمون میں وہ فطرتی سیلان کی بدولت وحید العصر بن سکتا ہے۔ اس کو استاد صاحب نے امتحان کی بجھٹ چڑھا دیا۔ نہیں بلکہ چڑھانے پر مجبور ہوئے۔

ہمارے کلج

ہمارے کلج اور یونیورسٹیاں جو محض نظریوں کی بنا پر اپنا مقصد غلطی۔ ”تجسس“ (Research) بتاتے ہیں اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ اور بالکل صحیح معنی میں ہیکارگنڈ کو بیٹ بنانے کی مشینیں بنے ہوئے ہیں شاید الا ماشاء اللہ صورتوں ہی میں وہ کوئی صحیح مذاق طلبا میں پیدا کرتے ہوں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے محققین کے شاہکار محض امتحان کے نصاب میں داخل ہونے کی بنا پر اپنی دلچسپی کھو دیتے ہیں۔ اور دلچسپی کھونٹا کیا معنی ایک کی منافرت طلبا میں پیدا کر دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا واقعات و حقائق اس امر کے مقتضی ہیں کہ امتحانات کو حد سے زیادہ اہمیت نہ دیکائے۔ تعلیمی دنیا سے باہر کے نگران محض امتحان میں کامیاب ہو جانے کو معیار نہ رکھیں۔ طلبا امتحان کی کامیابی کو ہی طمع نظر نہ بنائیں۔ اساتذہ امتحان کی فکر ہی میں نہ رہیں۔ بلکہ اصل مقصد طلبا کی انفرادیت کی تعمیر قرار دیں۔ محکمہ تعلیم محض فیصدی نتیجہ کے گز سے ہی درسگاہوں کو نہ ناپے

امتحانی سوالات

دوسری خرابی جو ہمارے امتحانات کے نظام کو بیکار بنا رہی ہے اور ایک انقلاب کی مقتضی ہے۔ وہ ہمارے امتحان کے سوالات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ آج کل اس قسم کے سوالات نہیں پوچھے جاتے۔ جن کے متعلق سٹراٹونٹ Rayson پروفیسر تعلیمات نے اپنی تصنیف ”اصول تعلیم“ میں تعریف کے طور پر water babies کے چند نفرد کو نقل کیا ہے۔ جو ناظرین کی ضیافت طبع کے وسط ورج کرتا ہوں:-

ایک چلا یا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ جو کس طرح نکالو گے ؟

دوسرا چلا یا۔ کیا تم بتا سکتے ہو — اور — کے درمیان کتنا فاصلہ ہے ؟ (.....)

دو ایسے مقامات کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو نہایت ہی غیر معروف ہیں)

تیسرا چلا یا۔ اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ کے جو پندرہ چار اذبحائی تھے۔ ان میں سے تیرھویں کی وادی کی خادسہ کی بلی کا کیا نام تھا ؟

چوتھا۔ اچھا بتاؤ کہ ایک معمولی رفتار کا سکول انسپکٹر لندن سے یارک تک اگر آفت کا مارا اپیدل چلے تو کیا وقت صرف ہوگا ؟

ایک تماشائی اچھا اگر ان سوالات کے جواب دے بھی دیئے جائیں۔ تو فائدہ کیا ہوگا ؟

فائدہ کیا معنی امتحان جو سر پر آ رہا ہے

تاہم اب بھی بعض خرابیاں ہمارے سوالات میں ایسی ہیں۔ جنکی بنا پر امتحانات بے بنیاد ثابت ہو رہے ہیں۔ جن کی مثالیں ہم نے مضمون کی ابتدا میں درج کر دی ہیں۔ اس خرابی کو رفع کرنے کے سلسلہ میں ماہرین تعلیم نئی قسم کے سوالات کو رائج کر رہے ہیں۔ جن کو آجکل *معلقہ معامات* کے نام سے نامزد کیا تھا۔ اور جن کو اول اول ۱۹۰۵ء میں ایلفرڈ ہینٹ (*Alfred Hent*) نے استعمال کیا۔

ان کی تہ میں یہ نیا اصول کام کر رہا ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ چند سوالات ایسے دیئے جائیں۔ جنکے لیے جوابات مضمون کی شکل میں طلبہ کو لکھنے پڑیں۔ ایسے سوالات پوچھے جائیں۔ کہ جنکا جواب دہنی ہو۔ لیکن وہ طلبہ اس کی ذہنیت اور فہم و فراست کی صحیح صحیح جانچ کر سکیں۔

ان سوالات کی چند اقسام ہیں۔ ہم ہر ایک کے تحت میں چند سوالات درج کرتے ہیں۔ تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ان کی نوعیت کیا ہے۔

اول غلط صحیح کا اندازہ۔

مندرجہ ذیل بیانات میں سے بعض صحیح ہیں۔ بعض غلط۔ اگر کوئی بیان بتامام صحیح ہے تو اس کے مقابل میں صں لکھو۔ اور اگر کوئی بیان تمام کا تمام یا اس کا کوئی حصہ غلط ہے تو غ لکھو

(۱) ہندوستان سارے کا سارا سلطان اور خطہ ہدی کے درمیان واقع ہے۔

(۲) کراچی کی آبادی آئندہ پچاس سال میں بھی کی نسبت زیادہ فیصدی بڑھ جائیگی۔

(۳) پنجاب کی آب و ہوا میں موسموں کے تغیر و تبدل کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ بنسبت مدراس کے۔

(۴) سیوا جی کی کالیانی کار از عیاری اور فریب کاری میں مضرت تھا۔

(۵) عہد اکبری میں مذہبی پیشواؤں کا اقتدار زیادہ ہو گیا تھا۔

(۶) سلطنت مغلیہ کو تیمور کے حملہ سے بہت بڑی زک پہنچی۔

آئندہ فاقروں کی تکمیل کیلئے خطوط وحدانی ولے الفاظ میں سے کوئی ایک ایسا چھانو جو اس فقرہ کو صحیح

بنادے۔

(۱) اشوک اعظم نے (برہمن مت - چین مت - بدھ مت) کی سرپرستی کی۔

(۲) ساہو کو (اورنگ زیب - بہادر شاہ - زیب النساء) نے رها کر دیا۔

(۳) غدر ۱۸۵۷ء (دہلی - میرٹھ - کانپور) سے شروع ہوا۔

مندرجہ ذیل میں سے غلط کے مقابل میں X کا نشان بنا دو۔

محمود غزنوی ۱۰۰۰ء

غوری خاندان عروج پر تھا ۱۰۰۰ء

علاء الدین خلجی ۱۲۰۰ء

خاندان غلامان کا پہلا بادشاہ ۱۳۰۰ء

دوم صحیح جواب کا انتخاب :- فقروں کو صحیح بنانے کے واسطے مناسب ترین الفاظ کا انتخاب کرو۔

(۱) مدراس میں زیادہ تر بارش (بہار خزاں - گرمی - سردی) کے موسم میں ہوتی ہے۔

(۲) اوسطاً سالانہ بارش سندھ میں تقریباً (۸ - ۲۵ - ۴۰ - ۶۰) انچ ہوتی ہے۔

(۳) آبپاشی کے واسطے بہترین دریا (برہم پتر - سندھ - ایراودی - کاویری - گنگا) ہے۔

(۴) دکن کے اکثر دریا (شمال - جنوب - مغرب - مشرق) کی طرف بہتے ہیں۔

(۵) کوہ ہمالیہ کی چوٹیاں برٹ سے ڈھکی رہتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے ۰۰۰۰۰۰۰۰

دو قطب شمالی سے زیادہ نزدیک ہیں۔ بہت بلند ہیں۔ ان پر بہت زیادہ بارش ہوتی ہے۔ تیخ کے تو دے

انہیں ٹھنڈا رکھتے ہیں)۔

سوم فقروں کی تکمیل :- نیچے دیے ہوئے فقرات کی تکمیل کرو۔

اول اول انگریز ہندوستان میں لٹورہ آئے۔ اور انہوں نے ۱۷۵۷ء بنائی۔ برطانوی راج

کی بنیاد ہندوستان میں نے ڈالی جس نے کہ سے انتقام لینے کے واسطے۔

(۲) ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔

(۳) زیادہ تر کلکتہ سے باہر جاتی ہے۔

(۴) گو..... ہندوستان کا ایک صوبہ ہے لیکن دراصل یہ جزیرہ نما ہند چینی کا ایک حصہ ہے۔
(۵) ہندوستان کی بڑی بڑی بندرگاہیں..... اور..... ہیں۔

مندرجہ ذیل واقعات کب وقوع پذیر ہوئے۔

آرمیڈہ کی شکست۔ امریکہ کی دریافت۔ جنگ پلاسی۔ الطاق پنجاب۔ پانی پت کی پہلی لڑائی۔
(۱۴۹۲-۱۵۲۶-۱۵۸۸-۱۷۵۷-۱۸۴۹-۱۸۵۷)

مندرجہ ذیل تاریخی واقعات کے متعلق ایک فرضی مکالمہ یا خط لکھو۔
(۱) محمد غوری کو بے چند کا بلانا۔

(۲) محمد غوری کا اپنے سپاہیوں کو غیرت دلانا۔

(۳) سوالات ٹیپنگ کے گزشتہ دو سال کے مختلف پرچوں میں اخذ کئے گئے ہیں۔
اوپر درج کئے ہوئے سوالوں کو بغور پڑھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اُن کو قدیم سوالات پر بدیں وجوہ تفوق حاصل کر
(۱) طلباء کو نہایت مختصر مگر خوب سوچ سمجھ کر جواب دینے پڑتے ہیں۔

(۲) اُن کی جانچ کرنے کے واسطے زیادہ وقت درکار نہیں۔

(۳) متعین نمک کر طلباء پر ظلم نہیں کر سکتے۔

(۴) متعین اپنی ذاتی رائے یا رجحان کی مخالفت کی بنا پر طلباء کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

طلباء صرف ایک ہی معیار پر پرکھے جاسکیں گے۔ اس لئے وہ خطرناک اور مضحکہ خیز غلطیاں نہ ہو سکیں گی
جن کا تذکرہ آغاز مضمون میں کیا گیا ہے۔

ممتحن اساتذہ ہونے ضروری ہیں

اوپر ضابطہ بتایا جا چکا ہے کہ ایک بڑی حد تک ہمارے امتحانات مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ سوالات
قابلیت اور محنت سے بنائے گئے ہوں۔ ممتحن کو یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ نہ صرف طلباء کی قابلیت اور علمیت
کی جانچ کر رہا ہے۔ بلکہ ایک حد تک اپنے اوپر ذمہ داری لے رہا ہے۔ کہ آئندہ طلباء کو کس طرح تعلیم دیا جائے۔
نیز یہ کہ اُس کے ذمہ اساتذہ کی رہنمائی کی اہم ذمہ داری رکھ دی گئی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سوالات کا پرچہ
بناتے وقت ہر سوال پر ممتحن اپنے دل میں یہ سوچے کہ

آیا اس سوال سے طریقہ تعلیم پر اچھا اثر پڑیگا؟

آیا اس سوال سے اساتذہ کو تحریک ہوگی کہ وہ مناسب مواد مناسب طور پر طلباء کے دماغوں میں محفوظ رکھیں۔

آیا اس سوال کو پورے طور پر طلباء سمجھ سکیں گے اور یہ اُن کے دماغی ارتقا کی۔ اُس منزل کے مطابق ہے۔ جس میں سے وہ گزر رہے ہیں۔

لیکن اب سوال پیدا ہونا ہے کہ آیا وہ اعلیٰ تعلیمی اور ادبی قابلیتوں کے مالک اور اعلیٰ اعلیٰ اسنادوں کے حامل جنکو پروفیسر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ طلبائے سکول کی نفسیات کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں۔ آیا وہ براہ راست اُن طلباء کی ذاتی اہلیت سے واقف ہیں۔ جن کی کلیہوں پر وہ بے دردی سے سرخ نیلی پینسل سے X کے نشان بناتے چلے جاتے ہیں یا آیا اُس کو اوسط درجہ کے طلباء یا کم درجہ کے طلباء سے کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے جو ہمیشہ اپنی جماعت میں اول نمبر پر رہا ہو؟ آیا وہ شخص ایک مفید ممتحن بن سکتا ہے جس کو جدید طریق تعلیم سے مطلق کوئی واسطہ نہ ہو۔ اور جس کو صرف وہ فزودہ اور چھاننا طریقہ تعلیم ہی یاد ہو۔ جو کہ اُس کے اساتذہ نے کم از کم ایک چوتھائی صدی پہلے پڑھایا تھا۔ آیا اُس سے پیامید کیا سکتی ہے کہ وہ ایسے سوالات بنا سکتا ہے جو اساتذہ کے طریقہ تعلیم پر اچھا اثر ڈالیں۔ اور اُن کی رہنمائی کرے۔ اُن کا جواب بلا خوف تردد نہیں۔ برگر نہیں، کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

جب یہ حالات ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہائی سکول کے آخری امتحان میں ممتحنین کی زیادہ تعداد اساتذہ ہائی سکول ہی کی ہونی چاہیے؟

اتفاقی تباہ کن غلطیوں کی روک تھام

بعض مرتبہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہوشیار سے ہوشیار طالب علم محض کسی سو اتفاق سے ناکام ہوتا ہے ایک نکتہ کا حسن اتفاق سے کامیاب طلباء کی صفِ اول میں لا کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ خود راقم کے ہائی سکول کی طاعتی کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ چوٹی کا لڑکا ناکام رہا۔ حیرت ہوئی پہلے دوبارہ دیکھو لڑکے کامیاب نکلا۔ اور شکر ہے کہ یونیورسٹی نے اس کے بعد اُس کے متعلق کامیابی کا اعلان بھی کر دیا۔ لیکن اُسے خزش قسمتی ہی سمجھے ورنہ اکثر ایسا نہیں ہوتا۔

اس قسم کی اتفاقی تباہ کن غلطیوں کی روک تھام کیلئے بعض یونیورسٹیوں نے بی طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ سالانہ کے بعد ذرا تمام مدارس کے ہیڈ ماسٹروں سے ایک ایسا نقشہ منگواتے ہیں۔ جس میں ہر طالب علم کے سکول کے ماہی ششما ہی امتحانات کے نمبر درج ہوتے ہیں۔ اور ہر مضمون کے مقابل میں نوٹ دوانے ہیں کہ آیا اس میں پاس ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ بی طریقہ اگر بعض قباحتوں کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے۔ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

رباعیات

(صوفی غلام مصطفیٰ صاحب نقشبتمائے ایم اے)

(۱) خروئی آرزو کا شکر اکرنا
ہر رنج میں اور رنج پیدا کرنا
جب بحرِ المہم میں ڈوبتا ہوا انسان
اندیشہ چاہتا ہے بھروسہ کرنا

(۲) دیکھو دیکھو کبھی درازی دیکھو
دیکھو دیکھو کبھی گدازی دیکھو
دیکھو دیکھو کبھی الم کی جاں گدازی دیکھو
دیکھو دیکھو کبھی ازبندی میری
اور اس چشم اپنی بسبب زنی دیکھو

(۳) ہر رنج کہن کو بھول جانا دیکھو
ہر تازہ خوشی سے لو لگنا دیکھو
جب درد سے چاک چاک ہو جائے دل
ماندگی سے کسے لانا دیکھو

(۴) جو رنج تم فراق سے نہا لیا
اور بے غم سے حال دل نہا لیا
غفلت کا طعشہ وہ جو پیش فرمایا
بیدار ہونے سے نہا لیا

خیالاتِ عالیہ

(حضرت عظامی صاحب مدظلہ)

آنکہ آہور انجیر چشم صبا و من است و آنکہ بخشہ جوہر جان تیغ جلا و من است
 لے دل در آشنا از آہ و نالہ ہا چہ شود آنچہ اورا بر سر قہر آورد واد و من است
 آفتاب روزِ محشر تا ہمارہ تہائے خویش سایہ پروردِ غدا راں پری نادر و من است
 پائے دیوارِ جوہر گریہ پیسہم بر سخت این تصر فہمائے چشم قلم آباد و من است
 شکوہ افلاک گفتن شیوہ فرسودہ است آسمان را شکوہ پیمیا کردن ایجا و من است
 خوں کند صد نالہ چشم گزینش و قتل آں چہ منون فغانہا نیست فیاد و من است
 مے خورم دشنہ بدشہ نہ خصت فی بادیت داد واد آں صنم فریاد و من است

پابجولاں سرخف عشاق برسویب نو
 آنکہ مے آید عظامی سر آزاد و من است

معلم اور متعلم

(جناب سوڈھی جگت سنگھ صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس امرتسر)

تعلیم کا آغاز بچپن ہی سے ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بچوں کو جس وضع قطع اور عادت کا بنانا چاہیں۔ بنا سکتے ہیں۔ وہ اس عمر میں نہایت نرم ہوتے ہیں۔ جس سانچے میں چاہو ڈھال دو۔ مٹی نرم اور پگھلی ہی چاک پر چڑھا کر برتن بنائے جاتے ہیں۔ ایک مشہور پروفیسر کا قول ہے۔ کہ بچہ چھ سال کی عمر تک جس قدر علم حاصل کرتا ہے۔ وہ مقدور میں اس تعلیم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو ایک گز بچوٹ اپنی تمام تعلیم یونیورسٹی کے دوران میں سیکھ سکتا ہے۔ بچہ پانچ چھ سال تک وہ تمام تاثرات حاصل کر لیتا ہے۔ جن کو بعد کی زندگی میں وہ اچھے معطلوں کی زیر نگرانی تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

ولایت میں بچہ چھ سال کی عمر سے پہلے پہلے انفٹ سکول یا کنڈرگارٹن سکول میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ ایسی تعلیم کے واسطے استانیائیں مقرر ہوتی ہیں۔ جو نرسز کا کام سیکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور اس عرصہ میں تعلیم میل کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ مگر ہمارے ملک میں چھ سال تک بچے آوارہ گردی میں مصروف رہتے ہیں۔ اور گلی کوچوں میں مارے مارے سیہودہ حرکات سیکھ جاتے ہیں۔ جو تمام عمران کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ضروری ہے کہ اس ملک میں بھی چھ سال سے کم عمر کے بچوں کے واسطے استانیوں کے زیر اہتمام مدارس جاری کئے جائیں۔ جہاں میل کے ذریعہ کنڈرگارٹن کے طور پر تعلیم دی جائے۔

بچوں کی فرصت کا زمانہ خاص طویل نہیں ہوتا۔ عام طور پر پندرہ سولہ سال تک زیادہ سے زیادہ اُن کی تعلیم کا زمانہ ہوتا ہے۔ سب سے ضروری غور طلب امر یہ ہے کہ بچوں کی جسمانی اور ذہنی تربیت کس طریقہ ہونی چاہئے۔ ہمیں اگر اچھا سوٹ سِلانا ہوتا ہے۔ تو اعلیٰ سے اعلیٰ درزی کی تلاش کرتے ہیں۔ مگر بچوں کی تعلیم کیسے چاہئے؟ ہمیں کل قوم کا لیڈر بننا ہے۔ ہمارے پاس وقت نہیں۔ روپیہ نہیں۔ ہم توجہ نہیں دیکھتے۔ بڑوں کی تعلیم کا سارا دار و مدار معلم پر ہے۔ اور معلم میں ان باقوں کا ہونا ضروری ہے۔ کہ اس کا سیلان طبیعت اس بچہ کی طرف ایسا ہو کہ اس کے سرانجام دینے میں اُسے دلی خوشی ہو اس میں یہ قابلیت ہو۔ کہ وہ جلد اپنے طلباء کی طبیعتوں سے بہت اچھی طرح اور بہت احتیاط سے واقفیت حاصل کر سکے۔ جس طرح ایک طالب علم کو کتابوں سے واقف ہونا چاہیے۔ اسی طرح معلم اپنے طلباء کی طبیعتوں سے۔ اگرچہ بڑی درگاہوں میں کل طلبہ کی طلباء سے فرداً فرداً آشنا ہونا

دشوار ہے مگر تجربہ کار معلم بشرے سے ہی طلبہ کی طبائع کو بھانپ جاتے ہیں۔

معلم کا صرف صاحب علم ہی ہونا کافی نہیں۔ بلکہ لازم ہے کہ وہ معذبہ طریقہ تعلیم سے پورا ماہر ہو۔ اور نیک کے دار درست گفتار۔ خوش اطوار۔ نیک وضع اور جسمانی نقائص سے مبرا ہو۔

آج کل کے معلموں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے شاگردوں کے کان میں آواز اس طرح ڈال رہے ہیں جیسے کوئی بوقل میں کیفیت سے سرکہ ڈال رہا ہے۔ ان کا حکم طلبا کو یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ان کی سُنیں۔ اور اپنی نہ کہیں۔ جو سبق لیں۔ اُسے طوطے کی طرح بار بار رُٹیں۔ مگر یہ ان کی بھول ہے۔ اور طلبا کی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ معلم کو لازم ہے۔ کہ وہ فقط علمی ذہن کی اختراع کردہ باتوں کا بیان نہ کرے۔ بلکہ طلبا کو اجازت دے کہ جو بات انہوں نے اپنے ذہن اور مطالعہ سے نکالی ہو۔ وہ بیان کریں۔ اگر ان کے بیان میں غلطیاں ہوں۔ تو حتی المقدور سب کو ان سے ہی درست کر لیں۔ استاد ارسطو لیا اور شاگرد سکندر ایسا ہونا چاہیے۔ ارسطو نے سکندر کو کس خوبی سے تعلیم دی۔ اس کو شجاعت۔ دلیری کے طریقے۔ شباب اور استقلال کی روشیں۔ اعتدال اور عدالت کے برتاؤ۔ بزرگی۔ شان و شوکت کی نگہداشت۔ خوف کی خفارت وغیرہ اس طرح سے سکھائے کہ تمام دنیا میں اپنا اور اپنے شاگرد کا نام روشن کر گیا۔ استادوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاگردوں کی خوش بیاقتی سے ان کا نام بھی روشن ہوتا ہے۔ ان کی ناموری سے وہ بھی نامور ہوتے ہیں۔ بہت سے معلم ایسے ہیں کہ انکا کوئی نام ہی نہ ملتا اگر ان کے شاگرد نامور نہ ہوتے۔ اچھے معلم کا طریقہ ہے۔ کہ جب طلبا سبق پڑھنے آتے ہیں تو وہ خود کچھ نہیں بتاتے۔ بلکہ طلبا خود بیان کرتے ہیں۔ کہ آج اپنے مطالعہ سے ان باتوں کو نکال کر لائے ہیں۔ جب وہ سُن لیتے ہیں تو اپنی تشریح کرتے ہیں۔

بعض مطالعہ علم میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ معلم کو چاہیے کہ خدو روزانہ مطالعہ کر کے کمرہ میں داخل ہو۔ اور طلبا میں بھی مطالعہ کی عادت ڈالے۔ ہمارے معلمین نارمل سکولوں سے نکلنے کے بعد روزانہ مطالعہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کتب کو بالائے طاق رکھ کر اپنے آپ کو کامل مدرس خیال کرتے ہیں۔ مطالعہ سے نئے منفہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور ہم زندگی کو بے کرنے کے نئے نئے طریقے دیکھتے ہیں۔ ہر ایک معلم کا اپنا کتب خانہ ہونا چاہیے کتب خانہ دراصل معالج روحانی کہلاتا ہے۔ ہم جس قدیمی لائق عالم اور موجودہ قابل فاضل کو بلا تے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ دنیا کے جس کونے سے چاہیں۔ اعلیٰ عالم کو بلا لیتے ہیں۔ نفس انسانی کے واسطے مطالعہ ایسا ہے جیسا جسم کے واسطے ورزش۔ ورزش جسمانی سے تنومندی اور تندرستی پیدا ہوتی ہے۔ مطالعہ سے نیکی جو روحانی صحت ہے ہاتھ آتی ہے۔ متعلمین کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب کچھ اُسناد سکھاتا ہے۔ وہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ مطالعہ ہی اس تھوڑے کو بہت بناتا ہے۔ جو آدمی کسی علم و ہنر میں بلند پایہ حاصل کرتا ہے۔

اسے دو طرح کی تعلیم کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ایک استاد کی تعلیم کا جو زیادہ نہیں ہوتا۔ دوسرا اپنی تعلیم میں کوشش کا۔ جو کوئی کامل عالم ہوا ہے۔ وہ اپنے اس مطالعہ کی بدولت ہوا ہے۔

بعض حملوں کی یہ محکمت نہایت نازیبانما و نامناسب ہے۔ کہ وہ طلباء کو مشفقانہ نصیحت و مریبانہ موعظت اور شرفیافانہ طوہرے علم کی طرف رغبت نہیں دلاتے۔ بلکہ ہمیشہ ڈنڈ اور سیدھا تھپس رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی انگلیوں میں عزن اتر رہا ہے۔ ایسی ڈرائی صورت اور بھبھکیوں سے ننھے ننھے شاگردوں کا دل دہل جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے دل میں رعب اور خوف کا سمنا البیابڑ ہے۔ جیسا کہ ایک نرم اور نازک پودے پر باد صحر کا تند جھوکا یا پھول پر ٹوکا چلنا غرض جیسے سخت بیمار سی سے بیمار کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ ایسے ہی لڑکوں کی شکل اس مار دھار اور بدہشت و خوف سحر کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ زد و کوب بچوں کیلئے ایک سخت مرض ہے۔ استاد اور شاگرد میں وہی علاقہ ہے جو مریض اور ڈاکٹر میں جیسے ڈاکٹر کا مریض پر غصہ ہونا ہے۔ ہمیشہ استاد کا شاگرد پر ناراض ہونا مارا رہے۔ ایسے معلم بڑی غلطی کرتے ہیں۔ اس کا اثر لڑکوں پر ہوتا ہے۔ کہ وہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت ایسے بُرے نہیں ہوتے جتنا کہ خارج ہوتے وقت ہوتے ہیں۔ جودت و ذکاوت مر جاتی ہے۔ انسان سے حیوان بن جاتے ہیں البتہ جو فہمائش بچوں کو عقل و شعور کے ساتھ کی جاتی ہے۔ وہ مؤثر اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ مگر ہمارے نئے تربیت یافتہ مدرسین لڑکوں پر پلعت اور ظلمت کی بوجھاڑ بار بار اس طرح لگاتے ہیں۔ کہ ان کے لئے جھڑکی گھر کی سب مساوی ہو جاتی ہے۔ حیا اور شرم جاتی رہتی ہے۔ چکنے گھڑے بن جاتے ہیں۔ اس طرح تعلیم جو آزادی اور عزت کیلئے ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں ہو سکتی جن قوموں کے بچے مکتب میں جوتیاں کھائیں گے وہ کیا خاک فرماں روا بن کر سکیں گے۔ مدرسہ کو تو ایک انساب و ارتشاد کی تصویر بنانا چاہیے۔ کہ جس طرف بچوں کی آنکھیں شوق سے لگی رہیں۔

جہاں تک جا پانی بچوں کا تعلق ہے۔ انہیں کئی قسم کی بدنی سزا (یعنی مار پیٹ)۔ بید لگانا۔ تھپڑ مٹکانا اور گوشمالی وغیرہ نہیں دینی چاہی۔ اس قسم کی نظیر دنیا بھر کے کسی مہذب ملک میں ملتی مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ جا پانی بچے فرشتہ سیرت یا دیوتا محض ہوتے ہیں۔ بلکہ اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ جا پانی معلم و دم دلا سے اور پیار سے بچوں کی درستی کر کے کو بہترین طریق خیال کرتے ہیں۔ جا پانی مدارس میں مار پیٹ یا بدنی سزا نام کو بھی نہیں دینی چاہی۔ وہاں سب سے سخت سزا یہ ہے۔ کہ طالب علم کو کمرہ سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ جا پانی طلباء کیلئے استاد کی جھڑکی یا گھر کی ایک اہم سزا ہے۔ پچھلے سال کا ذکر ہے کہ کوہے بائی سکول کے ایک معلم نے ایک لڑکے کو معمولی سی سرزنش کی اس غریب لڑکے نے اس ملامت کو اپنی بے عزتی خیال کیا اور اس کے دل پر اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے فوراً گھر جا کر اپنے باپ کے دوائی خانہ دھڑکال اور خودکشی کر لی۔ تجربہ کار معلمین نے طلباء کی تقسیم اس طرح پر کی ہے۔

اول طلباء جو ذہین اور محنتی ہوں۔ یہ دونوں باتیں بچوں میں جمع ہونی قرآن السعدین کی طرح مسعود ہیں۔ ایسے لڑکوں

کے واسطے استاد کا تیوری چڑھانا ہی بیدار کرنے کے برابر ہے۔ اور بیدار ناموت کے برابر۔ اگر استاد ایک بید لگائے تو اس کی مشرق ان پر ہفتوں بید لگاتی رہتی ہے۔ ایسے طلباء کے ساتھ معلمین کو ہمیشہ نرمی اور ملائمت برتنی چاہیئے۔

دوم ذہن مگر کاہل اُن کا حال ایسا ہوتا ہے۔ جیسا کہ خرگوش اور کچھوے کی کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہم جماعتوں کو کچھ اہی مانتے ہیں۔ ایسے طلباء بھی اپنے درجہ پر پہنچ جانے میں گو ہوشیار ہوتے ہوئے۔۔۔ وہ خواب خرگوش میں رہتے ہیں۔ مگر استاد کی جھڑک اُن کی نیند کو جھگکاتی رہتی ہے۔

سوم کند ذہن مگر مضقی اور جفاکش اور ابتدا میں کوتاہم ہوتے ہیں مگر محنت ان کے دماغ سے اس کوڑے کرکٹ کو نکال کر خوب صاف کر دیتی ہے۔ ایسے طلباء کی گوشمالی اچھے معلم نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ دنیا میں بھر کی کوئی چیز سزا سے نہیں بدل سکتی۔

چہارم ایسے طلباء جو کند ذہن اور کاہل ہوں۔ کاہلی کی اصلاح تو ممکن ہے۔ مگر کند ذہن کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جس قیصر کی دھار میں لوہا نہ ہو۔ اس کو دنیا کی کوئی سان تیز نہیں کر سکتی۔ ایسے طلباء کو اور ورہیشوں کی طرف رغبت دلانی چاہیئے۔ ان کو طالب علمی کا پیشہ چھوڑ کر کوئی اور پیشہ مثلاً تجارت زراعت اختیار کرنا چاہیئے۔

روحانی تعلیم کے واسطے جسمانی تعلیم بھی لازمی ہے۔ یہ دونوں ایک جڑ میں ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ روح میں قوت اس وقت تک نہیں آتی۔ جب تک کہ جسمانی طاقت اس کی معاونت نہیں کرتی۔ دوران وقت مدرسین طلباء کو ہر قسم کی ورزش کی یعنی کھیلنے کودنے۔ دوڑنے اچھلنے پھلانگنے اور زنگینے لگانے کی اجازت دینی چاہیئے۔ جو معلم طلباء کو اس سے منع کرتے ہیں۔ وہ اُن کی آزادی اور قدرتی نشوونما کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ ان کو سردی گرمی۔ ہوا اور سورج کی تکالیف کے متعل ہونے کی عادت ہونی چاہیئے۔ غرض فرزانگی کے ساتھ مردانگی بھی پیدا کرنی چاہیئے۔ جس سے وہ کسی خوف سے نہ ڈریں۔ وہ باتیں جس سے نامردی۔ یزدلی اور زنانہ پن آئے۔ ان سے دور رہنی چاہئیں۔ غرض وہ عادتیں ان میں پیدا ہوں۔ جس سے کہ ان میں زور اور توانمندی بڑھے سختی اٹھانے کی عادت ہو۔ کوئی تلخ دوا پینی پڑے تو اسے کشادہ پیشانی سے نہیں طلباء میں کسی طرح کی نزاکت جسمانی پیدا نہ ہونے دینی چاہیئے۔

بعض طلباء کتابوں کے کٹرے بن جاتے ہیں۔ اور مطالعہ میں سرتاپا ڈوب جاتے ہیں۔ اور بن مانس کی صورت بن جاتے ہیں۔ غرض نہ تن کا ہوش ہے نہ بدن کی خبر۔ محذوب مخبوط الحواس بن جاتے ہیں۔ متعلمین کو کتابوں کا غلام نہیں بنانا چاہیئے۔ ان میں چودہ گھنٹے پڑھنے کی عادت برسی ہے۔ تعطیلات میں ان کو بہت زیادہ مطالعہ کرنے سے باز رکھنے کی ہدایت کرنی چاہیئے۔ اور سمجھانا چاہیئے۔ کہ تعطیلات اُن کی تفریح طبع کیلئے ہوتی ہیں۔ کتابوں کو بالائے طاق رکھ کر خوب سیر تھلے اور مطالعہ قدرت سے دل بہلا رہیں۔ غرض ایسے ہیں ایک ضرب الشل ہے کہ تعلیم بہت جلد شروع

ہونی چاہیئے۔ مگر یہ تک جاری نہیں رہنی چاہیئے مگر افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں اُس پھل نہیں ہوتا۔ کالج کی تعلیم میں بہت زمانہ گزر جاتا ہے۔ بعض طلباء کا دماغ تو کالج کی تعلیم میں ہی ایسا ضعیف ہو جاتا ہے کہ وہ بعد تعلیم کسی بڑے کام کے لائق نہیں رہتا۔

بعض صاحب استعداد معلموں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ طلباء کے سامنے بہت سی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ جن کا سمجھنا ان کی استعداد سے باہر ہوتا ہے۔ دورانِ سبق میں اکثر طالب علموں کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان الفاظ کی ماہیت کو کماحقہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ افلاطون کا قول ہے کہ لڑکوں کی تعلیم ان کی طبائع کی استعداد اور قابلیت کے موافق ہونی چاہیئے۔ والدین کے متول۔ حالت اور لیاقت کو اس میں دخل نہیں ہونا چاہیئے۔

ہمارے مدرسوں میں طلباء کے سبق سننے کا یا ان کے تحریری امتحان کا طریقہ ایسا ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ اور ان کی ترکیب طلباء کے ذہن میں محفوظ ہے۔ مگر اس پر مطلق خیال نہیں ہونا کہ اصل معانی اور مغز سخن طلباء کے ذہن نشین ہو۔ اور اس کے موافق اپنی زندگی بسر کرنے میں عمل کرتے ہوں۔ اور سیکڑوں طرح سے اُن کو ادل بدل کر مختلف مقاصد و مطالب میں برتتے ہوں۔ مثلاً اُسٹاد لڑکوں کو 'بیچ' کی بابت سبق پڑھاتا ہے۔ تو فقط اس سبق کے الفاظ ترجمہ اور ترکیب کو پوچھ لگا۔ اس پر خیال نہیں کریں گے کہ اس پر عمل درآمد کر کے طلباء درست کردار اور راست گفتار بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ پس اس طرح سے اگر کوئی متعلم نئی چیز سیکھتا ہے اور اس کی لپٹے ذہن سے نئی نئی صورتیں بنا کر اپنے کام میں نہیں لاتا۔ تو جان لو کہ غذائے اسلام کی طرح اس کے ذہن اور طبیعت نے سبق کو قبول نہیں کیا۔ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ طلباء کو چاہیئے کہ جو چیز پڑھیں۔ اس کو سمجھیں۔ بچان بین کریں۔ ذہن کو اوروں کے بھروسے پر نہ چلائیں۔ غیروں کے خیالات کے آرزو مند ہو کر متقلد نہ بنیں۔ ورنہ ان کا فطری جوہر جودت زائل ہو جائیگا۔ معلم اپنے شاگردوں کو اخلاقی تعلیم ہی باقاعدہ دے۔ اخلاقی تعلیم کا عام انجیم سے خدا کر دینا ایسا ہے۔ جیسا آفتاب

کا روشنی سے۔ اور آگ کا حرارت سے۔ گل کا بو سے۔ تمام علموں میں یہ شرف اسی علم کو حاصل ہے کہ اس کے تحصیل کی قابلیت بچوں میں نوشہ و غذا کی قابلیت سے پہلے پیدا کی جاسکتی ہے۔ ہر حالت اور ہر مقام میں اُس کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ گھر میں۔ باغ میں۔ میز پر غفلت میں۔ جلوت میں۔ صبح و شام یہ سب اس تعلیم کیلئے یکساں ہیں۔ یہ اوضاع و اطوار کی خوبیوں کو سکھاتا ہے۔ دسترخوان پر آدابِ طعام سکھاتا ہے۔ مجلس میں آدابِ سخن۔ کھیل کود میں حسنِ اخلاق۔ یہ ایسا علم ہے کہ اس میں انسان کے کل افعال اور اعمال کے قاعدے بیان ہوتے ہیں۔ یہ سکھاتا ہے کہ خدا کے حقوق انسان پر کیا ہیں۔ اور انسان کے کیا بے دولت کو کیوں کر خرچ کرنا چاہیئے۔ کونسا حصہ اس کا خیرات میں خرچ کرنا چاہیئے۔ کتنا حصہ عزیز و اقربا میں تقسیم کرنا۔ خدا کے کیا کیا احکام ہیں۔ ان کی کیا تفسیر ہے۔ کون سے طریقے مسخ میں؟ بعض لڑکوں کی طبیعت ایسی ہوتی ہے کہ وہ حکمت عملی کی باتوں سے دور بھاگتی ہے۔ ایک حکمت کے مسئلہ کے سننے سے ان کا دل ایک ہیودہ بازاری گپ میں زیادہ لگتا ہے۔ اگر لگی میں فیصل تلمش کی آواز آئے تو وہ کتاب بند کر کے

کے لڑکوں کے واسطے بہتر ہے کہ انہیں اپنی طبیعت کے مطابق سکھایا جائے۔

تعلیم میں حسن مذہبی کی پرداخت

(سید اصغر علی صاحب بی۔ اے بی۔ ٹی۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول چھتر ضلع ریتنگ)

انجیل شریعت میں آیا ہے کہ خدا کا خوف اصل دانائی ہے۔ حدیث شریف میں مسلم کا ایمان بنیم ورجا کے درمیان بتایا گیا ہے اہل ہنود میں پرستش مجاز معرفت حقیقت کا آغاز سمجھی جاتی ہے۔ یہ تو خدا ہمارے اسلاف کا نصب العین لیکن نئے انقلاب ہمارا مستہائے خیال صن ترقی ہے۔ کسی ترقی؛ مجلسی ترقی؛ معاشرتی ترقی؛ اقتصادی ترقی؛ علمی ترقی اور مذہبی ترقی۔ آف ہائیں یہ آخر میں۔ میں نے کس قسم کی ترقی کا نام لے دیا۔ یہ توفیقینیل تعلیم یافتہ اصحاب کی دنیا نے تخلیل میں ایک برب گرا دیا۔ یہ حضرات ضرور سمجھ گئے ہونگے کہ راقم الحروف ضرور کوئی دنیا فوشی خیالات کے بزرگ ہیں جنہیں موجودہ زمانہ کی مجلس معاشرتی اقتصادی اور علمی ترقی کے زمانہ میں بھی مذہبی ترقی کا خیال خام پریشان کر رہا ہے۔

رقیبوں پر ٹھٹھکھوئی ہے یہ ملنے تلنے ہیں کہ الکتو نلم لیتا ہے خدا کا اس نام نہیں لیکن نہیں صاحب میں کپے ہرگز اس صفت سے معراجیاں نہیں کوٹنگا جو ابھی تک آپ میں موجود ہے۔ شاہرہ تنظیم اور سنگٹش کے ذریعہ جن قسم کی ترقی کرنا خیال آپ کو نظر دامنگیر ہے۔ وہ مذہبی ترقی ہی تو ہے۔ خواہ اس کو دیگر اقسام کی ترقیوں کا آلہ کار بنانے کے واسطے حاصل کیا جائے۔ یہ پھیری دل کی بات۔ جسے عالم الغیب کے سو کوئی نہیں جانتا ہے۔ سو یہ ایک ایسا انجیل ہے۔ جس کی آپ کے فلسفہ میں گنجائش نہیں۔

صنعت و حرفت کی تعلیم جس پر ملک کی ترقی کا انحصار ہے۔ بلاشبک ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ لیکن اسکے لئے ہمارے تمام نظام تعلیمی کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ اور گورنمنٹ عالیہ کی موجودہ مالی حالت اس صرف کثیر کی تحمل نہیں ہو سکتی۔ اسلئے جب تک وہ وقت کئے ہم اس نصب العین پر ایک نظر ڈالیں جو ہم نے ملکی ترقی کے لئے اختیار کیا ہے۔

اقتصادی ترقی کی موجودہ جدوجہد میں ہم مغربی ممالک کی تقلید کرتے ہیں۔ اور اسلئے اہل مغرب نے ان مسائل کا جس طرح کیا ہے۔ وہی ہماری رائے میں بھی صحیح ہے۔ مثلاً مغربی معیار سے سبزی۔ احمد آباد اور کانپور بڑے خوشحال شہر کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں باکسٹر کی طرح پریت سے کاغذانہ جات ہیں۔ ان شہروں سے سکاڑ کوٹیکس کے ذریعہ بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ ان میں شمار ہو کر ان کا بدن وڑی بھی ہیں۔ لیکن غریب مزدور مل کی جھونپڑوں اور غریب خانوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں اس غریب شمالی کی اعلیٰ اچھی طرح سے مکمل جاتی ہے۔ تو کیا اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں آپ ان برائیوں پر غور نہیں کریں گے؟ کیا ان کا علاج

یا اسناد و ناموس کے ہر صفت و صفت کی تعلیم کی کچھ موقوفہ الزام نہیں تھا جہاں تک کہ کارخانوں میں لائے دن ہڑتالیں اسلئے تو نہیں ہوتیں اور ذیل اس لئے تو نہیں نکلتے کہ اچھے دستکار یا مزدور دستیار نہیں ہوتے۔ دراصل بات یہ ہے کہ کارخانہ دار اور مزدور دونوں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسلئے جلدی سے جلدی مالدار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنی طرف کھینچتا ہے۔ خواہ ہائیں یا نہ مانیں۔ یہ فلسفہ موجودہ سوسائٹی کے نظام پر ساری سچاؤ مغربی سائنس کی بدستوری یہ مادی طمع نظر میں حاصل ہو رہا ہے۔ اور اسلئے یہ ظاہر آخر شمالی دراصل ایک لغت نسبت ہو رہی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک اس لغت کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے تو ہمیں فوراً اپنا طمع نظر بدلنا پڑیگا۔ اولوی ترقی کے نصب العین کو قائم رکھتے ہوئے اپنے دل میں خوف خدا کے لئے جگہ نکالنا پڑیگی۔ دراصل اس خوف خدا کو کسی مستند مروجہ مذہب اور اس کے رسومات سے کوئی خاص تعلق نہ ہوگا۔ اگرچہ عقیدہ کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں فعل سے ہی کیا جاتا ہے خدا کی اعتقاد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی خاص مذہب یا فرقہ کا خدا ہو۔ بلاشبہ اس کی ہستی کی معرفت کے میدان میں اشتہب عقل فکر کے پاؤں پہلے ہی سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اور خواہ ہم اسے ہستی واجب الوجود یا غیر واجب الوجود یا ضرورت یا قانون فطرت کے نام سے تعبیر کریں۔ کیونکہ اس کی ہستی کے تخیل میں تصور کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ صرف اتنا ضروری ہے کہ ایسے مخلوق کا حکمراں۔ حاضر ناظر۔ علیم۔ قادر اور قوی تصور کیا جائے۔ اگر آپ اس قدر مذلت میں گرنے سے بچنا چاہتے ہیں جس کی طرف مغربی مادیت اور وہمیت نہایت سبک رفتار سے آپ کو لئے جا رہی ہے تو کم از کم اپنے تعلیمی نصب العین میں یہ تبدیلی بلا میں پیش کر ڈالئے۔ خود مغرب نے اس تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کر لیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس کی رفتار میدان ترقی میں آپ سے تیز ہو۔

تعلیمی دنیا میں مذہب اور خدا کے نام سے اہل عالم پر کیا کیا مصیبت کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا کہ معتقدان سائنس بھی ان اعمال حسد میں ان سے کسی طرح بھیچے نہیں ہے۔ صرف ایک جنگ عظیم میں جی خونریزی اور بربادی سائنس کی امداد سے کی گئی وہ تمام صلیبی جنگوں کے مظالم سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اس وجہ سے سکولوں اور کالجوں میں سائنس کی تعلیم پر کوئی شخص متضرر نہیں ہوا۔ اگر سائنس کا تعلق مادہ سے ہے تو مذہب بھی تخیل کا مدعا ہے۔ جب زندگی میں مسئلہ طور پر یہ دونوں شامل ہیں۔ تو کالجوں اور سکولوں کے طلباء کو زندگی کے ہر دروازے مسائل پر غور کرنے کا موقع دیا جائے۔ کیا یہ صریح غلط نہیں ہے کہ کوئی شخص مخلوق کی کیفیت ترکیبی اور استثنائی پر غور فکر کرنے میں متقدم نہ ہو جائے کہ اس کے مدعا سے خالی کا تصور ہی جاتا رہے۔

لیکن آپ کہیں گے۔ کہ ذات باری تعالیٰ کے تصور میں خواہ آپ کتنے ہی آزاد خیال ہوں۔ مگر مدارس میں اور خصوصاً ہندوستان کے مدارس میں مذہب کا ذکر چھڑنا ہی مناسب نہیں کیونکہ یہاں نہ مذہب کی تعداد کا ٹھکانا اور نہ معتقدانیت کے

تعداد دو تباہین کی حد۔ مثلاً ۲۲ سال ہوئے ایک گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو عالی جناب سپکٹر صاحب ہلند کے ایسا سے اپنے مدرسہ کا کام عامے شروع کرنا کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ ایک دعا تجویز کی گئی اور اسکول کی انجمن علمین میں پسند کرنے کے لئے پیش لگئی۔ ساری دعا پڑھ کر لکھنے کی تو اس ضمن میں گنجائش نہیں۔ صحت ایک فقرے کی نسبت عرض کئے دیتا ہوں۔ پہلا فقرہ تھا ”اے ہمارے مالک تعلم دنیا کے پیدا کرنے والے ہم سب تیرے گنہگار بندے ہیں“ سب سے پہلے ایک مسلمان مدرس کھڑے ہوئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے عرض کیا کہ تعمیل ارشاد سے تو گریز ناممکن ہے۔ لیکن یہ دعا مسلمان بچوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اول تو ہم لوگوں کے لئے دعا کے پانچ وقت مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی وقت خاص میں اپنا نام کے ساتھ دعا مانگنا بدعت ہوگا۔ دوسرے دعا میں صرف مومن بہتیاں شریک ہو سکتے ہیں تیسرے بلا وضو اور کعبہ شریف کی طوط رخ کے بغیر دعا مانگنا جائز نہیں۔ چوتھے مجھے دعا کے الفاظ پر کبھی اعتراض ہے۔ تخلیق انسان کو حضرت آدم کے گناہ کا نتیجہ سمجھنا عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ مسلمان بچوں کو بالکل معصوم خیال کرتے ہیں۔ اسلئے اُن سے صبح ہی صبح اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ ایک معصوم شخص کے منہ سے خواہ مخواہ جرم کا اقبال کرنا ہے۔ یہ تو میں نے مولیٰ مولیٰ باتیں کہی ہیں۔ اگر فروعات کو لیا جائے۔ اور شیعہ سنی۔ معتزلہ۔ نیچری۔ وہابی۔ قادیانی۔ پکڑاوی علماء کے نقطہ خیال اس دعا کے الفاظ پر تنقید کی جائے تو یہ ہرگز کسی قابل ثابت نہ ہوگی۔ ابھی مولوی صاحب اپنا وعظ ختم بھی نہ کرنے پائے تھے کہ آریہ پنڈت صاحب جامہ سے باہر ہو کر اس طرح ریاکھیاں دینے لگے۔ بلا شک یہ دعا اس قابل نہیں ہے۔ کہ صبح ہی صبح ہمارے بچوں کے منہ سے جبراً کہلائی جائے۔ ہم روح اور مادہ کو خدا کی ذات کے ساتھ ازلی اور ابدی سمجھتے ہیں۔ اس واسطے آپ ہمارے بچوں سے جبراً قرار نہ کرائیں کہ خدا کا مالک ہے۔ لہذا میں جہنی جہاشہ کو بھی جوش آگیا اور فرمانے لگے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب میں آپ کی توجہ ملکہ معظمہ کے اعلان شاہی کی طرف مبذول کرتا ہوں۔ جو انہوں نے مذہبی عدم مداخلت کے متعلق کیا ہے۔ یہاں اے بی سی ڈی پڑھائی جائے۔ جس عرض کے لئے یہ مدرسہ قائم ہوا ہے۔ یہ خدا خدا کیا لگا رہا ہے۔ ہم اپنے شاستروں کی رو سے اس قسم کی ہستی کے قابل نہیں ہیں۔

خبریں باتوں بطور وسیلہ معترضہ کہی گئی اور ۲۲ سال کے عرصہ میں متعدد گنگا کے پانی کی روانی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ لیکن عدم مداخلت مذہبی کے متعلق ملکہ معظمہ کے اعلان شاہی کا مطلب اساتذہ سکول نے نکال رکھا ہے۔ اس سے تو ان پر ”مغز سرش خرد زند“ کی مثال بالکل عاید ہوتی ہے۔ حکام سلطنت قسٹ نوٹ :- کیونکہ یہ تو آپ پر واضح ہے کہ ہمارے مدارس میں سکالڈ ٹنگ۔ ریڈ کر۔س۔ موسیقی۔ دیہات سدھار وغیرہ وغیرہ چلے کیا جاتا ہے جس احکام کی تعمیل اور خوشنودی مزاج مصلیٰ کے لئے کیا جاتا ہے چنانچہ ایک فیسدرس میں مسیحی کا وہ چھاپا ہوا کہ خلصہ برہمن اور مولویوں نے جواز ملے کے فتنہ ہمارے فساد کیا اور وہ مدرسہ جنہیں فرقہ ملاح مذہبی القاب متعلق تھے ان کے خلاف کی مثال نکال کئے گئے اور کہیں کئے جاتے؟ کیا ملک اشعرا شکسیر نے جو فطرت انسانی کے ہے وہی لکھنے کے لئے اپنے ڈراما میں ایسا نہیں کہ ماسہ ۱۲

انگلشیہ نے ہندوستان کے آئینی انتظام کے ارتقا کی تاریخ میں کسی جگہ بھی سکول کے بچوں کے لئے خدا کے لفظ کو "ہوتا" نہیں بتایا۔ رہا ہندو مسلمانوں پر یہ الزام کدہ اس دشمنی کے زمانہ میں بھی تصور باری تعالیٰ کے متعلق ہم خیال نہیں ہو سکتے تھے تو یہ بھی محض ہستان ہی معلوم ہوتا ہے۔

درحقیقت اس بابے میں ہندو مذہب نے شرح بھی پکی آزادی خیالی دی ہوئی ہے۔ ہندو کے نزدیک خدا کائنات میں شامل۔ اور کائنات سے علیحدہ بھی تصور ہو سکتا ہے۔ یہاں تک اہل کائنات اس کے عدم اور وجود کو کیساں سمجھے ہوئے بھی ہندو کہلا سکتے ہیں۔ قدیم ہندو ہمارا جاؤں نے کئی مرتبہ ایسی مذہبی مجالس قائم کیں جن میں صرف ذات باری تعالیٰ کے متعلق ہی نہیں بلکہ ہر مذہبی اعتقاد کے متعلق تہابیت آزادی سے بحث مساحتہ کیا جاتا تھا۔ اور ایک دوسرے کی رائے کا بے حد احترام کرتے ہوئے حکومت کی طرف سے اس پر عمل پیرا ہونے کی پوری آزادی دی جاتی تھی۔

قرآن شریف میں جگہ جگہ دوسری اقوام کے مذہبی معتقدات کا احترام کرنیکی تاکید آئی ہے۔ "ہم نے تمہیں سے ہر ایک قوم کیلئے علیحدہ علیحدہ شریعت عطا کی ہے جو ان کے لئے مکمل راستہ ہے۔ اگر ہاری مرضی ہوتی تو ہم تم کو ایک ہی قوم میں پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ہمیں تمہاری آزمائش علیحدہ علیحدہ شریعت کے مطابق ہی منظور ہے۔ اس واسطے ایک دوسرے سے نیکی میں ہدایت لی جانے کی کوشش کرو" (دیکھو قرآن شریف ترجمہ سیل صاحب صفحہ ۷۹) اسلام نے اپنے مین مروج کے زمانہ میں بھی عیسائی راہبوں اور ان کے اوقات کے متعلق وہ رعایتیں جائز رکھیں جو انہیں جو عیسائی بادشاہوں سے میسر آ سکیں۔ مذہبی معاملات میں شہنشاہ اکبر کی فراخ دل زبان زود عام ہے۔ حضور اعرصہ بھی انہیں نوا کر سلطان بزرگان وین کے مزارات ہندو عوام کی تریانگاہ بنے ہوئے تھے

اس میں شک نہیں کہ عیساء اور ذکر کیا جا چکا ہے کبھی کبھی مذہبی دیولوں نے اپنی خوش اعتقادی کے جوش میں فتنے و فساد پکارتے ہیں کسراٹھانہ رومی۔ لیکن مذہب انگلیٹڈ اور یورپ کی تاریخ میں بھی تو صدیوں کی صدیاں ای گزری ہیں۔ کہ جب آزادی خیال کا تصور بھی محال تھا۔ مگر گذشتہ دس سال کے اندر اندر مذہبی ساقشیت کی وجہ سے کچھ ہندوستان کی فضا ایسی مکر ہو گئی ہے کہ بعض لوگ تو یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مذہبی غیر جانبداری یا عدم مداخلت کا خیال بھی دیگر برکات سلطنت برطانیہ کی طرح سے مشرق کے لئے مغرب کا ایک عطیہ ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ برطانیہ کی مذہبی غیر جانبداری محض منفی رہی ہے۔ بڑا خلا اس کے مشرقی بادشاہوں کی غیر جانبداری بھی مفید اور مثبت۔ جہاں جہاں اشوک کے قانون سے ثابت ہے کہ ہر ایک آدمی کو اس کے عقیدہ کے بموجب تعلیم دینے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ حکومت کے عدم مداخلت کے حکم نے سررشتہ تعلیم کے سرکاری مدارس نے اس شے کا تذکرہ ہی مٹا دیا جو دلوں کو راحت اور روحوں کو تسکین بخشنے والی ہے۔ اگرچہ سائنس کی تمام روشنی اور اسکے عقیدہ تینوں کل حشر و خشر موجود سائنس کے مزدورم سے مذہب کا خاتمہ کر نہیں سکا سیاب رہا۔ اور سچا جب تک کہ مذہب کا اثر انسانی مسالغ پر مستطاب ہے۔

ذرا غور تو کرو جو دامنِ کھلم کھلاستان میں اس غیر جانبداری کے کیا معنی لئے جاتے ہیں لیکن کوئی اعتراض کرے کہ وہاں کے اور یہاں کے مدارس میں جن رات کا فرق ہے۔ وہاں سب عیسائی ہی عیسائی رہتے ہیں لیکن اگر معترض صاحب کو عیسائیوں کے ۱۰۴ بڑے بڑے فرقوں کے نام معلوم ہوں اور ان کے مذہبی معتقدات کے تفاوت کا علم ہو جو حقیقت اکثر مسورتوں میں لکھی ہے مختلف ہیں جتنے دو بڑے مذاہب کے معتقدات تو وہ سمجھ جائینگے کہ اختلاف اور تنوع تو کائنات کی جان ہیں۔ اور مختلف چیزوں کو یکساں بنانے کی کوشش کرنا گویا انکی خصوصیات کو معدوم کرنا اور ایک کو دوسرے پر بیجا ترجیح دینا ہے۔ جو سراسر آزادی خیال کے منافی ہے۔ اسلئے اٹھلینڈ کے حکام ممکنہ تعلیم نے ہر قسم کی مذہبی تعلیم کو مصلبِ تعلیم سے خارج کرنے کی بجائے یہ مناسب سمجھا ہے کہ ہر ایک سرکاری مدرسہ میں ایسے عقائد اور اخلاق کی تعلیم دی جائے جو کسی خاص فرقہ کی تعلیم کے خلاف نہ ہوں۔ اگرچہ والدین کو اجازت ہے کہ اگر وہ کسی مدرسہ کی مذہبی تعلیم کو اپنے عقیدے کے خلاف سمجھیں تو وہ اپنے لڑکے کو اس میں شریک نہ ہونے دیں۔ لیکن یہ کام اس شخص اسلوبی سے انجام دیا جاتا ہے کہ کسی سرپرست کو اجازت نہ ہو کہ اسے ناپیدہ اٹھائیںکی ضرورت نہیں پڑتی۔

پس جب دیگر ممالک میں مختلف مذاہب اور مختلف العقائد لوگوں نے اپنی تمام فروعات کو بالائے طاق رکھ کر مذہبی تعلیم کو مدارس کے طلبہ کے لئے صرف خالق کو ن مکان کی ہستی کے قور اور تفریم اسکی قدرت کے اٹل قوانین پر غور کرنے اور اس کے پیچھے ہمہ پیمبروں کے سوانح اور یقین کو سمجھنے تک محدود کر رکھا ہے۔ تو کیا ہندوستان میں ان سب باتوں کو قائم رکھتے ہوئے اور اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی عظیم الشان ہستیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاسکتا؟ ہندوستان کے تمام مذاہب میں ایک ایسے خدا کی ہستی پر یقین کیا جاتا ہے جو کائنات کے کارخانہ کو اپنے اٹل اور کبھی غلطی نہ کرنے والے قوانین سے چلا رہا ہے۔ اس قسم کے اعتقاد کا نتیجہ انسان کو اخلاق کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تک پہنچا سکتا ہے جس سے وہ خرابی دور ہو سکتی ہے جو مذہب کو مصلبِ تعلیم سے مطلق خارج کر دینے سے پیدا ہوئی ہے۔ اور جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں کیا گیا ہے۔ ہرگز آپ کسی کے مذہبی اعتقاد میں مداخلت نہ کریں لیکن یہ آپ کی عدم مداخلت بھی مثبت ہوئی چاہیے۔ اب رہی اس اثبات کی تفصیل یہ حسب موقع طے ہو سکتی ہے۔ پراپریری سکول کے طلبہ کو یہ سمجھانا کہ ہر ایک انسانی جسم خدا تعالیٰ کا مسکن ہے۔ انہیں جسم کی حفاظت اور پاکیزگی کی طرف ایک ایسے زمانہ میں مایل کر دیا جاتا ہے جس کی نشوونما نہایت سرعت کے ساتھ ہو رہی ہو۔ سیکینڈری سکول میں جذباتِ لطیف کو ابھارا جائیگا جن کی پاکیزہ زندگیوں کا مطالعہ ان کی اخلاقی ترقی کے لئے مشعلِ راہ بن جائے گا۔ کالج کے طلبہ کی صورت میں جہاں عقل کی بچش کے ساتھ تحقیق اور تنقید کا جوہر دماغ میں چمک اٹھتا ہے۔ نظام کائنات میں قوانین کی نفرت کے لئے جو حتی الامکان سمجھانے کی کوشش کی جائیگی، العرض مصلبِ تعلیم میں اگر ان ضروریاتِ دینیہ کے سکھانے کا اہتمام دیا جائے تو آدمی خوشحالی اور اخلاق اور مذہبی احساس کی عدم موجودگی میں دنیا کے لئے نعمت ثابت ہو رہی ہے۔

فلاح و برکت ہو جائیگی۔

یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ لپٹے اس خشک مضمون کو اُدو علم ادب میں سے ذات باری تعالیٰ کے متعلق کچھ اشعار کے انتخاب پر ختم کروں۔ تاکہ جب تک اربابِ سب و کشادہ ہنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت کو محسوس کر کے سرکاری مدارس میں سندھجہ بالا سکیم کو عملی جامہ پہننے کا انتظام کریں۔ مگر رسیں جن پر آئندہ نسلوں کی اخلاقی تربیت کی ذمہ داری مایہ جوتی ہے۔ سمجھ لیں کہ اب بھی انہیں ایسے مواقع حاصل ہیں کہ وہ دنیوی تعلیم کے دوران میں درستی عقائد کی کچی بہت کچھ غور و پرداخت کر سکتے ہیں۔

جنتِ سمیعہ باہوںِ ظفر گلستانِ کوئیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بت خانہ تھا
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
کبھی داغِ بھول کر بھی غمِ نجات کھانا
ہائے اس اشتباہ نے مارا
جب اس نے اپنی منہ و پاہی کھلا حینونِ گنگ کو کر
ڈوہیں گناہِ بادہ کشوں کے شراب میں
حصہ ہر ایک آنکھ نے پایا ہے نور کا
لطف و غضب میں فاصلہ تھا کتنی دور کا
گر آج آنکھ سے آنسو درِ یگانہ جھڑا (امیں)
قطرے جوتے مرے عرقِ انفعال کے (اقبال)
کون چکر کھائے پھر دیرِ حرم کی راہ کا
بت ہی ہیں جو کچھ ہیں آگے نامِ جہانِ خدا
نامِ تم نے سن لیا ہے زاہد و اللہ کا
نیست ہونے پر ملا ہم کو ٹھکانا تیرا
مجھے یقین نہیں آتا سنی سنائی کا
دیکھنا آسان نہیں اس دوسرے روشن کی طوف
مور کو بڑھ کے سلیمان سے ہم دیکھتے ہیں
ہر جگہ تم کو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں

جلوہ ہے ہر کلی میں کسی کے جمال کا
گو واں نہیں۔ پے واں کے نکالے ہوتے تو ہیں
ذیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخِ حرم
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
وہ کریم کیا نہیں ہے وہ رحیم کیا نہیں ہے
خوش ہے کا فر بھی اس کی رحمت پر
ذہبی تو ہے شعلہٴ تجلی کہ برقِ یاسین سنگ ہو کر
کچھ شانِ معرفت سے نہیں دور زاہد و
مردم اس کے خوانِ تجلی سے کون ہے
کہتے ہی یا کریم اور صرے اور گئے
جب آئی جو شش پہ میرے کریم کی رحمت
موتی سمجھ کے شانِ کریبی نے چُن لئے
گل گیا جب یہ کہ دل بھی جلوہ گہ ہے یار کا
ذیر میں آخس کا طالب ہے تو زاہد اگر
کچھ نہ سمجھے ہو نہ بوجھے ہو کہ وہ کیا چیز ہے
جب تلک ہست تھے دشوار تھا پانا تیرا
دکھاؤ جلوہ جو دعویٰ ہے خود نمائی کا
آج تک غور و شہد کا منہ اس طرف ہوتا نہیں
جب نظر بندہ نوازی پہ تیری جاتی ہے
ہو کہیں لالہ گل اور کہیں شمس و قمر

گنہ باری کو پہنچ جائے دلائل سے تو
ملنے نہ ملنے سے میں کیا کام سے ہے کام
کب زاهدوں کو مسئلہ عشق کا ہے فہم
صاف کہہ دو نہیں دیدار دکھانا ہے اگر
جستجو تیری دو عالم سے مجھے کمودگی
پوچھتی ہے تم پر دانوں سے تیری داستان
ہستی جہاں کی ہستی حق پر دلیل ہے
لامکاں میں نہ پتہ ہے نہ مکاں میں اس کا
امیر جلوہ وحدت سے آشنا ہو جو دل
بو نہیں رنگ نہیں نور نہیں نار نہیں
پردہ انہیں سے ہے جنہیں تاب نظر نہیں
جبتک کہ دل ہے چاہیے ہم کو تیری تلاش
محرم نہیں ہے تو ہی نوائے راز کا
کی جس پہ نگاہ تجھ کو دیکھا
جز دیر و حرم کہاں میں جاؤں
فنا کیسی بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے
جو چشم غور سے آئینہ تو حید کو دیکھا

یہ تو باہر ترے امکان سے ہم دیکھتے ہیں
جبتک کہ دم میں دم سے تیری جستجو کریں
نامحرموں سے راز کی کیا گفتگو کریں
کعبہ و دوسریں دوڑاتے ہو کیوں تم مجھ کو
بیں بھی تجھ کو نہ ملو بھگا جو مجھے تو نہ ملا
گل سنا کہتے ہیں بلبل سے تیری نظریہ کو
کیونکر جہاں ہو جو جہاں آفریں نہ ہو
بے ٹھکانے کے بتائے ہیں ٹھکانے بھگو
وہی ظہور ہے وہی شان ہے جدھر دیکھو
محض کیوں نہ ہو دشوار راہی تیری
آتے ہیں خود وہ دیکھنے والوں کے سامنے
جبتک چلے زبان تیری گفتگو کریں
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ بے ساز کا
اب تک تو نظر کہیں نہ چوکی
راہیں تو یہی ہیں جستجو کی
کبھی اس گھر میں آئیں کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے
تو سب کچھ تو ہی تھہرا ہم نہ کچھ اے خود کا ٹھہرے

مانند کلیم بڑھ نہ اے دل
یہ دور کی گفتگو بہت ہے

قیمتی باتیں

جب ارسطو سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ایک شخص جو بول کر کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تو اس نے کہا جب وہ
سچ بولے گا۔ تو اس کا یقین نہیں کیا جائیگا۔
لوگ شکایت کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی سچا دوست نہیں ملتا۔ ان کو چاہیے کہ اس بات پر غور کریں۔ آیا وہ بھی کسی کے سچے
دوست ہیں۔ اور کسی کے واسطے وہ بھی اپنی پیاری زندگی قربان کرنے کے لئے تیار ہیں؟



تاج الشعراء 'فیض' ناصر - 'محقق' حضرت لوح فاروقی

حضرت نوح ناروی

(واقعی مکہ پر پٹنگ، صادقین ناگد جناب نوح ناروی)

ماتے ہیں یہ بات سب اسے نوح
بوجھ مندوں میں شانِ تیسری ہے
شجرت سیکھے بیانِ حسن و عشق
ہر طرف ذکرِ خوش بیانی ہے
بزمِ ناز و نیشِ ناز کی باتیں
ایک بجلی نماں نیاں ہیں ہے
لفظ و معنی کا رہ نما نے سخن
دستِ شاعری کے بارش ہے
طورِ اندازِ ادب ہے طوقانی
فکرِ مبین رسا جو کرتی ہے
جوشِ سیلابِ دردِ سینے میں

اس کی شکستے کسی کو کب لے نوح
صاف تھری زبانِ تیسری ہے
جو کھسکے داستانِ حسن و عشق
ہر جگہ شوقِ محبتہ دانی ہے
پڑا اثرِ سوز و ساز کی باتیں
موندنیہاں کی کمال میں ہے
واقعی تو ہے ناخدا کے سخن
مستعارِ تیرا ذوق و داغ ہے
اس سبب سے لقب ہے طوقانی
پانی آکر زبانِ جسمِ تری ہے
خاص طوقان اس سینے میں

کیوں نہ دے جان اور وہ دل بھی
نادموں میں تیرے بسِ تسلیم بھی

حُسنِ تخیل

(از لسانِ المند حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم)

آئینہ ہے کہ بے قاتل کے مقابل قاتل مجھ کو ڈر ہے کہیں لڑ جائیں نہ قاتل قاتل
کمنچ کے تلوار کی سُورت نہ گھلے مل قاتل اس طرح مل کے ملے دل سے تزا دل قاتل
نیوے بے جوت ہے کیوں جاں و نذر اہل نیم جاں چھوڑنے سے کیا تجھے حاصل قاتل
موبیل ٹھیں تو دم فوج کچھ اے جوشِ خون خود ہی ہو جائیگا پابندِ سدا س قاتل
دستِ نازک کی طرح تین بھی نازک بہت تجھ سے آسان نہ ہو گی میری مشکل قاتل
انہی مہلت جی نہ دی تین ادا نہ مجھ کو کہ دکھ تا تجھے اپنا جگر و دل قاتل
قتل گہ جاں کے ہنسنا ذرا شرمیں نظر آئیں گے وہاں سینکڑوں سہل قاتل
بہ سوئے منزل مقصود پیے بھی جو کجی جادہ شمشیر بنا دوری منزل قاتل

کشتہ ناز ہے وہ حشر بے عید کا دن

اپنے صفدر سے ذرا آج گھلے مل قاتل

سکاؤٹ کیا ہوتا ہے؟

جناب ہنڈت مرلی دھر صاحب مودگل بی اے ڈسٹرکٹ انسپکٹر پولیس (جائیداد)
انگلستان میں ماہ اگست ۱۹۲۹ء میں دینا بھر کے سکاؤٹوں کے اجتماع اور باہمی میل جول کے دوران میں ہندوستان کے
سکاؤٹوں نے مشاہدات کی بنا پر جو تجویزات حاصل کئے ہیں اس سے ہندوستان میں سکاؤٹ تحریک کی اہمیت ایک مسئلہ امر ہو
گئی ہے۔ دیگر ممالک کی خوبیاں اور اپنی خامیاں محسوس کرتے ہوئے ہر ایک سچے ہندوستانی شخص کا جو سکاؤٹ تحریک سے دلچسپی
رکھتا ہے فرض ہے کہ وہ اپنی خامیوں کو دور کرنے اور دوسروں کی خوبیاں اختیار کرنے میں مدد دل سے ساقی ہو۔ اور میدان
عمل میں اترے۔

فی زمانہ دنیا بھر کے منتظمان سکاؤٹ تحریک کی توجہ اس جانب بڑے زور شور سے مبذول ہو رہی ہے۔ گزشتہ چند سالوں
کے اندر اس تحریک کو تواد کے لحاظ سے جو فروغ حاصل ہوا ہے۔ وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن ہر شخص اس بات کو محسوس
کر گیا کہ اس تحریک کا استحکام حقیقی سکاؤٹ تربیت پر منحصر ہے۔ اس لئے ناظرین کی خدمت میں چند ایک خیالات ہائے غور و
تحقیق پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر مقبول خاطر ہوں۔ اور ضمن نظر کرے تو ان خیالات کو عملی جامہ پہنا کر دیگر ممالک کے پہلو بہ پہلو دنیا
کے مصائب الام کی تخفیف و تسخیر میں حصہ لیں۔ اور اس تحریک کو حقیقی محسوس میں قوم و ملک کی فلاح و خجالت کا ذریعہ بنائیں۔
اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ سکاؤٹ کیا ہوتا ہے؟ کیا خاکی وردی میں ملبوس، ہاتھ میں ساڑھے پانچ فٹ کی لمبی لالھی
پکڑے ہوئے بچے کا نام سکاؤٹ ہے۔ یا جس کسی لڑکے کو کھانا پکانے، گانٹھیں لگانے یا ابتدائی امداد ہم پہنچانے میں معمولی
یا بخوبی واقفیت ہو جائے۔ اس سے سکاؤٹ کہتے ہیں۔ یا وہ بچہ سکاؤٹ کہلاتا ہے۔ جو بگل یا نفیری کے بیڈ باجے میں ماہر
ہے۔ اور صہبئی یا سیٹی کے اشارات سے پیغام رسانی کر سکتا ہے۔ جانوروں کو بولیاں لول سکتا ہے کھوج لگا سکتا ہے۔ اور
پوشیدہ اشارات کو سمجھ سکتا ہے۔ ان تمام سوالات کا جواب ایک جگہ میں دیا جاسکتا ہے۔ کہ سکاؤٹ بننے کا انحصار مندرجہ
بالا خوبیوں کے ماہر ہونے پر نہیں اور نہ اس بات پر ہے۔ کہ وہ کیا کچھ جانتا ہے؟ اور کرتا ہے؟ بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ
کیا ہے؟ اور کیا بننے کی کوشش کر رہا ہے؟ دنیا بھر کے سکاؤٹ موخر الذکر رویہ کے زیر اثر اپنے اندر کی جمیع پوشیدہ
طاقتوں کے نشوونما میں کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس زبردست عہد کو نباہتے ہیں جو انہوں نے سکاؤٹ تحریک میں شمولیت
کے وقت کیا تھا۔

جب ایک سکاؤٹ اپنے سکاؤٹ بھائی سے ملتے ہیں۔ تو اس کے تین انگلیوں سے سلام کرنے کا عمل اسے

فرا یاد دلانا ہے کہ اس نے کون سے تین مہد کئے ہوئے ہیں :-

(۱) جو فراتلئے خدا بادشاہ اور اپنے ملک کی جانب سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ وہ انہیں پورا کرے گا۔

(۲) ہمیشہ بنی نوع انسان کی مدد کرے گا۔

(۳) وہ دس قوانین سکاؤٹ کی پابندی کرے گا۔

پیشتر اس کے کہ دس قوانین سکاؤٹ کی اہمیت پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد سکاؤٹ کے مدعا و مقصد پر نشر کیا کچھ عرض کیا جائے :

عہد سکاؤٹ

- ہر ایک ملک و قوم کم و بیش اپنے اپنے عقیدے کے مطابق دنیاوی عیش اور خوشی اور بعد از مرگ نجات یا دکھ سے سنگساری حاصل کرنے کے لئے تلک دو کر رہی ہے۔ اس لئے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی زندگی - سچ اور حیات کے تجربات کا مجموعہ ہے۔ اس سچ اور راحت کا انحصار مادے پر ہے۔ اور مادہ ہمیشہ تغیر پذیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی نگاہیں ہمیشہ ایک ہی نہیں کھینچیں۔ کبھی تو اسے خوشی کے دو جامے میں بھولا نہیں سکتا۔ اور کبھی سچ و نعم کے بوجھ کے نیچے دب کر زندگی کو دہال جان خیال کرتا ہے۔

اگر یہ نظر تفتیح دیکھا جائے تو مادی اشیاء میں دوامی راحت کو تلاش کرنا سخت غلطی ہے اور طبع سلیم اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ کہ دنیا بھر کے عیش و عشرت کے سامان مٹیا کر لینے سے انسان کو دائمی راحت مل سکتی ہے۔

پس لازم و لابد ہے کہ دوامی راحت کی بنیاد ایسے نظام پر رکھی جائے۔ جو زمانہ کی دست برد سے مامون ہو۔ ہر مذہب و ملت میں اس بات کا مدعا ہے کہ ہمیشہ قائم رہنے والی طاقت یا تسلی تسلیم یا کیا جو پس لازم ہے کہ سچی خوشی یا ہمیشہ قائم رہنے والی راحت حاصل کرنے کے لئے اسکی مومن یا قیاد رکھی جائے۔

ایک بابت اور غور طلب ہے۔ عارضی خوشی جو مادے کے موافق حال ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ مادے میں نہیں ہوتی۔ بلکہ دل کی توجہ کی دھار کے اس مادے میں جذب ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ تو جو اس جانب سے سچی اور وہی مادی شے جو خزانہ راحت معلوم ہوتی تھی۔ دکھ اور سچ و کلفت کا باعث بن جاتی ہے۔ بعد ازاں توجہ کی دھار کو مادے سے ہٹا کر روح یا آتما میں جو کہ تغیر سے ہٹا رہا ہے۔ لگایا جائے تو جو سرور یا آنتہا سے حاصل ہوتا وہ دیر پا ہوگا۔

یہ نشہ وہ نہیں جسے تڑپتی آمار دے
مخون
ہی وہ ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب اس دائمی آنتہ و خوشی کو حاصل کرنے کے لئے روح یا آتما کے جذبہ یعنی

کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اس ذات پاک کو مختلف ناموں سے منسوب کرتے ہوئے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اپنے جھکوت کی ٹھگتی محبوب کی عبادت اور اپنے خدا کا پرستش کے حصول میں معاشی مشغول رہتے ہیں۔ اس لئے سکاؤٹ عہد کا پہلا جزو دوسرا بنی نوع انسان کو دائمی راحت اور پسے سکھ کی تباہی رجوع کرتا ہے۔

ب۔ یہ امر پوشیدہ نہ رہے کہ روحانی ریاضت کے لئے مادی حالات کی موافقت بے حاصلوری ہے۔ اور جب تک کہ انسان کو پیردنی فارغ البالی نہ ہوگی۔ وہ اپنی توجہ کو باطن میں مکیو کرنے میں قاصر رہے گا۔ اس دعا کے حاصل کرنے کیلئے افراد میں ضبط اور اقوام کی تنظیم لازمی ہے تاکہ ہر بونی آزادانہ اپنے عقیدے کے مطابق بلا روک ٹوک اپنے محبوب کی عبادت میں لگ سکے۔ مضمون طول و طویل ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ خارجی ندرغ البالی کے حاصل کرنے کے لئے ملک میں نظم و نسق کا ہونا ضرور ہے۔ نواہ وہی جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ جس نے کسی ایک فرد کو اجائے احکام کے لئے منتخب کیا ہو۔ یا وہ کسی ایسی ممتاز ہستی کے زیر نگیں ہو۔ کہ جسے ملکی رسم و راج کے ماتحت قدرت کی جانب سے کسی ایسے خاندان میں پیدا ہونے پر جو کہ ایک حکمران فی جمیع صفت سے متصف ہونے کے لحاظ سے مستحق ہو۔ نائزہ تسلیم کر لیا گیا ہو۔

پس ایسی ہستیوں کی قدر و تعظیم نہایت لازم ہے۔ جو کہ ملک میں نظم و نسق اور قوم میں تنظیم پر جوہ احسن برقرار رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مذاہب میں بادشاہ کو ظل الہی کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور یہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ اس ہستی میں کوئی طاقت کلا یا سکھی کا رکھن ہے۔ جو دیگر افراد میں نہیں پائی جاتی۔ ایسی ہستیوں کے احکام کے دیرو سر تسلیم خم کرنا عین سعادت ہے۔ اور موجب رضا خدا ہے۔

ج۔ ملک میں امن و چین اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب کہ ہر ایک فرد بشر دوسرے کے احساسات و جذبات کی اتنی ہی قدر کرے۔ جس قدر کہ خود اپنی، نیز راہ راست پر چلتے ہوئے ملکی مٹین کا ہر ایک پرزہ اپنے فرائض سر انجام دے۔ یہی وجوہات ہیں۔ جن کی بنا پر سکاؤٹ کا پہلا عہد مقرر کیا گیا ہے۔ اور سکاؤٹ کیلئے دائمی راحت فارغ البالی اور امن چہن حاصل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی رضا پر راضی ہو۔ اپنے حاکم اور بادشاہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اور اپنے ملک کے لئے ایثار نفسی اور قربانی کا نمونہ بنے۔ اور نظم و نسق سے اس عہد کو نبھائے۔ اگر ہر ملک کا ہر ایک شہری اس تنظیم کے زیر اثر تربیت حاصل کرے۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ملک میں جھگڑا فاش البالی اور امن چین کا دور دورہ نہ ہو۔

عہد دوم

شاعر نے کہا ہے در و دل کیا اسے پیدا کیا انسان کو + ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کردیاں

خالق نے اپنی مخلوق میں بُرے اور بھلے سب پیدا کئے ہیں۔ اور انسان دُنیا میں بہتے ہوئے ہر لحظہ افعال و اعمال کی قید میں جکڑا رہتا ہے۔ اگر یہ جملہ اعمال نیک ہوں تو انسان فرشتہ بن جائے۔

خدا سے میل معدودے چند ہستیوں کا ہوا ہو تو ہوا ہو۔ ورنہ خدا کا تصور اس کی صفات سے ہی قائم کیا جاتا ہے اور خدا کی خدمت اس کے بندوں کی خدمت پر مشتمل ہے۔ ورنہ خدا خدمت کا جھوکا یا محتاج نہیں۔ رح نہ چاہوں میں اسے کیونکر میرے پیارے کا پیارا ہے

کے مصداق خدا کی محبت اس کے بندوں سے محبت کرنا ہے۔

اس لئے لازمی ہے کہ انسان کی خدمت کی جائے اور اُس سے محبت کی جائے چنانچہ سکاؤٹ سے عہد دوم کا مطالبہ کوئی غیر مرغوب شرط نہیں۔ بلکہ خود اسے خدا سے میل کرانے کی شاہراہ پر گامزن کرنا ہے۔

جب سہ رجب بالا دو وعدوں کی اہمیت واضح ہو گئی۔ تو ان کی پابندی کے لئے سکاؤٹ میں قابلیت کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس قابلیت کے پیدا کرنے کی غرض سے دس قوانین بطور ذرائع مقرر کئے گئے ہیں۔ جن کی تیسرے میں سکاؤٹ راہِ راست پر چلے ہوئے لغزش نہ کھائیگا۔

مکمل ذات خدا ہے اور تکمیل حاصل کرنا فرضِ انسان ہے۔

اگر کوئی انسان چند اوصافِ حمیدہ سے مستفیع ہے۔ اور اُمذہ کے لئے بہتر سے بہترین بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ تو وہ اس انسان کے مقابلہ میں جو کہ ابتدائیں کوئی اعلیٰ ہستی نہیں۔ لیکن حصولِ تکمیل کے لئے ہمہ تن کوشاں ہے اور ناپسندیدہ صفات کو ترک کر کے صفاتِ حسنہ کے اکتساب میں مامی ہے۔ کسی صورت میں افضل تر نہیں۔

پس سکاؤٹ کے نام کے ساتھ متواتر ترقی لازم و ملزوم ہے۔ اور جب کسی سکاؤٹ نے اپنی اُمذہ ترقی میں کوشش کو ترک کر دیا۔ وہ سکاؤٹ کہلانے کا مستحق نہیں رہا۔ اس لئے ہر سکاؤٹ کے لئے لازم ہے کہ وہ بہتر سے بہترین بننے کے سلسلہ ترقی کو لگاتار جاری رکھے۔ اور اپنے خیالات اقوال و افعال سے عوام کے دلوں پر سکاؤٹ تحریک کی اہمیت کا سکہ ثبت کر دے۔

اب دس قوانین سکاؤٹ کی نسبت مختصر عرض ہے :-

قانونِ اول

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ دنیا بھر کا کاروبار خواہ وہ کسی شعبہ کے متعلق ہو۔ صرف اعتبار پر چل رہا ہے۔ خواہ بیوپار ہو یا صنعت و حرفت۔ خواہ ملازمت ہو یا حکومت۔ اگر آج دُنیا سے اعتبار اٹھ جائے۔ تو تمام کاروبار بند ہو جائے گا۔

----- مثل مشہور ہے۔ جان جائے پر آن نہ جائے۔

دنیا میں ہر شخص عورت حاصل کرنے کے لئے اپنا سرمایہ - دھن - دولت سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔ کوئی اس عورت کو پلک کے ناماندہ کی شکل میں تلاش کرتا ہے۔ کوئی خطابات کے سمجھے لگ رہا ہے۔ کوئی ممتاز عہدے حاصل کرنے کے درپے ہے۔ کسی کے دل میں رفاہ عام کی دُھن سمائی ہے۔ غرض کہ ہر کس بقدر محنت و ادست کے مصداق ہر کدھر عورت کی دیوی کی صنیٹ اپنے عزیز ترین سرمایہ کو قربان کرنے میں گریز نہیں کرتا۔ لیکن مقام انیسس ہے کہ ہر قدم پر وہ منزل مقصود سے دور ہو جاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے ۷

خدا اُس پاس وہ ڈھونڈھے ہے جنگل میں

وُھندو ا شھر ۾ ٺر ڪا بھل ۾

ریت کی نیا دہر عالیشان عمارت کو کھڑا کرنے میں سرمایہ زندگی صرف کر دیا جاتا ہے۔ اور آخر میں جب اس دنیا سے کوچ کا وقت آتا ہے۔ تو صبح خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ کا در در کرتے ہوئے سینہ پر بارگراں لئے عالم فانی سے روانہ ہو جاتے ہیں۔

مثالیں موجود ہیں۔ جو بیابانگ دہل پکار پکار کہتی ہیں کہ حقیقی عزت کے حاصل کرنے کے لئے راستبازی اختیار کرو۔ قول کے دھنی بنو۔

کیا ہمارا جہ راہچندہ جی کی صحرانوردی خارجی از علت تھی؟

باپ کا قول نبھانے کی غرض سے چودہ سال جنگوں میں دکھ سے - عزیزوں سے جلدی اختیار کی۔ لیکن جھوٹی عزت کو اختیار نہ کیا۔ ایک طرف راج پاٹ - والدین کا اصرار - رعایا کی التجا اور کوئی رکاوٹ راستے میں حائل نہ تھی۔ اور دوسری طرف سراسر مصائب و تکالیف۔ لیکن واہ رے (مریاد پر شوق) - فرض مجسم - ذرا ارادے کو متزلزل نہ ہونے دیا۔ اور خندہ پیشانی بنوں کو سدھارے۔ اور دنیا بھر کے لئے ایک مثال قائم کر گئے۔

جلد تواریخ ایسے کارناموں سے پُر ہیں۔

پس مکمل انسان وہی ہے۔ جو حقیقی عزت کے مقابلے میں حرص و ہوا کو لات مارے۔ اور اپنی آن پرکٹ مڑے کیا بھی اچھا ہو۔ اگر سکاوٹ اپنے رویہ سے یہ ثابت کر دکھائیں۔ کہ عدالت میں بجائے ایمان یا دھرم کے ان سے یتیم لی جائے۔ کہ میں اپنی آن پر جو کچھ کو لگنا۔ سچ کہوں گا۔ پس سکاوٹ کا پہلا قانون اسی غرض سے مقرر کیا گیا ہے کہ سکاوٹ کی عزت قابل اعتبار ہے۔

قانون دوم

دُنیا بھر کے مصائب دور ہو جائیں۔ اگر ہر ایک انسان اپنے فرض کو سمجھے۔ اور اسے انجام دے۔ بیوی۔ بچے

معاذی بندہ۔ خویش۔ اقارب۔ دوست آشنا۔ والدین۔ افسر۔ مانت۔ بادشاہ اور رعایا ہر ایک کے ذمے کوئی نہ کوئی فرض ہے جب تک ان میں سے ہر ایک اپنے فرض کو نبھاتا رہتا ہے۔ دنیا میں امن چین کا راج رہتا ہے۔ شیر گیری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ لیکن جوہنی ان میں سے کسی نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی۔ نظام دنیا ہم برہم ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کو برقرار رکھنے کے لئے قانون و قواعد مرتب کرنے پڑے۔ تاکہ خدا دار کو سزا ملے۔ اور دوزخ کے لئے باعث عبرت ہو۔

سکاؤٹ کا دوسرا قانون اُسے فرائض کی ادائیگی کی تلقین کرتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی دیت کے طریق کو ایسے سانچے میں ڈھالے۔ کہ زندگی میں اسے نچا نہ دیکھنا پڑے۔ چنانچہ یہ قانون ہدایت کرتا ہے کہ

” سکاؤٹ اپنے بادشاہ اپنے حاکم اپنے والدین اپنے ہمسروں اور اپنے ماتحتوں کا وفادار ہوگا اور کسی سے دغا نہیں کرتا“

قانون سوم

۵۔ بنی آدم اعضاء یک دیگر اند + کور آفرینش نیک جوہر اند
چو عضوے بد و آرد و روزگار + دگر عضو ہاراند ماند قرار

دنیا میں جتنے بھی پیر پیغمبر۔ اولیاء۔ ائمہ اور خدا رسیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ سب کے سب خدمت خلق کو خدمت کا درجہ دے گئے ہیں۔ اور سب کو خدائی وصال کا زینہ قرار دے گئے ہیں۔ مگر انسان کی کیا مجال کہ جل جلالہ کی تخلیق کو نظر بھر کر دیکھنے کی تاب لاسکے۔ دنیا کے جو۔ جنتو۔ چرند۔ پرند اور انسان کی سیوا ہی پر ماتمائی بھگتی ہے اور وصال پائی کا اعلیٰ ذریعہ! ۵

طریقیت بجز خدمت خلق نیست
پنہنج و تجاود و دقت نیست

چنانچہ سکاؤٹ کا تیسرا قانون اُسے ہدایت کرتا ہے کہ

” وہ اپنے اندر سیوا کی قابلیت پیدا کرے اور بنی نوع انسان کی امداد کرے

اسی بنا پر سکاؤٹ کے مختلف مشاغل اور اعزازی نشانات مقرر کئے گئے ہیں۔ تاکہ وقت پڑے پر سکاؤٹ اپنی علمیت اور قابلیت کا پورا استعمال کر سکے۔ اور ہر حالت میں چلہ جامہ چٹ اور تیار پایا جائے۔

قانون چہارم

جس وقت سکاؤٹ کے اندر سیوا اور خدمت کی قابلیت پیدا ہو گئی۔ تو وہ اس قابلیت کا جائز اور حقیقی استعمال

اسی وقت کر سکتا ہے۔ جب کہ اس کے اندر خدمت اور سیداکے لئے سچی خواہش اور دلی احساس ہو۔ بیشیز اس کے کہ کوئی شخص کسی کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے اندر خدمت کے لئے خواہش پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ خواہش ذاتی اغراض کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ یا محض اس شخص میں فطرتاً یہ جذبہ ہوتا ہے۔ کہ دوسروں کی تکالیف میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ اور انہیں دکھ سے نجات دے۔ سکاؤٹ کی خدمت کا معیار نہایت اعلیٰ ہونا چاہئے۔ اس کا لالچ یا صلے اور انعام کی غرض سے خدمت پرستند ہونا سکاؤٹ تحریک کو ذیل کرنا ہے۔

پس یہ ضروری ہے کہ سکاؤٹ کی خدمت بلا غرض اور بمنزلہ فرض ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے تعلقات کا دائرہ نہایت وسیع ہو۔ وہ دنیا کے ہر ایک انسان کو اپنا دوست شمار کرے۔ اور ہر دوسرے سکاؤٹ کو اپنا بھائی سمجھے۔

بعض اصحاب کو اس امر کا بہت گھٹنڈ اور اطمینان ہوتا ہے کہ ایک قوم ان کی پشت پناہ ہے۔ چہ جائیکہ سکاؤٹ جس کی برادری۔ دئے زمین کے ہر بچے میں اس کی حمایت پر کمر بستہ ہے۔ سکاؤٹ خدا سے اتکر دوسرے درجہ پر دنیا کے ہر ملک و قوم کے سکاؤٹوں کی اوٹ اور پناہ لئے ہوئے ہے۔

انگلستان کی عالمگیر جمہوری (World Scout jamboree) کا عہد شان نظارہ اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ دنیا کے کونے کونے میں سکاؤٹ بھجیت صلح و آشتی کا پیغام لے کر گئی ہے۔ اور جنگ و جدل کے کھمارے کو سکاؤٹ تحریک کے بانی بانی لارڈ ولبرٹ بیڈن پاؤں نے ہمیشہ کے لئے زندہ دگر کر دیا ہے۔ صبح کے نہری تیرہ ہلکے قوم کے سکاؤٹ نمائندوں کے ہاتھ میں اپنا اثر دکھائیں گے۔ اور خدا کرے وہ دن نزدیک ہو جبکہ سکاؤٹ تحریک کے ماقبول دنیا کے تنازعات اور منافرت کا قلع قمع ہو۔ لارڈ بیڈن پاؤں کی رقت آمیز اور دل گداز اپیل اپنا رنگ لائے۔ اور دنیا میں امن کا امن قائم ہو جائے۔

پس چوتھے قانون کی روت سے سکاؤٹ کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ
”وہ ہر انسان کو اپنا دوست خیال کرے اور ہر دوسرے سکاؤٹ کو بلا تمیز عہدہ یا کسی دنیاوی عزت کے اپنا بھائی شمار کرے۔“

قانون پنجم

کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان ناخوشگوار تعلقات و توہین پذیر نہ ہوں۔ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان لوگوں سے ساتھ جن سے ہمارا دن رات واسطہ پڑتا ہے۔ خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔ اگر ہم کسی کو شہد نہ ٹھکانے کہتے ہوں۔ تو کم از کم ہمارا کلام تو شیریں ہو۔“

پس سکاؤٹ سے امید کی جاتی ہے کہ وہ خوش اخلاق بنے۔

قانون ہشتم

جب ہم خود راحت کے متلاشی ہیں۔ تو ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم اوروں پر ظلم و ستم روا رکھیں۔ اور خاص کر بے زبنا چرند و پرند کو جو دفاتشاری اور خدمت میں انسان سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ محض تفریح و تماشا کے غرض سے ایذا پہنچانا گناہ و کبیرہ ہے اور سکاؤٹ کا چھٹا قانون اسے ہدایت کرتا ہے۔ کہ وہ جانداروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔

قانون ہفتم

۵ بے سجادہ رنگین کن گرت پیر میناں گوید + کہ سکاٹ بے خبر نہ بود نہادہ و رسم و سنز لہا ضبط کا پہلا اصول فرماں برداری ہے۔ خدا جس کسی کو حاکم بناتا ہے وہ اسے حکمرانی کی صفات پہلے عطا کر دیتا ہے اور مانت کا فرض ہے کہ اپنے حاکم کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرے۔ دُن دُنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جو شخص فرماں برداری کرنا نہیں جانتا۔ وہ کبھی کامیاب فرماؤا نہیں بن سکتا۔ سنت کبیر نے فرمایا ہے ۵

پہلے دانا شیش بھیا، جن تن من اپا پائیس

پیچھے دانا گورو بھیا جن نام کیا بخشیش

پس سکاؤٹ کے ساتوین قانون میں اُسے فرماں برداری کا سبق ملتا ہے۔ یعنی سکاؤٹ اپنے افسروں کے احکام بلا حیل و حجت بجالاتا رہے

قانون ہشتم

۵ دل دے تو اس مزاج کا پرور دگا دے + جو رنج کی گھر ٹھی بھی خوشی سے گزار دے دکھ اور تلخیت اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انسان کا فرض ہے کہ ان دکھوں کو برداشت کرنا سیکھے۔ اور ان کے رفع کرنے کی سبیل نکالے۔ نہ کہ دکھ کے بوجھ سے دب کر اپنی اور دوسروں کی زندگی دھجھ کر دے۔ سچ پوچھو تو ۵ مصیبت کا احوال ہر اک سے کہنا + مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

اگر کوئی مشکل آ پڑے۔ تو انسان کا فرض ہے کہ اسے حل کرنے کی تدبیر کرے۔ ایک فلاسفر کی نسبت بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ غلامی کی حالت میں اپنے ظالم آقا کی بہ ہمہ نوع خذہ پیشانی سے خدمت کرتا۔ ایک مرتبہ ظالم آقا نے کسی کوتاہی پر اس کی ٹانگ کو ٹکسنج میں ڈال کر اسے مروڑا۔ فلاسفر نے کہا۔ اس سے زیادہ نہ مروڑیے، ورنہ ٹانگ

ٹوٹ جائے گی؟ ظالم زمانہ - ذرا اور مڑا اور ٹانگ ٹوٹ گئی - لیکن واہ رے برداشت! فلاسفر صاحب کہنے لگے کہ میں نہ کہتا تھا کہ ٹانگ ٹوٹ جائے گی - دیکھا ٹوٹ گئی کہ نا پس قانونِ شتم سکا ڈٹ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ مشکلات کا مقابلہ سکا ہٹ سے کرے - ادیشی بجا کر غم غلط کرنے کی کوشش کرے -

قانونِ نہم

دور ادیشی اسی میں ہے کہ انسان اپنی ضروریات میں حد سے تجاوز نہ کرے جتنی چادر دیکھے - اتنے پاؤں پھیلے اپنے گاڑے پسینے کی کمانی کو مفت میں برباد نہ کرے - چنانچہ کھانا شکاری سکا ڈٹ کا لازمی فرض ہے اہل قانونِ نہم اس کی تلقین کرتا ہے -

قانونِ دہم

انسانی زندگی اعمال کا مجموعہ ہے - اور اعمال کا سلسلہ نہایت دقیق ہے - اعمال نیک ہو سکتے ہیں یا بد - ان کے نیک یا بد ہونے کا میدانِ تجربہ پر منحصر ہے - اگر کسی عمل کے کرنے سے عالم و معمول کو سکھ اور آسند یا راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے تو عمل نیک ہے - ورنہ برعکس نتیجہ برآمد ہونے پر اس عمل کے بد ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے - دنیا میں سکھ - آسند - راحت اور خوشی حاصل کرنے کے لئے ہر کہ و مہر کوشاں ہے -

پس یہ لازمِ غیر - کہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے جو عمل اختیار کیا جائے وہ نیک ہو -

چنانچہ ہر ایک مذہب اپنے پیروؤں کو اعمالِ صالح کی تلقین کرتا ہے جن سے کہ دائمی راحت سکھ اور آسند پراپت ہو - اب اعمال کی تین صورتیں ہیں - یعنی نسا - باچا - کرنا - یا خیالات - اقوال اور افعال - مثال کے طور پر یوں سمجھئے - کہ ہمارے دل میں کسی عمل کے کرنے کی خواہش یا خیال پیدا ہوتا ہے - ہمارے اندر ایک ایسی دھڑکتی ہے - خواہ ہم نے اس کے پیردنی اظہار سے پیشتر ضبط سے کام لیا - لیکن ہمارا ویہ - ہمارا بشر و چشم بنا پر ہمارے اندر دنی جذبات کا اظہار کر دیتا ہے -

اس عمل کا اظہار ہم بول کر زبان سے کر سکتے ہیں - اور تیسرے درجہ پر اسی خیال کو ہم کسی فعل کی شکل میں عملی جامہ پہنا سکتے ہیں - پس ہر مذہب میں اس امر کی بار بار تاکید کی گئی ہے کہ ہمیں خیالات - اقوال اور افعال سے کسی کو دھڑکتے نہیں پہنچانا چاہئے - بلکہ سچ پوچھ تو اکیلے اس اصول پر کاربند ہونے سے انسان دنیا و عاقبت میں دونوں جگہ عمدہ برآمد ہو سکتا ہے - اور سکا ڈٹ کا آخری قانون ہر مذہب کے نقطہٴ نگاہ سے ایک ایسی اعلیٰ تعلیم ہے - کہ جس کے زیر اثر سکا ڈٹ خود بخود اپنے مذہب کا حقیقی پیرو بن سکتا ہے - عالم بنا انسان ہے - لیکن عامل بنا مشکل ہے - پس جب تک کہ بچے کو شروع سے بغیر

نہی زنجیروں کی قید کے اعمال پاکیزہ کی جانب راجع نہ کیا جائیگا۔ اور اسکی عادات راسخ نہ کی جائیں گی۔ خدشہ ہے۔ کہ بڑا بچہ اپنے مذہب کے اصولوں پر کاربند ہونے سے قاصر رہے۔ چنانچہ سکاؤٹ کا دسواں قانون اسے خیالات، اقوال، افعال میں پاکیزہ رہنے کا سبق دیتا ہے۔

سکاؤٹ قوانین کا مقصد اور مدعا مختصر بیان کر دینے سے یہ امر واضح ہو چکا ہے۔ کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے قول کے دھنی ہوں۔ وہ وفائش اور فرض شناس بنیں۔ وہ سعادت مند اور فرمانبردار بنیں۔ ان میں استقلال و تحمل کی عادت پیدا ہوں۔ وہ کفایت شایع بنیں۔ اور پاکیزہ خیال۔ خوش اقوال اور نیکو افعال رہیں۔ ان میں قربانی اور ایثار فی کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ حقیقی محبت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ تو سکاؤٹ تربیت سے بہتر اور کوئی تربیت جو ہر ایک ملک و قوم اور ہر مذہب و ملت پر یکساں عائد ہو سکے۔ آج روسے زمین پر نظر نہیں آتی۔

یہ امر واضح رہے کہ یہ تعلیم و تربیت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب کہ سکاؤٹ ماسٹر خود اس تربیت سے بہرہ یوں۔ اس کے اصولوں سے ماہر اور ان پر عملی طور پر پچھے دل سے کاربند ہوں۔ اور وہ اپنے زیر تربیت سکاؤٹوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔

انگلستان کے ۱۹۲۹ء کی عالمگیر جمبوری (World Scout jamboree)۔

میں بین الاقوامی محبت اور پریم کے جو نظائر دیکھنے میں آئے۔ وہ نہایت حوصلہ افزا تھے۔ جاپانی، ترکی یا جرمن، ہندو، انگریز یا امریکن، حبشی، فرانسیسی، برازیلین وغیرہ ہر ایک ملک و قوم کے بچے حقیقی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے تھے آپس میں ہنستے، کھیلتے تھے اور خندہ پیشانی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ عجب گلزار تھا جس میں تمام روئے زمین کے لہائے گوناگوں اپنی رنگ و بو سے تماشا یوں کے دلوں میں صلح و اشتی کے سرور کی جھلک پیدا کرتے تھے۔ اور سکاؤٹ فریک کے جد امجد لارڈ بیڈن پاول کے تشریف فرما ہونے پر کس ناز و انداز سے اس کے قدموں پر شمار ہونے کے لئے آمادہ نظر آتے تھے۔ یہ نظارہ دیکھنے سے ہی قلب رکنا تھا۔

سچے ہم آہنگ ہو کر لارڈ بیڈن پاول کی آمد پر (He is a jolly good fellow)۔

کا نغمہ جو کیفیت سامعین کے دلوں پر پیدا کرتا تھا۔ وہ ملت العز کا لوں میں گونجتا رہے گا۔

خاتمہ پر درگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو توفیق دے۔ کہ ہم اپنی غامیوں کو دودھ کے دیگر اقوام کے دوش بدوش خدمت خلق بنالائیں۔ اور دنیا سے رنج و دلم کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں۔ آمین۔

سکاؤٹ تحریک کا مقصد بچہ مندجہ بالا مقاصد کے ایک ہی جملے میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ آنے والی نسل کے سیدان اور چمن کو ایسے معیار پر لانا ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کو ادائیگی فرض کا ایک مسلسل اور بول زمانہ خیال کریں۔ اور مفید شری بنیں۔ دھاپا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہوں۔ وہ دوسروں کے راستے میں حائل نہ ہوں۔ بلکہ دوسروں کے مدد و معاون بنیں۔

وہ زندگی کو وبال جان خیال نہ کریں۔ بلکہ اس میں دل چپی لیں۔ اور دوسروں کی زندگی دل چسپ بنائیں۔ دنیا دی مکھوں کی تحفیف کریں۔ اور اپنی نوع انسان کے لئے حقیقی راحت کا دروازہ کھولیں۔
نواب غلام احمد یار خاں احمدی کے مندرجہ تحت اشعار ہمنایت و صاحت سے سکاؤٹ کے فرائض کو بیان کرتے

ہیں:-
میں دقت تک تجھ کو ملا ہے سیر کا فرماں غرض یہ تھی کہ جب ہو جلوہ بخش گلشنِ امکاں!
ترے آنے سے ہوں سب ہمنشین چن دلا چلن سے تو عزیز دل ہواں کا اور سرور جاں

تو ہر اک حال میں ان کا شریک مہنوائی ہو
دلوں میں انکے جا ہو تیری سنیو نیں سانی ہو
مصیبت جس کو پیش آئے تو اس کا آشنا تو ہو کوئی ماتم زدہ پائے تو اس کا غم ربا تو ہو
کوئی ہو راہ گم کردہ تو اس کا رہنما تو ہو غرض ہر زخم کا مرہم ہو ہر دکھ کی دوا تو ہو
جہاں مشکل کی پڑ جائے گرہ ناخن ترا کھوے

تو ہر اک درد میں شامل ہو ہر آواز میں بولے
جہاں کانٹے نظر آئیں کرے تو صاف ہرستہ تجھے ہر دم برہنہ پائے بلکہ کسے کھٹکا
نہ ہو پا مال گچیں سبزہ خوابیدہ گلشن کا جلانے پائے گلبن کو نہ بادِ گرم کا جھونکا
لڑیں دیہلیں تو ٹالسٹ باخیر تو ہوئے
معاذی ہو کے مادی بنکے گرم سیر تو ہوئے



قدیم ہندوستان میں ہندوؤں کا طریقہ تعلیم

(جناب سید خادم حسین صاحب ضوی ایم اے)

قدیم یونانیوں کی طرح ہندوستانی بھی فلسفہ کا شوق لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اور مذہب کے شیدائی تھے۔ یعنی فلسفہ انکی جبلت اور مذہب طبیعت ثانیہ تھا۔ تدریس کی تعلیمی درگاہیں اس رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ یہ فلسفہ کے پتے۔ مذہب کے مجھے۔ شہری زندگی سے سخت متنفر۔ جنگل کو اپنی بہترین جائے اقامت سمجھتے تھے۔ لیکن علم کے پروانے جہاں یہ شمع روشن ہوتی تھی۔ اڑ کر پہنچتے تھے۔ جب شہری زندگی نے ترقی پائی۔ اور عامۃ الناس کے لئے اپنے بچوں کو آبادی سے دور بھجنا دشوار محسوس ہونے لگا۔ تو شہروں میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن ان کا اعتقاد پھر بھی یہی رہا۔ کہ حصول علم و معرفت کے لئے جنگل کا گوشہ نشینی ہی نہایت موزون تمام ہے۔ یہیں انسان فتنہ ہائے عالم سے بچ کر آرام و سکون کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ دنیا کے جھگڑوں سے آزاد۔ پیٹ کے دھندوں سے بے نیاز۔ فرشتہ صورت شیطان ہیرت نگار، دغا بازوں کی صحبت سے دور۔ حرص و ہوا کے جہال سے علیحدہ سادگی۔ سچائی اور زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ارد گرد جو بیان حق کے جھگھے ہیں۔ علم و معرفت کے چرپے ہیں۔ کیوں نہ ہو ایسی ہی اور فقط ایسی ہی زندگی ان بزرگوں کی پسند خاطر ہو سکتی تھی۔

دہاں ان سب کا تہہ کیا ہوتا تھا۔ غلام اور آقا میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ امیر و غریب۔ شاہ و گدا۔ راجہ و دربار جاب سادی سمجھے جاتے تھے۔ شہروں اور دیہاتوں میں جا بجا لقاؤ سکول کھلے ہوئے تھے۔ اور میکلا۔ بنارس۔ ندیا وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں تھیں۔ جہاں دور دراز علاقوں سے طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جوق در جوق آتے تھے۔ یہ تمام یونیورسٹیاں رہائشی ہوتی تھیں۔ اور ہر ایک اتنا رقبہ نبھائے ہوئے تھی۔ کہ اس میں عمارت ضروری کے علاوہ سب سے زار اور ان میں چھوٹی چھوٹی ندیاں۔ عجائب خانہ اور چڑیا گھر بھی شامل تھے۔

یہ تمام عمارت پختہ ہی نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض بلکہ بیشتر کی یہ حالت تھی۔ کہ صرف گارے کی چادر دھاری نہ پائی۔ تاہم کچھ اور ساکھو وغیرہ کی بنی رکھی۔ اور گھاس پھوس کا پھیر ڈال لیا۔ علاوہ انہیں ان چھوٹی چھوٹی میں کوئی قابل ذکر سامان بھی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے چٹائیوں پر یا قدت کے خمی فرش پر سب سے زاروں میں میٹھے کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور ان کے

معلم بغیر خاص امتیاز کے ان کے درمیان تشرفین فرماہوتے۔

اس سادگی کا یہ فائدہ تھا کہ جہاں ضرورت ہوئی فوراً دس دہائیں کا سلسلہ شروع کیا جاسکتا تھا۔ بزرگوں کو کبھی مالی قلتوں کی تکلیفیں پیش نہ آئیں۔ کسی قریب کے درخت کا سایہ جماعت بٹھانے کے لئے نہایت موزوں ہوتا۔ اد اگر بزم کی خرابیوں نے تنگ کیا۔ تو نزدیک کا برآمدہ سب سے عمدہ جاسے پناہ تصور کی جاتی تھی۔ اس طور پر سرمایہ کی قلت ان پرانے لوگوں کی تعلیمی ترقی کے راستے میں ہرگز حائل نہ ہو سکتی تھی۔

فیس

ہر ایک برہمن کے لئے تعلیم دینا فرض ہوتا تھا۔ اور ان کو فیس یا کسی قسم کا معاوضہ لینے کی سخت ممانعت ہوتی تھی۔ البتہ جب کوئی شاگرد فارغ التحصیل ہو جاتا۔ تو اس سے وہ تحفے کے طور پر کچھ عطیہ منظور کر لینے کا مجاز تھا۔

اخراجات

چونکہ عمارتیں اور سامان سکول بہت معمولی ہوتا تھا۔ اس لئے اخراجات سکول بھی نہایت معمولی ہوتے تھے۔ اور جو کچھ تھوڑا بہت ہوتا اسے عام لوگ مل کر پورا کر دیتے۔ لیکن بڑی بڑی درگاہیں اور یونیورسٹیاں راجاؤں اور رئیسوں کے عطیات کے بل پر قائم تھیں۔ وسیع رقبہ زمین لگان سے بری ان کے سپرد کر دیا جاتا۔ اور عطاءزیر کافی مستقل سرمایہ ان کے پاس جمع رہتا تھا۔ جو طلباء امیر گھرانوں سے آتے۔ انہیں اپنے تمام زمانہ تعلیم کا خرچہ آغا میں جمع کرنا پڑتا۔ مگر اس کے بعد ان کو دیگر طلباء کے ساتھ مساوی درجے پر زندگی بسر کرنا ہوتی تھی۔ امیر غریب میں کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ اور سب کو یکساں خوراک و لباس ملتا۔ مگر چھٹی چھوٹی درگاہوں میں طلباء اپنے لئے اور اپنے استاد کے لئے خورد و نوش کا سامان و دیگر بھیک مانگ کر دیا کرتے تھے اور یہی رواج قرون وسطیٰ میں یورپ کی قدیم درگاہوں میں پایا جاتا تھا

طالب علم کے فرائض

شاگردوں کو ادائیگی فرائض کے علاوہ استاد کے تمام خانگی امور کو سرانجام دینا ہوتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے استاد کے احکام کے لئے دست بستہ منتظر رہتے۔ گویا وہ ان کے بلا تنخواہ خدام تھے۔ ان کا زمانہ تعلیم خاص نظام کے ماتحت ہوتا۔ اور ان کو اخلاقی طور پر ایک خاص سانچے میں ڈھالا جاتا تھا۔ چنانچہ ممنو نے اپنے آئین میں چند ان اخلاقی جہانی معاشرتی اور مذہبی پابندیوں کا ذکر کیا ہے۔ جن پر کار بند ہونے کے لئے اس زمانے میں طلباء کو خاص تاکید ہوتی تھی۔ ملاحظہ ہوں:-

طلباء کو ہر روز نہانا ضروری ہوتا تھا۔ شہد اور گوشت کا کھانا۔ خوشبودار بھولوں کے ہار کا استعمال۔ دن کو سونا۔ سرمہ لگانا۔ گانٹھی پر چڑھنا۔ جوتا پہننا۔ محبت۔ غصہ۔ لالچ۔ ناچنا۔ گانا بجانا اور تفریح کے لئے نہانا۔ یہ سب چیزیں منع تھیں۔ اور کم و بیش ان کی پابندی کی جاتی تھی۔ طالب علموں کے لئے اپنی زبان۔ ہاتھ پاؤں اور بھوک پر قابو رکھنا۔ شراب اور دیگر فحش چیزوں سے پرہیز کرنا ضروری تھا۔ سچ بولنا اور بڑوں کا ادب کرنا اس کے حسن اخلاق میں داخل تھا۔

مغربی تہذیب صرف طلباء پر ہی عائد نہ ہوتی تھیں۔ بلکہ استادوں کے لئے بھی مقرر تھیں۔ مالی یا ذاتی اغراض کو مد نظر رکھ کر پڑھانا ان کے نزدیک مکروہ تھا۔ اور وہ درس و تدریس کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ شاگردوں کو بیٹوں جیسا سمجھا۔ ہندوؤں کے قدیم اساتذہ کا عام رویہ تھا۔ اور ان کا قول تھا کہ "قہر استاد بہ زہرید" اور ان کا خیال تھا کہ طلباء میں اعلیٰ معیار تعلیم قائم کرنا اور حسن اخلاق پیدا کرنا اسی صورت میں ممکن تھا۔ جب کہ ایک شاگرد کے لئے ایک استاد مقرر ہو۔ گو اس نعمت سے عامۃ الناس محروم تھے۔ اور صرف رؤسا ہی کو میسر آ سکتی تھی۔ تاہم ایک استاد کو نہایت ہی مختصر حیات کا اتالیق بنایا جاتا تھا۔ وہ اکیلا ہی از ابتدا تا انتہا اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا تھا۔ یعنی یہ موجودہ رواج کہ ہر ایک محنت کے لئے عہدہ استاد ہونا چاہئے۔ ان دنوں معدوم تھا۔ اور اس کا یہ فائدہ تھا۔ کہ وہ لڑکوں کے اخلاق کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر سکتا۔ اور اس طرح ان کا صحیح مرتبی بن سکتا تھا۔ قدماً لڑکوں کو بھی اپنے استادوں سے کمال اُلفت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ مختلف رواج ولایت ملک ہندوستان میں درگاہ کو نہیں بلکہ استاد کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ انگلستان دے اپنی درگاہوں پر ناز کرتے ہیں۔ مگر اہل ہند اپنے خاص استاد پر۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ یہ خیال اب بھی لوگوں کے دماغوں سے نہیں گیا۔ کہ بہترین استاد وہ ہے۔ جو ہر وقت طلباء کے درمیان رہے۔ اور ہر ایک مسئلے پر روشنی ڈالے۔ مشکلات علمی کو حل کرے۔ اور دیگر حل طلب امور پر نصیحت کرے۔ مگر استاد صرف مقررہ وقت پہ آئے۔ اور پڑھانے کے فوج پر چڑھ کر چلے گئے۔ اور پھر سارا دن نظر نہ آئے۔ اُسے ہمارے بچے مفرد سمجھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔

مضامین نصاب

ہر وقت سوچنا اور خود کرتے رہنا آئین کی فطرت تھی۔ اور مذہب طبیعت ثانیہ۔ اس وجہ سے عاقبت کا خیال اُن کے دماغ میں ہر وقت جاگزیں رہتا تھا۔ جس سے اس دنیا کی ان کی نظریں کو کبھی وقعت نہ تھی۔ ان حالات میں ظاہر ہے۔ کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم ہی ایسی دیتے تھے۔ جس سے ان کی عاقبت سنور جائے۔ اور لازماً اس قسم کی تعلیم سے زیادہ ذہنی ترقی ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ ان کے اس خیال نے کہ ہر ایک انسان اپنی ذات کے مطابق ایک خاص کام کے لئے پیدا ہوا ہے " ان کے تعلیمی دائرے کو اور بھی محدود کر دیا تھا۔

گویا ایک طرف تو دوسری دنیا کی تیاری کے خیال نے ذہنی ترقی کے دائرے کو محدود کر دیا تھا۔ دوسری طرف ذات پات کے سلسلے نے غیر برہمنوں کے لئے التعمیم تقریباً ناممکن کر دی تھی۔ وہ صرف اس قدر تعلیم حاصل کرتے تھے جو ان کے گادبار کے واسطے ضروری تھی۔

اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ذوق ہمیشہ تنگ رہا۔ اور اس لئے صدیوں تک صرف وہیوں کی تعلیم پر لوگوں نے اکتفا کیا۔ مگر یہ بھی فقط برہمنوں کے لئے مخصوص تھی۔ اور عام انسان اس نعمت سے محروم تھے۔

لیکن تحصیل وید کے لئے گرائمر، تلفظ اور علم الاسناد کی ضرورت تھی۔ لہذا یہ مضامین بھی نصاب میں داخل کر لئے گئے۔ علاوہ انہیں ہندوؤں کی مخصوص طرز عبادت کا تقاضا تھا۔ کہ علم انجور اور ہندسہ وغیرہ کی تحصیل کی جائے۔ اور سطح خود بخود ضرورت کے مطابق جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ نصاب تعلیم میں توسیع ہوتی گئی۔ شہری زندگی نے ترقی پائی۔ اور آہیہ درت کی ترقی پذیر تہذیب نے مختلف علوم و فنون کے ایجاد پر اصرار کیا۔ چنانچہ چندرہیت کے زمانے ہی میں منطق، حکمت و فلسفہ، سیاسیات، فنِ عمارت، علم نباتات، حیوانات، طبیعیات و کیمیا اور حساب و جبر میٹری وغیرہ ایسے علوم نے خوب رواج پایا تھا۔ اور مختلف درگاہوں کو مختلف شعبوں میں عروج حاصل تھا۔

خوشکہ جوں جوں انسانی ضروریات بڑھتی گئیں، علم کی شاخیں بھی پھیلی گئیں۔ لیکن اس کا مطالعہ ہمارے لئے اس قدر اہم نہیں، جتنا پرانے رشیوں کا طریقہ تعلیم۔

طریقہ تعلیم

جب میسوپوٹیمیا سے لکھائی ہندوستان میں آئی۔ اس کے پہلے اور بعد بھی تقریری اسلوب پرانے سطحوں کے ہمیشہ پسند فرمایا۔ استاد شاگرد دونوں کتاب سے بے نیاز تھے۔ اور شاگرد کا فقط یہی فرض تھا۔ کہ جب استاد بگوشا ہو۔ اُس کو گوش ہوش سے سنے۔ اور بار بار دہرائے جتنی کہ سبق ذہن نشین ہو جائے۔ حل طلب نکات کی توضیح اور مشکل مسائل کی تشریح کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لئے شاگرد استاد کے گرد حلقہ باندھ لیتے۔ اور جوشلوک وہ سناتا۔ اُس کے پیچھے پیچھے دہراتے جاتے۔ مگر اس طریقہ سے اکثر طلباء کا دل اُچاٹ ہو جاتا تھا۔ اور معلم کہانیوں اور لطیفوں سے اس کو دلچسپ بناتے تھے۔ اس فن میں ان لوگوں کو کمال مہارت حاصل تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ داستان و حکایت افسانہ و قصہ گوئی اور تمثیلات کے لئے ہندوستان مشہور ہے۔

انہندوؤں میں فلسفہ کی تعلیم حکایتوں اور نظیروں کے ذریعے سے دی گئی ہے۔ اور پنج منتر اور ہتو پدیش کے مصنفین نے اس طریقہ کو تعلیم اخلاق کے لئے مخصوص ہی کر دیا ہے۔

بہر حال پرانا طریقہ تعلیم انفرادی تھا۔ اور ایک استاد کے لئے ایک شاگرد دکانی سمجھا جاتا تھا۔ گو عملی طور پر یہ سوائے

راجاؤں کے سپوتوں کے اور کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ تاہم اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کہ جماعت نہایت مختصر ہو۔ اور استاد ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ سبق دے۔ جوڑکے زیادہ ہشیار۔ زمین اور چالاک ہوتے تھے۔ وہ استاد کو مدد دیتے۔ اور یہ مانیٹر مقرر کرنے کا طریقہ نہایت سخن تھا۔ اس سے نہ صرف استاد کی ہی کمال اعانت ہوتی۔ بلکہ بڑے لڑکوں کو اپنا سبق دہرانے اور احساس ذمہ داری کے لئے نہایت معقول موقع مل جاتا۔ انیسویں صدی میں جب ڈاکٹر آرنلڈ ہیل ہندوستان میں تشریف لائے۔ تو وہ اس طریقے سے بہت متاثر ہوئے۔ اور اپنی واپسی پر انہوں نے ولایت کے سکولوں میں اس مانیٹوریل طریقے کو رواج دینے کا تہیہ کیا۔

زمانہ تعلیم و تربیت

مذہبان سلف نے زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کر کے پچھلے حصے کو تحصیل علم کے لئے وقف کیا۔ عام طور پر یہ مدت بارہ سال مقرر تھی۔ اور اس میں ایک دید نہایت آسانی سے ختم ہو سکتا تھا۔ مگر اکثر شوق والے اپنی تمام زندگی کو اس کارنیک کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ سکول جانے کا وقت برہمن لڑکے کے لئے ۷ سال۔ کشری کے لئے ۱۰ سال اور ویش کے لئے گیارہ سال کی عمر سے شروع ہوتا تھا۔ مگر یہ میعاد مقررہ تصوری (Ideal) تھی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اپنی تعلیم کو بہت جلد ہی ہو کر شروع کرتے تھے۔

سزا

استاد اپنے طلبہ کو سزا دینا نہایت محبوب سمجھتے تھے۔ گو تم اپنے درشن میں لکھتا ہے کہ عام طور پر طالب علموں کو جہانی سزا اگر نہیں دینا چاہئے۔ مگر اصلاح کے لئے اگر کوئی راہ نہ ملے تو فقط پتلی رسی یا بید سے مارنا چاہئے۔ اگر کوئی استاد بچے کو کسی اور چیز سے مارے تو وہ دربار شاہی میں مستوجب سزا ہے۔ سزائے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ اور صرف رسی یا بانس کی لکڑی سے پیٹھ پر مارنے کی اجازت دی ہے۔ اور کسی عضو نازک پر لٹنے کو جرم قرار دیا ہے۔

طالب علموں کو نہایت اعلیٰ تربیت دی جاتی تھی۔ نظم و نسق نہایت عمدہ ہوتا تھا۔ مگر کیا مجال کہ اس میں سختی و درشتی کی جھلک تک بھی ہو۔ استاد شاگرد دونوں ایک نہایت عمدہ اخلاق اور چال چلن کا نمونہ ہوتے تھے استاد شاگرد کو بیٹے سے بڑھ کر عزیز رکھتا۔ اور شاگرد کی کیا مجال کہ استاد کے سامنے اونچا سانس بھی لے۔ معلم کو کوئی انعام دینا یا فیس کا لالچ نہ تھا۔ اور وہ درس و تدریس کو فقط ایک فرض الٰہی سمجھ کر انجام دیتا تھا یا مقابل اس کے شاگرد اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا شیعہ زندگی خیال کرتا تھا۔ ریاکاری یعنی اور گستاخی سے کوسوں بھاگتا

سادگی اخلاص اور حسن خلق کی اسے ہر وقت نصیحت ہوتی تھی۔ اور ہمیشہ پابندی وقت مستعدی۔ غیروں کی عزت اور ذاتی وقار برقرار رکھنے کی تعلیم ہوتی تھی۔ غریب ہو یا امیر استاد کے لئے دونوں ایک تھے۔ اور ان کے باہمی تعلقات سے خوشگوار ہوتے تھے۔ جیسے پدر مہر ماں اور فرزند فرماں بردار کے۔

تعلیم مختصر یہ ہیں وہ اصول جو اسلاف سے ہیں داشت میں ملے ہیں۔ ہمارے موجودہ طریقہ تعلیم کے جاری کرنے والوں نے ان کی طرف بے اعتنائی اختیار کی اور اس کا نتیجہ ہم آج جھگڑ رہے ہیں۔ نہ بچوں میں اخلاص ہے نہ سچائی۔ راستہ ہم تک کو پاس ٹھکے نہیں پائی۔ اور بزرگوں کی عزت کیسی۔ انہوں نے چوٹے بڑے سب کو اپنی گستاخیوں سے نالاں کر رکھا ہے۔ کون ہے اس زمانے میں جس کو ہمارے نوجوان تعلیم یا قوتوں سے شکوہ نہیں۔ ماں باپ کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی کیا نہیں مانتا۔ استاد کو شکایت ہے کہ اس کی مطلق عزت نہیں۔ صفت نازک شکوہ سچ ہے کہ سوسائٹی میں قلعہ ان کا احترام نہیں۔ اور بزرگان قوم و ملت کو گلہ ہے۔ کہ نئی پود کی گھٹی میں سرکشی پڑی۔ بے عرض جے دیکھو شامی ہے۔ سر را بندر نا تھ ٹیگور نے اس مرض کی خوب تشہیں کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان پر علم کا صحیح چرچا ہو نہیں سکتا۔ تا آنکہ ہم اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر نہ چلیں۔ اور اس مرض کا انہوں نے یہ علاج سوچا ہے۔ کہ پرانے طریقہ تعلیم کو پھر از سر نو رواج دیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد سے شانتی نیکیتن انہوں نے ایک درس گاہ کھولی ہے۔ جو اپنے مقاصد میں بالکل موجودہ ہے۔ مگر طریقے میں میکلا کانونہ ہے۔

فدا کرے ان کی محنت بار آور ہو۔ آمین



کو زبانی بتا سکیں۔ بعد ازاں اس قسم کی مہارنی میں مشق کرائی جاسکتی ہے۔ پہلی جماعت سے ہی آسان آسان عبارتی سوال کرائے جائیں۔ مثلاً میرے پاس آٹھ پیسے ہیں۔ میں نے تین پیسے خرچ کئے۔ باقی کتنے پیسے میرے پاس رہے۔ یا میرے پاس دو پیسے اور میرے بھائی کے پاس چار پیسے ہیں۔ ہم نے پیسے اکٹھے کر لئے۔ کل کتنے پیسے ہوئے۔

حساب میں تعلیم کا آغاز مرثیٰ توضیحات سے یعنی بذریعہ اشیا ہونا چاہئے۔ مگر طلبہ کو ہر وقت انہیں توضیحات میں نہ رکھنا چاہئے۔ اشیا کے استعمال سے یہ مراد ہے کہ اعداد کے تصورات پختہ ہوں۔ نہ یہ کہ طلبہ بغیر استعمال اشیا کام ہی نہ کر سکیں۔ اور توضیحات مرثیٰ کے غلام بن جائیں۔ آگے چلکر ہمارے طلبہ کی مدد سے بنوائے جائیں۔ یہ نہیں کہ استاد نے دیا تین کا پھارہ زبانی بتا دیا۔ اور بذریعہ ہمارے طلبہ کو یاد کرا دیا۔ بذریعہ گولیاں یا تیلیاں یا بال خیم طلبہ ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴ وغیرہ کو اچھی سے سمجھیں۔ بعد ازاں ان کو ازبر کر لیں۔ کیونکہ ہمارے اچھی طرح یاد نہ کرنے سے سوالات نکالنے میں دقت ہوگی۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات دسویں جماعت کے طلبہ کو پہلے اچھی طرح سے یاد نہیں ہوتے۔ وہ قاعدہ جانتے ہوئے سوالوں کے جوابات غلط نکال لیتے ہیں۔ یا ان عملوں پر بہت سادہ دقت صرف کرتے ہیں۔ میں نے میٹر کیولیشن کے امتحان میں طلبہ کو دو تقسیم کرتے ہوئے لمبی تقسیم سے عمل کرتے دیکھا ہے۔

دو چکر پہاڑے یاد کرتے وقت اگر طلبہ یہ بات سمجھ لیں کہ ۲۳۲ یا ۲۳۳ ایک ہی بات ہے تو ان کی محنت پہاڑے یاد کرنے میں نصف رہ جائیگی۔ اس وقت بھی عبارتی سوالوں سے کام لینا چاہئے۔ مثلاً ایک جماعت میں ۱۲ لڑکے ہیں۔ اگر ہر ایک لڑکے کو چھ چھ لٹو دیئے جائیں۔ تو کل کتنے لٹو خرچ ہوں گے؟ یا ایک جماعت میں ۱۲ لڑکے ہیں۔ اگر کل فیس ۹۶ آئے ہو۔ تو ہر ایک لڑکا کتنی فیس دیتا ہے؟

میرے تجربہ میں آیا ہے کہ طلبہ ضرب و تقسیم کے لمبے لمبے سوالات تو حل کر لیتے ہیں۔ مگر جب عبارتی سوال دیا جائے تو رہ جاتے ہیں۔ اور مدرسین بھی کہتے ہیں۔ کہ عبارتی سوالات ان کی طاقت سے باہر ہیں۔ مجھے ایک دفعہ تیسری جماعت کو سوالات میں امتحان لینے کا موقع ملا۔ ادویہ سوال لکھا یا گیا کہ میرے پاس ۲۴ صندوق ہیں۔ اور ہر ایک صندوق میں سولہ سولہ کپڑے رکھے ہوئے ہیں۔ کپڑوں کی کل تعداد بتاؤ۔ ۴۰ طلبہ میں سے تین چار نے جواب درست نکالا۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ اس جماعت میں عبارتی سوال نہیں کرائے جاتے۔ لڑکوں کا ڈر عبارتی سوالات کا دور کرنا چاہئے۔

اس میں شک نہیں کہ پرائمری جماعتوں میں حساب کے سادے قاعدوں میں طلبہ کو خوب مشق کرنی چاہئے۔ تاکہ اگلی جماعتوں میں ان کو دقت نہ ہو۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ میں نے دسویں جماعت کے طلبہ کو مضمون ذیل

سوال دیا۔ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰

کرو۔ اور اس عمل کو دہراتے جاؤ۔ حتیٰ کہ خارج قیمت ۱۳ سے کم آئے۔ ۲۲ طلباء میں سے چار نے سوال درست حل کیا صاف ظاہر ہے کہ اس جماعت نے غلطی جماعتوں میں سادے قاعدوں میں پوری مشق نہیں کی۔

نقدی کے اصلی سکے طلباء کو دکھا کر ان سے جمع تفریق۔ ضرب تقسیم کے عمل شروع شروع میں کرانے چاہئیں۔ تاکہ طلباء ان کی قیمتوں اور عملوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ وزن اور لمبائی کے پیمانے بذریعہ استعمال سیکھیں۔ کمروں کی لمبائی۔ چوڑائی کا اندازہ لگائیں۔ اور ناپ کر اندازے کی صحت کی پڑتال کریں۔

پیمانوں کی واقفیت بغیر استعمال اچھی طرح سے نہیں ہو سکتی۔ چاہئے کہ طلباء ان کو اپنے ہاتھ سے استعمال کریں۔ کمسور عام اور کمسور اعشاریہ کے تصورات کو اچھی طرح سے واضح کرنا چاہئے۔ طلباء ان کی اصلیت کو سمجھیں۔ قاعدوں کو دلائل پر مبنی کرنا چاہئے۔

ان قاعدوں میں بھی عبارتیں سوالات دیئے جائیں۔ مثلاً ایک گھڑی اور چین کی قیمت ۱۲۰ روپے ہے گھڑی کی قیمت چین کی قیمت سے ۲۴ روپے زیادہ ہے۔ گھڑی کی قیمت معلوم کرو۔

روزمرہ کے کاروبار کی مثالیں کرائی جائیں۔ عام طور پر کمسوروں کے لیے بے سوالات دیئے جاتے ہیں جن کا عام زندگی میں کچھ فائدہ نہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان قاعدوں میں عقلی کام بہت کم کیا جاتا ہے۔ مفصلہ ذیل سوال لاہور کے ایک بڑے سکول میں ایک جماعت حل کر رہی تھی۔

$$\begin{aligned} & 2\frac{11}{17} + 1\frac{14}{19} + 3\frac{6}{17} + 4\frac{5}{19} \\ & \text{طریق حل یہ تھا:} \quad 2\frac{11}{17} + 1\frac{14}{19} + 3\frac{6}{17} + 4\frac{5}{19} = \\ & \quad \frac{45}{17} + \frac{33}{19} + \frac{57}{17} + \frac{81}{19} = \\ & \quad \frac{855}{17} + \frac{561}{19} + \frac{1083}{17} + \frac{1377}{19} = \\ & \quad \frac{3876}{323} = \\ & \quad 12 \text{ جواب} \end{aligned}$$

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس طریقہ میں کس قدر داغ اور محنت منسلک ہوئی۔

میں نے جماعت میں جا کر طلبہ سے سوالات کئے $\frac{5}{19}$ سے کیا مراد ہے؟ $\frac{14}{19}$ سے کیا مراد ہے وغیرہ وغیرہ بعد ازاں دکھایا کہ کمسور ایک اور تین کو زبانی جمع کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری اور چوتھی کمسور کو۔ طلبہ نے میرے سامنے سوال زبانی حل کر لیا۔ طلبہ خوش تھے کہ اتنا لمبا سوال زبانی حل ہو گیا۔ مگر جو بیسی کمرے سے باہر نکلا مدرس صاحب نے لڑکوں کو مخاطب کر کے کہا، لڑکوں! سوال نکالنے کے کسی طریقے ہوتے ہیں۔ جو طریقہ میں نے

برڈ پر سمجھایا تھا اور جو تم کر رہے تھے۔ وہ بہت اچھا تھا۔ یہ کچھ ایسا ویسا ہی ہے۔ وہی طریقہ استعمال کیا کرو۔
عام طور پر یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ ہمارے سکولوں کے بڑے ہوئے طلبہ بازار میں خرید و فروخت کے وقت قیمت وغیرہ آسانی سے دریافت نہیں کر سکتے۔ یہ شکایت ایک حد تک درست ہے۔ مگر شکایت کرنے والے بچا چند امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

(۱) دکاندار ایک ہی قسم کے سوالات ہر وقت نکالتے ہیں۔ مثلاً آٹا۔ دال بیچنے والا سیرمن۔ چٹانک وغیرہ کے متعلق کام کرتا ہے۔ کپڑا بیچنے والا ہر وقت گر۔ گرہ وغیرہ کے متعلق اور سونے، چاندی والا تو رمانہ رتی کے متعلق۔ مگر گاہک کو سارے پیمانوں سے ضرورت کے مطابق عمل کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے اسے دیر لگتی ہے۔
(۲) سکولوں میں بڑے ہوئے جواب کسوروں تک صحیح نکلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر دکاندار تحیناً جواب نکالتے ہیں۔

سکولوں میں تحیناً جواب نکلانے کی عادت ڈالنی چاہئے۔

(۳) سکولوں میں پونے۔ ڈیوڑھے۔ ڈھانچے اور اونٹے کے پہاڑے عام طور پر اچھی طرح یاد نہیں کرائے جاتے۔ اگر یہ پہاڑے ازبر ہوں۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ لین دین میں طلباء، جلدی جواب نہ نکال سکیں۔
(۴) اسکولوں میں جنم ایک ایسے عملوں پر وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ جن کی ضرورت عام لین دین میں نہیں۔ مثلاً ذرا صفا اقل۔ عاد اعظم کے لیے سوالات۔ کمو ملحق۔ کمو مسلسل کے لیے سوالات۔

اگر ان کو چھوڑ دیا جائے۔ تو بہتر ہوگا۔

سکولوں میں روزمرہ کے سوالات کو پوری پوری توجہ نہیں دی جاتی۔ نیز اسلحہ طریق عمل پر زور نہیں دیا جاتا۔
اگر مفصل ذیل باتوں کو مد نظر رکھا جائے تو حساب کی درست تعلیم میں بہت کچھ مدد ملے گی۔

(۱) حساب کے ابتدائی تصورات کو مرئی توضیحات سے واضح کرنا چاہئے۔ مگر ہر وقت اشیاء اور تصاویر سے کام نہ لینا چاہئے۔

(۲) پہاڑے اچھی طرح ازبر ہونے چاہئیں۔

(۳) سکول اور پیمانوں کو بذریعہ استعمال سکھانا چاہئے۔

(۴) قاعدوں کو دلائل پر مبنی کرنا چاہئے۔

(۵) جواب کا تحیناً اندازہ لگانے میں مشق کرانی چاہئے اور سوال نکلانے کے بعد پڑتال کی عادت ڈالنی چاہئے

(۶) روزمرہ لین دین کے سوالات کرائے جائیں۔

(۷) سبق کے آغاز میں اور دہرانے کے لئے زبانی سوالات کرائے جائیں۔

- (۸) سوالات کے حل کرنے میں آسان طریق عمل سوچنا چاہئے۔ تاکہ بے فائدہ محنت اور وقت ضائع نہ ہو۔
- (۹) ہر ایک سوال کے لئے قاعدہ بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جیسا کہ عام طور پر کیا جاتا ہے۔ سود میں مدت نکالنے کا قاعدہ۔ شرح نکالنے کا قاعدہ وغیرہ وغیرہ۔ سود میں صرف ایک قاعدہ کافی ہے۔

تعلیم بچکان

مسٹر سریش چندر سہگل بی اے بی اے بی ٹی

یہ اصول کہ بچوں کیلئے تعلیم ضروری ہے۔ عام لوگوں میں زمانہ سے مقبول ہو چکا ہے تعلیم کو عام اور لازمی کرنے کے لئے چند سالوں سے سرگرم جدوجہد ہو رہی ہے۔ اور اس شعبہ میں صوبہ پنجاب کو دوسرے صوبجات کی نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مگر اس سوال پر کہ یہ تعلیم کیسی ہو ابھی تک واجب غور نہیں ہوا۔ یوں تو تعلیم کا سارا سلسلہ ہی تشویش پیدا کرنے والا ہے۔ مگر تعلیم کی ابتدائی منزل جس پر آئندہ منزلوں کا انحصار ہے۔ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ اس کا بطور بنیاد تسلی بخش اور مضبوط ہونا لازمی ہے۔ بلکہ اسلئے بھی کہ اس کی حالت بالائی منزل کی نسبت زیادہ قابل افسوس ہے۔ مضمون کو زیادہ طول نہ دینے کے خیال سے ابتدائی تعلیم کی موجودہ حالت کے وجوہات پر حاشیہ آرائی نہ کرتا ہوا میں صرف چند ایک ضروری امور کی طرف اساتذہ کرام کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

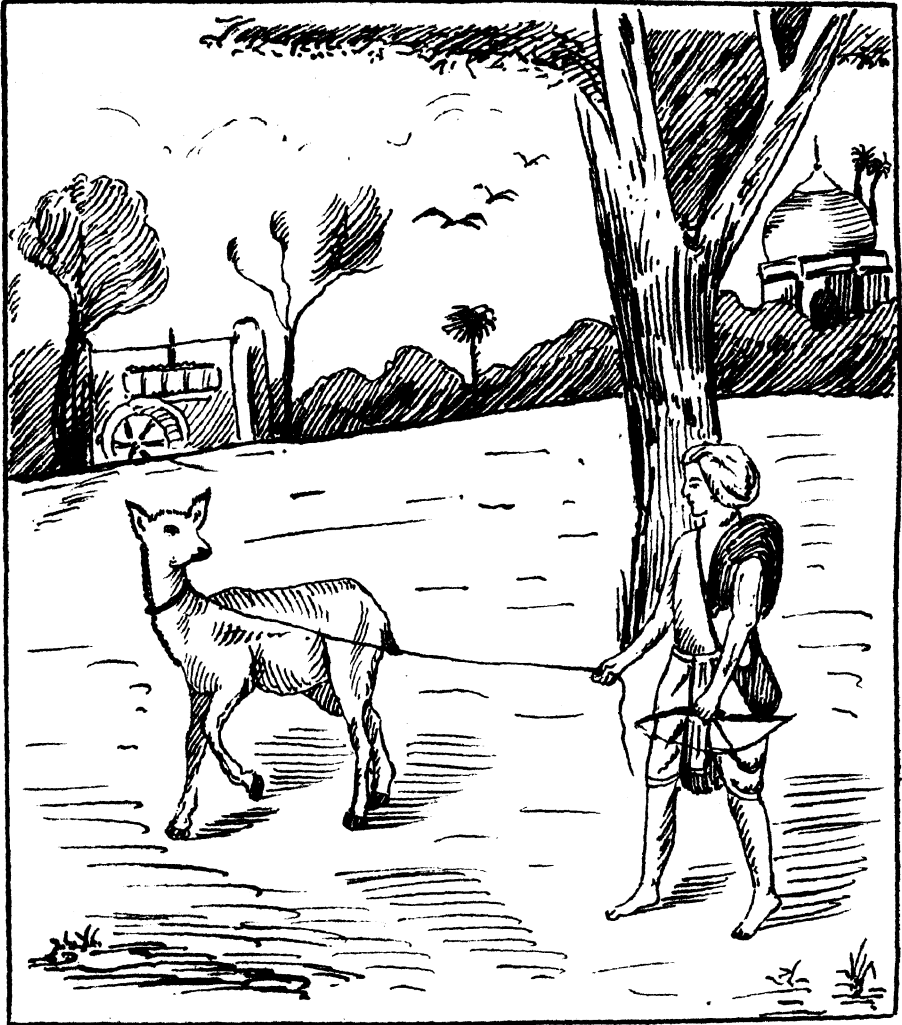
سب سے اول اساتذہ کو یہ بات مد نظر رکھنی چاہئے کہ اس کا فرض محض لڑکوں کو پڑھنا لکھنا اور حساب کے سوال حل کرنا سکھانا ہی نہیں۔ بلکہ صحیح معنوں میں تربیت دینا ہے۔ دراصل تربیت محض پڑھنے لکھنے کے مقابل میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کی طرف خاص طور پر دھیان دینا لازمی ہے۔ اساتذہ کو اپنا تعلیمی معیار حاصل کرنے کے لئے سب سے اول چھوٹے بچوں کا ہمدردی و مہربانی ضروری ہے۔ اس ہمدردی کا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد بقی کام خاصاً آسان ہو جاتا ہے۔ اور اس شے کے پیدا نہ ہونے کی صورت میں اساتذہ کی کوشش کا بیشتر حصہ کارہت ہی جاتا ہے۔ ہمدردی سے یہ مراد نہیں کہ بچوں کو ضبط نہ سکھایا جائے۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہے۔ کہ ہم بچوں کو پڑھائی وغیرہ باقاعدہ سکھائیں۔ مگر ایسا کرتے ہوئے ہم محبت کے جذبے سے متاثر ہوں۔

دوسری قابل غور بات ہے صفائی۔ بچوں کے لئے ننداھو کر صاف کپڑے پہن کر مدرسہ میں آنا نہایت ضروری ہے۔ اس بارے میں والدین تو عام طور پر بڑی بے پرواہی سے کام لیتے ہیں۔ استاد بچارے پڑھائی لکھائی میں اس قدر مشغول ہوتے ہیں کہ انہیں فرصت ہی کہیں۔ کہ بچوں کی صفائی کی طرف دھیان دے سکیں۔ اگر ہم اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب والدین خود اس قدر تعلیم یافتہ ہو جائیں گے۔ کہ وہ بچوں کو صاف رکھنا اپنا فرض اولیں سمجھیں گے۔ تو ہمیں نہ معلوم کتنے سال انتظار کرنا پڑے گا۔ بہر حال استادا کو یہ احساس ہونا چاہئے۔ کہ بچے کی پڑھائی کی نسبت بچے کے جسم اور لباس کی صفائی زیادہ ضروری ہے۔ اس کے دو علاج ہو سکتے ہیں۔ یا تو بچوں کے والدین کے ساتھ اس بارے میں سمجھوتہ کیا جائے۔ یا ان کو صاف بنانے کا سکول میں بندوبست ہو۔

اگر ہم فرض کر لیں۔ کہ استادا ہمہ رد ہے اور بچے صاف ہیں۔ تو اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ استاد کونسا پڑھانے کا طریقہ اختیار کرے۔ جس سے بچوں کی جسمانی ذہنی اور اخلاقی نشوونما تسلی بخش ہو سکے۔

جب تک پڑھانے کے طریقے کے متعلق تجربات نہ کئے جائیں۔ پڑھائی کے طریقے کی تفصیل کوئی شخص بھی سمجھتے طور پر نہیں دے سکتا۔ ہاں ہمارے طریقے کی بنیاد کیا ہو۔ اس کے متعلق چند ایک باتیں ذوق سے کہی جاسکتی ہیں۔ بے انتہا لڑکے اور لڑکیوں نے اب تک پڑھنا لکھنا تو سیکھ لیا ہے۔ مگر جس طریقے سے انہوں نے تعلیم حاصل کی ہے وہ تسلی بخش اس لئے نہیں کہ دوران پڑھائی میں استاد کو تو اکثر حالتوں میں قدرے دھیمی ہوتی ہے مگر بچوں کے لئے یہ عمل باعث تخلیف ہی ہوتا ہے۔ امریکہ میں پروفیسر ڈیوی نے تعلیم کے بارے میں تجربات کئے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ کہ بچوں کی تعلیم کا ان کی روزانہ زندگی کے ساتھ جوہ عام طور پر گاؤں یا شہر کے کوچوں میں گزرتے ہیں۔ ایک خاص تعلق ہونا چاہئے۔ بلکہ ان کی شہری یا دیہاتی زندگی مدرسے کی تعلیم کی بنیاد ہونی چاہئے بچے سکول میں ہی کھیل کھیلیں جو وہ گھر میں کھیلتے ہوں۔ وہ حتی الوسع وہی راگ گائیں اور وہی کہانیاں سنیں۔ جن سے ان کو قدرتی رغبت ہے۔ کھیل کھیلنے۔ راگ گانے اور کہانیاں سنانے کے دور۔ ان میں ہی وہ پڑھنا لکھنا اور حساب کے سوال حل کرنا بھی سیکھیں۔ ان مثا فل کے علاوہ بڑھئی کا کام کرنا بچوں کی تعلیم کا ایک ضروری جز ہونا چاہئے۔ پروفیسر ڈیوی کے اس تجربے کے نتیجوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت سے نئی اہتم کے سکول امریکہ میں رائج ہو گئے ہیں۔ ان مدارس کی خاص خوبی یہ ہے کہ بچے پڑھنا لکھنا سیکھنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ سکول میں ہر کام خوشی خوشی کرتے ہیں۔ اور اسے اپنا ہی کام سمجھتے ہیں۔ بیگار خیال نہیں کرتے۔ تمام دن سکول میں بچے خوش و خرم رہتے ہیں بعض کو تو اپنے مدرسے سے اس قدر الفت ہو جاتی ہے۔ کہ وہ گھر جانا پسند ہی نہیں کرتے۔

یہ چند سطور لکھنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ اساتذہ پنجاب کے مدارس کا امریکہ کے سکولوں سے مقابلہ کریں اور سوچیں کہ کن ذرائع سے ہم بھی اپنے بچوں کیلئے تعلیم حاصل کرنا آسان اور باعث خوشی بنا سکتے ہیں ؟



کردن میں اے سنگر ڈالارن کا پھندا
تغزیر کس خطا کی؟ کس جرم کی سزا ہے؟

ہرن کی فریاد

(اندرجیت شرما پچھڑا شعلہ میرٹھ)

کیا بے زباں نے عالم تیرا برا کیا ہے؟
تو دیکھ کر سنطاک کی کسبدم کی سزا ہے؟
کیوں! تھو دھوکے پیچھے اس جان کے پڑا ہے؟
آج کی شکل میں یہ اک نعل بے بہا ہے
پہلو میں میرے کعبہ تیرے سجود کا ہے
مخلوق میں اسی کی خالق وہی برا ہے
اس دل میں بھی اسی کا جوش جنوں بھرا ہے
نجومِ نہ میں الگ ہوں مجھ سے نہ توجہ ہے

فطرت کا راز ہے یہ تو پشیم دل کو واکر
غفلت کا پڑ گیا ہے پردا سا تیرے دل پر

اک ذات سے ہے قائم بلخ و بہارِ ہستی
اک آفتاب کے ہیں روشن شرارِ ہستی
یکساں ہیں جب بھی کے نقش و نگارِ ہستی
ذروں میں کرنہ پیدا تو انتشارِ ہستی
قبضہ میں تو سمجھتا ہے کیا دیا و ہستی
تقسیم کر رہا ہے اپنا مزارِ ہستی
جاتا رہے گا تیرا عز و وقارِ ہستی
دل میں ترے بھرا ہے یہ کیا غبارِ ہستی

ناشا دکر کے مجھ کو دل شاد تو نہ ہوگا
برباد میں جو ہوں گا آباد تو نہ ہوگا

دیبا داتو نے مجھ کو کیوں قید کر لیا ہے
گردن میں لے ستم گردنِ ڈالار سن کا پھندا
باندھے ہوئے کمر ہے تو جو رہ چھٹا پر
افسوس تو نے میری جانی نہ رفت در وقت
معلوم ہی نہیں ہے سمجھ کو مری حقیقت
قائم ہے جس کے دم سے تیرا وجود سستی
تیری رگوں میں جس کا ہے جذبہ محبت
دونوں میں ایک ٹوٹا دو گل میں اک چمن کے

اک روح پر ہے سب کا دار و مدارِ ہستی
اک سچے کران سے قطرے جدا بنے ہیں
دل پر ترے چڑھا ہے کیا رنگ امتیازی
نقشِ دوئی مٹائے الفت کی زندگی میں
ذمی روح کوئی تیرا زیرِ نگین نہیں ہے
دیران کر کے اپنے دل کے حرم کو ناداں
جاندار کو سستا ہے عدل کے منافی
دوروزہ زندگی پر غافل ہے خسربے جا

ارشاداتِ عالیہ

بزرگ کشنی ہمارا جبین السلفۃ سرکش پرشاد بہاد شاد بالقاہم
صدہ اعظم باب حکمت سرکار عالی

اُس نے کہا کعبہ ترا میں نے کہا چہرا ترا میں نے کہا جلوہ ترا
اُس نے کہا جینا ترا میں نے کہا ہستی ترا میں نے کہا پروا ترا
اُس نے کہا کیا کام ہو میں نے کہا ہر وقت یہ
اُس نے کہا کیا کفر ہے میں نے کہا کیسوتے
اُس نے کہا دل کیا بواہ میں نے کہا تو نے کیا
اُس نے کہا مندبو کیا میں نے کہا بوندل ترا
اُس نے کہا مقصد ترا میں نے کہا تو ہی تو ہو
اُس نے کہا خدمت ترا میں نے کہا بندگی

اُس نے کہا وہ کون تھا خلعت میں غلامِ نسال

میں نے کہا وہ شاد و شاد عاشق ترا شہید ترا
(مہرِ عشق)



مزاكسلنس راجه راجاياس مہاترا راجہ یحیٰی الماسطیت درگشی پر شہاد
بہادر شہاد صدر اعظم دولت امقبہ حیدر آباد (دکی)



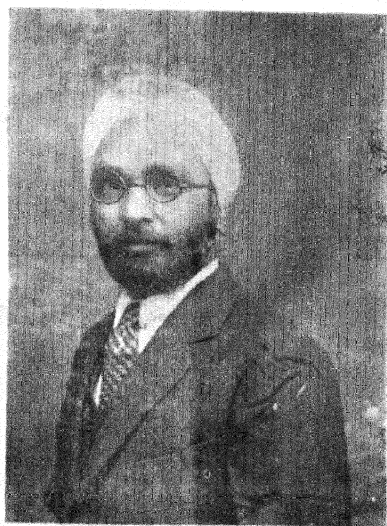
حضرت سعدی



لکھ ہردیال صاحب چوہدرہ بی اے بی ای
ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کجوات



یادگت مرلی دھر صاحب سودگل بی اے
ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس جالندھر



سر ڈی جیمس سنگھ صاحب بی اے بی ای
ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس امرتسر

INTELLIGENCE TEST

اور

پہیلیاں

(جناب لالہ ہر دیال صاحب چو پٹروہ بی لے پٹی، ایس۔ ایس۔)

مکرم بندہ صاحب!

نئے! آپ کے رسالہ رہنمائے تعلیم نے صوبہ کی پچیس سال ایسی اچھی خدمت کی ہے کہ حقیقت میں انکی تعریف نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمتی سے مجھے اس سے اس کے پچیس سے ہی تعارف حاصل ہے۔ انھیں ان شکل گھڑیوں کو خوب جانتا ہوں۔ جن میں سے اس کو معلومات کے ایام سے گزرنے پڑا ہے۔ اب تو ایڈیٹر کی کرپا سے یہ مقبول عام ہو گیا ہے۔ اور مضامین بھی ہر قسم کے ناظرین کے مذاق کے مطابق ہوتے ہیں مگر وہ وقت بھی تھا۔ جب ناظرین میں مذاق پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ صوبہ کی تعلیمی خدمت اور وہ بھی جیڑنا حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں آپ کو اس جولائی کے موقع پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اور کم محنتی کے باوجود ایک مختصر سامعین بریہ ناظرین کرتا ہوں۔ جو امید ہے۔ دل چاہی سے خالی نہ ہوگا۔

(ہمدلی)

مگر ہفتہ زمانے میں طریقہ تعلیم عموماً انفرادی تھا۔ چند دنوں کے بعد استاد شاگرد ایک دوسرے کے عادات سے

واقع ہو جاتے تھے۔ استاد پر فوراً غلبہ ہو جاتا تھا کہ طالب علم ذکی ہے یا غبی۔ استاد کو پر غلبہ ہو جاتا تھا کہ معلم خوش خلق یا تلخ۔ خوشامد پسند ہے یا کٹھالی کے زبور سے مریض۔ غرض حالات کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ربط ہو جاتا تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تحصیل علم کر کے شاگرد شہید ہونے کا دھوڑے کرنے کے قابل ہو جاتا تھا اب بھی مسجد دل اور پاشے شالاولیٰ میں یہ طریق مروج اور کامیاب ہو رہا ہے۔

جہاں زیادہ تعداد کی تعلیم کا سوال ہو۔ اور ساتھ ہی خرچ کا بار بھی گراں ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور موزوں عمارت اور نصاب سامان کی کچھ کمی ہوئی ہو۔ وہاں یہ طریقہ قابل عمل مہم نہیں ہوتا۔ اس لئے اجماعی طریقہ تعلیم رائج کیا گیا۔ اس سے ایک طرف تعداد طلباء کی تھوڑے خرچ سے بظاہر تعلیم یافتہ ہو جاتی ہے اگرچہ سرسری طور پر دیکھنے سے اس میں بہت نقص دکھائی نہیں دیتے۔ مگر نظر حقیقی سے دیکھنے سے معلوم ہونے لگتا ہے کہ ذہین و کند۔ ذکی اور غبی سب ایک ہی دسی میں باندھے جا رہے ہیں۔ جو تیز چلنا چاہتے ہیں۔ ان کو چلنے نہیں دیتے۔ اور جو آہستہ آہستہ چل سکتے ہیں۔ ان کو گھٹیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہوشیار طلباء کی طاقت اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور کمزور طلباء بچارے قدرت کے مارے کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔

سافوں مدرسہ میں پڑھ پڑھ کر ان پڑھ رہ جانا، مہینوں پانی میں رہ کر بن نہائے نکل آنا اسی طریق تعلیم کا نتیجہ ہے۔ آئے دن رپورٹوں میں شکایت ہوتی ہے۔ کہ ایک بھاری تعداد طلباء کی پہلی جماعت میں داخل ہوتی ہے مگر کھن کا ۲۵ فیصدی بھی پرائمری پاس نہیں ہوتا۔ اور دس فیصدی بھی انٹرنس تک نہیں پہنچتے۔ اس حالت کے لئے ذمہ دار زیادہ تر اجماعی طریقہ تعلیم ہے۔ جس میں مدرس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ انفرادی طور پر طلباء کی ضروریات کو دیکھ اور سمجھ سکے۔ اور اپنی تعلیم کی رفتار اور اپنی گفتار کو ان کی کم و بیش قابلیت کے مطابق کر سکے اس لئے جن کے مائدے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ بستر ابوریا باندھ کر چل دیتے ہیں۔ اور ان کے پیچھے ببا اوقات وہ بھی چل دیتے ہیں۔ جن کی طبع آزمائی کے لئے کافی سامان مہیا نہیں۔ مگر ایسے طلباء کی تعداد عموماً کم ہوتی ہے جو بچا یہ بچارے قدرت پر شا کر ہو کر اپنی روشنی طبع کی شمع کو مدھم کر لیتے ہیں۔ اور وہ پات جو ہونہار بروے کے دکھانا دیتے تھے۔ بڑے ہو کر دکھائی نہیں دیتے۔

اس بھاری نقص کو محسوس کر کے ہی (Dalton plan) ڈالٹن پلین، اور ماٹ سوہی سٹم وغیرہ کی اختراع عمل میں لائی گئی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں جماعت بندی عمر کے لحاظ سے کم ہوتی ہے۔ ببا اوقات ایک طالب علم کی ذہنی عمر اس کے سالوں کی عمر سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور کسی موقعوں پر ایک ہی عمر کے طالب علم کو چھوٹی عمر کے ذہن رسا طلباء کے ساتھ ملنا پڑتا ہے۔ یہ بھی لازمی نہیں سمجھا جاتا کہ جو طالب علم حساب میں پانچویں جماعت کے ساتھ ہے۔ وہ اردو بھی ضرور اسی جماعت کے ساتھ پڑھے۔ اگر اس کو ذہنی طور سے

دیادہ مس ہے۔ تودہ آٹھویں جامعہ کے درجہ کے باہر ملدو پڑھ سکتا ہے۔ جس طریقہ امتحان سے ایسے طالب علموں کی جامعہ بندی کی جاتی ہے وہ (Intelligence test) سنسٹم ہے۔ اب یہ طریقہ امتحان (Experimental Psychology) کی اصطلاح سے اس قدر وسیع ہو گیا ہے۔ کہ بلا تامل طلباء کو ان کی ذہنی طاقت کے مطابق تعلیمی کام پسرو کر دیے جاتے ہیں۔

ہمارے صوبے میں ابھی یہ طریق بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ اور جو تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو موقع بھی کم ملتا ہے۔ اس لئے کچھ بڑے پیمانہ پر عمل درآمد کریں ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ مگر چھوٹے پیمانے پر ہر ایک مدرس اپنی جامعہ کے کئی فرقہ خدمت کے لحاظ سے کر سکتا ہے۔ اگر وہ پسیلیوں اور مضمون کو اپنی جامعہ کے روزانہ کام کی نگاہ سے دیکھنے کے لئے استعمال کیا کرے۔ توجہ دونوں میں ہی فرق نمایاں ہونے لگے گا۔

ممتحن خصوصاً اگر وہ انسپکٹر کی شکل میں ہو۔ تو طلباء اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ اور عموماً اس کی روانگی کی خبر سن کر ہی خوش ہوتے اور اطمینان کی شکل دیکھتے ہیں۔ مگر میں ذاتی تجربہ کی بنا پر عرض کرتا ہوں۔ کہ اگر جامعہ میں دل چسپ اور حسب یاقوت پسیلیاں پوچھنے والا انسپکٹر آجائے۔ تو طلباء کی دل چسپی اس قدر بڑھ جاتی ہے۔ کہ وہ سمجھنے میں نہیں آتے۔ اور انسپکٹر کے لئے بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ طلباء کی ذہنی تعلیم کس درجہ پر ہے۔

عرصہ تیس سال کا ہوا۔ کہ پسیلیاں اور کہانیاں ہر گھر اور کوچے میں بچے ایک دوسرے سے پوچھتے اور دہل بہلایا کرتے تھے۔ اور اپنے بزرگوں کے پاس بیٹھ کر اس ذہنی شربت کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔ مگر اب یہ نظارہ کہیں شاد و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ایک بڑی کمی واقع ہو گئی ہے اور مدد میں جتنی جلدی اس کو رواج دے کر اس کی کوپڑا کریں گے۔ اتنا ہی وہ اپنے کام کو آسان بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

ناظرین کی دلچسپی کے لئے میں چند پسیلیاں اور معجزات مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ طبع آزمائی کے بعد اگر وہ اپنے طالب علموں کے ذہنی ہاضمہ کو تیز کرنے کے لئے استعمال کریں گے۔ تو یقیناً ایک مفید مطلب نسخہ کا کام دینگے۔ یہ نہیں کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔ یا عجوبہ ہے۔ مگر بہت عام ہونے کے سبب بکاسم اس کی قدر و قیمت بھول گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سی پنجابی زبان میں ہیں۔ اس لئے شاید بعض اصحاب کو اس کے سمجھنے میں کچھ وقت ہو مگر پنجابی طلباء کو غالباً نہ ہوگی۔

جامعہ اول

اگر کسی کڑی ادھ لے پرائڈ انٹری سٹوڈی

- (۲) چھیاں دی جھوٹی کدے لسی کدے سوٹی ————— مشکیزہ
 (۳) سکا ڈسنگر آڈے دیوے ————— چرغا
 (۴) چونے کھ مسیت بوا کوئی ناں ————— انڈا
 (۵) ماں جی ناں پُت کوٹھے تے ————— آگ اور دھواں
 (۶) اپنی کوٹھی سارے اند پتی ————— دیکھی روشنی
 (۷) آلا بھریا کو ڈیاں وچ تو تک نچے ————— منہ میں زبان
 (۸) نیکا کا گھر دارا کھا ————— دیا
 (۹) نیلی لیرے موتی بدھے ————— آسمان اور چاند
 (۱۰) ہتھ لایاں اودھ میلا ہووے منہ لایاں اودھ ہتے ————— شیشہ

جماعت دوم

- (۱) جوان مویا کوئی سوندا نہیں ————— سانپ
 (۲) چنبا چنبیلی اکھڑا کوئی چنڈا نہیں ————— رات
 (۳) سیج دھچی کوئی سوندا نہیں ————— دیا
 (۴) تھانڈا نے قلعہ بنایا ————— نہ اٹاں نہ گارا لایا ————— بھڑد کچھتہ
 (۵) چھوٹی جی کڑی ————— آسمان نال جا کڑی ————— دھواں
 (۶) ادے ٹکے ہوئے ————— مان بھین کٹی ہوئی ————— بیگن اور دھواں
 (۷) اودھ لٹی ہوئی تے ————— ادا بیٹھا ہویا ————— ترادر تروڑ
 (۸) آپ کالی تے پتر بگے ————— پوہا تاں پُت اکٹ لہے ————— ملت تیار اور سوچ
 (۹) ہاک چنڈا لیا ————— اودھ دی ٹوٹھی تے میا ————— پوست کا ڈنڈا
 (۱۰) چھوٹی جی کڑی اودھ ہے جراجا دند ————— کھانڈی کھانڈی رتے ناہیں بن چکاوے پنڈ ————— دھری
 (۱۱) چھڑی ٹک گئی بیٹو مر گئی ————— چرانج
 ذیل میں تیسری سے چھٹی جماعت کی بیعت کے مطابق بھارتی لکھی جاتی ہیں۔ اس سے یہ مدعا نہیں کہ یہ شیک
 قلمی کراسی جماعت کے لائق رکھی گئی ہیں۔ بلکہ یہ ہر ایک جگہ امدعاں کے حالات پر منحصر ہوگا۔ قرا کو شمش اور سوچ

بچہ کلام میں لہنے کے لئے جوابات ساتھ نہیں دیئے گئے۔ مگر چونکہ راقم کو تجربہ ہوا ہے۔ کہ بہت سے اصحاب کوشش کے باوجود ناکام رہتے ہیں۔ اس لئے مضمون کے آخر میں جوابات کتبے دے دیئے گئے ہیں۔ امید ہے ناظرین فیہود پوری کوشش کرنے کے جوابات کی امداد حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ ورنہ وہ لطف جو محسوس کا نتیجہ ہوتا ہے حاصل نہ ہوگا۔

جماعت سوم

- (۱) جل دھج ہویا۔ جل دھج مویا۔ جل دھج ادبے سانس۔ ناودہدی ہدی ناودہداس۔
- (۲) کالاسی کھتری۔ کالے پودا پتری۔ آڈوں پانی پینداسی۔ بروٹی پھانویں بہنداسی۔
- (۳) پنج پان والے۔ تہی کمن والے۔ بھاگوکھی بلان والی۔ گھسیٹا مٹرا کھن دالا۔
- (۴) پنجاں آدمیاں نے گھٹری چائی چادھری صبار۔ بھلی بی بی نے دھکا دتا گھی سمندوں پار۔
- (۵) چار تھم چلے جان۔ دو ویوے بلدے جان۔ دو چھج بلدے جان۔ اگے سپ لیٹا جائے۔ لوک تاشہ دیکھ دا جائے۔

- (۶) پارسل آیا بابا لودی۔ چھرتاں تے آکو لودی۔
- (۷) کٹی جی کڑی۔ راجہ نال دی ککر کھان جا بندی۔
- (۸) پینا پلاؤنا۔ یار ٹھنڈ پاؤنا۔
- (۹) اک دیکھیا ایسا جٹ۔ چوسی دھیاں تے پتراٹھ۔
- (۱۰) ایک ٹکے تے بارال ٹال۔ اکتی پتر ہر ڈالی نال۔

جماعت چہارم

- (۱) اونٹ دی بہنی۔ ہرن دی چال۔ کون جانور ایسا جس دی پوچھ ہے نہیں تل۔
- (۲) آئی گلا بگئی گلا ب۔ بانڈی کے نڈوشی۔ پانی نالوں تہی پتا سے نالوں مٹھی۔
- (۳) اک نام کرتا نعل پاسے سن فے بجائی مٹھا۔ جیوندیاں نول موئے پئے تارن عجب تماشہ دکھا۔
- (۴) ہری سی من بھری سی، نال موتیاں جڑی سی۔ لالہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی۔
- (۵) چڑھ چوکی پر مٹھی رانی، سر پر آگ بن پر پانی۔
- (۶) اک صند دھڑی دھ ہارل رنھے۔ ہر رنھے دھڑی تی دانے۔ بیجن والے بڑے سیانے۔

(۸) ہسپتال عیال میں پھر جی میری تائی، کچھ کچھ کے بیوہ جایا۔ پھر جی میری مائی۔

(۹) ادھے بیٹے بھالو تھے۔ میں جادواں تے بھڑکھڑ ہتے۔

(۱۰) اندہ بال تے اُتے چام۔ دھج بازار دے بکے عام۔ اسنوں کھاندے لوک تمام۔ ایسی چیز دا کی ہے نام۔

(۱۱) چٹا سفید دودھ بھی نہیں۔ چم چٹ بھولی بایا پر پتر بھی نہیں۔ بچہ بچا کے کچھری کھڑیا پر ادھ چور بھی نہیں۔

اس جماعت میں حسابی دلچسپ مئے دیئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ایک طالب علم دوسرے سے کہے۔

(۱۲) کوئی عدد (یا روپے) دل میں سوچ لو۔ اتنے ہی اس میں میرے جمع کر لو۔ آٹھ رام چند کے ڈال لو۔ پھر کرم

کے ملاؤ۔ اس کو دو تفریق کر دو۔ سات فقیروں کو بانٹ دو۔ باقی بچے تباؤ۔ میں تم کو یہ تباؤں گا۔ کہ تم نے کیا عدد سوچا تھا۔

اسی طرح سے جغرافیہ کی پسلیاں بنائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً پنجاب میں کوئی ایسی مشدی کا نام تباؤ جس کے معنی

(۱۳) امرت کا تالاب ہو۔ یا جس کا نام ہی یہ ظاہر کرتا ہو۔ کہ لاتے جاؤ اور دہاں خرچ کرتے جاؤ۔

الغرض جماعت کی استعداد کے مطابق ایک سمجھدار استاد اپنے لئے درجنوں ایسی پسلیاں بنا کر بچوں کی دلچسپی بڑھا سکتا ہے۔ اور ان کے اندر سوچنے اور سمجھنے کا مادہ پیدا کر سکتا ہے۔ اور بالآخر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسا طالب علم ذہنی عمر میں بڑا ہے۔ اور کونسا چھوٹا۔ سالانہ ترقی کے وقت اگر ذہنی بڑی عمر والا کسی مضمون میں کمزور ہو۔ تو اس کو ترقی دینے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ اور اس کے غلات کم ذہنی عمر والے سے کمی پورا کرنے کی توقع رکھنا بالکل بیوقوف ہوگا۔ اس لئے ایسے طالب علم کو خواہ وہ ایک مضمون میں ذہنی ہو۔ کبھی ترقی نہ دینی چاہئے۔

اگر ان پکڑا صاحب بھی اپنے امتحان میں اس قسم کے چند سوالات کر کے جماعت کے ذہنی بڑی عمر والے عمر کے طلباء کا اپنے لئے فیصلہ کر لیا کریں۔ تو انہیں رعایتی ترقی دینے میں ایک سائنٹفک اصول کی امداد مل سکے گی۔

جماعت پنجم

حصہ ثلث میں عموماً طلباء کی سوچنے اور سمجھنے کی طاقت قدرتی طور پر بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے اس جماعت میں

پسلیاں زیادہ مشکل اور کھوج والی ہونی چاہئیں۔ مثلاً

(۱) ایک عورت کو ہم نے دیکھا جہاں میں مٹی بٹھائے۔ ہڈیاں اس کی انیدھن ہو گئیں چڑا شہر لکھئے۔

(۲) چڑھ چوکی پر مٹی رانی۔ سر پر آگ بدن پر پانی۔

(۳) بیوں کا سر کاٹ لیا۔ نہ مارا نا خون کیا۔

(۴) ایک دیکھا بڑھا باوا چٹی پک چو غدا ساوا۔ مو تر اسیسا مٹھا۔ کہ سارا جگ پینڈا ڈٹھا۔

(۵) دو ٹانگیں پر وہ آدمی نہیں۔ چار اس کے متن پر بھینس بھی نہیں۔ آٹھ اس کی ٹونڈیوں پر وہ سٹانی بھی نہیں۔ سولہ اس کی گائے پر گوجر بھی نہیں۔ چونٹھ اس کے چیلے پر وہ جوگی بھی نہیں۔

(۶) ایک عورت اور ایک مرد کیس جا رہے تھے۔ کسی نے عورت سے پوچھا۔ کہ یہ مرد رشتہ میں تمہارا کیا لگتا ہے۔ عورت نے جواب دیا۔ رشتہ تو مجھے معلوم نہیں۔ پر اس کی ساس اور میری ساس حقیقی مان بیٹی ہیں۔ اب رشتہ تم ہی بتاؤ؟

(۷) وہ کونسا عدد ہے جسے گننا کر دو۔ تین یکساں ہندسوں کا ہو۔ دوبارہ گننا کر دو۔ تو بھی اسی طرح۔ اور دوبارہ گننا کر دو تو بھی حاصل ضرب اسی طرح یکساں ہندسوں کی ہو۔

(۸) وہ کون سا حکمران گزرا ہے۔ جس کے نام کے پہلے اور دوسرے حرف کو ملائیں۔ تو میلان جنگ کے معنی دے اور تیسرے اور چوتھے کو ملائیں۔ تو فتح ظاہر کرے۔ اور باقی ماندہ حروف کو ملائیں۔ تو وہ شہر کے معنی دے۔

(۹) بالاسی تو سب جگ بھایا۔ بڑا ہوا تو کام نہ آیا۔ میں نے کہہ دیا اس کا نام۔ بتاؤ پہلی پاؤں انعام۔

(۱۰) میں آکھیا ادکی جھیرا پانی دچہ ترے۔ خشک زمیں تے کھڑا نہ ہو نہ خوش حال پھرے۔ دھڑ دچہ دریا نہ اوپر پیٹھ جائے کو۔ پٹری ونگوں لے دگے زرا نہ رہے کھلو۔

جماعتِ ششم

اس جماعت کے لئے متعین عموماً ایسے ہونے چاہئیں۔ جن کے بچانے میں خاصی محنت و غور و فوض کرنے کی ضرورت ہو۔ جتنی محنت زیادہ دیکھا ہوگی اسی قدر حل کرنے میں زیادہ ٹکٹ آئیگا۔ اور کامیابی پر خوشی زیادہ ہوگی مختلف مضامین جو اس جماعت میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ان سب کو پسلیاں چننے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:-

(۱) ایک قلعہ کے گرد اگر دو چاروں طرف ۱۱ فٹ خندق ہے۔ ایک فوج جو اس قلعہ میں داخل ہونا چاہتی ہے اس کے پاس ۱۰ فوجیں ہیں۔ ۱۰ فٹ سے زیادہ لمبے نہیں۔ بتاؤ وہ فوج اس قلعہ میں کس طرح داخل ہو سکتی ہے۔ جبکہ کسی وغیرہ کا سامان بھی پاس موجود نہیں۔

(۲) ایک مالی نے اپنے باغ میں کل دس پھل دار درخت اس خوبصورتی سے پانچ قطاروں میں لگائے۔ کہ ہر ایک قطار میں چار چار درخت لگے ہیں۔ خدا سمجھاؤ۔ کہ اس نے کیسے یہ درخت لگائے ہیں۔

(۳) ذیل کے خاکے میں ایک سے پندرہ بندے ہیں۔ ایسی ترتیب سے انہیں خانوں میں لکھو کہ ہر لحاظ سے مسلسل چار خانوں کا مجموعہ ۲۰ ہو۔

(۴) ایک شخص نے دارنے اپنے خزانہ کے گرو اپنے ۱۲ سپاہیوں کا پہرہ اس طرح سے لگایا کہ وہ اس کے گرد چھ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ مگر ہر ایک قطار میں چار سپاہی دکھائی دیتے ہیں۔

(۵) پنجاب میں کوئی ایسا دریا بتاؤ۔ جس کی سطح آب پر سیکڑوں کنبے بستے ہیں۔ اور ایسی جھیل بتاؤ جس کے پیٹ میں سے دیا چلا گیا ہے پر غائب نہیں ہوا اور جل کا توں پھر نکل آیا ہے۔

(۶) میرا نام چھ حروف سے بنا ہے۔ میں ایک بڑا مشہور شہر ہوں۔ میرے تیسرے اور چوتھے حروف کو ملائے سے جھوٹی بات ظاہر ہوتی ہے میرے پچھٹے اور تیسرے حروف کے ملنے سے ہی میرے جسم میں خون دورہ کرتا ہے۔ میرے پہلے دو سرے اور تیسرے حروف کے ملنے سے ایک خون ناک کاٹنے والا جانور بن جاتا ہے۔ میرے تیسرے پانچویں پچھٹے اور پانچویں حروف کے ملنے سے وہ شے بن جاتی ہے جس کے بغیر علم حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ میرے تیسرے دوسرے اور پہلے حروف کو ملا کر سننے سے نہایت لطف آتا ہے بتاؤ ایسا اچھا میرا نام وہ کیا ہے؟

(۷) میرا نام نو حروف کا بنا ہوا ہے۔ اور ایک مشہور بہادر ہندو راجہ ہو چکا ہوں۔ میرے پانچویں ساتویں۔ چھٹے اور آٹھویں حروف کے ملنے سے ملک سیراب ہوتے ہیں۔ میرے دوسرے۔ آٹھویں۔ پانچویں اور چھٹے حروف سے پنجاب کے ایک دریا کا نام بن جاتا ہے۔ پہلے، چھٹے، آٹھویں اور دوسرے سے اگر بادشاہ رعیت سے برتے تو وہ اس کی غلام ہو جاتی ہے۔ اور ساتویں اور آٹھویں کے درمیان سے ہی وہ راج کرتا ہے۔ تیسرا اور پہلا اگر معمولی انسان کو ہو جائے۔ تو ڈاکٹر بلانا پڑتا ہے۔ مگر کوئی سادھو کرے۔ تو بڑا سکھ پاتا ہے۔ اور تیسرے اور دوسرے کے ملنے سے اس بھوسگر سے تر جاتا ہے۔ پہلے دوسرے۔ پانچویں اور چوتھے کو ملائے سے جو بن جاتا ہے۔ اس کو قاب عورتیں محب پسند نہیں کرتیں۔ میرے پہلے۔ چوتھے، دوسرے، چھٹے ساتویں اور آٹھویں حروف کے ملنے سے وہ چیز بن جاتی ہے۔ جو شاہوں کا نشان ہوتی ہے۔ اور جس کو لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ چوتھے۔ پانچویں اور آٹھویں کے ملنے کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے۔

(۸) کوئی ایسی چیز بتاؤ۔ جو چھوڑ دیں۔ تو بھاگ جائے۔ کھا جائیں تو ٹھنڈک دے۔ باہر میں تو اڑ جائے۔ سر پر رکھیں۔ تو موت کر سلا بلن بھر دے۔ بوتل میں ڈالیں اس میں بھی ٹھیک آجائے اور نرمی ڈالیں تو وہ بھی بھر جائے۔ روٹی اس کے بغیر کٹی نہیں۔ عمارت اس کے بغیر بنتی نہیں۔ باغ اسکے فرائض سوکھ کا ٹہا بھٹاؤ۔ بکریاں اسکے پرکھ لیں گے۔ گدے پرکھ لیں گے۔

(۹) آج کل انگریزوں کو ایک ایسا نوکر مل گیا ہے۔ جو رات کو روشنی کر دیتا ہے۔ دن کو کا رخا نہ چلاتا ہے۔ دوپہر کو چار لپکا دیتا ہے۔ اور ہزاروں میلوں پر جھٹ پٹ خبر پہنچا دیتا ہے۔ اور منوں اسباب اٹھا کر بغیر شکایت ساتھ چل دیتا ہے۔ وہ کون ہے؟

(۱۰) میرے پاس ایک ایسی چیز ہے۔ جو بولتی ہے پر پزندہ بھی نہیں جو چلتی ہے پر چوبایا بھی نہیں۔ آدمی کی جب میں چپ کر بیٹھ جاتی ہے اور عورت کی کلائی کی شان ہو جاتی ہے۔ ریل گاڑی اس کی دودھ کے لیئر مل ہی نہیں سکتی۔ بڑے بڑے شہروں میں اونچے میناروں پر چڑھ جاتی ہے۔ تباؤ کیا ہے؟

جوابات

جماعت ہجوم۔ (۱) بیلا (۲) جین (۳) انجیل۔ دانت۔ (۴) دھن (۵) اٹھی۔ (۶) ترازو (۷) کٹی (۸) ٹکلی (۹) دن رات گھنٹے اور پیر۔ (۱۰) سال۔ (۱۱) ادا جان
جماعت چارم۔ (۱) میڈک (۲) ایند (۳) سڑی (۴) مکئی۔ (۵) حقہ (۶) سال ماہ اندویش (۷) دودھ۔ دیسی۔ سی۔ کھن (۸) اکاس (۹) آم (۱۰) روپیہ
جماعت پنجم۔ (۱) سن (۲) حقہ (۳) ناخن (۴) ہالیہ (۵) روپیہ۔ اٹھی۔ چوٹی۔ دونی۔ آئینہ۔ پیسے (۶) مرد کی بیوی کی مامی یعنی انکی بھی مامی۔ (۷) ۱۱ (۸) ریخت سنگھ (۹) چراغ (۱۰) سڑی
جماعت ششم کے جوابات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ سوچنے والے خود بخود ان کا جواب نکال لیں گے۔
حصہ اپرٹل کی جماعتوں کے لئے تو تمام بات اس قدر دلچسپ اور وسیع پیمانے پر بن سکتے ہیں کہ اگر طلباء کی توجہ اس طرف مبذول نہ جائے۔ تو اپنی طبع آزمائی سے ہفتہ وار کلبوں اور مجلسوں میں ایک پُر لطف تقیسی شل کا کام دیں گے۔
مجھے یقین ہے کہ کامیاب میڈیا سٹر مشیر بھی اس قسم کے کام کسی نہ کسی شکل میں ضرور اپنے مدرسے میں کرائے ہونگے لیکن اگر ہر ایک مدرسے میں دارج پاجائیں۔ تو ایک مفید اور ضروری بات ثابت ہوں گے۔

کارآمد باتیں

- ۱۔ مصیبت کے وقت گھبرانا نہ چاہئے۔
- ۲۔ بیخیاٹی جوان مردوں کا شیوہ نہیں۔
- ۳۔ جو کام تم خود کر سکتے ہو اس کیلئے کسی دوسرے کو تکلیف مت دو۔
- ۴۔ محنت دولت و بزرگی کی کنجی ہے۔
- ۵۔ خیرات کا اثر بعد میں مفید ثابت ہوتا ہے۔
- ۶۔ بد عادتوں سے قوت احساس کم ہو جاتی ہے
- ۷۔ صبر گرچہ تلخ است، ولیکن بر شیریں دارو۔
- ۸۔ محنت بھی ایک رت نہیں جاتی۔
- ۹۔ کسی کام میں تعجل سے کام نہیں لینا چاہئے۔





تعلیم کا اصل مقصد

(جناب چوہدری پران ناتھ صاحب دستِ اہل علم سے ڈسٹرکٹ انسپکٹر اور اس کرناٹک) قبل اس کے کہ نفسِ ممنون کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی تاریخ ارتقاءِ تعلیم پر ایک تصدیق مگر مختصر تبصرہ کیا جائے۔ ہندوستان کے تمدن کو لحاظ ارتقاءِ تعلیم حسبِ مطابقت تاریخ تین زمانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی عصرِ قدیم، عصرِ متوسط اور عصرِ جدید۔ عصرِ قدیم میں ہم صرف اُس زمانہ کو شامل کرتے ہیں۔ جب کہ اس ملک میں صرف اسنہ قدیمہ مثل سنسکرت اور پالی زبانوں کی تعلیم ہوتی تھی۔

عصرِ متوسط سے وہ زمانہ مراد ہے۔ جب کہ ہندوستان کی قدیم زبانوں کے ساتھ دیگر اسنہ مشرقیہ مثل عربی، فارسی کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ اور عصرِ جدید میں ان تمام زبانوں کے ساتھ مگر بہ ترجیح تمام انگریزی کی تعلیم بھی شامل ہوتی۔ ان تینوں زمانوں میں تعلیم کا غایت اصلی فلسفہ رائج الوقت کے ماتحت حسبِ ضرورت زمانہ بہ جا رہا ہے۔ ازمنہ ماضیہ میں جب کہ تعلیم و تعلم کا استحقاق صرف برہمنوں کی مقدس ذات تک محدود تھا۔ اس کا مدعا خالصتہً تزکیہٴ نفس و روح، تربیتِ قوارِ غنیمتہ اور تحفظِ آئین و مسائل مذہبی تھا۔ اسی لئے تعلیم بالکل دھارمک تھی۔ اور اخلاقی پہلو غالب۔

قرین وسطیٰ میں جس میں مسلمانوں کا دورِ حکومت بھی شامل ہے۔ اس اخلاقی غایت کے ساتھ جزوی طور پر اس خیال کی بھی ابتدا ہوئی۔ کہ حکومتِ وقت کے وفتری کاروبار میں تعلیم یافتہ لوگوں کو عہدہٴ مت میں ترجیح دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ہم اس ارتقاء کے آخری یعنی جدید دور میں داخل ہوتے ہوئے متبر شواہد کی بنا پر دیکھتے ہیں کہ مدعا تعلیم کا روحانی عنصر فلسفہٴ جدید کے زیر اثر مادیت کا رنگ اختیار کرنے لگا۔ افلاطون کا قدیم نظریہٴ تعلیم "علم، معن علم کے لئے" یعنی بغیر کسی دنیاوی مفاد کی لگاؤ کے ضعف پذیر ہوتا گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ مدعیٰ کرام کے سامنے عصرِ جدید کے تعلیمی ارتقاء کا تبصرہ کسی قدر وضاحت سے پیش کروں۔

حکومتِ انگلیش کو جس وقت ابتدا و سلطنت میں ہندوستان کی تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنا پڑا۔ اس وقت یہ بھی ایک اہم ضرورت تھی کہ قطع نظر ترقیِ تمدن و تہذیب کے حکومت کی شینری کو چلانے کے لئے ایسے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی کثیر تعداد کا رہتی۔ جو فرمانروا ہیں ملک کا متحدہ انتظامِ سلطنت میں بٹائیں۔ مگر چونکہ اس زمانہ میں ہندوستانیوں کا اخلاقی تخیل یورپ کے فلسفہٴ جدیدہ کے مفاد منہج (Utilitarian) نقطہٴ نظر کے ادراک کا

عامل نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے اشاعتِ تعلیم میں حکومت کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اہم بادو سالہا سال کی تحریک و ترغیب کے جو بھی مختصری تعداد انگریزی تعلیم سے متعلق ہوتی تھی۔ وہ متواتر سرکاری مصلحت پر مامور ہوتی رہی۔ جماعتیں نظامِ حکومت کے شعبے اور محکمے دست پائے رہے تعلیم یافتہ لوگوں کی مانگ بڑھتی رہی۔ یہی عمل ایک صدی سے چلتا رہا۔ زمانہ تک جاری رہا۔ مگر ایک وقت ایسا ضرور آنے کو تھا۔ جب کہ پیداوار مانگ سے متجاوز ہو۔ کیونکہ اشاعتِ تعلیم کی کوشش حکومت کی طرف سے پیش از پیش شروع و مد کے ساتھ جاری رہی ہے۔ بلکہ اس میں اب تک کوئی جزر و پیما نہیں ہوا۔ اس لئے نتیجتاً ملک میں ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد عرصہ سے ضرورت سے بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ جن کا مدعا اکتسابِ علم سے حصولِ ملازمت تھا۔ مگر اس وقت گورنمنٹ کا منشا اشاعتِ تعلیم سے یہ نہیں کہ برتھریا فتر سرکاری ملازمت کا جو یاں ہو۔ اگرچہ حکومت نے اپنے نقطہ نظر کو بڑے عرصہ سے بدل دیا ہے۔ مگر ایک متوسط اخیال ہندوستانی اور بالخصوص دیہاتی والدین اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے صرف غرضِ ملازمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش کرتے ہیں اور چونکہ لوگ اپنے عینی تجربات کی بنا پر تعلیم اور ملازمت کی وابستگی کو مدتِ ہائے عید سے مشاہدہ کرتے آئے ہیں اس لئے ان کے لئے مدعا تعلیم کا ملازمت قرار دینا کوئی امر عجیب نہیں۔ مگر بحیثیتِ بحث اشاعتِ تعلیم یہ صرف ہدا کام ہے۔ کہ ہم اس بارے میں والدین کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کو بتلائیں کہ فی زمانہ تعلیم کا نصب العین کیا ہونا چاہئے؟ جس کی تشریح آئندہ پیش کی گئی ہے۔

تعلیمی مکتوں میں ماہرینِ تعلیم نے مدعا تعلیم کے متعلق ایسے بسیط و جامع مضامین پیش کئے ہیں۔ کہ ان کی تکرار طول لا طائل ہے۔ اگرچہ اس خیال سے یہ مضمون پامال اور افسردہ ہے۔ مگر میں نے آئندہ سطریں دیہاتی تعلیم کے مسئلہ کو بحث قرار دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اہل شہر دیہاتوں سے زیادہ تمدن اور مذہب ہو چکے ہیں۔ مگر دیہات میں ابھی آبادی کا کثیر حصہ یعنی تقریباً ۷۷ فیصدی ہندوستان کی دیہاتی آبادی تعلیم و تمدن سے عاری ہے۔ اس وقت دیہاتی تعلیم کا مسئلہ صوبائی حکومتوں کے لئے خاصی مشکلات پیش کر رہا ہے۔ جو پرائمری یا ابتدائی تعلیم کی اشاعت سے حل کیا جا رہا ہے۔ اور اس ضمن میں یہاں یہ بتلادینا چاہا نہ ہوگا۔ کہ پنجاب میں پرائمری تعلیم کی توسیع موجودہ ڈائرکٹر صاحب بہادر تعلیم پنجاب کے حُسن تدبیر سے اتنی ہو چکی ہے۔ کہ اس صوبہ کو ملک کے دیگر صوبوں میں امتیاز خاص حاصل ہو چکا ہے۔ مگر اب اس مسئلہ ابھی دیہاتی آبادی کا صرف چھ فیصدی حصہ تعلیم یافتہ کہا جاسکتا ہے۔ باوجود محکمہ کی کوشش بلخ کے ابھی پنجاب کا بہت حصہ جسے تعلیم سے بہرہ ور ہو سکا ہے۔ اس کے اسباب چند چند ہیں۔ اور محکمہ کو اشاعتِ تعلیم میں بے شد مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جن ان مشکلات کی طوائفی فہرست میں سے صرف ایک شکل کو اپنے بحث کے دائرہ میں ہتے ہوئے بیان کرنا چاہتا ہوں، یعنی پنجاب کے اُن اضلاع میں جہاں ابتدائی اور ثانوی مدارس میں تعداد طلباء مایوس کن ہے۔ اس کا سبب عام لوگوں

کی ہے اعتنائی بلکہ متحر ہے۔ یہ متحر اور بے اعتنائی جن اسباب کا نتیجہ ہے۔ وہ چار گونہ ہیں۔ جن کو یکے بعد دیگرے میں نے کسی قدر وضاحت سے بیان کیا ہے۔

۱۔ محکمہ تعلیم اور والدین کے درمیان اختلاف مدعا تعلیم۔

۲۔ ابتدائی نیز ثانی تعلیم میں اقتصادی عنصر کا فقدان۔

۳۔ موجود تعلیم کا گریں ہونا۔

۴۔ تعصیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری۔

اگرچہ باوی النظر میں آپ کو یہ چار عیودہ عیودہ باقی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر دراصل ان سب کی تیس وہی غلط نصب العین کا تین پوشیدہ ہے۔ تاہم ان میں سے ہر ایک انفرادی بحث کا متقاضی ہے۔

۱۔ موجودہ زمانہ میں جب کہ دنیاوی تعلیم کا دھایہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ وہ تعلیم کو عملی زندگی میں کامیاب بنانے کی تسکین پیدا کرتی ہے۔ اور جس وقت ہم ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگوں میں بیکاری پاتے ہیں۔ تو موجب ہیرت و استعجاب ہوتا ہے مگر اس حیرت و تعجب کو دھکے کرنے کے لئے صرف اتنا خیال کرنا کافی ہے۔ کہ جو لوگ تعلیم پکے سیکھ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے وہ تعلیم میں یا ان کے سرپرستوں نے ان کی تعلیم کے زمانہ میں کبھی کسی دعا اور غایت کا خیال اور نصیلا نہیں کیا۔ قطع نظر تعلیم کے دوسرے اثرات کے جن میں تمدن و تہذیب۔ تربیت ذہن۔ اصلاح خصال۔ دستی اخلاق اور قومی گیر کٹر کا استحکام وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ فی زمانہ تعلیم کا مقصد بشر اقتصاد ہی ہے۔ یعنی اہل حرفہ خواہ وہ ناصحت پیشہ ہوں، یا تجارت پیشہ۔ دستکار ہوں یا مزدور۔ اپنے اپنے اشتغال متعلقہ میں تعلیم کی بدولت ترقی اور فروغ حاصل کریں۔ اور اس زندگی کی کفالت میں جب کہ مسئلہ بقائے لائق نرین (Survival of the fittest) کا فرما ہے۔ وہ اس قابل ہو سکیں کہ زمانہ ان کو مقابلہ کے میدان میں شکست دے کر بالکل نشٹ نہ کر دے۔ مگر بالعموم لوگ ابھی تک تعلیم کو بغرض حصول ملازمت حاصل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اگرچہ زمانہ کی ناصحت ایک عرصہ سے ان کو اشدہ گورہی ہے۔ کہ ان تلوں میں تیل نہیں رہا۔ مگر لوگوں کی قدامت پسندی بخیرہ اصطلاح خیال میں سدہا ہے۔

۲۔ موجودہ تعلیم میں اقتصادی عنصر کے فقدان سے جو مطلب ہے۔ اس کو لیک نیشنل سے دامن کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ کشمکش کی زندگی کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ ان کے خاندان کا ہر فرد، خواہ وہ زمرہ اناث سے ہو یا مذکر سے ایک غرض خاص رکھتا ہے۔ جس کی ادائیگی خاندان کے کسب معاش میں ایک اقتصادی قیمت رکھتی ہے۔ اگر ان کا پیشہ کشمکش یا فروغ کیا جائے۔ تو خاندان کا ہر باتیز پچہ مشاغل کشمکش میں اپنے والدین کو بلا اجرت نقد جو خدمت ادا کرتا ہے وہ بصورتِ عدم موجودگی اس سچہ کے مساوی نہ ہونے پر کافی شرمیلی ہے۔ اس لئے کشمکشوں کے بچے گویا ایک بزدلی قیمت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جس وقت ان سے بچوں کو منہ میں داخل کرانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ تو ان کا مذہب

اکراہ، اندازِ مضامندی تا ناگو یا ایسی مالی نقصان کے خیال پر مبنی ہوتے ہیں۔ مگر ان کے لئے جو اہم تعلیم سے منافرت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ محمور ہوتا ہے۔ وہ ان کے بچوں کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یعنی جو والدین اپنے بچوں کو کسی میٹرونی دباؤ کی وجہ سے مدرسہ میں داخل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ اکثر پرائمری درجے سے زیادہ نہیں پڑھاتے جس کے لئے بچوں کو اعلیٰ الموم پانچ سال مدرسہ میں صوفت کرنے پڑتے ہیں۔ پرائمری مدارس میں بچوں کے آبائی پیشوں کی کوئی تربیت نہیں ہوتی اس لئے ایک پرائمری پاس لڑکا اس پانچ سال میں اپنے والدین کے پیشہ میں بچائے مفید نفعی ہو سنے کے ایک رکن مستقل ہو جاتا ہے۔ گو اس مصلیٰ کی سیوا زیادہ نہیں ہوتی۔ اور تھوڑے عرصہ کی تربیت سے وہ پھر ایک مفید کمزور بن جاتا ہے۔ مگر قیمتی سے گلا کی تعلیم مثل تک ترقی کر جاتی ہے تو زمانہ مصلیٰ اکثر حالات میں اتنا غیر متعین ہوتا ہے۔ کہ بالآخر اس کو ملازمت کی جستجو کرنی پڑتی ہے۔ جس کا دروازہ تقریباً بند ہو چکا ہے۔ اسکی بیکاری اس کے سرپرستوں کے لئے وبال اور سرسراہلی نقصان کی مترادف ہوتے ہوئے وہ آئندہ کے لئے ضرورت اپنے اقران و اشال میں بلکہ جملہ اہل دیہہ کیلئے تعلیم کے لئے بے سود ثابت کر دینا محتم پر دیکھنا اور جانتا ہے اور سرپرستوں کو اس کی بد قسمتی کا فیضان اٹھانا پڑتا ہے۔

اس تعلیمِ عوام (mass education) کے قابلِ خود نقص کا اشارہ

جنہذا خود عوام کے اختیار میں ہے۔ اور جزواً حکمہ تعلیم یا حکومت کے۔ ایک طرف عوام کو لازم ہے۔ کہ وہ غایت تعلیم کی صحیح تفہیم کے بعد اپنے بچوں کے تعلیمی مفید کو صرف پرائمری تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ بحکمہ کے اصلی منشاء کے مطابق ان کو اپنے پیشوں کی ٹریننگ کے لئے متعلقہ اداروں میں بھیجیں۔ جبکہ دوسری طرف حکومت کو بھی دیہاتی تعلیم کے لغت میں طلباء کے آبائی پیشوں کی تربیت کا اہتمام زیادہ وسیع پیمانہ پر چاہنا چاہئے۔ جو عوام کو کم سے کم خرچ پر پائیر ہو سکے۔ تاکہ طلباء بعد اتمام مدت تعلیم اپنے جاہل والدین کی نسبت زیادہ مفید کاریگری ثابت ہوں۔ اور ملازمت کا رجحان ان کی طبیعت سے یک قلم محمور ہو جائے

گزشتہ چند سالوں سے اور بالخصوص اس سال کے بعد ان میں ملک کی اقتصادی حالت میں جو افسوسناک تنزل ہوا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب عوام کی تعلیمی لاپائندگی ہے۔ تعلیم یافتہ ممالک ہر ضرورت زندگی کے پیدا کرنے میں تعلیم کی بدولت ایسے وسائل اختیار کر سکتے ہیں۔ جن سے کہ وہ فطرتی موانعات اور مشکلات کا مقابلہ زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مگر ہندوستان جہاں تعلیم کو یا اب تک معقود ہی ہے۔ ان فطری رکاوٹوں کا مقابلہ مصنوعات سے نہیں کر سکتا۔ ہر زمیندار اور کاشتکار غیب جانتا ہے۔ کہ زمینوں کی سابقہ پیداوار میں اتنا اضطراب ہو گیا ہے۔ کہ اگر اب مصنوعی وسائل سے اسکی طاقت کو برقرار نہ رکھا گیا۔ تو کاشتکار طبقہ قریب ہر طاقت پہنچ جائیگا۔ ان مصنوعی وسائل کا تہہ پڑا دیگر دشتکاریوں کے نظام کا طریقہ بنبر تعلیم نامکن ہے۔ اس لئے فی زمانہ اتمام اہل حرفہ کو اپنی بقائے نوع کے

لئے وہ نہ کہ استاد تعلیمی تہیاد سے کرنا ہے۔ جس کا مدعا کتاب فزون ہونا چاہئے۔ نہ کہ کتاب چاکری۔ یہیں یہ ذکر کرنا دیکھیں سے غالی نہیں کہ موجودہ عالمگیر انسانی اجناس کا سبب ایک فرانسیسی ماہر اقتصادیات سمٹن ملک کی کثرت پیداوار بتاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی منڈیوں میں اجناس و میوہ جات کی افزائی پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس نے ایک ہا فلت کے ملک سے پوچھا کہ اس نے اپنی پیداوار کو درختوں سے کیوں نہیں اتارا؟ تو اس نے جواب دیا کہ منڈی میں میوہ جات کی کثرت نے ان کے زرخ میں اتنی افزائی پیدا کر دی ہے کہ درختوں سے ہمارے میں جو غراش ہاتھوں پر آتے ہیں۔ ان کے لئے جس کاربانک روشن کی ضرورت ہوتی ہے اس کی قیمت بھی وصول نہیں ہوتی۔ یہ کثرت پیداوار مصنوعی وسائل کاشت کا ذریعہ ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے ہندوستان میں قیمت پیداوار کی شکایت ہے۔ 'وائے رمال'۔

۳۔ تعلیم کی گروانی کا سوال پرائمری درجات تک تو لازمی تعلیم کے قانون کے نفاذ سے علاج پذیر ہو چکا ہے۔ مگر اعلیٰ تعلیم اب تک ایک متوسط والدین کے ذرائع آمدنی سے باہر ہے۔ پرائمری تعلیم کا کافی ہونا سطور بالا میں ثابت کیا جا چکا ہے۔ اس لئے حکومت کی توجہ اعلیٰ تعلیم کی افزائی کے وسائل اختیار کرنے کی طرف مبذول کرانی جاتی ہے اور امید ہے کہ اس شکل کا حل بھی جلد ممکن ہو سکیگا۔

۴۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کا مسئلہ اور اس کا حل ایک حد تک نمبر ۱ کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔ تاہم اسکی وضاحت اتنی کافی ہو کہ سرپرستوں کا فرض والدین اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق یہ ہے کہ وہ انکی فطری میلان طبیعت کا صحیح اندازہ لگا کر انکو صرف اُنہی تعلیم کیلئے مخصوص کریں۔ جو ان کو آئندہ زندگی میں مفید ثابت ہو سکے۔ فی زمانہ اصناف تعلیم کی فہرست اتنی طویل ہے کہ تمام علوم و فنون مترجہ کامیاب ذکر کرنا فصول ہوگا۔ لیکن اس بارے میں سب سے اچھا اور معتبر رہنما صرف طبقہ متعلمین ہے۔ جن کا فرض ملکی بہبود کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ہے کہ وہ ہر بچہ کے فطری رجحان کا بغور مطالعہ کر کے سرپرستوں کی رہنمائی کریں۔ اور طلباء کو غیر مانوس اور غیر فطری تعلیم کی خرابیوں سے متنبہ کرتے رہیں۔

میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ بچوں کے فطری رجحان کا اندازہ لگانا بجائے خود ایک فن خاص ہو جسکی مہارت حاصل کرنے کے لئے ثانوی مدارس کے متعلمین کو زائر تربیت میں بچوں کی نفسیات Child Psychology کے مطالعہ کا موقع دیا جاتا ہے۔ مگر اس کا مشورہ نابل سکولوں کے نصاب میں بھی لازم ہے تاکہ پرائمری مدارس کے متعلمین بھی اس فن کے ضروری اصول سے واقفیت حاصل کر کے خود متنبہ ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی مستفید کر سکیں۔

۵۔ اس طرح دیہاتی رقبوں میں تعلیمی اشاعت کو نیاں کو جن میں میرے ہم عصر صاحب اور انکی سادھن شامل ہیں۔ لازم ہے کہ وہ دیہات کے لوگوں کی رہنمائی اس بارے میں خاص طور سے کریں۔ اور جو تعلیم کے مفکر کو موجودہ نظام تعلیم میں داخل ہونے سے باز رکھیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے جو وسائل حاصل کیا گئے ہا سکتے ہیں۔ انکا ذکر کسی آئندہ مضمون میں کرونگا۔

بیوہ کی فریاد

(اس نظم کی خوبیاں - ۱۔ بے عطف اضافت - ۲۔ ہر شعر مردف ہے)

کسی کی یاد دل میں ہے کہ جس سوجی ٹھکانا ہے
عجب طرح کا حال ہے بہت غراب حال ہوں
نہ وہ زمیں نہ وہ فلک شب بے کائنات ہے
یہ دل جو نامراد ہے کبھی یہ بامراد تھا
وہ آرزو ہے کونسی جو آج پایہ گل نہیں
گھٹا اٹھی تو ہے مگر پہنچا آج گائے کیا
پریم سے بھرے چمن کہ جن سے کان آشنا
وہ بات بات پر ہنسی وہ چھپڑ پیا رپا میں
کبھی ادھر سے تاکتا کسی ادھر سے دیکھنا
غرض وہ دن کہ جب مے چمن میں اک بہار تھی
غرض وہ دن کہ نغمہ زن سرتوں کا ساز تھا
کہوں اگر تو کیا کہوں عجب طرح کا حال ہے
غموں سے ہوں گھری ہوئی غموں سے پامال ہوں
وہ زندگی ہی ابنہ پیش دن ہو نہ راستے
ہے یاد جس کی اس کے کبھی یہ اس کو یاد تھا
ہے نام دل کا دل مگر جو سچ کہوں تو دل نہیں
تڑپ مری مٹائے کیا لگی مری بجائے کیا
وہ مست آنکھ بد بھری کہ جس سے جان آشنا
قرار اک تڑپ میں وہ تڑپ وہ اک تڑپ میں
وہ میرے دل کے شوق کو میری نظر سے دیکھنا
غرض وہ دن کہ جب خوشی میرے لئے منگاتھی
غرض وہ دن کہ حسن جب میرا نظر نواز تھا

غرض وہ دن گھری نہ تھی فلاکتوں کے دور میں
 غرض وہ دن کہ دل سے جب نشان غم کا دور تھا
 غرض وہ دن کہ میں بھی جب کسی کے دل کا ہاتھی
 غرض وہ دن خیال تھا کہ اب نہ جائیں گے کبھی
 غضب ہے شباب میں مرا ساگ لٹ گیا
 مری سکھی سپیلیو خبر تو لو کہ کیا ہوا
 یہ سچ ہے مجھ غریب کا کوئی رفیق اب نہیں
 کہو تو یاد ہیں وہ دن کہ دل تھے جب ملے ہو
 کہو وہ عیش کیا ہوا وہ راحتیں کہاں گئیں
 فناں میں اب وہ جوش ہے کہ جس کی انتہا نہیں
 خیال ہے خزاں میں بھی مجھے اسی بہار کا
 اجل کی ایک شکل ہے یہ درو اس بلا کا ہے
 غرض وہ دن چھنی نہ تھی حبیبوں کے جوڑ میں
 غرض وہ دن کہ آنکھ میں بس رہا سو اس دور تھا
 غرض وہ دن نیاز کے کہ جب میں بے نیاز تھی
 چلے گئے کچھ اس طرح کہ پھر نہ آئیں گے کبھی
 سفر میں تھا جو ہمسفر اسی کا ساتھ چھوٹ گیا
 کبھی تو آ کے پوچھ لو یہ شریک بپا ہوا
 یہ سچ ہے غم نصیب کا کوئی شفیق اب نہیں
 کہاں ہے وہ گفتگو کہ دل تھے جب کھلے ہو
 وہ پیار آج کیا ہوا وہ اُنٹیں کہاں گئیں
 جگر میں اب وہ درد ہے کہ جس کی کچھ دوا نہیں
 غضب ہے چھوڑتا نہیں فریب انتظار کا
 دوا کروں تو کیا کروں کہ وقت اب عا کا ہے

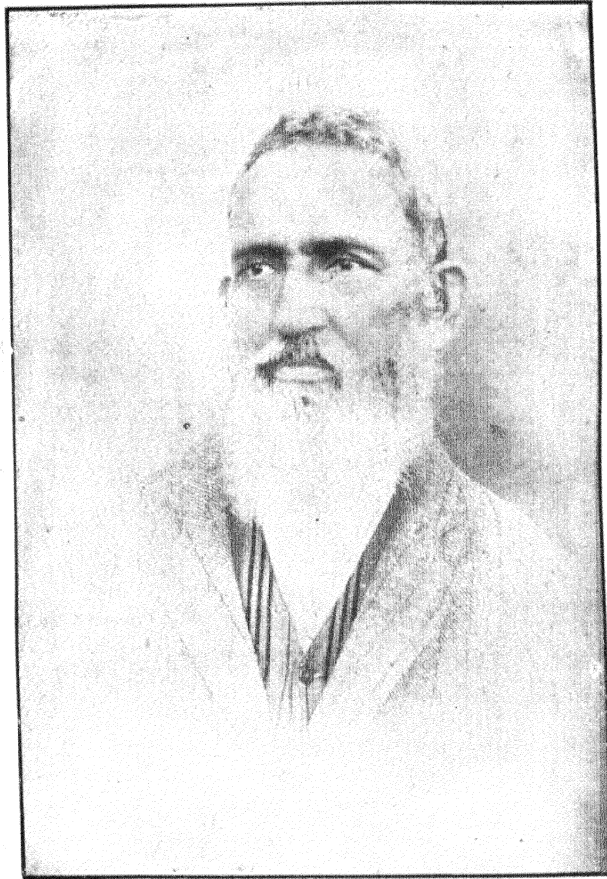
مری طرح نہ زندگی کسی کی یوں عجیب ہو

نصیب موت ہو اگر تو زندگی نصیب ہو

عرشِ ملیانی



مردار بکرم سنگه صاحب بی اس بی ٹی بی ای ایس
ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس راولپنڈی



یڈت رلیا رام صاحب ریڈالوڈی پر وفسور علوم مشرقیہ سنٹرل
ٹریڈنگ کالج لاہور

ہمارا تعلیمی معیار کیوں گر رہا ہے؟

(جناب ایس۔ ایس۔ شرایم لے۔ دہلی)

جس گھر میں ایک آدمی بیمار ہوتا ہے۔ گھر والے سب دکھی ہو جاتے ہیں۔ جائے غور ہے کہ جس ملک کے ۹۵ فیصدی باشندے جہالت کے ہلکے مرض میں مبتلا ہوں۔ وہ کیسے خوشحال رہ سکتا ہے؟

آج کون ہے۔ جو تعلیم کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتا۔ اور ہندوستان کی جہالت کا اسے واحد ذریعہ نہیں سمجھتا۔ علم تو ہم بڑے کا منبع ہے۔ اسی کی بدولت انسان نے عالم سعی کی ہابیت کو سمجھا۔ عالم علوی کی حقیقتوں کو جانچا۔ قدتی طاقتوں سے نوکران اور خادموں کا کام لیا۔ اور نیک و بد میں تیز کی۔ اس کو شروع دینے کے لئے کیا کیا کوششیں نہیں ہوئیں نئی نئی سیکیں نہیں۔ نئے نئے کورس بنائے گئے۔ ٹریننگ کلاسیں کھولی گئیں۔ پرائمری کی تعلیم مفت اور لازمی قرار دی گئی۔ جو دن کے سکولوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے لئے رات کے مدرسے بھی کھولے گئے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود تعلیمی ترقی کی نسبت شکایت ہی سنتے میں آتی ہے۔ اور غور کرنے پر یہ شکایت بہت حد تک درست بھی ثابت ہوتی ہے۔ جتنا وقت اور روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں موجودہ تعلیمی نظام کا غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ اور دیکھنا چاہئے۔ کہ اس میں کیا کیا خامیاں ہیں۔

سب سے بڑی خامی جو دیکھنے یا سننے میں آتی ہے۔ وہ یہی ہے۔ کہ عام طور پر مدرسین پوری توجہ سے فرائض انجام نہیں دیتے۔ بچوں کی اخلاقی اور جسمانی تربیت سے تو وہ اپنا کچھ تعلق ہی نہیں سمجھتے۔ امدوس و تدبیر کی ذمہ داری ایک بوجھ خیال کی جاتی ہے۔ کسی قوم کا بنانا یا بگاڑنا۔ اس کے استادوں کے ہاتھ میں ہے۔ استاد ہی قوم کے بچوں میں انسانیت کی روح پھونکتا ہے۔ وہی انہیں آئندہ زندگی میں سوسائٹی کے لئے مفید رکن بناتا ہے۔ اس لئے اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ اس کا مرتبہ بلند ہے۔ وہ قابلِ عزت ہے۔ مگر ہمارے ملک میں اس کی کیا حالت ہے؟ ایک ان پڑھ مزدور تو روپیہ روز کی مزدوری بھی حاصل کر لیتا ہے۔ مگر مدرس کے کام کا صلہ ۱۲ روپیہ کی کافی سمجھا جاتا ہے۔ اچھا پھر اس سے یہ بھی امید کی جاتی ہے۔ کہ جمل وہ بچوں کی تعلیم کا ذمہ دار ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کی اخلاقی۔ جملانی اور روحانی تربیت کا بھی نگہاں ہو۔ اس کی ذات غیرت۔ خود داری اور العزمی۔ عالی ظرفی اور بلند خیالی وغیرہ صفات سے مزین ہو اور ہمارے بچوں میں بھی ان شرائط انسانی کا بیج

ہوئے۔ جاسے غور ہے۔ کہ جو شخص اپنی ضروریات زندگی کیلئے بھی محتاج ہو۔ جسے خورد و نوش کے فکر سے بھی بجات نہ ہو۔ وہ جس کا خیال با اوقات انہیں مشکلات کا حل ڈھونڈنے میں لگا رہتا ہے۔ ہم کس طرح امید کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داریوں کا بار کامیابی سے اٹھا سکیگا۔ اور اپنا دماغ اپنی توجہ اور اپنا وقت آزادی سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں صرف کر سکیگا۔ اس کے بھی بچے ہیں۔ جن کی تعلیم کا بار اس کی گردن پر ہے۔ اس کے رشتہ دار بھی ہیں۔ جن کی نشا ویدی غمی کی بھڑکت احسان کی زیر باریاں اُسے برداشت کرنا ہیں۔ اُسے بھی اچھی سوسائٹی میں رہنا ہے۔ اور اس کے مطابق اپنی حیثیت کو برقرار رکھنا ہے۔ ۱۲ اُس نے روزیں وہ کیا کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ کمی پوری کرنے کیلئے اُسے آمدنی کے دیگر راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اور جتنا دماغ توجہ اور اپنا وقت اس طرف صرف کرنا پڑتا ہے۔ اسی نہایت سے اس کے اصلی کام یعنی تعلیم میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں تعلیمی کام کامیابی سے نہیں چل رہا۔

ہم مدرسے کی عمارت پر ہزاروں روپیہ صرف کر دیتے ہیں۔ اس کو فرنیچر اور دیگر سامان تعلیم مکمل اہل لائبریری وغیرہ سے آراستہ کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھانیں رکھتے۔ مگر جب استادوں کے رکھنے کا سوال آتا ہے۔ تو روپیہ کی کمی نظر آتی ہے۔ اور سستے سے سستے پتھر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن کا گزراہ بھی تعلیم تنخواہ میں بڑی مشکل سے ہوتا ہے ہماری یہ بے جا کفایت شعاری اس روپیہ کو بھی ضائع کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ جو ہم نے محنت و سامان پر لگایا ہے۔ مدرسے کی زینت اس کی عمارت اور فرنیچر سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصلی زینت استاد ہے۔ جب ہی مطمئن نہیں۔ جب وہی سکول پروری کے تفکرات سے آزاد نہیں۔ اور اپنا دل دماغ سکول کی بہتری کے لئے وقف نہیں کر سکتا۔ تو یہ عالیشان عمارتیں اور قیمتی سامان ہمیں کیا فائدہ پہنچائیں گے۔ چاہے تو یہ تھا کہ پندرہ استادوں کو مطمئن کر کے ان کا انتظام کرتے۔ اور پھر بقایا روپیہ کو عمارتوں اور دیگر سامان پر صرف کرتے۔ تاکہ ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی حسیج واقع نہیں ہوتا۔ اور اُن کا وقت اور قوت اس طرح ضائع نہ ہوتی جیسے آج کل ہو رہی ہے اکتے بچے ہیں۔ جو بلا غھر پر انتظام کئے صرف مدرسے ہی کی مدد سے اپنا تعلیمی کورس سال بسال باقاعدہ طور پر پورا کرتے ہیں؟ جواب بالکل سہی ہے۔ بچوں کا قیمتی وقت ہماری بے توجہی سے ضائع ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں استاد کا درجہ بہت افضل گن جاتا ہے۔ کیا امیر کیا غریب راجاؤں تک نے استاد کا درجہ اپنے سے بالاتر مانا ہوا تھا۔ کیونکہ راجا تو لوگوں کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے اور استاد ان کے دلوں کا مالک راجا کی حکومت اس کے جیتے جی ہے مگر استاد کی سلطنت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ہر سلطنت انجام پذیر ست مبعود

جز سلطنت فیض و حضرت استاد

استادوں کے گوارے کا ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ انہیں اس طرف توجہ دینے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی

تھی۔ وہ بچوں کی بہتری کے ذرائع سوچنے میں ہر وقت مصروف رہتے۔ اور عملی کام کے لئے ان کے دل و دماغ وقف تھے۔

آج کل بھی جو ملک شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں استادوں کی قدر و منزلت بہ نسبت کسی اور طبقے کے لوگوں کے زیادہ ہے۔ اور ان کی تنخواہیں ان کی حیثیت برقرار رکھنے اور ضروریات زندگی پوری کرنے کیلئے کافی سے زیادہ ہیں یعنی جو کہ وہ پوری توجہ سے گلشن قومی کے ان سب سے زیادہ ہٹاؤ پودوں کی پرورش کرتے ہیں۔ اور ان کی اصلاح اس خوبی سے ہوتی ہے کہ وہ بڑے ہو کر نہ صرف اپنے ملک قوم کی زینت ہی ہوتے ہیں بلکہ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبودی کا باعث بنتے ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے اس پودے پر توجہ دیں۔ اور استادوں کی شکایات کو دور کرنے کے ذرائع اختیار کریں۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا۔ ہمارا تعلیمی کام کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ یاد رکھو مدرسہ کوئی سیرگاہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک میدانِ رزم ہے۔ جس میں سیکڑوں نوجوانوں کی زندگی اور موت کی بازی لگی ہوئی ہے۔ جب اس لشکر کا کان افسر ہی افسر وہ دل یا فرض سے غافل ہو۔ تو وہ بیمار ہے اپنے فرائض کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔

از مدرسہ ہر ملک پذیر فتنہ عمارت

غارت شدہ گر نشہ ہم از مدرسہ غارت

جائے افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے امرا اپنے گھوڑوں کو سدھانے کے لئے تو اچھے سے اچھے چابکداز تلاش کرتے ہیں مگر اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے سستے سے سستے ٹیچر کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گھوڑے تو مدرسے ہوئے اور باقاعدہ ہونے ہیں۔ مگر ان کے بچے اکھڑ اور ناتراشیدہ! یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ایک ان پٹھ آدمی جانوروں کو تو سدھائے اور ایک پڑھا لکھا آدمی انسان کے بچوں کی اصلاح نہ کر سکے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جانور دل کو سدھاتا والا پوری کوشش سے کام کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی محنت کا صلہ حبِ منشا پاتا ہے۔ مگر انسان کے بچوں کی اصلاح کو جاننے کا دل مرجھایا ہوا رہتا ہے کیونکہ اسے اس کی محنت کا صلہ کافی نہیں ملتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو مطمئن کریں۔ ان کی حیثیت کو بنانے میں مدد دیں۔ تاکہ ان کی قد ہو۔ اور وہ دل و جان سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوشش کریں۔ بغیر اس کے محض تعلیم کی نئی سیمیں اور ٹیکنیک سکول ہیں ایک قدم بھی آگے نہیں مچھلے۔



لطیفہ

مسافر یہ کیا یہ راستہ محفوظ ہے؟
راہنما: بالکل محفوظ ہے۔ مگر اس سے صرف اڑھن خطرناک ہے

سکولوں میں مضامین کی تقسیم

(از مولوی غلام ناصر خان صاحب نگار بی اے)

یوں تو تعلیم و تعلم کا مسئلہ بنفسہ پیچیدہ ہے۔ مگر سب سے اہم مسئلہ جس میں ایک ہیڈ ماسٹر کو اکثر و شور اڑیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اساتذہ میں مضامین کی تقسیم ہے۔ عموماً ہیڈ ماسٹر اساتذہ کی قابلیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسا کیا کرتے ہیں۔ پھر بھی بہت سی خامیاں ہیڈ ماسٹر کی نا تجربہ کاری اور بعض دفعہ جنبہ واری کی وجہ سے اس انتظام میں نظر آتی ہیں۔

سب سے پہلے میں اساتذہ کی ممکن قابلیت اور ڈگریوں کا ذکر کرونگا۔ جو اپنے ساتھ لیکر اسکولوں میں آتے ہیں۔ میرے پیش نظر صرف اعلیٰ شاف ہے۔ اور اس میں بھی جی اے وی اساتذہ کو بحث سے خارج کرتا ہوں۔ اب مدرس یا تو بی ٹی ہوگا یا ایچ کیو اور لازمی طور سے بی اے بھی ہوگا۔ اور یا زیادہ سے زیادہ ایم اے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسے مضامین ہیں جو سکولوں میں داخل ریفاب ہیں اور الیت اے او بی ٹی میں بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو سائنس بھی ہے اور اُس کے واسطے بلا استثناء تمام سکولوں میں سائنس ماسٹر جدا ہی ہوتے ہیں۔ لہذا اس سلسلہ میں اُن کا ذکر کرنا فضول ہے۔ اب رہے جغرافیہ۔ حساب اور تاریخ۔ ان میں جغرافیہ صرف الیت۔ اے تک ہے آگے ندارد۔ تاریخ پڑھانے کے واسطے ہر وہ گریجویٹ جس نے B.A. تک تاریخ کا مطالعہ کیا پڑھینگ میں بھی اُس کے پاس لازماً یہی مضمون ہوگا (مناسب اور موزوں ہستی ہو) حساب کے واسطے وہ گریجویٹ جس کے پاس حساب کے دوڑوں کو رس یا صرف ایک ہو یا آنرز اسکول پاس ہو بہت ہی مناسب ہوگا۔ جغرافیہ میں ہر گریجویٹ کا مبلغ علم اتنا ہوگا۔ جتنا کہ اُس نے انٹرنس میں پڑھا ہے۔ ایسی حالت میں اُن اساتذہ کو ترجیح دینا چاہیے کہ جن کو اس مضمون سے خاص دلچسپی ہو۔ ہاں اگر الیت۔ اے تک جغرافیہ وان اساتذہ بھی موجود ہوں تو وہ دوسروں پر قابل ترجیح سمجھے جائینگے۔

اوپر میں نے جتنی صورتیں اساتذہ کی بیان کی ہیں وہ عفا کا حکم نہیں رکھتیں بلکہ تبعہ لوکثیر ہر سکول میں موجود ہوتی ہیں۔ کئی وجہ نہیں کہ اوروں کی لیاقت سے کافی فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ صوبہ بھر میں ہیڈ ماسٹر صاحب اور ہی قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر مضامین کی تقسیم کرتے ہیں۔ البتہ اتنا اور ہوتا ہے کہ کسی خاص شخص

کو غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے ایسا مضمون بھی دیدیتے ہیں کہ جس کی سند اُس کے پاس نہیں ہے مگر اُس مضمون میں خاص دلچسپی رکھتا ہے اور ایک سند یافتہ شخص سے کہیں بہتر پڑھا سکتا۔ ایسی مثالیں شاذ ہوتی ہیں اور اصول نہیں بن سکتیں۔

تقسیم مضامین کے سلسلے میں اب ایک نئی بات اور پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے تدریسی اصطلاح میں کلاس ٹیچر سسٹم (تمام مضامین کا استاد) اور سبجکٹ ٹیچر سسٹم (مضمون واحد کا استاد) کہتے ہیں بہت کم سکول ایسے ہیں۔ جہاں اول الذکر طریقہ کو ثانوی الذکر طریقہ پر ترجیح دیا جاتی ہے۔ اور اس کی تائید میں ایک یہ دلیل بتائی جاتی ہے کہ ایک ہی ٹیچر اگر تمام مضامین پڑھائے تو کامیاب رہ سکتا ہے کیونکہ وہ بیشتر اوقات ایک ہی کلاس میں رہنے کی وجہ سے لڑکوں کی طبائع کو اچھی طرح مطالعہ کر سکتا ہے۔ اُس کا ضبط بھی اچھا رہ سکتا ہے اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ہر مضمون میں کافی دلچسپی کا اظہار کر سکتا ہے۔ یہ تین دلائل ہیں جن کے متعلق یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ جو ٹیچر بھی دوسرا مضمون پڑھانے آئیگا۔ وہ بھی ان تینوں باتوں کا جاننے والا اور سمجھنے والا ہوگا۔ طبائع طلبہ کا مطالعہ کرنا اور ضبط کا قائم کرنا ہر ٹیچر کا وصف ذاتی ہے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو ٹیچر کہلانے کا مستحق نہیں۔ اب رہا ذمہ داری کا سوال۔ سوہرچہ اپنے مضمون کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ خواہ وہ کلاس ٹیچر ہو یا سبجکٹ ٹیچر۔ میں یہ بنائیکو تیار ہوں کہ ایک گھنٹہ روز پڑھانے والے استاد کے مقابلہ میں پورے وقت پڑھانے والے کا ضبط اچھا ہو سکتا ہے مگر کسی قدر۔

پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ضبط کے معمولی سے فرق کیوجہ سے قابلیت اور لیاقت کو ضبط کی قربانگاہ پر کیوں بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اب میں اسی طریقہ کے موٹے موٹے بعض نقص بیان کرتا ہوں۔ فرض کیجئے۔ ایک ٹیچر سا نوے جماعت کو انگریزی حساب۔ تاریخ و جغرافیہ پڑھاتا ہے۔ اُس کے ہفتہ میں کل پیریدہ ۲۵ ہونگے اس حساب سے تقریباً ۵ پیریدہ روزانہ ایک ہی کلاس میں ہونگے کیونکہ نصف یوم کی تعطیل بھی ہوتی ہے۔ لہذا کی کیا اور بڑوں کی کیا۔ طبائع عام طور سے جدت پسند ہوتی ہیں اور بچوں کی۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ ہر گھنٹے میں نئی چیز نئی بات اور نیا ماسٹر آئے اور جائے۔ ۵ یا ۶ گھنٹے تک ایک ہی ٹیچر کے ساتھ ساتھ جھک جھک کرتے رہنا اُن کی دلچسپی میں اضافہ نہیں کرتا۔ استاد بھی ایک جگہ قلوب صاحب کی لاٹ بنے بنے اکتا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھائی تو ہوتی ہے مگر ہیڈ ماسٹر صاحب کے دکھانے کو۔ لڑکے خاموش بیٹھے رہتے ہیں مگر ماسٹر کے ڈر سے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ ایک ماسٹر سے کہا جاتا ہے کہ تم فلاں جماعت کو حساب پڑھاؤ۔ غریب ٹیچر کا یہ کہنا کہ اس مضمون سے مجھے دلچسپی نہیں۔ اپنی کسر شان سمجھتا ہے اور چونکہ وہ پڑھانے کا نوکر ہے۔ مجبوراً

پڑھانے پر گلا دھ لیتا ہے اور صرف اتنا ہی پڑھا سکتا ہے جتنا لالہ موہن لال کے حساب میں بذریعہ مثالوں کے واضح کیا گیا ہے۔ اگر کسی اور کتاب کا سوال یا کسی ایسی شق کا جو ماسٹر صاحب تیار کر کے نہ لائے ہوں۔ سوال دیا جائے تو ماسٹر صاحب غائب۔ بھلا جب خود استاد ایک مضمون سے دلچسپی نہیں لیتا۔ تو لڑکوں میں اُس مضمون کیلئے کیا خاک دلچسپی پیدا کر سکیگا۔

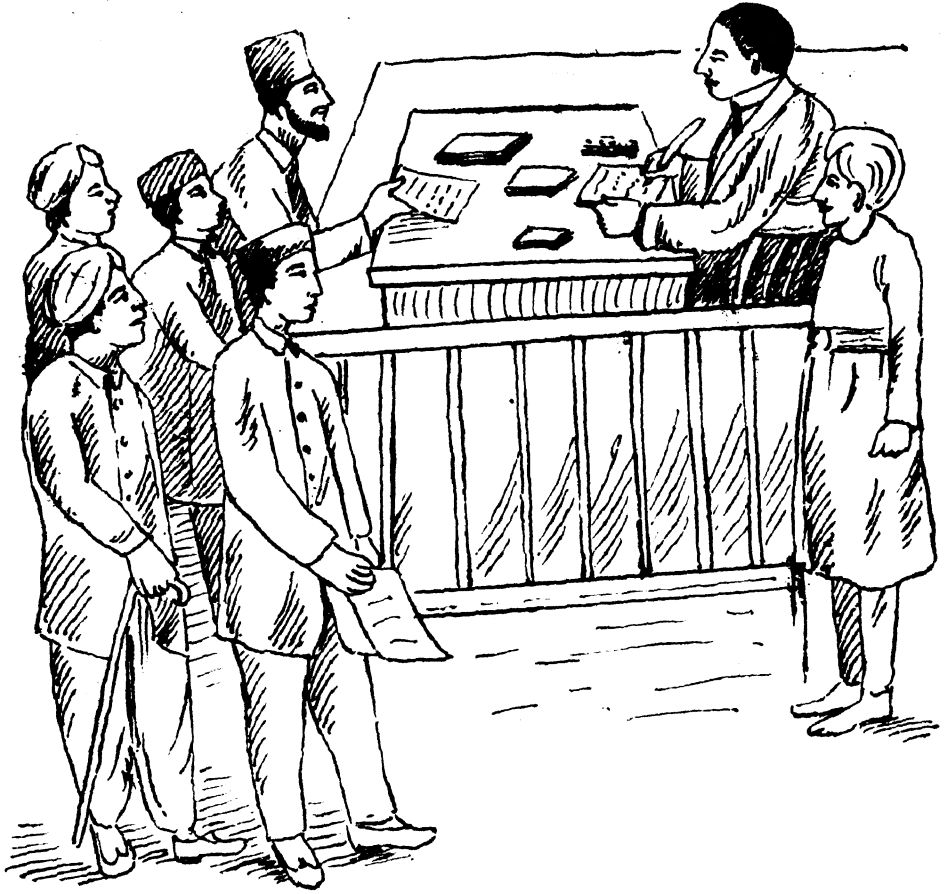
ایک بڑے ماہر فن تعلیم کا قول ہے ”خدارا! کبھی ایسے مضمون کو پڑھانے کی کوشش نہ کرو جن میں تمہیں خود دلچسپی نہ ہو۔ صاف انکار کر دو“

بھلا اس طرح ماہرے باندھے کے پڑھانے کہیں کام چل سکتا ہے۔ تمام مضامین پڑھانے سے استاد چوں چوں کا مرید بن جاتا ہے اور شکستہ پیر کے لفظوں میں *Jack of all trade and master of none*۔ بر غلاف اس کے اگر ایک ہی مضمون پڑھانے کو دیا جائے تو اُس میں کثرت مطالعہ اور مزادت سے (Sheerly) ماہر خصوصی بن سکتا ہے اور اپنے سکول کو اپنے مطالعہ اور تجربہ سے بہت فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ جس طرح ہر سکول میں سائنس ماسٹر ہوتا ہے۔ اسی طرح جغرافیہ اور ریاضی کا ماسٹر بھی علیحدہ ہونا چاہیے۔ اس کے واسطے مخصوص کمرے ہوں۔ جہاں جس وقت طلبا جائیں تو اپنے آپ کو اسی مضمون کے ماحول میں پائیں۔ اُسی مضمون کے متعلق تصاویر سے کمرہ سجا جو اس صورت سے کام بخوبی اور نیا وہ کامیابی سے چل سکتا ہے۔

معمودے چند سکولوں کے علاوہ باقی تمام سکول سبجکٹ ٹیچر سسٹم پر ہی کاربند ہیں اور بہت لمبے نتائج نکال رہے ہیں۔ ایک کامیاب ہیڈ ماسٹر کے لئے ضروری ہے کہ کلاس ٹیچر سسٹم کے مالک و ماعلیہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور حسیا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں اگر اُس کو خوش قسمتی سے کوئی جوہر قابل مل جائے تو اُس سے تمام مضامین پڑھا سکتا ہے۔ مگر ہمیشہ اور ہر حالت میں اسی قاعدہ پر عمل پیرا ہونا خلاف عقل ہے۔

لطیفہ

ظفرؔ کیا اب بھی نعت اللہ تمہارے زیرِ علاج ہے ؟
ڈاکٹرؔ جی نہیں میں نے چند دن سے اس کا علاج کرنا ترک دیا ہےؔ
ظفرؔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اب وہ خطرہ سے باہر ہو گیا ہےؔ



مدرسین اپریل ٹیڈنٹ ڈسٹرکٹ بورڈ سے "جناب عالی! تنخواہ کیلئے تین تین چار چار ہفتے انتظار کرنا پڑتا ہے
ہم سخت تکلیف میں رہتے ہیں۔"

پریزیڈنٹ "کاغذات مرتب کرنے میں کچھ دیر ہو ہی جاتی ہے۔"
مدرسین "جناب عالی! گورنمنٹ سکولوں میں بھی تو کاغذات مرتب ہوتے ہیں۔ وہاں پہلی تاریخ کو تنخواہ تقسیم
ہو جاتی ہے ہمیں بعض اوقات دو مہینے درمیان ایک مہینہ تو ضرور منتظر رہنا پڑتا ہے۔"

پریزیڈنٹ "ہمارے خیال میں پندرہ تاریخ سے پہلے ملنی تو مشکل ہے۔"
مدرسین "تو ڈسٹرکٹ بورڈ کے کلرک پہلی تاریخ کو کس طرح وصول کر لیتے ہیں؟"

ہتہ نمانے پر ایک نقطہ

اس مسئلے پر دو ہیروئنوں سے نگاہ ڈالی جاسکتی ہے۔

۱۔ ایسی خصوصیات کا مطالعہ جو نیکے کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔

ب۔ ایسے حالات کی چھان بین جو بچے کی ذات اور تعلیم پر اثر ڈالتی ہے ۔
پہلی جماعت کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے، بچہ کی ذات کا مطالعہ یا بالفاظ دیگر اس کی فطرت کا موازنہ ضروری ہے۔ یہ ایک امر واقعی ہے۔ اور اس کی صحت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ دیہاتی بچے شہری بچوں سے کئی امور میں بالکل مختلف واقع ہوئے ہیں۔ شہری بچے عموماً چرت و چالاک --- عافیت سحرے۔ ہوشیار۔ باتونی اور مدرسہ میں پابندی اوقات کے عادی ہوتے ہیں اور اس کے برعکس دیہاتی بچے مقابلتاً ڈھیلا ڈھالے۔ میلے پھیلے۔ کمزور۔ کم گوار اور اوقات مدرسہ سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ شہری بچوں کے والدین اکثر حالات میں اپنے بچوں کے نیک و بد سے باخبر، مشتمل اور اس امر کے اہل ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالا جائے۔ برخلاف اس کے دیہاتی بچوں کے باپ اپنے بچوں کی آئندہ زندگی سے بے خبر ناخواندہ یا کم تعلیم یافتہ اور دیہاتی مدرس کے صلح و مشورہ کے پابند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دو شہری اور دیہاتی بچوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ گویا دیہاتی رقبہ جات میں جماعت اول کی حالت بہتر بنانے میں ہمیں ایسے امور پر بھی کافی توجہ دینا پڑتی ہے۔ جو شہری رقبہ جات میں معمولی اور غیر ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔ نیز یہ امر کہ دیہاتی میں تعلیم کا پرچار شعروں کی نسبت دیر بعد ہوا۔ اور اب بھی شہری آبادی سے تعلیم میں پیش رو ہے

ظاہر کرتا ہے۔ کہ طریق کار و طرز اصلاح دیہاتی رقبہ جات میں شہروں کی نسبت کس قدر مختلف ہوگا۔

ضمن ب کی زد میں مندرجہ ذیل اسباب خصوصاً اثر انداز ہیں۔ جن کا مطالعہ
نہایت ضروری ہے!

(۱) اُستاد

(۲) مدرسہ

(۳) سامان تعلیم

(۴) طریقہ تعلیم

اُستاد کی شخصیت

یہ ایک ایسا پیچیدہ سوال ہے۔ کہ جس کے حل پر ساری کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔ یہاں پر بتفصیل یہ جانے کی ضرورت نہیں کہ اُستاد کن اوصاف کا مالک ہونا چاہئے۔ یا یہ کہ اس کی ذات کس طرح سے ان بچوں پر اثر ڈالتی ہے۔ جو اس کے زیر تعلیم ہیں۔ چونکہ یہ ایسے امور ہیں۔ جن پر بار بار روشنی ڈالنی چاہی ہے اور ماضی تعلیم مدرسین یا محکمہ تعلیم سے اس دہر دہری رکھنے والے اصحاب ایک بڑی حد تک اپنے ذہن میں ایک کامل اُستاد کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ اور وہ اس بات سے بھی باخبر ہیں کہ اُستاد کے ہاتھ میں بچوں کی زندگی کا بنانا اور بگاڑنا ہر دو ہیں۔ جسے رنگریز سفید کپڑے پر جو رنگ جانا چاہیے۔ جاسکتا ہے بعینہ ایک قابل اُستاد اپنے شاگردوں کو اپنے رنگ میں یا کسی ایسے رنگ میں جسے وہ چاہے رنگ سکتا ہے مجھے ایسے شاگردوں سے واقفیت حاصل ہے۔ جنہوں نے اپنے اُستادوں سے اُن کی حرکات و سکنات۔ طرز و طریق گفتگو تک کو اپنی ذات کا جزو بنالیا ہے۔ بعض حالات میں لڑکوں کے دستخطوں سے یہ پہچان ہو سکتی ہے کہ وہ فلاں اُستاد کے شاگرد ہیں مختصراً جامعہ اول کے لئے ایک ایسے اُستاد کی ضرورت ہے۔ جو باتوں کا دھنی نہ ہو۔ بلکہ عملی نمونہ پیش کرنے والا ہو۔ جسے اپنے کام سے کام ہو۔ بچوں کے ساتھ بچہ ہو کر رہے۔ جو اُن کے ساتھ مکمل رکنا ہو۔ جو بچوں سے مانوس ہو۔ اور انہیں محبت کرے۔ جس میں لوہے کی سی مقناطیسی کشش ہو۔ جس سے بچے خائف نہ ہوں۔ جو سادگی اور صفائی کا نمونہ ہو۔

عام طور پر شکایت ہے کہ اب نارمل اسکولوں سے قابل اُستاد نہیں نکلتے۔ اور نارمل سکولوں کے

استادوں کا خیال ہے۔ کہ نازل سکولوں میں اچھا مصاحفہ نہیں نہچتا۔ عموماً کمزور اور کم لیاقت امیدوار آتے ہیں۔ یہاں ہی شکوہ شکایت درست بھی ہے اور نہیں بھی۔ یہ معلوم کرنا کہ کس حد تک اس صورتِ حالات کے ذمہ دار موجودہ تعلیمی کورس یا نازل سکول ہیں شکل ہے۔ یہ (*Arguing in vicious circle*) والا معاملہ ہے نازل سکول کی پیداوار پر عام سکولوں میں تعلیمی ترقی کا انحصار ہے۔ اور نازل سکول بہتر پیداوار اس وقت تک نہیں بنے سکتے۔ جب تک ان کے پاس بہتر جنس نہ آئے۔ گویا ہر دو لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن اس امر سے انکار شکل ہے۔ کہ جب تک جماعت کا پانچار ج قابل استاد نہ ہو۔ اس جماعت کی تعلیمی ترقی حسب خواہش نہیں ہو سکتی۔ موجودہ (*Expansion*) کے زمانے میں نازل سکولوں میں داخلے کے معیار کو بلند کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ یا کم از کم ناقابل عمل ہو۔ لیکن یہ کمی زمانہ تربیت کو ایک سال کی بجائے دو سال کر دینے سے پوری ہو سکتی ہے۔ جے، دسی مدسین کے لئے دو سالہ کورس جیسا کہ ایس۔ دی کیلئے ہو چکا ہے۔ یا ہو رہا ہے۔ کر دیا جائے تو کمین یا بہتر نتائج کی امید ہے

کوئی وقت تھا جب کہ دیہاتی مدرس کو سوائے درس و تدریس کے کوئی کام نہ تھا۔ اس وقت اس کی توجہ کامرکز تمام تر یا زیادہ تر اس کی جماعت یا جماعتیں تھیں۔ اور وہ ان کی حالت کو بہتر بنانے میں ہی کوشاں رہتا تھا چونکہ اسی میں اس کی ترقی کا راز نہیں اور درحقیقت اس کی نجات کا راستہ تھا۔ اُسے اچھی طرح سے معلوم تھا۔ کہ اس کی ترقی کا انحصار اس کے تعلیمی کام پر ہے۔ لیکن برعکس اس کے آجکل مختلف اقسام کے فرائض (خواہان فرائض کی ادائیگی کے لئے مدرس کو عوامنا یا الاؤنس مل جاتا ہے) ان کی توجہ کو منتشر کر رہے ہیں۔ اس کا اثر بحیثیت مجموعی سکول کی تعلیمی حالت پر پڑتا ہے۔ اور جماعت اول جو بیش از بیش توجہ کی محتاج ہے۔ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ اس تحریر سے یہ مطلب نہیں کہ مدسین ڈاکخانہ کا کام۔ دیہاتی بچوں کا کام یا وثیقہ نویسی کا کام نہ کریں۔ اور نہ یہ مقصد ہے کہ جملہ محکمہ جات کا باہمی تعاون بند ہو جائے۔ اس سے صرف مدعا واقعات کا اظہار ہے جن سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ مدسین پر دن بدن تعلیمی کام کے علاوہ ایسے فرائض کا بار بڑھنا چاہا رہا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس سے آگے بند نہیں ہو سکتی۔ اور جلد یا بدیر ہیں ان واقعات کی وجہ سے کھمبہ کش سے دوچار ہونا اور مناسب حل سوچنا پڑے گا۔

(۲) مکان یا کمرہ مدرّس

جہاں استاد کی ذات مدرسہ کے جملہ طلباء کو عموماً اور جماعت اول کے بچوں کو خصوصاً موثر کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہاں کمرہ جماعت بھی ایک ایسا جزو ہے۔ جو ان بچوں کی تعلیمی ترقی میں امداد دینے والا ہے

چند عملی دقتیں اور ان کا مناسب حل

۱۔ سب سے اول دقت طلبہ کے داخلہ اور ان کی فہم کی ہے۔ آج کل فراہمی طلباء کا مسئلہ ہر ایک اسکول استاد، افسرانِ معائنہ اور ماہرینِ تعلیم کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ جب تک طلباء مدرسوں میں آتے نہیں۔ ان کی بہتر تعلیم کا انتظام کیونکر ہو۔ تعداد ہی ترقی کا بہترین انڈیکس *index* گنا جاتا ہے۔ مختلف مقامات اور علاقوں میں مختلف طریقوں سے کام کرنے کی ضرورت ہے لیکن پریکٹس اور بچوں کے والدین اور پبلک سے باہمی تعاون و دوا ایسے ستون ہیں۔ جن پر ترقی تعداد کی سقف مضبوطی سے کھڑی رہ سکتی ہے۔ ماہ اپریل میں شہر کے ہائی سکولوں میں جو کشمکش داخلہ کے لئے کی جاتی ہے۔ اس سے مدرسہ اور دکان میں مٹا بہت کا گمان پڑ جاتا ہے۔ جہاں مذہب اور ترقی یافتہ ممالک میں اشتہار بازی سے کام لیا جاتا ہے۔ دکان دار گاہک کی کشش کے لئے *Window Show* کا انتظام کرتا ہے۔ رنگ برنگ کی بجلی کے پلوں سے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ وہاں مدرسہ میں جہاں ابتدائی تعلیم ایسی قیمتی شے کی فروخت کا انتظام ہے کیونکہ وقتاً فوقتاً ایسے (*Exhibitions and Shows*) کا انتظام کیا جائے۔ کہ جس سے بچے مانوس ہوں۔ اور والدین ان کو بھیجنے پر راضی ہوں۔ *Exhibitions and Shows* سے میرا مطلب یومِ والدین۔ جلسہ تقیم انعامات اور *Scouting Shows* کا ہے۔

۲۔ بچوں کا سکول میں رکھنا

جس طرح دولت کمانا اتنا مشکل نہیں۔ جتنا اس کا سنبھال کر رکھنا۔ اسی طرح طلباء کی فراہمی اتنی مشکل نہیں۔ جبکہ ان کو بعد فراہمی مدرسہ میں حاضر رکھنا۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آفیسرانِ معائنہ کی تشریف آوری کے موقع پر ترغیب و محبت سے طلباء کو سکول میں داخل تو کر آتے ہیں۔ لیکن بعد میں طلباء کو سکول چھوڑ جاتے ہیں۔ اس واسطے نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی زبردستی یا توجہ سے یا استاد کی لاپرواہی سے طلباء کجا جماعت اول حاضر ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے بچوں کو ہوشیاری اور طریقے سے ہی مدرسہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہر ایک بچہ دنیا پرندہ جو قفس مدرسہ میں داخل ہوتا ہے اسے مانوس کیا جائے۔ اور پھر باقاعدہ ہر روز حضورِ اہبت سبق پڑھایا جائے۔ کسی ایک دن بھی اسے سبق نہ پڑھانا اسے مدرسہ سے بدظن کرنا ہے۔ اگر وہ ایک آدمی جو ہر عمر حاضر ہوتا ہے تو اس کے سر پرست یا والدین سے پرسش ضروری ہے۔ بدنی سزا کا دینا ہر ایک ستم پرندے کو ہمیشہ کے لئے سکول سے پروا کرنا ہے۔

وقتاً فوقتاً شریکی تقسیم نئے بچوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

۳۔ طلباء کا گروہوں میں تقسیم کرنا۔

یہ وقت حقیقت حل طلب ہے۔ چونکہ جماعت اول کے طلباء سال کے ہر حصہ میں داخل مدرسہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے داخلہ پر کوئی قید نہیں۔ اور اگر نئے طلباء کو سبق نہ دیا جائے تو بھی مشکل ہے۔ بدینہ جہ مدرسہ انچارج کے پاس متحدہ اور مختلف سیکشن بنتے جاتے ہیں۔ اگر وہ ایک ایک طالب علم کو علیحدہ علیحدہ سبق دیتا ہے۔ تو یہ اس کے فوری ذہنی کا فضول خرچ ہے۔ بہتر بات تو یہ ہے کہ جتنی جلدی ان طلباء کو ہم سبق گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اتنا ہی فائدہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انفرادی سبق جماعتی سبق سے زیادہ موثر ہوتا ہے لیکن ایک استاد سے چالیس پچاس طلباء کے انفرادی سبق کی امید رکھنا اُسے مار ڈالنا ہے۔ متعدد گروہوں کی تقسیم کا کام دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ بڑی جماعتوں کی طرح داخلہ کا موسم مقرر کیا جائے۔ خواہ سال میں پہلے تین یا چار دفعہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن آہستہ آہستہ داخلہ سال میں صرف دو دفعہ کر دیا جائے۔

ب۔ بصورت دیگر جو طلباء دیر سے داخل مدرسہ ہوں۔ انہیں زیادہ سبق دے کر آگے والوں کے ساتھ ملایا جائے لیکن اس میں پھر دو وقتیں ہیں۔ ۱۔ جو طلباء بعد میں داخل ہو کر پہلے داخل شدہ طلباء کے ساتھ مل جاتے ہیں وہ ان کی ندامت کا باعث ہوتے ہیں۔ اور بعض وقت جماعتی سبق کی خاطر طلباء (مکمل) (۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔

جماعت اول کے کما کی نگہ رانی

۱۔ ہیڈ ماسٹر۔ مدرس پنجارج کی نکتہ چینی ہی نہ کرے۔ بلکہ اصلاح دے۔ اور جن لائون پرائسٹاد نے شروع سال سے کام چلایا ہے۔ انہیں لائون پرائسٹاد پر ہیڈ ماسٹر وقتاً فوقتاً اصلاح دیتا رہے۔ پنجارج مدرس کو ہر روز نئے طریقہ پر ڈالنا جماعت کی ترقی کو روکنا ہے۔ محض "ایسا ہونا چاہئے" "ایسا ہونا چاہئے" ہی کام کو بہتر نہیں بنا سکتے۔

ہیڈ ماسٹر جماعت اول اور پنجارج مدرس کو اپنی بہترین دولت سمجھے۔ اس کے دل میں پنجارج جماعت اول کی عزت کسی دوسرے استاد سے کم نہ ہو۔ وہ جماعت اول کے مدرس کو امتیازی مدرس تصور کرے۔ اور جماعت اول کو شان مدرسہ۔ وقتاً فوقتاً جماعت اول کا امتحان لیتا رہے۔ گاہے گاہے چھوٹے چھوٹے انعامات سے ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہے۔ نقشہ انفرادی ترقی کی باقاعدہ ہمارہ پڑتال کرتا رہے۔

ب۔ افسران معائنہ کے ذمہ بھی اس جماعت کے بہتر بنانے کے خاص فرائض ہیں۔ اگرچہ وہ زیادہ معائنہ نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ اس اصول پر کہ جماعت اول ہی مدرسہ کی بنیادی جماعت ہے، عمل پیرا ہوتے ہوئے جماعت اول کا امتحان سب سے پہلے کریں۔ نقشہ انفرادی ترقی کی جانچ پڑتال کریں۔ بشرط ضرورت علی طویر نمونہ کا سبق دیں۔

رائے بک میں ایک خاص اور مکمل نوٹ جماعت اول پر دیا جائے



اساتذہ اور قومِ ترقی

(جناب چودھری محمد عبداللہ بی لے آنرز سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

جول جوں زمانہ سائنس، فلسفہ، علم الاخلاق اور نفسیات میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ علم و عمل کے ہر شعبے میں نئے نئے نظریات قائم کئے جا رہے ہیں۔ محققین کی آسے دن کی تحقیقات نے لوگوں کے خیالات میں اہم تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ ہر بات کی تدبیر پہنچنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ ماہرین فن تعلیم بھی اپنے حلقہ عمل میں پورے رُو اور استقلال کے ساتھ نئے نئے انکشافات کرنے میں مشغول ہیں۔ علم النفس (سائنس کالوجی) کی جدید تحقیقات نے مدرس کے نقطہ نگاہ میں عظیم الشان تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اور مدرس کا دائرہ عمل اب بہت وسیع ہو گیا ہے۔ فی زمانہ اس کی کوشش صرف اپنے طلباء کی ذہنی ترقی تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ ان کی اخلاقی اور جسمانی تربیت اُس کے اہم ترین فرائض میں داخل کی گئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ موجودہ زمانہ میں اُستاد کا کام حیوانِ ناطق سے بااخلاق انسان بنانا قرار دیا گیا ہے۔

اس مقصد کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ کسی قوم کی مجموعی اور انفرادی ترقی میں اُستاد کس قدر دخل ہے۔ مشاہیرِ عالم کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا واد قابلیتوں کے علاوہ اُنکے اوج ترقی پر پہنچنے کے ذرائع میں قابلِ مائیں اور کامل اُستاد خاص طور پر مقابلِ ذکر ہیں۔ کامل اُستاد کی زیرِ تربیت ایک معصوم بچے کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے ایک گھمار کے ہاتھ میں خمیر کی ہوئی مٹی۔ وہ جس طرح کی شکل چاہتا ہے۔ اس سے تیار کر لیتا ہے۔ بعینہ اپنے فن میں ماہر اُستاد بھی اپنے طلباء کو جس اخلاقی سانچے میں ڈھانا چاہے۔ ڈھال سکتا ہے۔

بچے کی فطرت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ ہر لحظہ اپنے گرد و پیش کے واقعات اور مشاہدات سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ صالح حقیقی نے قوائے فہمی میں یہ خاصیت و دلالت کر دی ہے۔ کہ ایام طفولیت میں قبول کردہ تاثرات کو وہ دائم حیات صانع نہ ہوتے دیں۔ چنانچہ ایک معمولی سے تجربہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے۔ کہ بچپن کے تاثرات کس قدر مستقل صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور انسان کا ہر فعل کسی نہ کسی حد تک اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس شخص نے بچپن میں ڈراؤنی کہانیاں یا قبرستان اور مرگھٹوں کے متعلق بے بنیاد روایات یا جن بھوت کے افسانے سنے ہوں۔ یا جس شخص کی بچپن میں تربیت کرنے والے کسی قسم کی توہم پرستی کا شکار ہوں۔ تو خواہ وہ شخص کتنا ہی تعلیم یافتہ

کیوں نہ ہو جائے۔ اور کتنا ہی ان باتوں کو ہیودہ اور بعید اور عقل خیال کیوں نہ کرے۔ پھر بھی وہ کی طور پر ان خیالات کے اثرات سے ہذا دی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ جن میں اس کی حرکات و سکنات سے اُن تاثرات کی موجودگی کا علم بخوبی ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اکیلا اندھیرے میں یا دوپہر کے وقت کمیں دور درازا میں گزرے۔ تو ضرور گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کرتا ہے۔ اس ذہنی کیفیت کا باعث وہی تاثرات ہوتے ہیں۔ جو اس نے بچپن کی حالت میں قبول کئے تھے۔

یہی حال اچھے تاثرات کا ہے۔ وہ بھی انسان کا مرتے دم تک ساتھ دیتے ہیں۔ پس اگر بچے کی تربیت ایسے ماحول میں کی جائے جس سے کہ وہ عمدہ اثرات کو قبول کر سکے۔ تو یہ امر نہایت ہی خوشگوار نتائج کا باعث ہوگا۔ بڑے بڑے جرنیلوں اور بد بڑوں کے سوانح حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے تربیت کنندگان خاص طور پر اپنے اساتذہ کے نمونے اور تعلیم سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ جیمز گارفیلڈ جو ادنیٰ حالات سے ترقی کر کے سوشلزم میں ممالک متحدہ کا پریزیڈنٹ بنا۔ ایک مرتبہ اپنے استاد کے صرت اس چھوٹے سے لیکن معنی نیر فقرے سے کہ اگر تم اچھی طرح دل لگا کر پڑھو۔ تو ہو سکتے۔ کہ تم ایک بڑے جرنیل بن جاؤ۔ اتنا تاثر ہوا۔ کہ اُس نے اپنے دل میں عقد کر لیا کہ وہ ضرور شوق سے تعلیم حاصل کر کے بڑا آدمی بنے گا اور آخر وہ اپنے ادا دے میں باوجود بے شمار مصائب و مشکلات کے کامیاب ہوا۔

طلبا کو اپنے اساتذہ پر ایک خاص اعتماد ہوتا ہے۔ اس اعتماد سے استاد بے انتہا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور اس حقیقت سے کام لے کر وہ اپنے طلباء کی رہنمائی نہایت آسانی سے کر سکتا ہے۔ دیکھا گیا ہے۔ کہ چھوٹے بچے اپنے استاد کو سب سے زیادہ لائق اور قابل ترین کہتی تصور کرتے ہیں۔ اس کا ہر لفظ ان کے لئے ایک سبق ہے۔ حقیقت ہوتا ہے۔ جیسے وہ بچے چون و چرا مانستے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے اعتماد کا یہ حال ہے کہ وہ ہرگز یہ گویا نہیں کرتے۔ کہ ان کا کوئی بڑے سے بڑا عوز یا بھائی ان کے استاد کے خلاف کوئی بات بنائے۔ یا ان کی نصیحت کرے۔ اگر آپ پانچ چھ سال کے بچے کو کہیں کہ بھئی میاں یہ لفظ جو تم پڑھ رہے ہو غلط ہے یوں نہیں یوں ہے! تو وہ جھٹ کہہ دے گا۔ کہ نہیں جی ماسٹر صاحب نے اسی طرح بتلایا تھا۔ الغرض یہ ایک ایسی بات ہے۔ جو استاد کے سوا کسی دوسرے کو تیسر نہیں۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے طلباء کی آئندہ زندگی کو وہ جس طرح چاہے۔ تو مالک کی خدمت کا بہترین ذریعہ بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے چنانچہ اگر بڑی میں ایک مشل ہو جیسا مفہوم یہ ہو کہ آج کا بچہ کل کا باپ ہے۔ یعنی بڑا ہو کر آدمی جن عادات اور اخلاق کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی بنیاد اس نے بچپن ہی میں ڈالی ہوئی ہے۔ اور وہی ابتدائی تاثرات اس کی کامیابی یا ناکامی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس نظریے کو پیش نظر رکھ کر جو کہ فی زمانہ ایک عمدہ حقیقت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس امر کے

تسلیم کر لینے کے بغیر انسان کو اٹھارہ نہیں ہو سکتا کہ اقوام کی ترقی میں اساتذہ کا بہت بڑا دخل ہے۔ قوم افزا ہو سکے جو کسے کا نام ہے۔ اور اساتذہ کا کام انفرادی زندگی کی اصلاح اور تکمیل ہے۔ اللہ اور ماہر فن استاد و خط و صورت اور نیک مزاج سے اپنے طلباء کے خیالات میں چہرے انگیز تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور قوم پرستی اور استیاد و جمالیت کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے انہیں سچی اور وقت کے گرائس سے نکال کر ترقی اور کامیابی کی منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

محنت۔ دیانت۔ فراخ بوارہی۔ پابندی احکام۔ شجاعت۔ غیرت۔ کفایت شعاری۔ علم۔ تعاون۔ صفائی۔ رحم۔ شفقت۔ احسان۔ مروت اور شکر گزاری وغیرہ عمدہ فضائل کی بنیاد اس زمانے میں رکھی جاتی ہے جیکہ طلباء اپنے اساتذہ کی صحبت میں تعلیم حاصل کر سنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس طرح سے بری عادات سے نفرت کا مادہ بھی اس عمر میں بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ اور اگر نیکے کی تربیت صحیح طور پر ہو رہی ہو۔ تو خود بخود اسکی طبیعت خلعت۔ تساہل۔ بزدلی۔ حسد۔ کینہ۔ خود غرضی اور بے مروتی وغیرہ یہ اخلاقیہ قہل سے اجتناب کرنے لگ جاتی ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ یہ تمام باتیں جن پر اساتذہ زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار ہے اس طریق سے اپنلا کر کرتی ہیں کہ بالکل محسوس نہیں ہوتا۔ اس وقت کی سکھی ہونی باتیں خواہ وہ ابھی بچوں یا بڑوں کی تمام عمر انسان کا ساتھ دیتی ہیں۔ اور راسخ ہو کر فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ جو ان ہو کر کسی شخص کے گھر کو گھر کی بنیاد اُنہی باتوں پر ہوگی۔ جو اس نے ایام تعلیم میں اخذ کی تھیں۔ جس طرح کہ ایک بچے سے پودے کی نشی کو جس طرف جھکا دیں۔ بڑا ہو کر درخت بھی اسی طرف کو جھکا رہیگا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ بچپن میں جس طرف اس کی طبیعت کا رجحان ہو گیا۔ جوان ہو کر اسی قسم کا وہ نمونہ پیش کرے گا۔

پس کسی قوم کے افراد کی زندگیوں کو سنوارنے میں استاد کی ہستی کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور قومی ترقی چونکہ دراصل انفرادی آمدنی کے مجموعے کا نام ہے اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں کہ کسی قوم کی ترقی کا باعث وہ قابل فخر اساتذہ ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں اس قوم کے نوجوانوں نے تربیت پائی ہو۔

اگر یورپ کی تاریخ کا سرسری نگاہ سے مطالعہ کیا جائے۔ تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ کہ ان ممالک کی اقتصادی ترقی۔ عام بیداری اور اس کے ساتھ احیاء و ترویج علوم و فنون میں حکماء اور محققین کے علاوہ ماہرین تعلیم نے نمایاں اور قابل قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔ انگلستان اور وسطی یورپ کی ترقی سے پہلے دنیاں کے طریقہ تعلیم میں کینیس۔ لاک۔ روسو۔ ہرمیٹ۔ پٹ بوزی ایسے ماہرین فن تعلیم نے ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ جس کی بدولت درس گاہیں صرف درس گاہیں ہی نہیں۔ بلکہ مجمع معنوں میں تربیت گاہیں بن گئیں۔ اور تمام یورپیوں ایک عظیم آدمی کی لہر پیدا ہو گئی۔

پس ہر وہ قوم جو چاہی ہے اپنی اور دلت کے گڑھے سے نکل کر معزز اقوام میں شامل ہو۔ اور جس کی خوشن حالی ہے کہ جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر علم کی روشنی میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ اور جس کی خواہش ہے کہ اس کے افراد دنیا میں وقار۔ خود داری اور عزت سے زندگی بسر کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ثابت شدہ نظریے سے فائدہ اٹھائے۔ اور آئندہ نسل کی بہتری کا جو سبب اہم لیکن سب سے آسان ذریعہ ہے۔ اس سے کام لے۔ اُسے چاہئے کہ استادہ کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کر دے۔ اور ان کی حالت کو بہتر بنا کر ان سے تعاون کرے۔ یہی ایک طریق ہے۔ جس سے کہ قوم کی حالت قبل تر ہی غریب سے بہتر ہو سکتی ہے

معجزہ

معجز اس لفظ کا مادہ ہے۔ اور اس کا اطلاق ایسے خلاف عادات واقعات پر ہوتا ہے۔ جو انسان کو حیران کن ہیں جن کو لوگ تعلیم یافتہ سمجھتے جا رہے ہیں۔ معجزات کی حقیقت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اکثر معجزات کے وجود ہی سے انکار ہو رہا ہے۔ اور اکثر ایسے ہیں جن کیلئے موجودہ تعلیم یافتہ لوگ طرح طرح کی جہتیں مکر رہے ہیں۔ کسی میں راوی کے بیان پر شک کرتے ہیں۔ کسی میں لوگوں کی لاعلمی اور ناواقفیت کو آگے لایا جاتا ہے۔ راوی کے بیان کو جاننے سے پہلے اُس کے لفظ ہونے کا یقین حاصل کیا جاتا ہے۔ پھر اُس کے بیان کردہ واقعات کو روایت کی گئی ہیں کہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر ایک معجزہ کی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔ کہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ معجزہ خیال کر کے ہیں۔ تاہم ابھی تک ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو معجزات کے اچھی طرح سے قائل ہیں۔ یہ معجزات نہ صرف ذی روح چیزوں سے وابستہ ہیں۔ بلکہ اکثر ہیں تو اشیا اور دیگر جمادات کو بھی ذی روح ہستیوں کی طرح صاحب ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ معجزات کسی خاص گروہ اور فرقے کی ملکیت اور وحدت نہیں ہیں۔ قدیم سے قدیم مذاہب میں بھی اس کے نشانات بلکہ کثرت نظر آتی ہے۔ چونکہ ابتدا میں لوگوں میں تحقیق کے شوق عنقا تھے۔ بلکہ اکثر اوقات ان معجزات کی چھان بین کفر قرار دی جاتی تھی۔ اسلئے سادہ لوح لوگ اُسی بات کے قائل ہو جاتے تھے۔ جو غلط قدرت یا عادت اُن کو ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔ آج بھی گناہ اور پس افتادہ علاقوں میں ایسے بہت سے لوگ پائے جاتے ہیں جو عام لوگوں کو اپنے معجزات سے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی یہ لوگ خاندانہ اور باوقف افراد سے دوچار ہوتے ہیں۔ ساری معجزاتی بھول جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے حلقہ میں اسلئے معجزانے جا رہے ہیں کہ وہ جس چیز کو خود دیکھتے ہیں۔ وہی میٹھی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہر خاندانہ اور باوقف آدمی اُس کی طرح چیزوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ لوگ یہ سوچنے کی کوشش نہیں کرتے کہ چیزیں میٹھی کس طرح ہو سکتی ہیں۔ بلکہ فوراً ہی اُن کے مانع پر چیزوں کے

میٹھا ہو جائے گا حیران کن عمل یہ اثر پیدا کرتا ہے۔ کہ ہونہ ہو۔ کی کوئی خدا کا خاص فرد ہے۔ جس کو اس نے اپنی طاقت میں سے کچھ حصہ خاص طور پر عطا کیا ہے۔

بعض مذہبی معجزات ایسے ہیں۔ کہ دنیا اُن کو دانتہ مانتی چلی جا رہی ہے۔ کیونکہ اُن کا دوجو کسی خاص فرقے کی زندگی اور موت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اگر اُن معجزات کی صداقت سے صحتاً انکار کر دیا جائے۔ تو اس فرقے کی مذہبی حیثیت جلد ہی گر جائے گا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہاں اُن لوگوں کو اشاعت و تبلیغ مذہب کیلئے اور سابق پیروان مذہب کو راسخ الاعتقاد بنانے اور رکھنے کیلئے ایسا کرنا ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ باوجود علم سائنس کے دن بدن بڑھتے جانے کے چند سببائی معجزات آج تک نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی بدستور قائم ہیں۔ جہاں کہ علم سائنس اپنے پورے عروج پر ہے۔

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ان معجزات کا آسان بڑا اثر کیوں ہے؟ وجہ یہ ہے کہ یہ معجزات شروع دنیا سے آدمی کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ اور اب ہولے ہولے اپنی قدامت کے لحاظ سے سرشت انسانی میں ایک طرح سے گھر چکے ہیں۔ اگر ہم ان کو مٹانا اور ان کا اثر نایل کرنا چاہیں۔ تو جلد کا مسیابی ناممکن ہے۔ کیونکہ کروڑوں سال کے پروپیگنڈا کا اثر ان واحد میں دُور کرنا کوئی آسان امر نہیں ہے۔ اور پھر اُس حالت میں جب کہ مذہب اپنی زندگی کے لئے ان کے احیا کی پر زور کوشش کرتے رہیں۔ اور یہ باتیں لوگوں کے دلوں پر اُس وقت سے جمی ہوئی ہیں۔ جبکہ اُن کے دل ہر قسم کی واقفیت سے پاک تھے۔ شروع کے تصورات اور نفوس کو مٹانا اور دُور کرنا نہایت ہی مشکل ہوا کرتا ہے۔

ضعیف الاعتقاد لوگ گھر زمانے ہی میں ہوتے ہیں۔ ان کی کمزور طبیعت میں عجز کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ معجزات کے زیادہ اور پہلے قایل ہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ اس کے بعد معجزہ یا واقعہ عام ہو کر لوگوں کی دلچسپی حاصل کر لیتا ہے عام لوگوں میں اگرچہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ جو ہر ایک بات کی چھان بین کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن وہم اور نقل کی عادت اور ضعف الاعتقاد لوگوں کی صحبت اور رسوخ اُن پر اپنا اثر کرتا ہوا۔ اپنا ہم خیال بنالیتا ہے معجزات کو جنم دینے والے عام طور پر ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ جو معجزے کے ہیر وے کسی نہ کسی شکل میں کم و بیش وابستہ ہوتے ہیں۔ یا تو ہم مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ تقدس کے جذبہ کے پیروں پر مشرک معجزہ کو جنم دیتا ہے۔ اور یا پھر رشتے کی نزدیکی کے باعث کسی خاص فرد کا عام لوگوں سے الگ قرار دینے کی کوشش کرتا ہوا خلاف عادت یا دیگر فوائد اس سے منسوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ لوگ اُسے ایک غیر معمولی انسان خیال کرنا شروع کر دیں۔

جب کبھی معجزات نے جنم لیا ہے۔ مخالف بھی اپنی آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ لیکن معجزات کی اشاعت

کرنے والوں کو بہت زیادہ مخالفت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باعث اُن کو اپنے بہت سے ہم خیال پیدا کرنے میں ہمیشہ کامیابی حاصل ہوتی رہی ہے۔ آج جبکہ تمدن کافی ترقی کر چکا ہے۔ متمدن لوگوں میں ایسے لوگ مل سکتے ہیں۔ جو کسی بھی معجزہ کے موید بنائے جاسکتے ہیں۔ ہر ملک عام طور پر اور ہندوستان خاص طور پر اپنے بزرگوں کی عزت کرنا فرض جانتا ہے۔ اُن کے احکام و ارشادات کی تعمیل ہی میں اپنی سعادت خیال کرتا ہے۔ چونکہ ہمارے بزرگ ان معجزات کے جنم و اتار اور موید تھے۔ لہذا یہ معجزات ہم کو اُن سے وراثتاً مل رہے ہیں۔ ہم اور ہم میں سے بعض ان معجزات کی حقیقت سے واقف ہو کر بھی یہی مناسب خیال کرتے ہیں۔ کہ بزرگوں کو ناراض نہ کریں۔

مُجوں جوں لوگوں کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ معجزات کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ آج تک بہت سے امراض کے اسباب دریافت ہو چکے ہیں۔ اُن کے متعلق جس قدر معجزات لوگوں میں مشہور تھے۔ بہت سے اُن میں سے ہمیشہ کی موت مر چکے ہیں۔ سائنس اور معجزات میں سخت بیر ہے۔ جہاں سائنس سے لوگ واقف ہوئے۔ معجزات کی حقیقت پہنچانے لگے۔ بس معجزات کا خاتمہ ہوا۔ بعض لوگ واسیلو کا پیالہ عورتوں میں لئے پھرتے ہیں۔ اور اُن کے سامنے اُس میں پانی بھرتے ہیں۔ کتنا یہ سُناتے ہیں۔ کہ دیکھو۔ جو پانی پانی شری کرشن مہاراج کے چرن چھوتا ہے۔ فوراً نیچا ہوتا شروع ہو جاتا ہے۔ نادان عورتیں سائنس کے اصول کو کیا جانیں۔ وہ خیال کرتی ہیں کہ یہ شخص ستھرا لکڑی کا رہنے والا ہے۔ اسی لئے شری کرشن مہاراج نے اپنی ٹشکی میں سے اُس کو کچھ حصہ دیا ہے۔ ورنہ پانی کس طرح نیچے بہ سکتا ہے۔ جب کہ پیالہ بھی آدھا ہی بھرا ہوتا ہے۔ ہم یہ تو ماننے ہیں۔ کہ کرشن جگتی سکھائے گا یہ اچھا اور آسان ذریعہ ہے۔ لیکن اس میں مداری یا ستھرا باشی کی کیا کارگیری ہوئی۔ بات یہ ہے کہ پُرانے لوگوں نے اول تو تائید نہیں لکھی بہت کم ہیں۔ اور اگر لکھی ہیں تو اس طرح کہ تواریخ غیر مضمون بندی شامل کر دی ہے۔ پھر ان تواریخ کی تقدیس نے ان کے حرف حرف کیلئے لوگوں کے دلوں میں ایک خاص جگہ پیدا کر لی۔ عام ذہن باریکیوں اور مضمون بندی کی صنائع و بدائع استعارات و تشبیہات کو سمجھنے سے اُن کی اصل مراد سے ناواقف رہے۔ اور الفاظ پر یقین کرنے کی کوشش کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کہیں کتاب میں ذکر تھا۔ کہ فلاں نے دُعا کی۔ کہ چاند کچھ دیر نظر نہ آئے۔ وہاں یہ سمجھ لیا گیا کہ فلاں پیغمبر نے چاند کے ٹکڑے کر دیئے۔ اور جہاں ذکر تھا کہ فلاں نے سمندر پر پُل باندھنے میں کمال کر دکھایا وہاں یہ کہا جانے لگا۔ کہ اُجی۔ مہاراج نے جس ستھرا کو ہاتھ لگایا۔ وہی پانی پر تیرنے لگا۔ ہم تقدیس اور خوش اعتقادی میں تو اس سے بھی آگے جانے کو تیار ہیں۔ لیکن سائنس کچھ کرنے نہیں دیتی۔ کریں کیا ؟

امزنا تھ طیش موگوئی

مسئلہ فیثاغورث کا ریاضی احسان

(مولوی محمد عزیز الدین صاحب سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

حکملے یونان نے جس دماغ سوزی جانفشانی اور عرق ریزی سے نئے نئے انکشافات اور معلومات دنیائے عالم کے سامنے پیش کئے۔ اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اور دنیا کبھی ان کے احسان اور شکریہ سے محروم نہ رہی ہو سکتی۔

عظیم افلاطون - ارسطو - سقراط - بقراط - ارسطاطالیس - بوعلی سینا - فیثاغورث کے نام سے کون واقف نہیں۔ جس عزت اور احترام سے لوگ ان کو یاد کرتے ہیں۔ اس سے ان کی عظمت اور شان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب کیوں؟ اسلئے کہ انہوں نے ایسے ایسے اصول پیش کئے جن سے بے انتہا میدانِ کام نکلے۔ بطور پرہم حکیم فیثاغورث کا ریاضی کے متعلق دریافت کردہ خاص اصول پیش کرتے ہیں کہ "مثلث قائم الزاویہ میں دو اضلاع کے مربعوں کا مجموعہ وتر کے مربع کے برابر ہوتا ہے" یا اس کے برخلاف دتر اور ایک ضلع کے مربعوں کا فرق دوسرے ضلع کے مربع کے برابر ہوتا ہے۔

فرض کرو ایک تنکوں کے دو ضلع a و b ہیں اور وتر c ہے۔ پس $a^2 + b^2 = c^2$ ۔ (ج)۔

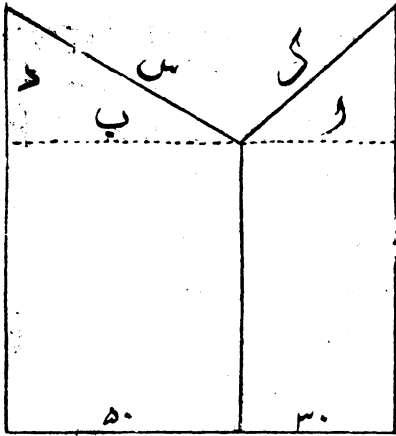
چونکہ دو اعداد کے مربعوں کا فرق ان اعداد کے مجموعہ و فرق کے حاصل ضرب کے برابر ہوتا ہے۔ پس

$c^2 - a^2 = (c + a)(c - a)$

ایک ایسا مفید اور کارآمد اصول ہے کہ اسکی مدد سے ہم بیسیوں مشکل مشکل سوالات آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔ ریاضی کی جملہ شاخوں جیومیٹری - حساب - الجبر میں اس کا استعمال بے انتہا مشکلات کو حل کرتا ہے ہم اس کے ثبوت میں ریاضی کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

مثال نمبر ۱ - دو برابر بانس ایک دوسرے سے 80 فٹ کے فاصلہ پر گاڑ کر ان پر 100 فٹ لمبا رستا باندھ کر ایک بازگیر نشانہ کرنے اس پر چڑھا۔ اتفاق سے رستا ایسی جگہ سے ٹوٹا کہ بازیگر ایک بانس سے 30 فٹ کے فاصلہ پر زمین پر گرا۔ بتاؤ رستا کہاں سے ٹوٹا۔

یہ سوال اسی اصول کی بنا پر حل کیا جاسکتا ہے۔ شکل سے ظاہر ہے کہ رستے کے چمکاؤ سے دو



قائم الزاویہ ٹکونیں پیدا ہو گئی ہیں جن کے ج و د ضلع باہم برابر ہیں چونکہ دائیں طرف کی ٹکون میں ک = ج + ا اور بائیں ج طرف کی ٹکون میں س = د + ب ایس س ک = (د + ب) - (ج + ا)

اور چونکہ د و ج آپس میں برابر ہیں پس س ک = ب - ا

$$= (۵۰) - (۳۰) = (۳۰) = (۳۰ + ۵۰) (۳۰ - ۵۰) = ۲۰ \times ۸۰ = ۱۶۰۰$$
 مربع فٹ۔

اور چونکہ س ک = (س + ک) (س - ک) = ۱۶۰۰ مربع فٹ۔

اور (س + ک) = ۱۰۰ فٹ

پس (س - ک) = $\frac{۱۶۰۰}{۱۰۰} = ۱۶$ فٹ۔

پس س یعنی رستے کے لیے ٹکڑے کا طول = $\frac{۱۶ + ۱۰۰}{۲} = ۵۸$ فٹ

اور ک یعنی رستے کے چھوٹے ٹکڑے کا طول = $\frac{۱۶ - ۱۰۰}{۲} = ۴۲$ فٹ۔

مثال ۲۔ ایک درخت ۹۰ گز بلند تھا جو ا کے زمرے سے کہیں بھیج میں سے ٹوٹ کر اس طرح گر گیا کہ اس کا سر اس کی جڑ سے ۳۰ گز کے فاصلہ پر زمین سے جا لگا۔ بناؤ درخت کتنی بلندی سے ٹوٹا؟

حل۔ شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ ا ب درخت مقام ج سے ٹوٹ کر اس طرح زمین پر جا لگا۔ کہ

ا ج د ایک قائم الزاویہ ٹکون پیدا ہو گئی جس کا ج د وتر = ج ب

چونکہ (ج د) = (ج و ا) = (د و ا) = (۳۰) = ۹۰۰ مربع گز

اور (ج د ا) = (ج و ا) (ج د و ا) = (ج د - ج و ا)

اور (ج د و ج و ا) = ۹۰ گز

پس (ج د - ج و ا) = $\frac{۹۰}{۲} = ۴۵$ گز

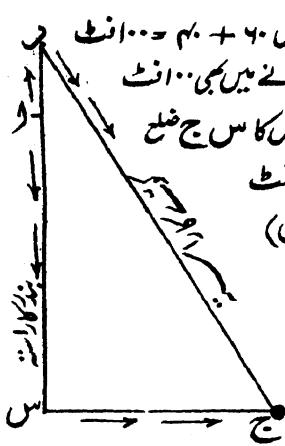
پس ج و ا کا طول = $\frac{۹۰ - ۴۵}{۲} = ۲۲$ گز

پس درخت ۲۲ گز کی بلندی سے ٹوٹا۔

مثال ۳۔ ایک مینار ۶۰ فٹ بلند ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک بندر اور ایک کوئی بیٹھے تھے۔ مینار کی جڑ سے ۴۰

فٹ کے فاصلہ پر ایک روٹی کا گڑ اڑا تھا۔ بندر تو مینار سے نیچے اتر کر اس ٹکڑے تک پہنچا لیکن کوئی بیٹھا اور

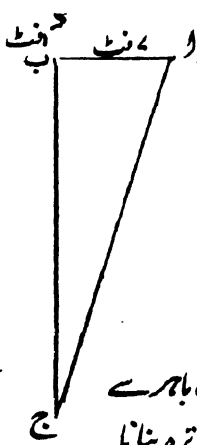
کو کچھ فاصلہ اڑ کر پھر وتری رستے ٹکڑے تک پہنچا معلوم ہوا کہ بندر اور ٹکڑے کو یکساں فاصلہ طے کرنا پڑا۔ بتاؤ کتنا سیاحا اوپر کو اڑا؟



حل۔ شکل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بندر روٹی کے ٹکڑے تک پہنچنے میں ۶۰ + ۱۰۰ = ۱۶۰ فٹ فاصلہ طے کرنا پڑا۔ اور ٹکڑے کو او سے ب تک جا کر پھر ج تک آنے میں بھی ۱۰۰ فٹ ہی طے کرنا پڑے۔ اس طرح جو ب ج سے ج س مثلث پیدا ہو گئی۔ اس کا س ج ضلع ۶۰ فٹ ہے۔ اور س ب اور ب ج کا مجموعہ ۶۰ + ۱۰۰ = ۱۶۰ فٹ چونکہ (س ج) = (ب ج) ہیں لہذا (ب ج + ب س) = (ب ج - ب س) = (۶۰) = ۱۶۰ مربع فٹ

اور (ج ب + ب س) = ۶۰ فٹ
پس (ج ب - ب س) = $\frac{160}{140} = 1.14$ فٹ
پس ب س = $\frac{140 - 60}{2} = 40$ فٹ
پس ب ج = $40 + 60 = 100$ فٹ
پس کو ۱۵۰ فٹ اونچا اڑا۔

مثال ۴۔ ایک کنول کا پھول پانی کی تہ سے ۱۵ فٹ اونچا تھا۔ ہوا کے نور سے جھکتا ہوا ۷ فٹ کے فاصلہ پر پانی کی سطح سے جا لگا۔ تو پانی کی گہرائی معلوم کرو۔



حل۔ کنول کی ڈنڈی وپانی کی گہرائی اور پانی کی سطح سے ایک قائم الزاویہ مثلث

ا ب ج پیدا ہو گئی ہے جیسا کہ شکل سے ظاہر ہے۔

چونکہ ا ج = ج د اور ا ج - ج ب = ۱۵ فٹ

نیز (ا ج) = (ج ب) = (ا ج + ج ب) = (۱۵ + ۷) = ۲۲ فٹ

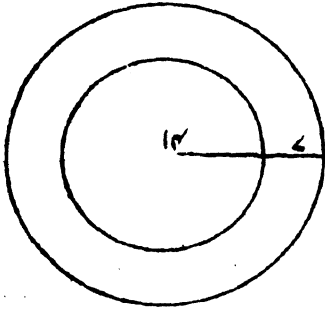
پس (ا ج + ج ب) = ۲۲ = ۲۹ فٹ

پس ج ب = $\frac{29 - 22}{2} = 3.5$ فٹ

پس پانی کی گہرائی = ۳.۵ فٹ۔

مثال ۵۔ ایک گول زمین کے ٹکڑے کا نصف قطر ۴۴ فٹ ہے۔ اس کے گرد ب طرف باہر سے

۷ فٹ چرخی زمین کھود کر اس کی مٹی اندر کے ٹکڑے پر ڈال کر اس پر ۵ فٹ اونچا چبوترہ بنانا چاہتے ہیں۔ بتاؤ باہر کی زمین کو کتنا گہرا کھودنا چاہیے؟ نیز اس کی سطح چبوترہ کی سطح سے کتنی نیچی ہو جائیگی؟



اس سوال کے حل کرنے کا عام قاعدہ حسب ذیل ہے۔

اندکے ٹکڑے کا نصف قطر = ۱۴ فٹ

$$۱۴ \times ۱۴ \times \frac{۲۲}{۷} = ۶۱۶ \text{ مربع فٹ}$$

باہر کی زمین بلا کر کل گول ٹکڑے کا نصف قطر = ۷ + ۱۴ = ۲۱ فٹ

$$۲۱ \times ۲۱ \times \frac{۲۲}{۷} = ۱۳۸۶ \text{ مربع فٹ}$$

$$۱۳۸۶ - ۶۱۶ = ۷۷۰ = \text{مربع فٹ}$$

چونکہ اندر کی زمین ۵ فٹ اونچی بنانا چاہتے ہیں۔ پس اندر کی زمین کی جسامت = ۵ × ۶۱۶ = ۳۰۸۰ مکعب فٹ
چونکہ باہر کی زمین سے اتنی ہی مٹی نکالنی منظور ہے۔ یعنی اندر ڈالنی چاہتے ہیں۔ پس باہر کی زمین سے جو مٹی
اُٹھانی جائیگی اس کی جسامت بھی وہی ہوگی جو اندر کی زمین کی ہوئی ہے۔

پس اس کی جسامت = ۳۰۸۰ مکعب فٹ

$$۳۰۸۰ \div ۷۷۰ = ۴ = \text{فٹ}$$

پس بیرونی زمین کو ۴ فٹ گہرا کھودنا چاہیے۔

لہذا اندرونی و بیرونی زمین کی سطح کی بلندی میں فرق = ۴ + ۵ = ۹ فٹ۔

اصول ذریعہ بحث کی مدد سے یہ سوال آسانی سے زیادتی حل ہو سکتا ہے۔ جس کا قاعدہ مندرجہ ذیل ہے:-

اندرونی کل زمین کے نصف قطروں میں نسبت = ۲۱ : ۱۴ فٹ

اندرونی و بیرونی زمین کے رقبوں میں نسبت = (۱۴) : (۲۱) - (۱۴)

$$= (۱۴) : (۱۴ + ۲۱) - (۲۱)$$

$$= (۷ \times ۲) : (۱۴)$$

$$۱۹۶ : ۲۴۵ =$$

$$۴ : ۵ =$$

چونکہ رقبوں میں ۴ : ۵ ہے پس بلندی اور گہرائی میں اس سے اعلیٰ نسبت یعنی ۵ : ۴ ہوگی۔

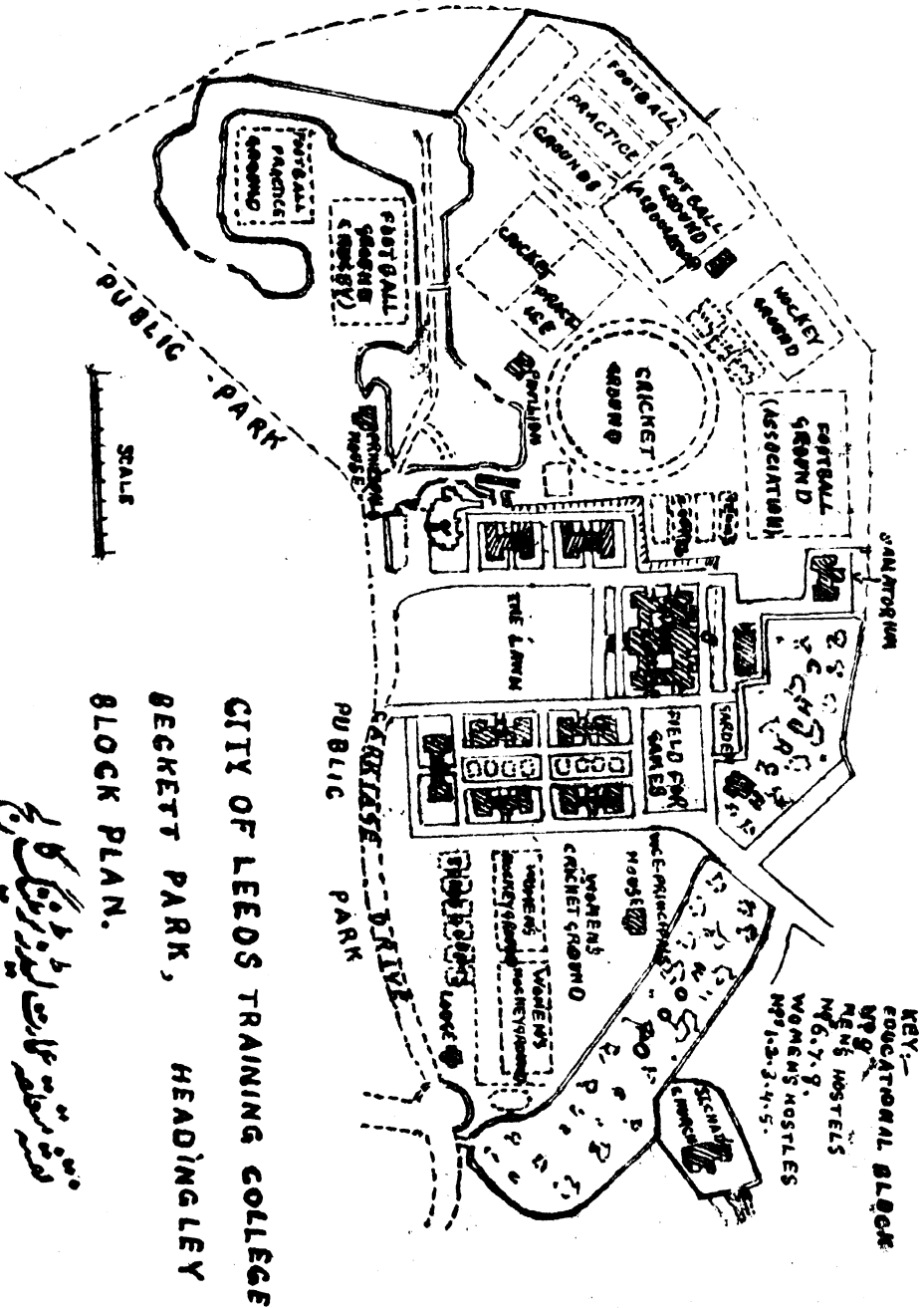
پس اندر کی زمین کو ۵ فٹ اونچا کرنے کے لئے باہر کی زمین کو ۴ فٹ کھودنا پڑے گا۔

پس دونوں سطحوں کی بلندی میں فرق = ۴ + ۵ = ۹ فٹ۔

اب مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سوال کے حل کرنے میں اتنی ہی لمبی لمبی رتوات حاصل ہوتی تھیں۔ کہیں کا

اساتذہ کرام! یہ مسئلہ تعلیمات میں حل کرنے کی ایک آسان سی مثال ہے۔ جس کا حل ہم نے آسانی سے دیا ہے۔

فہرست مضامین و موضوعات



تعلیمی رپورٹ

پنجاب کا رقبہ ۹۹۸۶۶ مربع میل ہے۔ آبادی ۲۰۶۸۵۰۲۳ ہے جن میں سے ۱۱۳۰۶۲۶۵ آدمی اور

۹۳۸۷۵۹ عورتیں ہیں یعنی آبادی فی مربع میل ۲۰۷ ہے۔

۱۹۲۹ء میں ۹۷۷ فیصدی مرد اور ۵۳ فیصدی عورتیں تعلیم پاتی تھیں۔ لیکن ۱۹۳۸ء میں عورتیں

۱۶۷ ہو گئیں۔ اور مردوں کی تعداد گھٹ کر ۴۹ رہ گئی۔ جہاں پہلے سال کل ۶۰ فیصدی طلباء تعلیم پاتے تھے وہاں اب ۵۹ فیصدی طلباء رہ گئے۔ تعداد طلباء کا خیال کیا جائے۔ تو لڑکیاں ۱۹۲۹ء میں ۹۳۹۱ پڑھتی تھیں اور لڑکے ۱۲۳۸۱۳۱ پڑھتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جہاں لڑکیوں کی تعداد ۲۰۳۲۱۰ ہو گئی یعنی ۳۱ کی بیشی ہوئی۔ وہاں لڑکوں کی تعداد ۷۹۷۱۲۲ رہ گئی۔ یعنی ۳۶۲ کی کمی ہوئی۔ یہ کمی حلقہ دار اس طرح ہے۔

انبالہ ڈویژن ۲۶۶۲۳ کی کمی جالندھر ڈویژن ۱۰۱۶ کی بیشی لاہور ڈویژن ۹۲۶۳ کی کمی

راولپنڈی ڈویژن ۴۰۶ کی کمی ملتان ڈویژن ۳۶ کی کمی

یعنی انبالہ ڈویژن میں سب سے زیادہ کمی ہوئی۔ اس کے برعکس جالندھر ڈویژن میں تعداد بڑھ گئی۔ اسی وجہ سے فیصدی طلباء کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔ نہ صرف طلباء کی تعداد میں کمی ہے۔ بلکہ درسگاہوں کی تعداد میں بھی کمی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں لڑکیوں کی درسگاہیں ۴۰۱ اور لڑکوں کی درسگاہیں ۵۰۴۲ تھیں۔ کل ۱۹۰۵۹ درسگاہیں تھیں۔ ۱۹۳۸ء میں لڑکیوں کی درسگاہیں ۴۱۸ ہو گئیں یعنی ۱۰۱ زیادہ ہوئیں اور لڑکوں کی درسگاہیں ۱۳۹۸۱ رہ گئیں یعنی ۱۰۶۱ کی کمی ہوئی۔ کل درسگاہیں ۱۸۰۹۹ رہ گئیں یعنی کل کمی ۹۶۰ کی ہوئی۔ پنجاب میں ۵۱۵ مربع میل پر محاسب اوسط ایک درسگاہ ہے۔ شہر میں ایک مربع میل میں کئی کئی درسگاہیں ہیں۔ لیکن گاؤں میں درسگاہیں دور دور ہیں۔

جہاں درسگاہوں اور طلباء کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔ وہاں خرچ میں پچھلے سال کی نسبت ۱۲۸۰ء کی بیشی ہوئی۔ کل خرچ ۳۰۲۱۰۵۵۵ روپے ہوا۔ اس میں ۵۵۹۵۵ فیصدی گورنمنٹ نے ۱۲۵۹۳ فیصدی پبلک کیٹی ڈسٹرکٹ بورڈ نے خرچ کیا ۲۰۴ فیصدی فیس سے حاصل ہوا۔ اور ۱۱۶۸۰ فیصدی دیگر ذرائع سے حاصل ہوا۔

لوگ اس بات کو بڑھ کر متعجب ہو گئے۔ کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ طلباء اور مدرسوں کی تعداد میں کمی ہو گئی۔ اور خرچ بڑھ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجاب میں بہت سے لڑکے، لڑکیاں تھے جو پہلے ناممکول تھے۔

لیکن طلباء میں نہ آتے تھے۔ یہ سکول بند کر دیئے گئے۔ اس کے علاوہ موجودہ وزیر تعلیم صاحب نے طلباء کی تعداد ٹھیک ٹھیک ظاہر کرنے پر خاص طور پر توجہ دی۔ تعلیم کی بہتری کی طرف توجہ دی گئی۔ نئے واقع طلباء کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ بیشی ہوئی ہے۔ اگر والدین کو کافی طور پر سمجھایا جائے۔ پبلیک سیکولز وک کافی مقدار میں کیا جائے۔ تو تعداد میں بہت اضافہ ہو سکتا ہے۔

دیگر اطراف میں ترقی اگرچہ بظاہر تعداد طلباء میں کمی واقع ہوئی ہے۔ لیکن اگر دیگر جانب نظر دوڑائی جائے۔ تو معلوم ہو گا کہ بہت کچھ قابل قدر ترقی ہوئی ہے۔ لوئر مڈل سکولز کافی تعداد میں بڑھا دیئے گئے۔ اعداد حسب ذیل ہیں۔

لوئر مڈل	اپر مڈل	میزان	لوئر مڈل	اپر مڈل	میزان
۱۹۲۶ء	۱۳۴۲	۳۹۱	۱۴۳۳	۲۴۴	۶۵۶
۱۹۲۷ء	۱۶۵۸	۴۵۶	۲۱۱۳	۲۷۰	۷۰۸
۱۹۲۸ء	۱۹۸۹	۵۲۹	۲۵۱۸	۲۹۹	۸۸۷
۱۹۲۹ء	۲۲۲۱	۵۹۵	۲۸۱۶	۳۲۳	۱۲۰۶

یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ پرائمری کلاس کے طلباء کی تعداد مڈل سکولز اور لوئر مڈل سکولز میں ۳۸۳۳۳۰ ہے۔ محض پرائمری سکولوں میں ۳۵۹۸۴۴ پڑھتے ہیں۔ گویا ۵۰ فیصدی سے زیادہ طلباء پرائمری کے ایسے سکولوں میں تعلیم پاتے ہیں جہاں قابل اور تربیت یافتہ مدرسین تعلیم دیتے ہیں۔

طلباء کی تعداد میں اصلاح بہت پرائمری سکولوں کو لوئر مڈل سکولوں میں تبدیل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں پہلے چوتھی جماعت میں کم طلباء جاتے تھے اب پرائمری کی اعلیٰ جماعتوں میں طلباء کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

ایک مدرس والے سکولوں میں کمی یہ ظاہر ہے کہ ایک مدرس چار جماعتوں کی نگہداشت اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ نہ طلباء کی تعلیم میں پوری دلچسپی لے سکتا ہے۔ اس لئے اس سال اس طرف خاص توجہ دی گئی کہ ایک مدرس والے سکولوں کی تعداد میں کمی کی جائے اس طرف روپیہ کی کمی کی وجہ سے کافی توجہ نہ دی جاسکی۔ کیونکہ یہ امداد سال کے آخر میں دی گئی ایک مدرس والے سکول ابھی تک پنجاب میں ۱۶۴۲ اور میں۔ کل مدرسین کی تعداد ۳۵۶۵۷ ہے جس میں سے ۲۳۸۶۱ تربیت یافتہ ہیں یعنی ۶۷ فیصدی پچھلے سال صرف ۶۲ فیصدی تربیت یافتہ مدرسین تھے۔ سکولوں میں کل طلباء کی تعداد ۱۰۳۶۱۸۶۷ ہے۔ جو پرائمری مڈل و مائی سکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ یعنی بحساب اوسطاً ۲۹ طلباء پڑھتے ہیں۔

برانچ سکول { اس سال جہاں ایک مدرسہ والے پرائمری سکولوں کو کم کیا گیا۔ وہاں دوسری جماعت تک کے ایک مدرسہ والے برانچ سکول کھولے گئے۔ یہ سکول مڈل سکولوں کے ماتحت ہیڈ ماسٹر مڈل سکول کی مناسب نگرانی کے باعث بخوبی چلے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دیہات کے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے بچوں کے سکول بھیجنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔

ابجد خوانوں کے لئے موڈل سکول { ڈسک اور دیگر مقامات پر ایسے سکول چھوٹے بچوں کے لئے بطور نمونہ کھولے گئے۔ جہاں بچوں کو بہتر طریق پر تعلیم دی جائے۔ کیونکہ بچوں کی تعلیمی ترقی پر ہی آئندہ کی ترقی منحصر ہے۔ اور اسی طرف اصلاح کی کافی ضرورت ہے۔

لازمی تعلیم میں اضافہ { باوجودیکہ تعداد طلباء میں کمی ہوئی۔ مالی لحاظ سے بھی حالت بہتر نہ تھی۔ لیکن پھر لازمی تعلیم میں اضافہ ہوا جہاں لازمی تعلیم جاری کی گئی۔ ۴۲ رقبہ میونسپل کمیٹی اور ۲۰۰۰ دیہاتوں میں لازمی تعلیم جاری ہے۔

کھیل کود اور جسمانی ورزش { پہلے کھیل کود اور ورزش جسمانی کا انتظام ڈرل ماسٹروں کے سپرد تھا۔ جو تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باعث جسمانی تربیت کی علت غائی اس کا صحت جسمانی سے تعلق قومی ترقی میں کھیلوں کا درجہ وغیرہ اصولوں کو نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے یہ بہتر سمجھا گیا کہ طلباء کی جسمانی تربیت کا انتظام بھی تعلیم یافتہ اصحاب کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ مسٹر بیچ ڈبلیو ہاگ کی زیر نگرانی بہت گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ پنی۔ ٹی کی تربیت حاصل کر کے نکلے ہیں جنہوں نے صوبہ کے سکولوں میں کھیل۔ ورزش اور سکاؤٹنگ میں نئی زندگی پھونک دی ہے۔ اور ریفریوٹر کورس قائم کر کے دیہاتی بچوں کو کافی تربیت اس بارے میں دی گئی ہے۔

سکاؤٹنگ { سکاؤٹنگ کی تربیت کا عملی پہلو یہ ہے کہ سکاؤٹس نے میلے تہواروں پر انتظام کرنے۔ آگ بجھانے۔ پلیریا کے دنوں میں ادویات تقسیم کرنے میں کافی مدد دی ہے جو سکاؤٹس ہینڈل سے انگلینڈ کی جمہوری میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں کی پبلک پراجھا اثر ڈالا۔

ریڈ کراس سوسائٹی اور کمیونٹی کونسل { نارل سکولوں اور دیگر سکولوں میں ریڈ کراس سوسائٹی کھلی ہوئی ہیں جو طلباء کے ذریعہ بیماروں کی مدد کرتی ہیں اور لوگوں میں صحت کے اصولوں پر لکچر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ کمیونٹی کونسل اور رورل کمیونٹی بورڈ قائم ہیں جو طلباء کی مدد سے گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں اشاعتی کام کرتی ہیں اور جلوس نکالتی ہیں جس کا اثر پبلک ہیلتھ پراجھا پڑتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم ۱۹۲۹ء میں ۱۳۶۹۵ طلباء انٹرنس میں شامل ہوئے۔ اور ۱۸/۶۲ فیصدی طلباء کامیاب ہوئے۔ اعداد کا مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۲ء سے طلباء کی تعداد میں اضافہ نہ ہوا۔ پچھلے سال ۱۳۷۰۷ طلباء امتحان میں شامل ہوئے تھے۔ ایف۔ اے میں ۱۹۲۹ء میں ۳۳۳۸ طلباء امتحان میں شامل ہوئے۔ اور ۶۲/۸۸ فیصدی کامیاب ہوئے۔ بی۔ اے میں ۱۷۱۳ طلباء شامل امتحان ہوئے۔ اور ۵۱/۵۱ فیصدی کامیاب ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ والدین کا کثیر روپیہ اعلیٰ تعلیم پر ضائع جارہا ہے۔ تعداد طلباء میں بھی پچھلے چار پانچ سال سے کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام طلباء کا رجحان لٹریچر کی تعلیم کی طرف نہیں ہوتا لیکن سب کو اعلیٰ تعلیم پلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جن طلباء کا رجحان دستکاری اور زراعت کی طرف ہے۔ ان کو اسی قسم کی تعلیم دی جائے۔ اور لٹریچر کی تعلیم صرف ان طلباء کو دی جائے جنہیں اس تعلیم کا شوق ہے تاکہ والدین کا روپیہ اور طلباء کا وقت ضائع نہ ہو۔

کالجیٹ سکولز اس خیال سے کہ دیہات و قصبات کے طلباء کو گھر کے قریب اعلیٰ تعلیم مل سکے۔ انٹرنس کالجیٹ سکولز کی نو سو سو جماعتوں کے ساتھ فٹ ایر اور سیکنڈ ایئر کلاس جاری کی گئیں۔ پنجاب میں ایسے دس کالج ہیں۔ لیکن ان کالجوں نے کافی کشش پیدا نہیں کی۔ اور طلباء کی کثیر تعداد مرکزی درس گاہوں میں ہی داخل ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آہستہ آہستہ یہ کالج کشش کا باعث بن جائیں گے۔

اعلیٰ درس گاہیں شہر لاہور میں گورنمنٹ کالج۔ فورمن کالج۔ ڈی اے دی کالج۔ سنان دھرم کالج۔ دیال سنگھ کالج اور اسلامیہ کالج کافی رونق پر ہیں۔ ان میں طلباء کی تعداد میں کافی ترقی ہو رہی ہے۔ پچھلے سال مسٹر جے۔ آرفر تھ کے گورنمنٹ کالج سے اور ڈاکٹر رائس کے فورمن کالج سے لاہور چلے جانے کی وجہ سے بڑا نقصان ہوا۔ اس سال پنڈت رگھو دیال صاحب شاستری کی بے وقت موت سے سنان دھرم کالج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پوسٹ گریجویٹ کلاس کے طلباء کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

یونیورسٹی کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی نے تحقیقات کے محکمہ میں کافی کام کیا ہے۔ ۱۸ سو دے طلباء کئے گئے۔ یونیورسٹی کی تعلیم جن میں سے ۱۱ شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی شہرت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی ہے۔ یونیورسٹی کی طرف سے کئی طلباء یونیورسٹی کے خرچ پر بیرونی ممالک میں تحقیقات کا کام کر رہے ہیں۔

مدرسین کی قابلیت میں اصلاح پچھلے سال مدرسین کی قابلیت میں کافی اصلاح ہوئی ہے۔ اب تربیت یافتہ مدرسین کی تعداد پنجاب میں ۷۰ فیصدی سے ۵۰ فیصدی

ہو گئی ہے۔ یہ تعداد دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں بھی حوصلہ افزا ہے۔ لیکن جب تک مدرس ٹریننگ کالج و نارل سکولوں سے حاصل کردہ تربیت کو پورے طور پر تعلیم میں استعمال نہ کریں۔ اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔

وسیع خیالی پچھلے سالوں کے مقابلہ میں اب سکولوں میں نئی نئی تحریکیں جاری کی گئی ہیں۔ مثلاً ریڈنگ اس سوسائٹی۔ سکاؤٹنگ۔ دیہات سدھارکیم یہ ایسے امور ہیں جن سے طلباء اپنی ذات کو دوسروں کی خدمت میں لگانے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے طلباء کے دل و دماغ وسیع ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے طلباء کو زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔

لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم لڑکیوں اور لڑکیوں کی تعلیمی توسیع کے لئے جذباتی اختیار کئے گئے۔ ان کے خاطر خواہ نتائج نکل رہے ہیں۔ اعداد سے ظاہر ہے کہ درگاہوں اور طلباء کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ اعلیٰ جماعتوں میں لڑکیاں کافی تعداد میں داخل ہونے لگی ہیں۔ کینیا رڈ ہائی سکول لاہور نے عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں کافی کام کیا ہے۔ اس سال مختلف مقامات پر لڑکیوں کے ہائی سکول کھولے گئے ہیں۔ ان سکولوں میں طلباء کی تعداد میں خاص اضافہ ہوا ہے۔ یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ سکولوں کو وسعت دی جائے تاکہ طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو۔ ایڈمیسیٹنگ کالج نے مس اسی مسٹ صاحبہ کی رہنمائی میں کافی کام کیا ہے۔ وکٹوریہ سکول میں مس بوس صاحبہ نے طلباء کی تعلیمی ترقی میں بیش بہا خدمات سر انجام دی ہیں۔ وہ ماہ جولائی میں ریٹائر ہو گئیں۔ طلباء کی ٹریننگ کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔ ایڈمیسیٹنگ کالج کے ساتھ زنانہ جے اے وی اور ایس وی کلاسیں کھولی گئی ہیں۔ جگہ جگہ اضلاع میں مڈل سکولوں اور ہائی سکولوں کے ساتھ جے وی کی ٹریننگ کلاسیں کھول دی گئی ہیں۔ اس بارے میں مس سٹریڈ فورڈ نے کافی کام کیا ہے۔

خاص تعلیم و دستکاری کی تعلیم امیدوار پیشے کے سکولوں اور دستکاری سکولوں کے لئے کافی خاص تعلیم و دستکاری کی تعلیم در خواستیں دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ طلباء کا رجحان ادھر کافی ہوتا جاتا ہے۔

وزیکلر مڈل سکولوں میں زراعتی تعلیم پچھلے سال ایک کمیٹی اس بارے میں مقرر کی گئی تھی جس نے دیگر تجاویز کے علاوہ بڑی تجویز یہ کی تھی کہ زراعت کی تعلیم دوسری تعلیم کے ساتھ ساتھ دی جائے تاکہ طلباء چنانچہ مڈل سکولوں میں زراعت جاری کر دی گئی ہے۔ جہاں ایسے مڈل سکولوں کی تعداد پچھلے سال ۲۸ تھی وہاں ۱۹۲۹ء میں ۱۳۴ ہو گئی۔ زراعت کے بارے میں لائے پھین داس جی بی اے نہایت توجہ سے کوشش کر رہے ہیں۔

یورپین کی تعلیم اگرچہ یورپین سکولز علیحدہ ہیں جن میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ مگر ان سکولوں میں ہندوستانی اور اینگلو انڈین بچے بھی تعلیم پاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن ان کے تعلقات یورپین بچوں کے ساتھ نہایت خوشگوار ہیں۔ ان میں اہم تبدیلی لگی گئی ہے۔ کہ حکمہ کا انٹرنس کا امتحان اڑاکر کیمبرج سکول سرٹیفکیٹ امتحان جاری کر دیا ہے۔ اس تبدیلی کو پسند کیا گیا ہے۔ اور طلباء دیگر یورپی امتحانات کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیم یہ امر تسلی بخش ہے کہ اگرچہ اس سال طلباء کی تعداد میں عام طور پر کمی واقع ہوئی ہے۔ لیکن مسلمان طلباء کی تعداد میں ۵۲۲۸ کی بیشی سیکنڈری جماعتوں میں ہوئی ہے۔ ساتھ ہی کالج اور ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز میں مسلمان طلباء کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

اچھوتوں کی تعلیم اچھوت طلباء کی تعلیمی ترقی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ایک خاص افسر اس فرقہ کی تعلیمی طرف سے اس کے متعلق رزولوشن شائع ہوئے ہیں۔ ان رزولوشنز اور رپورٹ پر اگلے سال ۱۹۷۱ء سے عملدرآمد ہوگا۔ لوگوں کے دلوں سے ان کے برخلاف تعصبات کم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ بجائے خاص مدرسے میں داخل ہونے عام سکولوں میں ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اعلیٰ جماعتوں میں ان کی تعداد ابھی بالکل تھوڑی ہے۔ لیکن جب سماج و سرپرست عمل درآمد ہوگا۔ تو یہ کمی بھی دور ہو جائیگی۔

جرائم پیشہ فرقے کی تعلیم جرائم پیشہ فرقہ کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ طلباء میں کھیلوں اور جرم پیشہ فرقے کی تعلیم کی دیگر صحت افزا امور کی طرف شوق پیدا کیا گیا ہے۔

غرضیکہ تعلیم کے ہر شعبہ میں ترقی کی گئی ہے۔ اگر لوگوں نے ادھر توجہ دی تو تعلیم کا پودا پنجاب میں نہایت حوصلہ افزا نتائج پیدا کریگا۔

(بہاری لال پتھر نرمل سکول حصار)



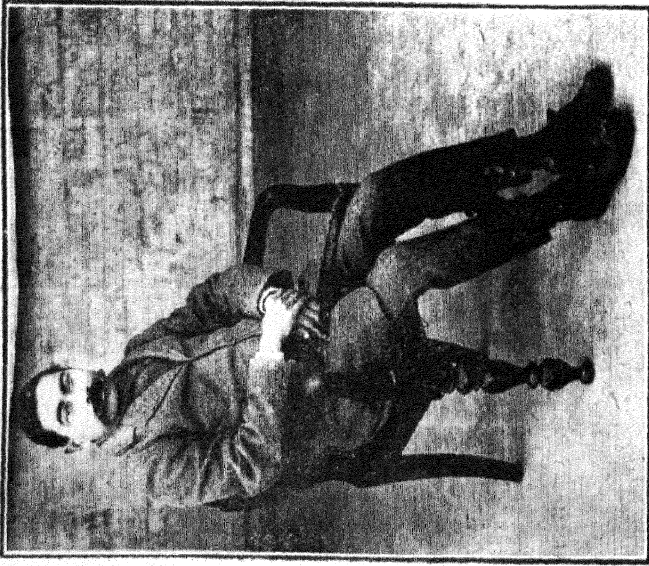


محمد زاهد

پند

پست لای

827 N 1146



منشی یزدان چنگ ماهی نو اس



شیخ خادیم مصی الہ نقوی صاحب ایم ای
پی (ایڈز) پی اے پی پی (ایڈیٹور)



لااد تلپور چیف صاحب مہموم پی اے
تاریخ تصویب 1915
آبر تاریم مہم افش 1885

درفضیلت علم

تفہیم اشعار حضرت میر خیر نواز داہوی

(انجناب ملک بہ صاحب نام ہیں)

علم سے روشن دل و جان و دماغ علم مٹاتا ہے جہالت کے داغ
سخوف اس سے نہ ہوا ہے نہ باغ علم ہے تیرے لئے روشن چراغ

آئینہ چرخ غمیش نباشد براہ

در شب تاریک در رفت رہ پاد

علم کی امداد سے اے باشعور چاہئے افزائش نور و نور

حیف کی بجائے کہ زرا و فستور علم جو پیہ را یہ کبر و غرور

شمع شب افزو ز می کا شاد آفت

نہ از پے آتش زدن نماند آفت

نور میں انوارِ سحر سے سوا بلوہ خورشید و قمر سے سوا

علم ہے سو گنج گہر سے سوا قیمتی ہے حدن زر سے سوا

امرد کہ از علم تو نگر بود

کے نظرش بر گھر و زر بود

علم کے عالم میں ہے جس کا گذر دولت جاوید سے ہے ہمہ ور

ہاتھ ہیں اس کے نہیں گویا مال و زر پھر بھی عزت وہ صاحبِ مہر

آئینہ بزدان ہر حالت گم است

بہت گدا اگرچہ زرش نہ خم است

منعم جاہل کا زر و مال کیس طلبِ علم دولت و اقبال کیس

بوم کو ہے ناز پر د بال کیس زیرِ جُل زر خیر بد فال کیس

گرچہ کشد گاو - جوال گمر

بار زیادت بودش بے ہنر

علم نہیں حیلہ و فن کے لئے اور نہ آرائش تن کے لئے

بلکہ ہے اعمالِ حق کے لئے خدمتِ اہلئے زمن کے لئے

”آنکہ بتعلیم دل افروزد

نہ از پئے دوزخ سبق آموزد

پڑھ کے بہت علم جو خود بین ہوا چھوڑ کے گوہر وہ صدف چیں ہوا

دشمنِ عقل و خسرو دیں ہوا صورتِ ابلیس کج آئیں ہوا

”سبق ادب کر پئے خود بینی است

مطلع دیباچہ بے دینی است

”بدم جاں جس نے کیا علم کو واقف اسرارِ حقیقت ہے جو

علم کا پیکر ہے وہ دوزخ و خود خوئے مجبر کی نہیں اس میں بو

”فائدہ علم تبیں است خاص

کت دھند از پاہ مجبر خلاص

راہ بر راہ عمل گر نہیں علمِ جاہالت سے وہ بہت نہیں

نخل بے لیکن وہ شہر و نہیں ہے مثل تصویر، گل تر نہیں

در علم کز اعمال نشانیش نیست

کالبہے دارد و جانیش نیست

علم کہ ہے بدرقہ بے بدل درو دشوار گزارِ عمل

بے حرکت ہو وہ اگر مثلِ شل کارِ جہاں میں نہ ہو کیونکر خلل

”عالم بے کار نیا بد برے

گرچہ بصد جیلہ بر آرد سرے

طریقہ تعلیم کی ترقی

فن تقریر کی ابتدا پہلے پہل جب انسان عالم وجود میں آیا۔ تو اُس نے قدرت کا مشاہدہ کیا۔ اشیاء کو چلتے دیکھا۔ اُس کی آواز کو مرسوسے تعبیر کیا۔ اور اُس کا نام مرسوسے کے نام رکھے۔ مثلاً سانپ طرح جانوروں پرندوں کی آوازوں کے نام رکھے۔ اشیاء کے نام رکھے۔ اس طرح زبان بن گئی۔ اور الفاظ کے ذریعہ اپنے خیالات ایک دوسرے پر زبانی ظاہر کرنے لگے۔ مثلاً بعد نسل زبان بذریعہ بول چال سیکھتے رہے۔ آب و ہوا۔ مقام کی علیحدگی کی وجہ سے لوگوں کی زبان مختلف ہے۔ پہاڑیوں کی زبان کالب و لچہ اس قسم کلبے گویا دریا چل رہا ہے۔ اس میں پتھر بہتے جا رہے ہیں۔ اور شور و غل پیدا کر رہے ہیں۔ یہ نظارے پہاڑوں پر اکثر ملتے ہیں۔

فن تحریر کی ابتدا جب زبان بن چکی۔ تو تحریر کے ذریعہ اپنے خیالات دوسرے پر ظاہر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ پہلا خیال، قدرتا یہ تھا کہ جب کسی چیز کو خیال دلانا ہو تو اُس کی تصویر بنا کر بھیج دی۔ گلے کا خیال دلانا ہوا تو گلے کی تصویر بنا دی۔ اسی طرح تھا دوسرے کی مدد سے بات چیت ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ مختصر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ گلے کی بجائے صرف ہینگ کی تصویر بنا دی (۱) عربی میں گلے کو الف کہتے ہیں۔ اس نشان کا نام الف ہوا۔ اسی طرح گھر کو ایک چکر و شکل سے ظاہر کیا۔ اور آگے ایک نقطہ سے گھر کا چوکدار ظاہر کیا □ عربی میں گھر کو بیت کہتے ہیں اس کا نام بیت ہوا۔ بکڑ کو بے ہو گیا اور شکل (ب) یہ رہ گئی۔ اسی طرح اونٹ کو اونٹ کی گردن ح سے ظاہر کیا۔ اونٹ کو عربی میں جل کہتے ہیں۔ اس لئے (ج) اس صورت کا نام جیم رکھا۔ اس طرح مختلف عروف بن گئے۔

آوازوں کا تصور مختلف اشیاء کے مختلف نام تھے۔ اب خیال پیدا ہوا کہ ہر ایک شے کو الگ الگ نشان سے ظاہر کریں۔ تو بے شمار نشان ظاہر کرنے پڑینگے۔ جتنے زبان میں الفاظ ہیں۔ اتنے ہی نشانوں کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے سوچا گیا۔ کوئی ایسی تدبیر اختیار کر و کہ (۱) نشانیاں کم سے کم ہوں (۲) ان نشانوں کی مدد سے کل الفاظ ظاہر کئے جا سکیں۔

چنانچہ ام۔ رام۔ کسان۔ مال میں مشترک آواز م کا تصور ہوا۔ اس طرح کل مشترک آوازوں کو معلوم کیا۔

آپ - ہان - روپ میں پ کی آواز - اور - دوڑ - موت میں آ کی آواز مشترک ہے - اب ان آوازوں کا مشاہدہ کر کے دیکھا کہ م - پ وغیرہ الگ ظاہر نہیں ہو سکتے جب تک ان کے زیر زیر پیش و نحو کی آواز نہ لگائی جائے - لیکن آ - ا - ای - او وغیرہ آوازیں اکیلی الگ ظاہر کی جاسکتی ہیں - پہلی قسم کی آوازوں کا نام حروف صحیح رکھا - جو بذات خود بلا امداد زیر زیر وغیرہ آواز نہ دے سکیں - اور آ ا ا وغیرہ آوازوں کو جو بذات خود اپنی آواز دے سکتے ہیں - حروف علت کے نام سے پکارتے ہیں -

حروف کی ترتیب ہندی پنجابی بنگالی وغیرہ زبان والوں نے حروف علت و حروف صحیح کو الگ الگ علت جو تالو سے ادا ہوں - جیسے ا ای بعد میں وہ جو ہونٹ سے ادا ہوں - جیسے ا آ دوسرے وہ حروف صحیح کو اس طرح مترتب کیا کہ حلق والے آواز الگ مثلاً کھ وغیرہ تالو والے ج چھ وغیرہ الگ اس میں بھی اس بات کو مد نظر رکھا کہ حلق کے نیچے سے بولا جائے وہ پہلے - جو ذرا اوپر سے بولیں وہ بعد میں ک کھ گ گھ وغیرہ - تاکہ کھینے میں آسانی ہو - جن میں زبان کو گھمانا پڑتا ہے وہ بعد میں رکھے -

حروف کی نشانی کی خصوصیت حروف کو بغور مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض حروف اگر لام کی آواز ادا کی جائے تو زبان (ب) ایسی صورت اختیار کرتی ہے - چنانچہ اس کی شکلیں ل لہم میں ملتی ہیں سب میں زبان کے سر مونے کی شکل مشترک ہے - اسی طرح م مہم میں گھنڈی مشترک ہے - اور مذ سے ادا کرنے سے بھی ایسی شکل بنتی ہے - یہ بہت ممکن ہے کہ آوازوں کی شکلیں آواز ادا کر کے اور موند کی بناوٹ کا مشاہدہ کر کے بنائی گئی ہوں -

حروف کو ملانے کا طریق پھر حروف کو ملانے کا طریق جاری ہوا - ہندی والوں نے یہ قاعدہ رکھا کہ ت میں مل جائے - اسی طرح قاعدے بن گئے -

طریق تہجی اب یہ سوچا گیا کہ بجائے مختلف الفاظ پڑھا کر اتنا وقت خرچ کرنے کے یہ بہتر ہے کہ مختلف آوازوں کے نام بتائے جائیں - اور اعراب لگا کر ان کا ملانا سکھایا جائے - اس طرح حروف کے نام الف بے پے وغیرہ سکھائے گئے - پھر آ ا ا ب ب ب کے ذریعہ مختلف اعراب کی مدد سے ان کو ادا کرنا سکھایا گیا - اس طریق کا نام طریق تہجی رکھا گیا -

طریق البصوت حروف کے نام اور آواز الگ رکھنا وقت طلب تھا - اس لئے ہند والوں نے حروف

کے نام اُن کی آوازوں پر رکھے۔ اور اِن آوازوں کو ک کہ گ گھ وغیرہ کو سکھا کر حرف علت کی مدد سے انکی آوازوں سکھائی گئی۔ ک کا ک کی ک کو کے کے کو کو گ کہ وغیرہ اس طرح حروف کو ملا کر الفاظ بنانے سکھائے گئے ہیں طریق کا نام طریق الصوت رکھا گیا۔

طریق دیکھو بولو رہین و گو اوپر کے طریق سے سکھانے میں کئی دقتیں پیش آئیں۔ اول تو بچے اور کرتا۔ بڑا آدمی تو ان کی اہمیت سمجھ کر یاد کر لیتا ہے۔ دوسرے یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ کہ ک کہ کی مدد سے بچے کو مشترکہ آواز کا تصور ہو جائیگا جب تک یہ نشانی ایک ادک وغیرہ متعل نہ ہوں تب تک بچہ ک کے کچھ معنی نہیں سمجھتا تیسرے بچہ گھر میں کچھ بولتا تھا۔ سکول میں آتے ہی ۔۔۔۔۔ اس نے ایک ناگوار تبدیلی محسوس کی۔ نیز ماہرین فن طریق تعلیم نے بچے کو سکھانے کے لئے نئے اصول ایجاد کئے تھے۔ یہ طریقہ بالکل اُس کے برخلاف نظر آیا۔ نامعلوم بات سکھا کر معلوم کی طرف چلنا بالکل اصول کے خلاف تھا۔ اس نے ایسا طریق سوچا گیا۔ جو بچے کی فطرت کے مطابق ہو۔ یعنی بچے کو مقرون چیز آم دکھا کر اُس کا نام پوچھا جائے۔ پھر آم لکھ کر دکھایا جائے۔ اس طرح الفاظ کا پڑھنا لکھنا سکھایا جائے۔ جب بچے سوچا اس لفظ پڑھ لیں۔ تو ذریعہ تخیل آم رام شام سے مشترکہ آواز م کا تصور دلایا جائے۔ اس دن گن وغیرہ سے مشترکہ اعراب (زیر) کا تصور دلایا جائے۔ جب مشترکہ آواز م کا تصور ہو جائے۔ تو پھر اعراب کی مدد سے حروف کو ملا کر الفاظ بنانا سکھایا جائے۔ اس طرح بچہ جلدی اور آسانی سے پڑھنا سیکھتا ہے۔

طریق کہانی یا طریق سبک یہ محسوس کیا گیا۔ کہ بچہ کہانی کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے شروع میں بچہ کو آجائے۔ وہ پڑھنا جلدی سیکھتا ہے۔ اس لئے پہلے ایک دو ماہ بچوں کو کہانی سنانے۔ اور بات چیت کرنے میں صرف کئے۔ پھر کہانی کی مدد سے فقرے اور الفاظ سکھائے گئے۔ پھر الفاظ کی مشترکہ آواز اور کہانی کی مدد سے حرف کا تصور (اکر حروف سکھائے گئے۔ اور بعد میں اعراب و حروف کو ملا کر پڑھنا سکھایا گیا۔ یہ طریق سبک کہلایا۔ لکھنا پڑھنا ساتھ ساتھ سکھایا گیا تاکہ تصور گہرا ہو۔

پروجیکٹ میٹھ یہ مشاہدہ کیا گیا کہ بچہ عملی کام کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے بجائے زبانی کہانی سنانے کے عملی طور پر کہانی سمجھائی گئی۔ ایک لڑکے کو کوٹا بنا کر گھڑا رکھ اس میں کنکر ڈلو کر طلبہ کو کہانی کا تصور دلایا۔ پھر کہانی سنائی گئی۔ اس طرح عملی کام کی مدد سے پڑھنا سکھایا گیا جس سے بچے کو اور بھی دلچسپی ہوئی۔ طلبہ نے کھیل کو اپنا مقصد قرار دیا۔ اور اس مشا کو سامنے رکھ کر خوشی خوشی پڑھنا لکھنا سب کچھ

سیکھنا شروع کیا۔ اس طریق کا نام پروجیکٹ میتھڈ رکھا گیا۔

کنڈرگارٹن میتھڈ { فربول صاحب نے محسوس کیا کہ محض لکھنا پڑھنا تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ لکھنا پڑھنا تو بعد میں ہی آسکتا ہے۔ اصل تعلیم اور ہے۔ اور بچہ اس تعلیم کو خود بخود حاصل کرتا رہتا ہے۔ ایک اُن پڑھ بچے اور اُن پڑھ نوجوان کی معلومات میں فرق ہے۔ اس لئے یہ سوچا کہ چھوٹی عمر میں طلبا پڑھنے لکھنے سے کتراتے ہیں۔ اس لئے پڑھنا لکھنا مناسب وقت پر سکھایا جائے۔ شروع میں طلبا کی معلومات میں اس طرح اضافہ کیا جائے کہ وہ خوشی خوشی علم حاصل کریں۔ چنانچہ طلبا کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کیا۔ اور دیکھا بچے مٹی کی چیزیں بناتے ہیں۔ انہیں توڑتے پھوڑتے ہیں۔ اینٹیں کھڑی کر کے اُس کی عمارت بناتے ہیں۔ سرکندے اور تیلے کو جوڑ کر طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں۔ طلباء کلمے کو پسند کرتے ہیں۔ اساکرنے سے اُن کے ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہوتی ہے۔ اس لئے فربول صاحب نے تحفے اور مشغلے بنائے۔ مٹی کا غذا اور گتے کے ذریعہ طلبا قسم قسم کی اشیاء بناتے ہیں۔ تحفوں کی مدد سے جوڑ جوڑ کر نئی نئی اشیاء بناتے ہیں۔ اس طرح طلبا میں غور و خوض کرنے اور ایجاد کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اُن کے ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہوتی ہے۔ چنانچہ تین برس سے سات برس کی عمر کے بچے اسی قسم کے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ گاتے بھی جاتے ہیں۔ یہ نہایت دلچسپ بات تھی۔ ہمارے سکولوں میں جاری ہو کر بند ہو گئی ضرورت ہے کہ پھر سے جاری ہو۔

مونٹی سوڈی میتھڈ { صرف لکھنا پڑھنا تعلیم نہیں۔ بلکہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے حواس کی تربیت ضروری ہے جو اس علم کے اندر داخل ہونے کے لئے حواسوں کا تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس تعلیم کا ایسا طریق جاری کیا جائے۔ جس میں طلبا دلچسپی لیں اور جس سے حواس کی تربیت بخوبی ہو۔ مثلاً مختلف قد کی تیلیاں اور کعبے گولے رکھ کر نظریے اُن کا بڑا چھوٹا معلوم کرنا۔ دیاسلائی کے بکسوں میں مختلف اوزان رکھ کر ہاتھ سے اندازہ کرنا۔ مختلف رنگوں میں تیز۔ مختلف بوتلوں میں پانی بھر کر اس میں مختلف مقدار کی کھانڈ یا نمک ڈال کر کمی و بیشی میں تیز کرنا۔ آواز کی شناخت۔ نیز یہ معلوم کرنا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ کدھر سے آ رہی ہے کس قسم کی ہے۔ وغیرہ اسی طرح ناک آنکھ کان زبان ہاتھ جسے جس قسم کی تربیت کرنا۔ تعلیم کا بڑا ضروری حصہ ہے۔ مختلف طریق سے اشیاء کی شناخت مثلاً صوف کو سوگند کر دیکھ کر۔ چھوکر اور بر سے ڈال کر آواز کی مدد سے۔ اُس کا ذائقہ چکھ کر صوف کی شناخت کرنا۔ ناصٹک اندازہ کرنا وغیرہ غرضیکہ اس طرح مشق کرائی جائے کہ طلبا کے حواس کی تربیت ہوتی چلی جائے۔ اس طرح تعلیم آسانی سے دلچسپی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس طریق کا نام مونٹی سوڈی میتھڈ ہے۔

اجتماعی تعلیم { پہلے ہر ایک طالب علم کو الگ الگ تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح مدرس کا بہت سا وقت ضائع

طلبائے پیرا اور نئے سرسبز کرتے ہیں۔ زمین برسوتے ہیں۔ قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور براہ راست قدرت سے حسب ضرورت تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ غرضیکہ مغربی دنیا میں ایک عظیم تغیر و تبدل ظہور میں آ رہا ہے میٹر فورڈ نے تیس کروڑ روپیہ نوجوانوں کی تحریک چلانے کے لئے وقف کیا ہے۔ اور ایک ہزار ایکڑ زمین حاصل کر کے اس میں ہل چلانا۔ گھریلو دستکاری سکھانا جاری کیا ہے۔ جس کو سیکھ کر نوجوان اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ سادہ زندگی بسر کریں۔ غرضیکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جوں جوں ہم طلباء کی حرکات سکنت کا مشاہدہ کرتے ہیں اُن کے حل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے سوچتے ہیں۔ نئے نئے تجربے کرتے ہیں۔ اسی طرح طریق تعلیم میں ترقی ہوتی چلی جا رہی ہے اور جی جائیگی۔ بہترین سے بہترین طریق تعلیم دینے کے لئے نکلیں گے۔ لیکن جو لوگ اپنے دل و دماغ کو تالے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کھڑے پانی کی طرح اُن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اور کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔

رُکا و خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے میند پانی میں

بہاری لال ٹیچر نارمل سکول حصار



پنجاب میں ۱۹۲۸ و ۱۹۲۹ء میں تعلیم کی حالت

قسم درگاہ	تعداد درگاہ مرد	اوسط خرچ فی طالب علم	تعداد درگاہ زنانہ	اوسط خرچ فی طالب علم
آرٹ کالج	۳۲	۹ - ۲ - ۱۸۸ روپے	۲	۶ - ۱۰ - ۵۵۸ روپے
مختلف پیشے کے کالج	۸	۹ - ۹ - ۶۴۲	۱	۹ - ۵ - ۶۰۳
مائی سکولز	۳۱۵	۸ - ۵ - ۲۶	۳۲	۱ - ۱۰ - ۴۹
مڈل سکولز	۳۰۴۸	۱۰ - ۸ - ۱۳	۱۰۰	۵ - ۳ - ۲۶
پرائمری سکولز	۵۵۲۰	۳ - ۱۴ - ۹	۱۴۰۹	۸ - ۲ - ۱۲
خاص مدارس	۲۲۸۸	۹ - ۱۱ - ۲۹	۶۲	۴ - ۴ - ۱۱۸
بیزوان	۱۱۲۱۱	۹ - ۱۱ - ۲۰	۱۶۰۶	۰ - ۴ - ۲۳

پنجاب میں یورپین و اینگلو انڈین کی تعلیم

آبادی مردانہ	فیصدی طلباء	آبادی سترواٹ	تعداد طلباء فیصدی	اوسط فیصدی	کل خرچ	اوسط خرچ فی طالب علم
۱۸۰۴۸	۹۶۰۹	۴۶۳۶	۲۱۵۱۹	۱۳۶۴۳	۱۰۸۵۵۳۰	۶ - ۱۰ - ۳۳۱ روپے

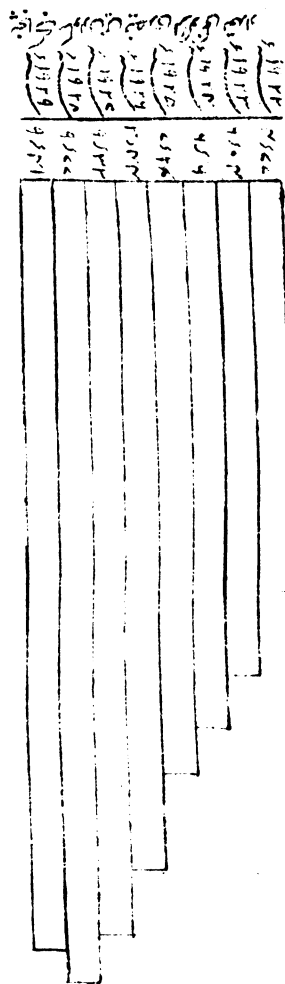
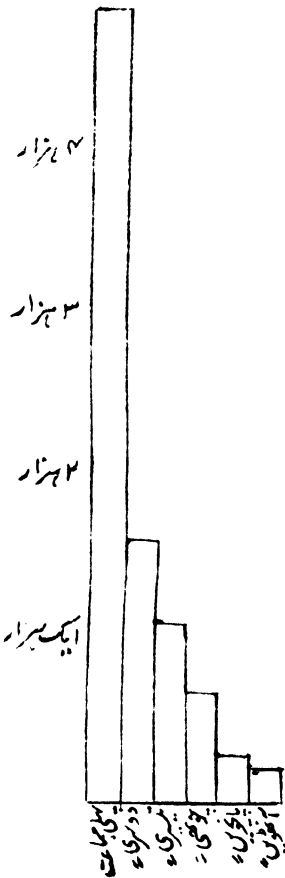
نوٹ (۱) کل ۳۲۴۳ طلباء یورپین مدارس میں پڑھتے ہیں جن میں سے ۳۶۰ غیر یورپین ہیں۔

(۲) لڑکیوں کی زیادہ تعداد کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپین اصحاب عام طور پر لڑکوں کو یورپ میں تعلیم دیتے ہیں۔

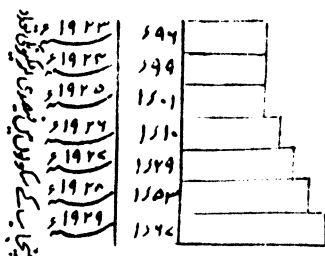
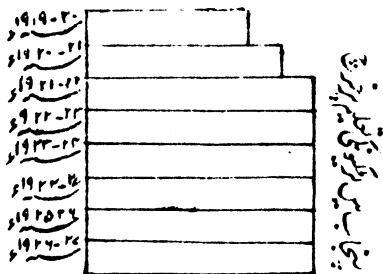
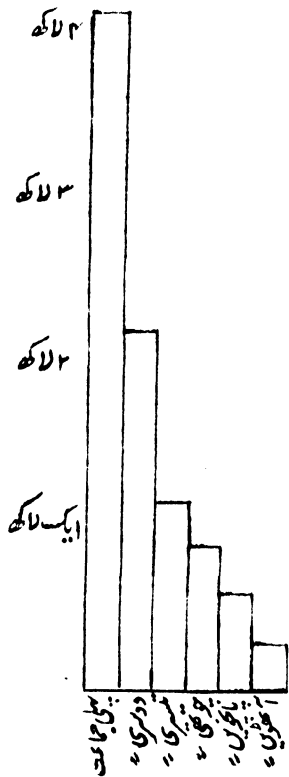
قسمت	فرست	۱۳۹۹	۱۴۰۰	۱۴۰۱	۱۴۰۲	۱۴۰۳	۱۴۰۴	۱۴۰۵	۱۴۰۶	۱۴۰۷	۱۴۰۸	۱۴۰۹	۱۴۱۰	۱۴۱۱	۱۴۱۲	۱۴۱۳	۱۴۱۴	۱۴۱۵	۱۴۱۶	۱۴۱۷	۱۴۱۸	۱۴۱۹	۱۴۲۰	۱۴۲۱	۱۴۲۲	۱۴۲۳	۱۴۲۴	۱۴۲۵	۱۴۲۶	۱۴۲۷	۱۴۲۸	۱۴۲۹	۱۴۳۰	۱۴۳۱	۱۴۳۲	۱۴۳۳	۱۴۳۴	۱۴۳۵	۱۴۳۶	۱۴۳۷	۱۴۳۸	۱۴۳۹	۱۴۴۰	۱۴۴۱	۱۴۴۲	۱۴۴۳	۱۴۴۴	۱۴۴۵	۱۴۴۶	۱۴۴۷	۱۴۴۸	۱۴۴۹	۱۴۵۰	۱۴۵۱	۱۴۵۲	۱۴۵۳	۱۴۵۴	۱۴۵۵	۱۴۵۶	۱۴۵۷	۱۴۵۸	۱۴۵۹	۱۴۶۰	۱۴۶۱	۱۴۶۲	۱۴۶۳	۱۴۶۴	۱۴۶۵	۱۴۶۶	۱۴۶۷	۱۴۶۸	۱۴۶۹	۱۴۷۰	۱۴۷۱	۱۴۷۲	۱۴۷۳	۱۴۷۴	۱۴۷۵	۱۴۷۶	۱۴۷۷	۱۴۷۸	۱۴۷۹	۱۴۸۰	۱۴۸۱	۱۴۸۲	۱۴۸۳	۱۴۸۴	۱۴۸۵	۱۴۸۶	۱۴۸۷	۱۴۸۸	۱۴۸۹	۱۴۹۰	۱۴۹۱	۱۴۹۲	۱۴۹۳	۱۴۹۴	۱۴۹۵	۱۴۹۶	۱۴۹۷	۱۴۹۸	۱۴۹۹	۱۵۰۰	۱۵۰۱	۱۵۰۲	۱۵۰۳	۱۵۰۴	۱۵۰۵	۱۵۰۶	۱۵۰۷	۱۵۰۸	۱۵۰۹	۱۵۱۰	۱۵۱۱	۱۵۱۲	۱۵۱۳	۱۵۱۴	۱۵۱۵	۱۵۱۶	۱۵۱۷	۱۵۱۸	۱۵۱۹	۱۵۲۰	۱۵۲۱	۱۵۲۲	۱۵۲۳	۱۵۲۴	۱۵۲۵	۱۵۲۶	۱۵۲۷	۱۵۲۸	۱۵۲۹	۱۵۳۰	۱۵۳۱	۱۵۳۲	۱۵۳۳	۱۵۳۴	۱۵۳۵	۱۵۳۶	۱۵۳۷	۱۵۳۸	۱۵۳۹	۱۵۴۰	۱۵۴۱	۱۵۴۲	۱۵۴۳	۱۵۴۴	۱۵۴۵	۱۵۴۶	۱۵۴۷	۱۵۴۸	۱۵۴۹	۱۵۵۰	۱۵۵۱	۱۵۵۲	۱۵۵۳	۱۵۵۴	۱۵۵۵	۱۵۵۶	۱۵۵۷	۱۵۵۸	۱۵۵۹	۱۵۶۰	۱۵۶۱	۱۵۶۲	۱۵۶۳	۱۵۶۴	۱۵۶۵	۱۵۶۶	۱۵۶۷	۱۵۶۸	۱۵۶۹	۱۵۷۰	۱۵۷۱	۱۵۷۲	۱۵۷۳	۱۵۷۴	۱۵۷۵	۱۵۷۶	۱۵۷۷	۱۵۷۸	۱۵۷۹	۱۵۸۰	۱۵۸۱	۱۵۸۲	۱۵۸۳	۱۵۸۴	۱۵۸۵	۱۵۸۶	۱۵۸۷	۱۵۸۸	۱۵۸۹	۱۵۹۰	۱۵۹۱	۱۵۹۲	۱۵۹۳	۱۵۹۴	۱۵۹۵	۱۵۹۶	۱۵۹۷	۱۵۹۸	۱۵۹۹	۱۶۰۰	۱۶۰۱	۱۶۰۲	۱۶۰۳	۱۶۰۴	۱۶۰۵	۱۶۰۶	۱۶۰۷	۱۶۰۸	۱۶۰۹	۱۶۱۰	۱۶۱۱	۱۶۱۲	۱۶۱۳	۱۶۱۴	۱۶۱۵	۱۶۱۶	۱۶۱۷	۱۶۱۸	۱۶۱۹	۱۶۲۰	۱۶۲۱	۱۶۲۲	۱۶۲۳	۱۶۲۴	۱۶۲۵	۱۶۲۶	۱۶۲۷	۱۶۲۸	۱۶۲۹	۱۶۳۰	۱۶۳۱	۱۶۳۲	۱۶۳۳	۱۶۳۴	۱۶۳۵	۱۶۳۶	۱۶۳۷	۱۶۳۸	۱۶۳۹	۱۶۴۰	۱۶۴۱	۱۶۴۲	۱۶۴۳	۱۶۴۴	۱۶۴۵	۱۶۴۶	۱۶۴۷	۱۶۴۸	۱۶۴۹	۱۶۵۰	۱۶۵۱	۱۶۵۲	۱۶۵۳	۱۶۵۴	۱۶۵۵	۱۶۵۶	۱۶۵۷	۱۶۵۸	۱۶۵۹	۱۶۶۰	۱۶۶۱	۱۶۶۲	۱۶۶۳	۱۶۶۴	۱۶۶۵	۱۶۶۶	۱۶۶۷	۱۶۶۸	۱۶۶۹	۱۶۷۰	۱۶۷۱	۱۶۷۲	۱۶۷۳	۱۶۷۴	۱۶۷۵	۱۶۷۶	۱۶۷۷	۱۶۷۸	۱۶۷۹	۱۶۸۰	۱۶۸۱	۱۶۸۲	۱۶۸۳	۱۶۸۴	۱۶۸۵	۱۶۸۶	۱۶۸۷	۱۶۸۸	۱۶۸۹	۱۶۹۰	۱۶۹۱	۱۶۹۲	۱۶۹۳	۱۶۹۴	۱۶۹۵	۱۶۹۶	۱۶۹۷	۱۶۹۸	۱۶۹۹	۱۷۰۰	۱۷۰۱	۱۷۰۲	۱۷۰۳	۱۷۰۴	۱۷۰۵	۱۷۰۶	۱۷۰۷	۱۷۰۸	۱۷۰۹	۱۷۱۰	۱۷۱۱
تعمیرات	فرست	۱۳۹۹	۱۴۰۰	۱۴۰۱	۱۴۰۲	۱۴۰۳	۱۴۰۴	۱۴۰۵	۱۴۰۶	۱۴۰۷	۱۴۰۸	۱۴۰۹	۱۴۱۰	۱۴۱۱	۱۴۱۲	۱۴۱۳	۱۴۱۴	۱۴۱۵	۱۴۱۶	۱۴۱۷	۱۴۱۸	۱۴۱۹	۱۴۲۰	۱۴۲۱	۱۴۲۲	۱۴۲۳	۱۴۲۴	۱۴۲۵	۱۴۲۶	۱۴۲۷	۱۴۲۸	۱۴۲۹	۱۴۳۰	۱۴۳۱	۱۴۳۲	۱۴۳۳	۱۴۳۴	۱۴۳۵	۱۴۳۶	۱۴۳۷	۱۴۳۸	۱۴۳۹	۱۴۴۰	۱۴۴۱	۱۴۴۲	۱۴۴۳	۱۴۴۴	۱۴۴۵	۱۴۴۶	۱۴۴۷	۱۴۴۸	۱۴۴۹	۱۴۵۰	۱۴۵۱	۱۴۵۲	۱۴۵۳	۱۴۵۴	۱۴۵۵	۱۴۵۶	۱۴۵۷	۱۴۵۸	۱۴۵۹	۱۴۶۰	۱۴۶۱	۱۴۶۲	۱۴۶۳	۱۴۶۴	۱۴۶۵	۱۴۶۶	۱۴۶۷	۱۴۶۸	۱۴۶۹	۱۴۷۰	۱۴۷۱	۱۴۷۲	۱۴۷۳	۱۴۷۴	۱۴۷۵	۱۴۷۶	۱۴۷۷	۱۴۷۸	۱۴۷۹	۱۴۸۰	۱۴۸۱	۱۴۸۲	۱۴۸۳	۱۴۸۴	۱۴۸۵	۱۴۸۶	۱۴۸۷	۱۴۸۸	۱۴۸۹	۱۴۹۰	۱۴۹۱	۱۴۹۲	۱۴۹۳	۱۴۹۴	۱۴۹۵	۱۴۹۶	۱۴۹۷	۱۴۹۸	۱۴۹۹	۱۵۰۰	۱۵۰۱	۱۵۰۲	۱۵۰۳	۱۵۰۴	۱۵۰۵	۱۵۰۶	۱۵۰۷	۱۵۰۸	۱۵۰۹	۱۵۱۰	۱۵۱۱	۱۵۱۲	۱۵۱۳	۱۵۱۴	۱۵۱۵	۱۵۱۶	۱۵۱۷	۱۵۱۸	۱۵۱۹	۱۵۲۰	۱۵۲۱	۱۵۲۲	۱۵۲۳	۱۵۲۴	۱۵۲۵	۱۵۲۶	۱۵۲۷	۱۵۲۸	۱۵۲۹	۱۵۳۰	۱۵۳۱	۱۵۳۲	۱۵۳۳	۱۵۳۴	۱۵۳۵	۱۵۳۶	۱۵۳۷	۱۵۳۸	۱۵۳۹	۱۵۴۰	۱۵۴۱	۱۵۴۲	۱۵۴۳	۱۵۴۴	۱۵۴۵	۱۵۴۶	۱۵۴۷	۱۵۴۸	۱۵۴۹	۱۵۵۰	۱۵۵۱	۱۵۵۲	۱۵۵۳	۱۵۵۴	۱۵۵۵	۱۵۵۶	۱۵۵۷	۱۵۵۸	۱۵۵۹	۱۵۶۰	۱۵۶۱	۱۵۶۲	۱۵۶۳	۱۵۶۴	۱۵۶۵	۱۵۶۶	۱۵۶۷	۱۵۶۸	۱۵۶۹	۱۵۷۰	۱۵۷۱	۱۵۷۲	۱۵۷۳	۱۵۷۴	۱۵۷۵	۱۵۷۶	۱۵۷۷	۱۵۷۸	۱۵۷۹	۱۵۸۰	۱۵۸۱	۱۵۸۲	۱۵۸۳	۱۵۸۴	۱۵۸۵	۱۵۸۶	۱۵۸۷	۱۵۸۸	۱۵۸۹	۱۵۹۰	۱۵۹۱	۱۵۹۲	۱۵۹۳	۱۵۹۴	۱۵۹۵	۱۵۹۶	۱۵۹۷	۱۵۹۸	۱۵۹۹	۱۶۰۰	۱۶۰۱	۱۶۰۲	۱۶۰۳	۱۶۰۴	۱۶۰۵	۱۶۰۶	۱۶۰۷	۱۶۰۸	۱۶۰۹	۱۶۱۰	۱۶۱۱	۱۶۱۲	۱۶۱۳	۱۶۱۴	۱۶۱۵	۱۶۱۶	۱۶۱۷	۱۶۱۸	۱۶۱۹	۱۶۲۰	۱۶۲۱	۱۶۲۲	۱۶۲۳	۱۶۲۴	۱۶۲۵	۱۶۲۶	۱۶۲۷	۱۶۲۸	۱۶۲۹	۱۶۳۰	۱۶۳۱	۱۶۳۲	۱۶۳۳	۱۶۳۴	۱۶۳۵	۱۶۳۶	۱۶۳۷	۱۶۳۸	۱۶۳۹	۱۶۴۰	۱۶۴۱	۱۶۴۲	۱۶۴۳	۱۶۴۴	۱۶۴۵	۱۶۴۶	۱۶۴۷	۱۶۴۸	۱۶۴۹	۱۶۵۰	۱۶۵۱	۱۶۵۲	۱۶۵۳	۱۶۵۴	۱۶۵۵	۱۶۵۶	۱۶۵۷	۱۶۵۸	۱۶۵۹	۱۶۶۰	۱۶۶۱	۱۶۶۲	۱۶۶۳	۱۶۶۴	۱۶۶۵	۱۶۶۶	۱۶۶۷	۱۶۶۸	۱۶۶۹	۱۶۷۰	۱۶۷۱	۱۶۷۲	۱۶۷۳	۱۶۷۴	۱۶۷۵	۱۶۷۶	۱۶۷۷	۱۶۷۸	۱۶۷۹	۱۶۸۰	۱۶۸۱	۱۶۸۲	۱۶۸۳	۱۶۸۴	۱۶۸۵	۱۶۸۶	۱۶۸۷	۱۶۸۸	۱۶۸۹	۱۶۹۰	۱۶۹۱	۱۶۹۲	۱۶۹۳	۱۶۹۴	۱۶۹۵	۱۶۹۶	۱۶۹۷	۱۶۹۸	۱۶۹۹	۱۷۰۰	۱۷۰۱	۱۷۰۲	۱۷۰۳	۱۷۰۴	۱۷۰۵	۱۷۰۶	۱۷۰۷	۱۷۰۸	۱۷۰۹	۱۷۱۰	۱۷۱۱
تعمیرات	فرست	۱۳۹۹	۱۴۰۰	۱۴۰۱	۱۴۰۲	۱۴۰۳	۱۴۰۴	۱۴۰۵	۱۴۰۶	۱۴۰۷	۱۴۰۸	۱۴۰۹	۱۴۱۰	۱۴۱۱	۱۴۱۲	۱۴۱۳	۱۴۱۴	۱۴۱۵	۱۴۱۶	۱۴۱۷	۱۴۱۸	۱۴۱۹	۱۴۲۰	۱۴۲۱	۱۴۲۲	۱۴۲۳	۱۴۲۴	۱۴۲۵	۱۴۲۶	۱۴۲۷	۱۴۲۸	۱۴۲۹	۱۴۳۰	۱۴۳۱	۱۴۳۲	۱۴۳۳	۱۴۳۴	۱۴۳۵	۱۴۳۶	۱۴۳۷	۱۴۳۸	۱۴۳۹	۱۴۴۰	۱۴۴۱	۱۴۴۲	۱۴۴۳	۱۴۴۴	۱۴۴۵	۱۴۴۶	۱۴۴۷	۱۴۴۸	۱۴۴۹	۱۴۵۰	۱۴۵۱	۱۴۵۲	۱۴۵۳	۱۴۵۴	۱۴۵۵	۱۴۵۶	۱۴۵۷	۱۴۵۸	۱۴۵۹	۱۴۶۰	۱۴۶۱	۱۴۶۲	۱۴۶۳	۱۴۶۴	۱۴۶۵	۱۴۶۶	۱۴۶۷	۱۴۶۸	۱۴۶۹	۱۴۷۰	۱۴۷۱	۱۴۷۲	۱۴۷۳	۱۴۷۴	۱۴۷۵	۱۴۷۶	۱۴۷۷	۱۴۷۸	۱۴۷۹	۱۴۸۰	۱۴۸۱	۱۴۸۲	۱۴۸۳	۱۴۸۴	۱۴۸۵	۱۴۸۶	۱۴۸۷	۱۴۸۸	۱۴۸۹	۱۴۹۰	۱۴۹۱	۱۴۹۲	۱۴۹۳	۱۴۹۴	۱۴۹۵	۱۴۹۶	۱۴۹۷	۱۴۹۸	۱۴۹۹	۱۵۰۰	۱۵۰۱	۱۵۰۲	۱۵۰۳	۱۵۰۴	۱۵۰۵	۱۵۰۶	۱۵۰۷	۱۵۰۸	۱۵۰۹	۱۵۱۰	۱۵۱۱	۱۵۱۲	۱۵۱۳	۱۵۱۴	۱۵۱۵	۱۵۱۶	۱۵۱۷	۱۵۱۸	۱۵۱۹	۱۵۲۰	۱۵۲۱	۱۵۲۲	۱۵۲۳	۱۵۲۴	۱۵۲۵	۱۵۲۶	۱۵۲۷	۱۵۲۸	۱۵۲۹	۱۵۳۰	۱۵۳۱	۱۵۳۲	۱۵۳۳	۱۵۳۴	۱۵۳۵	۱۵۳۶	۱۵۳۷	۱۵۳۸	۱۵۳۹	۱۵۴۰	۱۵۴۱	۱۵۴۲	۱۵۴۳	۱۵۴۴	۱۵۴۵	۱۵۴۶	۱۵۴۷	۱۵۴۸	۱۵۴۹	۱۵۵۰	۱۵۵۱	۱۵۵۲	۱۵۵۳	۱۵۵۴	۱۵۵۵	۱۵۵۶	۱۵۵۷	۱۵۵۸	۱۵۵۹	۱۵۶۰	۱۵۶۱	۱۵۶۲	۱۵۶۳	۱۵۶۴	۱۵۶۵	۱۵۶۶	۱۵۶۷	۱۵۶۸	۱۵۶۹	۱۵۷۰	۱۵۷۱	۱۵۷۲	۱۵۷۳	۱۵۷۴	۱۵۷۵	۱۵۷۶	۱۵۷۷	۱۵۷۸	۱۵۷۹	۱۵۸۰	۱۵۸۱	۱۵۸۲	۱۵۸۳	۱۵۸۴	۱۵۸۵	۱۵۸۶	۱۵۸۷	۱۵۸۸	۱۵۸۹	۱۵۹۰	۱۵۹۱	۱۵۹۲	۱۵۹۳	۱۵۹۴	۱۵۹۵	۱۵۹۶	۱۵۹۷	۱۵۹۸	۱۵۹۹	۱۶۰۰	۱۶۰۱	۱۶۰۲	۱۶۰۳	۱۶۰۴	۱۶۰۵	۱۶۰۶	۱۶۰۷	۱۶۰۸	۱۶۰۹	۱۶۱۰	۱۶۱۱	۱۶۱۲	۱۶۱۳	۱۶۱۴	۱۶۱۵	۱۶۱۶	۱۶۱۷	۱۶۱۸	۱۶۱۹	۱۶۲۰	۱۶۲۱	۱۶۲۲	۱۶۲۳	۱۶۲۴	۱۶۲۵	۱۶۲۶	۱۶۲۷	۱۶۲۸	۱۶۲۹	۱۶۳۰	۱۶۳۱	۱۶۳۲	۱۶۳۳	۱۶۳۴	۱۶۳۵	۱۶۳۶	۱۶۳۷	۱۶۳۸	۱۶۳۹	۱۶۴۰	۱۶۴۱	۱۶۴۲	۱۶۴۳	۱۶۴۴	۱۶۴۵	۱۶۴۶	۱۶۴۷	۱۶۴۸	۱۶۴۹	۱۶۵۰	۱۶۵۱	۱۶۵۲	۱۶۵۳	۱۶۵۴	۱۶۵۵	۱۶۵۶	۱۶۵۷	۱۶۵۸	۱۶۵۹	۱۶۶۰	۱۶۶۱	۱۶۶۲	۱۶۶۳	۱۶۶۴	۱۶۶۵	۱۶۶۶	۱۶۶۷	۱۶۶۸	۱۶۶۹	۱۶۷۰	۱۶۷۱	۱۶۷۲	۱۶۷۳	۱۶۷۴	۱۶۷۵	۱۶۷۶	۱۶۷۷	۱۶۷۸	۱۶۷۹	۱۶۸۰	۱۶۸۱	۱۶۸۲	۱۶۸۳	۱۶۸۴	۱۶۸۵	۱۶۸۶	۱۶۸۷	۱۶۸۸	۱۶۸۹	۱۶۹۰	۱۶۹۱	۱۶۹۲	۱۶۹۳	۱۶۹۴	۱۶۹۵	۱۶۹۶	۱۶۹۷	۱۶۹۸	۱۶۹۹	۱۷۰۰	۱۷۰۱	۱۷۰۲	۱۷۰۳	۱۷۰۴	۱۷۰۵	۱۷۰۶	۱۷۰۷	۱۷۰۸	۱۷۰۹	۱۷۱۰	۱۷۱۱
تعمیرات	فرست	۱۳۹۹	۱۴۰۰	۱۴۰۱	۱۴۰۲	۱۴۰۳	۱۴۰۴	۱۴۰۵	۱۴۰																																																																																																																																																																																																																																																																																																																	

[illegible]

۱۹۲۸ و ۱۹۲۹ء
مختلف علاقہ جاتوں میں لڑکوں کی تعداد



۱۹۲۸ و ۱۹۲۹ء
پنجاب کی مختلف جاتوں میں لڑکوں کی تعداد



۲۰ لاکھ

۱۰ لاکھ

۲۰ لاکھ

۱۰ لاکھ

۱۰ لاکھ

۱۰ لاکھ

۵ لاکھ

پنجاب میں اراکین تعلیم پر خرچ

(۱۹۱۹-۲۰)
(۱۹۲۰-۲۱)
(۱۹۲۱-۲۲)
(۱۹۲۲-۲۳)
(۱۹۲۳-۲۴)
(۱۹۲۴-۲۵)
(۱۹۲۵-۲۶)
(۱۹۲۶-۲۷)
(۱۹۲۷-۲۸)

پنجاب میں اسٹنٹ ڈسٹرکٹ
انپکڑوں کی تعداد

۱۳۰

۱۲۰

۱۰۰

۸۰

۶۰

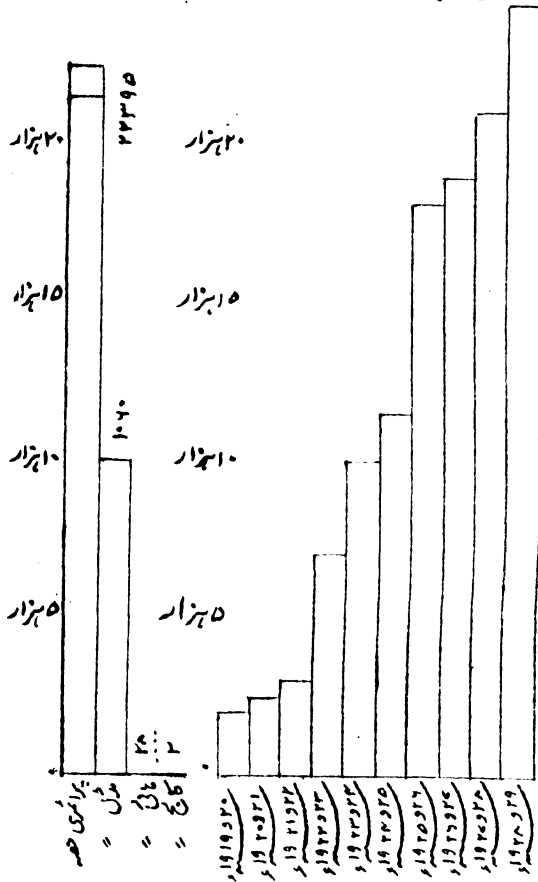
۴۰

۲۰

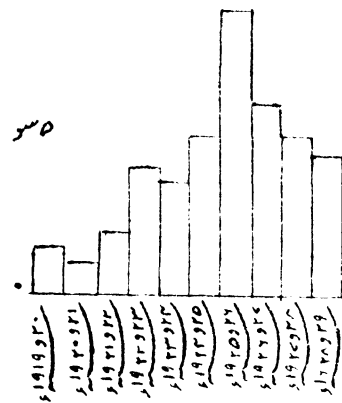
(۱۹۱۹-۲۰)
(۱۹۲۰-۲۱)
(۱۹۲۱-۲۲)
(۱۹۲۲-۲۳)
(۱۹۲۳-۲۴)
(۱۹۲۴-۲۵)
(۱۹۲۵-۲۶)
(۱۹۲۶-۲۷)
(۱۹۲۷-۲۸)

۱۹۲۸-۲۹ء میں مسکن حصوں میں
اپھونٹوں کی تعداد

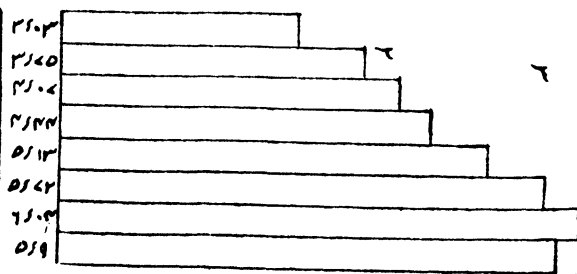
پنجاب میں اچھوت درگاہوں کی تعلیمی حالت کا گراف



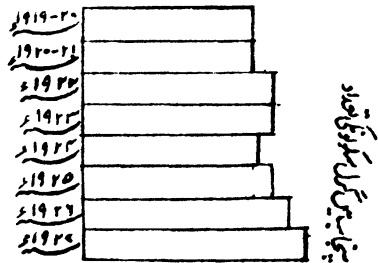
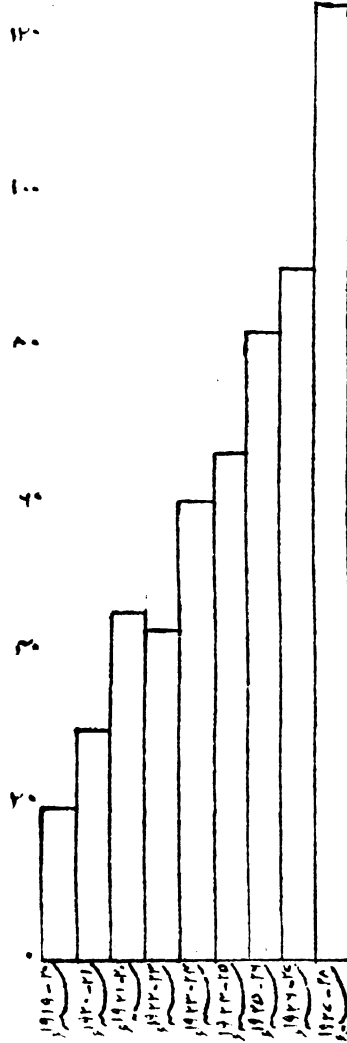
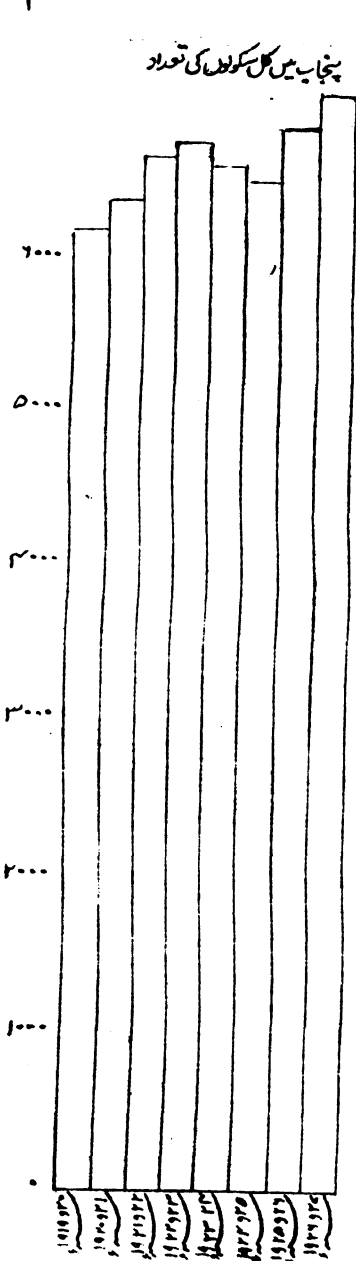
پنجاب میں اچھوت درگاہوں کی تعلیمی حالت کا گراف



۱۹۲۲ء
۱۹۲۳ء
۱۹۲۴ء
۱۹۲۵ء
۱۹۲۶ء
۱۹۲۷ء
۱۹۲۸ء
۱۹۲۹ء



پنجاب میں مل سکولوں کی تعداد



پنجاب میں مل سکولوں کی تعداد

کی پروان زبان اردو ادب ہی کو شان، انشائے اردو اسکی علمی بے مائیگی پر متأسف تھے اور آج اسکی ترقی یافتہ نرغریزی پر متأسف نظر آتے ہیں۔
دنیا سے ادب میں اردو کو جس سطح پر ارفع پر لایا جا رہا ہو۔ اور اسے اطراف عالم میں قبولیت کا موقعہ لایا
اردو کا موجودہ معیار کیا جا رہا ہو۔ اسیں محکمہ تعلیم کی ساسی بلینے کے علاوہ علمی انجمنیں۔ رسائل کی مسابقت پر روانہ مدد و حجتیں مہیا کی ہیں
اردو صحافت و جرائد کی روز افزوں فراوانی اور مضامین و نوٹوں کی ارفانی نے ثابت کر دیا ہو کہ اردو کی رفتار ترقی کی سیدھا سیدھا بلکہ عجیب ثابت ہے
اور اسکا خوش آمد مستقبل ملک کے لئے باعث خیر و برکت ثابت ہوگا۔ اگرچہ اسے اسی پنج پر محکمہ تعلیم کا درست شفقت اسکے سر پر رہا۔ تو ایسے
بہت جلد قدیمی زبانوں میں امتیازی۔ چرلھیت جاکینگا محکمہ تعلیم نے اشاعت تعلیم کے باب میں گزشتہ ربع صدی کے دوران میں جہد
سرگرمیاں کھائی ہیں۔ ان میں سے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر ملکی زبان قرار دینا اردو نوازی کا کامل ثبوت ہے۔

اردو نوازی کی اصل و اساس
اردو نوازی کی اصل و اساس

انشا پر دوازی کی اصناف اور انکی تدریس کو طرق التدریس میں جو تہہ اردو کو حاصل ہو۔ وہ منصب عیاں ہو یعنی زبان کی شیشے کی
کمل ہوگی جو مگر انتہائی انیسویں سے کامتا ہو کہ مدارس میں بھی تک اسکی تعلیم انشا پر دوازی کے اعتبار سے جو جمعی ترقی کا پہلو ہو، اصلاح کی محتاج ہو
اور کارکنان اردو کی پیش از پیش توجہ مبذول کو جانسکی دست نگر۔ اس اجمال کی تفصیل رقم کرنا ایک مصیبت کا سامنا کرنا ہو اور اسکی تشریح مختصراً
موجب اسلئے مختصر لکھا جا سکتا ہو۔ کہ انشا پر دوازی کے دونوں پہلو تقریری اور تحریری تہہ تخیل میں اردو کی مد میں اردو کی فزید توجہ کو منظر اسلئے مناسبت سے
کسی زبان کی انشا پر دوازی کی داغ بل سوقت کا سنبھالنے میں چھٹکتی جھکتی ہے اصل زبان کی تعلیم سے مترصد کیا جائے یا اس مان کی انشا سکھانے
کے اساتذہ گہری پسری کھنے دے نوں۔ یا اسکی ترویج کے اسباب ساز رہو۔ لیکن یہ ایک کلی ہوئی حقیقت ہو کہ ترویج کی ماہیں بھی کشادہ ہیں اور اس مذکور
جماعت زریعہ ہوئی جیٹیسے اردو کی طبعاً لازمہ خدمت گزار موجود ہو۔ اگر کوئی کمی زبان کی انشا پر دوازی کو نامکمل بنایا باعث بنی ہو تو وہ اعلیٰ لڑکوں
یعنی زبان کو انشا کو منفک کر کشت طریقہ سے پڑھایا جاتا ہو جو بعض سہل انگار و تعافیل شمار اساتذہ کی کورسوا دی پر عمل کرنا چاہو۔ کیونکہ اگر
زبان کو انشا سے مرتبط و متحد کر کے پڑھایا جائے۔ اور اسے الگ مضمون نہ سمجھا جائے۔ تو انشا پر دوازی (مدارس میں) بہترین منصب
حاصل کر سکتی ہو اور ان طبعین تعلیم کی سرگرمیاں حقیقت آشا ہو سکتی ہیں جب انشا پر دوازی عبارتہ اطوار خیالات و ذریعہ بیان کو تو چھوڑ کر دھنیں
کہ زبان کو ان مطالب کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ زبان اور وہ زبان جو ذریعہ دس تدریس ہے اس نقطہ سے پڑھائی جائے
جس کو اسکی انشا کی تربیت ہی نہ ہوتی رہے بلکہ وہ پائیدار تخیل کو پہنچ جائے۔

اردو کی تقریری انشا پر دوازی بہسانی بہترین صورت اختیار کر سکتی ہو۔ کیونکہ اس کو ہمیں اور زبان کی نسبت
تقریری انشا پر دوازی زیادہ سادہ رہتا ہو۔ پیچ جماعت تک پہنچتے پہنچتے لڑکوں میں اردو فقرے بولنے اور گفتگو کرنے کی
مہبت زیادہ پھیل جاتی ہو۔ اگرچہ آدھم جماعتوں میں تقریری انشا پر دوازی کی مشق زیادہ کرائی جائے۔ توجہ معین ہو کیونکہ تقریری
انشا پر دوازی پر تقریری انشا پر دوازی کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔
افان میں مجوزہ سکیم کے مطابق گاہو ماہی اشیاء کو اسباق یا تعریفیہ مضامین یا گفتگو کے طریقہ پر انشا پر دوازی کی تہید رکھنی چاہو۔

ادب کتابی مضامین کو مترادف ترجمہ یعنی وقتہ کہانی کا اختصار وغیرہ زبردینا چاہیے تقریری انشا پر دانی کی سکیم ٹڈل کی جامعیتوں میں انگریزی کی تحریری انشا پر دانی کی سکیم کو مربوط ہونی چاہیے تاکہ بچوں کیلئے آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ گوان جامعیتوں میں انگریزی اور اردو کی انشا آٹمی کا نصب العین متفاوت ہوتا ہو یعنی انگریزی کا مدعا زیادہ تر ذخیرہ الفاظ پر حنا ہوتا ہو اور اردو کا انشا خیالات و توثیق فقرات وغیرہ۔ مگر حقد زبانی کا ارتباط اور رکھا جائیگا۔ اسی قدر زیادہ موثر و مفید ہو گا۔

ٹڈل کی جامعیتوں میں اردو کی انشا پر دانی (تقریری) کی عبارت محض سو لاکھ پڑی کرنی چاہیے۔ کیونکہ بچے باوصف خواص حقائق سے لگا دہونے کے انشا پر خیالات کی قدرت سے معرا ہوتے ہیں اسلئے سوالات کی خوبی ان کیلئے خضر راہ کا کام دیگی۔ انہیں جوابات دینے میں لہری ہوگی۔ اور یہی انشا پر دانی ہے سوالات میں جامعیت کا خیال کھانا مقدم سمجھا جائے مثلاً عبارت سے تقریری انشا پر دانی کرتے وقت مندرجہ ذیل سوالات حاصل مضمون ہیں:-

(۱) عبارت کس جگہ واقع ہے؟ (۲) اسکی مکانت کیسی ہے؟ (۳) اسکا نظارہ کیسی ہے؟ (۴) اکروں کی ترتیب کیسی ہے؟ (۵) ہول وادیر جو کئی قسم کیونکر ہے؟ (۶) کنواں قسمت واقع ہے؟ (۷) باغیچہ کی حالت کیسی ہے؟ (۸) پھل کی مقدار کی نسبت کیا خبر ہے؟ (۹) شکار کی نسبت کیا خبر ہے؟ (۱۰) کتنی جامعیتوں پر مشتمل ہے؟ (۱۱) تعداد اطفال کیسی ہے؟ (۱۲) استاد کتنے ہیں؟ (۱۳) ان کے جوابات کو اسی ترتیب سے جمع کیا جائیے۔ تو تقریری مضمون بھی مکمل ہو سکتا ہے۔

زبانی اسباق کی صورت میں پیش پانچ دہ مضامین پر انشا خیالات کرایا جائیے۔ جو فوراً تصور یا نظر کے سامنے آجائیں۔ فقرات مختلف اطفال سے مرتب کرائے جائیں۔ ترتیب و اسلوب کا خاص خیال رکھا جائے۔ جب فقرے یا سلیکی اہمیت پہلے میں پیدا ہو جائے تو انہیں ترتیب و تربط کی طرف مانتھا جائے۔ بلکہ یہ ان کیجو مشق کے ساتھ ساتھ آسان ہوتا جائیگا۔ دورانی گفتگو میں کشادہ دلی کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ تحسین و آفرین میں بخل روانہ رکھا جائے۔ جو انشا پر دانی کی ترقی کی سب سے بڑی محرک ہو۔ انشا پر دانی کی مقبولیت کا اصل الاصول سلاست ہو۔ اور اسی تقریری انشا پر دانی میں ہمیشہ نصب العین بنانا چاہئے۔ کوئی بات یا جہ جب ہی موثر ہو سکتا ہو جبکہ وہ کان کی راہ میں دل میں اتر جائے اور اگر اسے کان بوجھ کر کی طرف معود کر کے فرصت دے گا ہو تو اسکی اثر پذیری معلوم۔ بقول حضرت اکبرؒ

ایسا سنئے کہ کہنے والا اچھا ہے! ایسا کیئے کہ بیٹھ جائے دل میں

بانی کلاسوں میں مسلسل تقاریر کی مشق کرنی چاہئے۔ پہلے اطفال کو سوچنے کا موقع دینا چاہیے۔ پھر بیان کرنے کا بغیر غور و خوض کے خیالات کا ظاہر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ادبی مجالس کا انعقاد۔ اور ان میں انشا پر دانی کی تقریری پہلو کو تقویت دینا مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور اس میں دو زبان کی حقیقی خدمت بھی یہی ہے کہ بچوں کو قوت گوئی میں زیادہ روئی و دبیرہ گوئی پیدا کی جائیے۔ دینا انشا فروع تحصیل ہو سکے۔ مگر رہنا بیحد نوسان گذرہ ہو۔ قوت بیانہ کی تربیت بھی ضروری ہے جسے مدین نے گلدستہ طاق فراموشی بنا رکھا ہے!

انشاء اللہ تقریری انشا پر دانی پر پھر کبھی عرض کر دینگا *



ما سترجکستنگ

میننگ پروپرا ستر ساله ہذا



لالہ آنکھا رام صاحب سچدیو منشی فاضل

یادِ صبح

(از جناب یحییٰ کھوسو صاحب رضوی)

یادِ ایامِ صبحِ نورانی	ب نہ تو ہے نہ وہ درخشانی
سچ بتا کیوں پھپھایا منہ کو	اے مری صبح کی درخشانی
نہیں آتا نظر کئی دن سے	کیوں نہ ہو رنج میں منہ سروانی
بھول کھلا کے رہ گئے ہیں تمام	نسخِ رنگت ہوئی ہر اب ہانی
اے لکھ مری پیاری صبح	پھر دکھا اپنا روئے نورانی
کیا کہوں کیا ہے حال دل میرا	کیا کہوں کس قدر ہے حیرانی
شوقِ دیدارِ جب بڑھانے سے	بجز حسرت میں آئی غنیمانی
کیا ہوا تیرا جلوہ زیب	کیا ہوا تیرا حسنِ لاثانی
وہ ترا حسن دیکھ کر جس کو	ہوا اجاتا تھا آئینہ پانی
بھٹوٹ کر تجھ سے طائرانِ چمن	نہیں کرتے ہیں اب غولِ جوفانی
مر گئے وہ خوشی کے سب آثار	جھا گئی اک بھاں میں ویرانی
دل بے تاب مضطرب ہے بہت	کچھ ہے تشویش کچھ پریشانی
سُن لیں یہ نکتہ صاحبِ انِ فہم	ہو سمجھنے میں تاکہ آسانی

چھیڑو نامہ سر نہ داستانِ فراق
قصہ غم بہت ہے طولانی

تصویر بر نظم

تجھ کو زیبا تھا کہ ہوتی ساقی سا غریب دست
اس قدر بھڑکا دیا کیا دل کی آہوں نے تجھے
کس مصیبت میں تجھے خوریز ہو جانا پڑا
یہ غضب یہ قہر یہ غصہ یہ سبب یہ جلال
صنفِ نازک میں یہ جرأت آج تک کیھی نہ تھی
سوراووں میں جیا لوں میں ترا چرچا ہے آج
آدمی عزت کی خاطر شعلہ خوانسا تو ہو
مشتعل چہرے سر روشن شانِ نسوانی نری
حسن پر غصے کی سرخی رنگ ہے تصویر میں
اپنی دھن میں محو ہے تو اس قدر اے حبیب
تیرے تیور کہہ رہے ہیں سامنے آئے کوئی
کیا خبر کس کس کی تو نے ختم کر دی زندگی

دیکھتا ہوں کیوں تجھے اے نازنین خنجر بدست
یا نگاہِ بد سے دیکھا بزدلگا ہوں نے تجھے
کیوں تجھے اے نازنین چنگیز ہو جانا پڑا
شیر مردوں کو ترے آگے ٹھہرنا ہے محال
یہ شجاعت یہ بہالت آج تک دیکھی نہ تھی
آن پر مرٹنے والوں میں ترا چرچا ہے آج
آبرو والوں کو پاس آبرو اتنا تو ہو
خون کے چھینٹوں سے رنگیں پاک دامانی تری
یا بھرے میں لعل تو نے دامنِ ششیر میں
ہوش کچھ سر سے دوپٹے کے سرکنے کا نہیں
جب حالت ہو تو کیونکر تجھ کو بھجائے کوئی
ہے تری ششیر براں خون کی پیاسی بھی

سنگدل اتنی نہ ہو نسوانیت اپنی نہ چھوڑ
حسن کی دیوی ہے تو معصومیت اپنی نہ چھوڑ

جوش
نسیان

خیالاتِ قمر

(انجانبِ قمر، جہی)

وہ تکتے ہیں بھڑکتے راہیں تمہاری جو دیکھے ہوئے ہیں نگاہیں تمہاری
 انہیں ہیں سما کر پہنچتے ہو دل میں نگاہیں باری میں راہیں تمہاری
 نظر میں مری کب سماتا ہے کوئی کہ کوئی ہیں میں نے نگاہیں تمہاری
 پہنچتی ہیں یہ غرشِ اعظم سے اونچی غضب کی ہیں نجی نگاہیں تمہاری
 وہ بے تیغ و بے تیر ہوتا ہے بسمل چہیں ہیں یہ قاتل نگاہیں تمہاری
 کبھی تیر ہیں اور کبھی تیغ و قاتل وہ یدھی وہ ڈیڑھی نگاہیں تمہاری
 خوش آئے نہ کیوں مسکے عشق و وعدت بتائی ہوئی ہیں یہ راہیں تمہاری
 دو عالم کی آنکھوں کے پھر لے کا کایم مگر پھر نہ جانیں نگاہیں تمہاری

قمر تم بھی الفت میں کیا دل جلے ہو

نکلتی ہیں کیوں گرم آہیں تمہاری

میکدہ ریاض

(از جناب سان الملک خیام العصر حضرت ریاض خیر آبادی مدظلہ)

تیسرے فاقے ہمیں دانہ انگور ملے
کتنے کعبے ملے رستے میں کٹی ٹُور ملے
ایسے بھی کتنے ہیں اللہ خدا کے بندے
نہ سہی حبلوہ نرا جلوہ محبوب سہی
وہ بھی بخشے گئے ہم بادہ کشوں کے بہرے
مجھ سے کاوش تھی اُسے تیری مژدہ نے ڈالے
یہ بھی قسمت نہ ملے دیر میں ناقوس کوئی
کئے جنت وہیں خود جان سکین جنت میں
خاک ہو کر نہ رہی خاک بھی ان کی باقی
دعوتِ شیخ بھی تھی انہیں ساقی میں
عرش کو طور کو کعبے کو وہیں سے دیکھو
آئی غربت میں اہل شام کو لے دامن صبح
تیشہ بردوش و ماں جاؤں کہ دکھتے ہیں
عینہ تک راہ پر آجائیں گے ناصح رندو
دور سے دل کو تجلی تری روشن کر دے

ہم یہ سمجھے کہ بھرے ساغر بُور ملے
ان مقامات سے ہم کو وہ بہت بُور ملے
اس خدائی سے الگ سب بُت مغرور ملے
یا خدا دیکھنے کو وہ سُرخ پر نُور ملے
آج جنت میں ہیں ناصح مغفور ملے
گھرے گھرے مجھے دل میں کئی نامُور ملے
لے سراپیل تہیں پھونکنے کو صور ملے
ایسے بھی تیری گلی میں کئی معذور ملے
خاک میں یوں جم و کے قیصر و فقور ملے
آکے جنت میں بھی کئے انہیں انگور ملے
دیکھنے کو مجھے وہ روضہ پر نُور ملے
اب کفن اور کفن کے لئے کافور ملے
کو کفن سے ہمیں اچھا کوئی مزدور ملے
رمضاں میں انہیں افشردہ انگور ملے
یہ سیہ خانہ ہمیں نور سے معمور ملے

نام جو کچھ ہوا انہیں کہتے ہیں سب لوگ یہ
آج ہم کو وہ بڑے شاعر مشہور ملے

سرسبزیت تعلیم پنجاب

پنجاب کا تھوڑا سا علاقہ نہالہ پور کے روئے ۱۸۶۶ء میں سرکار انگریزی کے ماتحت آیا۔ اور ۱۸۶۹ء میں سارا صوبہ سرکاری مقبوضات میں لگ گیا اس وقت اس صوبہ کا انتظام ایک بورڈ آف کنٹرول کے ماتحت تھا جسے قدرتاں ملک میں انتظام قائم کرنے اور ضرورت شرف و کرنے کی طرف زیادہ متوجہ ہونا پڑا اور صوبہ کی تعلیمی حالت پر کماحقہ توجہ زدی جاسکی۔ اور وہ بدستور اول معبود کے تعلق رہی جہاں ہر قوم کا نمائندہ مذہبی تعلیم کے ساتھ کسی قدر فارسی زبان کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ البتہ پٹ شالہ اول میں ہندو یا مسلم پائیسے تجارتی سہولتوں کو مد نظر رکھ کر تفریری حساب اور یہی لکھتے رکھنے کے طریق سکھایا کرتے تھے اگرچہ جب کبھی تھوڑا مہربان ہونے تعلیمی معاملات میں دیکھی انظار کیا کرکھا جاسکتا ہے کہ ان کے انتظامی فرائض نے انہیں ۱۸۵۵ء تک بہت کم شریک کرنے کا قیودا مسلمانوں اور سکھوں کے راج میں رہی سرکاری زبان تھی جو تعلیم یافتہ شاخص اور سرکاری حکام کی زبان کلمات تھی جس کی تعلیم مکاتب فارسی خوان مدارس اور خالص فارسی مدارس بہم پہنچایا کرتے تھے اساتذہ عام پلویدہ مسلمان ہوتے تھے مجموعہ مند دیکھا جاتا تھا انہی سکولوں میں رغبت تام علم حاصل کرتے تھے لکھنا سکھایا جاتا تھا اور فارسی کی مشہور کتب خاصہ سرگستان ہستان برصانی جاتی تھیں ان سکولوں کے اخراجات معبودوں کی محنت اراضی کی آمدنی یا معبودوں کے دیگر ذرائع سے بہم پہنچتے تھے حکام وقت بھی سہولتی فرماتے رہتے تھے۔

سرگرنڈ اپنی تعلیمی رپورٹ سال ۱۸۵۶ء و ۱۸۶۵ء میں ذکر کرتے ہیں کہ ایسے مکاتب کے طلباء کا تعداد ۷۸۹۶۸۹ تھی سال ۱۸۶۵ء و ۱۸۶۹ء کی تعلیمی رپورٹ میں ان کا اندازہ ۵۳۲۰۰ لگایا گیا ہے۔ ڈاکٹر میٹزہ تعداد کم از کم ۶۰۱۶ بتاتے ہیں۔ سال ۱۸۶۲ء و ۱۸۸۳ء کے لفٹ گورنر صاحب بہادر کی رائے میں اس وقت ۱۰۹۰۰ طلبہ درس اور ۱۳۳۵ طلبہ زیر تعلیم تھے۔

بورڈ آف کنٹرول نے ابتدائی عمارتوں میں حکام ضلع اور انڈین سول سروس کے افسران سے توقع کی کہ وہ اپنے علاقہ کی تعلیمی سرپرستی کریں چونکہ ملک کے دیگر صوبہ جات کی نسبت پنجاب بہت بڑے سرکاری مقبوضات میں شامل ہوا تھا یہاں کی تعلیمی ترقی بھی ان کے مقابلہ میں بڑے ہوئی۔

فروری ۱۸۵۵ء میں اس بورڈ کی بجائے سچیف کمشنری قائم ہوئی۔ اور اس عرصہ میں تعلیم کا انچارج جو ڈپٹی کمشنر ہوتا تھا ضلع کے حکام موقوفہ بہت پر اسے تعلیمی اہلیت میں مشورہ کرتے تھے مگر ۱۸۵۵ء کے بعد یہ اختیارات صاحب نشل کمشنر کے سپرد ہوئے چونکہ تعلیم دینے کیلئے ذریعہ تعلیم زیادہ غور طلب تھا لہذا اقرار پایا کہ اردو زبان کو فارسی کا نظم تبدیل قرار دیا جائے اگرچہ بعض مقامات

میں اور دو کے ہمراہ فارسی کو بھی بدستور وقت دی گئی تھی مگر بالآخر ۱۹۵۵ء میں اردو تمام صوبہ کی سرکاری زبان قرار پائی۔ اور اس کی تعلیم کے ساتھ فارسی کی تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔

اس وقت کے مدارس موجودہ تقسیم بنقسیم تھے بلکہ ہر ضلع کے صدر مقام میں ایک اعلیٰ سکول "ضلع سکول" ہوا کرتا تھا۔ جہاں دیگر مضامین کی تعلیم کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ تحصیلوں کے صدر مقام کے مدارس تحصیلی مدارس کہلاتے تھے اور ابتدائی تعلیم کا کام دیتے تھے۔ گوان میں سے بعض مدارس میں انگریزی تعلیم بھی رائج تھی۔ سب سے پہلا گورنمنٹ سکول مسٹر ایڈورڈس سپرنٹنڈنٹ ریاستہائے کوہی نے شکر میں یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو کھولا۔ کرائل ایسٹ نے اسی سال ایک سکول ہوشیارپور میں جاری کیا۔ مسٹر ایڈورڈس نے مختلف مقامات پر تیسرا ضلع سکول کھولے جن میں ۲۱۳ طالب علم زیر تربیت تھے۔ اترسر کے پٹی کشن کی تجویز پر وہاں ایک گورنمنٹ سکول قرار پایا جس کے لئے سرکاری امداد پانچ سو سالانہ روکھی گئی۔ یہ سکول ۱۹۵۳ء میں کھلا۔ راولپنڈی شجرات شاہپور ملتان حلیم اور جالندھر میں بھی ضلع سکول کھولے گئے اور سال ۱۹۵۴ء کے اختتام تک صوبہ میں کل ۱۸ سرکاری سکول تھے تحصیل سکولوں کی تعداد ۴۴ تھی جو ابتدائی سکول کہلاتے تھے۔

۱۹۵۵ء کے بعد دہلی شمال مغربی صوبہ سے منسلک ہو کر پنجاب میں شامل ہوا۔ اس وقت تک دیسی کتب اور ہاتھ نشانہیں اپنا تعلیمی کام جاری رکھے رہیں۔ سکیم تعلیم صوبہ شمال مغربی (حال صوبجات متحدہ) اگر وہاں کی رائج تھی جس کے روسے اردو اور ہندی لکھنا پڑھنا حساب سات اور جغرافیہ سکھایا جاتا تھا۔ ان کے معانوں کیلئے وزیر مقرر تھے اور سب سے تعلیمی انسرورٹر جنرل کہلاتا تھا مگر صوبہ کوہی کی سکیم کو پنجاب کے موافق نہ پا کر ۱۹۵۳ء میں سندرجہ ذیل سکیم قرار پائی:-

۱۔ تحصیلوں کے صدر مقامات میں چار سکولوں کے اجرائی اجازت ہو اور مدرسین کی تربیت کیلئے چار نارمل سکول ہوں۔

۲۔ وزیر جنرل کے ساتھ ۱۲ ضلع وزیر اور ۵۰ پرگنہ وزیر مقرر ہوں۔

۳۔ لاہور میں ایک سنٹرل کالج جاری کیا جائے۔

لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کی طرح سکیم منظور ہو کر آئی اور ہدایت ہوئی کہ خزانہ عامو سے ایک لاکھ روپیہ کی امداد سرکاریا جائے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو اس وقت ہند کی حکمران تھی اس کے چارٹر کی تجدید کے ساتھ ڈائریکٹر ان کیمپنی انکسٹرکوشن ان انڈیا "کیلئے" کیلئے ان امداد کیلئے تعلیمی بینک چارٹا ۱۹۵۳ء کا جاتا ہے جس کے و سے مراعات ذیل روکھی گئیں:-

۱۔ صوبہ کے صدر مقام میں یونیورسٹی بنائی جائے۔

۲۔ تعلیم کا متحد محکمہ قائم کیا جائے۔

۳۔ مدارس میں اساتذہ کی بہرسائی کیلئے ٹریننگ انشٹیٹیویشنز قائم کی جائیں۔

۴۔ موجودہ سرکاری کالج اور ذاتی سکول قائم رہیں اور بشرط ضرورت دیگر سکول کھولے جائیں۔

۵۔ نئے ڈال سکول کھولے جائیں اور وزیر کے مدارس میں مکاتب پر پوری توجہ دی جائے۔

۶۔ پرائیویٹ صحاب کی فیاضی کی دادیتے ہوئے جوہ تعلیم کی اشاعت کیلئے رفاہیں امداد کے طریق مقرر کئے جائیں۔

تعلیم کی اشاعت کے لغرض من مقاصد سابقہ ہی قائم رکھے گئے اور عوام کی تعلیم کا ذریعہ وزیر کے قرار دیا گیا۔ اور نئے تعلیم کیلئے انگریزی کو ذریعہ تعلیم مانا گیا۔ اس میں سے پہلے وزیر کو تعلیم پر کافی غور نہ ہوتا تھا اگرچہ گھوڑیگر اور وزیر کے مدارس اب ایک ہی لائن پر آ گئے۔ کچھوں ہائی سکولوں اور مل سکولوں میں طائفہ دیئے جانے کا طریق عمل میں آیا۔ اور تعلیم نسواں کو بھی سرکاری تائید حاصل ہو گئی سرکاری تعلیمی اخراجات کا اندازہ تین لاکھ روپیہ سالانہ قرار دیا گیا۔

قدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد حکومت ختم ہو جانے اور ہندوستان کے براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آ جانے پر ۱۸۵۹ء میں وزیر فرما عطا ہوا ان دنوں فرہین اور سال ۱۸۶۰ء کے فرہین کے بعد مندرجہ ذیل انتظامات مستقل صورت میں عمل میں آ گئے۔

جنوری ۱۸۵۷ء میں سررشتہ تعلیم پنجاب کا وجود قرار دیا گیا اور ایک ڈاکٹر جنرل بشا ہر ۱۲ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔ انصران معائن کی ذیل میں نو روپن انپکٹر صاحب چھ سو روپیہ ماہانہ پر۔ دس ٹیچی انپکٹر صاحب ۸۰ سے ۱۵۰ روپیہ ماہانہ تک۔ ۷ اسٹ پیچی انپکٹر ۲۰ روپے سے ۶۰ روپے ماہوار کے مقرر ہوئے ڈپٹی انپکٹر اور سٹ پیچی انپکٹر بجائے ضلع وزیر اور پرنسپل کے تھے چونکہ ۱۸۵۷ء کے چارٹر میں ڈاکٹر انرل کمپنی کی صورت میں حدایت تھی کہ ڈاکٹر جنرل اور انپکٹر صاحب ہمارے سول سروس کے ممبران ہوں کریں۔ لہذا مسٹر رولڈ اسسٹنٹ کمشنر پنجاب جنوری ۱۸۵۷ء میں صوبہ کے پہلے ڈاکٹر سررشتہ تعلیم مقرر ہوئے ہر دیور میں انپکٹر صاحب تھے اور مغربی ملکہ کے کچھ پانچ قرار پائے۔ باقی عہدہ داران کیلئے صوبہ میں قابل آدمی نہ ملنے سے دیگر صوبجات سے آدمی منگائے گئے اور سررشتہ تعلیم جسکا فائنل کمشنر کے ماتحت رہا مگر غیر صوبہ جیکے انصران معائنہ ثابت نہ ہوئے پنجاب انہیں جواب دیا گیا کہ ان میں سے بعض قابل شخص کی خواہ پر اسی بکارہ گئے اور اب انصران معائنہ نام بجائے ڈپٹی انپکٹر اور سٹ پیچی انپکٹر ڈسٹرکٹ مقرر رکھا گیا۔ اور جس میں نہ ضلع میں ایک قابل انصران معائنہ مقرر کیا گیا جسے ضلع کے تعلیمی فنڈ سے تنخواہ ملتی تھی اور صاحب ڈاکٹر کو براہ راست گورنمنٹ پنجاب کے ماتحت رکھنا منظور ہوا۔

علاقہ دہلی کے پنجاب میں شامل ہونے پر ایک تیسرا دیور میں انپکٹر رکھا گیا اور سال ۱۸۶۲ء میں موجودہ سرحدی صوبہ کیلئے جو پنجاب ایک ضلع تھا انپکٹر مقرر ہوا جب کہ عہدہ مقام متنازعہ سال ۱۸۵۷ء تک یہ چاروں تعلیمی حلقے بدستور کام کرتے رہے مگر اس کی بنگلہ کیشن کی سفارش پر تمام دیور میں لوگ چارج لاہور سکرل انپکٹر کے ماتہ دیا گیا اور باقی سکرول کو اسکے کام کا کچھ حصہ دیا گیا ۱۸۶۳ء میں ہر سکرل کیلئے ایک مسند متنازعہ ڈپٹی انپکٹر بھی مقرر ہوا۔ اور ہر ضلع میں ایک ایک چیف سکول مقرر ہوا جسے ۷۰ سے ۷۵ روپے ملنے لگے۔ انک ضلع کے تعلیمی فنڈ سے تنخواہ ملتی تھی اگرچہ فیصد ملازم ثابت ہوئے گریسے و ممداری کے عہدہ کیلئے انکی پولیشن موزون نہیں لہذا سال ۱۸۶۷ء سے ایف انٹر سکرل انپکٹر صاحب کی تنخواہ ۷۵ روپیہ ماہوار اور اس کے زیادہ تھی تبدیل ہونے میں نہیں ۱۸۷۰ء میں صوبہ کے تعلیمی فنڈ سے تنخواہ ملنے لگی سال ۱۸۷۰ء تک صوبہ میں ۱۳ ڈسٹرکٹ انپکٹر اور ایک ڈسٹرکٹ انپکٹر اور ۶ چیف سکول مقرر تھے نئی سکیم کے مطابق ۲۰ ڈسٹرکٹ انپکٹر ایک ڈسٹرکٹ انپکٹر اور ۱۰ چیف سکول مقرر ہوئے ورنہ انکی تنخواہوں میں ایذا دی رد رکھی گئی۔

تعلیم جو اب تک صرف فنی اخراجات کی پیش کو موٹا رکھتے ہوئے صرفت نہ رہی اور فیس کا وصول کیا جانے لگا اور رکھا گیا۔ کاشنکار لوگ اس سے مستثنیٰ تھے کیونکہ تعلیمی اخراجات میں وہ مالگداری کے ساتھ ایک خاص فیصدی حصہ دیا کرتے تھے۔

پرائمری تعلیم میں پرنسپل کی مشینوں اور لوکل باڈیز کے ماتحت ہونی اور سیکنڈری تعلیم کے خراجات سرکاری روپیہ سے ادا ہونے لگے۔ اس کی موجودہ تقسیم دینی، مل، دہرائی سال ۱۹۶۸ء سے قائم ہوئی ابتدائی سکولوں میں جماعتوں کی تعداد آٹھ سے گھٹا کر چار کر دی گئی اور ۱۹۷۰ء سے پانچ خوانان۔ لوئر پرائمری اور اپر پرائمری کے معیار کی کامیابی لازمی قرار دی گئی۔ گیارہ سال کے عرصہ میں خاصی ترقی ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں گورنمنٹ پرائمری سکولوں کی تعداد ۱۴۸۳ اور زیر تربیت طلباء کی تعداد ۷۱۹۵۰ تھی۔ مادی سکولوں کی تعداد ۱۲۶۹ اور تعداد طلباء ۹۷۴۲ تھی۔ یونیورسٹی صوبہ میں نہ ہونے کی وجہ سے طلباء انٹر نل امتحان کلکتہ یونیورسٹی کا دیتے تھے۔ اور اعلیٰ امتحانات بھی وہیں دیتے تھے۔

سال ۱۹۷۳ء میں ۲۰۳۰ امیڈاران نے انٹر نل امتحان پاس کیا۔ سکولوں کے ساتھ پورڈنگ ٹوٹل کس طریق بھی سال ۱۹۷۰ء سے عمل میں آیا۔ یکم جنوری ۱۹۶۲ء سے لاہور گورنمنٹ کالج جاری ہوا جبکہ لاہور میں ایک دل زبرد گورنمنٹ ہائی سکول ۱۹۷۰ء میں قائم ہوا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ہی ایک کالج دہلی میں لایا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ہیوسٹ کرایا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کالج لاہور بنائے مشرقی کی تعلیم واشاعت کیلئے سال ۱۹۷۰ء میں کھولا گیا۔

ڈاکٹر لیتھ (DR. LETH) گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل کی کوششوں ایک سائنسی بنام انجمن پنجاب قائم ہوئی جس نے کلکتہ یونیورسٹی کو زبائے مشرق کی اشاعت کے سانی پاکستان پنجاب یونیورسٹی قائم کئے جانے کی تجاویز پر زور دیا۔ صاحب ڈاکٹر بھٹا نے بھی ممبران انجمن سے اتفاق رائے کر کے انکی پروپوزیشن کی مگر ڈاکٹر ہند نے یونیورسٹی کے نفاذ کی بجائے پنجاب یونیورسٹی کالج کے اجرا کی اجازت دی۔ آخر ایک سال کے رو سے یونیورسٹی پنجاب قائم ہوئی جسے ڈائریکٹر اور آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے دینے کا حق حاصل ہوا۔ نواب گورنر جنرل ہند نے قانون۔ میڈیکل۔ سائنس اور انجینئرنگ کی ڈگریاں عطا کرنے کا بھی اسے حق عطا کیا۔

نارمل سکولز۔ سال ۱۹۵۶ء میں لاہور اور راولپنڈی نارمل سکول کھولے گئے۔ ایک سال بعد دہلی نارمل سکول موجود آیا۔ پانچ اور نارمل سکول بھی ۱۹۷۰ء تک کھولے گئے۔ مگر اخیر میں پہلے تینوں سکولوں میں ہیوسٹ کمریے گئے۔ کرسچن ڈیپارٹمنٹ تعلیمی سوانحی نے امر میں ایک مادی سکول کھولا۔ ان سکولوں کا تعلیمی کورس شروع میں چھ ماہ ہوا کرتا تھا ہر دس برس سے سال بعض دس برس کے دوبارہ بلایا جاتا تھا مگر بالآخر مادی تعلیمی تین سال قرار دی گئی۔ پہلے دو سال کی تعلیم کے بعد جو زیر تربیت تھے وہ تیس سال کی تعلیم کے بعد میٹروپولیٹن ڈاکٹر تھی۔

سال ۱۹۶۹ء میں ٹیٹل سکول امتحان ہی ہوا اور مل پاس امیڈاران سکول میں جانے لگے۔ ان سکولوں میں تمام امیڈاران کے وظائف لگاتے تھے۔ سال ۱۹۷۰ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور جاری ہوا جس کے پہلے پرنسپل آرٹس کے صاحب ہار تھے۔ اس کالج میں ٹیٹل سکولوں کے ڈیپارٹمنٹ میں ملے ایس ڈی اور پرائمری ڈیٹل کلاسوں کی انگریزی تعلیم کیلئے جے۔ ایس ڈی اور ڈیٹل کلاسوں کی تعلیم کیلئے ایس۔ ایس ڈی کلاسیں کھولی گئیں۔ گورنمنٹ بکٹ پو کتب خانہ جہاں ہر سال ۷۵ کے شروع میں قائم ہوا۔ یہ کتب خانہ صاحب ڈاکٹر سر شریہ تعلیم کے تحت قائم کرنا تھا جس پر سر سے دس ہزار روپیہ دی گئی۔ اس کا ایک تعلیمی مطبع قائم تھا جو سرکاری اخبار کی طباعت کے علاوہ ڈیپارٹمنٹ بھی تیار کرتا تھا۔ چند سال بعد بکٹ پو اپنے اخراجات کا خود مسئلہ ہو گیا اور سال ۱۹۷۰ء میں بکٹ پو کام کرنے لگا۔ سال ۱۹۷۰ء میں اس کی بجائے پنجاب میونسپلٹی بک کمیٹی کا وجود ظہور میں آیا۔

اب سررشتہ تعلیم پنجاب اس قابل ہو چکا تھا کہ اپنی سماعی جیل کو دیگر شعبوں میں بھی پھیلاتے چنانچہ سال ۱۹۳۵ء میں ریڈیکل سکول لاہور جاری ہوا اب اسسٹنٹ مہرجن اور اسپنٹل اسسٹنٹ کلاسیں کے ترتیب پانچ اور تین سال انگریزی اور اردو ذریعہ تعلیم کے طبقات سے بہرہ ور ہوتی رہیں جیل سکول - انڈسٹریل سکول چیفس کالج وغیرہ بھی جاری ہوئے مسلمانوں اور دیگر پسماندہ قوم کی تعلیم غامض ہوئی۔ انڈین ایجوکیشن کمیشن ۱۹۲۲ء کی بعض سفارشات : ۱۔ یہی حکمت اور پانچ سالہ لاول کو برقرار رکھ کر یونیورسٹی میں داخلہ اور لعل باڈی کو نئے مدارس کھولنے کی ہدایت ہوئی۔ پرائمری تعلیم وریکریٹس کی جانی قرار پائی اور سیکنڈری ایجوکیشن کے اخراجات سرکاری مصارف سے دیئے جانے لگے تعلیم نسواں پڑش اور پیش قدمی جانے۔ اور ان کے مضامین نسبت لڑکوں کے آسان ہوں سنا مذہب نوزل سکول کھولے جائیں بیشتر یونیورسٹی ایجوکیشن جو کام جاری کیا ہوا ہے اس میں ان کی سہولتی فکر معقول مدد دی جائے تعلیم نسواں کے مسئلہ کا انتخاب سمیٹت انپیکٹس وغیرہ مناسب خیال کیا گیا فیس میں بتدریج کمی کی جائے تاکہ تعلیم کے انفران کی ہر سال سٹی میں ایڈڈ اور ان ایڈڈ سکولوں کے نیچر صحاب کے ساتھ کاٹھن ہو کرے ماتحت انفران معائنہ کے پراسپیکٹس بہتر بنائے گئے اخلاقی اور جسمانی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جائے چیفس مسلمانوں اور راجھوت اقوام کی تعلیم میں شریں زینش و پھیپی کی جانے انفران معائنہ کی حالت دیکھ سیکٹس پر غور ہوا اور اسسٹنٹ انپیکٹر صحاب کی تعداد سات قرار دی گئی شلہ اور کوٹ کے ضلع کے بغیر باقی تمام ضلعوں میں ایک ایک سٹرکٹ انپیکٹر مقرر ہوا۔

دوسرے انٹرکٹر شریہ تعلیم سیر فلر صاحب بدور تھے ان کے جانشین کرنل ڈبلیو آر ایم ڈبلیو ایڈ صاحب بدور کے عہد میں ہوئے ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا چنانچہ مرحوم مولانا آزاد دہلوی مولانا حالی پانی پتی وغیرہ نامی شعرا کے کئی اس وقت کے کرائے اردو کورسوں میں موجود ہیں یہی کتب نئی شکل و صورت میں شائع ہوئیں تعلیمی سکیم کے ساتھ ضابطہ تعلیم پنجاب وجود میں آ گیا۔ آپ کے بعد ڈاکٹر جے سٹام صاحب بدور کے عہد میں سررشتہ اور تعلیم کا کام بتدریج ترقی پذیر رہا۔ آخر قمر مسٹر ڈبلیو بیل کے نام پڑا جنہوں نے ہر ضلع میں ایک ایک گورنٹ ہائی سکول نہایت وسیع پیمانے پر کھولا۔ ماتحت تعلیمی سکیم کی ترمیم کے بعد اسے نئے گریڈوں اور نئی صورت میں شائع کیا اور آبکاری وزارت اس قابل ہو گئی کہ پرائمری سکولوں کے بستر بھی جانے انفران معائنہ کی ذیل میں آئے۔ ڈی۔ آئی صحاب وجود و نفعہ مشہور پرایم سر میں ایک سٹیا انپیکٹر سرکار قائم ہوا جو آخر میں بند کیا گیا اور وہاں کے انپیکٹر سر جے جی کاٹھ کے آپ کے جانشین قرار پائے یہ ریزرو گورنر معنی پسند اور کفایت شری کے دلدادہ تھے اس واسطے سررشتہ کے ماتحت تعلیمی مقدمہ میں کوئی خاص تفریق تبدیل رونما نہ ہوا۔ آپ کی سیکرٹری سر جے جی سرحدی صاحبہ تبدیل ہو کر پنجاب سررشتہ تعلیم کے ڈائریکٹر بن گئے آپ کے عہد کی یادگار موجودہ چار جاموں کے پرائمری سکول ہیں جو پرائمری تعلیم پنجاب جماعت شروع ہوئی اور ریجنل مشرقی کالج انگریزی سکولوں میں جماعت نہم سے قرار دیا گیا تا سب تقسیم ڈیپارٹمنٹ (پرائمری سکول) سکول۔ ڈیڑھ مل جماعت پنجم و ششم، اہل راجھوت پنجم و ششم، انڈیڈ سکولوں میں جماعت نہم و دہم، سر جے جی کے پکیشنل سکولوں میں جماعت انڈیا ہو جانے پر کرنل ڈبلیو رایت صاحب بدور کا حکم اور مالہ مستحق دار سرکار نے جن کے عہد میں پرائمری تعلیم کا آغاز ہوا۔ اسے ڈی ایچ صاحب کی تعداد پرائمری سکولوں کے اضافہ کی وجہ سے بڑھائی گئی۔

اچکے عہد کے بعد سر شمسہ تعلیم پنجاب گزشتہ پنجاب (وزارت تعلیم) کے ماتحت منتقلہ محکمہ کی صورت میں تبدیل ہوا۔
 سر حاجی اینڈرن بہادر بالاقاب موجودہ ڈائریکٹر اس عہد کی مستقل یادگار ہیں۔ انریبل سریاں فضل حسین صاحب تعلیم سہی کو نسل کا پورا
 عرصہ سر شمسہ تعلیم کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ آپ نے ہر سائنہ اقوام کے حقوق کو فروغ دینے اور انہیں محکمہ تعلیم میں اچھی حصہ دلانے پر
 توجہ دی اور ملازمت میں حتیٰ کہ ٹریننگ کالج اور کئی دیگر پروفیشنل کالجوں کے اعلیٰ ترین تہاں کو روا رکھا گیا۔ اس حالت میں قریباً ساڑھے پچیس
 چوبیس اقوام کی قصبہ حق تلفی ہو رہی تھی۔ تناسک کے پورا کرنے کیلئے جو غیر عمدہ اداروں کو سینئر اسامیاں دی گئیں، امداد کے وہیں بھی جو پرائیویٹ
 باڈیز کو ملا کر تھا اس تہاں سب کے گڑبڑ گئی۔ کو نسل کی دوسری ٹرم میں انریبل سریاں صاحب صوفیہ دوبارہ تعلیم دینے کو فریضہ کا فرائض میں
 تشریف لیجئے۔ پراپکے قائم مقام سر شیخ عبدالقادر صاحب مال بیج لائیکورٹ چھوٹے بعد میں میاں صاحب کے ریونیو ممبر بننے پر لے صاحب
 چودھری چھوٹو رام جی وزیر تعلیم چھوٹے تیسری ٹرم میں وزارت تعلیم کا قلمدان انریبل مسٹر منوہر لال کے سپرد ہوا اور اب چوتھی ٹرم میں
 وزارت انریبل ملک فیروز خان صاحب فون ایم اے سے سر شمسہ لال کے ہاتھوں میں دی گئی ہے۔
 دوسری ٹرم میں سر حاجی اینڈرن کے خدمت پر جانے کے وقت سر شمسہ لال نے قلمدان ڈائریکٹر شمسہ لال اور تیسری ٹرم میں دوبارہ سر
 آرشدین نے قلمدان ڈائریکٹر شمسہ لال کے فرائض سرانجام دئے۔

سر حاجی کے عہد ڈائریکٹر شمسہ لال کی حالت اور عہد کی کو ملحوظ رکھا گیا۔ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج منصفیات میں قائم کئے گئے گورنمنٹ سکولوں
 کا جال صوبہ میں ہر جگہ پھیلا دیا گیا۔ پست اور اچھوت اقوام کی تعلیم میں خاص دلچسپی لی گئی اب نگران معائنہ کی ذیل میں ہر تحصیل میں ایک ایک
 اے۔ ڈی۔ آئی صاحب مقرر ہیں جنکے دفتر کا کام لکچرری مقرر سرانجام دیتا ہے جس طرح اس سسٹم ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب کے علاوہ ایک ایک
 پرنسپل اسسٹنٹ مقرر ہے۔ ڈویژنل انسپکٹر صاحب پہلے و امدا اچھوت ڈویژن قصبہ پھر انکے خاص خاص شعبہ جات کے اسسٹنٹ مقرر کئے
 گئے۔ اب ہر ڈویژن میں دو اور باقی ڈویژنوں میں ایک ایک پٹی انسپکٹر صاحب ہیں۔ ذریعہ سکولوں کو عام طور پر مقامی ہائی سکولوں کے ساتھ
 پیوست کر کے ایک قابل پرنسپل صاحب کے ماتحت کر دیا گیا ہے اور خاص خاص ہائی سکولوں میں ایس ڈی فوٹس تعلیم حاصل کر کے گورنمنٹ مائرس
 کی ہیڈ ماسٹری کیلئے تیار ہو رہے ہیں۔ پچھلے سال سے ایس ڈی کا کورس مستقل طور پر دو سالہ کر دیا گیا ہے۔ سرنل ٹریننگ کالج میں بی بی
 اور ایس اے دی کلاس کے علاوہ انڈینل نیچرل کی ٹریننگ کلاس میں بی بی لازمی تعلیم کا صفحہ نسبتاً بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اور
 تعلیم ہاتھ لگھی شروع کر رکھا ہے تعلیم سواں کیلئے دو کالج اور کئی ہائی سکول اندر نل سکول کھولے گئے ہیں۔

موجودہ سر شمسہ تعلیم کی صورت یہ ہے

- ۱۔ انریبل ملک فیروز خان صاحب بالاقاب وزیر تعلیم۔
- ۲۔ سر حاجی اینڈرن صاحب بہادر ڈائریکٹر سر شمسہ تعلیم پنجاب۔
- ۳۔ سر شمسہ رینل بی بی ایڈم اسسٹنٹ ڈائریکٹر سر شمسہ تعلیم پنجاب۔
- ۴۔ سر آرشدین صاحب بہادر ایس ڈی انسپکٹر ٹریننگ انشٹی ٹیوٹ سر شمسہ پنجاب۔
- ۵۔ خان بہادر سید بولش صاحب بی۔ آئی ایس ڈی انسپکٹر سکولوں میں۔
- ۶۔ لالہ شام چند صاحب بی ایس سی رپورٹر اعلیٰ کمر سر شمسہ۔
- ۷۔ لالہ شمسہ لال صاحبہ بی بی ایس ڈی انسپکٹر اعلیٰ کمر سر شمسہ۔

لاہور ڈویژن

- ۱۔ خان بہادر شیخ نور الہی صاحب ایم اے آئی ایس ٹی انیکپٹر دھارس
۲۔ شیخ محمد ظہور الدین صاحب بی اے آئی ایس ٹی " "
۳۔ شیخ محمد صاحب بی اے بی ٹی ڈسٹرکٹ " منیع اترسر
۴۔ شیخ محمد نور احمد صاحب بی اے پی ایس " سیالکوٹ
۵۔ شیخ غلام حسین صاحب بی اے بی ٹی " شیخ پورہ
۶۔ سردار تارا سنگھ صاحب ایم اے پی ایس ٹی انیکپٹر دھارس
۷۔ باوا برکت سنگھ صاحب بی اے " ڈسٹرکٹ " ضلع لاہور
۸۔ شیخ بیچم بخش صاحب بی اے " " گوردھپور
۹۔ لالہ عیادارام صاحب بی اے " " گوجرانولہ

جالدھر ڈویژن

- ۱۔ مسٹر من موہن ایم پی ای ایس انسپکٹر مدارس
۲۔ مسٹر جی ایم پی ای ایس انسپکٹر مدرسہ
۳۔ مسٹر جی ایم پی ای ایس انسپکٹر مدرسہ
۴۔ مسٹر جی ایم پی ای ایس انسپکٹر مدرسہ
۵۔ مسٹر جی ایم پی ای ایس انسپکٹر مدرسہ
۶۔ مسٹر جی ایم پی ای ایس انسپکٹر مدرسہ

انبالہ ویشن

- ۱۔ مشرعی لیج کون ایم اے انسپکٹر مدارس (رضی)
- ۲۔ سینڈ پرائز تحفائی لے پی ایس فاقم ڈپٹی انسپکٹر مدارس
- ۵۔ چودھری ان تہ صاحبہ ایم اے ڈسٹرکٹ انسپکٹر کمرال
- ۷۔ ٹھاکر دانا نند سنگھ صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گورکھ پور
- ۹۔ چودھری محمد ولال صاحب بی اے بی ڈسٹرکٹ انسپکٹر شملہ
- ۲۔ سزاد دیو سنگھ صاحب ایم پی ای این فاقم انسپکٹر مدارس
- ۳۔ لالہ پربھ دیال صاحب بی اے بی ڈسٹرکٹ و اہنالہ
- ۶۔ پیرزادہ محمد نواز صاحب بی اے ڈسٹرکٹ انسپکٹر حصار
- ۸۔ لالہ رام سروپ صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدرسن ہنگ

اولینڈی ڈویژن

- ۱۔ اے بہادر شاہ تمام ایم آئی ای میں انیکٹر مدارس (درستی)
۲۔ لجنہ اللہ کے صاحب بی بی ای ایس میں انیکٹر مدارس
۳۔ پھر محمد یعقوب شاہ تمام ایم پی ای ایس میں انیکٹر مدارس
۴۔ انصاف لارڈ تیل ل ایم پی ای ایس تمام انیکٹر مدارس
۵۔ سرکار کرم گھمستابی سے بی بی پی ای ایس میں انیکٹر مدارس
۶۔ لالہ جمال مسند چوہدرہ بی بی ای ایس ، انیکٹر مدارس

- ۷۔ ملک غلام رسول صاحب شوق ایم اے پی ای ایس ٹرک انپکٹر شاہ پور
۸۔ چودھری غلام علی صاحب بی اے بی ٹی پی ای ٹی ٹرک انپکٹر میانوالی
۹۔ مینتی احمد سعید صاحب بی اے پی ای ایس ٹرک انپکٹر پٹی

ملتان ڈسٹرکٹ

- ۱۔ جناب شیخ عبد الحمید مفتاح ایم اے پی ای ایس ٹرک انپکٹر مدارس
۲۔ لالہ اندر جان صاحب بی اے بی ٹی پی ای ٹی ٹرک انپکٹر مدارس
۳۔ لالہ راجہ محمد صاحب بی اے ڈسٹرکٹ انپکٹر ملتان
۴۔ چودھری شہزاد عالم صاحب ایم اے ڈسٹرکٹ، مظفر گڑھ
۵۔ چودھری غلام حسین صاحب بی اے ڈسٹرکٹ، ڈیر غازی خان
۶۔ مولوی محمود حسن صاحب بی اے ڈسٹرکٹ، جھنگ
۷۔ محمد حسین صاحب ڈسٹرکٹ، لاہور
۸۔ چودھری احمد حسن صاحب ایم اے ڈسٹرکٹ، منٹگمری

معنیٰ یہ ہے کہ سر جارج کے عہد میں تعلیمی اسایوں کی تقسیم اس طرح ہر دو راجھی گئی تھی۔
جس میں سٹریچی کے عہد میں سب سے پہلے سردار بہادر سردار ہری سنگھ صاحب
انڈین ایجوکیشنل سروس سابق انپکٹر ملتان کو ترقی دی گئی تھی۔ کرنیل رائٹ کے عہد میں ایک دہندہ ستانی
اور سر جارج کے عہد میں اس سروس میں چند ممتاز دہندہ ستانی بزرگوار ترقی پذیر ہوئے۔
۲۵۰-۲۵-۵۰۰-۲۵-۴۰۰
پروانشل ایجوکیشنل سروس { انتخابی گریڈ ۶۵-۳۰-۸۰۰

سارڈنی نیٹ { اسٹیکوڈریکٹیشن ۲۵۰-۱۰-۲۰۰-۱۲۰-۱۰-۱۹۰-۵۵-۳-۷۰
ایجوکیشنل سروس { ڈریکٹیشن ۱۱۰-۵-۱۳۵-۸۰-۴-۱۰۰-۲۵-۲-۷۰-۲۵۰-۷۰
آخری ملازمت کے لئے پروفیسر راجی رام صاحب ساہنی نے سر جارج کے عہد میں کونسل میں ٹائم کیل کا
سلسلہ چھیڑا۔ مگر اس ملازمت کی بدقسمتی سے یہ کیل منظور نہ ہو سکا۔ حالانکہ محکمہ تعلیم کے کلرکل سٹاف کو بھی ٹائم کیل
کے مفاد سے بہرہ ور کیا ہوا ہے۔ کاش کہ سر جارج اور آرنیل ملک صاحب اپنے عہد کی یادگار میں اس تعلیمی
ملازمت کو ٹائم کیل کے طریق سے مالا مال کر کے ان کی دعائیں حاصل کر سکیں۔

(سجدہ ۱۱)



دولتِ علم

اذا افتخار الشراعتی ما راج بہادر صاحب ق دہلوی بی اے مصنف مطلع الانوار

دولتِ علم سے بہتر نہیں دولتِ کوئی اس کے پتے کی نہیں دہریں ثروتِ کوئی
کسبِ تعلیم سے افضل نہیں حشمتِ کوئی اس سے بڑھ کر نہیں سرمایہٴ راحتِ کوئی

یہ وہ دولت ہے لٹانے سے سوا ہوتی ہے

یہ نگین وہ ہے کہ صیقل سے جلا ہوتی ہے

یہ وہ ثروت ہے کہ رہزن کا نہیں جس کو خطر یہ ہے وہ گنج کہ ہے رشکِ دکانِ گھر

نزوال آتا ہے اس شے کو نہ لگتی ہے نظر نفع ہی نفع ہے اس میں نہ زیاں ہے نہ ضرر

بارِ خاطر نہیں۔ یہ جان کا جغجال نہیں

سات تالوں میں ہے بند یہ وہ مال نہیں

یہ وہ دولت ہے کہ نادار ہے جس سے زردار یہ ہے وہ چیز کہ کر دیتی ہے قسمتِ بیدار

یہ ہے وہ مال کہ جس پر زرد دنیا ہے نثار یہ وہ شے ہے کبھی ہوتی نہیں جس بے کار

بطنِ مادر سے کسی کے نہ یہ ساتھ آتی ہے

یہ وہ دولت ہے کہ تحصیل سے ملتا آتی ہے

ادب اخلاق



فہرست مضامین

۳۸۹	حضرت قاضی مرحوم
۳۸۸	نہایتی
۳۸۷	مومنی محمد نون صاحب قاضی
۳۸۶	باب پنجم فی
۳۸۵	پر دفعہ محمد بن صاحب قاضی مرحوم
۳۸۴	سیّد علی صاحب قاضی شیخ الفضل
۳۸۳	کتاب الشفاء علیہ السلام
۳۸۲	ابو نعیم حضرت خواجہ انصاری نقی
۳۸۱	شہر مشہور احمد علی صاحب قاضی
۳۸۰	شہر خورشید سن صاحب بی بی بی
۳۷۹	تین محمد امین صاحب پانی پتی
۳۷۸	بی بی شہداس صاحب بی بی امی بی بی
۳۷۷	باب ہشتم فی
۳۷۶	خواجہ محمد عبدالنون صاحب عشرت گنوی
۳۷۵	صیاد الملک حضرت طار موزی
۳۷۴	سید غفر علی صاحب نقوی بی بی

(ب)



(ا)



فہرست مضامین

۲۸۹	مولوی عبدالعزیز صاحب ایم لے	حضرت داغ مرحوم
۳۰۲	منشی دیانوش صاحب اکرمی لے	کامیابی
۳۰۶	جناب جوش ملیانی	مولوی محمد نوح صاحب نوح
۳۲۶	پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم لے	نیک بدمی
۳۴۱	سید دل محمد صاحب نقض منشی ناصر	آب حیات
۳۵۳	تاج الشعراء حضرت نوح ماروی	ارمغان عزیز
۳۶۲	معاونت حضرت خواجہ حسن نظامی بوی	رام گلی
۳۶۴	مستر منصور احمد ایڈیٹر بھاپیں	بچے اپنے بڑوں سے
۳۰۵	مستر خورشید حسن صاحب بی لے بنی ٹی	میری حماقتیں
۳۸۰	شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی	اخلاق و موعظت
۳۸۲	بھائی اشدیس صاحب کریم لے پی ایس	شری بڑکے
۳۸۶	جناب جوش ملیانی	تغییل کے کرشمے
۳۹۱	خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکنوی	صرف و نحواردو
۳۹۶	ضیاء الملک حضرت طار موزی	تعلیم و تہذیب
۴۰۵	سید غضنفر علی صاحب تقوی بی لے	تحت مقدم ہے یا تہذیب؟

رباعیات

(از ابوالفضل رازچاند پوری)

(۳)
بہ جو جب ناز جان فوازی تیری
بے لائق شک کار سازی تیری
ماہر بندوں چا اور اتنی شفقت
گو بار جستے بنیابی تیری

(۴)
گمراہ کو راہ پر لگا دیت ہے
سیدھا رشتہ اسے دکھا دیت ہے
مومن کا فتنہ کچھ نہیں ہے
ہر ایک کی بات تو بنادیت ہے

(۱)
نہال کجک آئینہ سب کی کیا
ہر چیز کو جو سب سامان کی کیا
سنا کر نہ فرماں دکان کی کیا
رشتہ کا نقطہ ہے سب اس کی کیا

(۲)
طاہر توبہ بنایا شجہ کو
باقی میں جاں نوازیا شجہ کو
برکات میں تیرا دست قدرت کی کیا
ہر حال میں کارسازیا شجہ کو



صافى صافى قالى صافى طالبى نى ۱ - ۱
ايل مى چووال



سید دل محمد حقنا - بالذہری - نیشی ڈال

سید دل محمد حقنا - بالذہری - نیشی ڈال



فتح الملک نواب مرزا داغ مراد علی



ملک الشعراء مولانا غلام قادر کو اسی مراد

داغ مرحوم

ہمارے محکم و محترم جناب مولوی عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے۔ نے اس سے پیشتر بھی ایک مبسوط مضمون مولانا حالی اور ان کی شاعری سے متعلق لکھ کر اپنی ادب فزاری کا ثبوت دیا تھا۔ یہ مضمون رسالہ ہذا کی کسی سہ ماہی اشاعت میں ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ اب جناب مصوف نے حضرت داغ مرحوم کی شاعری پر ایک اجمالی تبصرہ تحریر فرمایا ہے۔ اس مضمون کی جدت ادا اور سلجھا ہوا انداز بیان ان کے مذاق صحیح کا نمایاں ثبوت ہے۔ رہنمائے تعلیم ان کی اس عنایت کا دل سے شکوہ گزار ہے۔ ناظرین اس مضمون کو پڑھیں اور لطف اٹھائیں۔

{ جوش ملیانی

فدر سے چند ایک برس پہلے دہلی میں نواب غلام مصطفیٰ خاں شیفہ کے ہاں ایک مشاعرہ ہوا جس میں حسب معمول مرزا اسد اللہ خاں غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مفتی صدر الدین خاں آردو، حکیم آغا جان صاحب عیش غلام علی خاں صاحب محنت، عیسے قادر الکلام شعرا، شریف لائے۔ ان کے علاوہ مرزا زین الدین خاں صاحب عارف، سید حسین الدین صاحب عین، حافظ قطب الدین صاحب شیر، مرزا رحیم الدین صاحب حیا، میر مہدی حسین، مجروح، سید ظہیر الدین صاحب ظہیر، اور ان کے برادر خورد و سید شجاع الدین صاحب عرف، امر و مرزا انور، مرزا قربان بیگ صاحب سلک، مولانا امام بخش صاحب مہربانی، مرزا پیارے صاحب شہرت، مرزا قاسم بخش صاحب، میان، خدا بخش صاحب تنویر، غلام احمد صاحب تصویر، عبدالقادر صاحب توقیر، آغا مرزا صاحب درخورد، داغ المتخلص بہ شامل بھی موجود تھے۔ ان میں سے بعض نوجوان اور بعض ضعیف پیری کو پہنچ چکے تھے جو بغیر ابھی تک صغیر سن تھے۔ دہلی کے فضلا و شرفا کا نواب صاحب کے مکان میں مجمع تھا چھوٹے موٹے شعرا کی غزلیں ہو چکیں تو شیخ ایک نوخیز جوان کے سامنے لائی گئی جبکہ چہرہ پر بدن چوڑے پائٹھے واسے پا جائے اور انگریز کے میں خوب سج رہا تھا۔ سر پہ چار گوشہ سرخ مغل کی مٹلا محمد شاہی ٹوپی تھی۔ یہاں قد نہایت ملبوع، طبع چہرہ پھکیلی، آنکھیں حرکات و سکنات سے جلد پلن پٹکتا تھا۔ اس وقت کوئی بارہ تیرہ کا سن تھا۔ شعر عرض ہے کہ کہ بے تکلف غزل پڑھنی شروع کی۔

شہر و برق نہیں شعلہ و سیلاب نہیں کس لئے پھر یہ تھہرنا دل قیاب نہیں
شعر پڑھنا خاک و واہ واہ، احفست و اند کیا شعر ہے، یہ عمر ابدی صفائی، خوب تلم توڑ دیا خوب مذاق

پایا ہے، کاشور بر پا ہو گیا۔ شعروں میں زبان کی چاشنی اور ننگی تو تھی ہی مگر پڑھنے والے کے رنگ و صباغ نے ان میں اور جان ڈال دی۔ آواز تھی کہ اتار چڑھاؤ کے اقتدار سے فضا سے ہوائی میں تھر تھراتی ہوئی دلوں میں بیٹھ جاتی۔ اور اس پر لطف یہ کہ نہ تو لکچھڑے پھولتے اور نہ رگیں تنٹیں۔ ہاتھوں کے اشاروں تک سے بھی کام نہ لیتے۔ مومن خاں نے پہلے بالوں کو سنوارا اور آغا جان عیش کے کان میں کہہ سنا کہ آہستہ سے کچھ کہا اور پھر دونوں نے سر ہلایا۔ مرزا غالب نے ایک شعر دوبارہ پڑھوایا۔ استاد ذوق چپکے بیٹھے رہے۔ مرزا اور واہ و امیں غزل ختم ہوئی۔ مولانا صبیحی اور نواب غلام مصطفیٰ خان صاحب نے مزید تعریف کی جواب میں مرزا داغ نے انداز سے تسلیات عرض کی اور چپکے ہو بیٹھے +

(۲۱)

بلبل چنستان فصاحت و مصلحت سبیلستان بلاغت شہسوار عرصہ معنی پروری گوہر شب چراغ تاج مخدوری طوطی ہندوستان نواب مرزا خاں دلرخ دہلوی ناظم یار جنگ بیرالد و الفیض الملک بہادر مرحوم مغفور تبارتخ ۱۲۔ ذی الحجہ ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء و ۱۲۔ ستمبر ۱۸۸۸ء بمقام شاہجہان آباد دہلی محمد علیا دارا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نواب شمس الدین خاں نواب ضیاء الدین خاں ولئے لوہارو کے بھائی تھے۔ بد قسمتی سے ۱۲۵۲ھ میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت نواب مرزا خاں کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کی والدہ نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخر و خلعت بہادر شاہ سے نکاح کر لیا اور حرم میں داخل ہو کر شوکت محل کا خطاب پایا۔ نواب مرزا خاں بھی والدہ کے ساتھ قلعہ علی میں داخل ہوئے اور وہاں کے علوم و فنون سے مستفید ہونے اور شعر و سخن کے چرچوں کے دیکھنے کا انہیں بہترین موقع ہاتھ لگا چنانچہ ادھر تحصیل علوم کے لئے مولوی سید احمد حسین صاحب کے شاگرد ہوئے اور سید امیر بخش دہلوی سے خوشنویسی میں استعداد حاصل کی اور فنون مثل شہسوار سی پیر گری، پھیلتی، بانک علی مذ و غیرہ کی تکمیل کی بہادر شاہ نے طبع موزون دیکھ کر آپ کو ذوق کا شاگرد کر دیا۔ اسی طرح عمر بڑے چہین اور خوشحالی سے گذرا کہ ۱۲۵۷ھ میں شہزادے کا انتقال ہو گیا اور ۱۲۵۶ھ میں قدر کی آفت ناگہانی نازل ہوئی اور جان و مال کے علاوہ لوگوں کی عزت و ناموس خطرے میں پڑ گئی۔ اس وقت داغ کی عمر صرف ۲۴ برس کی تھی۔ اس زمانے میں ریاست رامپور امت زدگان قدر کے لئے مجا و ما و ابنی ہوئی تھی۔ نواب یوسف علی خاں صاحب والے ریاست نہ صرف عالم اور علم دوست تھے بلکہ نہایت عادل اور بہرہ بان فرمانروا تھے ان کے خوان نعمت سے ہزاروں آشفتہ حال پرورش پاتے تھے۔ داغ بھی مع تمام اہل و عیال وہاں پہنچے ان کی وہاں بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ نواب صاحب کے بعد ان کے جانشین نواب کسب علی خاں

مرحوم نے بھی بڑی خاطر و مدارات کی۔ ریاست میں انہیں ایک ذمہ دار سامی بھی دیدی گئی اور نواب صاحب کی محبت میں آپنے خلیفہ ج بھی ادا کیا۔ اس عرصہ میں شہر و سخن کی بڑی گرم بازاری رہی مشاعروں میں امیر مینائی، جلال، امیر سراج، ہجر، قلق، عروج، تسلیم سے بڑے معرکے رہے۔ نواب ملک علی خاں کے انتقال کے بعد ایک کونسل مقرر ہوئی جس کے صدر جنرل عظیم الدین خاں تھے۔ مرزا دل غ کی ان سے نہ بنی۔ لہذا آپنے ایک طویل سفر اختیار کیا۔ اور لاہور، امرت سرکشن کوٹ، بنگلہ علی گڑھ، متھرا، بے پور، منگھول اور اجمیر میں اپنے شاگردوں کے ہاں گئے۔ اس کے بعد حیدر آباد کا عزم کیا۔ وہاں آپ کو پہلی مرتبہ ناکامی سے واپس آنا پڑا۔ مگر کلام کی شہرت کی وجہ سے آپ کو دوبارہ حیدر آباد طلب کیا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی حضور نظام کے است و مقرر ہوئے اور مبلغ چار سو پچاس روپیہ ماہیانہ مقرر ہوا۔ یہ مشاہرہ اڑوئے قدروانی بعد کو ایک ہزار کر دیا گیا اور تاریخ ورود حیدر آباد سے ادا کر دینے کا حکم صادر ہوا۔ حیدر آباد میں آپ ایک مرتبہ منہج زندگی گزارتے رہے۔ سولے نامی مشاعروں کے اور کہیں نہ جاتے۔ آپنے میر انیس کی طرح بڑی آزاد طبیعت پائی تھی۔ خاص ضرورت کے سوا آپ نہ کبھی کسی امیر کے ہاں گئے اور نہ کسی کی مدح سرائی کی ہم، برس کی عمر میں ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو بعارضہ فالج بیمار رہ کر راہی ملک بقاء ہوئے اور وہیں حیدر آباد میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ علیہ۔

(۳)

گیتے کا قول ہے کہ اگر تم کسی شاعر کے خیالات کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہو تو اول اس کے زندگی کے حالات کو سمجھو۔ نواب مرزا خاں نے عمر کے پہلے میں پچیس برس عیش و عشرت میں گزارے کہ کیا ایک سارے کتبے کا بوجھ ان کے کاندھوں پر پڑ گیا۔ اس پر قدر کے مصائب و آلام اور دوستوں کے فراق نے ان کا دل خراشا۔ انہیں اہل و عیال سمیت رام پور جانا پڑا اور وہاں مد مقابل شعرا کی باؤ بیجا چلیں سہنا پڑیں۔ اس طرح چالیس برس بسر ہو گئے اور پھر ذاتی تفرقت کی بنا پر انہیں رام پور بھی چھوڑنا پڑا۔ بالآخر تمام ہندوستان پھر کر انہیں حیدر آباد میں جائے امان ملی۔ ان واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم ان کی شاعری کے تین عصر بنا سکتے ہیں۔

(۱) جوانی کا کلام۔ سمرانے اپنی جوانی کا زیادہ حصہ عیش و عشرت اور بے فکرگی میں گزارا اس لئے اس زمانے کا کلام حسن و محبت کے لطیف جذبات سے لبریز ہے یہ جذبات خیالی نہ تھے بلکہ شاعر کے ذاتی تجربات تھے۔ شوقی، تیکھاپن، نزاکت، نوک جھوک، راز و نیاز کی باتیں، ہجر کے صدمے، فراق کی داستانیں، جوانی کی ولولہ انگیزیاں جو اس زمانے کے کلام میں پائی جاتی ہیں وہ کسی زمانے کے کلام

میں نہیں۔ دراصل انہیں باتوں میں داغ کا معراج کمال ہے۔ یہ تمام کلام گلزار داغ کے نام سے راپور میں چھپا۔ چند ایک شعر ملاحظہ ہوں:-

کہا ہے دیندار اس منہم کو ہزار طوفاں اٹھا اٹھا کر
کہا نہ کچھ عرض مدعا پر وہ لے رہے دم کو مسکر کر
تیری محبت نے مار ڈالا ہزار ایذا سے مجھ کو ظالم
بے عیب تیرا یہ خاکداں ہے اسی کی ہے روشنی جہاں
جہاں لگی آنکھ کچھ یونہی سی وہیں جھبی بھانپ سی جگہ پر
نہیں تو ہو جو کہ خواب میں ہو تہیں تو ہو جو خیال میں ہو
ستم کے جولہ ت آشا ہوں کرم سے بے لطف بھڑا ہوں
غرائب خانہ ہے یہ تو زاپہ تسلیم خانہ نہیں جو ٹوٹے
خوسلم کرنا تھا سر پہ میرے تو اور قفن اٹھائے ہوئے
نکھ کو میا کیاں سکھاؤ حجاب شرم و حیا اٹھاؤ
قیساچے میں نے مانا برا مجھے تو نے دل سے جانا
جناب سلطان عشق وہ ہیں کریں جولے داغ اک اشارہ

(۲) غدر کے بعد کا کلام۔ اس میں وہ غزلیں شامل ہیں جو رام پور کے مشاعروں میں یار امپور کی سکونت کے ایام میں کہی گئیں۔ داغ اس زمانے میں بڑے بڑے استادان فن کے مقابلے میں غزلیں پڑھتے تھے اور انہیں طرح طرح کی نکتہ چینیوں سے احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ اس لئے اس زمانے میں بڑی سر مغز عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیتے تھے بگڑ سلاست اور روانی کو جو ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ یہ کلام بھی عشقیہ جذبات سے لبریز ہے۔ ان کہیں انقلاب زمانہ سے موثر ہوتے ہیں۔ تو دنیا کی نیرنگی پر ایک آدھ شعر ان کی زبان پر آجاتا ہے خصوصاً جب انہوں نے ایام غدر کے مظالم اپنے سامنے دیکھے۔ اور اس وجہ سے انہیں اپنے قدیمی وطن دہلی کو اور عزیز رفیقوں کو ہلاکت، فلاکت، بے عزتی اور مصیبت کے زنجیر میں چھوڑ کر نکھانجا پاڑا تو ان کے جذبات کو کیسے خمیں نہ لگتی۔ آخر اہل اہل کر شہر آشوب لکھ ڈال کلام ملاحظہ ہو:-

(۱) دہلی کی تعریف میں کہتے ہیں۔

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا۔
یہ شہر وہ ہے کہ ہر اند و جان کا دل تھا۔
یہ شہر وہ ہے کہ ہر اند و جان کا دل تھا۔
یہ شہر وہ ہے کہ ہر اند و جان کا دل تھا۔

رہی نہ آدمی یہاں سنگ وشت کی صورت
بنی نہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

ظہیر دہلوی کہتے ہیں۔
یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا حسن والوں کا یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونب لوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا مہ جالوں کا یہ شہر وہ ہے کہ مزج تھا ذی کماؤں کا
یہ وہ زمیں ہے زمیں سبکی زراگلتی ہے
یہ خاک وہ ہے کہ اکیسرا تھ ملتی ہے

(۲) داغ :-

فلک نے تہر و غضب تک کر ڈالا تمام پردہ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا غرض نہ لاکھ کا گھر اس خاک کر ڈالا
جلیں میں صوب میں شکلیں جو مانتا ب کی تصویر
کھینچیں میں کانٹوں میں جو پتیاں مٹلا ب کی تصویر

ظہیر :-
یہ وہ الم ہے کہ اس غم سے سب ہلاک ہوئے لگا کے چرخ سے چین تاسماک ہوئے
ہلاک گور میں آسودگان خاک ہوئے کفن بھی ساتھ گریباں کے چاک چاک ہوئے
نہ روزِ حشر سے کم تھی عذاب کی صورت
خدا دکھائے نہ اس انقلاب کی صورت

(۳) داغ شہر سے نکلنے کو یوں ادا کرتے ہیں :-

برنگ بونے گل اہل چمن سے چلے غریب چھوڑ کے اپنا وطن و وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو جی پائے جس جلیں سے چلے قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن بھی ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی ۴۴

یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی ۴۴

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت چڑھے ہی آتے تھے سر پر سجاد کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر ایک گنوار کی صورت چھپی نہ ان سے پراہلی دیار کی صورت
کسی جگہ جو کوئی ہو کے بیقرار آیا

تو اہل قسریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا
زباں جو بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی ملیں جو خاک بھی منہ پر تول نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی
جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پڑے سر کتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھستے ہیں

ظہیر:-

نکنا شہر سے خلقت کا بے سرو ساماں وہ جانا پردہ تشبیہوں کا باس عریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کتا دا ماں وہ دارو گیر سپاوشیر بے ایماں
دراز دست تطاول ستم شعاروں کا
فلک کو یاس سے تکنا جفا کے مارونکا
نکلے شہر سے ہیں پزیر نہیں سکتے ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کھوڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے قدم قدم پہ بے لغزش سنبھل نہیں سکتے
کنڈ موت نے کہا بند بند جکڑے ہیں
زمین شہر نے کہا اکے اکے پاؤں پھوڑے ہیں

(۴) داغ :-

بنا ہے خالی سیر رنگ مہ جساموں کا دو تا ہوا ہے قدر است نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو سوز نالوں کا عجیب حال دگرگوں ہے دلی والوں کا
کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعاے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

ظہیر:-

مکھوں سے جسموں پہ اک مردنی سی چھائی تھی وہ مہ سے چہروں پہ گویا ٹھٹی ہوائی تھی
غضب وہ پردہ نشینوں کی بے روائی تھی غرض کہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی
بیان کیجئے نصیبوں کی کیا بڑائی کا
وہ دشت اور وہ پھر نابز ہنسہ پانی کا

(۵) داغ :-

پیادہ پاہوں رواں شہسوار صد افسوس لہو کے گھونٹ پیس باوہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہل وقار صد افسوس ہزار حیف دل بقیہ رار صد افسوس
بھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکا یک بنے ہوئے کیسے

ظہیر :-
نہاں گمشدہ اقبال پائمال ہوئے گل ریاض خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطر گل کو نہ ملتے وہ مٹی میں
جو فرش گل پہ نہ چلتے وہ مٹی میں

(۶) داغ :-

جہاز ایسا تباہی میں آگیا اپنا ملائے تحتِ ثرا ہی تک کہیں پتا اپنا
رہا نہ آہ زمانے میں آشنا اپنا بحرِ خدا کے نہیں کوئی نا خدا اپنا
کسی سے دوپہ ہوئے ایسے کب نکلتے ہیں
یہاں محضرتِ الیاس بچ نکلتے ہیں
پے محاسبہ پرش ہے نکتہ دانوں کی تلاش بہرِ ریاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی کہ حکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی
یہ اہلِ بیعتِ قلم کا ہو جبکہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ

ظہیر :-

جہاں کی تشنہ خوں تیغ آبدار ہوئی سنان و نیزہ ہر اک سینہ سے دو چار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی ہر ایک سمت سے فریاد گیر و دار ہوئی
ہر ایک دشتِ قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا
ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا ہر اک قبیلہ و مرغانِ قتل ہوا
ہر ایک اہلِ زبانِ خوش بیان قتل ہوا غرضِ خلاصہ یہ ہے اک جہان قتل ہوا

گھوڑے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے شہار میں
نرگور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

(۸) گرمی کا نقشہ دیکھئے۔

دماغ :- جو بھی تو افغی کا کل کے زمہ کی گرمی جو بھی تو شعلہ عذاراں شہر کی گرمی
نہ دیکھیں جو نگہ خشم و قہر کی گرمی اٹھائیں ہائے وہ جلتی روپہر کی گرمی

طیش سے ریگ بیا باں بھی آفتاب توئی
زمین ہل کر نہ مار کا جواب ہوئی

دیکھئے مرزا دماغ نے اس تڑا تے کی گرمی میں تعشق کو نہ چھوڑا۔

ظہیر :- وہ دھوپ اور وہ ریگ طپاں وہ گرم ہوا وہ فوج فوج ہراک سو سے زرخ اعدا
وہ کینہ ورزمی غارتگران بے پروا اور اسپہ ظلم گنواروں کا وہ کہ وا ویلا

جو ہم سے سنتے ہیں وہ انقلاب کی باتیں

تو لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تپتے ہوئے وہ گورے بدن ناک میں ملائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگڑ میں الم سمائے تھے جفا کی تیغ کے سب نے خم دل پہ کھائے تھے

وہ دماغ مرگ عزیزاں وہ دشت پیمانی

وہ ریگ غارِ غنیمتوں وہ آبلہ پائی

اس زمانے کی غزلیں آفتاب دماغ میں جمع ہیں۔ چند ایک شعر ملاحظہ ہوں :-

کچھ آنے لگا جیسے اثر آہ رسائیں دل اور ہوا میں ہے جگر اور ہوا میں
تکیں تری شوخی میں تو شوخی ہے جیا میں غمہ ترے انداز میں انداز ادا میں
فریاد ہی فرقت میں بہت چاہنے والے کیسی ہو جو آجائے اثر سب کی دعا میں
تو دوست ہے کس طرح نہ لیں تیری بلا میں ہم کو دہرا کرتے ہیں دشمن کی بلا میں
اس ام سے چھٹنا کوئی آسان ہے ظالم تو دل میں ہے دل لعل ہیں زلف بلا میں
تجھے اس بتِ مردوش کے بہت چاہنے والے انگشت نما دماغ ہوا ساری سجا میں

ہر دل میں نئے درد سے ہے یا کسی کی ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

گہرا کے اگر موت بھی مانگوں تو کہیں وہ
ہے الفت دشمن میں برا حال کسی کا
کبھت وہی داغ نہ ہو دیکھو کوئی
جاگیر نہیں ہے دم آباد کسی کی
اس حضرت دل کیجئے امداد کسی کی
بیچین کئے دیتی ہے فریاد کسی کی

مٹ گئے عشق میں گھر سینکڑوں دیران ہو کر
کیوں نہ مر جائیے اس چھڑیہ قرباں ہو کر
جب کہیں جاتے ہو آتے ہو پشیمان ہو کر
اس کو حسرت نہ رہے دشمن ایماں ہو کر
پھر گئی آنکھ تری گر و شس دوراں ہو کر
دل میں چھتی ہے تنہا تری فرغاں ہو کر
تم کو جانا نہیں آتا ابھی مہماں ہو کر
کوئی دن دیکھ لو اسے داغ مسماں ہو کر

سانس بتیاب قدم تیز ریشاں نظر
دیکھنے والے ہی سوعیب لگا دیتے ہیں
داغ تو کہے سے جاتا تو ہے بتخانے کو
آئے ہو کیا طرف گو رہ غریباں ہو کر
کوئی جو چاہے کرے آنکھ سے پنہاں ہو کر
شرم آتی نہیں کبھت مسماں ہو کر
۳۱ کہولت کے زمانے کا کلام۔ اس عمر میں آپ کے عشقیہ جذبات کا شعلہ دم پر گیا تھا۔ نہ تو آپ کی طبیعت
میں وہ وارفتگیاں رہی تھیں نہ جوانی کا جوش و خروش اور نہ زندگی کی چل پھل۔ ہاں کہنہ شوق ہونے
کی وجہ سے کلام نہایت پختہ اور خوش و زوائد سے بالکل پاک ہو گیا تھا۔ یہ مجموعہ "مہتاب داغ" کے نام سے
مشہور ہے۔ اس مجموعے میں کہیں داغ زندگی کی پر اسرار گھاٹیوں پر اتر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے
کہ شاعر زندگی سے کس قدر موثر ہو رہا ہے۔

دل نہیں دم نہیں دماغ نہیں
اہل محشر میں پوچھو نگا خدا گنتی بات
تم نے دیکھا بھی ہے دنیا میں کبھی شاد مجھے
وفات کے وقت کچھ کلام غیر مطبوعہ رہ گیا تھا۔ اسے اول اول سید علی حسن نے فراہم کر کے دشنا کی
اجازت بغیر لاہور سے یادگار داغ کے نام سے شائع کیا۔ مگر بعض غزلیں ناسمکل رہ گئی تھیں اس لئے تقاضا
نہن لالہ سریرام صاحب ایم۔ اے مصنف خمانہ جاوید نے ان کے جانشینوں سے تمام مسودے حاصل
کر کے اس دیوان کو بطور ضمیمے کے مہتاب داغ کے ساتھ شامل کر دیا۔ ان دوادین کے علاوہ ایک شہسوی مستی
بہ فریاد داغ تھے جو مرزا کی اپنی عشقیہ داستان ہے۔ اس زمانے کی ایک غزل ہے۔
تو وہ ہے سب بت کافر تے قربان گئے
جو خدا کو بھی نہ مانیں وہ تجھے مان گئے۔

دعویٰ مہر و وفا پر وہ بُرا مان گئے
تیرے عاشق کا جنازہ نہ گیا ہوا گئے
یا الہی کہیں لٹتی تو نہیں راہ عدم
خانہ دل ہے الہی کہ مسافر خزانہ
آزمائش ہی یہ ٹھہرا تھا محبت کا ثبوت
بنہ عشق ہو ایسے کہ الہی توبہ
اٹے نادوم ہوئے احسان کے احسان گئے
ابھی اس راہ سے کچھ لوگ پریشان گئے
جانے والے جو یہاں چھوڑ کے سلمان گئے
کتنے ہی آئے یہاں کتنے ہی ارمان گئے
اب تو پہچان گئے جان گئے مان گئے
تم تو معشوق کو اسے داغ خدا جان گئے

(۴۷)

داغ کا اسلوب کلام بھی نرالا ہے۔ غزل گوئی میں ان کا شجرہ نسب کسی سے نہیں ملتا۔ ان سے پہلے غزل گوئی کے دو مستقل مسلک تھے۔ پہلا یہ کہ عشق مجازی کے جذبات نہایت سوز و گداز کے ساتھ پاکیزہ الفاظ میں بیان کئے جائیں۔ میر تقی اس فن میں استاد ملنے جاتے ہیں۔ سید انشا، جرات اور مرزا غالب نے اس رنگ میں خوب جدت طرازیں دکھائیں۔ کسی نے اس میں رندی و ہوسنالی کا طرہ لگایا اور کسی نے اس میں فلسفی تحقیق کے نیچے جڑ دئے۔ دوسرے یہ کہ عشق حقیقی کو عشق مجازی کی اصطلاحات میں بیان کیا جائے۔ یہ میر درد، میر اثر اور راسخ کار رنگ ہے اور ذوق نے اسے پایہ کمال تک پہنچایا۔ بلکہ اس میں انقلاب زمانہ اور اخلاقیات کے مضامین کا اضافہ کیا۔ مرزا داغ ان میں سے کسی مسلک کی تقلید نہیں کرتے۔ غزل گوئی میں ان کی انوکھی چال ہے۔ یہ اپنی غزلوں میں معشوق سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ چہر خوانی کرتے ہیں شوخیاں دکھاتے ہیں۔ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور پھر خود ہی مناتے ہیں۔ اور مناتے مناتے سحر ہو جاتی ہے اور پھر دل بہلاتے ہیں کہ ناراض تو بظاہر ہے۔ ”تجھے داغ دل جانتا ہے کسی کا“ غرض سوطر ح کی اٹھکھیلیاں کرتے ہیں۔ داغ کی شاعری ان کی چلبلی طبیعت، چنبیل نرالی عادات، تیکھا پن، تردنازگی، اودشوغی کا پتہ دیتی ہے۔ دیوان بڑھنے والے کے سامنے نوجوان داغ مسکاتا ہوا گذر جاتا ہے۔ ان کا ہر ایک شعر دل کی جنگی لیتا ہے۔ اور مگر مسل ڈالتا ہے۔ اس پر روزمرہ کی خوبی محاورہ کی بندش اور صفائی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رامپود کے مشاعروں میں امیر مینائی اور جلال جیسے استاد ان فن کہا کرتے تھے کہ یار اخیر میں غزل پڑھنے کا کیا فائدہ۔ مشاعرہ کے اختتام پر تو داغ کی غزل سب کی نوک زبان ہوتی ہے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ منشی امیر احمد مینائی کو اپنا رنگ چھوڑ کر مرزا داغ کے مسلک پر چل پڑا۔ سحرزائے کلام میں سوتیانہ پن نہیں۔ گھنڈ والوں کی طرح بے جوڑ قافیوں کو باندھتے ہوئے غزل کا لٹلہ نہیں بنا دیتے۔ ذیل میں چند ایک خصوصیات کلام درج کی جاتی ہیں۔

(۱) کلام نہایت صاف سلیس ہوتا ہے۔ لفظ ہموار ہوتے ہیں۔ ترتیب عبارت بالکل شریک سی ہوتی ہے جو بڑے بڑے گہرے تخیلات کو عام فہم بنا دیتی ہے یعنی داغ کا کلام تعقید سے پاک اور سہل متمتع ہوتا ہے۔ شعروں میں محاورہ خوب باندھتے ہیں۔ داغ کا کلام پڑھنے سے اردو زبان بڑی آسانی سے سیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً ذیل کے ابیات میں دوسرے محاسن کے باوجود اٹھ جانا اپنے مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی	اے تہوایا ننداری اٹھ گئی
وہ بیہوش میں مجھے کب گئے کہ جب	بیٹھ کر مخلوق ساری اٹھ گئی
رہ گئے لاکھوں کلچہ تھام کر	آنکھ جس جانب تھاری اٹھ گئی
کس سے رکھے داغ چشم دوستی	اٹھ گئی یاروں سے یاری اٹھ گئی

تلنے کے استعمال

ملائے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے
ذیل کی غزل میں بے ساختگی زبان کی صفائی، روزمرہ کی خوبی اور محاورہ کی بندش ملاحظہ ہو :-

صاف کب امتحان لیتے ہیں	وہ تو دم دیکھ جان لیتے ہیں
پھر نہ آنا اگر کوئی نہ بھیجے	نامہ برسے زبان لیتے ہیں
یہ سنا ہے مرے لئے تلوار	اک مرے مہربان لیتے ہیں
کون جاتا ہے اس گلی میں جسے	دور سے پاسیان لیتے ہیں
منزل شوق طے نہیں ہوتی	ٹھیکیاں نوجوان لیتے ہیں
کہ گزرتے ہیں ہو بری کہ بھلی	دل میں جو کچھ وہ ٹھکان لیتے ہیں
وہ جھگڑتے ہیں جب رقیبوں سے	بیچ میں مجھ کو سان لیتے ہیں
تیسے خنجر سے بھی تو اے قاتل	نوک کی نوجوان لیتے ہیں
ضد ہر اک بات پر نہیں اچھی	دوست کی دوست مان لیتے ہیں
مستعد ہو کے یہ کہو تو سہی	آئیے امتحان لیتے ہیں
داغ بھی ہے عجیب سحر بیاں	بات جن کی وہ مان لیتے ہیں

(۲) تیکھان اور شوخی جو داغ میں خاص ہے :-

نہ کسی شخص کی عزت نہ کسی کی توقیر عاشق آتے ہیں تہاے کہ غلام آتے ہیں

دیکھیں تو کیسے فتنے ہیں نیسپی نگاہ میں آئینہ رکھ دے کاش کوئی ان کے سامنے

نہ پئی تو سہی تو بہ بھی ہو جائے گی زاہد کجغت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

گرے ہوتے الجھ کر آستان سے چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

خاطرے یا لحاظ سے میں مان تو گیا جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

بتوں سے اب محافی چاہتا ہوں خدا سے کچھ کہا تھا بخود می میں

(۳) میر تقی کا سا سوز و گداز ہے - دو شعروں پر اکتفا کی جاتی ہے -

نہیں آتے نہ آئیں وہ گئے تاب و توان جائیں تجھی پر آج ہم اے بیقرار می صبر کرتے ہیں

خدا جانے ہوئی ہیں دفن کیا کیا حسرتیں دل میں کبھی بیٹھے کبھی اٹھے کبھی لوٹے کبھی تڑپے
پھپھو لوں سے مرے سینے پہ عالم ہے مزاروں کا تماشا دید کے قابل ہے تیرے بیقراروں کا

(۴) - اخقار - لاکھ دینے کا ایک دینا ہے دل بے مدعا دیا میں نے

حاصل ہوئے مرے تے خنجر کے غیر کو سر پر ہمارے مفت کا احسان ہو گیا

مرے آشیاں کے تو تھے چار ستکے چمن اڑ گئے آندھیاں آتے آتے

۵ - خیالات میں تڑپ ہوتی ہے :-

رہے ہم یاس میں اس رنگ کا رونا کیسا پانی ہو ہو کے بہا خون تمنا کیسا

ثبات ہر جہاں میں اپنا فقط مثالِ جناب دیکھا
۶۔ زندگی وہ سنا کی اور اس پر نفاقت کا طرہ۔
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ خواب دیکھا

زاہد تری محفل میں چرچا ہی نہیں مے کا
اس سے تو یہ بہتر تھا کچھ ذکرِ خدا ہوتا

زاہد بڑا مزاحم اگر یوں عذاب ہو
دورِ رخ میں پاؤں ہاتھ میں جامِ شراب ہو

حشر میں اینڈتے ہوئے یارب
کسی کے تقصیر وار پھرتے ہیں

یقین ہے کہ ہو جائے آخر کو سچی
۷۔ بلند خیالی۔ روزِ مترا ہوں روزِ بقیا ہوں
مرے منہ میں تیری زباں آتے آتے
زندگی کا کوئی حساب نہیں
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہونہیں سکتا
بندگی ایسی غلامی کو اگر قتل نہ ہو
قتل کر ڈال جو کرتا نہیں آزاد مجھے
تکوار الفاظ سے یا مختلف الفاظ کے پے درپے لانے سے خوبی پیدا کر دیتے ہیں :-
نظارہ نہ جانے نہ جانے نہ جانے
تجھے داغِ دل جانتا ہے کسی کا
کسی نے کچھ ان کو ابھارا تو ہوتا
نہ آتے نہ آتے یہاں آتے آتے

دل کو سمجھائیں گے بہلائیں گے پھیلانگے
بعدِ مر جانے کے بلجائیگی فرصت کیسی

آزمائش ہی پہ ٹھہرا تھا محبت کا ثبوت
اب تو پہچان گئے جان گئے مان گئے

ترجی محبت نے مار ڈالا ہزار ایذا سے مجھ کو ظالم
رلا رلا کر گھلا گھلا کر جلا جلا کر مٹا مٹا کر

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجیبِ انتخاب دیکھا
برائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

عبدالغزیزہ ایم۔ اے۔ منشی فاضل

کامیابی

(از جناب منشی دیان رائیں صاحب نگم - بی۔ اے۔ ایڈیٹر ”زمانہ“ کانپور)

ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر شخص کو ہر وقت اور ہر کام میں کامیابی کی ضرورت ہے۔ ہر ایک کو شش اور ہر ایک محنت کی غرض، مدعا اور نتیجہ کامیابی ہے۔ درحقیقت وہ کام ہی نہیں جس میں پورے طور سے حصولِ مٹمانہ ہو ایک چھوٹے درجہ کے طالب علم سے لیکر قوم اور ملک کے بڑے بڑے مدبّر تک۔ ایک عزیزِ حور وہ فروش سے لے کر ملکِ التجار تک۔ معمولی کسان سے راجہ ہمارا جہ تک۔ ایک چپراسی سے اعلیٰ ترین حاکم تک بغرض جس کو دیکھئے اُسے اپنے پیشہ میں کامیابی مد نظر ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دنیا میں ہر ایک کو کام میں کامیابی نہیں ہوتی؟ جب اُس کے حصول کی ہر ایک کو فکر ہے۔ اور اس لئے سب لوگ کو شش بھی کرتے ہیں تو پھر ہر فرد بشر منزلِ مقصود تک کیوں نہیں پہنچتا؟ کیا اس کے لئے معمولی سے زیادہ غفل اور اعتدال سے زیادہ محنت درکار ہے؟ بہت آدمی بظاہر محنت کرتے ہیں۔ اور اپنی مزا میں ناکام رہتے ہیں۔ اکثر دوسروں کی ناکامی کو اپنی کابلی اور بیجا آرام طلبی کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ بعضے اپنے بے طریقہ محنت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ پانے سے بیدل ہو کر سبھی کام کاج چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یا نقدیر کے اندھا دھند قائل ہو کر دنیاوی تدبیر سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں ہاتھ پیر چلانا داخلِ گناہ ہے۔ ایسی اور اسی قسم کی بہت سی مثالیں روز مرہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایک آدمی کی ناکامیابی صرف اُسی کو نہیں بلکہ بہت سے بندگانِ خدا کو بیدل اور پست ہمت اور کابل بنا دیتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ جو کام شروع کیا جائے وہ سوچ بچار کے بعد شروع ہو اور آغاز کے بعد اُس کے انجام بخیر کی ہمیشہ فکر رہے۔

کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس کی آرزو بخوبی ذہن نشین ہو۔ دوسرے اس کے حصول کا مضبوط ارادہ ہو اور تیسرے مستقل مزاجی اور یکسوئی کے لئے مسلسل کوشش کرنے کا تہیہ ہو۔ اتنی ضروری باتوں پر دوستانہ دینے سے معمولی محنت کے ساتھ اوسط درجہ کی سمجھ کا آدمی بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

ہماری اکثر کوششیں غرضی جیسے بیکار بھجائی ہیں کہ ہم ان کے لئے شروع سے آخر تک باقاعدہ محنت نہیں کرتے ہندوستان میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اپنے مشاغلِ دلی اور اصل غرض یا مدعا کو خود بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ یا جنہوں نے صحیح طور سے اپنی زندگی کی کوششوں اور منتقلی کے حاصل پر غور کیا ہو۔ مثال کے لئے ہندوستانی بچوں کی تعلیم کا مسئلہ

لیجئے۔ ایسے والدین کی تعداد بہت ہی کم ہوگی کہ جنہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم شروع کرتے وقت یا اس سے قبل کسی یہ سوچا ہو کہ ہمارا بچہ کیا کام کرے گا۔ یادہ کسی کام کے لائق ہے یا کس غرض کے لئے ہم اُسے تعلیم دے رہے ہیں۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بڑا صلہ شروع کر دیا اور جب تک اپنے ذرائع اور اس کی ہمت نے ساتھ دیا وہ بڑھا گیا۔ شروع سے ہم اس کو کسی خاص غرض کے لئے مخصوص نہیں کرتے۔ فراغتِ علم کے بعد جب فکرِ معاش ہوئی تو صاحبزادے ملازمت سرکاری کی طرف رجوع ہوئے۔ عرضی تان دی۔ اس میں ناکامیابی ہوئی وکالت کی طرف مچکے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ تجارت کا بھی حوصلہ ہے۔ لیجئے نہ اس کے رہے نہ اس میں ہوئے نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ ایسے طریقوں سے تفصیح اوقات اور نقصان کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے۔ چاہیے کہ ضروری اور معمولی تعلیم کے بعد لڑکے کی طبیعت کی موزونیت۔ لیاقت کا اندازہ اور مزاج کا رخ دیکھ بھال کر جس کام کے لائق ہو اس کی آئندہ تعلیم اسی لحاظ اور ڈھنگ پر کی جائے پھر دیکھئے کہ اس دورانِ تدبیر کے نتائج قابلِ اطمینان ہوتے ہیں یا نہیں۔ عرض ہر کام اور ہر راہ کے قبل اُس کے سب پہلوؤں پر غور کر لینا اور آخر نتیجہ و دلی مقصد معلوم کر لینا فرض ہے۔ ورنہ سوہوم نتیجہ و نامعلوم اُمید کے خیال سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ارادہ کی مضبوطی کا سیابی کی دوسری شرط ہے۔ یہ نہیں کہ گھڑی میں کچھ اور گھڑی میں کچھ دم بھر تو خیال رہا اور پھر فراموش۔ یکدلی ہر کام کے لئے لازمی ہے جو کام درپیش ہے۔ اور جو عرض حاصل کرنا ہے اس کا ہر وقت دھیان رہنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ یاد نما کی طرح جس کسی نے چاہا رخ بدلوادیا۔

اس کے بعد مستقل مزاجی کے ساتھ باقاعدہ کوشش اور لگاتار محنت کی ضرورت ہے۔ محنت وہ چیز ہے کہ خراب سے خراب اُجڑے اُچار زمین کو چمن و لالہ زار بنا دیتی ہے۔ درحقیقت جو نوجوان محنت کا علوی ہو گیا ہے۔ اُسے کامیابی کے بہت بڑے ذریعہ پر اقدار حاصل ہو گیا ہے۔ محنت کسی کام کی نصف کامیابی ہے۔ محنتی آدمی بھی بعض اوقات کسی نہ کسی وجہ سے ناکام ہوتے ہیں۔ مگر اُن کو کیا ڈر ہے۔ اگر مستقل مزاجی سے کوشش جاری ہے تو کسی نہ کسی روز ضرور کامیابی ہوگی۔ سمجھدار آدمی ناکامیابی کے سایہ میں نئے نئے تجربے حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ پختہ و تجربہ کار ہو جاتے ہیں اور درحقیقت مستقل مزاجوں کی شکستیں منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے میں مختلف قیام گاہوں کی طرح ہیں۔ ہندوستان میں بلند حوصلگی اور فراخ ہمتی بہت کم ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض پیشوں کی طرف سب کا خواہ اس کے قابل ہوں یا نہ ہوں اس قدر جھگڑا نظر آتا ہے کہ دوسروں کی روٹیاں چھیننے کی کوشش میں بہت سے گھر بھوکے رہ جاتے ہیں۔ اور بزرگوں پیشے جو عام پیشوں سے بدرجہا زیادہ فائدہ مند اور نفع بخش ہیں۔ اُدھر کوئی راغب نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہم کو معاش کے نئے ذریعے اور وسیلے پیدا کرنا چاہئیں۔ اور جس طرف بہت کم لوگ راغب ہوں اس طرف ہم کو خصوصیت سے کوشش و محنت کر کے اپنے پست ہمت ہموطنوں کو سبق دینا چاہیئے۔ دلیر آدمی اس سے کسی نہیں ڈرتے کہ وہ کسی کام کو تنہا یا اول دفعہ کر رہے ہیں۔ بلکہ اس خیال سے اُن کی ہمت اور زیادہ بڑھتی ہے۔

ہمارے ملک میں یہ ایک عام قاعدہ ہو گیا ہے کہ کسی کام میں ایک آدمہ مرتبہ ناکامیابی ہوئی یا خاطر خرافہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ تو چھوڑ بیٹھ۔ حالانکہ مستقل مزاجی سے مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔ بہر حال تھوڑی بہت یا خفیف رک سے ہمیں اپنی ہمت نہ ہار بیٹھنا چاہیے۔ کبھی کبھی بلکہ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ قبل از وقت نتیجہ کی فکر ہوتی ہے۔ اور پوری کامیابی کی جستجو رہتی ہے۔ اور جہاں کہیں کوئی دیر طلب کام ہو انوار اس قدر بے صبری ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ برسوں کے کاموں کو دنوں کی مہاد بھی نہیں دیکھتی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ موقع عملت اور بے وقت جلد بازی سے سارا کام خراب ہو جاتا ہے۔ اور اس قابل افسوس بے صبری سے بہت سے کام انجام تک نہیں پہنچنے پاتے۔

یہاں پر میری یہ ہرگز مراد نہیں کہ نقصان وہ کام کو اندھ کی طرح کئے جائیں۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ غریبی و غور فکر کے بعد اگر کوئی کام نفع بخش ثابت ہو تو اس کی ایک آدمہ بار کی ناکامیابی سے ہمت نہ ہار بیٹھنا چاہیے۔ بلکہ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے اس کو کئے جانا ضروری ہے۔

ہم کسی کام میں ہر وقت کوشش کرتے رہیں گے۔ تو ممکن نہیں کہ ایک نہ ایک روز ہمیں کامیابی نصیب نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر کام کے لئے نفیس ہو۔ یا بھدا۔ بڑا ہو یا چھوٹا محنت اور استقلال ضروری ہیں۔

بعضوں کا یہ خیال ہے کہ ہر کام کے لئے معمول سے زیادہ عقل اور محنت کی ضرورت ہے۔ اکثر دیکھا گیا کہ جہاں کسی غمی یا سست لڑکے کو دیکھا۔ اس کی ناکامی کا فتویٰ دیدیا۔

بعضے دماغ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ترقی کی رفتار سست مگھکتی ہوتی ہے۔ جسے بعض رخت ایسے ہوتے ہیں جہاں نشو و نما بہت عرصہ میں ہوتا ہے مگر نہایت مضبوط اور شاندار ہوتے ہیں دنیا کے بعض بڑے بڑے آدمی ظاہر میں نہایت غمی سمجھاتے تھے۔ معمولی سمجھ اور اوسط درجہ کے مگر مسلسل اور باقاعدہ محنت ہر ایک انسان کو کام کے لایق بنا سکتی ہے۔ اکثر لوگ جو محنت کے علاوہ نہیں یا جو محنت کے نام سے بھاگتے ہیں وہ رعایت اور موقع کی تلاش میں گر گئے ہیں اور ساری عمر بے صلاح گزرتی ہے۔ رعایت اور ترقی میں طبعی عناد ہے۔ یہ دو باتیں ضد ہیں۔ انکا اجتماع کسی طور پر ممکن نہیں ممکن ہے کہ رعایت اور دوسروں کی امداد و اعانت سے اُس وقت یا موجودہ زمانہ میں کچھ ظاہری فائدہ ہو جائے۔ مگر وہ فائدہ ہرگز دیر پا اور مستقل نہیں ہو سکتا ہے۔ رعایت بغیر قابلیت کے دم بھر کا فائدہ اور چشم زدن کی چمک ہے۔ جہاں کچھ میں قابلیت ہے وہاں رعایت سے نفرت ہوگی۔ کیونکہ یہ اصل ترقی کی ہارج ہے۔ اور یوں بھی ہے

حقاً کہ باعقوبت و خوش فراہ راست رفتن بہ پائے مروی ہمایہ در بہشت

بعض صاحبوں کو کسی کام کو شروع کرنے کا کبھی معقول موقع ہی نہیں ملتا۔ یا دیکھنا چاہیے کہ اگر ہمیں دنیا میں کوئی کام کرنا ہے تو موقع ہمیں خود تلاش کرنا چاہیے۔ ہر ایک کام کے لئے درحقیقت ہر وقت موقع ہے۔ اور ہر شکل کا محنت اور استقلال سے آسان ہو جاتا ہے۔



بسیار

ایک چاپانی مہمور گاشاہ کار

رازِ تخلیق

(جانبِ مولوی عبد الغنی صاحب سے مل سکول گھوڑا)

(۳)

تجھ کو جو دیکھت ہوں ہوتا ہے دل میں برپا
طوفاںِ مسرتوں کا
اے حاصلِ جوانی اے شمعِ زندگانی
اے نور کے ستارے نسکینِ جاں ہے تجھے
پیری کا تو عصابِ معصوم و بے ریا ہے
اک حسن ہے سراپا اک عشق ہے دل افزا
اے شمعِ زندگانی
اے حاصلِ جوانی

(۴)

ہاں ہاں سمجھ گیا میں اور خوب پا گیا میں
آد کا تیسری نشا
اس صانعِ ازل نے اس خالقِ جہاں نے
فردوس کے چمن سے خوشیوں کے اُس جہاں
اک پھولِ خوشِ مناسا بھیجا ہمارے گھر میں
تا غمِ غلط کرے وہ ہم کشتگانِ غم کا
ہاں ہاں سمجھ گیا میں
آد کا تیسری نشا

(۱)

ہستی کے اُس سر سے آیا ہے اک مسافر
میرے عزیز کے گھر
اُس سے جا کے پوچھیں کچھ اُس جہاں کی باتیں
اُس سرزمین کی باتیں آیا ہے وہ جہاں سے
کیا واں بھی آدمی ہیں حرص و ہوا کے بندے
ہر دل کے ساتھ واں بھی کیا غارِ غم ہیں اُنکے
کچھ اُس جہاں کی باتیں
اُس سے جا کے پوچھیں

(۲)

اے مرکزِ محبت خاموش ماہِ پائے
مضمونیت کے پتلے
کیوں آگیا وہاں سے دنیا کے عکدے میں
ہے یہ دیارِ بستی رنج و الم کی بستی
غم بے مضیبتیں ہیں دنیا میں آنستیں ہیں
تدیک ہے یہ دنیا اے راہِ حق کے جویا
دنیا کے عکدے میں
کیوں آگیا وہاں سے

(۵)

اے محزونِ محبت اے نغمہٴ مسرت آلودہ ہونہ جائے دل تیرا مصیبت سے
 اے رازدارِ الفت تو خیرِ خاندان ہو عصمت کا اک جہاں ہو
 ہاں ہاں سنبھل کے چلنا ظلمت کے اس مکان میں
 لبوسِ نور ہو کر آیا ہے تو جہاں میں
 ظلمت کے اس مکان میں
 ہاں ہاں سنبھل کے چلنا

بہار

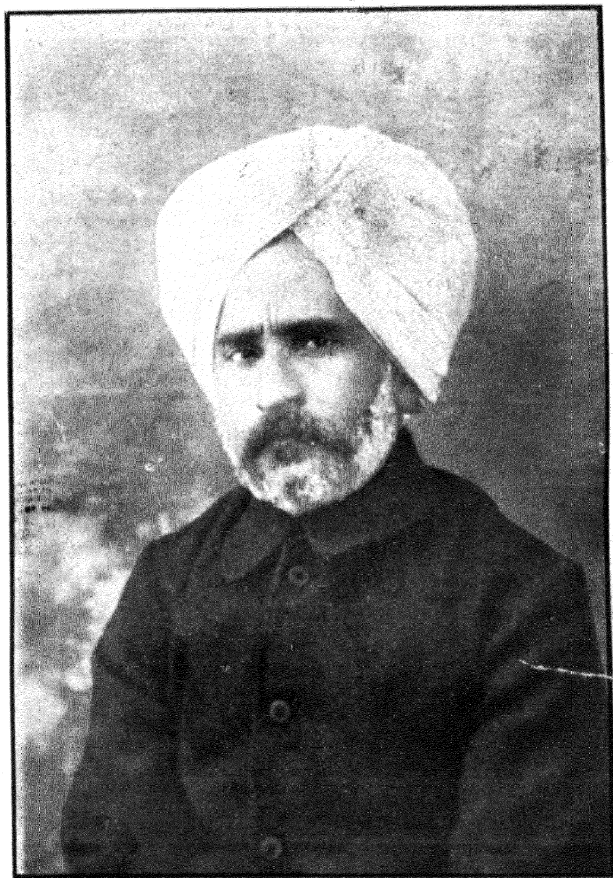
واہ واکس شان سے پھرا کے آتی ہے بہار
 نو جوانانِ چمن سرشار ہیں اس دور میں
 اک نیا اندازِ گلشن میں دکھاتی ہے بہار
 پھونکتی ہے ایک صبحِ تازہ ہزل میں عبا
 میکشوں کو مردہ راجت سناتی ہے بہار
 کاکلیں کھولے ہوئے ہیں نو عروسانِ چمن
 عیسوی اعجاز سے مردے بجاتی ہے بہار
 ہے ہر اک فردِ بشر جو تماشا ہے جمال
 نانہ سنبھل سے خوشبوئیں اڑاتی ہے بہار
 غنچہٴ سرسبز کہنے کو ہے اپنا حال دل
 ہے سب ہر سمت رقصاں لگاتی ہے بہار
 غانہٴ خوشترنگ سے کرتی ہے تازہ روئے گل
 رازِ بلیوں کی چٹک سے کہہ سناتی ہے بہار
 اور اکٹِ محبوب میں مہندی رچاتی ہے بہار

کر نہیں سکتا بیاں کچھ طالبِ لکچِ مجِ نیاں

دیدہٴ بینا میں رنگ اپنا جاتی ہے بہار
 طالبِ کاشمیری



سائنس لکھنؤ میں چند صاحب و دباوتھی بی اس ایس
چف ایڈیٹر رسالہ ہدا



پنڈت لہجورام صاحب جوش ملیالی منشی فیاض

مولوی محمد نوح صاحب نوح

خلف مولوی عبد المجید صاحب رئیس قصبہ نارہ پرگنہ کڑا ضلع الہ آباد

آپ کے والد ماجد مولوی عبد المجید صاحب کو گورنمنٹ کی جانب سے غدر ۱۹۵۷ء کی خبر خواہی کے صلے میں ایک علاقہ ملا تھا جسکی سالانہ آمدنی دس ہزار روپیہ سے زیادہ ہے۔ آپ ۱۲۹۶ھ غالباً مطابق ۱۸۷۹ء میں بمقام موضع بہوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی نانائیشیخ علم الہدی صاحب کے دولت کدہ پر پیدا ہوئے۔ ابھی اچھی طرح ہوش بھی نہ سنبھلا تھا کہ مولوی عبد المجید صاحب نے سرکاری ملازمت میں سب ججی کے ہمدے تک پہنچ کر ۲۶ جون ۱۳۳۷ھ کو انتقال فرمایا۔ چونکہ آپ اس وقت بہت کم عمر تھے۔ اس لئے جلد ریاست کا انتظام آپ کی نانی صاحبہ کے حقیقی بھائی سید حسن صاحب کے تعلق کیا گیا۔ دس بارہ برس تک خاندان کے باہمی جھگڑوں کے سبب سے آپ کی ریاست پر نارادشاہی حملے اغوا و قراہی کی طرف سے ہوتے رہے۔ جن کا اثر موجودہ سربراہ پر بہت پڑا۔ اس بد نظمی کو دیکھتے ہوئے چودہ برس کے سن میں آپ نے انتظام جائداد کا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور چند ہی دنوں میں شرف و فادار فرج ہو گئے۔ اور حکام رس کہلانے لگے۔

پہلے حافظ قدرت علی صاحب و مولوی یوسف علی صاحب ساکنان نارہ پھر حاجی عبد الرحمن صاحب جالسی آپ کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ پھر میر نجف علی صاحب سے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں تک سنج کے طور پر اپنے مکان پر آپ اپنے انگریزی بھی پڑھی۔ شعر و سخن کا شوق بھی آپ کو میر نجف علی صاحب ہی کی صحبت میں ہوا۔ شروع شروع میں آپ انہی سے اصلاح لیتے رہے۔ لیکن آپ ذہین سلاست پسند و ہند خیال تھے۔ اس لئے استادوں نے دوسرے استاد سے اصلاح کھیلنے فرمایا۔ بہت رو و بدل کچھ آخر کار نواب فیض الملک میرالدولہ نانم یا جنگ مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے۔

ابھی اصلاح لیتے ہوئے دو برس نہ ہوئے تھے کہ استاد کی قدیم بوسی کے شوق میں عزیز و اقربا سے چھپ کر آپ حیدرآباد پہنچے۔ آپ کو دیکھ کر حضرت داغ نے فرمایا کہ مجھے تمہارے نوح ہونے میں شک ہے۔ کیونکہ تمہارے کلام سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ نوح من رسیدہ ہونگے۔ مگر جب اپنے یقین دلایا۔ تو حضرت داغ نے بہت کچھ خاطر مدارات کی۔ اور مرزا خاں فرمایا کہ ہم جانتے تھے کہ نوح حضرت نوح کے ہم عمر ہونگے۔ لیکن یہ تو بہت کم عمر ہیں۔ آپ کو استاد کا کلام بہت یاد تھا۔ اس لئے آپ کی نسبت حضرت داغ کا یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دیوان حافظ پہلے

دیکھا تھا۔ مگر حافظ دیوان آج ہی دیکھا۔ جب آپ کے استاد نے آپ کے حیدر آباد پہنچنے کی خبر آپ کے گھر میں بھیجی۔ تو آپ کے لانے کیلئے آپ کے عم زادہ بھائی منشی عبدالحمد صاحب تشریف لے گئے۔ ان کی خاطر واری بھی حضرت داغ نے بہت کچھ فرمائی۔ کچھ دنوں کے بعد آپ اپنے وطن واپس آئے۔ اور خطوط کے ذریعے اصلاح لیتے رہے۔ ابھی دو تین ہی سال گزرے تھے۔ کہ آپ نے اپنی محنت سخن سے ایسی ترقی فرمائی۔ کہ زیادہ غزلیں بغیر اصلاح واپس آنے لگیں۔ اس ترقی کو دیکھ کر حضرت داغ نے خود پھر دوبارہ اپنے پاس بلایا۔ اور اب مکرر ۱۹۰۲ء میں حسب الطلب استاد دکن گئے اور بہت دنوں تک رہ کر حضرت داغ و جناب تلہیر دہلوی سے ہمہری و دستخطی سندیں حاصل کیں۔ حضرت داغ آپ کو اپنا عزیز جانتے تھے۔ چنانچہ حضرت داغ کی صاحبزادی یعنی امیرہ جناب اب مزاحم الدین احمد صاحب سائل دہلوی آپ سے کسی قسم کی مغائرت نہیں فرماتیں۔ بے تکلف گفتگو کرتی ہیں۔ دوسری بار دکن سے مراجعت کے وقت حضرت داغ نے باہتمام سید رضی الدین صاحب کیفی تصویر کا ایک گروپ کھینچوایا تھا جس پر آپ کو خاص طور پر نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ یہ گروپ آپ کے کمرے میں اور تصویروں کے ساتھ آویزاں ہے۔ آپ کا کلام استاد کی زندگیاں ہی میں استاد کے کلام سے ملتا جلتا تھا۔ بیان کی شوخی زبان کی صفائی محاوروں کی بے تکلفی اور الفاظ کی پسندیدہ اسٹیلٹ حضرت داغ کے کلام کی طرح جناب نوح کے بھی کلام کی جان ہے ان باتوں کی تصدیق میں جی تو یہی چاہتا تھا۔ کہ ان استاد کی نقلیں جو حضرت داغ و جناب تلہیر دہلوی نے آپ کو عطا فرمائی ہیں۔ درج کی جائیں۔ لیکن طوالت کا خیال ہے۔ یوں بھی شائقین آپ کے دیوان اول و دوم میں دلچسپی سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت داغ دہلوی کے انتقال کے بعد جانشینی کے جھگڑے بہت دنوں تک چلتے رہے۔ اور اس کے مدعی بہت سے تھے لیکن جیسے جناب سائل دہلوی نے اپنی تحریر کے ذریعے سے آپ کو حضرت داغ دہلوی کا جانشین مان لیا۔ اس وقت سے اس بحث میں زیادہ خامہ فرسائی کی نوبت نہیں آئی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ سب نے آپ کو جانشین مان لیا بلکہ ایک بڑی جماعت نے اس کو تسلیم کیا۔ اور چند لوگ مخالف رہے۔

آپ بڑے بڑے معرکہ آرا مشاعروں حیدر آبادیہ بنے۔ گیا۔ بھوساول میں پوری ہدایوں فتح پور غازی آباد کنوئیں سندیلہ مارہرہ۔ باپور۔ شاہجہان پور لشکر گوالیار۔ میرٹھ۔ الہ آباد وغیرہ وغیرہ میں شریک ہو کر داد سخن حاصل کر چکے ہیں۔ اور انہی مقامات سے آپ کو فصیح العصر تاج الشعر انا خدائے سخن کے خطاب بھی ملے ہیں۔ آپ کے دو دیوان سفینہ نوح و طوفان نوح چھپ چکے ہیں پہلے دیوان کے دو ایڈیشن نکلے۔ اور اس قدر مقبول ہوا۔ کہ اب اس کی ایک کاپی بھی کہیں تلاش سے نہیں ملتی۔ دوسرا دیوان کچھ دن ہوئے شائع ہوا ہے۔ اس کی مانگ بھی اس قدر ہے جس سے یقین ہوتا ہے۔ کہ کئی ایڈیشن نکالنے پڑیں گے۔ تیسرا دیوان بھی قریب قریب تیار ہو چکا ہے۔ مگر ابھی شائع نہیں ہوا۔ ہمارے خیال میں اس وقت کوئی ایسا بڑا شہر نہ ہوگا۔ جہاں کوئی نہ کوئی آپ کا شاگرد نہ ہو۔ اس وقت شاگردوں

کی تعداد قریب قریب ۴۰۰ ہے۔ اس تعداد میں چالیس سچاس آدمی نہایت اچھے کہنے والے ہیں۔ اور بجائے خود صاحب دیوان ہیں۔

ہزاروں پرچہ رسالہ گلدستہ اخبار اطراف عالم سے نکلے۔ اور نکل رہے ہیں۔ پیشتر ان میں بھی آپ کا کلام شائع ہوا۔ اور ہوتا رہتا ہے۔ اب دو چار سال سے آپ اپنا کلام رسالوں میں کم بھیجتے ہیں۔ بیاض میں سے کسی شاعر کو نہ لکھ کر بھیج دیا۔ تو چھپ گیا۔ ورنہ عظیم الفرستی مانع رہتی ہے۔

آپ کے دو صاحبزادے ابوالحسن اور محمد حضر ہوئے۔ بڑے صاحبزادے کا انتقال تو چودہ برس کی عمر میں اور چھوٹے کا چھ برس کی عمر میں ہو گیا۔ اس وقت سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس وقت ایک صاحبزادی اور ایک نواسہ محمد احمد ملہ اور ایک نواسی ہے اسی نواسہ کے حق میں آپ نے اپنی کل جائداد بذریعہ وقف علی الاولاد کے منتقل کر دی ہے۔

اخلاق و عادات۔

حضرت نوح کی طبیعت نہایت صلح کل اور مرئیاں مرنج واقع ہوئی ہے۔ اور یہ اس محبت و ہمدردی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو ان کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ حلقہ احباب بہت فیض ہے۔ اور سب ان کے حسن اخلاق و اوصاف حمیدہ کے مداح ہیں۔ وہ اپنی طرف سے کبھی کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیتے۔ یہاں تک کہ کسی کی زبان سے غلط شعر سن کر بھی خاموش ہو رہتے ہیں۔ اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کسی کی ولنگی ہو جائے یا کوئی برا مانے جو یہ کلام سے ان کا دامن بالکل پاک ہے۔ استادوں کا ادب و احترام اس نہ تک ہے کہ استادوں کی زمین میں غزل کہنی سوا ادب خیال کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایسی غزلیں بہت کم ہیں جو پامال زمینوں میں لکھی گئی ہوں۔ اگر کسی پرانی زمین میں یا کسی کے دے ہوئے مصرع طرح پر غزل کہنے کا اتفاق ہوا ہو۔ تو اسے امجدوری سمجھنا چاہئے۔ ورنہ نئی نئی زمینیں خود تلاش کر لیتے ہیں اور ان میں اپنی شگفتہ طبیعت کے جو ہر دکھا کر باغ و بہار کا منظر پیدا کتے ہیں۔ اگر استادوں کی زمین پر کچھ کہنے کو طبیعت چاہے۔ تو ردیف یا قافیہ یا بحر میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیتے ہیں تاکہ بے ادبی سے دور رہیں۔

شعراے دہلی و کھنڈ کے باہمی جھگڑوں میں کبھی شامل نہیں ہوتے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی مشاعرہ میں داغ و خراب کی غیر طبعی نزول بدلتا تبرک پڑھی گئی ہے۔ تو حضرت نوح نے امیر میاں کی کوئی غیر طبعی غزل بھی خاص اصرار سے پڑھوائی ہے۔ مشاعروں میں شعرا کا یہ جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ کہ پہلے کون پڑھے اور اخیر میں کس سے پڑھوایا جائے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں اخیر میں پڑھوں۔ اگر سادہ حیثیت کے کئی شاعر کسی مشاعرہ میں جمع ہو گئے ہوں۔ تو یہ جھگڑا اور بھی نازک ہو جاتا ہے بہتم مشاعرہ کی شاشت آجاتی ہے۔ جس کا نام پہلے آگیا۔ وہی ناراض۔ ناچار یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ حروف تہجی کے اعتبار سے غزل پڑھوائی جائے تاکہ کسی صاحب کو شکایت نہ رہے۔ اس قسم کے جھگڑوں میں بھی

حضرت نوح اپنے انکار کا ثبوت دیتے ہیں اور صاف کہہ دیتے ہیں کہ مجھے جس وقت کہا جائے گا۔ اسی وقت اپنی غزل پڑھ دوں گا۔

کلام کی داد دینے میں بھی وہ بہت شہرت رکھتے ہیں۔ اور اس خاص وصف کی وجہ سے بھی کسی مشاعرے میں ان کا موجود ہونا غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بیچارے شعر کو صرف واہ واہی اڑائے لئے پھرتی ہے۔ اگر اس میں بھی بخل روا رکھا جائے۔ تو فی الواقع شاعر کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت داغ ہی کے شاگردوں میں ایک نامور شاعر جن کا نام ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں (واقعہً اصحاب خود ہی سمجھ جائینگے) کچھ ایسی افتاد طبعیت رکھتے ہیں اور کچھ ایسے بے باک واقع ہوئے ہیں کہ مشاعرہ میں اگر کسی نے کسی کو مکرارِ اشعار ہو کہہ دیا۔ تو یہ فوراً بول اٹھتے ہیں کہ نہیں کوئی ضرورت نہیں۔ ہم غصوں کا کلام سنتے ہیں۔ انصاف طبعیت پر غالب آگیا۔ تو کسی شعر پر یہ ارشاد ہو جاتا ہے۔ کہ یہ قافیہ آپ نے مجھ سے اچھا باندھا ہے۔ ورنہ ہر شعر پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ قافیہ میں نے اچھا لکھا ہے۔ مختلف بہانوں سے ان کو مجلس سے الگ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ صحبت میں بے لطفی پیدا نہ ہو۔ کئی شعرا ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ کسی کے کلام پر سر ہلانا گناہ سمجھتے ہیں۔ اور اچھے سے اچھے شعر کی داد دینے میں نہایت بخل سے کام لیتے ہیں۔ برخلاف ان کے حضرت نوح غلط اور سقیم شعر سن کر خاموش رہیں تو نہیں۔ ورنہ ہر اچھے شعر کی داد دینے میں وہ بہت ہی فراخ دل ہیں۔ اور یہ بات کچھ تصنع سے نہیں۔ ذوق سخن ان کو بے اختیار کر دیتا ہے۔

عام اخلاق و مروت کے لحاظ سے وہ ہندوستانی شرفا کا بہترین نمونہ ہیں۔ ایسے جامع جمیع اوصاف آدمی بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہر ایک ہندوستانی نوجوان کیلئے ان کا دستور اخلاق قابل تقلید ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں جب کہ ہر ایک چیز مغربی تہذیب کے طوفان میں بہ رہی ہے۔ مشرقی تہذیب کے عمدہ نمونے اگر تفتا کئے جائیں۔ تو حضرت نوح کا نام نامی نہایت اچھا انتخاب ہے۔ اور کسی کو اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے اوصاف حسنہ پر ایک مبسوط مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ مگر چونکہ ہمارے مضمون کا موضوع ان کے کلام بلاغت نظام کا تبصرہ کرنا ہے۔ اس لئے دوسری مفید باتوں کو چھوڑ کر ان کے کمال شاعری پر ناظرین کی توجہ مبذول کی جاتی ہے۔

بیشتر اس کے کہ اہل ذوق حضرت نوح کے پائے سخن کا کوئی معیار اندازہ کر سکیں۔ یہ جان لینا ضروری ہے کہ انہوں نے متروکات فصحائے حال کے علاوہ بہت سی ایسی پابندیاں اختیار کر رکھی ہیں۔ جو آج تک کسی نے اختیار نہیں کیں۔ مثلاً وہ قاتل سبیل مشکل وغیرہ قافیوں کے ساتھ مائل حائل وغیرہ توانافی نہیں لاتے۔ حالانکہ تمام اساتذہ سابق و حال نے اپنے کلام میں یہ تمام قافیے مخلوط کئے ہیں۔ وہ دریا صحرائے ساتھ جلوہ

شعلہ وغیرہ کے قافیے بھی نہیں لاتے۔ مطلع اول کے دونوں مصرعوں میں قافیہ اگر اردو زبان کے ہوں۔ تو غزل کے باقی اشعار میں بھی اردو کے قافیے لکھیں گے۔ اور اگر مطلع اول میں فارسی یا عربی کے قوافی آئے ہیں۔ تو غزل میں اردو کا کوئی قافیہ آنے نہ دیں گے۔ اگر مطلع اول میں ایک مصرع کا قافیہ اردو اور دوسرا فارسی یا عربی ہے تو صرف اس صورت میں مخلوط قافیہ باقی اشعار میں لکھیں گے۔

اس کے علاوہ اگر دو لفظ مل کر بامعنی لفظ ہو جائے۔ تو اسے نہیں لکھیں گے۔ مثلاً ہے اور جان کو بالاتصال نہیں آنے دیں گے۔ کیونکہ ان کے ملنے سے لفظ ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لفظ سین پر ختم ہوتا ہے۔ تو اس کا مابعد ایسا نہ لکھیں گے۔ جو سین سے شروع ہوتا ہو۔ کیونکہ ایک ہی آواز کے دو حرف مل کر نقل پیدا کرتے ہیں۔ پر کی جگہ پر نہیں لکھتے۔ کھا کر کی جگہ کھا کے اٹھا کے نہیں لکھتے۔ ارمان کے ساتھ مہمان کا قافیہ مطلع میں نہیں لاتے۔ اس لئے کہ حرف روی سے پہلے میم دونوں میں مشترک ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بادی النظر میں ان پانڈیوں کو شاید لزوم مالا یزیم سمجھا جائے۔ اور یہ کہا جائے۔ کہ یہ زبان کو محدود کرنے کی کوشش ہے۔ یا اس سے شعر گوئی میں بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ دشواریاں پہلے ہی کچھ کم نہیں۔ جو ماہرین فن نے اردو فارسی کی شاعری پر عائد کر رکھی ہیں۔ ایک مبتدی کی غزل پر فن کے لحاظ سے تنقید کی جائے۔ تو وہ بیچارہ متحیر ہوتا ہے۔ اور پوچھتا ہے۔ کہ اتنی پانڈیوں کے ہوتے ہوئے کوئی شخص اپنے خیالات آزاد می سے کس طرح ظاہر کر سکتا ہے۔ ایک شخص اچھی مثنوی بجز رجز مثنیٰ سالم میں لکھتا ہے۔ مثلاً شاہ نامہ اسلام، مگر جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مثنوی کی مقررہ بحر سے خارج ہے۔ تو اس کو اپنی محنت پر افسوس ہوتا ہے۔ ان بے انتہا پانڈیوں پر اتنی کڑی بندشیں جو حضرت نوح نے التزاماً اختیار کر رکھی ہیں۔ اور بڑھا دی جائیں۔ تو شعر کہنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر انصاف سے دیکھا جائے۔ تو یہ پانڈیاں پانڈیاں نہیں۔ بلکہ اصلاحات ہیں۔ اور فی الحقیقت نہایت عمدہ اور قابل قدر ہیں۔ اور زبان کو حشو و زوائد اور عیب و نقائص سے مبرا و منزہ کرنے والی ہیں۔

ہماری اس رائے سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو اتفاق نہ ہو۔ مگر اس مضمون میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ باوجود ایسی دشوار پانڈیوں کے اردو شاعری میں حضرت نوح نے کس قدر کمال دکھایا ہے۔ اور شہبازِ تحفیل نے پہلے سے بھی زیادہ رشتہ بہ پا جو کہ کتنی رفعت تک پرواز کی ہے۔ ایسی کڑی زنجیریں بڑھا دینے پر بھی اگر کوئی سامری فن اپنی سحر بیانی کا معجزہ دکھا سکتا ہے اور اپنی خوش بیانی کا سکھ بٹھا سکتا ہے۔ تو بلاشبہ اس کی کوشش اور محنت کی وقعت ناقدان سخن کے نزدیک بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور ہر شخص اس مصنف کی سعی بیخ کنی داد

میں نے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اتنی تہید عرض کر چکنے کے بعد اب ہم کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں حضرت نوح کے نوادر انکام میں صفت منقبت - سلام - قطعہ - رباعی - مثنوی - مرثیہ اور غزل ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ مگر زیادہ تر غزل لکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مجموعہ غزلیات دوسری قسم کے کلام کے مقابلے میں بہت زیادہ اور ضخیم ہے۔ اگرچہ کسی شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ نظم کی کسی ایک صنف سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے مزید ثبوت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی طبیعت ہر قسم کا کلام لکھنے پر حاکمانہ قدرت رکھتی ہو۔ بہت سے شاعر ایسے تھے اور ایسے ہیں کہ نظم کی ایک صنف میں تو خوب لکھتے ہیں۔ مگر دوسری صنف میں ان کا قلم شکستہ پا دکھائی دیتا ہے۔ حضرت ناسخ مرحوم غزل گوئی میں اتنے نامور اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ مگر مثنوی مصالح اعضاءے انسانی ان کے پایہ اعتبار سے ساقط ہے۔ زمانہ حال کے بہت سے مشہور اور مشاق غزل گو ایسے ہیں۔ جو غزل کے سوا اور کوئی تقریبی یا سنگامی نظم یا ملکی و قومی رنگ میں یا تو لکھ ہی نہیں سکتے اور اگر لکھتے ہیں تو بہت ہی معمولی اور پھیکا لکھتے ہیں۔ مگر حضرت نوح کے کلام میں نظم کی ہر ایک صنف موجود ہے اور ہر صنف میں ان کی طبیعت کا رنگ یکساں ہے۔ ان کے کلام کی متعدد خصوصیتیں آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔ قطعہ - رباعی - حمد - نعت - سلام - مرثیہ وغیرہ سب میں اپنی پوری قوت سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ خوش بیانی اور استادانہ بندش کا رشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ جو کچھ کہتے ہیں۔ ایک رنگ میں کہتے ہیں۔ ان کے سلام اور مرثیہ ان کے ظرفیانہ کلام کے بالمقابل رکھ کر پڑھے جائیں۔ تو تعجب ہوتا ہے۔ کہ اتنا در و بھرا کلام لکھنے والا شخص ہنسی ٹھٹھول کے ایسے مضامین کہاں سے نکال سکتا ہے۔

چونکہ کلام کا بڑا مجموعہ غزلیات کی صورت میں ہے۔ اس لئے پہلے غزل ہی پر بحث کی جاتی ہے۔ اس وقت غزل کے کئی نمونے دنیا کے ادب کے سامنے ہیں۔ ایک تو وہ رنگ ہے جس میں حضرت داغ حضرت امیر نے قبلیت عام و شہرت دوام کا تاج حاصل کیا۔ ان دونوں بالکمال استادوں کے شاگرد اسی رنگ کے شیدائی ہیں۔ دوسرا رنگ وہ ہے جس میں درد اور کیفیت کے سوا تیسری چیز نہیں ہے۔ اس قسم کی غزل شعریت کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی بلند ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ستر یا پامرثیہ ہے۔ جس کو غزل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس رنگ سے افسردگی - پرمردگی - بیزارمی اور زارنالی کے سوا اور کوئی ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا۔ جسے زندگی بخش کہا جاسکے۔ حالانکہ ملکی اور جماعتی ضروریات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ شاعری تمام افراد ملک کے لئے حیات افزہ ہو۔ اگر اس سے شگفتگی اور زندگی حاصل نہیں ہوتی۔ تو جہور کو اس سے

کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس نظریہ کے مطابق اگر غزل کی جانچ کی جائے۔ تو حضرت داغ کی غزل سب سے بہتر نمونہ تسلیم کی جائے گی۔ تیسرا رنگ وہ ہے۔ جس میں صرف زبان ہی زبان ہے۔ اور تخیل کو اس میں بہت کم دخل ہے۔ یہ رنگ زبان کی خدمت گزاری کے لئے تو بیشک مفید ہے۔ مگر تخیل کے عدم سے وہ شاعرانہ کمال میں شامل نہیں ہو سکتا۔ زبان کی خوبی آرائش و زینت کا سامان ہوا کرتی ہے۔ اگر زینت پائیوالے کا وجود ہی بیچ میں نہ ہو۔ تو یہ سامان زینت کس کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرز کو صرف باتیں ہی باتیں کہا جاتا ہے۔ مثلاً

سہ تہیں چاہو تہیں چاہو تہیں چاہو رقیبوں کو کبھی ہم نے نہ چاہا تھا نہ چاہیں گے نہ چاہا ہے

چوتھا رنگ فلسفیانہ و حکیمانہ ہے۔ افراد ملک کے لئے یہ رنگ بھی مفید ہے۔ بشرطیکہ بیان کی صفائی بھی اس کے ساتھ شامل حال ہو۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کوشش کی جاتی ہے۔ کہ شعر کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ اور غزل متحان کر رہ جائے۔ اس کے علاوہ ایک اور خرابی اس طرز میں مستزاد ہو رہی ہے وہ یہ کہ غیر متعارف الفاظ دور دور کے استعارے اور عجیب عجیب فارسی ترکیبیں جن میں غرابت کا عیب پایا جائے۔ نہایت کثرت سے استعمال میں آرہی ہیں۔ اس لئے جب تک یہ عیوب موجود ہیں۔ اُس وقت تک اس قسم کی غزل چنداں سودمند نہیں ہو سکتی۔ پانچواں رنگ وہ ہے جس میں ملکی۔ قومی۔ تاریخی۔ اخلاقی اور ذریعہ مضامین غزل کی طرز میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کی غزل کو غزل کہنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ تغزل کی کوئی بات اس میں نہیں ہوتی۔ یہ پانچوں نمونے مختلف طرز کے اس وقت ملک میں مروج ہیں۔ جن میں ایک مشترک خوبی یہ ہے کہ تہذیب جدید کے اثر سے جسے نئی روشنی کہا جاتا ہے۔ بالکل عریاں اور حیا سوز مضامین ہر قسم کی غزل سے مفقود ہو چکے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ زمانے کے مذاق نے ایسی تمام خرافات کو قابل نفرت اور آداب مجلس سے خارج قرار دیا ہے۔ حضرت فوج کی غزل بھی اس اثر سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ کسی قسم کے برہنہ مضامین جن کا وجود دورِ آخر کے تمام شعرا کے کلام میں کم و بیش موجود تھا۔ ان کی غزل میں نہیں پائے جاتے۔

مذکورہ بالا قسم کی پانچوں غزلیں اگر ایک جگہ رکھی جائیں۔ اور غزل کی تعریف جو فن کی کتابوں میں درج ہے اس کے لحاظ سے اچھی غزل کا انتخاب کیا جائے۔ تو ہمارے خیال میں وہ غزل انتخاب میں آئے گی۔ جو پہلی قسم کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔ حضرت لعل کی غزل بھی اسی رنگ میں ہوتی ہے جس کو پڑھ کر کسی قسم کی افسردگی یا بیزاری پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ گفتگوئی و زندگی کا ایک دریا اپنی موج میں بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زبان نہایت شیریں اور شستہ۔ اس پر سلیس اور عام فہم اتنی کہ ہر شخص سمجھ سکے۔ بیان اس قدر صاف اور سمجھا ہوا کہ شعر پڑھا اور دل میں اترا۔ بندشیں اتنی ٹھوس کہ کوئی لفظ اپنی جگہ سے نہیں ہلایا جاسکتا۔ حشو و زوائد کا نام تک نہیں پایا جاتا۔

مضامین اتنے بلند تازہ اور دلکش گویا معانی کے آسمان پر بیٹیاں نورانی صورتیں اپنے جہاں آرا جمال کے جلوے دکھا رہی ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ آنکھوں والو! ذرا ادھر تو دیکھو۔ ان جلووں کو ایک نظر دیکھ کر اگر ہوش باقی رہ جائے۔ تو پھر تانا کہ ہم کیا چیز ہیں۔

مناسب یہ تھا کہ اس مقام پر کم سے کم تین چار غزلیں سالم نقل کی جاتیں۔ مگر ایک تو حضرت نوح کی غزل عموماً لمبی ہوتی ہے۔ وہ اپنی پُرگوئی کے تقاضے سے جب تک پندرہ یا بیس شعر بلکہ بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ اشعار نہ لکھ لیں اور غزل کی زمین کو اپنی گرم رفتاری سے ابھی طرح پامال نہ کر ڈالیں۔ اس وقت تک ان کی طبیعت زیر نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اس مضمون کی طوالت کا خوف بھی دامن گیر ہوتا ہے۔ اس لئے صرف ایک غزل جو مختصر بھی ہو۔ بطور نمونہ یہاں درج کی جاتی ہے۔ تاکہ اہل ذوق غزل کی مجموعی نوعیت کا اندازہ کر سکیں۔ اس کے بعد محاسن کلام کو تفصیل وار بیان کیا جائیگا۔

غزل

دل ملا کر دل کو وہ کرتا ہے کیوں دل سے الگ
درد و غم ارماں نہیں ہوتے کبھی دل سے الگ
رہ گیا بس اب اسی پر زندگی کا آسرا
شمع کے سر بھی مصیبت آئی پر دانے کے ساتھ
پہلے دو بچھڑے ہوئے آپس میں ملتے ہی نہیں
عشق میں تقدیر نے ڈالا یہ کیسا تفرقہ
پہلے اس کو دیکھ پھر اے قیس اپنے دل کو دیکھ
روز و شب رہتا ہے مجھ کو بھیاں بزم ناز کا
یہ تو اے سفاک تیرے عہد میں ممکن نہیں

کیا انہیں طوفان کا ڈر کیا انہیں موجوں کا خوف
نوح بحر عشق میں رستے ہیں سال سے الگ

اکثر ناقدان سخن اور کلامان فن نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہر غزل میں اچھے اشعار کی تعداد دو تین سے زیادہ نہیں ہوتی۔ باقی تمام شعر بھرتی ہوتے ہیں۔ جن میں کوئی خاص خوبی یا جدت نہیں پائی جاتی۔ اس نقل

کوفہ میں رکھ کر مذکورہ بالا غزل کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر ایک شعر لطف زبان و حسن بیان کی دولت سے مالا مال ہے اور اس میں شاعرانہ انداز کی وہ تمام خوبیاں اور اوصاف موجود ہیں جو ایک باکمال استاد کے کلام میں ہونا کرتے ہیں۔

محاسن کلام۔

حضرت نوح کے کلام فصاحت و نظام میں شاعرانہ حسن ادا کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جن سے شعر پر سحر و حلال کی تشبیہ صادق آسکے۔ مگر جس طرح ہر استاد کے کلام میں چند باتیں امتیازی حیثیت سے پائی جاتی ہیں اسی طرح ان کے کلام میں بھی بعض محاسن ایسے نمایاں طور سے نظر آتے ہیں جو ان کو اپنے تمام ہم عصروں سے زیادہ ممتاز کرتے ہیں۔ ان محاسن کی جھلک ان کے تمام مجموعہ کلام میں صاف نظر آتی ہے۔ یہاں ان مخصوص محاسن کی کسی قدر تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

پہلا نمایاں وصف ان کے کلام کا یہ ہے کہ کلام نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ پڑھتے ہی دل میں اتر جاتا ہر پیچیدہ بیانی اور دشوار گوئی کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔ اس وصف کو استادانِ سلف کے بعد حضرت داغ نے بہت نمایاں کیا تھا۔ اور یہ کہنا بالکل بے مبالغہ ہے کہ حضرت نوح نے اس روش کو اتنی ترقی دی ہے کہ کلام کا اس سے زیادہ عام فہم اور سلیس ہونا بالکل ناقابلِ عمل دکھائی دیتا ہے۔ تخیل کو ہاتھ سے چھوڑ کر صرف زبان ہی زبان کو سرمایہ شاعری سمجھ لیا جائے۔ تو شاید اس سے زیادہ ترقی کی گنجائش نکل سکے۔ لیکن تخیل اور زبان کو ساتھ ساتھ رکھا جائے تو حضرت نوح کا کمال سخن اس خاص وصف میں منتہائے کمال ہے۔ بعض لوگ کمال شاعری کا معیار یہ سمجھ ہوئے ہیں کہ صرف خواص ہی اس کو سمجھ سکیں اور عوام کیسے اس کا سمجھنا لوے کے چنے چبانے کا مصداق ہو۔ انہیں لوگوں کا یہ مقولہ ہے کہ حضرت داغ کے طرز سخن نے شاعری کو بہت آسان کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال سراسر غلط ہے اور اس پر دو زبردست اعتراض عاید ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر ملک اور قوم میں حیاتِ تازہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا زندگی بخش کلام ایک قبیل، النعماء و جماعت تک جسے خواص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں محدود رہے۔ کیا ملک اور قوم کے کثیر النعماء افراد اس کے حیات افروز افکار سے مستفید ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ وہ بلاشبہ یہ حق رکھتے ہیں اور ہمارے خیال میں سب سے زیادہ حقدار وہی ہیں۔ کیونکہ عوام ہی اس نئی زندگی کے محتاج ہوتے ہیں۔ پس ایک خوش بیان شاعر اگر گونگے کی فارسی کھٹنا چلا جاتا ہے۔ تو اس سے وسیع سطح آب کے ایک محدود حصے میں برائے نام ہلکا سا موج پیدا ہو جانے کے سوا اور کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ آخر یہ نموج بھی تھوڑی دیر میں مٹ کر رہ جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کلام

کامام فہم ہونا بذات خود کمال شاعری ہے۔ اسے شاعری کو آسان کر دینا کس طرح کر سکتے ہیں جب کہ یہ وصفت فی الحقیقت ایک دشوار کام ہے۔ مشکل سے مشکل۔ دقیق سے دقیق اور نازک سے نازک مضامین جو شعر میں بیان کرنا چاہیں تو کئی سطروں میں بیان ہو سکیں۔ اگر چھوٹی سی بحر میں چند گنتی کے الفاظ استعمال کرنے سے بخوبی ظاہر ہو جا رہا ہے۔ تو یہی کچھ کم خوبی کی بات نہیں۔ خواہ ان الفاظ میں چند پیچیدہ استعارے اور مسلسل اضافتیں بھی کیوں نہ ہوں۔ لیکن شاعر نے ان پیچیدہ استعاروں اور مسلسل اضافتوں کو بھی استعمال نہ کیا ہوا اور مضمون کو نہایت سلیس اور عام فہم رنگ میں برقی وضاحت و صراحت سے بیان کر دیا ہو۔ تو اس سے زیادہ کمال شاعری اور کیا ہو سکتا ہے مثالیں ملاحظہ ہوں۔ —

اے دل زار وہ آتے ہیں عیادت کیلئے اب سنبھلنا ہی پڑاے کے سنبھالا ہم کو
دل زار کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اور کوئی غمخوار موجود نہیں ہے۔ بالکل تنہائی کا عالم ہے۔
لفظ سنبھالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریض کی حالت کس قدر غیر ہے۔ سنبھلنا ہی پڑا۔ اس سے جو مجبوریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی تشریح و چار لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک دریا ہے۔ جو ان تین لفظوں کے کوزے میں بند ہے۔ کیوں سنبھلنا پڑا اس کی وجہ مصرع اول میں بیان کی ہے۔ کہ وہ عیادت کے لئے آتے ہیں۔ مگر یہ وجہ محض ظاہری ہے۔ اصلی وجہ کو ناقابل اظہار سمجھ کر پردہ راز میں رکھا گیا ہے۔ اب یہ سخن فہموں کا کام ہے۔ کہ اس راز کو ٹوٹ لیں۔ کہ وہ عیادت کو آئے ہیں۔ تو سنبھلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ یہ اخفا اس شعر میں نہایت دلچسپ ہے۔ اور اس میں بہت سے مطالب پوشیدہ ہیں۔ علاوہ اس کے شعر کی ظاہری صورت کس قدر صاف اور دلکش ہے۔ سنبھلنا اور سنبھالنا کا لطف دیکھئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ باوجود ان تمام خوبیوں کے شعر تا شیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ —

غور سے دیکھ ذرا ادبِ مشتاقِ جمال طور پر کچھ نظر آتا ہے اُجالا ہم کو
مشتاقِ جمال کو جلوہ جمال کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ اس کی تلاش میں سرگردان و حیران ہو رہا ہے۔ اگر تھوڑی سی جھلک کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔ تو بھی اس کو یقین نہیں آتا۔ وہ سمجھتا ہے۔ کہ ایسے نصیب کہاں۔ اس لئے غور سے دیکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ کہ ادبِ مشتاقِ جمال۔ طور پر کچھ اُجالا دکھائی دے رہا ہے۔ اسے غور سے دیکھ۔ کہ آیا یہ اسی مطلوب کا جلوہ ہے یا کچھ اور ہے۔ لفظ غور اس شعر میں بالکل اُتار دینے سے
لڑکھڑا کر کبھی قدموں پر جوساکی کے گرے پھینک کر جام و سبب اس نے سنبھالا ہم کو
آج تک کیوں نہ خبر لی نہ خبر لی تم نے آج تک کیوں نہ سنبھالا نہ سنبھالا ہم کو
پہلے شعر میں لڑکھڑانے کی وجہ لفظ ساقی اور جام و سبب سے ظاہر ہے۔ اس کو ظاہر نہ کرنا بھی بلاغت کا

حق ادا کرنا ہے۔ لفظ کبھی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اتنی نہیں پی جاتے جس سے بالکل بذست ہو جائیں۔ یہ لغزش کبھی کبھی ہو کر تھی ہے۔ مگر اس عالم میں بھی اتنا ہوش باقی رہنا ہے کہ گرتے ہیں۔ توساقتی ہی کے قدموں پر گرتے ہیں اس کے بعد دوسرے مصرع میں ساقی کے التفات کو واضح کیا گیا ہے مضمون کا یہ حصہ نہایت پر لطف ہے۔ اس میں محاکات کا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ ساقی نے دلی محبت اور ہمدردی و الفت کے تقاضے سے ہمیں سنبھالنے کی کوشش کی۔ پھینک کر جام دبو۔ یہ الفاظ اس کوشش کی نہایت روشن تصویر ہیں۔ یعنی ساقی نے اس قدر عجلت سے کام لیا اور اس قدر التفات کا ثبوت دیا۔ کہ جام و سبو کی جو اس کی عظمت کا سرمایہ تھے بطور پروانہ کی۔ انہیں فوراً پھینک دیا اور ہمیں سنبھالنے پر آمادہ ہوا۔

دوسرے شعر میں لفظ آج تک سے جو طویل مصیبت ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ شکایت کی تکرار اور وہ بھی دونوں مصرعوں میں تقابل کے ساتھ کیا مراد یہی ہے کہ جس کی حد جس کی ہو کچھ میعاد بھی۔ وہ گرفتاری گرفتاری نہیں۔

کنایت اپنی طویل گرفتاری جس سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اس شعر میں بیان کی گئی ہے۔ اور یہ اسلوب بیان بہت نادر ہے۔ شعر سزا پا شعریت ہے۔ محبت میں گرفتار ہو کر آزادی کہاں۔ اگر کچھ عرصے کے بعد آزادی مل گئی ہے۔ یا مل جائے گی۔ تو وہ عشق ہی نہیں۔ بلکہ محض مطلب برآری ہے۔ ایسی گرفتاری کو گرفتاری عشق نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے مصرع کے آخر میں لفظ "بلکہ مطلب برآری ہے" کو محذوف سمجھنا چاہئے۔ یہ محذوف حزن بیان میں شامل ہے۔

پہلے تم نے دل لیا پھر تم نے میری جان لی بعد اس کے یہ کیا اب کیا کرو گے اس کے بعد بعد اس کے یہ کیا۔ اس کی تشریح مصلحتاً نہیں کی گئی۔ کیونکہ درحقیقت وہ ناگفتی ہے۔ یہ ایک ایسی مصیبت ہے جو جان لینے سے بھی زیادہ تباہی پیدا کرنے والی ہے۔ اور قتل کر دینے کی سختی سے بھی زیادہ جابرانہ ہے۔ اس حد تک کہ بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ با ایں ہمہ یہ یقین ہے۔ کہ ابھی اس جو رستم کا خانہ نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے پوچھنا ہے کہ اب کوئی آفت برپا کر و گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے۔ کہ اب اس سے زیادہ سختی اور کیا کر و گے۔ یہ چند مثالیں اس غرض سے پیش کی گئی ہیں کہ نازک سے نازک مضامین کو جن کی تشریح کئی سطروں میں ہوتی ہو۔ ایک شعر میں بیان کر دینا اور وہ بھی اتنے عام فہم۔ اتنے سلیس اور صاف پیرائے میں جس سے زیادہ صاف پہلو خیال میں نہیں آ سکتا۔ فی الواقع کمال شاعری کا ثبوت ہے۔ اس خصوصیت سے متعلق زیادہ مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ حضرت نوح کا کلام اس لغت سے مالا مال ہے۔ یہاں تک کہ تمام مجبورہ کلام میں ہمیں ایک شعر بھی ایسا نظر نہیں آیا۔ جو عام فہم اور سلیس نہ ہو۔ ان کے کلام کا کثیر حصہ بھل منتع ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نوح کا کلام بے ساختہ اور تصنع و آلودہ سے قطعاً پاک ہے۔ اور اس سے ان کی مفتی سخن نمایاں اور مہارت تامہ کا ثبوت ملتا ہے۔ تصنع و آلودہ کا رنگ و پہلو رکھتا ہے۔ معنوی بھی اور لفظی بھی معنوی آلودہ ہے۔ کہ ایک بے محل مضمون کو تکلف کے ساتھ اپنے کلام سے مربوط کر لیا جائے۔ کہ درحقیقت وہ ربط کھانے کی صدا صحبت نہ رکھتا ہو۔ لفظی آلودہ وہ ہے۔ کہ عجیب و غریب قسم کے الفاظ ناو ترکیبیں اور زوائد جمع کر دے جائیں۔ جن سے ایک سیدھا سادہ مضمون الفاظ کے گورکھ و معنی میں الجھ کر رہ جائے۔ یا مناسبات اور صنائع لفظی کا اس قدر ضبط ہو۔ کہ ایک لفظ کے کئی کئی مناسبات ایک مصرعہ میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ جیسا کہ امانت کے واسطوخت میں ہے۔ مثلاً ق اور ماہر فن دونوں قسم کے نقائص کو نور اچھلے لیتے ہیں اور خود کبھی اس ربط میں مبتلا نہیں ہوتے۔ کیونکہ ذوق سخن اس قسم کے کلام کو قبول کرنے سے ابا کرتا ہے۔ ان کی زبان سے لفظ بہت بچے تھے۔ باون تو نہ پاؤرتی نکلتے ہیں۔ جوابی کم سے کم تعداد میں تمام مضمون پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ مصرعہ پر مصرعہ ایسا لگاتے ہیں۔ کہ اس سے بہتر مصرعہ خیال میں نہیں آ سکتا۔ اور اس میں ایک لفظ کی ترمیم کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مثلاً مصرعہ ذیل۔

ایک فہرست مرے پاس ہے ویرانوں کی۔

کسی شاعر کو دیا جائے اور کہا جائے۔ کہ اس کی تضمین کرو۔ تو اسے محسوس ہوگا۔ کہ اس پر مصرعہ لگانا اور اس میں ربط پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔ مگر حضرت نوح نہایت میاں خستہ کہہ دیتے ہیں۔

جوش و خشت میں کسی قسمت نکل جاؤں گا۔ ایک فہرست مرے پاس ہے ویرانوں کی
یا ذیل کے مصرعہ پر (دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے) مصرعہ لگانا ہے۔ اب ہر شخص کو یہ سوچنا پڑے گا کہ کس طرح سے دل لگانے میں محض دل لگی پائی جاتی ہے۔ دور دور تک خیال دوڑائیں گے۔ یہاں تک کہ مجنوں اور زبانی قبر پر بھی خاک چھائیں گے۔ مگر حضرت نوح دور نہیں جاتے۔ بے ساختہ بول اُٹھتے ہیں۔
جس نے شیدائی بنایا اس کے شیدائی ہے۔ دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے
دیکھئے یہ مصرعہ کس قدر چست اور مربوط ہے۔ کہ اس سے بہتر اور کوئی مصرعہ خیال میں نہیں آ سکتا۔

تیسری خصوصیت الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تقدیم و تاخیر نظم میں ناگزیر ہے۔ مگر اتنی نہیں ہونی چاہئے۔ کہ تنقید لفظی کا عجیب پیدا ہو جائے۔ حضرت نوح کے کلام میں یہ امتیاز سی و صحت ہے۔ کہ انہوں نے الفاظ کی تقدیم و تاخیر حیرت انگیز حد تک کم کر دی ہے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد جن کی نثر نہ بن سکے۔ اس قدر زیادہ ہے۔ کہ کسی ہستاد کے کلام میں ایسے اشعار اپنی کثیر تعداد میں نہ ہونگے مثلاً

ملک کے پار ہوتی ہے کیلئے میں اترتی ہے ہماری ایک اک فریاد دو دو کام کرتی ہے
ہمارا دل ہویا ان کی زبان دونوں ہی آفتیں یہ سب کچھ گزرنا ہے وہ ہر کچھ گزرتی ہے

اب ہمارے دل میں اس سیدر کی الفت نہیں اور اگر بالفرض ہے تو بھی کمی کے ساتھ ہے
آپ اپنے کو بھی دل سے بھول جانا چاہئے ترک دنیا کا مزہ ترک خودی کے ساتھ ہے

حسن روز افزوں جو پردے سے عیاں ہو جائیگا ایک وہ کیا میں فدا سا راجاں ہو جائے گا
چرخ کی ناہربانی بھی مزادے بائیسکی کوئی اس کی خند سے مجھ پر مہرباں ہو جائے گا
ہم کو اپنے عشق کے اظہار کی عادت نہیں ہے کہے یہ خود بخود ان پر عیاں ہو جائے گا

چوتھی خصوصیت جو حضرت نوح کو تمام شعرائے ماضی و حال سے امتیازی درجہ دیتی ہے۔ وہ ان کی زبان اور روزمرہ ہے۔ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ اردو زبان کو ہندوستان میں اگر عام قبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ تو صرف اس صورت میں کہ اس میں سے فارسیّت کا عنصر جس حد تک بھی کم ہو سکے۔ کم کرو یا جائے اور اسے عام تصنیفات میں اس قدر سلیس اور عام فہم لکھا جائے کہ اس کا سننا اور سمجھنا کسی قسم کی دشواری پیدا کرے جن شعرا نے اس اصول کو مد نظر رکھا ہے۔ ان کا کلام سید مقبول ہوا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جس کلام میں بے بے فارسی الفاظ اور مسلسل ترکیبیں داخل کی گئی ہیں۔ وہ زبان پر نہیں چڑھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی زبان روزمرہ کے خلاف ہوتی ہے۔ فصحا اپنی معمولی گفتگو میں جس قسم کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہی بے تکلفانہ رنگ شاعرانہ انداز کے ساتھ کلام میں بھی قائم رکھا جائے۔ تو وہ بہت پر لطف معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ زبان کے لحاظ سے ان نیچرل (غیر قدرتی) ہو جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ حضرت دلاور خان نے اس ضرورت کو سب سے زیادہ محسوس کیا اور اپنے کلام کی بنیاد اسی اصول پر قائم کی۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے مقدّم کے مطابق ان کی پیروی کی۔ مگر پیروی پیروی میں بھی مراتب کا اختلاف ہوتا ہے جنہرے نوح نے اس اصول کی پیروی میں کہاں کر دیا ہے۔ انہوں نے متر و کات کی نہایت سختی سے پابندی کی ہے اور ان کے علاوہ مختلف قسم کے جدید متر و کات بھی وضع کئے ہیں۔ فارسی عطف و اضافت کو انتہائی حد تک اڑا دیا ہے۔ آج کل کئی نامور شعرا صحت زبان کے مدعی ہیں۔ مگر ہم ان کے کلام میں فارسی کے حرف جار اور دوسرے فارسی الفاظ خالص فارسیّت کے رنگ میں موجود پاتے ہیں۔ تو الی عطف۔ تو الی اضافات اور دوسری فارسی ترکیبیں مثلاً

تاہم مردن۔ پس از مرگ۔ شرر آسا۔ شعلہ ساں۔ تابہ خانہ۔ تابہ فلک وغیرہ بے دھڑک استعمال ہو رہے ہیں ان کے علاوہ یاں داں۔ یہ معنی لیکن۔ مگر معنی شاید وغیرہ مزدکات اچھے اچھے نامور اپنے کلام میں لکھتے چلے جاتے ہیں عجیب عجیب فارسی ترکیبیں تراشی جاری ہیں اور ان کو استعمال کرنے والے منچکھوں پرتاؤ دیتے ہیں۔ گویا بڑی مہم ماری ہے۔ مثلاً نواز زار۔ کیف زار۔ خوشاں۔ جلوه ستان۔ نواز زار۔ کیف ریز (زار ریز) ستاں کی خوب مٹی خراب ہو رہی ہے، وغیرہ۔ اس کے علاوہ دہلی ولکھنؤ کے بعض شعرا کلام کو عام افہام سے بالاتر بنانے کی مشق میں مصروف ہیں اور اسے اردو شاعری کے اوج ترقی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ درد اور کیف کے سوا تیسری چیز کچھ نہیں لکھتے۔ اور کچھ لکھتے ہیں۔ اسے پڑھ کر گونگے کے گڑ کی طرح دل ہی دل میں مزے لیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے تمام مصنفت زبان کی کوئی خاص خدمت نہیں کر رہے ہیں۔

پس صحت کے لحاظ سے جن شعرا کو صحیح معنوں میں زبان کا خادم کہنا چاہئے۔ ان کی تعداد نہایت قلیل ہے اور اس قلیل تعداد میں حضرت نوح کو جو فوقیت حاصل ہے وہ اسقدر لاثانی ہے۔ کہ اس خاص وصف میں کوئی شخص ان کا مد مقابل نہیں ہے۔ اور تو اور دہلی ولکھنؤ کے شاعر میں بھی زبان کا وہ بیسیاختہ رنگ اتنی نہایت صورت میں نہیں پایا جاتا۔ جو حضرت نوح کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔ یہ کہنا بالکل سچا ہے۔ کہ حضرت داغ نے خدمت زبان کا جو مشن شروع کیا تھا حضرت نوح نے اس مشن کو صد تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ ان کا کلام اردو زبان کی نہایت صحیح لکچر اور روزمرہ کا نہایت پاکیزہ و شستہ ہے۔ جس میں کہیں کوئی داغ یا دھبہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس اظہارِ کمال کے باوجود انہوں نے تکمیل کا سرشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ دقیق سے دقیق مضامین اسقدر صفائی و سلاست سے زبان اور روزمرہ کی پابندی قائم رکھ کر بیان کر جاتے ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ سننے والا سنتا ہے اور سردھناتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جو کسی کی ادا پہ فدا نہ ہوا جو کسی کی ادا پہ فدا نہ رہا
مردن میں سے مرے ہوش میں سے مرے قتل میں سے مرے یاد میں ہے
جو وہ تم نہ رہا تو وہ دل نہ رہا جو وہ تم نہ رہے تو وہ تم نہ رہے تو وہ تم نہ رہے تو وہ تم نہ رہا
تینوں شعروں میں زبان کا جو رنگ دکھائی دیتا ہے وہ ہمارے دعویٰ کا نہایت روشن ثبوت ہے۔ پہلے شعر میں فدا نہ ہوا اور فدا نہ رہا کا معنوی فرق ظاہر کیا ہے۔ اس قسم کے نکات حضرت نوح نے جا بجا حاصل کئے ہیں مصرعہ ثانی میں زور کلام کا جو نمونہ نظر آتا ہے وہ نہایت لاثانی و بے مثل ہے۔ پھر فیصلہ کی شان دیکھئے۔ کس درجہ ناطق اور کس حد تک قطعی ہے

دوسرے شعر میں اپنی یادداشت کو کس زور سے بیان کیا ہے۔ کہ مصرعہ اول کی ساخت دیکھ کر

حیرت پیدا ہوتی ہے۔ اس یادداشت کا مضمون کیا ہے۔ وہ مصرع ثانی میں بیان کیا گیا ہے۔ جو بجائے خود نہایت دقیق اور نہایت پیچیدہ روحانی مسئلہ ہے۔ وہ الگ بھی ہوا تو الگ نہ ہوا وہ جدا بھی ہوا جدا نہ رہا۔ اشعار شمر کیا وجدانی کیفیت ہے اور ہل متنع کا رنگ کس قدر نمایاں ہے تیسرا شعر ایک غیر فانی ادبی شاہکار ہے۔ اتنے چھوٹے چھوٹے لفظوں سے جو یا تو دوحرفی ہیں یا سہ حرفی ہیں۔ اتنا بڑا کام آج تک کسی شاعر نے نہ لیا ہوگا۔ سلسلہ کلام کی کڑی ایک دوسرے سے اس طرح ملتی جلتی ہے کہ ربط کلام کا یہ منہ نہ ڈھونڈے سے بھی نظر نہ آئیگا۔ چاروں ٹکڑوں میں سے ہر ایک ٹکڑا بجائے خود ایک مضمون ہے اور ہر ایک کی تشریح میں بہت سی قوت بیانیہ اظہار کرنا پڑتا ہے غم محبت کے بغیر دل ہمو کی بوند کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب دل اسقدر حقیر و بے مایہ ہو جائے تو انسان کی فضیلت بھی حقیر و بے مایہ ہو جاتی ہے۔ طالب کا اس قدر حقیر و بے مایہ ہو جانا مطلوب کی شان کو شاکستار ہے

اگر نہ بہر من از بہر خود عنزیم دار کہ بندہ خوبی او خوبی خداوند است
اور جب مطلوب کی شان ہماری رسوائی کی وجہ سے کم ہو جائے۔ تو یہ ندامت اور بھی سولہاں روح ہے جس سے محبت کا تمام سلسلہ بے لطف ہو جاتا ہے۔ اس قدر دقیق روحانی مسائل کو ایسی حیرت انگیز سادگی سے بیان کر جانا اور اس میں بھی زبان کا یہ رنگ بھر دینا ثابت کرتا ہے کہ اس سے زیادہ کمال شاعری کا دشوار ہے

وہ کرم وہ لطف کہ مر گیا وہ خوشی کا وقت گزر گیا
کوئی آرزو نہ نکل سکی کبھی شکل غم نہ بدل سکی
وہ ہجوم ظلم و جفا ہے اب وہ نزولِ قہر و بلا ہے اب
نہ وہ آئیں گے نہ بلائیں گے یونہی جان لیں گے تائیں گے
پہلا شعر میں ملال نہ ہونے کا ملال حسن بیان کی نزاکت کو ظاہر کرتا ہے

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی یہی
دوسرے شعر میں مصرعہ اول حسرت و یاس کی مجسم تصویر ہے۔ جس کا اثر دوسرے مصرعہ کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو امید تھی وہ امید ہے۔ جو خیال تھا وہ خیال ہے۔ وہ خیال ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ وہ اپنی اصلی صورت میں وہی کا وہی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ محض خواب و خیال اور بے اصل ہے۔ حسن بیان اور یہ سادگی ہے

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

تیسرے شعر میں بھی وہی صنعت تریصیح موجود ہے۔ جو ہر ایک شعر کے مصرعہ اول میں پائی جاتی ہے۔ کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے لفظ وہ کافی تھا۔ مگر اظہار مصیبت کی تکرار نے اس زور کو دو چند کر دیا ہے۔ مصرعہ ثانی میں زندگی کو چار روز کی زندگی کہنا بالکل استادانہ طرز بیان ہے چار روز نے مصرعہ کے ظاہر و باطن دونوں کو چمکا دیا ہے۔ چوتھے شعر میں دھن اور خیال کی صراحت نہیں کی گئی۔ اگر یہ اخفا ہے۔ تو عین مصلحت ہے۔ ورنہ روزمرہ بھی یہی ہے اور اس محل پر یہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے۔ کہ وہ اور دھن میں ہیں۔ میں اور خیال میں ہوں۔ اپنے لئے خیال اور ان کے لئے دھن کہنا بھی نکتے سے خالی نہیں ہے

پہلے میرا حال سن پھر سن کے میرا حال دیکھو دیکھو کر پھر غور کر پھر غور کر کے دل سے پوچھ یہ تغافل ہے برا یہ بے رخی اچھی نہیں رنج دل کا درد دل کا حال دل کا دل سے پوچھ پہلے شعر کی ساخت اور اس میں مضمون کو سلسلہ در سلسلہ دیکھ کر حیرت پیدا ہوتی ہے۔ معاملہ کی بات کس خوبی سے کہی ہے۔ یہ اسلوب بیان بہت نادر الوجود ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا ارشاد کیا ہے اور کس قدر بجا فرمایا ہے۔ ظاہری ہمدردی سے کیا ہوتا ہے۔ کیفیت تو سنی نہیں۔ پہلے وہ سن لو۔ پھر اس کی صداقت کا امتحان کر لو اور اس مصیبت کا اندازہ کر لو۔ پھر اس کے وجہ پر غور کرو اور اپنے دل سے پوچھو۔ تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ (ع) اے باد صبا! میں نہ آؤں نہ دست

دوسرے شعر میں قافیہ کی بندش کس قدر مرغوب ہے۔ دل سے پوچھ یعنی سچے دل سے پوچھ۔ ورنہ یہ ظاہری اور اوپری ہمدردی مجھے کچھ فائدہ مند نہیں ہو سکتی۔ مصرعہ ثانی میں رنج دل کا درد دل کا حال دل کا۔ ان الفاظ کی تکرار سے جو زور کلام پیدا ہوا۔ وہ ظاہر ہے۔

اس ضمن میں صد ہا مثالیں بیان پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ کہ زبان کے لحاظ سے حضرت نوح کا پایہ سخن کس قدر بلند ہے۔ لیکن طویل کلام کے خوف سے صرف چند مثالیں بغیر کسی مزید تشریح کے اور درج کی جاتی ہیں

کوئی کیوں اس پہ عاشق ہو کوئی کیا اسکا شیدا ہو
کسے معلوم کس کا تھا وہ کس کا ہے وہ کس کا ہو
گزرتی ہے بشر کی زندگی کس کس تو ہم میں
جو ایسا ہو تو ایسا ہو جو ایسا ہو تو ایسا ہو
تہارے وعدہ فر داپہ کیونکر اعمت بارگاہے
کبھی کبھی ہو کبھی کبھی ہو کبھی کیا ہو کبھی کیا ہو

مراد لے کے مجھ کو غم ترا بے انتہا دینا
یہ کیا باتیں ہیں کیا گھاتیں ہیں کیا لینا ہے کیا دینا
وہ اے قاصد بھلا کب ان تری باتوں میں آتے ہیں
بہت دشوار ہے ملنا ملا لینا ملا دینا

بعض اصحاب ان تری باتوں کی جگہ تیری ان باتوں کھجالتے ہیں۔ مگر حضرت نوح اس محل پر مضمون الیہ کی مضا سے ملتی رکتے ہیں۔ اور یہی دستور العمل نصیح درست ہے۔ مصرع ثانی میں ملنا۔ ملا لینا۔ ملا دینا کا فرق کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

کہاں شمشیر کا دم خم کہاں خون دل عاشق اسے تلوار پر دیکھا اسے تلوار میں دیکھا دو مختلف چیزوں میں فرق بیان کرنے میں یہ طریق استدلال بالکل نرالا اور نیا ہے جس میں زبان کے نکات حل کئے ہیں۔ تلوار کا دم خم تلوار میں ہوتا ہے اور خون دل عاشق تلوار پر ہوا کرتا ہے۔ اس لئے دونوں چیزیں بالکل مختلف ہیں۔

آپکے انداز کر چکتے مجھے اب تک ہلاک وہ تو کہیے غیب سے میری ملک ہوتی رہی کیا کہیں ہم کہ سکے پھر بھی نہ اپنے دل کی بات گفتگو ہونے کو ان سے ویر تک ہوتی ہی پہلے شعر میں وہ نو کہیے۔ یہ روز مرہ کس بے تکلفی سے نظم ہوا ہے۔ دوسرے شعر میں رکن صدر بلحاظ مضمون باقی شعر سے کتنی مناسبت رکھتا ہے۔ اسی شعر کے مصرع ثانی کی زبان اور اس کی بے تکلفی قابلِ داد ہے۔ کسی کو بیٹھ کر ہم نے یہاں اٹھتے نہیں دیکھا اگر اٹھتا ہے تو فتنہ تری محفل سے اٹھتا ہے وہاں سے جو نکلتا ہے نکل جاتا ہے دم اس کا وہ اٹھ جاتا ہے دنیا سے جو اس محفل سے اٹھتا ہے یہ حیرت کم کو ہوتی ہے تہا رے ناز بجا پر جو دنیا سے نہیں اٹھتا وہ کیونکر دل سے اٹھتا ہے جو ان کو سرگذشت یا ر غم تحریر کرتا ہوں تو میرے خط کا اک اک لفظ بھی مشکل اٹھتا ہے اس زمین کو دیکھئے اور پھر ہر شعر میں ردیف کا ثبوت ملاحظہ کیجئے۔ آخری شعر میں باغرم یہ بخڑا استاد ہے۔ ایسی زمین میں خوش بیانی کا یہ کمال ع

ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہے عالی

پانچویں خصوصیت لفظوں کا الٹ پھیر ہے۔ جو شعر میں عجیب لطف پیدا کرتا ہے۔ بادی النظر میں شاید اسے معمولی بات سمجھا جائے۔ مگر معمولی بات میں بھی کوئی سلیقہ درکار ہے اور یہی سلیقہ ہے۔ جو ہم اس خصوصیت کے تحت میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اس الٹ پھیر سے اگر معافی میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا اور مضمون وہی کا وہی رہتا ہے۔ تو یہ الٹ پھیر کسی کمال میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ شاید اسے حشو کہا جائے۔ لیکن اگر معافی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اور الفاظ تقریباً وہی رہتے ہیں۔ تو یہ الٹ پھیر فی الواقع دلچسپ چیز ہے۔ کیا کہلو کیا رات ہے کیا دن ہے کیا ایام ہیں ہائے یہ برسات کے برسات کا برسات کی

برسات کے ایام برسات کا دن برسات کی رات۔ نعت و نشر کی صورت میں کا۔ کے۔ کی تین حرفت
اصافت کو اس طرح جمع کر دینا نہایت دشوار ہے۔ حیرت پیدا ہوتی ہے۔ کہ یہ شعر کس طرح خلق ہوا۔
تہاری طبیعت تہاری نگاہ بدلتی رہے گی بدلتی رہی

مری تدبیر نے مجھ کو مری تقدیر پر ڈالا مگر اب دیکھئے تقدیر کیساتدبیر کرتی ہے

نہ زیر فلک ہے نہ زیر زمیں ہے کہاں ہے مسرت کہیں بھی نہیں ہے
تہاری تمنا بھی کیا دل نشیں ہے وہیں تھی جہاں ہے جہاں تھی وہیں ہے
اس شعر میں لفظ دل نشیں کی بندش کس قدر دل نشیں واقع ہوئی ہے۔ سخن فہم اس معنوی خوبی کا اندازہ
کریں ے

تری خوش خرامی کو میں جانتا ہوں قیامت ہے لیکن قیامت نہیں ہے
تری بات کا اور تیری زبان کا یقین بھی ہے مجھ کو یقین بھی نہیں ہے
ہو انورج پر خاتمہ شاعری کا سخن گو سخن دان سخن آفریں ہے

مگر ارجہاں کو جب دیکھا اک شکل نظر آئی مجھ کو عالم سے الگ عالم سے جدا عالم سے زالی پھولوں کی
پھرت بدلی پھرائی گھٹا پھر سرد ہوا میں چلنے لگیں ہو جائے پری بچلے دھن اب الی دالی پھولوں کی

صبر بہت دشوار طلب چاہ بڑی تاخیر پسند ہوتے ہوتے ہونٹا ہے ٹھٹھتے ہوتے ہوتی ہے
مصرعہ ثانی اس قدر بے ساختہ ہے۔ کہ اس سے زیادہ بے تکلفی خیال میں نہیں آسکتی۔ اس مصرعہ پر مصرعہ
الٹا و باغ پر مصیبت نازل کرنا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے۔ کہ ردیف و قافیہ کے خیال سے شعر پہلے مصرعہ ثانی
فکر کیا کرتے ہیں۔ یا قافیہ اور اس کا مناسب پہلو سوچا کرتے ہیں۔ غالباً حضرت نوح نے بھی پہلے یہ مصرعہ
ثانی تصنیف فرمایا ہوگا۔ اور پھر یہ سوچا ہوگا۔ کہ اس کا مصرعہ اول کیا ہونا چاہئے۔ اگر ہمارا خیال درست ہے
تو اس تلاش کے لئے بے اختیار واد دینی پڑتی ہے ے

وہی عشق کی ہیں مصیبتیں ہی ہجر کی ہیں شکائیں جہ کہیں ہم ان سے تو کیا کہیں جو نائیں ہم تو نائیں کیا
انہیں جس پر ہے غور بھی انہیں شرم بھی ہے لحاظ بھی دیکھ کر کسی سے زرائیں کیوں دیکھ کر کسی سے ملائیں کیوں

ہمیں ضد جو ہے تو اسی سے بے ہمیں کچ جو ہے تو اسی سے
 کبھی پوچھتے ہیں وہ حال لکھی برگزشتہ نظم و الم
 اسے سوطح کا خیال ہے ہمیں سوطح کا لحاظ ہے
 ان اشعار میں زبان کے نکات اور الفاظ کی مصوری جس خوبی سے نمایاں ہو رہی ہے۔ وہ حضرت نوح
 اور صرت حضرت نوح کا حصہ ہے۔

چھٹی خصوصیت معاملہ بندی ہے۔ جسے قدما کی اصطلاح میں تغزل کہا جاتا ہے اس میدان میں پہلے جرات
 نے اور ان کے بعد یمن نے علم امتیازی بلند کیا تھا۔ مگر حضرت داغ نے اس میدان میں شہسواروں کے جوہر
 دکھائے ہیں۔ ان کی معاملہ بندی ان کے قصہ شہرت کا ایک ستون ہے۔ حضرت نوح کا دامن بھی اس دولت
 سے مالا مال ہے۔ انہوں نے راز و نیاز کے مضامین ہر غزل میں باندھے ہیں اور ہر جگہ ایک خاص قسم کا بانچہ
 محبوبانہ انداز میں نظر آتا ہے۔ جس میں لطیف اشارے اور دلچسپ نوک جھونک پائی جاتی ہے۔ قدما نے غزل
 کی جو تعریف لکھی ہے۔ اس کے لحاظ سے معاملہ بندی ہی غزل کا ایک واحد عنصر ہے۔ اس کو الگ کر دیا جائے۔
 تو غزل غزلیت کے رتبہ سے گر جاتی ہے۔ قدما نے غزل کی بنیاد تغزل ہی پر قائم کی تھی۔ ان کے بعد قبا لے
 کے مختلف اثرات اس میں اپنا عمل دخل جاتے گئے۔ اور معاملہ بندی کے ساتھ شوخی و طرافت۔ ناؤ نوش
 زندان بے باکی وغیرہ مضامین بھی شامل ہو گئے۔ منصوفانہ مضامین۔ دنیا کی ناپائیداری۔ زلمے کی شکایت
 وغیرہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ اس طرح غزل کا ضروری عنصر تو وہی معاملہ بندی رہا۔ مگر دوسرے مضامین سے
 مل کر وہ ایک خوبصورت گلدستہ ہو گئی۔ چنانچہ متاخرین کی غزل اسی نمونہ کی ہے جس میں حضرت داغ نے
 اپنی طبیعت کی شوخی سے عجیب قسم کا بانچہ پیدا کیا۔ حضرت نوح کی غزل بھی اس امتیازی خصوصیت کی علم
 بردار ہے۔

یہ باتیں بیوفائی کی تہیں پر چھائی جاتی ہیں
 اے بھی روک رکھو تم اگر ملنے سے ٹکے ہو
 ذرا پھر تو کہو تم کون کس کے کام آتا ہے
 ہمارے لب پہ کیوں ہر دم تہا رانا نام آتا ہے

اور تو الفت نہ نبھنے کا سبب کوئی نہیں
 یا بڑائی آپ میں ہے یا بڑائی ہم میں ہے

جہاں ہوں بچ و لے کیا وہاں باہم صفائی ہو
 کبھی کچھ کہہ دیا تم سے کبھی کچھ لکھ دیا ہم سے

برہنہا تو ہمارے عشق کی تعریف ہوتی ہے سبھتے ہیں وہ صیادل میں اس کو ہم سمجھتے ہیں

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نوح غزل کا مقطع عموماً تخلص کی رعایت سے لکھتے ہیں اور اس میں لفظ کشتی یا طوفان ضرور لاتے ہیں جس سے مقطع میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں اس کی بھی ملاحظہ ہوں گے۔
نوح کی آنکھوں سے اٹھے سیکڑوں طوفانِ اشک اس کا رونا بھی تو اک دریا دلی کے ساتھ ہے
رونے کی کثرت سب نے بیان کی ہے۔ مگر اس کی کثرت سے لفظ دریا دلی کسی نے منسوب نہ کیا ہوگا
اس سے گریہ و زاری کے مضمون میں بھی شگفتگی کا عالم پیدا ہو گیا ہے
نوح سے واقعہ نہیں میں اپنے کیا کہہ دیا آج تک طوفان کس کا ہر جگہ مشہور ہے
مصرع ثانی کے ساتھ یہ خوبی بھی وابستہ ہے۔ کہ دیوان کا نام بھی طوفانِ نوح ہے
پہلے ہی سے جانتا تھا نوح کو سارا جہاں ہو گئے مشہور وہ طوفان اٹھا کر اور بھی
یہاں بھی ضمناً وہی کنایہ ہے

طوفانِ بحرِ غم نے ڈبو یا بہت مگر کشتی جنابِ نوح کی بچ کر نکل گئی
حضرتِ نوح کے طوفان کو سنتے ہیں فقط حضرتِ نوح کے دیوان کو ہم دیکھتے ہیں

اٹھویں خصوصیت محاکات ہے۔ جس میں حضرت نوح نے اچھے اچھے شعر نکالے ہیں کسی کی قوتِ بیانیہ کا کمال دیکھنا ہو تو اس کے لئے محاکات کی مثالیں کافی ہوتی ہیں۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ خوفِ دہرے اور گھبراہٹ کی تصویر ملاحظہ ہو۔

سائنس رکتی ہے جو سینے میں کبھی ہاتھ اپنی نبض پر دھرتے ہیں ہم۔
کبر و غرور کا مرقع اس طرح تیار کیا ہے
کہ رہا ہے کوئی کس دعوے کے ساتھ عاشقوں کو قتل ہم کرتے ہیں ہم۔
رفیق سے جدا ہو جانے کا رنج و افسوس کس حسرتِ ناک پرائے میں ظاہر کیا ہے
وہ لئے جاتے ہیں ل کو اپنے ساتھ دیکھتا جاتا ہے میرا دل مجھے

نوع کے عالم میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ یہ شعر اس کی کتنی صیح مثال ہے
نبضِ باقِ سرِ جہم احبابِ چپ عاجزِ طبیب اب مرے اللہ کو کچھ اور ہی منظور ہے
زکن ضرب میں کچھ اور ہی منظور ہے۔ یہ کنایہ کس قدر بلیغ واقع ہوا ہے۔ ہے تواخفا۔ مگر صراحت سے

بھی زیادہ واضح

اب ہم انتخاب کے طور پر چند ایسے اشعار یہاں درج کرتے ہیں جو بلاشبہ حضرت نوح کے لاثانی اور غیر لاثانی شاہکار ہیں جن سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ دنیائے شاعری میں اس وقت حضرت نوح کا پایہ سخن کس قدر بلند ہے

کھل نہیں سکتا کسی پر ماجرائے سر نوشت
یہ لفاظہ بند رکھا کا تب تقدیر نے

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کسی میں زور حسن
آئینے کو توڑ ڈالا آپ کی تصویر نے

کھل نہیں سکتا کے ساتھ بند رکھا کا لطف ظاہر ہے۔ نوشتہ تقدیر کے راز سر بستہ کو لفاظہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو نہایت یلغ ہے۔ دوسرے شعر میں زور حسن کا جو ثبوت دیا گیا ہے۔ وہ نہایت لاثانی ہے۔ تصویر کی شاعری شیشے میں سے گزر کر باہر آتی ہیں اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں تصویر کا جلوہ پیدا کرتی ہیں۔ اس عمل سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ آپ کی تصویر آئینے کو توڑ کر باہر آگئی ہے۔ اس سے بڑھ کر زور حسن اور کیا ہو سکتا ہے۔ تصوف کا یہ مشہور مسئلہ کہ حسن مطلق تقید و تعین کے زندان میں نہیں رہ سکتا۔ اس مصرعہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ اپنچل اور چلن کے باہر حسن کی جھلک دکھائی دینے کے بہت سے مضمون باندھے گئے ہیں مگر اس میں یہ زور کہ وہ آئینے کو توڑ کر باہر آجائے۔ آج تک کسی نے نہیں باندھا۔ یہ شعر نہیں بلکہ الہام ہے۔

مغربی شاعری بھی اس مضمون کا جواب نہیں دے سکتی۔ اردو زبان اس پر جتنا ناز کرے۔ کم ہے۔

موت کے ارمان میں بے موت مرجانا پڑا
میرے دل پر تیرا مارے آرزوئے تیر نے

بے موت مرنے کا ثبوت رکن صدر کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ لفظ پڑا (مرجانا پڑا) کس قدر بے انتہا مجبور پوں کو ظاہر کر رہا ہے۔ دل پر تیرا مارے۔ یہ ٹکڑا کتنا دردناک ہے۔ تیر کس نے مارے۔ تیر کی آرزو نے۔ نزاکت و بیان کی انتہا ہے۔ بے موت مرنے۔ اس محاورے کا استعمال اس سے بہتر صورت میں اور کیا ہو سکتا ہے۔

اب مرے ساتھی نال ہے نہ مجھے کس بات کا
وہ اٹھی وہ آئی وہ چھائی گھٹا برسات کی

رنج و غم اندوہ حرام۔ درد آزار اضطراب۔ اک مرے دل پر عنایت ہے برابر سات کی

پہلے شعر میں گھٹا کے تینوں استعمال گھٹا اٹھی۔ گھٹا آئی۔ گھٹا چھائی۔ ایک جگہ جمع کر دے ہیں۔ اس کے ساتھ لفظ وہ کی تکرار کتنی خوبصورت ہے۔ اٹھی کے بعد آئی اور آئی کے بعد چھائی اس حسن ترتیب کو بھی ملاحظہ کیجئے

دوسرے شعر میں دو مین نہیں اکٹھے سات سات لفظ اور وہ بھی ہم جنس کس خوبی سے جمع کئے ہیں۔ یہ کام سخت دشوار تھا۔ سات ہم جنس مفعول کو تلاش کرنا اور پھر انہیں ایک مصرعہ میں اس طرح جمع کرنا کہ حرف عطف سے بھی کام لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ فی الواقع بہت بڑا کمال ہے۔ رنج و غم اندوہ حرام۔ اس ٹکڑے کو رنج

وغم اندوہ جہاں اس لئے نہیں لکھا کہ فارسیست کا رنگ پیدائے ہو۔ دوسرے مصرعہ میں قافیہ معمول کی خوبصورتی اور اس کے ساتھ لفظ عنایت میں طنز۔ لفظ اک سے دل کی بگیسی کا ظاہر ہونا مزید برآں ہے
وصل کا وعدہ وہ کر سکتے نہیں ہلے اتنی بھی نزاکت ہے بُری
نزاکت کے بہت سے مضمون باندھے گئے ہیں۔ باایں ہمہ اس مضمون کی نزاکت کچھ اور ہی نزاکت رکھتی ہے۔

بعد مرنے کے بھی دل لاکھوں طرح کے غم میں ہے ہم نہیں دنیا میں لیکن ایک دنیا ہم میں ہے
یا الہی عقل سے باہر ہیں تیری حکمتیں یہ نہیں کھلتا کہ ہم تجھ میں ہیں یا تو ہم ہیں ہے

دل کے دے دینے میں وقت ہے بہت جان دے دینے میں دشواری نہیں
زلحفِ جانِ ایک ایسی رات ہے جو کسی بیمار پر بھاری نہیں
عیب سے ہے پاک ہر روشن ضمیر شمع کے شعلے میں چمک رہی نہیں
یہ مضمون مختلف شعرا نے باندھا ہے۔ مگر حضرت نوح نے جو ثبوت پیش کیا ہے۔ وہ بالکل نیا اور بہت روشن ہے۔

مست آنکھوں کو دکھا کر مست اس نے کر دیا میری قسمت میں یہ دوسا غرتھے دوسا غرٹے
حضرت زاہد نہیں کہتے میں ہے کس کی تلاش سنگِ اسودِ دل گِاب اور کیا پتھر ہے
پہلے شعر میں حسن بیان کی سادگی اور بے تکلفی ملاحظہ کیجئے۔ دوسا غرتھے۔ دوسا غرٹے۔ یہ ٹکڑا کس قدر دلکش اور بے ساختہ ہے۔ دوسرے شعر میں سنگِ اسود کی رعایت سے یہ کہنا کہ اب اور کیا پتھر ہے رعایت لفظی کا کمال ہے۔ اور وہ بھی بالکل بے ساختہ۔ جس میں تصنع یا آورد کا شائبہ تک نہیں ہے۔
اس رُخ پر نور سے کی تھی جو اس نے ہم ساری آج تک داغِ ندامت و مدہِ کمال میں ہے
غیر کو عزت ملی محسوس ہوئی ذلت نصیب یہ بھی ہے وہ بھی ہے سب کچھ آپ کی محفل میں ہے
کوئی آیا بھی ملا بھی اپنے گھر بھی چل دیا جو مرے دل میں تنہا تھی وہ اب تک دل میں ہے
اب ہمارے قتل کی دے تو شہادت کون دے ایک دم تھا تیغ کا وہ قبضہ قاتل میں ہے
حاندکے داغوں کو عیب اکثر شعرا نے نسبت دی ہے۔ انہیں داغِ غم۔ داغِ فراق بھی لکھا ہے۔ مگر داغِ ندامت کسی نے نہیں کہا ہوگا۔ دوسرے شعر میں لفظ سب کچھ کو دیکھئے اور اس میں جو لطیف طنز ہے اس کی لطافت کو ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے مصرعہ کا مضمون بہت معمولی تھا۔ مگر دوسرے مصرعہ نے اس کی شان ہی کچھ

سے کچھ کر دی۔ پیش پا افتادہ باتوں سے کیسے کیسے لطیف نکٹے نکالے ہیں۔ تیسرے شعر کا مضمون کس قدر دلچسپ ہے جس کے لئے اتنی مصیبت اٹھائی۔ وہ آیا بھی اور واپس بھی چلا گیا۔ مگر دل کی تمنا اسی طرح دل میں رہی۔ چوتھے شعر میں الفاظ کی مناسبت در عایت نہایت قابلِ داد ہے۔ قتل۔ قاتل۔ شہادت۔ یتیم۔ دم۔ قبضہ الفاظ ہیں کہ نہ بچنے جڑے ہوئے ہیں۔

اس کا غم اس کا تصور اس کی یاد اس کی تلاش
ہر طرف اس کی تجلی ہر جگہ اس کا جمال
دل دیا بھی تو دیا کس کو ستم ایسا
جس نے شیدائی بنایا اس کے شیدائی بنے
اس نگاہِ ناز کا مفہوم کچھ کھلتا نہیں
ایک نگاہ ہمارے زندگی کے ساتھ ہے
ہر کسی کے پاس ہے وہ ہر کسی کیساتھ ہے
جو ہے کام اپنا وہی دیوانگی کے ساتھ ہے
دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے
خدا ہے دیکھے ساتھ یا دل کی لگی کیساتھ ہے

ان اشعار کو دیکھئے۔ یہ رنگ سخن۔ یہ زبان۔ یہ حسن بیان۔ یہ استادانہ بندش۔ یہ شہریت۔ یہ فصاحت کس کس چیز کی داد دی جائے۔ ربط کلام کو دیکھئے۔ ایک مصرعہ پر دوسرا مصرعہ کس بے تکلفی سے لگایا گیا ہے۔ اور کیسے کیسے معافی پیدا کئے ہیں۔ کہ باید و شاید

کچھ نہیں پھر بھی تو سب کچھ ہے دل بے آرزو
جیت کا مقام ہے۔ کہ معمولی معمولی باتوں سے کیسے کیسے بلند معافی اٹھائے ہیں۔ دل بے آرزو کو مفلس کہنے کی وجہ تو ظاہر ہے۔ اس مفلس کو حقیر سمجھ کر یہ کہنا بھی آسان ہے کہ وہ کچھ نہیں۔ لیکن کچھ نہیں کو سب کچھ یعنی بیش بہا ثابت کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے جو دلیل دی گئی ہے۔ وہ نہایت زور دار ہے جس میں ضمناً یہ اشارہ بھی ہے کہ دل کا بے آرزو ہو جانا بہت ہی نادر الوقوع ہے۔
ہزاروں ششیاں پھر شوحیوں میں سینکڑوں غمرے
تہیں دنیا سے کیا مطلب کہ تم خود ایک دنیا ہو

دل لگانے سے نہ باز آئیں گے ہم
تو بے توہ میں تمہیں ظالم کہوں
جان جب تک ہے ہماری جان میں
ایسی گستاخی تمہاری شان میں

ہم کو میخانے میں اس کی جستجو بیکار ہے
شمع جلتی ہو۔ تو پروانے خود اس کو ڈھونڈ دیتے ہیں۔ آگ جلتی ہو۔ تو آگ میں خود اس کے پاس آ جاتی ہے
اسی طرح پیانہ بھی اپنے چاہنے والوں کے پاس خود آ جائے گا۔ گروش پیانہ کی نسبت سے چل پھر کے یہ الفاظ

نہایت خوبصورت ہیں —

حسب خواہش مجھے میخوار پلاتے ہیں کوئی تعداد مقرر نہیں پیمانوں کی
آتش عشق سے ہو کیوں مجھے غامی لگاؤ خاک بھی میرے غماص میں ہے پروانوں کی
معنی آفرینی اور پرواز فکر کا اندازہ کرنا ہو۔ تو یہی ایک شعر کافی ہے —
میری نظر سے ہے کہ تمہاری نظر سے ہے ہنگامہ حسن و عشق کا برپا کدھر سے ہے۔

دل کو ہوا سکون طبیعت سنبھل گئی ۛ دم کیا نکل گیا مری حسرت نکل گئی
پہلے تھی جو غمش وہ مرے دلیں اب نہیں کانٹا نکل گیا کہ تم نکل گئی

قدرت میں بھی ہے دخل تمہاری نگاہ کا جو بات اس نے چاہی کہ یہ ہو وہی ہوئی
یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے۔ کیونکہ خدا جو چاہتا ہے۔ وہی ہوتا ہے —
درد مندانِ محبت کروٹیں بدلا کئے ایک پوشیدہ پھری ہر چین بستر میں رہی
جس کو سب کہتے ہیں عقدہ نام ہے جس کا گرہ تیرے گیسو میں رہا میسرِ تقدیر میں رہی
جوش و حشت میں دیا قسمت نے میرا خوب ساتھ مجھ کو بھی پھر میں رکھا خود بھی چکر میں رہی
کیوں نہ ہو دل کی تمنا کو محبت دل کے ساتھ یہ اسی گھر میں پئی گھر میں بڑھی گھر میں رہی
قتل کا ارماں بھی تھا رسوائیوں کا ڈر بھی تھا کچھ لگاؤ کچھ رکاوٹ ان کے خنجر میں رہی

سائنس مجھ میں آتی جاتی ہے فقط اور آنے جانے والا کون ہے
تو نہیں تیرا تصور بھی نہیں پھر مرا تڑپانے والا کون ہے
کوئی ناصح کو یہ سمجھاتا نہیں وہ مرا سمجھانے والا کون ہے

جو نہ کہنا تھا وہ منہ پر کہ گیا دل لگی ہی دل لگی میں دل مجھے

میں ملاتا ہوں مگر آپس میں یہ ملتے نہیں یوں مرے اجزائے دل کو اس نے بہم کر دیا

رنج کا عیش کا دل میں کوئی احساس نہیں غم نے دنیا ہی بدل دی ترے دیوانوں کی

نامہ رنخ کے تو ظالم نے اڑائے پرے شکرتا ہوں کوئی حرف نہ تجھ پر آیا
حرف نہ تجھ پر آیا۔ اس کی داد کہاں تک دی جائے
محبت کی محبت ہے عبادت کی عبادت جہاں جلوہ کسی کا دیکھ لینا سر جھکا دینا

اے سلامی کس غضب کا ہے یہ منظر دھوپ میں الٰہی حیدر دھوپ میں الٰہی پیر دھوپ میں
دھوپ میں وہ تھے جنہیں اس سے بھی آگاہی نہ تھی چاندنی میں کس طرح رہتے ہیں کیونکر دھوپ میں
وہ علی اکبر جو نازک تھے گل تر سے سوا دیر تک لڑتے رہے انشا اکبر دھوپ میں
باؤں رکھنے میں بھی ان کے سوا طرح کا فیض تھا شامیانہ گرد بن جاتی تھی اڑ کر دھوپ میں
سر ٹپکتی ہے ابھی تک ہر درو دیوار پر دھوپ اس غم سے کہ تھے سبط پیر دھوپ میں
اختر دھوپ میں پتھر دھوپ میں۔ اس زمیں میں حضرت میکش کی ایک غزل پڑھی تھی۔ مدت گزر گئی
صرف ایک شعر یاد رہ گیا۔ جس میں کبوتر کا قافیہ ہے۔ وہ شعر یہ ہے
خط وہ کیا لیتے اترنے بھی نہ کوٹھے پر دیا شام تک اڑتا رہا میرا کبوتر دھوپ میں

اس میں شک نہیں کہ یہ قافیہ بہت الاجاب بندھا ہے۔ اسی شکل اور محدود زمین میں حضرت نوح
نے بھی ایک سلام لکھا ہے۔ یعنی نفس مضمون بھی محدود کر دیا ہے۔ مگر باایں ہمہ اس سنگلاخ زمین کو گلستان
پر بہار بنا دیا ہے۔ چند شعر اوپر درج کئے گئے ہیں۔ دیکھئے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ پہلے اس سلام کا مطلع
اسی طرح تھا۔ مگر بعد میں اس پابندی کی وجہ سے کہ مخلوط توانی کھیلے مطلع میں بھی مخلوط توانی کا آنا ضروری
ہے۔ مصرعہ ثانی تبدیل کر دیا۔ اب طوفان نوح میں مصرعہ ثانی یہ ہے۔ ع

دھوپ میں ہاں دھوپ میں جلتی زمیں پر دھوپ میں
ہمیں چونکہ پرانا مصرعہ یاد تھا۔ اور یہ مصرعہ بھی مطلع کی شان کو دوبالا کرنے والا ہے۔ اس لئے وہی لکھ
دیا۔ آخری شعر میں معنی آفرینی کا جو کمال دکھایا گیا ہے۔ وہ حضرت نوح کیسے ہر طرح سرمایہ افتخار ہے

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ صرف مجموعہ غزلیات سے متعلق تھا۔ لکھنے کو تو اتنا کچھ لکھ دیا۔ مگر حق تو یہ
ہے۔ کہ حق ادا نہیں ہوا۔ کلام کا جو انتخاب کیا گیا تھا۔ اس کا ایک چوتھا فی حصہ بھی درج نہیں ہو سکا۔ بحاسن

کلام کو ظاہر کرنے میں بھی ہمارا قلم بلاشبہ شکستہ پارہا ہے۔ اگرچہ بہت سی خوبیاں اس کلام میں وجدانی کیفیت رکھتی ہیں۔ جن کو الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہے۔ پھر بھی اس ضمن میں ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش تھی۔ طول کلام کے خیال سے قلم کو روک لیا گیا ہے۔ اب باقی اصنافِ سخن میں سے بعض حصوں کا نہایت مختصر انتخاب 'ج' کیا جاتا ہے۔ تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ تمام اصنافِ سخن میں حضرت نوح کا رنگِ سخن یہی ہے۔ اور یہ بات ان کی فادر الکلامی کے لئے نہایت زبردست شہادت پیش کرتی ہے

استادوں کی غزل پر خمرہ لکھنے کا رواج اردو زبان میں عام ہے نظم کی یہ صنف بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ایک تو غزل کسی نامور استاد کی ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس نامور استاد کی غزلیات میں یہ غزل ہوتی ہے جو خمرہ کیلئے منتخب کیجاتی ہے۔ اس قسم کے بلند پایہ کلام پر مصرعے لگانا آسان کام نہیں۔ اپنی پرواز فکر کو اس نامور شاعر کی پرواز فکر تک پہنچانا اور اسی پائے کا کلام لکھنا ہوتا ہے اور یہ کمال بھی دکھانا ہوتا ہے۔ کہ نئے اور پرانے مصرعوں میں کوئی جوڑا اور پیوندِ شناخت میں نہ آسکے۔ پھر یہ خوبی پیدا کرنی ہوتی ہے کہ سننے والے اس بات کو محسوس کریں کہ شعر کے مضموں میں فی الواقع اتنی کمی رہ گئی تھی۔ جو ان جدید مصرعوں کے پیوند سے مکمل ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خمرہ کی خوبی شاعر کے بہت بڑے کمال کی شہادت پیش کرتی ہے حضرت نوح نے مختلف مشاہیر کے کلام پر خمرے لکھے ہیں۔ یہاں دو تین مثالیں بطور نمونہ درج کیجاتی ہیں۔

حضرت اشک مرحوم سابق نواب رامپور کی غزل پر ایک خمرہ لکھا ہے۔ ان کی غزل کا ایک شعر یہ تھا ہ

شفا کیسی دوا کیسی یہ سب بیکار باتیں ہیں محبت کا جو ہو بیکار اچھا ہو نہیں سکتا۔

اس کی تحمیں ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ہ

عبث ہر وقت دغویں میں عبث ہر بار باتیں ہیں جنہیں آساں سمجھتے ہو بہت دشوار باتیں ہیں

سیچا غیر ممکن بس یہی دوچار باتیں ہیں شفا کیسی دوا کیسی یہ سب بیکار باتیں ہیں

محبت کا جو ہو بیکار اچھا ہو نہیں سکتا

والی ریاست ٹونک کی غزل پر بھی ایک خمرہ لکھا ہے۔ اس میں ایک شعر یہ تھا ہ

جب ایسا ہے تو پھر ملنے ملانے میں تکلف کیوں نہ مطلب آشنا میں ہوں نہ مطلب آشنا تم ہو

اب تحمیں ملاحظہ ہو ہ

جب ایسا ہے وہاں مجھ کو بلانے میں تکلف کیوں جب ایسا ہے یہاں تک تم کو آنے میں تکلف کیوں

جب ایسا ہے تو متے مان جانے میں تکلف کیوں جب ایسا ہے تو پھر ملنے ملانے میں تکلف کیوں
نہ مطلب آشنا میں ہوں نہ مطلب آشنا تم ہو

حضرت داغ کی غزل کا ایک شعر یہ تھا ہے
جب ہوئی صبح آگئے ناصح انہیں حضرت کو دیکھتا ہوں میں
تحنیس ملاحظہ ہو کس شان کے مصرعے لگائے ہیں ۔
قابلیت بتا گئے ناصح مغرب تک کے کھا گئے ناصح
ایک مجھ کو ہی پا گئے ناصح جب ہوئی صبح آگئے ناصح
انہیں حضرت کو دیکھتا ہوں میں

حضرت ظہیر دہلوی کا ایک شعر یہ تھا ہے
تیرے کوچے میں تیرے دے پڑے دوسرا تیسرا یہ پھیرا ہے

اس کی تحنیں یہ ہے ۔
اس طرف سے اُدھر اُدھر سے اُدھر میں لگتا ہوں رات دن بکر
آج بھی جیسا جو ستم پر دور تیرے کوچے میں تیرے دے پڑے
دوسرا تیسرا یہ پھیرا ہے

تحنیس کے یہ چند نمونے پیش کر چکنے کے بعد رنگ جدید کا مختصر انتخاب پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔
حضرت نوح کے بہت سے ہم عصر جو دنیاۓ شاعری میں کافی شہرت رکھتے ہیں ۔ اس رنگ میں بالکل صفر ہیں ۔
مگر حضرت نوح کا قلم اعجاز رقم اس رنگ میں بھی ویسا ہی خوش خرام ہے ۔ جیسا کہ وہ رنگ قدیم میں نظر آتا ہے ۔
دربار دہلی پر ایک نظم لکھی ہے ۔ نظم کیا ہے ۔ الفاظ کی ایک نادر مصوری ہے ۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں ۔
چکا اختر جاگی قسمت نکلا جو بن نکھری رنگت پلٹی صورت بدلی حالت آئی عشرت بجاگی عشرت
دلی کے دربار کو دیکھو دلی کے بازار کو دیکھو دلی کی سسرکار کو دیکھو دلی کی جسر مار کو دیکھو
پلٹن کے انداز نرالے پہرے پر مامور رسالے جان فدا کر دینے والے اکثر گوئے کشمراے
آپس میں بے باکی دیکھی ہر شکاری چالاکی دیکھی وردی نیلی خاک دیکھی کیا کیا شان خدا کی دیکھی

ملکی اور قومی رنگ میں بھی بعض نظمیں لکھی ہیں ۔ بیان کی صفائی ۔ سلاست ۔ روانی ۔ بندش کی چنگی خیالات
کی شگفتگی اور ہر جگہ شاعرانہ انداز عجب بہار پیدا کرتا ہے ۔ چند شعر ملحوظ ہوں ۔

پھیلا تفاق باہم ہوا اتفاق کیوں کر
اقبال کی ترقی کوشش پہ منحصر ہے۔
اتر سے ہم اپنے مذہب کی خیر مانگیں
یا ہم سے دوستی کا دم لوگ بھر رہے تھے
ہندو مسلمان کے عنوان سے چند شعر غزل کی طرز میں لکھے ہیں۔ ان میں بھی وہی آن بان موجود ہے

۵ ہند کی آن بان ہیں دونوں
خلق اس پر ذرا نگاہ کرے
بار اپنا اٹھا نہیں سکتے
نہ حرم ہے نہ اب وہ تب خانہ
فرض ان پر ہے اس کی رکھوالی
تیر اوروں پر کیا لگائیں گے
کوئی صورت نہیں صفائی کی
غور فرمائیں۔ ہر شعر ایک انداز میں کہا ہے۔ ایک رنگ میں لکھا ہے۔ جو کسی حال میں پھیکا نہیں ہوتا
اسنادوں کی ٹھوس بندشیں۔ بیان کی سادگی۔ طرز ادا کا بانگین ہر شعر سے نمایاں ہے

تن ہے ایک جان ہیں دونوں
اپنے خالق کی شان ہیں دونوں
اس قدر ناتوان ہیں دونوں
ٹوٹے پھوٹے مکان ہیں دونوں
ملک کے پاسبان ہیں دونوں
خود یہ آتری کسان ہیں دونوں
دل میں یوں بدگمان ہیں دونوں

تاریخ نویسی میں بھی حضرت نوح کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ اس میں بھی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ آپ
تذخیرہ یا تاریخ کو کبھی پسند نہیں کرتے۔ اور اس کو عجزِ طبیعت سمجھتے ہیں۔ جو تاریخ لکھی ہے۔ اس میں
سال تاریخ جمع یا تفریق سے بے نیاز ہے۔ حالانکہ اکثر تواریخیں تذخیرہ و تخریج سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور
بعض مشائیر نے اس میں نا خوبیاں پیدا کر کے عیب کو ہنر بنا دیا ہے۔ مثلاً
الف کشیدہ ملائک ز فوت اکبر شاہ

فوت اکبر شاہ کے اعداد میں سے الف کا ایک عدد کم کیا ہے۔ مگر معنی کے لحاظ سے صنعتِ ایہام
پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ محاورے میں الف کشیدن کے معنی افسوس کرنا ہے۔

یا حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا سال تاریخ کسی نے اس طرح لکھا ہے۔ ع

سردیں را بریدے دینے

اس میں دین کا سر یعنی وال کاٹ کر باقی مٹی اور آن کے اعداد ساتھ شمار کئے ہیں اور یہی سال شہادت

لیکن انصاف یہی ہے کہ مادہ تاریخ سالم ہونا چاہیے۔ کیونکہ سالم عند نکال نہ سکے کا عیب ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ خواہ تداخل و تخرج میں کتنی ہی خوبی کیوں نہ پیدا کی جائے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔
حافظ ابوالقاسم صاحب کے فرزند کی تاریخ ولادت یہ ہے۔ فرزند حافظ (۱۳۱۲ ہجری)
حضرت بخجود بدایونی کے دیوان کا سال تاریخ یہ ہے۔ تصویر بخجود (۱۳۲۸ ہجری)
ایک مکان کا سال تعمیر یہ ہے۔ منظر رشک بہار (۱۹۱۸ عیسوی)

اب اخیر میں ظریفانہ کلام کا کچھ اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے حضرت نوح کی طبیعت کا چلبلا رنگ بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ حضرت البراء آبادی کے رنگ سے بہت کچھ مشابہت رکھتا ہے۔
بدے وہ سب طریقہ یاروں نے زندگی کے شربت پہ خاک ڈالی ہوٹل میں چائے پی کے
واغظ کے وغظ سے ہے پھر کی شان پیدا منبر پر پورے ہیں اوصاف ممبری کے

ہیٹ کو ملنے لگی سر پر جگہ خیر مانگیں شیخ جی دستار کی
پہلے لیتے تھے خبر اخبار سے اب وہ لیتے ہیں خبر اخبار کی
سبحان اللہ۔ سے اور کی کے فرق سے معافی میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا۔
جب یہ پوچھا حکم کیا لکھا گیا درخواست پر کہد یا دفتر سے تم کو نقل لینی چاہیے
اور دفتر سے اگر طالب ہو اس نقل کا تو وہ پورے اس کی بھی درخواست لینی چاہیے

اہل مشرق سے نہیں کرتے وہ بات اہل مغرب کی یہی پہچان ہے
نوکر کی ملنے میں آسانی نہیں پاس ہو جانا بہت آسان ہے
ڈھونڈتے ہیں کونسلوں میں سیٹ وہ اپنے گھر سے جن کو اطمینان ہے
روز کے چندوں سے عاجز آگئے بیچے حاضر ہماری جان ہے

ہے نئی تعلیم کا یہ انقلاب اپنی بی بی تک پرانی ہو گئی
دست مغرب کے جو دم بچ گیا تو لگہ گیر کے ٹائی ہو گئی
ریل پر قربان ہوٹل پر شازر باپ دادا کی کمائی ہو گئی

پس آیا کے جو میں آیا گیا خانساں سے لڑائی ہو گئی

اس کشتِ زعفران کو دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح ہمیں۔ بلکہ اکبر الہ آبادی بول رہے ہیں۔ وہ سب شاعرانہ ہی اس رنگ میں لکھنے کی کوشش کی۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر حرکتِ مذہبی کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ عجزِ طبیعت سے مجبور ہو کر رہ گئے۔ لوگوں نے پکڑوں کی پھبتیاں اڑائیں۔ اور رسوائے خلق ہو کر خاموش ہو جانا پڑا۔ بات یہ ہے کہ اختلافِ طبائع کی وجہ سے ہر شخص ہر میدانِ کام نہیں ہوتا۔ میدانِ شعر کے شہسواروں کی بھی یہی حالت ہے۔ لاکھوں میں کوئی ایک شاعر ایسا ہوتا ہے جس کی طبیعت ہر ایک سانچے میں ڈھل سکے۔ ہر رنگ میں لکھ سکے اور اچھا لکھ سکے۔ حضرت نوح کی طبیعت بھی ایسی ہی ہیولہ و صفت واقع ہوئی ہے۔ کہ ہر رنگ کا روپ بھر لیتی ہے اور ہر پردے میں گونا گونی و بوقلمونی کے نظریہ بجلوسے دکھاتی ہے۔ وہ عاشقوں میں عاشق جاں باز۔ شادہوں میں شاد طراز۔ خانقاہ میں صوفی کیو۔ دلپوش میخانے میں رنہ دریا دلپوش۔ رزم میں تیغ جوہر دار۔ رزم میں طوطی خوش گفزار۔ بیمار میں خاکساروں میں ناکسار۔ رزم میں غزلیں۔ غزل کے انداز بیان پر حاکمانہ قدرت رکھتی ہے۔

اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کے شاعری میں اس وقت حضرت نوح کا دمِ غنیمت ہے۔ انہوں نے دہلوی یا کھنوی نہ ہونے کے باوجود اردو زبان کا وہ کمال ظاہر کیا ہے جو بلاشبہ لائقِ ثانی ہے۔ وہ صمیم معنوں میں حضرت داغ مرحوم کی جانشینی کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اردو زبان کی ایسی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اور اسے اس قدر مقبول اور ہر ذریعہ بنادیا ہے کہ اس سے زیادہ ترقی و ثوار معلوم ہوتی ہے۔ اخیر میں دعا ہے کہ خدائے پاک حضرت نوح کو صحت و دولت اور درازی عمر کی نعمتیں عطا کرے تاکہ ان کے فیضِ سخن کا چشمہ باغِ سخن کو دیر تک سیراب کرتا رہے۔ فقط

لذیذہ حکایت دراز تر گفتم

جوش ملیانی

نیک و بد کی تمیز

(جناب پروفیسر محمد دین صاحب تائیر ایم اے)

کسی آدمی کی نادانی اور جہالت کے ثبوت میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسے نیک و بد کی تمیز نہیں۔ اس فقرے سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیک اور بد میں تمیز کرنا بہت آسان ہے۔ اور جو آدمی ایسی آسان بات نہیں جانتا وہ بڑا ہی کوڑن ہے۔ زیادہ محتاط آدمی کسی کا نقص نہ لے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسے اپنے نیک و بد کی تمیز نہیں جن سے ان کا مطلب غالباً یہ ہوتا ہے کہ مطلقاً نیک و بد کی تمیز تو شاید مشکل ہے۔ لیکن ہر شخص باسانی یہ جان سکتا ہے کہ کوئی چیز اس کے لئے اچھی ہے اور کوئی بُری! — لیکن یہ امر اس قدر آسان نہیں جس قدر ان فقروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ نیک و بد میں تمیز کرنا کافی مشکل ہے۔

اول تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا نیک و بد کے مختلف معیار ہیں۔ کیا ہر آدمی یا مختلف گروہوں کے لئے اچھے اور بُرے کی تمیز مختلف ہے۔ کیا ہر ایک کا اپنا اپنا نیک و بد ہے۔ یا ہر ایک کے لئے یکساں اصول ہیں۔ نیک و بد مطلق ہے؟

عام طور پر مینا جاتا ہے کہ ہر مذہب، ہر ملک، ہر چیزوں کو بُرا اور اچھی چیزوں کو اچھا سمجھتا ہے۔ رب کے نیک و بد کے اصول ایک ہیں۔ مگر یہ رائے بھی عام آراء کی طرح سطحی ہے۔ چیزیں، یا کام ہر ملک میں ایک حیثیت نہیں رکھتے۔ مسلمان سود لینا برا سمجھتے ہیں۔ ہندو جاناؤ سمجھتے ہیں۔ انگریزوں میں مرد اور عورتیں ملکر ناچتے ہیں۔ اشیاء میں اسے بے حیائی کہا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہی فعل، ایک ہی مذہب، ایک ہی ملک، ایک ہی شخص کے نزدیک اچھا اور بُرا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی کام اپنے طور پر نہ اچھا ہے نہ بُرا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فعل اچھے اور بُرے نہیں ہوتے۔ تو پھر اچھا اور بُرا کیا ہوتا ہے؟ — اس کا جواب ایک مثال سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

صبح کا وقت ہے۔ سردیوں کی صبح۔ جب طمان خوب گرم ہوتا ہے۔ اور آدمی کچھ جاگتا۔ کچھ سوتا خیالی محل کی تمیز میں مشغول ہوتا ہے عین اسوقت ایک فقیر نہایت کُخت آواز میں اُسی کھڑکی کے نیچے جاں تم سورہے ہو۔ گانا شروع

کروتیا ہے۔ تم کچھ دیر اس امید میں صبر کرتے ہو۔ کہ یہ بلا خود بخود ٹل جائے گی۔ مگر وہ کوسے کی طرح ڈھیٹ بنا چلتا ہی رہتا ہے۔ تم غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھتے ہو۔ اور تمہارا غصہ ہے بھی بجا۔ تم دیر تک پڑھتے رہے ہو اور صبح امتحان ہے، اس لئے تم اس تھوڑے سے وقت میں اچھی طرح آرام کرنا چاہتے ہو اور فقیر ہے بھی تو ماشاء اللہ جس کی مدد کرنا ضروری نہیں۔ ان خیالات کو لئے ہوئے تم لحاف کو پرے پھینک دیتے ہو۔ اور کھوتی پر لٹے ہوئے کوٹ میں سے کوئی سکہ نکالتے ہو۔ پیسہ! انہیں پیسہ نہیں یہ بہت ہلکا ہے۔ روپیہ بہتر ہو گا۔ سو تم روپیہ ہاتھ میں لے کر فقیر کی آنکھ کا نشانہ بنادیتے ہو۔ تم ناشی تھوڑا چمچے ہو۔ مگر کچھ غصہ، کچھ سردی، کچھ خند، نشانہ چوک جاتا ہے۔ اور روپیہ آرام سے فقیر کی جھولی میں جا پڑتا ہے۔ وہ دو دعائیں دیتا ہوا جلدی جلدی چلا جاتا ہے۔ جلدی، جلدی اس لئے کہ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔ خائف ہے کہ کہیں یہ روپیہ پھینک دیا جائے۔ کیا یہ روپیہ کی خیرات اچھا فعل ہے یا بُرا؟

ایک اور صبح لیجئے۔ امتحان ہی کی صبح ہے، ریاضی کے امتحان کی۔ تم خوشی خوشی ایک پیسہ نہیں۔ روپیہ، کھڑکی میں سے نیچے فقیر کی جھولی میں پھینکتے ہو۔ تمہارا منہ خوشی سے تمہارا ہے۔ نشانہ پھر چوک جاتا ہے اور روپیہ فقیر کی آنکھ پر لگتا ہے۔ لمبو بننے لگتا ہے۔ اور وہ گالیاں دینے لگتا ہے۔ وہیں پاؤں پسا کر بیٹھ جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ روپیہ کی خیرات اچھا فعل ہے یا بُرا؟

ظاہر ہے کہ جس خیرات سے فقیر زخمی ہوا ہے وہ نیک ہے اور جس سے اُسے خوشی ہوئی وہ بد! — نیک و بد کا اطلاق ہمیشہ ذہنی حالت اور نیت پر ہوتا ہے۔ فعل نہ اچھا ہوتا ہے نہ بُرا — ایک آدمی بازار میں دودھا جاتا ہے۔ یہ کام نہ نیک ہے۔ نہ بد — نہ جانے وہ کسی کے گھر آگ لگانے جاتا ہے۔ یا کسی ڈوبتے ہوئے کو بچانے۔

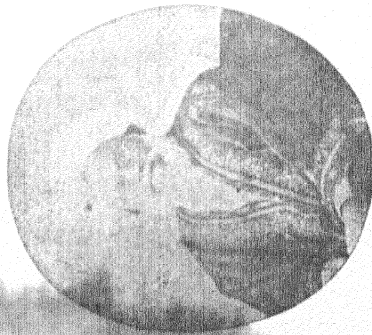
یہ اس سوال کا ایک پہلو ہے۔ اس کے اور بھی کئی رخ ہیں۔ مگر وہ زیادہ مشکل ہیں۔ ان پر پھر کبھی روشنی ڈالی جائیگی

لطیفہ

لالہ!۔ کیوں خاں صاحب! کل رات آپ کے ہاں چور آئے تھے۔ کچھ لے تو نہیں گئے؟
 خاں صاحب!۔ لالہ! لے کیا جانا تھا۔ تاک کٹ گئی۔ خدا کی قسم! کہتے ہوں گے۔ خاں صاحب کے ہاں کچھ بھی نہیں!"



مولانا الطاف حسین حالی



علامہ شبلی نعمانی



ڈاکٹر سو سید احمد



مولوی محمد حسین آزاد



پہنڈت رفیق فاطمہ سوشلر

سید مروحہ کے خط کا عکس

دو برس تک یعنی جب تک کہ میں گورنمنٹ آف انڈیا
لیچس لیٹ کونسل میں ممبر مولوی ابوالحسن میری پاس بطور
پرنسپل اسٹنٹ کیا رہی۔ اس عہد کے میں بھی ایسی شخص کی
درکار تھی جو انگریزوں میں مدد ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ ایماندار
اور معتدراز دار ہو۔ یہ سب صفات مولوی ابوالحسن میں
موجود تھیں اور میں تسلی کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ کو اس
مشکل کام میں ہر طرح کی مدد دی اور بہت ایمانداری اور معافی
اور راز داری۔ کام کیا اور ان کی انگریزی کی قابلیت اور کیا
جھکوت بہت بڑی مدد دی۔ وہ برابر کلمہ و شہد میں سرگشتہ
رہی پس میں اسامندی کے ساتھ یہاں رکھتے اور ان کو دیتا ہوں

مقام علیحدہ

سید مروحہ

۲۱ جنوری ۱۹۲۹ء

تجلیاتِ نظم

نواب میر تقی میر کا نظم

نہیں آتی نہ طبیعت اگر آئی ہوتی
 آنکھ لگتی نہ اگر آنکھ رگانی ہوتی
 راز سے دل کے نہ کرتا جو زباں کو آگاہ
 بات جو اپنی تھی کاسے کو پرانی ہوتی
 دل سے سرت کا کھٹا تھا اگر نامکس
 ساتھ لیتی ہوئی دل کو نکل آئی ہوتی
 کبھی تدبیر ہو بانی تو بچا بیٹھتے وہ
 کبھی نقیہ ہو لڑتی تو لڑانی ہوتی
 دل کے ارمان اگر تھے نہ بھگنے والے
 دم بھکنے کی تو امید بر آئی ہوتی
 گر پڑا پاؤں پہ اُس کے تو کہا ٹھکرا کر
 لوگ بیٹھے تھے ذرا شرم تو آئی ہوتی
 تو نے احساں جو اٹھایا تھا کسی کا لے نظم
 آنکھ پھر سامنے اُس کے نہ اٹھائی ہوتی

نغمہ صریر

وہ لڑکی تھی جس کا صاحب نے ریت میں اپنی سناٹا دوا صاحب پر ہرگز نہیں دیا تھا
 مائے انسان کبھی اسے خبر براں نہ ہوا
 ٹوپیٹ کر مری گردن سے گریباں نہ ہوا
 جان اگر کیوئے محبوب بلائیں لے لیں
 میں کبھی خواب پریشاں سے پریشاں نہ ہوا
 فیضِ کمال سے ہو کیا جوہرِ ناقابلِ کو
 عکسِ انساں سے کبھی آئینہ انساں نہ ہوا
 حسرت اس قسطِ کاخوں پہ جواٹھا کر سختی
 دل ہوا مائے ترے خیبر کا پیکاں نہ ہوا
 بلکہ میں بھی کہے ہم نے خدا کو جہ سے
 لطف یہ ہے کہ جب الکفر میں ایماں نہ ہوا
 جس قدر تو بہ سے نادم ہے صریر اے وعظ
 اس قدر کوئی گناہوں سے پشیاں نہ ہوا

آجیات

یعنی

حضرت امیرمیرمنیاں جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر حاقط سید جلیل جانشین حضرت امیرمنیاں
(از سید دل محمد فاضل فیاضی فاضل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر شہر)

حاقط سید جلیل جن صاحب جلیل المذاہب بہ جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر اپنے وطن نانک پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں نشو و نما اور علم ضروری پانچ قدیم فارسی زبان میں زبردست استعداد بہم پہنچائی۔ یہ وہ خوش نصیب اور صاحب کمال شاعر ہیں جن کو حضرت امیرمنیاں کے فیضانِ صحبت اور تلمذ نے نہ صرف ادبی دنیا میں مشہور کیا بلکہ ذہنی فکر سے بھی فارغ البال کیا۔ آپ امیر مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور تادم لکچر شفیق استاد کے قدموں سے جدا لگے ہوئے عروض و نوا کی کے ساتھ ساتھ جملہ معلومات و نکات شاعری کو حضرت امیر ہی کے خانِ ادب سے حاصل کیا۔ رام پور میں امیر اللغات کا دفتر قائم ہوا تو اس کا دائرہ ادارت آپ کے سپرد کیا گیا۔

حضرت امیرمنیاں حیدر آباد شریف لائے تو اپنے ہمراہ جناب جلیل کو بھی لائے اس وقت سے آپ حیدر آباد ہی میں اقامت پذیر ہیں استاد کی وفات کے بعد تمام تلامذہ امیر نے آپ ہی کو جانشین استاد تسلیم کیا۔ بعد ازاں دکن میں آپ کو اور جناب اخترمنیاں کو مہاراجہ سر پین السلطہ بہادر کی مہمان نوازی اور سرپرستی کی عزت حاصل ہوئی اور دو برس کے محبوب الکلام و دبیرہ آصفی کی ترتیب اشاعت کا اہتمام آپ کے ہاتھ میں آیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے تذکرہ و تانیث پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر موجودہ زمانہ کی ایک بڑی ضرورت کو پورا فرمایا جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکرہ و تانیث بہت واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ یہ رسالہ آپ کی محققانہ معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے سہذا ملک دکن کی ایک ضخیم تاریخ بھی آپ نے تالیف فرمائی ہے جو سنا جاتا ہے کہ اس وقت سرکار نظام کے حکم سے زیر طبع ہے ۱۳۲۶ ہجری میں نواب میر محبوب علی خاں بہادر سابق تاجدار دکن نے پانسو روپے ماہوار وظیفہ عطا فرمایا اور بجائے حضرت دائرغ کے اپنی استاد کی کاشت و بشت اور جلیل القدر کے معزز خطاب سے سرافراز کیا۔ آپ کا پہلا دیوان تلح سخن اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

حضور پرنو نواب میر عثمان علی خاں بہادر سربراہ آرائے سلطنت ہوئے تو اپنے پدید عالی قدر کے جواہر ریزوں میں سے اس کو مہر شاہوار کو بھی انتخاب فرمایا اور اپنی استاد کی کاشت و بشت سے شرف کیا اس وقت سے

رہنمائے تعلیم لاہور ————— ۳۴۳ ————— جولائی نمبر ۱۹۳۱ء
ہو سکتی۔

جان سخن۔ حضرت کا مشہور و مقبول دوسرا دیوان جو دوبارہ چھپکرتیار ہو گیا ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ اس نا در دیوان کا مطالعہ کیجئے۔ اور زبان کی شیرینی کا لطف اٹھائیے۔
معراج سخن۔ یعنی لغت شریف منقبت و سلام وغیرہ۔ یہ مجموعہ کلام کیا بہ اعتبار مضامین کی ندرت کیا باعتبار کثرت کیا باعتبار طاعت کیا باعتبار اپنے حسن ظاہری و باطنی کے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہ
بل نہیں سکتی کہیں اس کی نظیر
کیجئے کس چیز سے تعبیر عشق
"فضا"
اگر شائقین اس کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ تو بہت لطف اٹھائیں گے۔
تسرنان سخن "مدحیہ حضور نظام۔ قصائد و قطعات تاریخ کا یہ مجموعہ اپنی آپ نظیر اور اپنی آپ مثال ہے۔ اس کا مطالعہ شائقین ادب کیلئے نہایت ضروری ہے۔
کلام جلیل۔ یہ رسالہ ۱۰۷ غزلوں کا مجموعہ ہے جو کئی بار چھپ چکا ہے اب کے خصوصیت کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں جن کا مجھے علم نہیں۔
آپ کے نتائج طبع گہرے تازہ ترین بار بار رسالہ رہنمائے تعلیم میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور ہمارے ناظرین مطالعہ سے مستفید ہو چکے ہیں۔ تاہم پھر بھی میں حضرت کا نمونہ کلام پیش کرتا ہوں تاکہ یہ مضمون لطف سے خالی نہ رہے۔

نفاں میں درد۔ دغا میں اثر نہیں آتا۔
ترے خیال میں جو آئے ان سے کہ دینا
جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا۔
مری سمجھ میں تو کچھ نامہ نہیں آتا۔

یہ رنگ گلاب کی کلی کا
منہ بھیر کے یو اچلی جوانی
نقشہ ہے کسی کی کسنی کا
یاد آگیا روٹھنا کسی کا

بنان سنگدل نے آسیا کی جال سیکھی ہے
ہماری بیخودی کا حال وہ پوچھیں لائے ہمد
کہ مجھ کو پڑتے ہیں اور خود فریاد کرتے ہیں
تو کہنا ہوش اتنا ہے کہ تسکون دیتے ہیں

کہہ دو یہ کو کہن سے کمر نہ نہیں کمال
یہ اشکِ نعل نہیں جو ٹپکتے ہیں آنکھ سے
مر مر کے جہر بار میں جینا کمال ہے
کچھ ماجرا جگر کا ہے کچھ دل کا حال ہے

کتنی گہری مرے ساقی کی نظر ہوتی ہے
بیوفانی کا ہوش کوہ کہ ستم کی فریاد
مجھ کو پہروں میں کہیں اپنی خبر ہوتی ہے
سب کا توڑ ایک لحاظ کی نظر ہوتی ہے

نار بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیدار بھی
سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی

اے تنہا تنہا کو رو لوں شام وصل
آتے آتے آئیگا ان کو خیال
آج تو دل سے نکالی جائیگی
جاتے جاتے بے خیالی جائیگی
دیکھتے ہیں غور سے میری مشبہہ
شام اس میں جان ڈالی جائیگی

دل جلے عشق کے ڈرتے ہیں جل جائیے
لذتِ سوزِ جگر پوچھئے پروانے سے

تقص میں رشکِ حسرت پر مدارِ زندگانی ہے
یہی دانے کا دانہ ہے یہی پانی کا پانی ہے

پوچھئے یار کی خبر کس سے
جو گیا ہو کسے خبر آیا

کرتا ہوں یادِ شام سے ابروے یار کو
گلشن میں ان کی شوخیِ رفتار دیکھئے
خنجر سے کاٹنا ہوں شبِ انتظار کو
چالیں سکھا رہے ہیں نسیم بہار کو

قتال کا ہاتھ ہائے رکا بھی تو کسبِ رکا
تھوڑی سی جان جب تن بسل میں رہی

بوئے مے پاکے میں چلتا ہوا میٹلے کو
اک پر ہی تھی کہ اڑا لے گئی دیوانے کو

صلبانے جسے سنگھائی ہے جھکو بوتیری
قاتل جو کہ دیا انہیں بیزار ہو گئے
جمن جمن لئے بھرتی ہے جستجو تیری
ایسے مجھے وہ آج کہ تلوار ہو گئے

ہوش اٹتے ہیں بتوں کے دیکھ کر داغ جگر
رازِ دل کہہ کر بت کم سن سے خود رسوا ہوئے
چوٹ ان بچوں کی تیر بھی اٹھا سکے نہیں
جاننے تھے ہم کہ غنچے بو پھپھا سکے نہیں
لاش پر رونے سے بھڑکی اور رسوائی کی آگ
خاک ڈالو خاک پانی سے بچھا سکے نہیں

منظر موسم گل کے ہیں ترے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

رتبے میں وہ بند ہے جو خاک رہے
زخموں کے پھول کھل گئے تلوار چلی
دیکھا ہے بارہا کہ نلک پر غبار ہے
قاتل کی تیغ ہے کہ نسیم بہا رہے
اچھا یہ مشغلہ ہے جدائی میں جلیل
وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے

چھیر تانکوں ہے خدا کیلئے صیا د مجھے
دستِ مبارک کی نزاکت سے بہت ڈرتا ہوں
گو گرفتار ہوں اتنی نہیں فریاد مجھے
نیم ہل نہ کہیں چھوڑ دے جلاؤ مجھے
ساری دنیا کے خیالات تھے دلیں لیکن
جسے ہے یاد تری کچھ نہ رہا یاد مجھے

لادو گل بھی ترے چاہنے والے نکلے
شہری میں ہے عجب لطف خدا دادِ طویل
کوئی پرنخوں ہے کوئی داغ جگر رکھتا ہے
شرابچھا ہو تو جادو کا اثر رکھتا ہے

تمہاری تیغ کے پھل نے مزادیا ایسا
گلے سے کاش اتر جائے خنجرِ قاتل
دہان زخم کھلے رہ گئے دعا کیلئے
یہی دوا ہے مرے دردِ لادو کیلئے

ساتی بہار آتے ہی رنگ اور ہو گیا
رندوں کے ہاتھ سے نہیں ٹوٹی یہ ساقیا
گلشن کے پھول دینے لگے بو شراب کی
نشے سے چور ہو گئی بوتل شراب کی

میری توبہ بھی کوئی توبہ ہے
بھرسا قی میں ہے یہ حال اپنا
کون کیا چین میں جس نہ نثار
ہے اسی دن سے آئینہ حیران

جب بہار آئی توڑ ڈالی ہے
چشم پر خوں ہے جام خالی ہے
پتہ پتہ ہے ڈالی ڈالی ہے
تنبہ جس دن سے آنکھ ڈالی ہے

چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے
شمع کے ساتھ میں جلوں بگنک
دل مرا آنکھ آپ کی بیمار

نگو شوق پر وہ در بھی ہے
لے شب غم تری سحر بھی ہے
جو ادھر رنگ ہے ادھر بھی ہے

چمن کا رنگ پیدا ہو چلا خون شہیداں سے
بنے ہو تم جو ساقی نے کشی سے جی نہیں بھرتا

ترسی تیغ ادا پھولوں کی ڈالی ہوتی جاتی ہے
مرا جی پر صراحی آج خالی ہوتی جاتی ہے

ایک غزل بہت مقبول ہوئی۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں :-

تمہارے حسن کے آگے میر کا دل نہ ٹھہرے گا
ملاؤ دل سے دل تمکو اگر تسکین دینا ہے
جو تمہیں لیں قیس کی آہیں تو کرنا قصہ صحر کا
تصور سے علاج بے قرار سی ہو نہیں سکتا
قرار آتش پہ ہو سیلاب کو کیونکر یہ ممکن ہے
ہمارے دل پہ کیا موقوف ہے بیتاب ہو جانا
چلے ہیں کوئی جاناں کو نہ پوچھو شوق کا عالم
زبان حال سے کہتی ہیں موجیں بحر الفت کی
جداموتے تو ہو لیکن یہی انجم ہونا ہے

تمہارے ہاتھ رکھنے سے ہمارا دل نہ ٹھہرے گا
کہ اس آندھی میں سیلی پر وہ حمل نہ ٹھہرے گا
تجھے جب تک نہ دیکھیں گے ہمارا دل نہ ٹھہریگا
ترے دستِ خانی میں ہمارا دل نہ ٹھہریگا
وہ جس کے دل میں ٹھہریں گے اسی کا دل نہ ٹھہریگا
قدم رو جائیں دم رک جائے لیکن دل نہ ٹھہریگا
سفینہ بیقراری کا لب ساحل نہ ٹھہرے گا
تمہارا دل نہ پہلے گا ہمارا دل نہ ٹھہرے گا

جو سردیے کو آتے ہیں پٹ کر وہ نہیں جاتے
ہماری لاش ہی اب کو چہ قاتل سے نکلے گی

ابنِ باں کہیں بھی ہوں بہتے ہیں گلستاں
گلزار ہو رہا ہے نفسِ عندلیب سے
جس نے مرضِ دیا ہے وہی چارہ سنا
کیوں اپنے دل کا درد کہوں میں طیب سے
غم تھا جو اپنے حصے میں اسے بھی ایں ہے
غموار کتنے ہو گئے پیدا نصیب سے

دھڑکتے دل کو رکھ لو حبیب میں تم کوئی پوچھے تو کہ دینا گھڑی ہے

ضمیمہ

اس ضمن میں حضرت کے متفرق اشعار متعلقہ سہرا و تاریخی قطعات ملاحظہ ہوں
آب گوہر میں جو ڈوبا ہے سرا سہرا آتشِ حسن سے جلتا نہیں رخ پر سہرا
جدا فرقِ مبارک پہ مریضِ افسر مرجا چاند سے چہرے پہ منور سہرا
شوخی ایسا ہے کہ چھوٹنے سے الجھ پڑتا ہے مجبو حیرت ہے کہ گوندھا گیا کیونکر سہرا
موتیوں کا ہے جو سہرا سرِ نوشہ پہ جلیں ہم بھی لکھ لائے ہیں گنجینہ گوہر سہرا

شکر یہ عطائے ابنہ

فدوی کو شاہ نے جو کیا آم سے نہال یہ جاں نثار خاص ہوا سرِ خروکال
نایاب آمِ لطف ہوئے رنگِ رنگ کے کوئی ہے زر و کوئی ہر اکچھ ہیں لال
شیریں سوا ہے شیر و جاں سے ہر ایک بیل خوش رنگ خوش گوار و خوش انداز و خوش حال
خوشبو وہ ہے کہ سونگہ لے ان کو اگر مرین ہو جائے فضل حق سے طبعیت اجمی بحال
منہ میں جلیں کے ہوں نہ بانیں اگر ہزار اس مرحمت کا شکر ادا ہو یہ ہے محال

آج کل قطعہ تاریخ وہ پسند کیا جاتا ہے جس کے مصرعے پورا مادہ نکلے تعمیرِ تخرج کے حساب سے پاک ہو حضرت نے اس فن میں بھی کمال کر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند نمونے :-

”قطعہ تاریخِ جشن سالگرہ مبارک“

جولشنہ کام تھے وہ آج ہو گئے یلرب جلیلِ چشمہ زحمت ہے شہ کی سالگرہ
اٹھا جو دستِ دعا تھا آگئی تاریخ کلیدِ فتحِ سعادت ہے شہ کی سالگرہ

۱۳۳۴

انتخاب قطعہ تاریخِ جشنِ کتخانی ہمیشہ گانِ بنگانِ عالی متعالی

داد دیتا ہوں میں تاریخِ شادی کی جلیل آج ہیں اک بُرج میں دو ماہتاب و آفتاب

۱۳۳۴

”تاریخِ گلپوشی شہزادگان“

آج اس شاہ کے پیارے ہوئے گلپوش جلیل جو عطا پاش ہے مشہور خطا پوشی میں
تم وہ تاریخِ لکھو جس کا ہوا اندازِ جدا گل کھلے عیش کے شہزادوں کی گلپوشی میں

۱۳۳۴

مبارک بادِ بر موقعِ منشدِ نشینی شاہِ کن-کان اللہ!

یہ منشد شاہی تمہیں سرکارِ مبارک یہ جشنِ مبارک ہو یہ دربارِ مبارک
غنجے جو چمکتے ہیں تو آتی ہے یہ آواز دولت کا چمنِ عیش کا گلزارِ مبارک
کہتی ہے یہ خود شاہ کی پیشانی روشن تقدیرِ ساطاعِ بیدارِ مبارک
اجاب کو تری نگہِ لطفِ سزاوار دشمن کو ترا خنجرِ خوشخوارِ مبارک

لکھتا ہوں جلیلِ آصفِ ساج کی متنِ لطف
کیونکہ نہ مرے حق میں ہوں اشعارِ مبارک

تجلیاتِ اختر

(نواب اختر یار جنگ بہادر دینیائی ممتاز امور مذہبی سرکار نظام)

بجلی گراؤ ہنس کے نہ تم لالہ زار پر آتی ہے آنچ میرے دلِ مہدار پر
 دو ایک روز کیلئے چھپنا قہر ہے ہونے دو ہے نقاب اگر روئے یار پر
 پردے میں چشمِ شوق کے اک آگ لگ گئی پانیِ خطا نقاب کی جب روئے یار پر
 کچھ سیرِ گل کا شوق نہیں گنہ زار کو مدِ نظر ہے چوٹِ عروسِ بہار پر
 یہ ارتباطِ شانہ و آئینہ تاجِ ب برہم نہ سادگی ہو تمہارے سنگار پر
 چینِ جبین ہے نحو اسی اہتمام میں گردِ نظر نہ آنے کہیں روئے یار پر
 مستانِ عشق کو ہے ہمیشہ چڑھتی مٹی موقوف یہ جنوں نہیں فصلِ بہار پر
 اختر دعا کے واسطے کیونکر اٹھائے تھ
 ہے اک جب گرہ ایک دل بے قرار پر

بادۂ کہن

(از جناب قیاض ہریانوی بی اے)

اس چمن سے لختِ دل لے کر چلے ہم نئے پھولوں سے دامن بھر چلے
رہنے تھوڑی آئے تھے دنیا میں ہم سیر کر لی اور اپنے گھر چلے
لائے تھے مثلِ شرر تھوڑی سی عمر آنکھ (ادھر کھولی اُدھر ہم مر چلے
لائے کی مانند ہم اس بلغ میں داغ لینے آئے تھے لے کر چلے

امیدینائی

پاک لوگ آئے ہیں لے پیرِ مغان مے کدے میں بادۂ کوثر چلے
احسان شاہجہانپوری

بدرِ آخر ہو گیا بڑھ کر ہلال جس کو بڑھنا ہو، نہیں جھک کر چلے
اشم

کو کہن پر عشق میں ٹوٹے پہاڑ سختیوں کے قیس پتھر چلے
لے چلی مستانِ چال اپنا ثبات تھا منہا ہم اے پری پیکر چلے
پوچھتا ہے ضعفِ منزل میں شوق جو نہ چل سکتے تھے وہ کیونکر چلے
جلال کھنوی

جز شکستِ دل نہ کچھ حاصل ہوا ہم انہیں محکموں سے جھولی بھر چلے
جلیسی چل شری

مارڈالے گی قفس میں بُوئے گل ہم اسیروں سے ہوا بچ کر چلے
کیا دھرتھا اس تہی خنخانے میں ہم بھی آکر اپنا بھرنہ بھر چلے
داغ دھلوی

المدد! اے ناخنِ غم! المدد!! زخم پھر میرے جگر کے بھر چلے
آئے تھے کُچے میں تیرے غمزے حسرت آلودہ بگاہیں کر چلے
شائقِ فتح آبادی

جادۂ راہِ حقیقت کا ہے عزم ساتھ میرے خضر سار بہر چلے
صابر

مے بھی ہو، ساتھی بھی ہو، صافی بھی ہو یارے گھاڑھی چھنے، ساغر چلے
صافی

پھر گھٹا آئی، پیو اے مے کشو! پھر بہا آئی ہے پھر ساغر چلے
عطارد

ناتوانِ عشق یوں چلتے ہیں راہ ٹھک کے بیٹھے، دم لیا، اٹھ کر چلے
قیاس

اُس کی توبہ کا قمر کیا اعتبار توبہ کرنے کو بھی جو پنی کر چلے
قمر

ہر قدم جس کو بٹھا دیتی ہو یاس اٹھ کے راہِ شوق میں کیونکر چلے
ساتیا مے کا کبھی ایسا ہو دور توبہ ٹوٹے، خم لٹھیں ساغر چلے
سمال کھنوی

دردِ الفت نے کے اپنے گھر چلے آپ میرے حق میں یکساں کر چلے
لطیف

تم ابھی آنے، ابھی اٹھ کر چلے مفت کا احسان ہم پر دھڑ چلے
مدھوش

یہ خودی ہے چار دن کے واسطے چاہئے انسان کو تھک کر چلے
وصو

ساتھ بولیں دلہ ہی کو حسرتیں ہم جو ان کی بزم سے اٹھ کر چلے
ہرگز گردش ہو تیری آنکھ کو بزم میں ساقی یہی ساغر چلے
حسرتیں کیا کیا پسٹ کر روئی ہیں وصل کے ارمان جب باہر چلے
یاس لکھنوی

بارِ عصیاں سر پر اپنے دھڑ پلے کیا زمانے سے سبک ہو کر چلے
ذہین

جوش و حرشت میں بھی ہم بشتیا ہیں پھوڑنے کو سراسی در پر چلے
ناظم

زندگی ہے یا کوئی طوفان ب ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
درد

ارمغانِ عزیز

دآغ کے بعد لطفِ شعرِ عزیز
ہم نے تیری زبان میں دیکھا

نواب عزیز یار جنگ بہادر کب اور کس سن میں اور کس مقام پر پیدا ہوئے۔ بتدریج انہوں نے کیا کیا ترتیاں کیں۔ ماہوار یا سالانہ آمدنی کیا ہے؟ جاگیر کتنی ہے۔ مختلف علوم و فنون میں کما تنک قدرت رکھتے ہیں؟ ان باتوں سے مجھے کوئی تعلق ہے۔ نہ ان کے کھنکھنے کی میں ضرورت سمجھتا ہوں۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اگر پورا مواد میرے پاس جمع ہوتا تو میں ضرور لکھتا لیکن مجبور ہی ہے ان کے کمالات کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ کوئی مقامی باخبر شخص یہ کام اپنے ذمہ لے لگا۔ ازمنہ متصل حالات زندگی اس کے ماقول کتب ملے ہونگے!

پہلی بار میں نے غالباً سلسلہ عین ان کو حضرت دآغ دہلوی کے اس مقدس مکان پر دیکھا۔ جو حیدر آباد دکن محبوب گنج میں منڈی کے سامنے واقع تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید علی حسن صاحب آسن و افتخار عالم صاحب زادہ مدہروی موجود تھے۔ جناب امیر مینائی کھنوی کے انتقال کو بہت تھوڑا زمانہ گزرا تھا۔ دریا فت کرنے پر مغموم ہوا کہ اب نواب عزیز یار جنگ بہادر صرف خاص کے ناظم اور ایک معزز و مقتدر شخص اور قبلہ حضرت دآغ کے شاگرد و رشید ہیں۔ اس کے بعد عزا نہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن برابر ان کے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اور آپس میں شعر و سخن کے متعلق تبادلہ خیال کا موقع مل جاتا تھا۔ اس بار تو مجھے حیدر آباد میں کم رہنے کا موقع ملا۔ اور میں جلد چلا آیا۔ دوسری بار میں ستمبر ۱۹۰۸ء میں پھر گیا۔ اونڈیا وہ دنوں تک رہا۔ حسن صاحب آزاد صاحب اپنے وطن چلے آئے تھے۔ اُس وقت موجودہ لوگوں میں جناب مرزا خورشید عالم صاحب امراتہ مرزا صاحب نادان۔ نواب ابو اعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی۔ یادش بخیر نواب میر حسین علی خاں صاحب امیر جاگیر داروکن۔ سید حامد حسین بیدل شاہ جانیوری موجود تھے اور دآغ صاحب کا قیام ترپ بازار کی اعلیٰ شان کوٹھی میں تھا۔ ان باتوں کو چوبیس برس ہو گئے۔ آج نہ استاد ہیں۔ نہ وہ چلے ہیں۔ امراتہ مرزا صاحب چلے۔ مرزا خورشید عالم صاحب بھی اٹھ گئے بیدل صاحب پتہ نہیں۔ ایک بار نا پور میں میر کے مشاعر ملاقات ہوئی تھی۔ اتنا سنتا ہوں کہ ریاست بے پور میں وکالت کرتے ہیں۔ غرض اس پر لطف زمانے کے ناظم کرنے کو عزیز یار جنگ دکن میں اور سائل صاحب دہلی میں اور عین نامہ ضلع الہ آباد میں زندہ ہوں۔ اس وقت میری عمر کا ۵۲ سال شروع ہے۔ عزیز صاحب کی عمر بھی اسی کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن

ہے۔ دو ایک سال دو مجھ سے بڑے ہوں۔ یا اسی قدر میں اُن سے بڑا ہوں۔ وہ قریب قریب میرے ہم عمر ہیں۔ بچپن کا بھی زمانہ غالباً میرا اُن کا ایک ہوگا۔ اس صورت میں جو کچھ میری رائے اُن کے متعلق ہوگی وہ میرے خیال میں درست ہوگی۔ اویں یعنی پورا پورا اندازہ ان کے متعلق کر سکوں گا۔ گزریل کی باتیں دیکھنے سے کوئی صاحب یہ خیال نہ کریں کہ کسی خاص اثر میں میرے قلم سے اس قسم کے الفاظ نکلے ہیں۔ ادایک بھائی نے دوسرے بھائی کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ بلکہ جو کچھ میں لکھو لکھا۔ بغیر رعایت و مروت کے لکھوں گا۔ شاعری کے جتنے دالے اچھے برے کے رکھنے والے۔ جھوٹ سچ کے پہچاننے والے اس وقت خدا کے فضل سے ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ بات کھٹنے کو نہ رہ جائے گی۔ کہ میں نے کما تنک انصاف سے کام لیا ہے۔

ان کا پہلا دیوان اسی نام سے ۱۳۲۷ء میں شائع ہوا۔ ایک جلد میرے پاس بھی آئی۔ میں نے اُسی وقت خیال کیا تھا کہ اپنے خیالات کا اظہار کر دوں لیکن ایسے اسباب پیش آ گئے۔ کہ میں اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور یہ تنہا دل کی دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ اور اس کو کافی زمانہ گزر گیا۔ اب ان کا دوسرا دیوان "ارخان عزیز" ۲۸ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس دیوان میں غزلیں۔ سلام۔ مخمس۔ رباعیاں۔ کیا کچھ نہیں۔ چھپائی دیدہ زیب۔ کاغذ دلاستی۔ جلد بہت خوبصورت۔ نغمہ ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب کے لئے جو خوبیاں اور انتظام ممکن ہیں۔ وہ سب نظر آتے ہیں۔ باطنی خوبیوں کی بحث میں اگر ہر غزل اور ہر غزل کے اشارے لائے جائیں گے۔ تو ایک دوسری کتاب ہو جائے گی۔ لہذا چند غزلوں کے چند اشارے پیش کئے جاتے ہیں۔ بقیہ کلام کے متعلق ناظرین کی مہربان نگاہیں خود اندازہ کر لیں گی۔

سب سے پہلی غزل میں تین شعر قابل لحاظ ہیں۔

کچھ اس طرح مرے لب پر خدا کا نام آیا
ہو یا یہ شور کہ موسے کا ہم کلام آیا

"کچھ اس طرح" اس مکرے کی دست اور خدا کے نام کی تخصیص کی داد کیا دی جائے۔ پھر "موسیٰ کا ہم کلام آیا" صوفیہ کلام ہی نہیں۔ موسیٰ کا لفظ بھی موجود ہے۔ اس لفظ نے شعر میں جان ڈال دی اور طبع معنی نے مطلع کو مطلع خوش بنا دیا۔

ازل سے حُسن کے ہم قدر داں کچھ ایسے تھے
کہ زندگی میں ہمیں خود کا پیام آیا

یہ قاعدہ ہے کہ جو ہر فن یا کمال کا قدر داں ہوتا ہے۔ اُسی کے سامنے اظہارِ کمالِ فن کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہم حُسن کے قصدِ ازل ہی سے تھے۔ ہر لڑکپن سے مرنے کے بعد نہیں زندگی ہی میں یہ مژدہ سنایا گیا۔ کہ جو تم کو ملے گی۔ خود کا پیام آیا" کے دو معنی نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ خودی گئی کہ تم کو حور ملے گی۔ دوسرے یہ کہ خود خود نے

اپنے حسن کا قدر دان جان کر پیام دیا۔ زندگی کا لفظ شاعرانہ ہے۔ بعد مرنے کے جوبات حاصل ہوتی وہ زندگی ہی میں ہوگئی۔

کہو کلیم ہوئیں کیا حضور سے باتیں
ہمارا ذکر بھی کوئی دم کلام آیا

ایک معشوق کے دو چاہنے والے ہیں۔ ان میں سے ایک کی رسائی حرمِ ناز تک ہوگئی۔ اور دوسرا اس مستحار سے محروم ہے۔ جب پہلا مشتاق واپس آتا ہے تو دوسرا اشتیاق سے پوچھتا ہے۔ کہ دٹاں کیا کیا باتیں ہوئیں؟ تمہارے سلسلہ گفتگو میں کوئی میرا ذکر تو کچھ نہیں پایا واقعات کے لحاظ سے لا جواب ہے اور لطفِ بان اور اندازِ بیان کے خیال سے بے نظیر ہے۔ کلام کے سبب سے موسے نہیں استعمال کیا۔ کلیم کہا۔ اس سے وسعت نظر کا اندازہ کیجئے۔

”محبت تیری کیا، تیری وفا کیا“
ذرا پھر تو کہو، تم نے کہا کیا

عاشق کے لئے معشوق کی معمولی ادا بھی غضب ہوتی ہے۔ اس کو دشنامِ حجت تکرار میں بھی نئے قسم کا مزاج ملتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ میں معشوق کی ایسی سیدھی باتیں سنے جاؤں۔ چنانچہ یہی اس مطلع میں دکھایا گیا ہے۔ تم یہی کہے جاؤ، کہ نہ تیری محبت کوئی چیز ہے، نہ ہم تیری وفا کے قائل ہیں۔ مجھ کو تو اس میں بھی خاص لطف آتا ہے۔ ذرا پھر تو کہو، اُف! اُف! یہ ٹکڑا قیامت ہے۔ اور اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جن پر یہ واقعات گزر رہے ہوں۔

گئی گزری ہوئی باتوں سے حاصل
اب ان کا شکوہ کیا ان کا گلا کیا

بعض موقع انسان کے لئے ایسے آتے ہیں۔ جن میں زبان سے یہی الفاظ نکلتے ہیں۔ کہ جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا۔ گزری ہوئی باتوں کو جانے دو۔ ایسے ہی اشعار میں جو زبان پر رہ جاتے ہیں۔ اور ضربِ اشل کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں۔

”انہیں سے کر رہا ہوں اُن کے شکوے
الہی خیر ہو مجھ کو ہوا کیا

جن کا شکوہ ہو۔ اگر اُسی سے کیا جائے۔ تو یقیناً وہ اور برہم ہوگا۔ خدا سے شکایت کرتا۔ اپنے پرانے سے کتنا تو خیر ایک بات بھی تھی۔ مگر مجھے یہ کیا سوچی۔ کہ انہیں کا شکوہ انہیں کے آگے لے بیٹھا۔ اور ذرا بھی انجام کا خیال نہیں اب نہیں معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو؟

چھوڑ کر پھولوں کا دامن باغ میں
اڑ رہی ہے نکمتِ برباد کیا

”اڑ رہی ہے۔“ اس شعر میں خاص ٹکڑا ہے۔ اور اسی ٹکڑے نے اس شعر میں دو معنی پیدا کر دیئے۔ اڑنے کے معنی فخر کرنے کے بھی ہیں۔ جب پھولوں کا دامن چھٹ گیا۔ تو نکمت کے لئے فخر کا موقع کیا رہ گیا۔ دوسرے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ پھولوں کا دامن چھوڑ کر اڑ رہی ہے یعنی آوارہ و سرگرداں ہو رہی ہے۔ نکمتِ برباد۔ اس موصوف صفت کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ نکمت اور وہ بھی برباد! سبحان اللہ۔

آپ کے حُسن کا جواب نہیں
ہمنے سارے جہان میں دیکھا

یہ سہل ممتنع کی ایک لاجواب مثال ہے۔ اور اس شعر کی نثر نہیں ہو سکتی۔

اٹھے تو ابر کی صورت گرے تو برق کی طرح
ہمیں بھی ضحمت میں حاصل ہیں قوتیں کیا کیا

اول تو یہ زمین ہی سیکے خیال میں نئی ہے۔ پھر یہ شعر قابلِ داد ہے۔ ابر اور برق کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے۔ یعنی کوئی انتہا نہیں۔ اور پھر ضحمت میں ابر کی صورت اٹھنا اور برق کی طرح گرنا، یہ دو خاص فقرے ہیں۔ جب ضحمت میں یہ قوتیں حاصل ہیں۔ تو اس وقت کی قوتوں کا اندازہ کیجئے۔ جب ضحمت نہ رہا ہوگا۔ ابر اور برق۔ اور اٹھنا اور گرنا کا تقابل معمولی بات نہیں۔

پھاڑ کر دستِ جنوں دامانِ صبر
اپنے ہاتھوں آپ رسوا ہو گیا

دستِ جنوں دامانِ صبر پھاڑ کر اپنے ہاتھوں رسوا ہو گیا۔ تعریف سے باہر ہے۔ دستِ جنوں اور اپنے ہاتھوں کیا خوب شعر کہا ہے۔ اگرچہ میں دامن کی جگہ دامان کا استعمال بُرا جانتا ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کوئی نہ لکھے۔ مجھے یا کسی کو حق نہیں کہ جو لفظ خود ترک کرے۔ اس پر اور دن کو بھی مجبور کرے۔ ہر شخص کے لئے کچھ خصوصیت ہوتی ہیں۔ انہیں میں سے یہ بھی میسر کر لئے ہے۔

سرگزشتِ عمر کا ایک ایک حرف
سارے عالم میں فسانہ ہو گیا

دنیا میں کوئی اچھی بری بات ایسی نہیں جو مشہور نہ ہو جاتی ہو۔ کچھ واقعات تو تحقیقات کے خیال سے سنے جاتے ہیں کچھ حالات آنے والی نسلوں کے لئے درسِ عبرت بنتے ہیں۔ پھر ایک ایک حرف کا فسانہ ہو جانا کس قدر اہمیت

رکھتا ہے۔ سرگزشت اگر فسانہ ہو جاتی تو شعر میں اتنی وسعت نہ پیدا ہوتی۔ جس قدر ایک ایک حرف کے فسانہ ہونے سے پیدا ہوئی۔

کاروان اشکِ غم کے ساتھ ساتھ دل بھی پہلو سے روانہ ہو گیا

اگر یہ مضمون یوں ادا کیا جاتا کہ دل آنسوؤں کے ساتھ بگیا۔ تو کوئی خاص بات پیدا نہ ہوتی۔ اسلئے اتنے الفاظ اور خاص ترکیب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب کاروان اشکِ غم کے ساتھ دل کے روانہ ہونے میں ایک خاص لطافت پیدا ہو گیا۔ دل نے دیکھا کہ کارواں تو چلا جاتا ہے۔ میں ہی تنہا رہ کر کیا کر دوں گا۔ لہذا وہ بھی دیکھا دیکھی کارواں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ پھر آنسوؤں کا تعلق جو دل کے ساتھ ہے۔ اور دل کے روانہ ہونے میں جو اہمیت ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

غزل

آرام اپنے بس کا ہے۔ بس میں نہیں ہے کب
اپنی خوشی سے طائرِ جاں کس طرح اُڑے
نیلے سے پوچھتا رہا مجھوں یہ بار بار
دارِ فغانِ عشق کو کیسا اس سے واسطہ
دو لوں کا ایک ہی ہے حقیقت میں عسا
گلشن کی یاد لیتی ہے رہ رہ کے چٹکیاں

قائل ہوں میں تولدتِ آنار کا عزیز

جو خاریں غلش ہو چھن میں نہیں ہو گیا

یہ غزل تمام وکمال قابلِ دید ہے۔ اول تو زمین نہی۔ پھر محدود توانی۔ لیکن اس تنگی پر بھی کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ اور ہر شعر میں وجدانی کیفیت پیدا کی ہے۔ پڑھئے اور پڑھتے جلیئے۔ میں نے سب اشعار کی کئی بار پڑھے اور ہر بار ایک نیا لطف اٹھایا۔

روگِ جی کا فراق ہے گویا
سانس لینا بھی شاق ہے گویا

جان ہے گویا، شن ہے گویا، اس طرح پر لاہور سے وجاہت صاحب مہنجانوی ایک نمبر کسی رسالے کا نکل

چکے ہیں۔ مگر فراق ہے گویا اور شاق ہے گویا یہ بھی توانی ہیں۔ اس زمین میں ایسا نفس مطلع کنا عزیز صاحب ہی کا کام تھا۔ دونوں مصرعوں میں کس قدر برتگی ہے۔ اور سخی بھی کیا خوب ہیں۔

تم سے کب تھی وصال کی آہ
یہ بھی ایک اتفاق ہے گویا

وصال اور اتفاق کے لفظ اور دلوں الفاظ کے مفہوم نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ تمہارا وصل اتفاق سے ہو گیا۔ ورنہ اس کی امید نہ تھی۔ دیکھنے میں سلی معنی یہ ہوئے مگر انداز بیان کچھ ایسا دل فریب ہے کہ داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

دشمنی تو ہے دشمنی اُن کی
دوستی بھی اتفاق ہے گویا

دوستی کو اتفاق مان کر دشمنی کو کس قدر وسعت دی گئی ہے۔ جب ان کی دوستی اتفاق کے برابر ہے۔ تو دشمنی کیا ہوگی۔ علاوہ اس کے دشمنی تو ہے دشمنی اُن کی اس ترکیب پر دل بے چین ہوا جاتا ہے۔

دل تو سنتا ہے کوئی اور سننے یا نہ سننے
پردہ غیب سے آتی ہیں صدائیں کیا کیا

غیب کی آواز سے دل کا جو تعلق ہے۔ وہ سب جانتے ہیں۔ کوئی اور سننے یا نہ سننے اس فقرے کی روانی دیکھئے۔ ایسے موقع پر یہی الفاظ نکلتے ہیں۔ کوئی اور سننے یا نہ سننے دل تو سنتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پردہ غیب کی باتیں دل پر القا ہوتی ہیں۔

مے پرستوں کی دعاؤں کا اثر ہے ساقی
جھوم کر روزِ بستی ہیں گھٹائیں کیا کیا

عالم بادہ خواہی میں گھٹاؤں کے جھوم کر مے پرستوں کا لطف دی لوگ جان سکتے ہیں۔ جو اس میں عملی طور پر حصہ لیتے ہیں۔ "اے ساقی! گھٹاؤں کا قاعدہ ہے کسی دن برسیں اور کسی دن نہ برسیں۔ مگر جو یہ روز لگا تا برس کر لطف مے نوشی بڑھاتی ہیں۔ تو یہ دعاؤں کا اثر ہے۔ اور کس کی دعاؤں کا۔ مے پرستوں کی دعاؤں کا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ مے پرست اس قدر مقبول ہیں کوئی ان کی دعا خالی نہیں جاتی۔ مے کش یا مے خوار کہا جاتا تو وہ بات پیدا نہ ہوتی۔ جو مے پرست سے ہوئی۔ اس پرست میں محبوب لطف ہے۔

مست کرتی ہیں لٹپٹاتی ہیں مزارِ دیتی ہیں
میرے ساقی تیری متانہ ادائیں کیا کیا

اداؤں کے تین فعل بیان کئے ہیں۔ اور تینوں بلائے جان ہیں۔ ساقی کے لحاظ سے تینوں باتیں موقع کے ساتھ ایک ہی مصرع میں بیان کی ہیں۔ یہ کمال نہیں تو اور کیا ہے ایسے مصرع مشکل سے ملتا آتے ہیں

دیدنی ہے چمن دہر کا نقشہ بھی عزمین
رُت بدلتے ہی بدلتی ہیں ہوائیں کیا کیا

واقعاتِ عالم اور انقلابِ زمانہ کو کس خوبی سے پیش کیا ہے۔ قانونِ قدرت یہی ہے کہ ادھر رت بدلی اور ادھر مخالفت یا موافق ہوائیں چلنے لگیں۔

نیرنگی خیال کا اللہ سے اثر

صحرا ہوا چمن کبھی صحرا چمن ہوا

نیرنگی خیال کا لفظ تعریف سے بالاتر ہے۔ صحرا کا چمن اور چمن کا صحرا ہونا نیرنگی خیال پر منحصر ہے۔ اگر یہ لفظ نکال ڈالا جائے تو دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں مل سکتا۔ اور شعر بے کار ہو جائے گا۔

کچھ کم نہ تھی سیاہی عصیاں مگر عزمین
مٹی میں دب کے اور بھی میل کفن ہوا

اس زمین میں بیشتر استادوں کی غزلیں موجود ہیں۔ اور کفن کا قافیہ قریب قریب ہر شخص نے لکھا ہے۔ مگر یہ بھی خوب ہے۔ سیاہی عصیاں کیا کم تھی۔ اس سے پہلے ہی کفن میل ہو چکا تھا۔ پھر قبر کی مٹی نے اور بھی میل کر دیا۔ یہ "اور بھی" کی تعریف کہاں تک کی جائے۔

جھوٹے وعدوں پر تھی اپنی زندگی
اب تو وہ بھی اسرا جاتا رہا

یہ شعر حسرت و یاس کا جتنا جگتا موقع ہے۔ صریحاً معلوم تھا۔ کہ سب جھوٹے وعدے ہیں۔ اور ان جھوٹے وعدوں کو بھی غنیمت جان کر ہم جی رہے تھے۔ لیکن اب جھوٹے وعدے بھی نہیں ہوتے۔ کوئی صورتِ زندگی کی باقی نہ رہ گئی۔ مائے بائے!! اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا۔ وہ بھی آسرا جاتا رہا۔ خوب کہا ہے۔

کس دُصن میں کس خیال میں کس اشتیاق میں
دم توڑتا ہے آپ کا ہمارا دیکھنا!

پہلے مصرع میں دُصن۔ خیال۔ اشتیاق تین لفظ ہیں۔ ایک لفظ کی دوسرے لفظ سے دوسرے لفظ کی تیسرے لفظ سے مناسبت میں جو خوبی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ ان تینوں لفظوں کی نشست و بندش اور اپنی اپنی جگہ معنی خاص لطف دیکھتے ہیں۔ روایت کے لحاظ سے (کس) میں بھی عجیب بات ہے۔ یہ نہیں ظاہر

کیا کہ کیا دُصن ہے؟ کیا خیال ہے؟ کیا اشتیاق ہے؟ اس کا چہرہ رہنما ہی بہتر تھا۔

میر کے خدا نے مجھ کو دکھایا نصیب ہے
کس کو نصیب تھا ترا دیداً دیکھنا

یہ انشا میں دیکھا گیا ہے کہ اگر ایک لفظ مکرر آجاتا ہے تو بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن اس شعر میں نصیب دو جگہ ہے۔ مگر بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ایک حُسن پیدا کر رہا ہے۔ یہ قوتِ مشق کی بینِ دلیل ہے۔ کہ عیب کو ہنر کی صورت میں دکھایا جائے۔

کیا اور کوئی دل کو نہ لیکنا بجا درست
بے کار تم نے کہدیا بے کار ہو گیا

اس شعر کی ترکیب اور انداز بیان پر حضرت داغ کے شعر کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ عزیز صاحب کے پردے میں داغ بول رہے ہیں۔ کیا اتنا صاف شعر کوئی کہہ سکتا ہے۔ پہلے مصرعہ کی شانِ روزمرہ کی جان ہے۔ جس قدر بھی داد دی جائے۔ وہ کم ہے۔ طرزِ بیان پر دل لوٹ پوٹ ہوتا جاتا ہے۔

آئینہ لیکے ذرا دیکھ لو صورتِ اپنی
عشق وہ راز ہے تم سے بھی چھپا یا نہ گیا

تم افشائے راز کا بہت کچھ دعوے کرتے تھے۔ لیکن تم سے بھی نہ چھپا، اور سے کچھ اور صورت ہو گئی۔ آئینہ کے صورت دیکھو تو قلعی کھل جائے کہ دعوے غلط تھا۔ تم سے بھی کی تعریف امکان سے باہر ہے۔

سو تے فتنوں کو جگاتی رہی رفتِ سار تری
میری سوئی ہوئی فتمت کو جگایا نہ گیا

اس مضمون کو بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ لیکن یہ شعر معنی اور نبدش کے لحاظ سے نیا ہے۔ ملعنہ کے ذریعہ سے عاشق اپنا کام مشوق سے لگانا چاہتا ہے۔ سو تے فتنوں کو جگایا تو کوئی بات نہ کی میر سے سوئی ہوئی فتمت کو تیری رفتار جگاتی۔ تو میں جانتا۔ یعنی جب سوئی ہوئی فتمت جاگتی۔ تو سب اسان کھل جاتے۔ طریقِ بیان دلالہ ہے۔

حلق میرا ہے جگر میرا ہے گردن میری
تیغ تیری ہے پھری تیری ہے بخت میری

اس لفظ و نشر مرتب کو دیکھئے۔ پھر تین چیزیں ادھر اور تین چیزیں ادھر میرے خیال میں شاید الفاظ بھی

دنوں مصرعوں کے برابر ہیں۔ انقسم کی خوبی قابلِ آفریں ہے۔
کیا تار ماسیکہ کے لئے باغ جہاں میں بسبل!
سمیع پروا نے کی ہے اور گل تر بیت سرا

باغ جہاں میں کس قدر وسعت ہے۔ بظاہر شمع و پروانہ اور بیل و گل سے زیادہ کوئی حقیقی عاشق و مشوق نہیں۔
لوگ عاشقانہ مسنمین ہیں انہیں سے بیشتر نسبت دیتے ہیں۔ جب بیل کیلئے گل اور پروا نے کے لئے شمع مخصوص ہو
چکی تو میرے لئے کیا رہ گیا۔

مجھ کو چُپ رہنے کی عادت ہو گئی
ان کو لپکا پڑ گیا دشنام کا

دو دہائیں اپنی اور اُن کی دکھائی ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہوئے۔ کہ مجھ کو خاموشی کی عادت ہو گئی۔ اور اُن کو دشنام کا
لپکا پڑ گیا۔ دوسرے معنی یہ بھی ہوتے ہیں۔ کہ میری خاموشی نے ان کو دشنام پر ابھار دیا۔ اگر میں خاموش نہ رہتا۔ تو شاید
وہ گامیاں نہ دیتے۔

جس کو دنیا موت کہتی ہے عمر خیز
دوسرا اک نام ہے آرام کا

اس میں کوئی شک نہیں۔ تمام دنیا کی تکلیفیں زندگی تک منحصر ہیں۔ جب انسان مر جائے۔ تو نہ کوئی گھبراہٹ باقی رہتا
ہے۔ نہ بے چینی ہوتی ہے۔ موت کو آرام سے نسبت بہت بجا اور درست ہے۔

عمر بھر مجھ کو حسینوں سے سروکار رہا
اسے تاکا اُسے جھانکنا یہی آزار رہا

ایک من چلے انسان کی زندگی کا ہو بہو نقشہ ہے۔ جس کے پہلو میں چُبلدا دل جوتا ہے اُس کا یہی حال رہتا
ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ اسے تاکا اُسے جھانکنا یہی آزار رہا اور پھر عمر بھر مجھ کو حسینوں سے سروکار رہا کسی کو یہ مطلع
پسند آئے یا نہ آئے، مجھے تو بے حد پسند ہے۔

ہام پر وہ تو کسی روز پر آمد نہ ہوئے
دیکھنے والوں کا میلا پس دیوار رہا

”وہ تو“ یہ ٹکڑا قیامت ہے۔ ایسے الفاظ تلاش سے نہیں ملتے۔ حزن اتفاق سے مل جاتے ہیں۔

رازِ دل آنکھوں سے ظاہر ہو گیا
سلسلہ اشکوں کا مجسم ہو گیا

اول تو زمین نئی۔ اس پر محدود توانی جب تک ہمارے اشک آنکھوں سے نہ نکلے تھے۔ راز دل مخفی تھا۔ مگر اشکوں کے جاری ہونے سے آشفتہ ہو گیا۔ اس صورت میں اشکوں کے سلسلے کا مخبر ہو جانا کس قدر لگتی ہوئی بات ہے۔

خط کہاں کا بات تک اس نے نہ کی دیکھ کر قاصد کو ترجمہ ہو گیا
جو نہ کرنا تھا کیا وہ عشق نے جو نہ ہونا تھا وہ آخر ہو گیا

یہ دونوں اشاریں متضاد کی عمدہ مثال ہیں۔ کون ان کی نشر کر سکتا ہے شمس العلماء مولانا حالی صاحب کا فیصلہ ہے کہ عمدہ شعر کی تعریف یہی ہے جس کو سنایا جائے اُس کے دل میں فوراً یہ خیال آئے۔ کہ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ اور جب کہنے کو بیٹھے تو نہ کہہ سکے۔ دونوں شعر اس خاص صفت کی تحت میں آتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر اور کیا صفت شعر کوئی کہے گا۔

اڑا کر تلے جائے بادِ حوادث
ہوا ہو نہ جائے نشیمن کسی کا

بعض اشعار کیا قریب قریب وہ اشعار جن میں رعایت لفظی سے کام لیا جاتا ہے۔ فضول سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن بادِ حوادث کیسے ہوا ہونہ جائے۔ اگرچہ اکیلے قسم کی یہ بھی رعایت لفظی ہے۔ مگر مفہوم اور اپنی بندش سے ایک خاص جن اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ مناسبت لفظی بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔

حالِ ابر ہے شبِ غمِ نالہ شبِ گمراہ
اس اندھیرے میں پتہ چلتا نہیں تاثیر کا

اس مطلع کو بار بار پڑھتا ہوں اور صرختا ہوں، دل لٹن اٹھتا ہوں۔ زبان بیان نہیں کر سکتی۔ ایسے ہی مطلع شاعر کا نام روشن

کرتے ہیں۔ کہاں تک اس کی شرح لکھوں دفتر درکار ہے۔

چھوٹ جاؤں قیدِ غم سے زندگی میں کیا مجال
ربح مسکوں ہے احاطہ خانہ زنجیر کا

زندگی کا لفظ نگینہ ہے۔ اگر اس لفظ کو نکال کر دوسرا لفظ رکھتے تو وہ بات پیدا نہ ہو سکے گی۔ خانہ زنجیر کو ربح کہنا اور اس لڑی کو زندگی کے سلسلے سے ملانا۔ اور قیدِ غم سے مناسبت پیدا کرنی آسان کام نہیں۔ بڑی کوشش سے یہ شعر کہا گیا ہے۔ اور لایب تعریف کا مستحق ہے۔

کوچہ گردی سے بچا یا جو شرمِ محبت میں مجھے
مہربانی طوق کی احسان ہے زنجیر کا

زنجیر کے احسان اور طوق کی مہربانی کو کیا اچھے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ اگر یہ دونو چیزیں نہ ہوتیں۔ تو کوچہ گردی کی زحمتوں سے جوش و خروش میں بچنا محال تھا۔

نظر ان کی نہیں اٹھتی نہیں ملتی نہیں جیتی
نہیں کھلتا کہ صبر دیکھا کسے تا کا کسے جھانکا

یہ وہ پامال زمین ہے۔ جس پر قریب قریب تمام اساتذہ نے غول کھی ہے۔ اور خوب خوب شعر لکائے ہیں۔ ناسخ و آتش کے علاوہ خود حضرت ذریع دہلوی و جناب امیر مینائی لکھنوی کی متعدد غزلیں موجود ہیں۔ ایسی پامال زمین میں اب اچھے اشعار کا نکلنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ نظر کیلئے پہلے مصرعہ میں تین درجے قائم کئے گئے ہیں اور ایک درجے پر دوسرے درجہ کو ترجیح ہے۔ پہلے نظر اٹھتی ہے۔ پھر ملتی ہے۔ پھر جیتی ہے۔ اگر اس سلسلے میں کچھ تغیر کیا جائے۔ تو وہ سلسلہ باقی نہیں رہتا۔ پھر تین باتیں دوسرے مصرعہ میں بھی موجود ہیں۔ دیکھنا، اٹکانا، جھانکا ایک رشتے میں چھ موتی پرو دیئے ہیں۔

چھپاتے کس طرح مجھ سے کراؤ کا تبین آخر
منظر میں تھا مری ایک ایک نقطہ فرد و عصیاں کل

جو میرے کر توت تھے۔ میری نگاہ میں تھے۔ اس صورت میں کراؤ کا تبین کا چھپانا بے کار تھا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاص شعر ہے۔

آپ کی محفل ہے یا چو روں کا گھر
جس کو دیکھو چھپتا ہے دل گیا

بہت زمانے کی بات ہے۔ لیکن ہے مجھے میرا حافظہ دھوکا دیتا ہو۔ میں جس زمانے میں دکن میں تھا۔ سید امیرن صاحب فروغ لکھنوی وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد نے اس طرح پر ایک مختصر سا مشاعرہ کیا۔ میں نے بھی شعر کہے۔ امراؤ مرزا صاحب نادان و جناب سائل دہلوی نے غزلیں لکھیں۔ سپہنہ عزیز صاحب کا پہلا مصرعہ کچھ اور تھا۔ جس پر داغ صاحب نے یہ اصلاح فرمائی تھی

غیب کیا جانے غیب کی باتیں
میں سمجھتا ہوں آپ کا مطلب

”غیب کی باتیں“ اور آپ کا مطلب ”اس میں کچھ ایسی خوبی ہے کہ دل لطف اٹھاتا ہے اور زبان کچھ نہیں کہتی۔“

باتوں باتوں میں لے لیا دل کو
آنکھوں آنکھوں میں لے آرا مطلب

ہر عبادتی کا اگر رنگ یہی ہے تو عزیز

وَلَقَدْ عَلِمَ رَجُلًا وَكَمَا تَكَتْ خَسِرَ

دوستِ نازک پر ترے رہا، کے تیری تیغِ ناز

صدقے ہوتی ہے، مزاواں چیر کر میر کاٹ کر

پھر کاٹ کر انگڑا کاٹ کر یہ زمین آسان نہیں رہے۔ جدید ہونے کے علاوہ مشکل بھی ہے۔ دستِ نازک پر ترے تیغِ نازک صدمے ہونا۔ اس سبب سے کہ بہت نازک سے دل چاک کرنے اور سر کاٹنے کی امید نہ تھی۔ لیکن یہ باتیں ظہور پذیر ہو گئیں۔ اور اس نے خلافتِ امتیہ یہ اہم کام کر ڈالا۔ پھر تیغ کے دو فصل دکھائے ہیں۔ ایک ول چاک کرنا دوسرے سر کاٹنا۔ نزاکت کے دہلیز ہی کا گہرا مشکل تھا۔

جہاں کہیں کی قدر تو میری کسی نے بھیجی کی

نام آور ہو لیا و فرما د پھر کاٹ کر

جانبی کنی اور کوہ کنی میں کتنا فرق ہے۔ جانبی کنی کے مقابلے میں کوہ کنی کوئی چیز نہیں۔ لیکن فرما دو کہ کنی کر کے مشہور ہو گیا۔ اور اُس کی قدر و قیمت میں ہوئی۔ اور میں نے جو اُس سے زیادہ اہم کام کیا یعنی جانبی کنی کی۔ اُس کو کسی نے بھی نہ دیکھا۔ خوب شعر ہے۔

تھا گیا جو بے گناہی کا زمانہ عجب میں راز

کھٹ گیا ہے دل میں گردن میری خنجر کاٹ کر

گر دن کاٹ کر خنجر کا کٹ جانا توب بات کسی ہے۔ کٹ جانے کے معنی شرمندہ ہونے کے ہیں۔ چوتھم میں بے گناہ تھا۔ اور خنجر نے میری گردن کاٹی۔ اس لئے وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوا۔ کٹ جانے نے عجیب بات پیدا کر دی ہے۔

مستورے ہوتے ہیں غیر دل و ماں ہر بات میں

میرے خط میں بھی نئے لفظ اشکات گرا،

ہر بات میں غیر دل سے دماغ مشورہ لیا جاتا ہے۔ اور یہاں تک اس کی پابندی ہے۔ کہ میرے خط میں بھی اثرِ الفاظ تغیر و تبدل کرے، کچھ سے کچھ غمخوار کر دیا۔ حالانکہ میری تحریریں اس کی ضرورت ہی نہ تھیں۔ کیا اچھا خیال

ہے۔ اور کہتے اپنے الفاظ میں ادا ہوا ہے۔
 مگر رے گی طور پر بجلی مکہ
 اٹھے شعلے دل غمناک سے پھر
 'مکہ' نے روین کو کس قدر مضبوط کر دیا ہے۔ بلائے نہیں مل سکتی۔ پھر مضمون بھی کس قدر عمدہ ہے۔
 جو رے معشوق، اگر یہ عاشق

ہیں یہ دو نو حساب سے باہر
 نہ جو رے معشوق کی کوئی صوبہ۔ نہ گریہ عاشق کی کوئی انتہا۔ خوب بات کہی ہے۔
 میرے کمرے میں بھی کچھ تو ہوا رشاد
 کر چکے غیر کی شکایت بس
 غیر کی شکایت تو کر چکے۔ مگر میرے متعلق کچھ ارشاد نہ ہوا۔ کہ مجھ سے تو کوئی شکایت نہیں۔ علاوہ اس کے
 دوسرے معنی یہ بھی ہوتے ہیں۔ کہ غیر کی شکایت تو ہو چکی۔ اب میرے لئے کچھ ارشاد ہو۔ کہ میرے لئے کیا حکم ہوتا
 ہے۔

مبارک مصنف و تم کو گلشن
 ہمارا تو ٹھکانا ہے قفس بس
 کیا حسرت ہے۔ ادا کیا عبرت ہے۔ اور کیا صبر ہے۔ اسی میں ایک شعر اور بھی ہے۔
 وہ میسران کے آگے شکوہ غیر
 وہ ان کا ہنس کے فرمانا کہ بس بس
 کس قدر صاف صاف الفاظ ہیں۔ اور ہنس کے فرمانے نے تو جان ڈال دی ہے۔ کہ تم شکایت فضول کرتے
 ہو۔ اور یہ بھی معنی ہیں کہ بہت کچھ کہہ چکے۔ اب خاموش ہو۔ پھر قافیہ اور رویت کا کیا کہنا۔

یہ شب بوہ وفا یہ عنایت غلط غلط
 تم اور تم کو مجھ سے محبت غلط غلط
 معشوق کسی سے وفا نہیں کرتے۔ عنایت سے ان کو تعلق نہیں رہتا۔ یہ دونوں باتیں ہوں گی۔ تو کسی مصنف سے
 ہو گی۔ تم اور تم کو مجھ سے محبت "ان الفاظ پر وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ انداز بیان غضب ہے۔

مٹ جائے دل سے لذت آزار جھوٹ جھوٹ
 ٹل جائے سر سے بھر کی آفت غلط غلط

دونوں مصرعہ برابر کے ہیں۔ اور جھوٹ جھوٹ اور غلط غلط نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔
 ترے دستِ کرم سے مجھ کو ساقی ہو اس اغر عنایت ایک پر ایک
 چلی آتی ہے اُن کے ساتھ دلیں تنہا یا حسرت ایک پر ایک
 یہ توانی اور یہ ردیف اور یہ بحر، دونوں شعر لا جواب ہیں۔

سمائی سائے عالم کی ہے مشکل
 بڑھیکا حشر کا میداں کہاں تک
 شاعر جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ ناممکن کو ممکن کر کے دکھانا اس کے نزدیک مشکل نہیں۔ غرض اس کی دُنیا
 الگ ہے۔ یہ اپنے خیال کا تنہا مالک ہے۔ اور اس کی ملکیت میں غیر کا تصرف نہیں۔
 تھک تھک گیا ہوں ہجر کی شبِ اضطراب میں
 کہہ کہہ کے ہائے جگر ہائے دل
 علاوہ تناسب الفاظ کے واقعیت اس شعر میں بڑی مدت تک ہے۔ اضطراب کے سبب سے ہائے ہائے
 جگر، ہائے ہائے دل کہہ کہہ کے تھک گیا ہوں۔ اضطراب کا بھی دل اور جگر سے جو تعلق ہے۔ وہ پوشیدہ نہیں
 یوں ہر کسی کے سامنے کہنے سے فائدہ
 دل سے کوئی سنے تو کہوں جسے دل
 کوئی دل سے سنے تو دل کا حال کہوں۔ بالکل بکا اور درست ہے۔ اور جب دل سے کوئی نہ سنے۔ تو
 دل کا جاجر اکنا ہی بے کار ہے۔

کہنے کو ہم نے کہہ بھی دیا اضطراب میں
 سننے کو تم نے سن بھی لیا ماجراے دل
 لیکن اثر کچھ نہ ہوا۔ عجیب رخ سے شعر کہا ہے۔ ہندش کتنی پیاری ہے۔ اور الفاظ کس قدر اچھے ہیں۔
 رکھ کے زاہد کے سامنے ساغر حُسنِ نیت کو دکھیتا ہوں میں
 اسمیں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں دل کی وسعت کو دکھیتا ہوں میں
 جب ساغر سامنے آگیا تو محال ہے کہ نیت درست رہ سکے۔ زاہد کا امتحان حُسنِ نیت کے دیکھنے کے خیال
 سے لیا جاتا ہے۔ واہ رے حُسنِ نیت! عجیب لفظ رکھ دیا ہے۔ صرف نیت نہیں کہا۔ بلکہ حُسنِ نیت۔ یہی لفظ
 سارے شعر کی جان ہے۔

نظا ہر دل ذرا سی چیز ہے۔ لیکن اس کی وسعت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ دُنیا بھر کے خیالات اس میں

رہتے ہیں۔ تمام زمانے کی کھپت یہیں ہوتی ہے۔ ترکیب کے لحاظ سے اور معنی کے اعتبار سے بڑا درجہ اس شعر کا ہے۔

ٹوٹا ہے دل کسی کی محبت میں اس قدر
لکھتے ہیں اپنا حال شکستہ قلم سے ہم

دل ٹوٹنے کا اظہار شکستہ قلم سے کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بدست خیال ہے۔ تناسب الفاظ نے عجب بات پیدا کر دی۔ اور پھر اس قدر نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

اُن کو اس درجہ متغیر ہے دل عاشق سے
خط بھی لکھا تو کہیں وال نہیں لام نہیں

یہ بہت پامال زمین ہے۔ اکثر حضرات کی غزلیں اس طرح پر نظر آتی ہیں۔ مگر اس خوبصورتی کے ساتھ اب تک یہ قافیہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دل کے لئے وال نہیں لام نہیں خوب ہے۔ ایسی باتیں اتفاق سے ملتی ہیں مگر سے نہیں ملتیں۔ خوب لکھا ہے۔ کیا کہنا۔

دیکھنا راہ پر آجائے گی آتے آتے

گردش چشم تری گردشِ آیام نہیں
شعرِ مشافی ظاہر ہوتی ہے گردشِ آیام ایک ایسی چیز ہے۔ جس پر کبھی زور نہیں۔ لیکن تیر گوی چشم
آتے آتے کسی نہ کسی طرح راہ پر آجائے گی۔ پھر دیکھنا یہ لفظ توجہ کے قابل ہے۔ خصوصاً گردشِ چشم کے لحاظ سے تو بہت ہی موزوں ہے۔

آسمانِ دُور زمیں سخت - زمانہ دشمن

رُبحِ مسکول میں کہیں نام کو آرام نہیں

زمین سخت آسمانِ دُور پورا پورا عمارتِ نظم ہو گیا۔ اور پھر زمانہ دشمن جب یہ تین شکلیں سامنے ہیں۔ تو ربحِ مسکول میں آرام کا ملنا فی الحقیقت محال ہے۔ اور کہیں پناہ کی جگہ نہیں۔

جب ہے ساتی مہرباں تو مے کشو!

تم کو فکرِ بیش و کم آخسریوں

زمین بھی نئی شعر بھی نیا۔ جب ساتی مہربان ہے۔ تو بیش و کم کی فکرِ فضول ہے۔ شراب ختم ہونے پر اور مل جائے گی۔ کیونکہ شراب کا ملنا ساتی کی مہربانی پر موقوف ہے۔

دیدہ و دل کیا ڈبو دیں گے مجھے
ہو گئے دونوں ہم آخر یہ کیوں

آنسو دل میں رستے ہیں۔ اور رونے کے وقت دل سے چل کر آنکھوں تک آتے ہیں۔ تو دیدہ و دل
جب مل گئے۔ یقینی غضب آئے گا۔ بینی مجھے ڈبو دیں گے۔

چار دن کی زندگی کے واسطے
اس کی خواہش اُس کا ارماں کیا کریں

جب زندگی کا اعتبار نہیں۔ تو چند دن کے لئے کسی چیز کی خواہش کیوں کی جائے۔

ذیل کے اشعار میں سے اگر ہر شعر کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ لہذا بغیر اپنے
انظار رائے و خیالات کے درج کئے دیتا ہوں۔ نقاد اور مبصر نگار میں خود فیصلہ کریں کہ یہ اشعار کیسے ہیں۔ اور
دنیا تے ادب میں ان کا صحیح وقار کہاں تک ہے۔

دو قدم پر سے بیاہاں کیا کریں
تذکرہ بار بار کرتا ہوں
اور پھر اُمت بکارتا ہوں

نا توانی سے قدم اٹھتے نہیں
حُسن کا انکے عشق کا اپنے
جاننا ہوں مہتار و عدول کو

جب خطائیں شمار کرتا ہوں
دیکھنے کو تو یہ بھولے ہیں مگر پکے ہیں
ہم دکھا دینگے ارادے کے لگ پکے ہیں،
کان کے کچے ہیں مطلب کے مگر پکے ہیں
خام سب جن دلائیک ہیں بشر پکے ہیں
نا توانی میں بھی جان نا تو اں نکلتی نہیں
کارواں کجائے گرد کارواں نکلتی نہیں
کھل جائیگی گرہ ترے بند نقاب کی
تواریں گئی ہے کرن آفتاب کی

بہ نکلتے ہیں ہشمار آنسو
نازنینانِ جہاں شب رہ گریختے ہیں
ہم لٹا دینگے محبت میں متاعِ ہستی،
پختہ کاری کی خبر دیتی ہے خامی اُن کی
عشق کا بار اٹھانے سے ٹھلا یہ عفت رہ
آ رہی ہے کھینچ کے فرقت میں لبون بکارتا ہوں
اڑ کے ہم پہنچیں گے منزل پر ہوا شوق میں
شوخی سے کٹکٹ نہیں اچھی حجاب کی
ہو تے ہی صبح دل کی شب نکلتا ہوں کیا

شیشے کھلے نہیں ابھی ساغر چلے نہیں
 ایسا نہ ہو کہ چھین لے محشر میں بدگماں
 ساتی کہاں کی بھول یہ کہنے کی بات ہے
 میری یہ عرض وصل کا امیدوار ہوں
 دو آنکھیں دل کے ساتھ ملی ہیں اسی لئے
 محشر میں عجب حُسن نے اُن کو چھپا لیا
 ہستی سے پھر چلے ہیں عدم کی طرف کو ہم
 نابود و بود میں تو نہیں کچھ بھی فاصلہ
 اُس نے ہنس کر بات میری ٹال دی
 تڑپ فرقت میں جانِ ناتواں کی
 پٹے ہیں ہجر میں جینے کے لالے
 کہانی ہجر کی آگے کسی کے
 دیتا ہے مجھ کو دل مرا رہ کے مشورہ
 بجلی کی طرح چال ہو اکی وُں چل گئے
 میں اشتیاق دید میں بے چین اس طرف
 غش کھا کے میکدے میں گرے غم و مگر غم
 دیکھ کر بزم میں خالی ساغر
 تیرے خنجر میں عجب ہے مصیقل
 ناز کرتی ہیں دعائیں کیا کیا

اڑنے لگی پری کی طرح بو شراب کی
 دو نقلیں چاہئیں مجھے فردِ حساب کی
 دانستہ تو نے غیر کو دی میزِ نام کی
 اُن کا یہ قول آپنے ناحق مہیہ کی
 گنجائش ایک میں تھی کہاں فوق دید کی
 نظریں ٹٹولتی ہیں مشتاق دید کی
 بدستیاں ہیں یہ بھی شرابِ الست کی
 حاجت ہے درمیاں میں نقطہ ایک جبت کی
 آنکھوں میں اور الجھن ڈال دی
 بنی تصویرِ مرگ ناگساں کی
 کہاں کی آرزو حسرت کہاں کی
 نہ کرنی محنت بیاں لیکن بیاں کی
 جس وقت جاگتا نہ ہو دربان جانیے
 دل میں ہے نظریں پھرے پھر نکل گئے
 وہ اُس طرف نگاہ بچا کر نکل گئے
 ساتی نے ماتھے مقام لیا ہم سنبھل گئے
 آنکھ میخواروں کی بھڑکتی ہے
 موت کی شکل نظر آتی ہے
 کوئی مہیہ جو برآتی ہے

وہی منہ ہے وہی منہ میں باں ہے
 تسکینے میں تمہارا نیم جہاں ہے
 نہ ہوگی سرگزشتِ عمر آخر
 بولنے کی مجھ میں اب طاقت کمال
 وصل کا وعدہ پھر اس انداز سے
 آنکھ ان کی مجھ سے مل سکتی نہیں
 اُس نے کچھ اس طرح پوچھا حالِ دل
 اتنا بھی ہوش بے خودی شوق میں نہیں
 خالی نہیں اثر سے ہماری فغاں سخنِ یز
 عزیز اس باغِ عالم کی حقیقت کھل گئی مجھ پر
 دُور ہم تم سے بھلا فغل میں کیونکر بیٹھتے
 بدگمانی مجھے بڑھنے نہیں دیتی آگے
 عشق جب آسان تھا آسان تھا
 دل میں اترے دل میں ٹھہرے دل میں لے چکیا
 مائے وہ انگڑائی لیکر اُن کا کہنا ناز سے
 کیا ہے قیدِ نزاکت نے اس طرح اُن کو
 پھول بادہ سر و میں ناغہ کیا ہے
 گردِ کلفت سے معراشت و شو سے دنیا
 رازِ کلفت کو چھپا یا لیکن ان پر کھل گیا

مگر جو تباہی پہنچی کہاں ہے
 زمیں نیچے ہے اوپر آسمان ہے
 بڑا قصہ ہے لمبی داستان ہے
 روح پہلے کھینچ گئی تصویق سے
 نیچی نظروں سے دبی آواز سے
 بند ہے رستہ ہجومِ ناز سے
 مجھ کو کہنا ہی پڑا آرام ہے
 کس کا خیال ہے مجھے کس کی تلاش ہے
 دلکش کبھی ہے اور کبھی دلِ خراش ہے
 نگاہِ چشمِ زرگس سے زبانِ برگِ سوسن سے
 جسکے دل میں بھتی جگہ اس کے برابر بیٹھتے
 کیوں میرے ساتھ مرا نقشِ قدم ہوتا ہے
 اب ہی شوارسا د شوار ہے
 اسے مصو مجھ کو اک تصویر ایسی چاہئے
 خنجر ایسا چاہئے شمشیر ایسی چاہئے
 کہ اب کسی کے تصو میں آئیں سکتے
 باغ کا یہ باغ ہے مینا نے کا مینا ہے
 میری عریانی بھی گویا خلعتِ شاما ہے
 سچ کہ ہے یہ کسی نے دل کو دلِ راہ ہے

جتنا کم کیجئے اتنا ہی سوا ہوتی ہے
 بخودی میں جو ذرا الغرض پا ہوتی ہے
 خطا و ارجحیت تھے سزاوارِ کرم نخلے
 تلاشی لی تو سینے میں مرے غم نخلے
 بہم آئے بہم بیٹھے بہم اٹھے بہم نخلے
 اور وہ گھبرا کے دامن کی ہوا دینے لگے
 آخر آخر تیرے صو کے بھی مرا دینے لگے
 کیسی اڑتی ہوئی چنگاری ہے
 کیا بلب نے سایہ اپنے پسے
 چلا ہوں حال کیسی نامہ بر سے
 ہیں صرف محرومیت کے چرچے ہی چرچے
 یہ قول اُن کا ہے میری بلا طے تجھ سے
 بلائیں اسکی بھی لوں گر ملے بلا اُن کی

کسی کے عشوہ جا دو طراز نے دل پر
 کسی کے غمزہ و انداز و ناز نے دل پر
 کئے وہ ظلم کہ جس کا شمار مشکل ہے

ادھر نکلی ادھر پہنچی یہاں ٹھہری وہاں جھکی
 نہ جنت کی ضرورت تھی نہ حاجت تھی جہنم کی
 بڑھادی تیغ شاہ دین نے آبادی جہنم کی

ہوں دستِ دنیا بھی بلا ہوتی ہے
 ہتمام لیتا ہے وہیں کھلے مجھے دستِ سبُو
 تعجب کیوں تجھ بخش پر ہماری تجھ کو لے زاہد
 گماں کیا کیا تھا اُن کو خانہ دل کی تجلی پر
 غضب ہے وہ عُدوہ و نونِ ماری نرم ماتم میں
 میں گر اقدموں پہ ان کے اضطرابِ شوق میں
 اولِ اول ہم سمجھتے تھے محبت کو بُرا
 بوند بھی آتشِ ترکی ساقی !
 گلِ نازک چیب پڑنے لگی دھو
 دیا ہے خط سے پہلے میں نے انعام
 بدل گئے ہیں مانے کے اندنوں نقشے
 حیل کے چشمِ مروت سے اٹھ گئے پر دے

دوسرے نے پہنچے
 کسی کے طرہ زلفِ دل از نے دل پر
 کسی کے شیوہ راز و نیاز نے دل پر
 کئے وہ ظلم کہ جس کا شمار مشکل ہے

سکام کے دو چار شعر
 غضب کی چلتی پھرتی برق ہے شمشیرِ درجی
 سعادت کا شقاوت کا عزمِ مقصود تھا ورنہ
 گھٹادی چلتے چلتے لشکرِ کفار کی کثرت

دیا سجدے میں شمع نے سر شہادت الٰہی بتی ہے قیامت نے کہا اٹھ کر قیامت ایسی ہوتی ہے
 دھیان آتا ہے شہ تشنہ دہن کا جس دم ایک دریا مری آنکھوں سے رواں ہوتا ہے
 عابد زار کی زاری نہیں دیکھی جاتی جان آنکھوں میں ہے چہرے نمایاں غم ہے
 تعلق ہے غلامی کا مجھے شبیر و شیر سے گدھوں میں اسی در کا بنا ہوں میں سی گھر سے
 سلاموں کے بعد ایام ہجر کے نام سے ایک طولانی نظم ہے۔ اگر اُسے بھی لکھتا ہوں تو طوالت کا خیال ہے۔
 دو ایک رباعیاں بھی ملاحظہ فرمائیے :-

پُر نور و ضیا بخش جہاں بانی ہے کیا دورِ عزیز دورِ عثمانی ہے
 دفتر کے ہیں اوراق طبق گردوں کے یہ مہر فلک بھی مہر سلطانِ فی ہے
 محروم رہے وصل سے ناشاد ہے دیکھیں ہر وقت اسی منکر میں برباد ہے
 اللہ سے چاہیں گے ترے ظلم کی داد یہ یاد رہے یاد رہے یاد ہے
 پھر پھول مکتے ہیں بہار آئی ہے دیکھیں پھر قلب بھڑکتے ہیں بہار آئی ہے
 پھر باغ میں ہے دورِ مئی نابِ عزیز پھر جام پھلکتے ہیں بہار آئی ہے

کہاں تک لکھوں اور کن کن خوبیوں کو دکھاؤں اور کس کس بات کی تعریف کر دوں۔
 پہلے دستورۂ قضا لیکن اب رواج ہو گیا ہے کہ ہر تعریف یا تالیف کے ساتھ مصنف یا مؤلف کے حالاتِ عمر
 درج کئے جاتے ہیں اور تصویر بھی دی جاتی ہے۔ اگر اس دیوان میں کوئی کمی ہے تو یہی ہے کہ حالاتِ زندگی درج
 نہیں۔ اگرچہ تصویر ہے۔ یقین ہے کہ یہ کمی آئندہ ایڈیشن میں پوری کر دی جائیگی۔ دیوان مبلغِ دو روپیہ بیچنے یا دینی منگوانے
 پر عالی خباب نواب عزیز یار جنگ بھادر عزیز "عزیز منزل کنگ کوٹھی روڈ حیدر آباد دکن سے مل سکتا
 ہے۔ فقط۔

رام گلی

رہنمائے تعلیم کا دفتر لاہور شہر کی رام گلی میں ہے۔ آدمی جس چیز کا نام بار بار لیتے ہیں اس کی چھپی ہوئی طاقت اور چھپے ہوئے اثر کو بھول جاتے ہیں۔ مگر تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعلیمی رہنمائی اسی میں ہے۔ کہ ان کو شہر دل اور قصبوں اور ان کی گلیوں کے ناموں کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ اگر ان ناموں میں کوئی تعلیمی بات موجود ہو۔

رام گلی ایسا نام ہے کہ اس کو سن کر ہر ہندو کے دل میں اپنے مشہور اور مضبوط کیرکٹر کے اوتار سری رام چند جی ہمارا ج کا خیال آ جانا چاہئے۔ اور جب اس اچھے نام کی گلی میں کوئی بات دیکھی جائے یا سنی جائے۔ تو فوراً اس نام کی لالچ رکھنے کے لئے اس برائی کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ہر دوار میں ہر کی پٹری ہے۔ سنسکرت زبان میں ہر کا لفظ خدا کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر دوار کے یہ معنی ہوتے کہ خدا کے قریب" اور ہر کی پٹری کا مطلب بھی یہ ہوا کہ خدا کے پاس جانے کا زینہ۔ میں نے ہر دوار کی پٹری پر بے شمار ہندو عورتوں اور مردوں کو اشنان کرتے دیکھا ہے۔ اور وہاں میں بہت دن رہا ہوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دریا میں نہانے والے ہر کی پٹری کے اصلی مفہوم کو سمجھ کر غسل کرتے ہیں یا محض رسم و رواج کے دریا میں غوطہ لگاتے ہیں۔

ہندوستان میں ہزاروں مقامات کے نام تعلیمی نقطہ نظر سے رکھے گئے۔ مگر لوگ اب ان ناموں کے مقصد کو بھولتے جاتے ہیں۔ اگر رہنمائے تعلیم جیسا مفید تعلیمی کام کرنے والا پرچہ اس طرف توجہ کرے۔ کہ ہندوستان کے سب شہر دل اور آبادیوں کے ناموں پر غور کر کے ایک مضمون لکھے۔ اور اس سے تعلیمی نتائج نکالے۔ تو ہندو قوم کے لئے یہ مضمون بہت مفید ہو گا۔

ہندو طلباء کو اپنے ناموں پر بھی غور کرنا چاہئے۔ ہندوؤں کے نام سب سے زیادہ سری کرشن جی ہمارا ج کے مختلف ناموں پر رکھے جلتے ہیں۔ اور اس کے بعد رام چند جی کے نام پر۔ جن طلباء کے نام کسی مشہور اوتار یا پیشوا کے نام پر ہوں۔ ان کو چاہئے کہ اپنے نام کی لالچ رکھیں۔ اور کوشش کریں کہ جو تعلیم ان بزرگوں کی انتہائی ترقی و تکمیل کے لئے ان تک پہنچی ہو۔ اس کی پیروی کریں۔ اور اس کا نمونہ بنیں۔

کیا رہنمائے تعلیم رام گلی کے لئے آئندہ کچھ کام کرنا چاہتا ہے ؟ اگر ایسا ہو تو میرے خیال میں اس کی نہایت عمدہ خدمات جو اس نے ساہما سال سے ملک کی ہیں۔ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکنے لگیں گی۔

حسن نظامی دہلوی

بچے اپنے بڑوں سے

ہیں کھیل کود میں مصروف دیکھ کر تم کہتے ہو
"یہ ننھے بچے ہیں"

لیکن کیا یہ کل ہی بات نہیں
کہ تم بھی ننھے بچے ہی تھے

ٹاں ! اور اب کل ہی تو وہ دن آ رہا ہے
کہ ہم بھی مرد اور عورت ہوں گے۔

اور بھروسہ کے مالک نہیں گے۔
کھیل میں تو ہم بچے ہیں۔

لیکن گھر اور مدرسے میں ہمارے مستقبل کا دھیان کرو۔

ہمیں بھروسہ پر حکومت کرنے کے قابل بنا دو۔
ہماری رہنمائی عقل و دانش سے کرو۔

ہمیں راستی کا سبق پڑھاؤ
اگرچہ ہم بچے ہیں۔

لیکن تمہاری ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔

ہمارے ان کھیل کے دنوں میں تم اپنی اچھی مثال پیش کرو

ہم تو ہمیشہ تمہارے ہی قول و فعل کی نقل اتارنے والے ہیں۔

منصور احمد (جائنت ڈیٹرر: نہ ہالوں لاہور)

(ایلا ویرنگاکس)

میری حماقتیں

جب انسان سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے۔ تو اس کے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ اسے یہ بات ناگوار خاطر ہوتی ہے کہ اس کی حماقتوں کا علم دوسروں کو ہو جائے۔ لیکن بعض ایسی حماقتیں ہوتی ہیں۔ کہ موردِ ناہنہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اور پھر ان کے ظاہر ہو جانے سے زیادہ کوفت نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض اوقات تو ان کے بیان کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں جب کبھی کسی سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے تو اسے کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور ظاہر کر دینا چاہئے۔ تاکہ دوسرے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس سے سبق حاصل کر سکیں۔ چنانچہ میری عادت ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنی حماقت کسی فرضی شخصیت کی طرف منسوب کر کے احباب کے سامنے بیان کر دیا کرتا ہوں۔ اور طرزیانِ ایبا اختیار کرتا ہوں کہ ان کو شبہ تک نہیں ہوتا۔ کہ میں اپنی تعریف کر رہا ہوں۔

لیکن جن حماقتوں کا میں اب ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان کو میں کسی فرضی شخصیت کی طرف محض اسلئے منسوب نہیں کرتا کہ سطورِ مذکورہ بالا پڑھ کر آپ پر اعلیتِ فوراً روشن ہو جائیگی۔ اور آپ سمجھ جائیں گے کہ کسی اور کے پردہ میں اپنی حماقتوں کو بیان کر رہا ہوں (رع) کوئی معذرت ہے اس پردہ نگاری میں +

جب میری عمر کوئی پانچ سال کی تھی۔ میرے والد صاحب مجھے ایک رات ایک ڈراما دکھانے کے لئے لینگے میرا خیال ہے کہ ان کو ضرور مغت پاس مل گیا ہوگا۔ ورنہ وہ ایسی فضول خرچی کر نیوالے نہیں کہ پیسے خرچ کر کے ڈرامہ دیکھنے جائیں۔ اور پھر ایک بچہ کے ٹکٹ پر پیسے ضائع کریں۔ مجھے اب یہ بھی یاد نہیں کہ ڈراما کون سا تھا ممکن ہے ”خدا دوست“ ہو۔ کیونکہ بچپن میں جو میں نے دو یا تین ڈرامے دیکھے ہیں۔ ان میں سے صرف ”خدا دوست“ کا نام مجھے یاد ہے۔ اس ڈرامے کا پلاٹ بھی میری یاد سے بالکل محو ہو چکا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جب میں ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت بھی میں اچھی طرح نہ سمجھ سکتا تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے؟ البتہ ایک سین کا ذرا سا حصہ مجھے یاد ہے۔ وہ یہ تھا۔ کہ ایک قاضی صاحب کے دربار میں ایک آدمی آیا جس کی کسی نے ناک کاٹ ڈالی تھی اس کی ناک پر مرہم کی پٹی لگی ہوئی تھی۔ اور وہ قاضی کے دربار میں فریاد کرنا چاہتا تھا۔ یہ اکیڑ ہمارے پڑوس میں رہا کرتا تھا۔ اور مجھے شبہ ہے۔ کہ اسی نے ہمارے لئے ایک ایسے پاس کا انتظام کیا تھا۔ جس کو ”چہ گفت“ کہتے ہیں۔ اُس نے

قاضی صاحب کے دہائیں اگر اس قسم کا فقرہ کہا "اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کر دوں" لیکن قاضی صاحب نے بالکل توجہ نہ دی۔ مظلوم نے پھر اسی فقرہ کو دہرایا۔ مگر قاضی صاحب نے پھر پروا نہ کی۔ میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب کو ضرور دوسری طرف سے رشوت مل گئی ہوگی۔ ان کی بے اتفاقی کا یہ عالم دیکھ کر مجھے بڑا جوش آیا کہ مظلوم کی فریاد سن کر اس کی بات کا جواب تک نہیں دیتے۔ اس شخص نے جب تیسری دفعہ پھر اجازت طلب کی۔ تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں فوراً اپنی کرسی پر کھڑا ہو گیا۔ اور زور سے چلایا۔ بیشک اجازت ہے۔ میری آواز نے تمام تماشائیوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اور وہ چھوٹے سے بچے کو کرسی پر کھڑے ہو کر چلا تے ہوئے دیکھ کر میری حاکت پر ہنسنے لگے۔ اور زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ ایک صاحب نے جو میرے پاس کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے گود میں لے لیا۔ اور شاید یہ کہا کہ "چپ چاپ تماشہ دیکھا کرتے ہیں۔"

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔

میں ایک دفعہ چند دوستوں کے ساتھ لاہور گیا۔ اگرچہ میں اس سے پہلے کئی دفعہ شالامار باغ کی سیر کر چکا تھا مگر میرے ساتھی اس سے محروم تھے۔ اس لئے میں دو ٹانگے کرایہ کر کے ان کو شالامار باغ لے گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ دن صرف عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کہ چلنے سے پہلے اس بات پر کیوں نہ غور کر لیا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ہفتہ میں ایک دن عورتوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ پتہ نہ تھا۔ کہ وہ کونسا دن ہے۔ ٹانگہ والوں نے بھی مجھے یقین دلایا۔ کہ انہیں بھی اس کا علم نہ تھا۔ کہ وہ دن عورتوں کیلئے مخصوص ہے۔ اور میں نے ان کی باتیں میں آکر اس کا یقین کر لیا۔ ٹانگہ والوں نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ کہ وہ موعودہ کرایہ سے صرف ایک ایک روپیہ زائد لیکر ہمیں شاہدہ کی سیر کرانے کو تیار ہیں۔ پھر ہم شاہدہ چلے گئے۔ ہم اندر داخل ہونے لگے تو ایک ٹانگہ والے نے کہا چونکہ ہمیں اندر کچھ وقت لگ جائیگا اسلئے انہیں آدھ گھنٹہ کی جٹی ملنی چاہئے۔ اس پر ایک تجربہ کار نے کہا کہ ان کو یہیں رہنا چاہئے۔ مگر میں نے اس میں ہرج نہ دیکھ کر ٹانگہ والوں کو اجازت دیدی۔ کہ جہاں چاہیں چلے جائیں اور پھر ایک گھنٹہ تک واپس آجائیں۔ جب ہم ایک گھنٹہ کے بعد باہر نکلے۔ تو وہاں کوئی ٹانگہ والا موجود نہ تھا۔ اور نہ کہیں آس پاس نظر آتا تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ اور دوپہر کا وقت۔ دھوپ تیز تھی۔ اس لئے میرے دوست میری طرف تھراؤ دے کر نکلیں۔ مگر میں نے کہا کہ میں خود شاہدہ سٹیشن پر جا کر ان کی تلاش کرتا ہوں۔ اور ابھی ان کو لاتا ہوں۔ چنانچہ میں سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس کا راستہ بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ خیر دو تین مرتبہ راستہ بد چھنے کے بعد سٹیشن پر پہنچا۔ تو وہاں بھی ٹانگہ والوں کوئی نشان نہ پایا۔ متعبرہ پر حجب میں واپس پہنچا تو اپنے احباب کو بھی نہ پایا۔ میں نے خیال کیا کہ ان کو کوئی اور سواری مل گئی ہوگی۔ اور عطی کی سزا دینے

کے لئے وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر روانہ ہو گئے ہونگے۔ چنانچہ میں پیدل شہر کی طرف چل پڑا۔ مگر اسی آدھ میل بھی نہ گیا ہو گا۔ کہ دھوپ کی برواشت نہ کر سکا۔ اور یہ سفر پہاڑ نظر آیا۔ پھر میں سٹیشن کی طرف ٹوٹا کہ کسی ریل گاڑی سے لاہور چلا جاؤں۔ جب میں سٹیشن پر پہنچا تو گاڑی بالکل تیار کھڑی تھی۔ میں جلدی سے اس زمانہ کے قاعدہ کے مطابق ٹکٹ کے پاس گیا اور ٹکٹ لینے کا وقت نہیں۔ اس لئے میں بجری ٹکٹ سیکنڈ کلاس میں سوار ہو رہا ہوں۔ لاہور چل کر پیسے دے دوں گا۔ چونکہ فاصلہ تھوڑا تھا۔ اس لئے میں سیکنڈ کلاس میں جلدی سے سوار ہو گیا۔ ورنہ میں تو عموماً تھوڑے کلاس میں سفر کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ فوراً ٹکٹس کوئی نہیں ہے۔

جب لاہور پہنچا۔ تو میں نے گارڈ کو کہا کہ مجھ سے پیسے وصول کر لے (میری حققتیں ملاحظہ فرماتے چاہئے اس نے کہا) کیا ضرورت ہے۔ ایک طرف سے باہر نکل جاؤ ۱۰ گرجو رکی ڈاڑھی میں تنکا۔ اور پھر چور بھی ایسا جو بچا ہو۔ اور جس کی ڈاڑھی اتنی گھنی ہو کہ تنکے کی تلاش میں گھٹنوں لگ جائیں۔ ابھی میں پلیٹ فارم پر ہی تھا۔ اور چل جانے کے لئے موقع تلاش کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے دور ہی سے مجھے بھانپ لیا۔ کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہو انہوں نے ٹکٹ مانگا۔ تو میں نے اپنی رام کہانی کا آخری حصہ بیان کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ گارڈ سے کھوا کر لائیں۔ ورنہ ہم وزیر آباد سے کرایہ چارج کریں گے۔ ناچار ڈنڈا ڈرتا میں پھر گارڈ کے پاس پہنچا۔ جو گاڑی سے اسباب اتار رہے تھے۔ چونکہ آپ ایک صاحب نما عیانی تھے اور ٹوپ پہنے ہوئے تھے۔ اس لئے میں ڈنڈا تھا۔ کہ کہیں غصہ میں کچھ وہابی تباہی نہ۔۔۔ دیں۔ جب میں نے صاحب بہادر سے کہا کہ ٹکٹ باہو آپ کی تحریر چاہتا ہوں تو آپ فرمانے لگے۔ یہ بابو خواہ خواہ تنگ کیا کرتے ہیں۔ لویہ لودرا اس طرف سے نکل جاؤ ۱۰ یہ کھوکھرا آپنے ایک تھوڑے کلاس کا ٹکٹ جو کامونکے سے لاہور تک کا تھا۔ میرے لئے لے لیا۔ چنانچہ میں تھوڑے کلاس والے مسافروں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

اب میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے۔ ٹانگے دلے کچھ دیر کے بعد شاہدہ مقبرے پر پہنچ گئے ہوں۔ اور ہمیں وہاں نہ پا کر گالیاں دیتے ہوں کہ یہ بابو ہمارے پیسے مار کر بھاگ گئے۔ چنانچہ میں اس اڑے پہر پہنچا۔ جہاں سے کہ ٹانگے صبح کے وقت کرایہ پر لئے تھے۔ اور اُن کو تلاش کرنے لگا۔ کہ ان کو کرایہ ادا کر دیا جائے مگر ان کو وہاں نہ پایا اور دوسرے ٹانگے والوں نے بھی اُن کا کچھ پتہ نہ دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے ایسا بوقوف نہ سمجھتے تھے۔ کہ باوجود اس قدر تکلیف اٹھانے کے میں ان کو کرایہ دینے کے لئے ان کے پیچھے پیچھے پھر دوں اس لئے انہوں نے غالباً یہ خیال کیا ہو گا کہ میں اُن ٹانگہ والوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتا ہوں۔

خیر جب میں ہوٹل میں پہنچا تو میں اپنے دوستوں کو وہاں پا کر حیران ہو گیا۔ انہوں نے بتایا کہ جب میں ٹانگوں کی تلاش میں گیا ہوں۔ تو جلدی ہی ٹانگے وہاں پہنچ گئے تھے۔ اور وہ محض اس لئے بغیر میرا انتظار

کئے چل پڑے تھے۔ کہ ان سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ میں کسی اور ٹانگہ پر سوار ہو کر شہر آ گیا ہوں۔ میرے رفیل میں یہ لوگوں کی سن گھڑت کہانی تھی۔ اصل وہ مجھے سزا دینا چاہتے تھے۔ خیر جس صاحب نے کہ یہ ادا کیا تھا۔ ان کو میں نے تمام رقم ادا کر دی۔ اگرچہ انہوں نے ایک دودھ بناؤ ٹی نہ بھی کی۔

اگر آپ اکتانہ گئے ہوں۔ تو ایک دوا در باتیں بھی سن لیجئے۔ میں ایک سکول میں پھر ہو گیا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ اپنے فرائض کو نہایت ایمانداری سے قوائد کے مطابق سرانجام دینے کی کوشش کر دوں۔ اور نہ کسی کے ساتھ بے اعصافی روار کھوں۔ اور نہ ہی کسی کی ناہانزیر عایت کر دوں۔ کہیں یہ بات خود تائی تو نہ سمجھی جائیگی؟ ایک دفعہ ایک غریب لڑکا میرا دیا ہوا کام کر کے نہ لایا۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو اس نے گستاخانہ جواب دیا۔ میں نے کوڈ کوڈ نظر رکھتے ہوئے اسے کوئی سزا نہ دی۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس رپورٹ کی۔ انہوں نے اس لڑکے کو خوب سزا دی۔ اور بعد میں مجھے کہا۔ کہ ایسے موقعوں پر مجھے خود جماعت میں ہی سزا دینی چاہئے۔ جب میں نے کوڈ کا حوالہ دیا تو کہنے لگے آپ اس بات کی مطلق پروا نہ کریں۔ اور کام میں غفلت کرنا لڑکوں کو خوب سزا دیا کریں!

چند روز کے بعد دو تین لڑکوں کو کام نہ کرنے کی وجہ سے میں نے زد و کوب کیا۔ بد قسمتی سے وہ سکول کٹی کے ممبروں کے لڑکے تھے۔ پھر تو ایک شر محشر بپا ہو گیا۔ مجھ سے جواب طلبی ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے خوب اٹا اور کہا کہ تمہیں لڑکوں کو مارنے کا کوئی حق نہیں۔ آئندہ ایسا کر دو گے تو برخواست کر دیئے جاؤ گے۔ میں اس وقت رعب میں آ گیا۔ اور خاموش کھڑا رہا۔ جب لڑکوں کے سر پرست ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد تشریف لے گئے۔ تو میں نے حوصلہ کر کے نہایت اوج سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو وہ دقت یاد دلایا۔ جب انہوں نے سزا دینے کی اجازت مجھے بخشی تھی۔ وہ منس پڑے اور کہنے لگے "تم ابھی نا تجربہ کار ہو۔ تم میں ٹیکٹ نہیں ہے۔ سزا صرف ان لڑکوں کو دینی چاہئے۔ جو خاموشی سے سزا برداشت کر سکیں۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ صرف غریب لڑکے ہی سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرا خون کھولنے لگا۔ مگر میں خاموش کھڑا رہا۔ آخر میں نے کہا۔ اگر کوئی امیر لڑکا سزا کا مستحق ہو اور اُسے سزا نہ دی جائے تو اس کا اثر اس لڑکے پر اور بھی بُرا پڑے گا۔ آپ فرمانے لگے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ تم میں ٹیکٹ نہیں ہے۔ بھائی جان! ایسے موقع پر کسی نہ کسی بہانہ سے کسی غریب لڑکے کو خوب سزا دینی چاہئے۔ تاکہ مجرم امیر لڑکے پر رعب جم جائے۔ اور اگر وہ پھر بھی کام نہ کرے تو جائے جہنم میں! مختصر سے سکوت کے بعد آپ نے پھر دھڑک دیا۔ "تھیں یہ بھی چاہئے۔ کہ جماعت میں اپنی تمام توجہ سکول کی تھی کہ ممبروں کی طرف دیکھو۔ کیونکہ ان کی ترقی سے ہی تمہارا کام جانچا جائے گا۔ اگر ممبروں کے لڑکے پڑھائی میں اچھے ہوں گے۔ تو ممبر سمجھیں گے کہ ساری جماعت اچھی ہے اور استاد بڑا قابل ہے اور

اس بات کا بھی خیال رکھو کہ امیر ٹکے تم سے خوش ہیں۔ اُن کی ہر وقت دہلجی اور رعایت کرتے رہنا چاہئے کیونکہ کل کو یہی بڑے آدمی نہیں گئے اور تمہیں ان سے کام پڑے گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس کے متعلق ایک واقعہ بھی بیان فرمایا۔ کہ ایک دارودہ صفائی شہر کی کھٹی کے ممبروں کے مکانات کے سامنے خوب صفائی اور چمڑا کا ڈکرا دیا کرتے تھے۔ اور شہر کی عام صفائی کی طرف سے بالکل غافل رہتے تھے کبھی کبھی ممبروں کو سلام بھی کرتے تھے۔ ان سے ممبر ہمیشہ خوش رہے۔ اور ان کے برخلاف شکایات کو دشمنی پر مبنی کر کے ان کو ترقی پر ترقی دیتے رہے۔

غرض ہیڈ ماسٹر صاحب نے کمال مہربانی سے ٹیکٹ پر ایک لمبا چٹا لیکچر مجھے پلا دیا۔ مگر میں اپنی حماقت پر ڈٹا رہا اور اس لیکچر سے صرف اس قدم میں نے اخذ کیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا ٹیکٹ 'مسادہ' سے بے ایمانی جمع ہے انصافی کے۔ اور اس ٹیکٹ اور خود داری میں کوئی نسبت نہیں۔ میری ضد اور حماقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی مجھے استعفاء دینا پڑا۔ اور اب تک بیکار ہوں۔

ارادہ تھا کہ چند اور حماقتوں کو بھی معروض تحریر میں لاؤں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ پہلے ہی کافی لکھ چکا ہوں۔ اس لئے اب اجازت چاہتا ہوں۔ ہاں! یہ تو فرمائیے کہ سب سے بڑی حماقت آپ کے نزدیک کونسی ہوئی؟ آپ میں غالباً اس کا جواب دینے میں اختلاف ہوگا۔ اس لئے میں اپنی رائے ظاہر کئے دیتا ہوں۔ میرے خیال میں سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ میں اب بھی ان حماقتوں سے تائب نہیں ہوا۔

غزل

(عالمی نواب قدرت نواز جنگ بہادر قدس سرہ) "ناظم نظم جمعیت سرکار عالی تلمیذ حضرت جلیل القدر"

"جلیل" حیدر آباد کن

کیا ہے قتل جس دن سے کسی کو	لب قاتل ترستے ہیں منہ ہی کو
انل سے مست جاؤ بخودی ہوں	بھلا زانہیں لیا جانوں خودی کو
کسی پر مر کے پانی عسیر جاوید	خضر و کھنیں ہادی زندگی کو
برے زعموں کو ناقص تم نے چھڑا	نہ تھا کیا اور کوئی دل لگی کو

توہل کا عشق تھا قدرت منہ ہی ہے
تمہیں سفاک ٹیگا زندگی کو

اخلاق و موعظت

پر

چند لطیف اشعار کا مجموعہ

جمع کردہ

شیخ محمد اسماعیل صاحب سکرٹری اورینٹل پبلک لائبریری

پانی پت

- | | | |
|--------|--|---|
| (میر) | جدم یہ سوجھ بکلی کہ یہ عالم بھی خواب تھا | ٹمک دیکھ آنکھیں کھول کے اُس دم کی حقیقت |
| (۱) | اس سے کھجو بہر دور نہ ہوگا | دُنیا کی نہ کر تو خواست تھاری |
| (۲) | میر اس کو راہیگاں کھوتا ہے کیا | غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز |
| (۳) | کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا | معیشت ہم فقیروں کی سی احوالِ زماں سے کر |
| (۴) | ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا ٹھو کا | یہ عیش کہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے |
| (غالب) | دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں مجھ جائیگا | فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد |
| (۵) | ہے یہ وہ لفظ کہ ستر مندہ معنی نہ ہوا | وہ میں نقش وفا و جیت سی نہ ہوا |
| (۶) | جونا سزا کے اسکو نہ ناس نہ کہئے | جو مدھی بنے اس کے نہ مدھی بنئے |
| (۷) | نہ کہو گر بُرا کرے کوئی | نہ سگو گر بُرا کے کوئی |
| (۸) | بخش دو گر خطا کرے کوئی | روک لو گر غلط چلے کوئی |

- (علی) ایک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
(۱۰) ہوں اسمیں اگر گلے سرے دانے چند
(۱۱) دیکھا کہ چڑھاوانہ کو لیسکر سوار
(۱۲) مشکل نہیں کوئی پیش ہمت - دوشوار
(۱۳) نہ ہو در و کی چوٹ جس کے جلے پر
(۱۴) خدا مہرباں ہو گا عرشین میں پر
(۱۵) جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو
(۱۶) کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں
(۱۷) جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی !
(۱۸) فضیلت ، نہ عورت ، نہ فرمانروائی
(۱۹) تو بھاگا جماعت میں ہے اپنی آتما
(۲۰) فتوح اپنی اک ایک کو ہے دکھاتا
(۲۱) سدا ان کے ہیں اس طرح کام چلتے
(۲۲) کماٹی سے ایک اک کی لاکھوں ہیں پلتے
(۲۳) جب ایک چوٹا جس میں دانش نہ حکمت
(۲۴) معیشت سے ایک اک کو بچنے فراغت
(۲۵) تو اس سے زیادہ ہے بے غیرتی کیا
(۲۶) کہ ہو آدمی کو نہ پاس آدمی کا
(۲۷) تکرار مٹی مزارع و مالک میں ایک وز
(۲۸) کہتا تھا وہ کرے جو رامت اسی کا حکمت
(۲۹) پوچھا میں سے میں نے کہ ہو کسا مال تو
(۳۰) مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
(۳۱) دو نو یہ کہہ ہے تھے مرا مال ہے زمین
(۳۲) کہتا تھا یہ کہ "عقل ٹھکانے تری نہیں"
(۳۳) بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقین
(۳۴) جو زیر آسمان ہے وہ دھرتی کا مال ہے

شری لڑکے

(جناب بھائی نیشنلس صاحب پوریلم لے پنی اسی ایس ڈیٹر شعبہ پنجابی، ہندو)

(پنجاب ٹیکسٹ بک کمپنی - لاہور)

کیا والدین اسکیا استاد شری لڑکوں کے ہاتھوں نالوں ہیں۔ مگر ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جب دنیا بھر کے لڑکے کم دہش شری ہیں اور ہم سب بچپن میں شرارتیں کرتے رہے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ شرارت چھوٹی عمر کا ایک قدرتی خاصہ ہے اور بچوں کا چھوٹا ہونا ایک غیر طبعی حالت ہے۔ مگر سب سے دیا تھی سکولوں میں تمام دن طلباء کو ایک ہی جگہ جھاکر مدرس صاحبان کتابی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اس بات پر غور کرتے ہیں کہ دیکھو ہمارا ضبط ایسا اچھا ہے کہ ہمارے سامنے کسی لڑکے کی مجال نہیں ہے کہ ذرا بھی دم مارے۔ کوئی بول نہیں سکتا۔ ہاتھیں بھی پجوں سے تنگ آکر ان کو مدرسہ بھیج دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان کو شرارت سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ اور صرف مدرس میں استاد ہی ان کو قابو کر سکتے ہیں۔ مگر بچ پوچھو تو اس قسم کا ضبط خلاف قدرت ہے۔ اور بچوں پر جبر کرنا ہے۔ ولایت کے مدرس جو علم النفس سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے اصولوں کو عمل میں بھی لاتے ہیں۔ جان بوجھ کر لڑکوں کو گاہے ماہے شرارت کرنے کا موقع دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک سکول کے طلباء مل کر دوسرے سکول کے طلباء پر چھاپہ مارتے ہیں۔ اور مار پیٹ تک نوبت پہنچتی ہے۔ فریق ثانی مقابلہ کرتا ہے۔ جس فریق کی شرارت زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ وہ فتح مند تصور ہوتا ہے۔ اور استادوں کی تحسین کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ میں کئی سال تک یورپین سکولوں میں اردو کی تعلیم کا انسپکٹر رہا ہوں۔ اور یورپین لڑکوں کے اوصاف و اطوار اور چال و چل کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔ وہ ہندوستانی طلباء سے زیادہ شری ہو کر رہتے ہیں۔ مگر قواعد کے زیادہ پابند۔ زیادہ راست باز و صاف گو و زیادہ تندہست، خوش طبع اور جہت ہوتے ہیں۔ ان کے استاد کبھی ان کو بجا شرارت سے جبراً باز رکھ کر ان کی سپرٹ کو دباتے نہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی شرارتوں کو خفیف سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ میں کوہ مری کے نزدیک گھوڑا گلی کے سکول میں سائنہ کے لئے گیا ہوا تھا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرہ کے دروازہ میں کھڑا ہیڈ ماسٹر صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ تفریح کی گھنٹی بجی۔ چند من کے سامنے کی ایک جماعت کے کمرہ کے باہر کھڑے تھے۔ ادھر کی چھت پر بورڈنگ ہوس مقابلوں سے چند شری لڑکوں نے ان پر پانی پینکا۔ وہ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کہ یہ پانی کہاں سے آیا ہے جن لڑکوں نے یہ شرارت کی تھی۔ وہ فوراً اچھے ہٹ کر بہن رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے برائے نام تنبیہ کر کے ان کو دباں

سے بنادیا۔ اگر کسی ایسی سکول میں ہندوستانی میڈیٹر کے رد اس قسم کی بات ہوتی۔ تو وہ اسے ایک اہم معاملہ سمجھ کر نہایت سنجیدگی سے اسکی تحقیقات کرتا۔ اور غالباً مجرموں کو بد فی سزا دیتا۔

میں نے کئی دفعہ مدعوں کو یہ کہتے سنا ہے۔ کہ اچی اس سکول کے لڑکے بڑے شریر ہیں۔ عرصہ بڑا جب میں پشاور مشن کالج میں پڑھتا تھا۔ تو ایک نئے ماسٹر صاحب پنجاب سے تشریف لیکے۔ سرمدی علاقہ، آپ دہوا پتھی۔ لوگ قوی اور جوشیلے، لڑکوں میں غیر معمولی چلبلاہٹ دیکھ کر فرمانے لگے۔ کہ یہاں کے لڑکے بہت شریر ہیں۔ پرنسپل صاحب نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ ”Did he expect them to be angels“ یعنی کیا اسے توقع تھی کہ وہ فرشتے ہوں گے؟ لڑکا اور شریر ہونا، یہ تو لازم دوزم ہیں۔ اگر لڑکا شریر نہیں۔ تو اسکی جہانی اور دماغی حالت تہی بخش نہیں ہے۔ وہ ضرور خیف البدن اور کند ذہن ہوگا۔

مشرقات کی تخلیق کی جائے تو اس کے اندر ہم صحت۔ طاقت۔ جرأت۔ بناشت۔ ذہانت کے اجزا پائیں گے۔ مجھے تو ہمیشہ شریر لڑکوں سے کامیابی کی امید رہی ہے اور میں اپنے ننہیں سالہ تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ کہ عموماً جو لڑکھن میں شرارتیں نہیں کرتا۔ وہ بڑا ہو کر کچھ نہیں کرے گا۔ مدرسوں کو شرارت کے جذبے سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور طلباء کو صندش۔ کھیلوں۔ باغبانی۔ سکاؤٹنگ وغیرہ کے کاموں میں مشغول رکھ کر شرارت کی شکل کو بدل دینا چاہئے۔ اُن کو سست اور بے حس و حرکت رکھ کر مٹی کے مادہ میں بنادینا چاہئے۔

اب میں چند ایک شریر لڑکوں کا ذکر کرتا ہوں جس سے مذکورہ بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔

(۱)

میں ایک ماٹری سکول کا میڈیٹر تھا۔ ماٹری سکول کا ایک لڑکا نہایت مشہور سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سٹر صاحب (غالباً ان کے دماغ میں خلل تھا) اصرار کرتے تھے کہ اس کو سکول سے نکال دیا جائے۔ میں نے اُسے جماعت کا مانیٹر مقرر کر دیا۔ اس نے مانیٹری کام کا ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ سالانہ جلسہ کے موقع پر بہترین مانیٹر ہونے کا انعام پایا۔ میں نے صدر جلسہ ڈپٹی کمشنر صاحب اور معزز حاضرین کے سامنے اس بات کا اظہار بھی کیا۔ کہ یہ لڑکا سب سے شریر سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ سب سے اچھا منتظم اور اپنی جماعت کا ہر دلعزیز لیڈر ہونے کی وجہ سے انعام حاصل کر رہا ہے۔ یہ طالب علم جدید ولایت گیا اور ایک اعلیٰ امتحان پاس کر کے آیا۔ اور اب ہزاروں پلے کھاتا ہے۔

(۲)

جب میں پشاور کالج میں تھا۔ تو ایک شریر لڑکا جماعت کی پہلی قطار میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں پسرٹ مپ بلا کر سائنس کا کوئی تجربہ کر رہا تھا۔ کہ دفعہ میرے ریٹھی کوٹ کو آگ لگ گئی۔ اس شریر لڑکے نے فوراً ماتھ مار کر

جوبلی نیشنل ۱۹۳۱ء ————— ۳۸۴ ————— رہنمائے تعلیم لاہور

آگ بجھا دی۔ باقی سب مند دیکھتے رہے۔

(۳۱)

۱۹۵۵ء میں بی اے کا امتحان دیکر میں ماسٹر بنا۔ نئے ماسٹر کا امتحان مشریر لڑکے ضرور دیا کرتے ہیں چنانچہ دو چار لڑکوں نے شرارتاً مجھ پر سوالات کرنے اور شور مچانا شروع کیا۔ میں نے حکمت سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ مگر مجھے اسی وقت یقین ہو گیا۔ کہ یہ لڑکے کچھ بن کر ہیں گے۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب رائے بہادر دیکل ہیں۔ ایک صاحب کسی کالج کے پرنسپل ہیں۔

(۳۲)

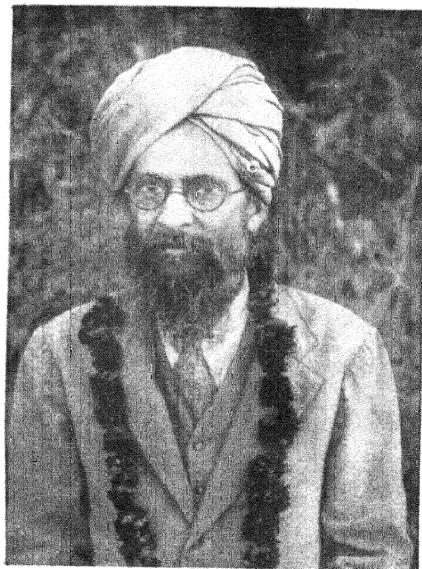
ٹائی ٹکاس کا ایک طالب علم بڑا چلتا پڑھ اور طرار تھا۔ ایک دفعہ میں نے اُسے کسی استاد کی گستاخی کرنے پر نرا بھی دی مٹی۔ وہ بھی خاص مشریر لڑکوں میں سے تھا۔ اب وہ تھانیدار ہے اور امید ہے کہ کسی دن خان بہادر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بن جائے گا۔

(۵)

ایک طالب علم جو واسطہ درجہ کا مشریر تھا۔ ایک ایسے مقام میں پڑھتا تھا۔ جہاں طیریا کا زہر دہتا ہے۔ اور مشریروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ ان حالات میں اسکی شرارت نمایاں تھی۔ اعلیٰ خاندان کا ہونے کی وجہ سے اپنی حیثیت کا خیال بھی اسکے دماغ میں جاگزیں تھا۔ ایک غریب ماسٹر کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی۔ جس سے اس کی شان میں فرق آیا اور جس نے اُسے گستاخی کرنے پر آمادہ کر دیا۔ غلطی دونوں کی تھی۔ مگر ماسٹر صاحب کا دفتار بھی قائم رکھنا ضروری تھا۔ میں نے دو بید بھر م کے ہاتھ پر لگا ہی دیئے۔ اس وقت تو بہت شہنشاہیا۔ مگر ذہین تو تھا ہی اصلیت کو پالیا اور دل میں کینہ نہ رکھا۔ عرصہ کے بعد ملا تو نہایت سود باز پیش آیا۔ اس وقت بی اے کا امتحان لینے والا تھا۔

ابھی اس قسم کی مثالیں ڈی جا سکتی ہیں اور تمام پلانے پھیرنے شاکر دوں میں سے کامیاب مشریروں کی مثالیں دے سکتے ہیں۔ اب میں ایک تاریخی مثال دے کر اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔

قریباً دو سو برس ہوئے۔ انگلستان میں ایک لڑکا تھا۔ جسے شرارت کا پتلا بلکہ شرارت محسوس کیں تو بچانہ ہو گا مگر مشریروں کے حالات کھنکھنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ باپ نے ٹنگ آکر اُسے ایٹ انڈیا کمپنی میں نوکرا دیا۔ اور اس سے بچھا چھڑانے کے لئے ہندوستان بھجوا دیا۔ یہاں آکر اس نے وہ کارنامے کئے، کہ تاریخ کے صفحات میں اس کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ ناظرین سمجھ گئے ہوں گے، کہ میسروری مراد لاڈلہ کیو سے ہے۔ اس مشریر لڑکے نے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اور وہ ہندوستان کا پہلا انگریز گدہ تھا۔



Bhai Bishan Dass Puri M. A. P. E. S.



Moulvi Mohd. Sharif "Qureshi".



Syd. Ghazanfar Ali Naqvi B. A.



Mr. F. M. Shujah M. Sc.



M. Fazal Mohayyud Din Qadri.



Syd. Mahmud B. A.

صبح و شام

(از جناب عبدالسیح صاحب پال انصہانی ایم اے ایل ایل بی ٹی کراچی)

آزاد غم دہرت ہے چہرہ خنداں پر وادی نہیں اس کی گگیں وہیں پریشاں
کتے ہیں کہ ہوتے ہیں سبیں رہزنِ ایمان یمن تو ایماں کا ہے سرِ چٹہ حیواں
کیا سادہ و پُر لطف جمالِ سحری ہے!

سب دشت و جبلِ حسن نے معمور ہوئے ہیں فزائتِ بہنِ غیرتِ صدرِ طور ہوئے ہیں
پردے رخِ محبوب سے کیا دور ہوئے ہیں شہار سے نور سے محمور ہوئے ہیں
قدرت کی سرای نے وہاں سے جہری ہے!

شام

ظلمت نے اب انس و سما کو کیا تغیر معمورۂ آفاق بنا درد کی تصویر
طاری ہے سکوں غلق یہ سزِ سپین نہ دگیر خاوتی عالم میں ہے تاثیرِ سہی تاثیر
اس نغمے ناموش کی لے در دہسری ہوا

جونیلے سے آکاش پر روشن ہیں ستارے کس سن کے جلوے ہیں یہ بے سوز شرارے
مہتاب کی کرنیں ہیں کہ میں نور کے دھارے اندوہ ربا، روحِ فنا میں یہ نظارے
کس شاہدِ محبوب کی یہ جلوہ گری ہے!

ہو نورِ حر کا کہ سیاہیِ شبِ غم کی ہونغمہِ مطرب کہ صحرِ راکِ خموشی
مہتابِ فلک پر ہو کہ ہوا میں بجلی جس چیز سے پوچھو وہ بصدناز کہے گی
اے پوچھنے والے یہ تری بے بصری ہے!

پیام شوق

(از جناب ضیہ حسن خاں صاحبہ دل شاہینا پوری)

کون و مضبوط بھی اے پیکار لیتا جا
پت چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا
کھانے خون کے قطروں وصال در و فرق
رق غش و انس طرہ لیتا جا
جانے مہر مونی ثبت چشم چسرت
یہ نقش ہے ہمہ تن انتظار لیتا جا
بے ہمت بکارتار اشک زنجیں میں
یہ دل پسند یخوش رنگ لیتا جا
کسی کے زیر قدم آج ہی بچ دیا
شکبہ بان مہر شہ لیتا جا
تمام عمر کا حاصل ہے ہوش جزو نیست
مثل سستی نا پا مدار لیتا جا
تجے ہے عذرا دوستان شوق طویل
میری زبان بھی ہے شکسار لیتا جا
و نور شوق جو سرمایہ محبت ہے
بے نیاز پئے نازیار لیتا جا
یہ پیروز ہے جو خالق ہے لاکھ چیزوں پر
فلوس عشق کا تو اعتبار لیتا جا
رہا ہے جو تسکین دل کا سرمایہ
مہ رفیق مرے راز دار لیتا جا

انہیں حضرت دل آہ جو تنہا تھی

میں نے خاک میں اس کا غبار لیتا جا

تخیل کے کرشمے

یوں تو دنیا تخیل کی ہر ایک چیز سمجھانے والی ہوتی ہے مگر اس میں بعض منظر ایسے بھی ہیں۔ جن میں ہم ناممکنات کو ممکنات کے رنگ میں جلوہ گر پاتے ہیں۔ عقل انسانی ان سیاحتی جلووں سے اس قدر متحیر و مبہوت ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے سکہ دعاوی کے باطل ہو جانے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور وہ عالم وارفتگی میں ان شعبہ دلوں کو جو حقائق کی صورت میں اس کے مذہب پر غالب آ جاتے ہیں۔ خراج تحسین ادا کرتی ہے۔ شاعرانہ تخیل کے یہ کرشمے بالکل خلاف قیاس باتوں کو قرین قیاس ثابت کر دیتے ہیں۔ اس انداز سے کہ اس کی اعجاز نہایت مندی کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ مثلاً خزاں کے موسم میں پھول نہیں کھلا کرتے۔ جو کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بھی مرجھا کر رہ جاتے ہیں۔ مگر تخیل کی یہ بہار ملاحظہ فرمائیں۔ کہ کس طرح خزاں کے موسم میں پھول کھلا رہی ہے۔ میکش بارغ عالم میں شگفتہ رہیں ہم پیری میں بھی کون کتا ہے خزاں میں پھول کھلتے ہی نہیں سائنس کا یہ سکہ کہ خلا محال ہے۔ تمام حکماء مشرق و مغرب نے تسلیم کیا ہے۔ مگر اس شعر کو دیکھئے۔ کس حکمت سے خلا کی ہستی ثابت کی ہے۔

ہے یہی ترک ہوا ہم کو اگر اے فلسفی! ثابت اپنے عالم دل میں خلا ہو جائے گا
زندگی اور موت میں جو فرق ہے۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ موت میں زندگی کہاں! مگر اس شعر میں زندگی کو موت اور
موت کو زندگی بخش ثابت کیا ہے۔ حضرت توسن کی اس سیاحتی کو ملاحظہ فرمائیں۔
زندگی عجب بھی اک موت تھی، مرگ نے کیا کار سیجا کیا!
جلی بادل سے الگ نہیں ہوتی۔ مگر حضرت تاج کے زور تخیل نے اسے بھی الگ کر دکھایا۔
دیکھ لو فرقت، نہ دیکھی ہو جو برق وابر کی تھنہ زن باتا ہے ظالم کچھ کو گریاں چھوڑ کر
دوست کے دیدار سے سکون قلبی حاصل ہوتا ہے۔ اور انتظار کی زحمت موت سے بدتر ہے۔ مگر حضرت بگر مرزا آبادی
کے اس شعر میں دنیا ہی دوسری ہے۔

موت دکھا کے پھر مجھے بے چین کر دیا کچھ لطف آپلا تھا غم انتظار میں
غالب مرحوم کا یہ شعر بھی اسی قبیل سے ہے۔
نے تیر کہاں میں ہے نہ صیاد کہیں میں گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

دریا میں کشتی سب نے دیکھی ہوگی۔ مگر کشتی میں دیا آج تک نہ دیکھا ہوگا۔ اس کی سیر بھی کیجئے۔ ایکش آنکھ کے حلقے میں اگر رک گئی ہے سیل انک کشتی تھی دریا میں اب کشتی میں دریا ہو گیا۔ لطیف یہ ہے کہ اس شعر میں دو نوعالتیں سامنے آگئی ہیں۔ یعنی دریا میں کشتی بھی اب کشتی میں دریا بھی۔ اسی طرح ترقی اور تنزل دو کو ایک جگہ دیکھنا چاہو تو اس شعر کو پڑھو۔

عمر بھی کیا چیز ہے، جتنی بڑھی اتنی گھٹی اس ترقی میں نظر آیا تنزل کا جواب پروانہ شمع پرفدا ہو جاتا ہے۔ اتنی بات کوسب جانتے ہیں۔ مگر اس کی جان بازی کا ایک جہر یہ بھی ہے۔ کہ وہ جل جانے کے بعد خود شمع بن جاتا ہے۔ وہ کس طرح؟ دیکھئے۔

دو کر دیتا ہے راوِ شوق کی تابیگیاں شمع بن جاتا ہے ہر پروانہ جل جانے کے بعد پانی میں آگ کس طرح روشن ہو جاتی ہے۔ یہ جادو کا تا شا بھی دیکھئے!۔ ذوق سے ملا کر ساقیاں ساحری فن آسب میں کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ نشن آب میں نیک لوگوں کی صحبت سے بڑے بڑے گنہ گار پاک دامن ہو جاتے ہیں۔ مگر حضرت ذوق نے اسے بھی غلط ثابت کر دیا۔

صحبت صافی دلائل سے تیرہ دل کب مٹا ہوں زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں اللہ اللہ۔ اس تردید میں کتنا زور ہے۔ لوہا پہلے ہی تیرہ دل تھا۔ مگر صاف دل کی صحبت میں آکر اودھمی آلودہ ہو گیا۔ یہاں تک تو ہم نے وہ منظر دکھایا ہے۔ جس میں تجل کی سحر کاریاں، نمکناٹ کو نمکناٹ کے رنگ میں نمایاں کرتی ہیں۔ اب ایک دوسرے منظر کی سیر کیجئے، جس کے باہل مختلف اور متناقض و متضاد رنگ و مانع کی قوت فیصلہ کو دھوکے دیتے ہیں۔ کہ کس کو اصل کے اور کس کو نقل۔ اگرچہ اپنے اپنے حُسن میں سب لاثانی ہیں۔ مگر پھر بھی ایک کی چمک دیک دوسرے کی چمک دیک کو باہل نابود کئے دیتی ہے۔ حضرت ذوق برون ہو جانے کو عزت و توقیر کا موجب سمجھتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں۔

ہوتی غربت میں اگر قد نہ خوش جوہر کی تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر پھر دوسری جگہ اس دعوے کے برخلاف یہ فتوے صادر کرتے ہیں۔

ذوق ہے ترک وطن میں مٹا نقص اُبرو بکتا پھرتا ہے گہر ہو کر مسند سے جدا حضرت امیر مینائی کے یہ دہ شعر بھی اسی قبیل سے ہیں۔ اور لطیف یہ کہ دونوں ایک ہی غزل میں ہیں۔ پوچھا نہ جائے گا جو وطن سے نکل گیا بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا خیر مٹنی جو میان سے چمکا میان صف جو ہر کھلے جو مرد وطن سے نکل گیا

عرفی شیرازی نے اس محاذ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ جواگ میں بل جانے سے ہوتا ہے۔ یوں کہا تھا ج
روئے دریا سلسیل و قعر دریا آتش است

مرزا غالب نے یہ مفہوم کس خوبی سے اٹا ہے
بے تعلق جہر بل و بون بہ ازیم بلاست
قعر دریا سلسیل و روئے دریا آتش است
یعنی بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ دریا میں انسان جمی تک بے چین رہتا ہے۔ جب تک
کہ اُسے ڈوب جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ جب ڈوب گیا۔ پھر کچھ بھی بے چینی باقی نہیں رہتی۔ پس
یوں کہنا چاہئے کہ ج

قعر دریا سلسیل و روئے دریا آتش است
حضرت ذوق نے یہ مفہوم کہ ملک عدم میں اس دنیا سے زیادہ آرام ملتا ہے۔ اس طرح ثابت
کیا تھا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا
حضرت تسلیم لکھنوی نے اس مفہوم کو اس طرح روکیا ہے

کیونکر میں کموں ملک عدم عیش کی جا ہے جب وزہیاں چاک گریاں سحر آئے
دھواں ہمیشہ آگ کے اوپر ہوتا ہے۔ مگر اس شعر نے یہ کلیہ بھی غلط ثابت کر دیا ہے
مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے تماشا ہے تیرا آتش دھواں ہے

اب اس کی تردید بھی ملاحظہ فرمائیں
لازم ہے اس کے رُخ پہ نمود خط سیاہ ممکن نہیں ہے آگ کے نیچے دھواں ہے
زمانہ حال کے ایک زندہ شاعر نے یہ مفہوم کہ طرز سبک روی میں ڈوبنے کا خوف باقی نہیں رہتا۔ اس
طرح باندھا تھا

طرز سبک روی نے کیا بحسہ آشا دیکھی نہ ڈوبتے کبھی کشتی جاب کی
ایک اور مقابل نے اس مفہوم کو کس خوبی سے مسترد کیا ہے
نامعتبر ہے بحر میں طرز سبک روی ڈوبی نہیں تو ڈوبی کشتی جاب کی
اسی زمین میں یہ دوشعر بھی جن میں تحریف کا پہلو موجود ہے۔ یاد رکھنے کے قابل ہیں
اٹھاٹھ کے کہہ رہی ہیں یہ میں شراب کی چل محتب کہ کھل گئیں راہیں ثواب کی

پیش نظر جب آتی ہے صورت شراب کی پھر کس کو یاد رہتی ہیں باتیں ٹو ارب کی
حضرت یحیٰ و دہلوی نے ایک مشہور غزل میں یہ شعر کہا تھا ۵
گور جاتے ہیں دو دو دن ہیں آبِ دوانے کے قفس میں کون کھائے ٹھیکر میاد کے ٹکڑے
اس مضمون کی تردید کسی نے اس طرح کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ داد سخن دی ہے ۵
رہا ہو کر بنائے لشبیں گرد و پیش اپنا زہجو لینگے امیر ان قفس میاد کے ٹکڑے
مرزا غالب کا یہ شعر بہت مشہور ہے ۵

دائے گریہ مرا انصافِ محشر میں نہ ہو، آج تک تو یہ توقع ہے کہ ماں ہو جائیگا
مرزا کی تقریر عقائد کی حد سے باہر نہیں گئی۔ انہیں ابھی تک توقع ہے کہ محشر میں انصاف ضرور ہو گا۔ البتہ
یہ بدگمانی ضرور ساری ہے کہ اگر وہاں بھی انصاف نہ ہوگا تو یہ بڑے انوس کی بات ہوگی۔ حضرت آغا شاعر دہلوی
نے اس شعر کا جواب لکھا ہے اور خوب لکھا ہے ۵

محشر میں انصاف ہو گا بس یہی سنتے رہو کچھ یہاں ہوتا رہا ہے۔ کچھ دہاں ہو جائیگا
چلے حضرت! یہ طلسمی تماشا چھوڑنے کو جی تو نہیں چاہتا۔ گرا بھی بہت سے قابل دید نگارے باقی ہیں۔
سب سے پہلے وہ دوسارے کے منظر دیکھیں گے۔ جن میں ایک نزاکت کا مرقع ہے۔ جو گرونگاہ سے میلا
ہو جاتا ہے۔ دوسرا ناتوانی کی تصویر ہے۔ جو بارنگاہ کی متحمل نہیں۔ آؤ! یہاں الگ بیٹھ کر اس بات پر غور
کریں کہ دونوں میں سے پہلے کس کو دیکھیں اور کیونکر دیکھیں۔ (چوش ملیانی)

قیمتی باتیں

کسی نے حکیم بقراط سے پوچھا کہ ہم دولت سے کیا کیا خرید سکتے ہیں۔ اور کیا کچھ نہیں خرید سکتے؟

حکیم نے جواب دیا کہ:-

- | | |
|--|--|
| (۱) ہم سسٹیں خرید سکتے ہیں۔ نہ کہ دوست۔ | (۴) ہم خوار خیز سکتے ہیں نہ کہ ہوک۔ |
| (۲) ہم صبر خرید سکتے ہیں۔ نہ کہ نظر۔ | (۵) ہم مقوی غذا خرید سکتے ہیں۔ نہ کہ طاقت۔ |
| (۳) ہم نرم بھونے خرید سکتے ہیں نہ کہ نیند۔ | (۶) ہم کتابیں خرید سکتے ہیں۔ نہ کہ علم۔ |

صرف نوار دو

(جناب خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

ضمیر معبود کی دو قسمیں، معبود خارجی، معبود ذہنی۔ معبود خارجی تو وہ ضمیر ہے۔ جو تسلیم اور مخاطب کی تقریر میں کسی معلوم چیز یا کسی معین آدمی کی ضمیر واقع ہو۔ جس کو مخاطب اور تسلیم دونوں بخوبی جانتے ہوں۔ جیسے وہ قلمی آدم جو کل ہم نے اور تم نے کھائے تھے۔ معبود ذہنی وہ ضمیر ہے۔ جو ذہن تسلیم میں ہو۔ مخاطب اسے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ جیسے ظفر سے وہ جو ہم سے تم سے قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ یعنی وہ قول و اقرار تسلیم کے ذہن میں ضرور ہے اور وہ مخاطب کو یاد دلانا چاہتا ہے۔

مصدر وہ اسم ہے جس سے اور صیغے نکل سکیں۔ لیکن وہ خود کسی سے نہ بنا ہو۔

اردو میں مصدر کی چار قسمیں ہیں۔ اصلی۔ جعلی۔ فرعی۔ ترکیبی۔ اصلی مصدر کو مصدر وضعی بھی کہتے ہیں۔ اصلی مصدر وہ ہیں۔ جنکی علامت مصدر ہوا کرنے کے بعد صیغہ امر واحد حاضر باقی رہ جائے۔ جیسے توڑنا۔ بگاڑنا۔ ہٹانا۔ ٹوٹنا۔ آنا۔ جانا۔ ہونا۔ کرنا۔ دنا۔

یہ نہ سنی ہماری نیت، کہ وہ صال یا رہوتا اگر ادھرتے رہتے یہی انتظار ہوتا ہوتا ماضی تلتائی ہے۔ اس کا مصدر ہونا ہے تاریخ

آواز یہ آتی ہے لب آب بقا سے مرنا ہی یہاں خوب ہے مینا نہیں اچھا

مرنا اور مینا دونوں مصدر ہیں۔

جعلی یا غیر وضعی وہ مصادر ہیں۔ جن پر کسی دوسری زبان کے مصدر یا اسم پر مصدر کی علامت اضافہ کر کے مصدر بنایا جائے۔ جیسے فرمانا۔ قبولنا۔ شرمانا۔ غالب

دوست مخماری میں سیر سی فرمائیکے کیا زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا

فرما، فارسی کا امر تھا۔ اس پر علامت مصدر "نا" اضافہ کر کے مصدر بنایا۔ آباد

دل جلاتا ہے نہایت سوز بھر اس ماہ کا اگلے روز کو شرمانا ہے شعلہ آہ کا

یہ مصدر شرم سے بنایا گیا ہے۔

فرعی وہ مصادر ہیں۔ جو غیر زبان کے کسی مصدر یا اسم پر مصدر اصلی بڑھا کر مصدر بنالیں۔ جیسے قبول کرنا

آبرودینا۔ سر اٹھانا۔ عرض کرنا۔ خواہہ دزیرہ
آبرو دے دے اے مجھے قد غمیدہ تو مجھے!
تاسخ

دشمن سر ہے تری گردن کشتی مانند شمع
افسر ز شوق سے رکھ پر نہ اتنا سراٹھا
قتل

خود یہ کہتے ہوئے تو ڈرتے ہیں
کہہ دے آداب عرض کرتے ہیں
آدمی بنانا۔ سحر

یار رکھتا ہے کہ منظور خدا وصل نہیں
آدمی تم کو بنایا ہے پر یزاد ہمیں
آرام کرنا۔ رند

نہایت نیند میں ہیں قصد ہے آرام کرنے کا
بڑھاتے ہیں چمڑوں کو بجلیاں بالے اترتے ہیں
تو کیسی مصد وہ ہیں۔ جو اردو کے ماضی یا امر پر یا کسی شوق پر ایک مصد لگا کر بنائے جاتے ہیں۔ جیسے آمینا
آپڑنا۔ اٹھ جانا۔ رند

جذبہ دل نے کیا تمہیں کھینچا
بے بلائے جو پاس آ بیٹھے
مسرور

عارض نے ترے چک چک کر
آئینے کی آب و تاب کھو دی
اٹھ جانا رشک

خون دل پینے میں غم کھانے میں کل پڑنے لگی
اٹھ گیا دنیا سے شاید میرا آب و دانہ آج!
مصدق کی چچان یہ ہے کہ اس سے اور صیغے بن سکیں۔ اور آخر میں علامت 'نا' ہو۔ کا نا اور نا اس لئے مصد
نہیں کہ ان سے دوسرے صیغے نہیں بن سکتے۔ مصد کی علامت کا بدلنا فصحائے لکھنؤ خلاف فصاحت سمجھتے
ہیں۔ جیسے روٹی کھانا مٹی اسکو روٹی کھانی تھی نہیں کہیں گے۔ اسلئے کہ روٹی کا تائید ہونا مٹی سے ثابت ہو گیا۔
اب اسکی اتباع میں مصد کا بدلنا غیر ضروری ہے۔ مصد کے علاوہ اور سب صیغے تذکیر و تائید کی حالت میں مل
جاتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ بھی ہے۔ کہ اردو میں مصد مذکر ہے۔ جیسے دافع

کیونکہ اسکی ننگہ ناز سے جینا ہوگا زہرے اسپہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا۔
اصغر لفظ کی علامت آخر لمبی حرف الف کبھی یا ئے معروف سے نہیں بدلتی۔ اس لحاظ سے بھی کافی جانی
آئی وغیرہ خلاف قاعدہ صرف ہیں۔ مصد علامت نہ بدلنے کی مثالیں صبا

اب توبہ کے حال پر لطف و کرم فرمائیے! ہو چکی ہونا تھی جو جد و جہا دو چار دن
نیم لکھنوی ۵

بھجانا اسے تو جان لینا! آسان ہے یہاں بھی جان لینا
جرات ۵

ہرات کا ہتھکڑیاں ہی، کہ یہ بھی ہے عیب کے کوئی جو ظاہر ہنسا ہونا
خواجہ وزیر ۵

کب گواہ تھا پہننا بلگھی پوشاک کا ہو کے ڈھیلا صُنعف سے اُترا یہ جاننا کا
لیکن فصحاء دہلی کے ہاں مصد کی علامت کا تائید کی محبت میں بدنا جائز ہے۔

بہر حال قاعدہ صرف تو یہی ہے کہ کوئی مذکر لفظ اسم تائید کی محبت میں اہلہ ٹائے معروف قبول نہیں
کرتا۔ لیکن مصدر کبھی امر اور کبھی مستقبل کے معنوں میں جب متعلق ہوتا ہے تو وہ مکمل جینے کا رکھتا ہے۔ اور کبھی ہم
فاعل کے معنوں پر بھی متعلق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا بدنا جائز ہے۔ ائیس ۵

ہر طرح سے یہ سرائے فانی دیکھی ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
آنی جانی یعنی آنے جانے والی۔ ناسخ ۵

خواب میں وہ آنے کا ابھیوں کرے وعدہ یعنی کب جدائی میں بھلوئیں گے؟
نیزد آنی ہے۔ یعنی نیند آنے والی ہے۔ خواجہ وزیر ۵

سلاٹے قصہ خواں فرقت کی شب سوہ کمانی ہے ترے زانوہی کے تکیہ پہ ہم کو نیند آنی ہے
یہاں سنی مستقبل ہیں۔ مصدر کبھی مستقبل کے معنوں پر آتا ہے۔ جیسے کل تم ہمارے یہاں آنا۔ یعنی آئیے گا۔ ہمارا
دوست آئے۔ تو بھانا۔ یعنی بٹھائیے گا۔

تقریب ثانی سے مصد کی وقتیں ہیں۔ لازم اور متعدی۔ لازم تو وہ ہے۔ جس کا فعل فاعل پر تمام ہو جائے
جیسے آنا فعل ہے۔ آئی والا اس کا فاعل ہے۔ اردو میں پہلے فاعل آتا ہے۔ پھر فعل۔ متعدی میں فاعل کا
فعل مفعول پر تمام ہوتا ہے۔ پہلے فاعل۔ پھر مفعول۔ پھر فعل۔ فعل لازم کی مثال داغ ۵

چپا کھلی گلاب کھلا، موتیا کھلی
لیکن نظم کی مجبوریوں سے اس پر پورا پورا عمل درآمد شاعر نہیں کر سکے۔ جیسے داغ ۵
نستے ہیں داغ کل وہ آئے تھے

حالانکہ اس مصرعہ کو قاعدہ صرف سے اس طرح ہونا چاہئے تھا

فارغ سنتے ہیں کل وہ آئے تھے۔

مثال متعدی کی امیر

مجھ گدا کو فے نہ تحیف حکومت اے ہوں چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں۔
ہوں فاعل ہے۔ مجھ گدا مفعول۔ دے فعل۔ نظم کی دقت نے اس مصرع کو بھی صرف سے علیحدہ کر دیا امیر
قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھلے

اس میں مفعول مقدم ہو گیا ہے۔ فاعل کی رو سے اس طرح ہونا چاہئے تھا۔
حضور کے قدم آئے مرے نصیب کھلے

مفعول کو بغیر تخصیص کے فعل و فاعل پر مقدم کرنا خلاف صرف ہے اور فعل کو فاعل یا مفعول پر تقدیم دینا
خلاف فصاحت و اصول صرف ہے۔ اس عیب کا نام شعرا نے تعقید لفظی رکھا ہے۔ تعقید اگر قریب ہے
تو وہ عیب میں داخل نہیں ہے۔ اور اگر بعید ہے تو وہ داخل عیب ہے۔ تعقید لفظی و معنوی کا مفعول بیان
یہاں ہم کسی دوسرے نمبر میں لکھیں گے۔

متعدی کی دو قسمیں ہیں۔ معروف و مجهول۔ معروف وہ ہے جس کا فاعل معلوم ہو۔ غالب

آج داں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں

واں ضمیر فاعل۔ تیغ و کفن مفعول۔ باندھا فعل۔ اسکو متعدی معروف کہتے ہیں۔

متعدی مجهول وہ ہے جس کا مفعول اور فعل معلوم ہو۔ فاعل معلوم نہ ہو۔ غالب

گھر حب بنا لیا ترے در پر کے بغیر

گھر مفعول بنا لیا فاعل نہ معلوم۔ یہ متعدی مجهول ہے۔ اردو میں بعض مصادر غیر فصیح مستعمل کئے جاتے
ہیں۔ جیسے پنہانا غیر فصیح سمجھا جاتا ہے۔ پنہانا فصیح ہے۔ دھرنا غیر فصیح ہے۔ رکھنا فصیح ہے۔

بعض مصدر لازم ایسے ہیں۔ جو متعدی نہیں بن سکتے۔ آنا۔ جانا۔ کھانا۔ پانا۔ فرمانا۔ ہونا۔ کا پنا
تمام متعدی الاصل لازم نہیں بن سکتے۔ لانا۔ ڈالنا۔ مول لینا۔ چرانا۔ سونپنا۔ کرنا۔ لیکن اکثر لازم متعدی بن
سکتے ہیں۔ اور ان کا قاعدہ یہ ہے۔ کہ مصدر لازم میں علامت مصادر سے پہلے ایک الف زیادہ کر دیتے ہیں
جیسے دیکھنا، دکھانا۔ سننا، سنانا۔ اٹھنا، اٹھانا۔ لیکن اس قاعدہ سے بعض مستثنیٰ ہیں۔ جیسے پکنا مصدر لازم
ہے۔ اس کا متعدی مصدر پچنا۔ ٹوٹنا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی توڑنا ہے۔

بھیننا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی بھاڑنا۔

بھگینا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی بھگوٹنا۔

گھٹنا مصدر لازم ہے اس کا متعدی کھیرنا۔

گھٹنا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی گھسوانا۔

متعدی بد و مفعول بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ جو مصدر لازم ہے۔ متعدی بنایا گیا ہو۔ اس پر علامت متعدی اور علامت مصدر سے پہلے ایک واؤ لگا دو۔ اٹھوانا۔ سنوانا۔ چلوانا۔ اور جو مصدر متعدی الاصل میں۔ ان کو جب متعدی بد و مفعول بنانا ہو۔ تو ان پر واؤ الف لگا دو۔ جیسے ڈالنا مصدر متعدی الاصل ہے اس کا متعدی بد و مفعول ڈالوانا۔ چرانا متعدی الاصل ہے اس کا متعدی چرانا ہے۔ کھانا متعدی الاصل ہے اس کا متعدی المتعدی کھلوانا ہے۔

بعض مصدر لازم ایسے ہیں جنکے متعدی بنانے میں الف تعدیہ نہیں لگایا جاتا۔ ان کو جب متعدی بد و مفعول بنانے کے لیے اس میں بی بی واؤ، الف زیادہ کریں گے۔ جیسے توڑنا سے تڑوانا۔ لوشا سے لوشانا۔ کھینچنا سے کھچوانا۔

بعض مصادر متعدی جن میں الف تعدیہ نہیں ہے۔ غلطی سے لوگوں نے صرف الف تعدیہ لگا کر متعدی بد و مفعول بنایا ہے۔ جیسے سجانے سجانا۔ گوندھنا سے گوندھانا۔ سینا سے سلانا۔ کٹانے سے کٹانا۔ کھنا سے کھانا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب خلاف قاعدہ صرف اور غلط اور غیر فصیح ہیں اور قابل ترک ہیں۔

مصدر کی مثالیں۔ پھرنا مصدر لازم ہے اسکی متعدی کھیرنا۔ خواجہ وزیرؒ

یہ سر جھکانا یہ منہ پھیرنا ہے مائع دید مہری نمازیں سجدہ نہیں سلام نہیں روشن ہونا مصدر لازم ہے۔ اسکی متعدی روشن کرنا ہے خواجہ وزیرؒ

نہ داغ و دوشب فرقت کا دن کو نام نہ لو ابھی چراغ نہ روشن کرو کہ شام نہیں دیکھنی کی متعدی دکھانا اسکی متعدی۔ قدما دکھلانا نظم کرتے تھے۔ مگر اب مترک ہے۔ خواجہ وزیرؒ مصحف رخ کودہ دکھلائیں اگر قیوس دن نئی بھیتی بچھے سو مجھے کہوں سپارے ہیں

اترنا لازم مصدر ہے۔ اسکی متعدی اتارنا صباؒ

پھولوں کی سیج گرد مٹی صبح شبے سال باسی جو اس نے ہار اتارے پلنگ پر

چھٹنا مصدر لازم ہے۔ اسکی متعدی چھوڑنا مومن (ع)

انس و اخلاص دلاسا و کرم چھوڑ دیا۔

بندھنا مصدر لازم ہے۔ اس کی متعدی اگر قاعدہ سے بنائی جائے۔ تو بندھانا ہوتی ہے۔ لیکن ہاندھنا

مستعمل ہے اور یہی فصیح و صحیح ہے خواجہ وزیرؒ

اپنے دروازے کی زنجیر سے باندھ کر رکھتا اب تو درکار نہ کوئی اسے درہل ہو گا۔
 دینا مصد لازم ہے اسکی متعدی دانا بھی مستعمل ہے۔ مگر غیر ضعیف اور غلط ہے۔ دینا یا صحیح ہے ظفر
 دالو سر کس کا تم اور باؤ کس کا سب دہل آپ کے ہیں اب دباؤ کس کا
 بعض مصداق لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہیں۔ جیسے رو دینا کہ مصد لازم ہے۔ مصد کو اتنا ستیا کہ
 کھسینا ہو کر رو دیا اور متعدی بھی۔ جیسے ممکن
 بات کہنے میں رو دیا میں نے جو جواب آیا سو دیا میں نے
 شرنا بھی لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے مگر معنوں میں اختلاف ہے۔ شرنا، جھپٹنا مصد لازم ہے
 شرنا، جھپٹنا کے معنوں پر مصد متعدی ہے۔ اور دونوں طرح مستعمل ہے *

تعلیم اور منہر

(از ضیاء الملک حضرت ملازموزی صاحب)

آج سے کوئی سو سو برس پہلے کی بات ہے۔ کہ ہمارے آپ کے بزرگ دنیا کے ہر حصہ میں حکومت کرتے تھے، اور جن مقامات پر حکومت نہیں کرتے تھے۔ وہاں اُن کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ اور کبھی کوئی ہندوستانی آدمی دنیا کے کسی اور ملک میں جانا تھا۔ تو لوگ اُسے جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ اور تو اور دوسرے ملک کے بادشاہ ہمارے ملک کے بادشاہوں کو ریشم اور اٹلس کے کپڑے۔ زیور۔ کھانے کے قیمتی برتن۔ گھوڑے اونٹ اور بس خچر تو نہیں باقی تمام چیزیں تحفہ بنا کر بھیجا کرتے تھے۔ اور خچر جو نہیں بھیجتے تھے سو اس لئے نہیں کہ ہم لوگ گدھے اور خچر کے قابل نہیں تھے۔ بلکہ اس لئے کہ خچر پر سوار ہو کر آدمی دو کوڑی کا ہو جاتا ہے۔ اور اس پر شہر بھر رہتا ہے۔ غرض ہم ہندوستانی کی عزت چین میں تھی اور جاپان میں بھی۔ بس یہ ذرا افغانستان کے لوگ ہیں خچر سمجھا کرتے تھے۔ تو ان کے سمجھنے سے ہونیکا تھا۔ دنیا بھر میں تو ہم عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اور بڑے بڑے بادشاہ ہندوستان کھینے کی خواہش کرتے تھے۔ تو یہ اس لئے نہیں کہ ہندوستانی لوگ کوئی تھیسٹر کا تماشا تھے یا بائیسکوپ اور سس کوپ کی مینی تھے۔ یا گاما سپوان تھے۔ بلکہ بات فقط یہ تھی۔ کہ اس زمانے میں ہم لوگ اپنا پورا وقت علم اور منہر حاصل کرنے میں صرف کرتے تھے۔ اور چار چار دن تک حقہ نہیں پیتے تھے۔ اب اگر ہماری بابت پر لفظیں نہ پڑتو تاریخ کی جس کتاب میں چاہو۔ دیکھ لو۔ یہی باتیں لکھی ہوئی ملیں گی۔ کہ دافعی ہم لوگ دنیا میں بڑی عزت والے سمجھے جاتے تھے۔

مگر اب جو دیکھئے۔ تو جناب ہمارے جو بھائی دیہات میں رہتے ہیں۔ انہیں گنوار خلی۔ آلو۔ گدھا اور گھوڑا تک کا جانا ہے۔ حالانکہ ہمارا ایک کسان بھی کبھی ہنسنا مانہیں۔ تو یہ کیوں۔ فقط اس وجہ سے کہ آج کل کے کسان بھائیوں نے اپنی بچوں کو بجائے علم اور منہر سکھانے کے دھونی لگانا۔ حقہ اور شراب پینا اور ہل بکھر چلانا تو سکھا دیا۔ مگر یہ نہ ہوا کہ ایک خاندان کے تین آدمی تو ہل بکھر چلاتے اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اسکول میں داخل کر کے انہیں خوب علم پڑھاتے منہر سکھاتے۔ تو چند دن کے بعد یہ بچے بڑے ہو کر کوٹوال صاحب ہی ہو جاتے۔ اور کلکٹر صاحب بھی۔ پھر ہم اور آپ اور یہ اور وہ اور فلاں اور فلاں ہوتے۔ اور ان کو جا کر بہت زیادہ جھک کر سلام کرتے۔ اسے صاحب ایک وقت تو ایسے تعلیم یافتہ اور منہر و سہم بچوں کو بڑے لاٹ صاحب تک سلام کر گزرتے ہیں۔ پھر ہماری آپ کی حیثیت ہی کیا ہے؟ مگر وہ تو کہنے کے یہ جو اگرچہ کل کسوں اور زمینداروں کے بچے علم اور منہر سے کورے دھڑے ہوئے ہیں۔ احساس کا سبب یہ ہو

کہ تول تو سوس سے ایک کسان اور دوسو میں سے دوزمندر کچھ لکھے پٹے ہوتے ہیں۔ توجب یہ خود علم اور ہنر کے فائدوں سے بے خبر ہوتے ہیں تو یہ کیا جائیں کہ علم اور ہنر سے آدمی آج کل عورت پالتے یا علم حاصل کر لینے سے آدمی ادب بن جاتا ہے۔ اور آپ لوگوں نے تو دیکھا ہوگا۔ کہ پنجاب کے اکثر زمینداروں کے لیے بے اور موٹے موٹے لڑکے نہایت جاہل۔ گدھے اور بے ہنر ہو کر بھی کار توں والی بند و قیں خرید کر دن رات شکار میں ماسے مار پھرتے ہیں۔ تو یہ اس لئے کہ ان کے جاہل باوا کے ساتھ ہی ان کی والدہ بہت زیادہ جاہل ہوتی ہیں۔ بس ان سے ان کے بیٹے مندر کے اور چل کر زیادہ قیمت کی بندوق یا انگریزی طرز کا پا جامہ کوٹ کر تا اور ٹوپی لے کر دن رات شکار یا تھیرا دینا میں اپنی عمر برباد کرتے پھرتے ہیں۔ نہ وہ خدا اور رسول کے احکام جانتے نہ ماں باپ کے حقوق پہنچاتے نہ بزرگوں کے آداب سے واقف ہوتے ہیں۔ بس ایسا مہوم ہوتا ہے جیسے رام سر دپ کمار کے گائے کو کوٹ تیلوں پہنا کر کسی تھیر میں چھوڑ دیا ہو۔ اور وہ ہے کہ ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا پھرتا ہے۔ بس ماں باپ کی اس محبت اور جہالت سے غور سے ہی عرض میں یہ لاڈ پیار سے پالے ہوئے بچے چور۔ ڈاکو۔ شرابی بدکار۔ افیونی۔ غنڈے۔ لفنگے اور نہیں تو پھر کسی رئیس کے پاؤں دبانے والے نوکر اور غلام ہو جاتے ہیں۔ اور ساری برادری میں عمر بھر ذلیل رہتے ہیں ایسے بے ہنر اور جاہل بچے چاہے جتنا قیمتی لباس پہن کر بازار میں جائیں۔ پولیس والے ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور وہ یہ دریافت کرتے رہتے ہیں کہ ان جاہل لوٹندوں کے پاس اتنا قیمتی لباس کہاں سے اور کس طرح آیا۔ جب کہ بیٹو کو لکھے پٹے ہیں۔ اور نہ کہیں نوکر چاکر اور اکثر کو تو وہ چاند و خانوں اور رنڈیوں کے گھروں میں جا کر پکڑ بھی لیتے ہیں۔ اور پھر ان کے جاہل ماں باپ انہیں پولیس سے پھرانے کیلئے رشوتیں دیتے پھرتے ہیں۔ اور کو تو اولوں کے ہاتھ جوڑتے پھرتے ہیں تو پھر لعنت ہے ایسے بے ہنر اور جاہل لوٹندوں پر۔ واللہ! اگر ہمیں کوئی پولیس والا یا موٹر چلانے والا ایک مرتبہ بھی جاہل کہہ کر پکارے تو یا تو ہم اسی دن سے علم حاصل کرنا شروع کر دیں۔ یا زہر کھا کر مر جائیں۔ مگر لا حول ولا یہ پنجاب کے کسانوں کو نہ ابھی غیرت نہیں کہ وہ اپنے ایک ایک بچہ کو اگر علم نہیں تو کوئی ایسا ہنر تو سکھادیں۔ کہ ان کا کالا لاٹو کا محلہ اور برادری میں اور کچھ نہیں تو "مستری صاحب" ہی مشہور ہو جائے۔ اور پنجاب آپ جھوٹ سمجھیں گے۔ کہ ایک مرتبہ اگر پولیس نہ آگئی ہوتی۔ تو ہم نے دو چار جاہل اور بے ہنر لوٹندوں کو مار ہی ڈالا ہوتا۔ کیونکہ کبھی! ساری موٹی موٹی اور چچی پتی کتابوں میں لکھا ہے کہ جاہل آدمی اور مُردے میں بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ جاہل کی قبر نہیں ہوتی۔ اور مُردے کی قبر ہوتی ہے۔ باقی جاہل آدمی مُردے سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ خدا آگے اور ہمارے بچوں کو جہالت اور بے ہنری سے بچائے۔

اچھا پنجاب! ایک اور بات یہ ہے کہ جاہل اور بے ہنر بچے نہ گھر میں عزت پاتے ہیں۔ نہ محلے میں نہ گاؤں میں نہ قصبے میں۔ نہ شہر میں نہ برادری میں نہ کو تو اول صاحب کی نظروں میں نہ مجسٹریٹ صاحب کی نظر میں۔ یہاں تک، کہ

خود ان کے ساتھ کے اسکول جانے والے لڑکے انہیں جاہل گدھا بے وقوف، آو۔ ہیودہ اور ذلیل کہتے ہیں۔ مگر انہیں کہ وہ پھر بھی علم ادب پھر حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ حالانکہ اگر وہ چاہیں تو اپنے دادا میاں کی عمر میں بھی علم و ہنر حاصل کر سکتے ہیں۔ اور کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اندھے آدمی تک قرآن شریف کے اتنے شکل تین پارے حفظ یاد کر لیتے ہیں اور تم تم کی چیزیں بنانا سیکھ جاتے ہیں۔ اور یہ جاہل لڑکے بدھ جاتے ہیں۔ چائے کھاتے ہیں۔ اور یورپ میں تو یہ قاعدہ ہے کہ جہاں بچہ دس برس کا ہوا اور اس کے باپ یا والدہ نے اُسے اٹھا کر کسی دوسرے شہر میں علم و ہنر حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ گھرنا ہے کہ پنجاب میں دیہاتی لوگ اپنے بچوں کو دن رات تعویذ بنا کر گلیں لٹکائے پھرتے ہیں۔ اور ذرا انہیں شرماتے۔

ایک بڑی معیت آج کل کے بچوں میں یہ ہے کہ اول تو وہ علم و ہنر حاصل کرنے کے عوض غمخیز اور سینا کے تاشوں میں مارے پھرتے ہیں۔ اور اگر خدا خدا کر کے وہ پڑھنے کے لئے اسکول جاتے ہیں۔ تو پھر کوٹ بھی مانتے ہیں تلپن بھی۔ کلا بھی اوٹا بھی۔ موزے بھی اور بنیان بھی۔ ترکی ٹوپی کی جگہ انگریزی ٹوپی اور بوٹ بھی۔ سائیکل بھی اور موٹر بھی۔ تو پھر یہ علم و ہنر حاصل کرنا کا ہے کورنا۔ گویا مال باپ بوٹ سوٹ اور فیشن اپیل چیزوں کی دکان ہو گئے اس سے یہ ہوتے ہیں کہ بچہ کو علم و ہنر سے زیادہ محبت فیشن کی چیزوں سے ہو جاتی ہے۔ اور پھر کسان لوگ اتنا روپیہ اُن کے لئے صرف بھی نہیں کر سکتے۔ اور اسی لئے وہ علم و ہنر کو ایک بڑی ہی گالی دے کر اپنے بچہ کو گنوار بنانا ہی پسند کرتے ہیں۔ مگر ایسے مال باپ اصل میں تیسرے درجہ کے بوقوف ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات اُن کے اختیار میں ہے کہ وہ شروع سے اپنے بچے کو گھوڑوں کی روٹی اور عمدہ قسم کی ترکاری ہی نہ دیں۔ اسی طرح کھادی یا کسی قسم کا ٹاٹ کے برابر موٹا کپڑا پہنائیں۔ کیونکہ اس قسم کے کھانے اور لباس سے بچہ میں بہادر ہی۔ بہت اور کام کرنے کی قوت بڑھتی ہے اور اُس کا دماغ یہ اُڑے اور پراٹھے کھانے والے لڑکوں سے زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ اور دُنیا میں جتنے بڑے اور مشہور بادشاہ اور عالم لوگ گذرے ہیں۔ ان کے حالات پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ کہ وہ ایسی ہی غذا اور لباس کے عادی تھے اسی لئے وہ اتنے بڑے آدمی ہو گئے۔ کیونکہ یہ بات بھی تو ہے کہ جو لوگ دینا میں تہذیب اٹھا کر علم و ہنر حاصل کرتے ہیں۔ ان کو آخرت میں موتیوں کے محل ملتے ہیں۔ اور یہ جتنے امیر اور مالکی فٹ بال کھیلنے والے لڑکے ہیں۔ اور سخاں فیل ہوتے رہتے ہیں۔ دیکھ لیجئے گا کہ انہیں دوزخ میں تین یا چار مرتبہ جھونک دیا جائیگا۔ اس کے بعد شاید جنت میں جائیں، تو جائیں۔ اور یہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جن کاشنکاروں کے بچے علم و ہنر سے کورے ہوتے ہیں۔ پولیس والے تک اُن کی جان کے دشمن بننے رہتے ہیں۔ کیونکہ بے ہنر اور جاہل رہنے سے آدمی یا تو افیونی ہو کر مٹھیا کھالتا رہتا ہے۔ یا پھر مارے بھوک اور پیاس کے وہ ڈسکے اور چوری کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے۔

وہ تو کہتے کہ ہم لاہور میں رہتے ہیں۔

جوتے کھلتے ہیں۔ اور گنوار کھلتے ہیں۔ اور اس میں سب سے زیادہ قصور ان کے گنوار ماں باپ کا ہے۔ اور یہ تو دیکھ لیجے کہ جو بچے جاہل اور بے ہنر رہ جاتے ہیں۔ ان کی شادی بھی تو کسی حسین اور خوبصورت لڑکی سے نہیں ہوتی۔ بس کسی مجبوتی اور کالی صورت کی لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ تو وہ بھی بڑی مشکل سے۔ اور جناب جب کالی صورت کی لڑکی سے شادی ہو جاتی ہے تو عمر بھی جی چاہتا ہے کہ یا اپنا گلا گھوٹ لیں۔ یا اپنی بیوی کا۔ اسی طرح علم و ہنر کے بغیر نہ گھر میں عمدہ مسمی چار پائی ہوتی ہے۔ نہ برتن۔ نہ میز اور نہ کرسی۔ نہ اعلیٰ درجہ کے کمرے اور نہ باغ۔ نہ صبح کو پائے اور بکٹ اور نہ شام کو انڈا اور مرغی کا گوشت۔ بس ہر وقت سوکھی روٹی اور گنگا پرشاد کے ٹاں کی دال کھانے کو ملتی ہے۔ اب اگر آپ کے رسالہ پڑھنے والے ماں باپ اور ان کے بچوں میں کچھ بھی جوش ہے۔ اور عقل ہے تو وہ ہمارا یہ ضمون پڑھ کر آج ہی سے علم و ہنر حاصل کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔ پھر دیکھ لیجے گا کہ انشاء اللہ عمر بھر کیسے خوش رہتے ہیں پس جناب اس معاملہ میں تو ہمارے ننھے میاں کی والدہ یعنی ہماری ”درجہ اول بیوی“ ساری دنیا اور سونے چاندی سے زیادہ اچھی ہیں۔ کرتی یہ ہیں کہ صبح سویرے سے اپنے ننھے میاں کو ایک درجہ دوم کا چائنا مار کر اٹھاتی ہیں۔ پھر اس سے خدا کی عبادت کراتی ہیں۔ پھر اسے چائے پلاتی ہیں اگرچہ اس کے حصہ کے پراٹھے اور بکٹ میں سے خود بھی کھا لیتی ہیں اور وہ روتا رہ جاتا ہے۔ بس اس کے بعد وہ اسے کتابیں پڑھاتی ہیں۔ اور مائندگی بھی یاد دہانی بھی پکاتی جاتی ہیں۔ پھر اُسے اسکول روانہ کر دیتی ہیں۔ اور جب وہ اسکول سے واپس آتا ہے تو ہماری کالی کالی صورت کی بیوی صاحبہ اس کی جیب کی تلاش لیتی ہیں۔ کہ کہیں اس کی جیب میں تاش یا بیڑی یا سگریٹ تو نہیں ہیں۔ کیونکہ آج کل کے لڑکے سگریٹ کثرت سے پیتے ہیں۔ مگر وہ سین جانتے کہ پڑھنے کے زمانے میں سگریٹ پینے سے دل اور دماغ خراب ہو جاتا ہے پھر وہ اُسے اپنے ساتھ چائے پلاتی ہیں۔ علیحدہ چائے اس لئے نہیں دیتی ہیں۔ کہ ہمارے ننھے میاں حد سے زیادہ شکر خاں کر چائے پیتے ہیں۔ یا ایک دم دس بارہ بکٹ کھا جاتے ہیں۔ پھر اُسے اپنے ساتھ ایک چاندنی پرہلتی ہیں یا ہمارے ساتھ تفریح کو ٹھنڈی سڑک پر بھیجتی ہیں۔ مگر اسے اکیلا گھر سے باہر نہیں جانے دیتی ہیں۔ کیونکہ چھوٹی عمر کے بچے جہاں اکیلے گھر سے نکلے۔ تو وہ یا تو مائی اور فٹ بال کے لڑکوں کے ساتھ گالیاں کبنا سیکھ جاتے ہیں۔ یا سگریٹ پیتے پھرتے ہیں۔ یا سینما کا تماشا دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ اور ان سب باتوں سے تعلیم بے کار ہو جاتی ہے۔ پھر وہ رات کو اُسے خود پڑھاتی ہیں۔ اگر کچھ کبھی کبھی وہ پڑھاتے پڑھاتے خود ہی ادب لگتی ہیں۔ اور بعض وقت تو وہ اپنے ہی ننھے کی کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتی ہیں۔ مگر پڑھائے بغیر وہ سوتی نہیں ہیں۔ پس اگر آپ کی والدہ صاحبہ کبھی پڑھی ہوں۔ تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے بچے کو خود پڑھاویں۔ مگر یہ نہیں کہ آپ کے حصہ کی چائے خود پی جائیں۔ اور جو خود کبھی پڑھی نہیں تو پھر آپ کو کسی ایسے ماسٹر کے حوالے کر دیں جو تنخواہ تو لے کم اور پڑھائے زیادہ۔ اب اگر آپ ہماری اتنی باتیں مان لیں گے۔ یا مان لیگی تو انشاء اللہ ہم آئندہ اس سے بھی عمدہ باتیں آپ کو بتاتے رہیں گے یا بتاتی

ہوا محل

جے پور

یہ خوبصورت اور شاندار محل وسط شہر میں واقع ہے۔ اس میں نو منزلیں ہیں۔ جن میں کثرت کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں۔ جن پر بہت نفیس پردے پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں یہ بڑی ہوادار عمارت ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ہوا محل کہتے ہیں۔ یہ عمارت عربی نمونہ کی بنی ہوئی ہے۔ جس کی ہر منزل میں بے انتہا کھڑکیاں ہیں۔ سب سے اوپر والی منزل میں برج قائم ہیں۔ جن پر سنہری کس لگے ہیں۔ یہ مشرقی طرز کی بہترین عمارت ہے۔ جس کا سامنے کا رخ بہت دل فریب ہے۔ اس کا گلابی رنگ بے حد جاذبِ انظار ہے۔ سرائیڈون آرٹنڈ اس عمارت کی متعلق لکھتے ہیں ”علاؤ الدین کا جادو کا محل اور پریمی نانو کا مکان بھی اس سے بہتر نہیں ہو سکتے“

الہیٹ ٹائل جے پور

بہت فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا فرش لکڑی کا ہے۔ اس میں خاص صنعت یہ ہے۔ کہ نازک نازک عمرانی بجاری چھت کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اسکے دونوں طرف بالمقابل دو کھڑکیاں ہیں۔ جن میں مختلف رنگوں کے شیشہ کے ٹکڑے تراش کر لگائے گئے ہیں۔ جن سے چٹ، گھوٹے اور کوچوان کی شکل بن گئی ہے۔ یہ تمام کام بے حد قابلِ تعریف ہے۔ محرابوں کے اوپر چھت میں پانے ہند ورشیوں کے اقوال کندہ ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے۔ کہ زندگی کو کس طرح پاکیزگی سے بسر کرنا چاہئے۔ وسطی برآمدہ میں چھ تصویریں جنگِ ہما بھارت کی ہیں۔ جن میں ہر تصویر مہیتی جاگتی معلوم ہوتی ہے۔



نیک و بد

(از حضرت ذہین)

ذہین جس میں بدی ہو زیادہ نیکی کم وہ نیک نام جہاں میں ہو کس طرح مشہور
برائی کم ہو بھلائی زیادہ ہو جس میں تو اسکے خالق سے ہوگی نہ خلق اُس سے نفور
مقام اپنی غرض پر ہو غیب کا مقصد یہ وصف بہرہوں لوگ اُس سے کیوں ہوں مسرور
ہو اپنا فائدہ نقصان غیر کا یہ امر کبھی پسند نہیں کرتے اہل عقل و شعور
خدا کی ذات فقط عیب سے منزہ ہے کم ایسے لوگ ہیں کم جن میں ہو فساد و فتنہ
ستم چرخ کوئی بے شعور کرتا ہے کسی کو ناز کہ ہے و خیر مجھ میں غرور
اگر ذلیل ہے زردار تو محسوس زبرد اگر شریف ہے محتاج تو وہ ہے مقہور
غرض کہ بے جہاں میں ہیں بسا اُٹا ہیں خال خال جو ہیں اہل درد۔ اہل شعور

جو نفع غیر کا چاہے بڑا ضرر دے

کہ اس میں فائدہ ہو گا ذہین اُس کا ضرر

مغزل

۱) از جناب امرناتھ صاحب طبعش موکومی

جوابِ ہستی انجسہر کے آخر شکستہ سامان ضرور ہوگا

جہانِ عمرِ رواں ہمارا فنا کی موجوں میں چور ہوگا

بچلے بُرے جس وقتِ عمل میں حساب اُن کا ضرور ہوگا

فَضْلُ حُبِّتِیْ مِیْنِ جَانِیْ
 کَا وَ جُو تَرِ سَیْجِ بے قُصُوْیْ ہُوْگا

منابع ہر نے کہ سب ہشتی ہیں گے جام شراب کوثر

اگر یہ سچ ہے تو مے کشوں کا لحاظ اُن کو ضرور ہوگا

اگر یہی ہے جنہوں کا غلبہ کہاں کا محشر کہاں کی پریش

دماغ عرضیہ اس کو دماغ ہی میں فنسٹور ہوگا

زبانِ زاہد سے ہجوِ رند انہی تو پیہرِ مغاس یہ بولا

یہ دہ زبانی بڑی سی ہے اس کا مواخذہ بھی ضرور ہوگا

کرم پائل و دھو گئے ہیں گری کیش کا ٹیپیش مجھ کو

اتنیں بھی اس چنر و رہوگا مجھے بھی اس چنر و رہوگا

صحت مقدم ہے یا تہذیب

(جناب سید غفر علی صاحب نقوی۔ بی۔ اے سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ سنٹرل ہائی اسکول لاہور)

بادی النظر میں مضمون کا عنوان ہی مضمون نگار کے لئے ایک اچھی خاصی کشمکش کا سامان پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ صحت اور تہذیب انسانی زندگی کے لئے دونوں زینت کا باعث ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ تندرست و توانا انسان غیر مہذب ہونا پسند کرے۔ یا دوسری صورت میں ایک مہذب انسان واپکم المریض ہونا قبول کرے۔ گو صحت اور تہذیب لازم ملزوم جہیں تاہم انسانی زندگی کی تکمیل دونوں کی رہن ہست ہے۔

جس تہذیب سے انسان کی روزمرہ زندگی کو چار چاند لگتے ہیں۔ اُس تہذیب سے مجھے بحث نہیں بلکہ مجھے آج کی صحبت میں اُس تہذیب کا ذکر کرنا منظور ہے۔ جو ہمارے نوجوانوں کا آجکل طرہ امتیاز بنی ہوئی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ہمارے ترچھے میٹرے فیشن پر مرٹنے والوں کی اندھا دھند تقلید کی شرمندہ احسان ہے۔

معیار تہذیب انسانی زندگی کے گرد و پیش کے حالات کے مطابق ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز آج ہمارے نزدیک مرغوب ہے۔ کل بعینہ وہی ہمارے نزدیک معیوب سمجھی جاتی ہے پتھر کے زمانے کے لوگ دھات کے زمانے کے لوگوں سے غیر مہذب خیال کئے جاتے تھے۔ پھر اس سے بعد کی نسلیں دھات کے زمانے کے لوگوں کو غیر مہذب اور وحشی وغیرہ کے خطابات سے یاد کرنے لگیں۔ غرض اسی معیار کی بنا پر آجکل کے ہمارے عزیز نوجوان اپنے اسلاف کو دقیا نوسی اور لگے وقتوں کے لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ زمانہ مستقبل میں بھی ہمارے میٹرے فیشن پرست نوجوان آئیو الی سلسلوں کی آنکھوں میں مکھڑ خیز ہسٹیاں ثابت ہوں۔

تہذیب اور شرافت دو مترادف الفاظ ہیں۔ لغت کے اعتبار سے گوان میں کسی قدر معنوی فرق ہو۔ مگر عام طور پر یہ دونوں الفاظ اُس سعید انسان کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جسے عام طور پر ہم مہذب اور شریف سمجھتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کی بات ہے کہ دنیا مہذب انسان کے خیال کرتی تھی۔ جو حسب و نسب کے لحاظ سے نجیب الطرفین ہو۔ بزرگوں کا ادب ہر وقت ملحوظ خاطر رہے۔ گفتگو میں اپنے بڑوں کی موجودگی میں سبقت نہ کرے۔ اگر رائے لی جائے تو نہایت ادب سے سنجیدہ الفاظ میں اظہار خیالات کرے۔ غریبوں یتیم بچوں اور راند عورتوں کی مدد کرنا اُس کا سب سے پہلا فرض ہو۔ ماں باپ اور اُستاد کا دل سے فرمانبردار ہو۔ عزیز و اقربا سے حسن سلوک میں سب سے ممتاز ہو۔ غرض چھوٹی پر خشیت اور بڑوں کا ادب ہر وقت اس کا شعار ہو۔ مذکورہ بالا صفات سے جس شخص کی مشیت ہوتا تھا۔

سب اُسے مہذب اور شریف سمجھا کرتے تھے مگر آج کل کے ترقی کے زمانے کے مہذب انسان کے لوازمات اور اُس کے فرائض بالکل مختلف ہیں۔ اگر آج کل کے ہندوستانی مہذب انسان کا روزانہ پروگرام سنو۔ تو پہلے مہذب انسان اور موجودہ مہذب انسان میں دور کی نسبت بھی نہ پاؤ گے۔ نئی روشنی کے جنبشیں کے لئے مغربی ہے۔ کہ وہ صبح کو ۹ بجے کو پہلے بستر سے نہ اٹھے۔ اور وہ بھی نوکروں کے پے درپے اصرار سے کہ میاں اٹھو۔ پانی گرم ہے۔ چلم بھری پٹی ہے بیٹھک میں غلام صاحب انتظار کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جب ہمارے عزیز دوست بستر سے اٹھتے ہیں۔ تو عجب شان سے خواب استراحت سے بیدار ہوتے ہیں نوکر کو بٹے بڑے مغلف الفاظ میں پکارا جاتا ہے۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگ بھاگ آتا ہے۔ صابون۔ استراحت فینچی وغیرہ تمام ضروریات سامنے دیتا ہے۔ آپ شیونگ سے (صحامت) فارغ ہونے کے بعد گرم پانی سے منہ دھوئے ہیں۔ اور چائے اور ڈبل روٹی کے توش فرما کر کہیں خدا خدا کر کے بیٹھک میں ۱۰ بجے قدم بچھ فرماتے ہیں۔ اور وہ صاحب جو بیٹھک میں ۷ بجے سے انتظار آشدہ من الموت کی فتنی میں مبتلا تھے۔ ان کی جان کو رو دھو کر واپس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ حضرت فوراً گوٹ پتلون ڈانٹ سائیکل پر سواریہ جاوہ جا چمپت ہوتے ہیں۔ گوٹ پتلون زیب تن ہے۔ بیٹ سر پر ہے۔ سائیکل پر سواریں۔ منہ میں سگریٹ ہے۔ اور اگر زیادہ مہذب ہو گئے۔ تو سائیکل کے پیچھے پیچھے ایک کتاب بھی دوڑتا ہوا دکھائی دے گا۔

اگر سیرنگی میں سما جائے۔ تو سیدے شاہہ پہنچتے ہیں۔ جہاں انہی جیسے وقت کا خون کرنے والے جنبشیں تاش اور شطرنج لئے پہلے سے ہی سوجو دہوتے ہیں۔ شاہدہ کی سیر یا شالامار کی سیاحت کی بنا پر نہیں نہ اسلئے کہ اپنے اسلاف کے کارنامے دیکھ کر دل ہی دل میں اپنے ناخلف ہونے کا اعتراف کریں۔ یا اور کچھ نہیں۔ تو انقلابیت زمانہ سے ہی عبرت حاصل کریں۔ بلکہ اسلئے کہ شالامار باغ کی سیر اور بھوپاں پر تاش اور شطرنج کی بازی لگانا۔ آج کل کے فیشن کی ضروریات میں سے ہے۔ عرض تمام دن ان حضرات سے وہاں اُن اُن نوحرات کا اظہار ہوتا ہے۔ کہ اُن کا کاغذ پر اظہار بھی سلیم الطبع اصحاب کے دل پر گراں گزر چکا۔ سورج کے غروب ہونے کے وقت کہیں گھر میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔ تو میز پر کھانا چٹا جاتا ہے۔ آپ ہر ایک کھانے میں نقص بھائے جاتے ہیں۔ اور نوکروں اور ماماؤں سے جھڑپ جھڑپ لے جاتے ہیں۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد ہی سینما کی سوجتی ہے۔ وہ کیوں محض اسلئے کہ سبنا کا تاشا آج کل کی ضروریات میں سے ہے۔ اگر ایسی تاشا گاہوں میں شرکت نہ کی جائے۔ تو آج کل کے شرفاء (جنبشیں) انہیں پرلے وفتنوں کے دنیا نویسی لوگ خیال کرنے لگیں گے۔ اور امن کے لئے اس سے زیادہ دنیا میں اور کوئی ذلت نہیں ہے۔ اب جو شخص ایک یا دو بجے بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ رات گزرنے کے بعد بستر پر لیٹے تو کیسے ممکن ہے۔ کہ وہ

ہے۔ علی الصباح ضروریات سے فارغ ہو کر ایک آدھ گھنٹہ کے لئے صبح کی ہوا خوی کے لئے نکل جاتے۔ سچ پوچھو تو آجکل تہذیب اور صحت و متفاد چھ چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک شخص تندرست و توانا ہے۔ مگر ایک نازک اندام اور فقیہ سے ستایا ہوا جنگل میں اُس تندرست و توانا انسان کو محض اس وجہ سے حقارت کی نگاہ سے دیکھ لگا۔ کہ اُس کی گفتار اور رفتار میں نازنینوں جیسی لپک نہیں ہے۔ کبھی تو سر کے بالوں کی تراش دیکھ کر بھیتی بہہ پھرتی کب لگا۔ اور کبھی گردن کا موٹا پاد دیکھ کر اسے اُسے بھینے سے خطاب کر لگا۔ اور اگر اپنی کیفیت پوچھو۔ تو صینک رات کو سو تے ہوئے۔ ایک دو دو تکی پل پلر (قبض کشا گو لیاں) نہ کھالی جائیں۔ تو صبح کے وقت مشکلیں آسان نہیں ہوتیں۔ غرض انتہائے تہذیب یہ ہے کہ ہماری وضع قطع۔ چال ڈھال غرض تمام حرکات و سکنات ایک اچھی خاصی نازنین لیڈی کی حرکات و سکنات سے مشابہ ہوں۔ گویا موجودہ دور میں تہذیب اور نزاکت و مترادف الفاظ ہو گئے ہیں۔ اسی ضمن میں مجھے ایک لطیف یاد آگیا۔ جس کا ذکر کرنا غالباً ناظرین کی ضیافت طبع کا باعث ہوگا۔

ایک جاہل زمیندار نے بابو لوگوں کی ظاہری سچ دھج دیکھ کر اپنے بیٹے کو بھی تعلیم دلانے کے لئے مدرسہ میں بھیجنا شروع کیا۔ لڑکا ننھا ہونہار۔ تھوڑے سی عرصہ میں لکھنے پڑھنے اور تھیل کو دین اپنے ہم جولیوں سے سبقت لے گیا۔ ہائی کلاسز میں پہنچ کر دوسرے طالب علموں کی دیکھا دیکھی۔ ایک دن اپنے باپ سے کہنے لگا کہ مجھے تو کوٹ پیلون سلوا دو۔ زمیندار باپ نے خوش خوشی کوٹ پیلون بھی سلوا دیئے۔ اور بیٹے کو بابوؤں کی طرح انگریزی لباس میں ملش دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ایک دن بوڑھے زمیندار سے اُس کے ایک دوست ملاقات کے لئے آئے اثنائے گفتگو میں دوست نے زمیندار سے پوچھا۔ کہ سنا ہے آپ کا بچہ کس جماعت میں پڑھتا ہے۔

زمیندار۔ جناب۔ نو میں جیت (نویں جماعت) میں پڑھتا ہے۔

دوست۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ ننھا لڑکا ہونہار ہے۔ اور تمہیں اس کی تعلیم کے متعلق کوئی شکایت نہیں۔ زمیندار۔ ہاں جی مجھے کوئی شکایت (شکایت) نہیں میں تو لڑکے کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوتا ہوں۔ آؤ ترائڈ کے فیل (فضل) سے کھڑے ہو کر پیشاب بھی کرنے لگا ہے۔

خیال فرمائیے۔ جاہل باپ کی نظر میں تہذیب کی ابتدا یہ ہے۔ کہ بچہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا سیکھے۔ غذا ہی کو علم ہے۔ کہ اس تہذیب کی انتہا کس نوعیت کی ہوگی۔

صفا مایاں ہو رہی ہیں صفتی دل اتنے ہی ہو رہے ہیں کیلے

اندھیرا چھا جائیگا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

مذکورہ بالا سہ گرام سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ ہمارے نوجوانوں کی جن پر اہل ملک کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ سقت

معروف زندگی ہے۔ ۴۴ مگستوں میں ان کے پاس کوئی ایسا وقت نہیں ہے۔ جس میں وہ ورزش جسمانی۔ خدمت خلق عبادت خالق۔ اعزاء و اقربا سے حسن سلوک کے لئے کچھ تھوڑا سا وقت ہی نکال سکیں۔ ہاں البتہ اگر تھوڑا بہت وقت فرصت کا ملتا ہے۔ تو وہ ہارمونیم باجے کی پھینٹ چڑھتا ہے۔ سڑت کو دس اور گیارہ بجے کے قریب جب کسی دن سینما کی نمایش ہو۔ بابا آ آ آ وغیرہ کی بے ہنگام سڑوں سے محلہ کو سر پر اٹھا لیا جاتا ہے۔ اگر اہل محلہ ان کے اس طرز زندگی کی شکایت کریں۔ تو انہیں دقیا نوسی۔ خداست پسند۔ خدا جانے کون کون سے مکروہ خطابات سے نوازا جاتا ہے۔

اگر ان خدائی فوجداروں سے پوچھا جائے۔ کہ اس بابا ہا سے اہل مکہ کو تکلیف دینے کے سوا آخر فائدہ ہی کیا ہو تو تفریح طبع کا ڈھونگ رچانے کے علاوہ پھیپھڑوں کی صفائی کا غفلت بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ان کی توجہ اشرف و ورزش جسمانی کی طرف مبذول کرائی جائے۔ تو پھر ان کے دلائل کا ترش تیروں سے خالی ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ کہہ کر منہ پھیر لیں۔ کہ پھیپھڑوں کی صفائی کا یہ دنیا نوسی طریقہ ہے اور بس۔ اور کوئی دلیل نہیں دی جاتی۔ حالانکہ ہارمونیم باجا ہو۔ یا کوئی اوبو لٹونوں۔ یہ سب کے سب انسانی طبائع کو عیش و عشرت کی طرف مائل کرنے والے ہیں۔ تاریخ نشاہدی کہ ایران کی سلطنت کی تباہی اسی علم موسیقی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ شہنشاہ ہند اور نگ زیب عالمگیر نے اسی بنا پر محفل رقص و سرود کو ممنوع قرار دیا تھا۔ تاکہ انہو الی سٹلوں کی طبائع اس زہریلے اثر سے محفوظ رہ سکیں۔ میرا سیوں اور علم موسیقی کے شہید ایہوں نے علم موسیقی کا جنازہ نکال کر محل شاہی کے پاس سے گذارا۔ شہنشاہ ہند نے ہجوم خلافت کو ننگے سر اور ننگے پاؤں ماتمی لباس میں بیکھر دیا۔ کہ یہ کس کا جنازہ ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کہ خداوند نعمت یہ علم موسیقی کا جنازہ ہے۔ آپ نے سکر اگر فرمایا۔ کہ اے کسی گہری قبر میں گاڑنا۔ جہاں سے پھر نہ نکل سکے۔ اُسے کیا معلوم تھا۔ کہ اُس کے بعد ایک ایسا نرئی کا زمانہ آنے والا ہے۔ کہ خدا کے فضل و کرم سے گھر میں دو دو تین تین نہیں۔ تو ایک ایک ضرور میرا سی نظر آئے گا۔

اسی ضمن میں مجھے ایک حکایت یاد آگئی ہے۔ جب کا امدادہ غالباً فائدہ سے خالی نہ ہوگا کسی امیر نے محفل رقص و سرود آراستہ کی اُس کے ایک درویش صفت دوست کو اطلاع ملی۔ آپ نے ایک نصیحت آمیز خط لکھا جس کا مضامین یہ تھا۔

اے گمراہی میں چلنے والے۔ اور اے باطل میں سرگشتہ۔ یہ کیا خیرو سری ہے۔ جو سر میں سائی ہو۔ یہ کیا بیہودہ خصلت ہے جو اختیار کی ہے۔ غفلت کا پردہ بصیرت کی آنکھ سے اٹھا۔ اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت کے اوندھے گڑھے میں نہ گرا۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو چیز آج بوئے گا۔ کل وہی پائیگا۔ یہ مرتبہ اور حشمت نہ رہا ہے۔ اور نہ رہیگا۔ اگر فقیر کی بات ہوش کے کان سے سنکر

عمل کرے تو بہتر۔ ورنہ عمل کا بدلہ پائیگا۔

امیر نے بیخود دیکھتے ہی جبران و پریشان ہو کر ایک غرضیہ محافے تصور کے لئے لکھا: محفل رقص و سرود کو ویرم برعم کے بدستور سابق خدمت خلق میں صفوف ہو گیا۔

ناظرین جو داندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اس آزادی کے زمانے میں اگر کوئی سلیم الطبع انسان کسی اپنے دوست کو محفل رقص و سرود کو منع کرے۔ تو معلوم نہیں کہ اس ناصح شفیق کی کیسی درگت بنے گی تو ان کی شان میں یہ پڑھینگے

اگھے دفتوں کے ہیں یہ لوگ! انہیں کچھ تکو جوئے و نعمہ کو اندوہ بلکہتے ہیں
اور کبھی انہیں سڑی۔ سودائی۔ بد مزاج۔ لکبر کے فقیر وغیرہ القاب سے یاد کیا جائیگا۔

قصہ مختصر فیشن کا مرض ہماری رگ رگ میں ایسا پیوست ہو چکا ہے۔ کہ ہمیں اس کے علاج کا تو ایک طرف اس کا بھی مجبورے سے گھاس نہیں ہوا۔ یہ موذی مرض روز بروز ہماری صحت جسمانی کو گھٹن کے کپڑے کی طرح کھا رہا ہے۔ کیا انہی موجودہ نسوں سے یہ توفیق کی جائیگی۔ کہ کسی اڑے وقت میں اپنے ملک کے لئے مفید ہستی بن سکیں گے۔ اس خیال است و محال است وجہوں۔

میرے ایک دوست کو جرمنی کے شہر برلن میں نمائش دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دنیا کی عجیب و غریب چیزیں مہیتا کی گئی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ جو چیز انہیں پسند آئی۔ وہ دو تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک کسان معمولی سی چٹائی پر بیٹھا ہے۔ دسترخوان سامنے بچھا ہوا ہے۔ بچے اور بیوی سب ارد گرد بیٹھے روٹی کھا رہے ہیں۔ ہر ایک کا چہرہ بے شاش نظر آتا ہے تصویر کے نیچے بڑے موٹے حروف میں لکھا ہوا ہے۔ کہ صحت بغیر دولت

سے آراستہ ہے۔ پانچ سات میزیں نہایت ہی اچھے قرینے سے گل و گلڈستہ سے سجائی ہوئی ہیں۔ صاحب خانہ ایک آرام کر سی پر تکلیف کی وجہ سے کروٹ پر کروٹ بدلتے ہیں۔ بچے ہیں۔ کہ باپ کی علالت دیکھ کر سہمے ہوئے ایک طرف کھڑے ہیں۔ نوکر اور مائیں الگ آداس اور پڑ مردہ ایک کونے میں بت بنی ہوئی ہیں۔ بیوی میاں سے بعد اصرار کہہ رہی ہے۔ کہ اگر تہہ را چپائی اور شور باکوچی نہیں چاہتا۔ تو خدا کے لئے بچنی کے ہی دو گھونٹ پی لیں۔ پندرہ دن ہو گئے ہیں کہ ایک دانہ بھی اڑا کر منہ میں نہیں گیا۔ مگر میاں ہیں کہ سر ہلاتے جلتے ہیں۔ کہ میرا کسی شے کے کھانے کو مطلقاً جی نہیں چاہتا۔ اور اس تصویر کے نیچے جلی قلم سے لکھا ہوا ہے کہ دولت بغیر صحت

میرے دوست بیان کرتے ہیں۔ کہ میری زندگی کلیئرے دلپس کی چیز نے اتنا گہرا اثر نہیں جتنا ان دو تصویروں نے۔ اور آجکل یہ حقیقت صاف طور پر روشن ہے۔ کہ ہماری آجکل کی پرمکلف زندگی دوسری تصویر کی زندگی

کے مطابق سوہو ہوتی جلی جا رہی ہے۔

ناظرین جو اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ جس قوم کے نوجوانوں کی زندگی اسقدر پر محکف ہو کہ اُن کی وضع قطع۔ چال و چل۔ طرز و معاشرت وغیرہ میں عورت اور آدمی کی تیز بائی نہ رہے۔ تو کیا اُس قوم کے افراد سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ دشمن کے مقابلے میں اپنے ملک کی حفاظت تو درکنار۔ محض اپنی اور اپنے عزیزوں کی مخالفت کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکیں گے نہیں ہرگز نہیں۔ اُن سے یہ توقع رکھنا۔ محض تخیل حاصل ہے۔ مجھے اہمی طرح یاد ہے کہ میرے ایک نازک اندام دوست کے ہاں ایک چور نے نقب لگائی۔ ماسٹرانڈ گھر میں اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے صرف یہی تن و واحد موجود تھے۔ چور نے پھر اُدکھا کر کہا۔ کہ اگر تمہیں اپنی زندگی مطلوب ہے۔ تو گھر کے صندوق کی چابیاں بتاؤ۔ اور جو کچھ زیورات کی قسم میں سے ہے۔ سب میرے حوالے کر دو۔ آپ نہایت لجاجت سے غلطے ہیں۔ کہ بوسیاں یہ ہیں چابیاں اور وہ ہیں صندوق جو تمہارا جی چاہتا ہے۔ لیکن مجھے کچھ نہ کہنا۔ عرض دوسرے دن افسوس کے لئے آپ کے در و دولت پر۔ کہہ نہ کہ دولت وغیرہ سب چور لے اڑتا بلکہ غریب خانہ پر پہنچے۔ وہاں پچھلے ایک اوجھنیت کا انکشاف ہوا۔ کہ اپنی ذات شریف نے اپنی چابیوں سے اپنے صندوق کو کھولا۔ اور تمام قیمتی پارچات۔ برتن اور زیور اور نقدی وغیرہ کو اکٹھا کر کے چادر میں باندھا اور چور کے سر پر اُس ٹھٹھی کے رکھنے میں بھی آپ نے شرکت فرمائی۔ مگر ان کی شرافت دیکھو۔ کہ چور کے چلے جانے کے بعد بھی اہل محلہ کو خبر نہ کی۔ شاید یہ ڈر ہو کہ ایسا کرنے سے چور واپس آکر پھر چھڑے سے گردن الگ کر دے گا۔ یہ ہے ہمارے آج کل کے عزیز نوجوانوں کی حذر و حفاظتی تدابیر مجھے اپنے عزیز دوستوں سے اخذ میں یہ عرض کرنا ہے۔ کہ یہ چند سطور اُن کی دل آزاری کے لئے نہیں لکھی گئیں۔ کیونکہ میرے نزدیک اس سے زیادہ کوئی اور گناہ نہیں۔ بلکہ اُن کی بہتری اور خیر خواہی کو مد نظر رکھ کر تحریر میں لائی گئی ہیں۔ سوٹ پتلون وغیرہ پہننا کوئی گناہ نہیں البتہ صحت کے مقابلے فیشن پر ہی فریفتہ ہو جانا بُرا ہے۔

کمرے کی صفائی۔ بدن کی صفائی۔ کپڑوں کا اجلا رکھنا وغیرہ نہایت ہی ضروری باتیں ہیں۔ مگر اس بات کو کسی بھی فراوان نہیں کرنا چاہیے کہ صفائی اور فیشن دو مختلف چیزیں ہیں صفائی جس قدر صحت کے لئے مفید ہے۔ فیشن اسی قدر مضر ہے۔ اے میرے عزیز دوستو۔ ایک زمانہ آنے والا ہے۔ کہ جب ہماری آئندہ نسلیں اپنے نہیں موجود فیشن کے ہاتھوں ہلاکت کے گڑھے میں پائیگی۔ تو وہ ہم پر ایک دفعہ نہیں۔ دو دفعہ نہیں۔ بلکہ صبح کو شام ہزار بار نفرن بھیجا کر یگی۔ خدا کرے۔ کہ ہم بہت جلد اس نامراد مرض سے رہائی حاصل کر کے اپنے لئے۔ اپنے اعزہ و اقربا کے لئے۔ اپنی سوسائٹی کیلئے۔ اور اپنے ملک کے لئے اس چند روزہ زندگی میں کوئی مفید خدمت کر سکیں

ایس ڈی اے سن مارشل جہاں آ میں باو

نمکدان

رسالہ انکی اشاعت ماہ جنوری ۱۹۲۷ء میں تک بند مبتدی حضرات کی بارگاہ بے نیاز میں یہ گزارش کی گئی تھی کہ وہ بلا کرم
ہم سے حال پر رحم فرمائیں اور اپنے حال پر بھی۔ مگر انہوں نے کہ ہمارے آواز صدا بہ صحرانابت ہوئی۔ اور انکی لایحیٰ و معینی ہرزہ سرائی کا
سلسلہ برابر جاری رہنا مبتدی ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔ بشرطیکہ طبیعت خدا داد ہو۔ اور ملکہ شاعری سے فطری مناسبت
رکھتی ہو۔ ہر ایک شاعر کو اس منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مگر ہمارے سخن ان اصحاب جنوں باب کی طرف ہے۔ جبکہ شعر و
سخن سے اتنی بھی نسبت نہیں۔ جتنی عقل اور وحشت میں ہے۔ جب کوئی جن ان کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ تو شورش
دماغ کے اثر سے دامن شرکی دھجیاں اڑانی شروع کر دیتے ہیں۔ پیٹ کے دھندلے سے فرصت ہوئی اور لگے دین شجر
کو پال کر نے۔ پھر اتنی خاک اڑتے ہیں کہ بقول مولانا نظامی زمینیں چھ رہ جاتی ہیں اور آسمان اٹھ ہو جاتے ہیں۔ خلی
یہ جو کہ اگر ان گرفتارانِ بلا کو یہ سمجھایا جائے کہ یہ طوق تھاری گردن میں بہت تنگ ہے۔ اسے اتار ڈالو۔ کیوں نسبت کی
معبیت بھل لے رکھی ہے۔ تو یہ بندگانِ عالی متالی اسے دھل و مقول اور گستاخی و بے ادبی پر محمول سمجھتے ہیں جہل و
کناچہ جو یہ تو امید نہیں رکھتی کہ یہ مہربان اپنے حال پر رحم فرمائیں۔ مگر کم سے کم اتنا تو ہو کہ ہم سے حال پر چھوڑیں۔
ناظرین غالباً متاق ہوئے کہ ان شاعری کے نام پر مرے والوں کا نام نہیں تو کلام ہی بطور نمونہ سنا دیا جائے۔ تاکہ
معلوم ہو سکے کہ آسمان سخن سے کیا کیا انوار ان شہید دل پر نازل ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ سرگرائی کے ابر محیط سے کیا کیا پھریں

لیجئے، یہ تبرک بھی حاضر ہے۔ جی تو نہیں چاہتا۔ کہ یہ گنج شاگلاں اس طرح ٹٹا دیا جائے۔ ممکن ہے کہ مصنف ہی کو ناگوار
معلوم ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا کوئی اور ہم جنس اس سے مستفید ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بھی ایک طرح سے مصنف
ہی کا فیض ہے کہ ان کے نایاب خزانے سے ان کے کسی غریب بھائی کا دامن عبرت مالا مال ہوا۔ اس تبرک کے لئے
ہم ایسے جامع جمیع کمالات کو منتخب کرتے ہیں۔ جو اپنے نام نامی کے بعد لفظ صاحب بھی لکھتے ہیں۔ خود شائی کے
مہدان میں گرم رفتار کی کا سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ صاحب کے بعد وقفہ کی علامت لکھ کر (یعنی تحفہ اسلام
لے کر) عالم و فاضل بھی لکھتے ہیں۔ پھر وقفہ لکھ کر شاعر و نیکوچرا۔ پھر جرنلٹ و میڈلٹ تقریر فرماتے ہیں کم محبت
سطر ہی ختم ہو گئی ورنہ خدا جانے ابھی اور کیا کیا لکھتے۔ عالم و فاضل کا مطلب ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ خدا جلنے، یہ
کوئی ذکر ہی ہے۔ یا اپنے دو شخص جو بزرگ لے ہیں۔ ایک دن کیسے اور ایک رات کیسے۔ دن کو عالم۔ رات کو فاضل
حافظ ہو تو کم سے کم اتنی تو ہو چہر شاعر و نیکوچرا اور جرنلٹ و میڈلٹ کی داغ و خلیف بھی سر پہٹ کر رہ جائے۔

شعر بنیئے۔

عموماً آپ دنیا اس طرح تغیر ہے ہوتا کہ جم جاتا ہے جذب تا ہے ارجاتا ہے بہ جاتا
آپ دنیا میں فصاحت کا دیا ہو جزاں ہو رہا ہے۔ اور اس میں کئی خوبیت مناظر دکھائی دیتے ہیں۔
بہ جاتا کے بعد ہے اسلئے نہیں آیا۔ کہ باؤ کے زور سے شعر کا اٹھا کنا رہ کٹ گیا ہے۔ اس زور
کا مقابلہ کرنا شاعر کی طاقت سے باہر تھا۔ قافیہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے۔ اس کی وجہ
بھی یہی ہے۔ وہ شاعر نے ہوتا کا قافیہ جوتا ضرور لکھا ہوگا۔ پانی کے زور سے داؤ گٹ
گئی۔ جوتا سے جاتا بن گیا۔ جذب کی ب سو ایساں لکھ دی ہے۔ حقیقت میں وہ بھی پانی
کی قوتِ جاذبہ میں جذب ہو چکی ہے۔ اتنے مختلف اور مستفاد اوصاف میں جو تناسب اور
رابطہ قائم کیا ہے وہ لاثانی ہے۔ وہ نہ ہے ہوتا اور بہ جاتا کے طوفان میں شاعری کا قطرہ
ضرور بہ جاتا۔ اب پانچواں شاہکار ملاحظہ فرمائیں۔

اگر خواص پانی کے نہ ہوتے یہ تو شکل مٹی نیکرے رنگ سکتے تہ نہ دھو سکتا ایندھنی
خواص کو خواص باندھ کر جو کمال دکھایا ہے۔ اس پر ہمارا بہادر خواص جس قدر بھی رقاص ہو۔ کم ہے
صوت الفاظ کا خیال کس شدہ و مد کے ساتھ ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ یہ شعر شاید سند میں گنگنیاں بھر کر
کہا ہے۔ رنگ سکتے ہیں جو دلکش اور نازک ہو دیا ہے۔ اسے گنگن بیاں کا مجرہ کہنا چاہئے۔

پانچ نمونے تو ان کی نظم کے ہیں اب شعر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اسی نظم کے ہمراہ ایک اشتقاق نامہ
بھی لکھا ہے اس میں نظم کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

”نظم مرسلہ ایک سائنس کا سبق ہے اور اگر آپ نے اسے پسند کیا۔ تو۔۔۔۔۔ الخ
لفظ ایک کا استعمال بھی نہیں آتا۔ یہ سائنس کا ایک سبق ہے یا ایک سائنس کا سبق ہے۔ اس کے
بعد حرف عطف کو دیکھئے۔ یہ پسند شاید اس لئے ہے۔ کہ کلام میں بے ربطی پیدا نہ ہو۔ جو بات
کی خدا کی قسم لا جواب کی۔ نظم نگاری کا مال و دھنا نشر نگاری کا جال یہ ہے۔ ہم حیران ہیں۔ کہ اس
عالم و فاضل شاعر و لکچرار کی عقل پر نہیں۔ یا اس جرنلٹ و میڈلسٹ کی جان کو روٹیں۔“

جوش ملیانی

دیہات سُدھا



فہرست مضامین

اسٹریٹ اینڈ رین ایم اے - بی ایس

ڈپٹی کمشنر بہادر جلم ۴۱۵

مولوی فضل محمد الدین صاحب دی ۴۲۰

پنڈت دینا ناتھ مناگنی ہوتری

بی بی اے - بی بی بیڈ ماسٹر گورنمنٹ
رانی سکول ہیر پور ۴۲۵

دیہات سُدھا - -

راز حیات - -

دیہات سُدھا کے متعلق

چند مفید نکات - -

دیہات سدھار

(مٹرا لٹ۔ ایل براؤن ایم اے بہادر آئی۔ سی۔ ایس ڈپٹی کمشنر جہلم)

پہلا باب - تعمیری پروگرام

شاہی زراعتی کمیشن کی رپورٹ منظر ہے :- کہ
”اگر صدیوں کی بے بسی کو دور کرنا مقصود ہے تو یہ ضروری ہے کہ گورنمنٹ عالیہ کے تمام ذرائع دیہات سدھار کے لئے وقف کئے جائیں۔ اس امر کی بجد ضرورت ہے کہ دیہاتی آبادی کے ماحول سے تعلق رکھنے والے جملہ محکمہ جات متحدہ اور منظم کوشش کریں“
چنانچہ ہر ایک ملٹی نوب وائسراے صاحب ہند نے چند ماہ ہوئے مدراس میں عوام کو بوائے کے خیر مقدم کے لئے جمع ہوئے تھے مخاطب فرمایا کہ

”گورنمنٹ زراعتی کمیشن کی کوششوں کو بار آور بنانے میں ہر ممکن سعی میں لائیگی“

جب گورنمنٹ ہند دیہات سدھار کا بیڑا اٹھائے تو اہل دیہات کی آئندہ کی بہبودی ایک یقینی امر ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم حوصلہ اور استقلال سے آگے بڑھے چلیں۔ مشکل یہ ہے کہ ابتدا کہاں سے ہو اور کس کام کی ہو۔ اس مسئلہ اور اس نے حل کو اپنی ہر تصنیفات بعنوان ”ہندوستانی دیہات کی از سر نو تعمیر“ ”سفر ہندوستانی گاؤں میں“ ”گاؤں میں بوائے سکاوٹ“ میں وضاحت سے ظاہر کیا ہے۔ اور ان کتابوں کا ہندوستان کی متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس جگہ پر مختصر عرض کرونگا کہ اس سوال پر ہر قسم کی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) زمین کی پیداوار اور دیہاتی صنعتوں کی نشوونما کو بڑھانا چاہئے۔

(۲) فضول غرضی کو کم کرنا چاہئے۔

(۳) صحت کو بڑھانا چاہئے۔

(۴) گھر کی حالت کو درست کرنا چاہئے یعنی ہم مستورات کی تعلیم و تربیت کی طرف پیش از پیش متوجہ ہوں تاکہ وہ اپنے گھروں کو ٹھیک طور پر رکھ سکیں اور بچوں کی پرورش اور نگہداشت بخوبی کر سکیں۔

پہلے ہر دو امور کو مشترکہ مد نظر رکھنا ہوگا کیونکہ عوام کی دولت اور ذرائع آمدنی بڑھانے سے کیا فائدہ؟ جب وہ اس کے ساتھ اپنی دولت کو مقدمہ بازی، فضول اور تباہ کن رسوم یا زبورات وغیرہ ضائع کرتے رہیں۔ جب تک یہ بیجا اخراجات بند نہ ہو جائیں ہماری کوششیں بے سود ثابت ہونگی اور ان پر آب درغیاں یا ٹٹے ہوئے ڈول میں پانی والی مثال صادق ہوگی۔

دولت کی زیادتی ہمارا نصب العین نہیں بلکہ ہمارا مطمح نظر اس کے انکساب کا ذریعہ ہونا چاہئے۔ جہاں لوگ متمول ہیں۔ ہمیں اس سوال کے پہلے تجزیہ کی طرف دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ باقی ہر سہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ البتہ جہاں لوگ آسودہ حال نہیں ہیں ان کی مدد کرنا چاہئے۔ تاکہ وہ بہتر طریق پر کاشتکاری کریں اور دیہاتی صنعتوں سے اپنے ذرائع روزگار بڑھا سکیں۔ فاقہ کش اور مفلس لوگ مجزرویوں کے سوال کے اور کسی بات کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ ضلع گورنمنٹ کی فہم فہم ہی مفلس تھا۔ جہاں پر خفک فحط پڑتے تھے۔ اس لئے ہمیں ہر ممکن صورت سے زمین کی پیداوار بڑھانے کی فکر لاتی تھی تاکہ غربا کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو سکے۔ اسی ذیل میں دیہاتی صنعتیں بہت معاون ثابت ہوئیں۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ مستورات کی فوطری میں خیرید اضافہ نہ ہو۔ مردوں کے بیکار وقت کے لئے مفید صنعتیں تیار کریں۔ جس علاقہ میں بارش کی کثرت ہوگی۔ مرد بیکار اور نکمے ہونگے اور عورتیں کاروبار میں زیادہ مشغول ہونگی اور افلاس کی زیادتی اور کاروبار کی خرابی آہستہ ظہور پذیر ہوگی۔

مجھے زمین کی پیداوار بڑھانے کے اصول یہاں بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ یہ میری کتاب میں بوضاحت ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور ان کا اطلاق گورنمنٹوں سے بھی زیادہ وسیع رقبہ پر ہو سکتا ہے۔ دیہاتی صنعتیں بیشمار ہیں۔ مرغیاں پالنے کے علاوہ ریشم کے کیڑوں کی پرورش سے بیشمار چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ لکڑی اور دھات کی اشیاء کے کئی کام جاری کئے جاسکتے ہیں۔ بانج مرد زبورات ہرگز استعمال نہ کریں اور عورتیں بھی خاص خاص مواقع کے علاوہ ان کا عام استعمال نہ کریں۔ مقدمہ بازی کو کم کیا جائے۔ اور مجلسی رسومات کے اخراجات کم کئے جائیں۔ اس قسم کے پروگرام پر مزید زور دینے کی ضرورت نہیں۔

تیسرے صحت اور شق یعنی صحت عامہ کی ترقی کے بغیر پہلی دو باتیں فضول ہیں۔ صحت ہی دولت ہے۔ ایک غریب شخص یا ایک دولت مند بیمار سے بہتر ہے۔ ہمارا نصب العین روپیہ نہیں بلکہ تندرستی ہے۔ جسکے بغیر خوشی حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ بیماری مفلسی کی ماں ہے کیونکہ اس کے رونما ہونے پر وقت ضائع ہوتا ہے۔ جو دولت کے نقصان کا مترادف ہے۔ انسانی بیماریوں کا ۹۹ فیصدی حصہ نجاست کا نتیجہ ہے۔ بلکہ یا بھی نجاست کی وجہ سے ہے بلکہ یا اس کے جراثیم چھڑوں کی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور گنہ اور غیر مصفا حالات کی بدولت لوگوں میں بیماری کا

مقابلہ کرنے کی قوت جاتی رہتی ہے۔

غلیظ دیہات کے معنی بغیر کھاد کے کھیت کی موجودگی کے ہیں۔ جس کا سرکاری نتیجہ پیداوار کی کمی اور نہایت معمولی فصل میں پس سب زیادہ ضروری امر گاؤں کی صفائی ہے۔ اس کے لئے کھا و محفوظ رکھنے یا تو چھٹ گہرے کوڑا گاولں کے گڑھے یا تین فٹ گہرے چینی مشترکہ گڑھے کھودے جائیں۔ ہر ایک قطعہ زمین کے لئے ایک گڑھا ہو۔ جب پہلا بھر جائے یا پھر ہونے کے قریب ہو تو دوسرا گڑھا تیار کیا جائے۔

ایک دفن گڑھے کھود دیئے جائیں۔ تو گاؤں صاف ستھرا رہ سکتا ہے۔ جب ایک دفن لوگ کھاد کی اہمیت سمجھ جائیں۔ تو پھر دیکھئے کہ کسی حیرت انگیز فصلیں پیدا ہوئی۔ اور پھر لوگ دیہات کی صفائی کو کھیتی باڑی کے کاروبار کا ایک ضروری جزو خیال کریں گے۔ اور ہر قسم کے کام کو بخوشی تمام انجام دیں گے۔ اگر ایک دفن گڑھے کھود دیئے جائیں تو دیہات کے باشندوں کے رفع حاجات کی جگہ تیار ہو جائیگی۔ گڑھوں کے ارد گرد پردہ بنا دیا جائے۔ اور دو کٹریاں بچوں سے لے کر بزرگوں تک کے رفع حاجات کی قدرتی جگہ تیار ہو جائیگی۔ یہ خود ہی صاف رہے گی۔ کیونکہ اس میں ہر روز کوڑا کرکٹ اور گوبر پرتا رہیگا اور اس سے عفونت دبی رہے گی۔ پانی پینے کے کوؤں کے قریب وجوار کو صاف ستھرا رکھا جائے۔ گھر وں میں کافی تعداد گھڑکیوں کی ہو۔ تو دیہات صحت و دولت کی شاہراہ پر گامزن ہونگے۔ گاؤں کی صفائی کے ساتھ ساتھ متعدی امراض یعنی چیچک۔ پلینک۔ ہیضہ اور بلیریا کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اولیس ہر سال امراض کا دفعیہ نہایت آسان ہے۔ یعنی چیچک کے لئے تین بار ویکہ پلینک کے لئے پلینک کا ٹیکہ۔ اور کوؤں کو ڈھانپنا۔ اور ان پر پیپ یا ریٹ لگانے سے ہیضہ کو دور رکھ سکتے ہیں۔ ان امراض کی پے درپے موجودگی ہماری جہالت اور غفلت پر وال ہے۔ بلیریا کسی قدر مشکل بیماری ہے اور معقول انتظام اور کوشش سے مغلوب ہو سکتی ہے۔ سکا ڈٹوں کے لئے ایک سہری موقع ہے۔ لوگوں کو سکھایا جائے کہ خوردنی اشیاء اور مصالحہ جات کی طرح کوئین کو بھی گھروں میں رکھیں اور اس کا استعمال کریں۔ اور پھر کوئین کو سارٹھیوں اور چوڑیوں کی خرید پر ترجیح دیں۔ دیہات کے قریب میں جو ہڑ کو ڈھانپ دیں یا بند کرادیں۔

اس طرح اس مسئلہ عظیم کے ہر سہ پہلو حل ہو گئے۔ ہاں یہ امور چوتھے کی محض تمہید ہیں۔ تا تا میں گھر کی صفائی اور معیار زندگی کی ذمہ داریاں ہیں۔ پس انہیں عہد طفولیت سے ہی مدرسہ میں بھیجا جائے اور پھر زندگی کے کاروبار کے لئے تیار کیا جائے۔ پس انہیں عہد طفولیت سے ہی مدرسہ میں بھیجا جائے اور آئندہ زندگی کے کاروبار کے لئے تیار کیا جائے۔ انہیں اعلیٰ پیمانہ کی تربیت کی ضرورت نہیں بلکہ انہیں خانہ داری کی تربیت کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ بوسہ ماں اور گھر کی نگہبانی کی اہل ثابت ہو سکیں۔ انہیں پرورش اطفال کا علم ہونا چاہئے۔ پارچا پٹ شیدنی کی درستی و تیساری سے واقفیت۔ کھانا بنانے۔ کپنے کی محنت کو قائم رکھنے کے

طریقوں سے آگاہی۔ سادہ دواؤں اور مصالحت سے واقفیت ہونی چاہئے۔ اُن کی مناسب حد تک عزت ملحوظ رکھی جائے۔ تاکہ وہ گھروں کی حقیقی مالک ثابت ہو سکیں۔

غیر ضروری کاروبار کے بوجھ عورتوں کے کندھوں پر سے ہٹا دینے چاہئیں۔ تاکہ اُن کو بچوں کی غور پر درخت کے لئے اور اپنے مکانات کو شاندار اور صاف ستھرا رکھنے کے لئے کافی وقت مل سکے۔ اور وہ اپنے خاوندوں کی رفیقہ بن سکیں۔ اور ان سے خاندانوں کا سلوک ہرگز روانہ رکھا جائے۔ چکی سے آٹا پیسنے۔ اور اپنے چھاپنے کے کام یکدم بند کرنے چاہئیں۔ اول الذکر کی جگہ خراس ٹکٹے بنائیں۔ اور آخر الذکر کی بجائے کسی اور قسم کا ایندھن تلاش کیا جائے۔ ہمارے گھروں اور دیہات کو پھولوں کی مہک سے معطر کیا جائے۔ جب ہماری عورتیں تربیت یافتہ اور مہذب ہوں گی اور ہمارے دیہاتی گھر شاندار اور خوشی سے معمور ہوں گے۔ تو دیہاتی لڑکے قصبات کا نئے نئے شیکے۔ بے یلانی۔ مقدمہ بازی اور لڑائی جھگڑے بہت کم ہوں گے۔ اگر میرا گھر آرام ہو گا۔ تو میں جھگڑوں میں کیوں شریک ہوں گا۔ اور اپنے پڑوسیوں کے خلاف کیوں مقدمہ بازی کروں گا۔ اس وقت اگر مردوں کو زیورات پہننے سے بند کیا جاتا ہے یا اپنے بچوں کے چیخ کا ٹیکہ لگانے کے لئے دیا جاتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ عورتیں انکے سخت خلاف ہیں۔ مگر وہ تعلیم یافتہ ہو کر کفایت شعاری اور صحت کے اصول کی پابندی ملحوظ رکھیں گے۔

ہر ایک صلیح کے حالات جدا جدا ہیں۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم سے نفعت صحت اور کھانا کائنات لا پرواہی اور غلیظ عادات یہ تقریباً تمام ضلوع میں پائی جاتی ہیں۔ ضلع گورگاؤں میں قحط و فحش عام تھی۔ ضلع جہلم میں زمین کا پُر آب ہونا اور لوگوں کے لئے کاروبار کی کمی مسائل عظیم ہیں۔ طغیانوں کے معنی فصل کی تباہی اور مویشیوں کے لئے چارہ کی عدم موجودگی کے ہیں۔ بیکاری کے معنی لڑائی جھگڑا۔ مقدمہ بازی۔ گھر سے نفعت اور کام سے نفرت کے ہیں۔ پہلا بڑا کام لڑھکوں کی کھلائی۔ گاؤں کی صفائی اور لوگوں کو صفائی کی عادات سکھانا ہے۔ لڑھکوں کو بطور پاختانوں کے تیار کیا جائے اور لوگوں کو ان کے استعمال سکھا دیئے جائیں۔ اس کے معنی ایک معرکہ عظیم کے ہیں۔ لیکن اولین عورتوں کے لئے یہ انتظام کئے جائیں کہ موجودہ رسم و رواج نہ ہی صحت بخش اور نہ ہی شائستہ ہیں۔ گاؤں کی حفظان صحت۔ صفائی پسند عادات کا اجرا باقی کاموں کو بالکل آسان بنا دینا۔ اور یہ حیرانی کی بات ہے کہ کس طرح سے خود داری۔ خاندانی نار اور صفائی ٹوٹن کو بہتر حالات کی طرف راغب نہیں کرتے۔ صفائی ترقی کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ غلاظت اور زندگی کے یہ معنی ہیں کہ لوگ اپنی حالت پر قانع ہیں۔ جسم صاف ستھرا ہو۔ گھر کی صفائی اور گاؤں کی صفائی کے یہ معنی ہیں کہ لوگ بہتر حالت کی طرف متوجہ ہیں۔ صفائی کے بعد لڑکیوں کی تعلیم اور گھر کے کام میں تربیت کا سوال آتا ہے۔ دیہات سدھاڑ ہم سب کا کام ہے۔ وہ لوگ بہترین کام کر کے دکھلا سکتے ہیں جو دیہات میں رہائش اختیار کر کے

نئی زندگی کی مثال قائم کریں۔ ہم سب ایسا نہیں کر سکتے۔ جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے ان کو کسی نہ کسی طریق پر کچھ کام کر کے دکھلانا چاہئے۔ ہم کو تقیر کرنے والوں کے علاوہ میچک لینٹرن تصویروں کی ضرورت ہے۔ ہمیں مصنفین کُتب۔ ناشر اور ناظم۔ ٹانگ نویس۔ مصوّر اور راکیوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اساتذہ اور اشاعت کنندہ کی ضرورت ہے تاکہ دیہات میں اس نیک خبر کی اشاعت ہو سکے۔ ہمیں ایسے لوگوں سے امداد کی ضرورت ہے جو میلوں کے مواقع پر لوگوں میں پرچار (اشاعت) کر سکیں اور ان کے آرام و سہولت کا اسباب مہیا کر سکیں۔ ہمیں تمام قسم کے دستکار اور موجدوں کی ضرورت ہے۔ جو اپنی ایجادات سے اہل دیہات کو ان کی کھیتی باڑی کے کام میں مدد دے سکیں اور ان کی بیوی کے لئے گھر کے کام میں سہولتیں بہم پہنچا سکیں۔ ہمیں ایسی عورتوں کی ضرورت ہے جو ہسپتالوں اور دایہ کے کام کے ذریعہ سے دیہاتی عورتوں کی مدد کر سکیں جس سے کہ ان کی زندگی شاندار بن سکے۔ ہمیں ایسی کتب مطلوب ہیں جو محض لڑکیوں کے لئے تصنیف کی گئی ہوں۔ ہمیں علم ادب اخبار رسالجات اور دیگر کتب مطلوب ہیں جو اہل دیہات کو تعلیم دے سکیں جس سے وہ اپنے فرصت کے وقت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ بوائے سکاوٹس تیار کریں کیونکہ وہی ہمارے دوست اور ساتھی ہو سکتے ہیں۔ اخیر میں ہم چاہتے ہیں کہ دیہات اخبار کا گھر بن جائیں۔

ہمارے لئے کام کی کوئی کمی نہیں اگر ابنائے جنس کی مدد کے خواہشمند ہوں اور ان کی زندگیوں کو خوشحال بنانا چاہیں۔ اس کا انجام یہ ہے کہ ہمیں دلی مسرت اور قلبی اطمینان حاصل ہو گا کہ ہم نے اپنے فرض کو ادا کر دیا ہے۔ اور ہم نے ان کی حقے الوسع امداد کی ہے۔ ہم نے چار برس برابر جنگ عظیم میں معرکہ آرائی کی۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان صلح ہے۔ لیکن دو دشمن۔ کاہلی اور جہالت ایسے ہیں جن سے ہمیں زندگی بھر لڑائی کی ضرورت ہے۔ یہ دو دشمن ایسے ہیں جو کاؤں والوں کی تمام معائب کا باعث ہیں۔ ان کا نتیجہ ہی غلامت بیماری عقلی اور مقدمہ بازی ہے۔ ان سے معرکہ آرائی کے لئے ہمیں ان لوگوں کی مستقل فوج کی ضرورت ہے جو دیہات سدھار کے لئے کمر بستہ ہوں۔

اپنے زیریں اصول۔ موافق اور خیالات کی رُو سے یہ جماعت صرف بوائے سکاوٹس ہی کی ہونا چاہئے۔ ہر مدرسہ اس پلٹن کی تربیت نگاہ ہو اور ہر جلسہ جہالت اور کاہلی کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے ایک جنگی کونسل کا کام دے۔



راز حیات

(فضل محی الدین صاحب فضل قادری)

”کہو تو راز حیات کہدوں۔ حقیقت کائنات کہدوں۔ وہ بات کہدوں کہ پتھر کے جگر کو بھی آب آ کر دے۔“ (حقیقہ جالندھری)

”امداد باہمی کو رائج کرنے سے ہندوستان کی زراعت کا مستقبل شاندار اور درخشاں بن سکتا ہے۔ (ملازم عظیم جارج پنجم) ہندوستان کے جسم میں پنجاب ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ اس لئے پنجاب کی ترقی پر ہندوستان کی ترقی کا انحصار ہے۔“

ہر کہ در قعر منزلت ماندہ است نا توانی را قناعت خواندہ است (اقبال)
”جس ملک کا خاص پیشہ زراعت ہو۔ وہاں اس سے بلند تر کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ کہ کاشتکاروں کی خوشحالی میں اضافہ کیا جائے۔“ (لارڈ ارون)

”اگر ہندوستان کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہو۔ تو دیہات اور دیہاتیوں کی اصلاح کرو۔“ (ٹیکور)
”میں سبک کام آؤں سب میرے کام آئیں۔ اس راز کی حقیقت امداد باہمی ہے۔“ (مسلم)
”ہمارے ملک کی نجات کا یہی ذریعہ ہے۔ کہ آمدنی میں اضافہ اور خرچ میں کمی کرنے کی کوشش کریں۔“
”بہتر کاروبار اور بہتر زراعت پر ہی بہتر زندگی منحصر ہے۔“ (ماربیس پلینکٹ)
”تعلیم اور امداد باہمی کے ذریعہ سے کسی ملک کی اقتصادی۔ معاشرتی ترقی اور اخلاقی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر سکتے ہیں۔“ (سر کینڈ)

ع۔ ”کو اپریشن میں ہیں تیری بہتری کے راز سب“

”امداد باہمی کا محل تعلیم اور صرف تعلیم کی بنیادوں پر ہی کھڑا ہو سکتا ہے۔“ (لارڈ لائلنگٹو)

”زرعی ممالک کے لئے زراعت ہی ایک بہترین اور مفید صنعت ہے۔“

جھگڑے چکا دیئے ہیں امداد باہمی نے بچھڑے ملا دیئے ہیں امداد باہمی نے

”کو اپریشن (امداد باہمی) کے ذریعہ سے ہی کاشتکار زمین سے بہترین فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔“ (ایچ کیلوٹ)
”دنیا میں تنظیم کے ذریعہ سے ہی خاطر خواہ ترقی ہو سکتی ہے اور بہترین تنظیم امداد باہمی ہے۔“

”اگر زمینداران پنجاب خوشگوار زندگی بسر کرنے کے تمنائی ہیں۔ تو ان کے لئے لازم ہے کہ کاشتکاری کے علاوہ کوئی اور پیشہ بھی اختیار کریں“

(ڈارلنگ)

پربادی و تباہی و افلاس آج ہے اس کا سبب خرابی رسم و رواج ہے ضرورت ہے کہ ہندوستان کے مزارعین بھی زراعت کے جدید طریقے اختیار کریں“ (ملک فتح خان فن) یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان زرعی ملک ہے۔ اور یہاں کے ۹۰ فیصدی باشندوں کا پیشہ زراعت لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حالات کس قدر یاس افزا ہیں۔ کہ خدا کی شانِ زراعت کا مظہر کاشتکار ایک حقیر و ذلیل زندگی بسر کر رہا ہے بیض شناسان ملک و قوم اور بی خان و وطن نے کاشتکاری ناگفتہ بہ حالت کی تشخیص کر کے جن نتائج کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہر چند خوشگوار نہیں ہیں۔ لیکن ایسے ضرور ہیں۔ کہ اگر بدترانہ ہند کی تمام تر توجہ اس طرف مبذول ہو جائے۔ تو یہ طبقہ جلدی ترقی کر سکتا ہے۔ ابھی اس کی بیماری اس حد تک نہیں پہنچی۔ کہ اسے لا علاج قرار دیا جائے۔ مختصر طور پر پنجابی کاشتکار کی خامیاں اور انکی اصلاح کے ذرائع بیان کئے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ سطور دیہاتی مدرسین کی اصلاحی جدوجہد کے سلسلہ میں انہیں اپنے مقاصد سے قریب تر لانے میں ان کی رہنمائی کریں گی۔

تعلیم۔ اگرچہ سب سے سوال کیا جائے۔ کہ کسی ملک کی ترقی کا انحصار کس بات پر ہے؟ تو میں جواب میں صرف ایک لفظ ”تعلیم“ کہہ کر اپنے جواب کو مکمل خیال کروں گا۔ یہاں تعلیم کے فوائد کا عادیہ چنداں دیکھ نہ ہو گا۔ کہ بقول مولانا رومؒ ع آفتاب آمد و دلیل آفتاب

یہ اعداد و شمار ہندوستان کی ہستی و پسماندگی کا ایک روشن ثبوت ہیں۔ کہ جہاں دیگر ممالک عالم امریکہ۔ جاپان۔ روس۔ جرمنی اور انگلینڈ میں ۷۰ فیصدی سے سو فیصدی تک لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ وہاں ہندوستان کے ایک قلیل التعداد طبقہ (صرف ۵ فیصدی اشخاص) کا تعلیم یافتہ ہونا کیا پوزیشن رکھتا ہے؟

تعلیم کے فوائد میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن ایک مفید ذریعہ ارتقاء سے ایسی بے لوثی و درجہ افسوسناک ہے۔ اور اس عدم توجہ کا باعث محض والدین کا بالخصوص مستورات کا تعلیم کے زیور سے عاری ہونا ہے۔ تعلیم بالانوان۔ تعلیم نسواں اور لازمی تعلیم ہی جہالت کے مرض سے شفا حاصل کرنا محض سب سے

افلاس۔ ہندوستان بھی عجیب ملک ہے۔ اگر اوسط آمدنی فی کس روزانہ صرف ڈیڑھ آنہ ہے۔ جہاں اس کے مقابلہ میں دوسرے ممالک کی اوسط آمدن فی کس پندرہ روپے روزانہ تک ہے۔ تو اموات کی تعداد سب ممالک کی نسبت ہندوستان میں زیادہ ہے۔ گویا ناقص کی بھرمار اور محاسن کا فقدان ہے۔ سونے کی یہ چیز خود ہی اپنے پروں کو اس طرح توڑ کر پھینک چکی ہے۔ کہ تاب پریدن نہیں رہی۔ اور مجال پرزدن باقی نہیں

تایم حقیقت کس قدر خون کے آنسو لانے والی ہے۔ کردہ ہندوستان جو گندم۔ چلے۔ پٹن۔ روٹی کی پیداوار میں دُنیا کے ریکارڈ کو شکست دیتا ہے۔ اپنے ملک کے باشندوں کا بیٹ پالنے میں ناکام نظر آتا ہے۔ لیکن یہ سب حالات ہمارے خود پیدا کردہ اور ہماری اپنی ہی جہالت و تغافل شکاری کا ثمرہ ہیں۔ افلاس کے اسباب پر سرسری نظر ڈالنے سے سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ حالات کی اصلاح کہاں تک ہمارے اختیار میں ہے۔

قرضہ۔ اس وقت صرف صوبہ پنجاب کے کاشتکاروں اور زمینداروں کے ذمہ ۳۰ کروڑ روپیہ قرضہ ہے جس کا سالانہ سود بیس کروڑ روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ تمام صوبہ کا معاملہ اراضی پلیم کو روڑ روپہ سالانہ ہے۔ پنجاب کے ۸۰ فیصدی باشندے مقروض اور ساہوکاروں کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے ہوئے ہیں۔ پنجابی کاشتکار کی حالت موجودہ اس شعر کی مجسم تفسیر ہے۔

پھنسا ہے دام غلامی میں بال بال اس کا کیا ہے قرض نے خستہ خراب حال اس کا
قرضہ کی زیادتی کے اسباب میں بھی مقروضان کی لاعلمی اور جہالت کا بُنت کچھ حصہ ہے۔ ہنایت گراں شرح سود پر قرض برداشت کر کے اسے غیر منفعت بخش اغراض پر صرف کرنا، بیاہ شادی اور دیگر رسومات پر "ناک" کی خاطر درجہ بہ حال کٹ ہی جایا کرتی ہے (سود در سود کے رنگین جال میں پھنسنا، ایک سو روپیہ نقد کے کر ڈیڑھ سو کا تمسک تحریر کر دینا اور ایک ہنگامی واہ واہ کے لئے اپنے پاؤں پر پٹنہری کلہاڑا چلانا پرے درجہ کی جہالت، افسوسناک حماقت اور ڈوب جانے والی کشتی نہیں تو اور کیا ہے؟

پنجاب میں ساہوکاروں کی تعداد چار لاکھ ہے جو ظاہر کرتی ہے۔ کہ دولتمند بنائے وطن کو غریبانوں کا خون چوسنے میں کیسا مزا آتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ یہی روپیہ تجارت، صنعت و حرفت اور دیگر مفید پیشیوں پر صرف کریں۔ تو نہ صرف وہ اس سے زیادہ منافع حاصل کریں۔ بلکہ غریبوں اور بیکاروں کی ایک کثیر تعداد کے لئے ذرائع معاش پیدا ہو جائیں اور ملک اپنی اندرونی ضروریات کے پورا کرنے کے قابل ہو جائے۔

کفایت شکاری۔ بیماری، تعلیم، شادی اور دیگر اتفاقی حاجات کے لئے ایسی رقم مطلوب ہے جو خانگی اور روزانہ ضروریات کی تکمیل کے بعد ہمارے پاس محفوظ ہو۔ لیکن بد قسمتی سے ہم اس احساس سے محروم ہیں۔ کہ ایسی ضرورتوں کے لئے آمدن کا ایک مخصوص حصہ پس انداز کرنا چاہئے۔ اسی لئے ہماری عادت ہو گئی ہے۔ کہ قرض لے کر ان ضروریات کو پورا کیا جائے۔ آمدنی میں اضافہ اور خرچ میں کمی کرنے کی کوشش کر کے یہ عادت پیدا کرنی چاہئے۔ کہ پس ماندہ رقم اتفاقی اخراجات کے لئے محفوظ رہے۔ اسلاف یا ناجائز اخراجات کو بالکل ترک کر دیا جائے۔

زاید پلٹے۔ امریکہ، مائیکلتان اور دیگر مہذب و تمدن ممالک کے کاشتکار اپنے اوقاف و صنعت میں ایسے مشاغل میں مصروف رہتے ہیں جو تفریح کے ساتھ آمدنی میں اضافہ کا باعث بھی ہوں۔ مثال کے طور پر سونے کے لندن میں، نیو یارک میں زمینداروں نے مرغی خانے بنائے ہوئے ہیں۔ امریکہ کے کاشتکار سالانہ ۲۰ کروڑ پونڈ انڈوں کی فروخت سے چل کر رہتے ہیں۔ کیا یہ اعداد و شمار پنجابی کاشتکار کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ناکافی ہیں؟ جو اپنے فہمت کے قیمتی لمحوں کی قدر نہ کر کے ان کو اس طرح صرف کرتا ہے جس کا انجام مقدمہ باری یا اس قسم کی دوسری تباہ کن صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ پنجاب میں مفید ترین مشاغل اختیار کرنے کے لئے قدرتی سہولتیں زیادہ ہیں مثلاً مسومات سارا دن گھروں میں بیکار بیٹھی رہتی ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل امور میں مردوں کا ہاتھ بٹا کر آمدنی میں اضافہ کی گنجائش پیدا کر سکتی ہیں۔ جن کے لئے کسی غیر معمولی سرمایہ کی ضرورت نہیں۔

مرغیوں کی پرورش۔ ریشم کے کیڑے پالنا۔ لاکھ بنانا۔ ٹپیاں بنانا۔ کشیدہ کاڑھنا۔ جلد بازی۔ رنگ و روغن کرنا۔ باغبانی۔ مویشیوں کی پرورش۔ ٹاٹ بنانا۔ کپڑا بننا وغیرہ وغیرہ۔

ناجا غز اخراجات۔ جس شخص کا بال بال قرضہ میں جکڑا ہوا ہو۔ جو فرقہ اپنی ہر جائز ضرورت کے لئے بھی دوسروں کا دست نگر ہو۔ جس قوم کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہو۔ اور جس ملک کے باشندوں میں کفایت شعاری کا احساس نہ ہو۔ لیکن جائز و ناجائز کے سوال پر غور کئے بغیر دل کھول کر خرچ کرنے کی قدیم عادت ہو۔ تو ضروری ہے کہ وہ شخص ذلت و خوارت کی زندگی و فرقہ پریشانی و پس ماندگی کے ایام وہ قوم افلاس و تکالیف کا زمانہ اور وہ ملک غلامانہ ذہنیت کے سہاگے کسی تمنا کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ نہ دے۔ اور فضول و بیکار ہوگئی۔ اس کی وہ ناکمل کوششیں چودہ پلٹے پٹنے کے لئے کرے گا۔

مذکورہ حالات پنجابی کاشتکار کی غیر مطمئن زندگی کا تاریک پہلو ہیں۔ مقدمہ باری شادی و اموات کے غیر ضروری اخراجات اور دیگر فضول رسومات کی قیود نے اسے ایسا پابہ زنجیر کر رکھا ہے کہ اس کے دل سے احساس آزادی بھی سلب کر لیا ہے۔

ضرورت ہے کہ زمیندار و کاشتکار ہندوستان و پنجاب اور ملک و قوم کے ان بڑھتے ہوئے ناجائز اخراجات کے خلاف ایک منظم و موثر طریقہ پراجہ تادی جدوجہد کا آغاز کیا جائے اور کامیاب ہونے کے لئے وسیع پیمانہ پر اصلاح رسومات کا جال پھیلایا جائے۔

تقدامت پسندی۔ ایک شاعر کا یہ شعر ہے

”جولانا زندگی کی دور میں سبک چھڈی ہے
لئے گز چال چلتا ہے پرانی اس کی کھڈی ہے“

اور ایک ماہر فن کا یہ مقولہ کہ پنجابی کاشتکار اس ترقی و تہذیب کے زمانے میں بھی وہی قدیم آفات

زراعت استعمال کر رہا ہے۔ جو اُسے اپنے آبا و اجداد یا بول کہو کہ حضرت آدم سے بطور ورثہ ملے ہیں، ہماری قدامت پسندی پر نمایاں اور صحیح طور پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ اس وقت جبکہ جدید آلات زراعت کی مرزائی کی بدولت ہم اپنے وقت میں نچت اور پیداوار میں ترقی کر سکتے ہیں۔ پنجابی کاشتکار نے آلات زراعت سے صرف ”نئے“ ہونے کے خیال سے ڈرتا ہے اور ان کے فوائد ذہن نشین کرنے کے باوجود بھی ان سے خطرہ سمجھتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی بُرائی اور فضول رسومات کو ترک کرنا بھی اچھا خیال نہیں کرتا۔ تعلیم یافتہ کاشتکاروں کے نمونہ سے بدترتیب یہ حالات کچھ تبدیل ہو رہے ہیں۔ لیکن جدت پسندی سے ابھی تک گریز ہے۔

منتشر قطعات اراضی۔ وراثت کی تقسیم و تقسیم کے باعث زمینیں ایسے چھوٹے چھوٹے قطعات میں منقسم ہو گئی ہیں۔ کہ بعض حالات میں تین ایکڑ زمین میں یا اس سے بھی زیادہ قطعات میں جدا گانہ کھیتوں کی شکل میں بکھری ہوئی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ کھیت کوئی دو تین مربع میل کے وسیع حدود میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان حالات سے زمینداران کو سخت مشکل کا سامنا ہے۔ آئے دن بٹہ شکنی کے مقدمات کی بھرمار رہتی ہے۔ کھیتوں اور پیداوار کی نگرانی اور حفاظت میں وقت پیش آتی ہے۔ زمین کا ایک بیش بہا حصہ حد بندی کی نذر ہو جاتا ہے۔ آبپاشی کا انتظام ناممکن نہیں تو محال ضرور ہو جاتا ہے۔ ان تکالیف کا سدباب صرف ”اشتعال اراضی“ کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ اشتعال کے فوائد ذیل کی ایک مجموعی مثال سے بخوبی ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔

تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں ایک شخص کی دس ایکڑ زمین ۴۷۹ قطعات میں منقسم تھی۔ اس نے اس سے فائدہ نہ حاصل ہوتا دیکھ کر لائل پور میں مزارع بننے کو ترجیح دی۔ اب اشتعال ہونے پر وہی زمین صرف دو قطعات میں جمع ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے واپس آکر اپنی زمین میں کھیتوں بھی لگوا لیا ہے۔ اور آرام سے اپنی زمین کاشت کر رہا ہے۔ کسی اشتعال شدہ گاؤں کا سابقہ اور موجودہ نقشہ دیکھنے سے اشتعال کی وقعت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبہ پنجاب میں اشتعال اراضی کے زیر اثر نئے سرے سے تقسیم ہو چکا ہے۔ جس میں مزید آبپاشی کے لئے پانچ سو نئے کنوئیں بھی لگ چکے ہیں۔ **ترقی زراعت**۔ یہ خیال کہ کاشتکاری ایک حقیر پیشہ ہے، ہماری زرعی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ زرعی ممالک کے لئے زراعت ایک بہترین اور مفید صنعت ہے۔ زمین کی حیثیت اور پیداوار میں ابھی ترقی کی کافی گنجائش موجود ہے۔ ہمیشہ یہ منظر رہے کہ زمین کسان کے لئے ہے نہ کہ کسان زمین کے لئے، جدید آلات زراعت۔ آزمائے ہوئے بیج اور کھاد کے درست استعمال سے محکمہ زراعت کی ہدایات کے بموجب

ہم زمین کی موجودہ حیثیت اور پیداوار میں کئی گنا اضافہ کر سکتے ہیں۔

خرید و فروخت۔ ترقی زراعت وغیرہ کی ہر ممکن کوشش اس وقت تک بے سود ہوگی جب تک کہ زمیندار کو ضروریات کی خرید اور پیداوار کی فروخت کے لئے سہولتیں میسر نہ ہوں۔ مرسٹر کلینڈ کا یہ قول حقیقت سے لبریز ہے کہ غریب آدمی خرید و فروخت دونوں موقع پر نقصان اٹھاتا ہے۔

زمین کی خرید و فروخت گاؤں کے معمولی دکاندار کے ساتھ ہوا کرتی ہے جو کہ زمیندار کی سادہ لوحی سے جائز نفع حاصل کرتا ہوا خرید و فروخت دونوں موقع پر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرتا ہے۔ ادھر زمیندار اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ لین دین کرے۔ انجن ہائے ہم رسانی اشیاء وراثت کی دکانوں نے اس مشکل کے حل کرنے میں کسی حد تک آسانیاں ہم پہنچا دی ہیں۔

ترقی نسل مویشیاں۔ اگر اعداد و شمار پر نظر ثانی کی جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار ہر سال خرید مویشی کے لئے ایک معتد بہ رقم قرض لیتے ہیں۔ زمیندار کی سلاخ خرید مویشی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر سال اس کے بہت سے مویشی محض اس کی عدم توجہی کے باعث ضائع ہو جاتے ہیں۔ معمولی اور اچھی قسم کے مویشی کے اخراجات میں چنداں فرق نہیں ہوتا۔ لیکن کام میں نمایاں اور لائی فرق ہوتا ہے ہمارے ملک کے کاشتکار معمولی اور ادنیٰ قسم کے مویشی کی خرید پر لاکھوں روپے ہر سال ضائع کر دیتے ہیں۔ اور پھر بھی وہ ان اتنا کام نہیں لے سکتے جو ایک اچھے اور عمدہ قسم کے مویشی سے لیا جاسکتا ہے۔

ترقی نسل مویشیاں کی انجن ہائے اس بارے میں بہت کچھ مفید کام کر رہی ہیں۔

کھاد کی حفاظت۔ کھاد زمین کی طاقت کو برقرار رکھنے اور پیداوار بڑھانے کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جیسا انسان کے لئے آناج۔ مویشی کے لئے چارہ اور بچوں کے لئے دودھ۔ لیکن ہمارے ملک کے زمیندار ایسی ضروری چیز سے اتنی کوتاہی اور ایسا تغافل روا رکھتے ہیں کہ گوہر جیسی قیمتی کھاد کو جلا کر ضائع کر دیتے ہیں۔ مویشی کا پیشاب (جو ایک بہترین کھاد ہے) بلا مصروف خیال کیا جاتا ہے۔ کھاد ڈھیروں کی صورت میں جمع کی جاتی ہے۔ جس سے اس کا کلر آند جز برسات کے پانی اور سورج کی گرمی میں ضائع ہو جاتا ہے محکمہ زراعت کی سرگرمیاں اس ضروری امر کی جانب خاص طور پر منعطف ہونی چاہئیں۔

امداد باہمی۔ امداد باہمی ایک اقتصادی۔ مساواتی اور اخلاقی عالمگیر تحریک ہے جو زمیندار کاشتکار شاہ و گدا سرمایہ دار مزدور۔ تاجر و پیشہ ور۔ حاکم و محکوم ہر اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کے لئے مفید اور فیض ساس تسلیم کی گئی ہے۔

کاشتکار کی اقتصادی امراض کا شافی علاج۔ زمیندار کی مشکلات کا بہترین حل اور ملک کی ترقی کا اولین

زینہ امداد باہمی اور صرف امداد باہمی ہے۔

ہندوستان اس بارے میں بہت خوش نصیب ہے۔ کہ اس کو خود اس کے متعلق کوئی تجربہ نہیں کرنا پڑا۔ ورنہ جن ممالک میں اس کا آغاز کیا گیا ہے۔ بہت مشکلات اور تکالیف کے بعد کامیابی نصیب ہوئی۔ اور ہندوستان ان ممالک کے حامل کردہ مفید نتائج پر بھی عمل پیرا ہونے میں پس و پیش کر رہا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں پنجاب گورنمنٹ نے ایک سرکاری کمیشن بیکاری کے اسباب پر غور کرنے کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے۔ ”ملک کی موجودہ بڑھتی ہوئی بیکاری کا واحد علاج یہ ہے۔ کہ امداد باہمی کے ذریعے سے پیداوار میں اضافہ کر کے تعلیم یافتہ طبقہ کو کاشتکاری کی طرف مائل کیا جائے۔“

دنیا کے مدبر و طباع افراد امداد باہمی کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ حضور ملک معظم خارج دم اقبال کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ امداد باہمی کو رائج کرنے سے ہندوستان کی زراعت کا مستقبل شاندار اور درخشندہ بن سکتا ہے۔“

اس وقت تک امداد باہمی کے زیر اثر مندرجہ ذیل اقسام کی انجمن ہائے کا اجراء عمل میں آچکا ہے۔ اس ظاہر ہوتا ہے۔ کہ امداد باہمی ہماری تمام مشکلات کا بہترین حل ہے۔

(۱) انجمن لازمی تعلیم۔ ممبران کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔

(۲) انجمن امداد قرضہ۔ ممبران کی ضرورت کے لئے قرضہ ہم پہنچانا اس انجمن کا پہلا مقصد ہے۔

(۳) انجمن ثالثی۔ مقدمہ بازی کے تباہ کن اخراجات سے بچانے اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کیلئے۔

(۴) انجمن اصلاح رسوم۔ ناجائز اور فضول رسومات کی بیخ کنی کے لئے امداد باہمی کا بہترین گارنٹہ۔

(۵) بچت و کفایت شعاری کی انجمن۔ ممبران میں کفایت شعاری کے جذبہ اور احساس کا پیدا کرنا اس کے مقاصد سے ہے۔

(۶) انجمن صحت و صفائی۔ ممبران کو صفائی کے اصول پر کاربند کر کے صحت کی عمدگی رکھنا اس انجمن کے قواعد کا خلاصہ ہے۔

(۷) ترقی نسل مویشیاں۔ مقاصد نام سے ظاہر ہیں۔

(۸) اشتغال اراضی۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے اور پریشان قطعات کو یک جا کر کے دوبار تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے اور یک جا کھیت ایک شخص کو مل سکیں۔

(۹) ادائیگی معاملہ۔ محوی چندہ ادا کر کے ممبر بن جاتے ہیں ممبران کا معاملہ اراضی انجمن ادا کرتی ہے۔

(۱۰) انفکاک اراضیات۔ زمین مرہونہ کو فک کرانے کے لئے بھاری رقوم کا قرضہ لمبی میعاد کے

لئے دیا جاتا ہے۔

(۱۱) ترقی زراعت (۱۲) بہم رسانی اشیا (۱۳) انجمن ہائے مستورات۔

(۱۴) انجمن معاوضہ نقصان فصل۔ ممبران کی فصل کو ناگہانی حادثات سے نقصان پہنچنے پر یہ انجمن ان کی امداد کر کے نقصان کی تلافی کرتی ہے۔

(۱۵) فوجی انجمن ہائے۔ محکمہ فوج امداد باہمی کی برکات سے مستفیض ہو رہا ہے۔

(۱۶) انجمن ہائے دستکاراں۔ پیشہ ور دستکاروں کی انجمن ہائے نہایت اعلیٰ پیمانہ پر اور کامیابی سے چل رہی ہیں۔

(۱۷) دکان ہائے آہرت۔ کاشتکاروں کی پیداوار امداد باہمی کے اصول پر فروخت کی جاتی

ہے۔

اس کے علاوہ پنجاب میں ماڈل ٹاؤن سوسائٹی اور نارنٹھ ویسٹرن ریلوے کے ملازمین کی انجمن اولو باہمی کی شاخوں کا ایک معمولی پرتو ہیں۔

اخیر میں مجھے پھر یہی عرض کرنا ہے کہ ملک کی ترقی کا مسئلہ ذریعہ (امداد باہمی) بھی تعلیم کے بغیر اپنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

پنجاب بینکنگ انکوارٹری کمیٹی کی رائے ہے کہ انجمن ہائے قرضہ کی کامیابی کے لئے ممبران میں بیش از بیش تعلیم کی ضرورت ہے۔

صدر کو اپریٹو لیگ امریکہ کا ارشاد ہے کہ ”امداد باہمی کی بنیاد تعلیم ہے“

پس یہی خواہاں ملک و قوم کا اولین فرض یہ ہے۔ اور ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ اپنی تمام تر توجہات امداد باہمی اور اس کی بنیاد (تعلیم) کی جانب مبذول فرما کر ملک کی دنگائی ہوئی لاشی کو ساحل مراد پر لا کر مادر وطن سے دعائیں لیں۔

قیمتی باتیں

جو چیز تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ اسے دوسرے کیلئے پسند نہ کرو۔

یاد رکھو۔ ہر جگہ ارچیز سونا نہیں ہوتی۔

دیہات سدھار کے متعلق چند مفید باتیں

(راجنہاں پنڈت دیناناث صاحب، اگنی ہوتری۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول میر پور)

لوکل سلف گورنمنٹ

لاہور میں جو رومن کیتھولک مذہب کے پیرو تھے ۱۸۸۷ء میں دائرہ سرحدی مقرر ہو کر ہندوستان میں تشریف لائے۔ انہیں ہندوستانیوں سے بہت ہمدردی تھی اس لئے انہوں نے ایسی اصلاحات جاری کیں جن کا مدعا یہ تھا کہ ہندوستانی سیاسیات میں کچھ مہارت پیدا کر لیں اور اپنی غلطیوں سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء کے دوران میں ایسے قوانین بنائے گئے جن کی رو سے لوکل سلف گورنمنٹ کا وجود عمل میں آیا یعنی ڈسٹرکٹ بورڈ قائم کئے گئے اور میونسپل بورڈوں کے اختیارات کو وسعت دی گئی اور ان دونوں کے اکثر ارکان دونوں کے ذریعے منتخب کئے جانے لگے۔ اور کوشش کی گئی کہ سرکاری اشخاص کی بجائے غیر سرکاری اشخاص ممبر مقرر ہو کر ہیں لیکن یہ تجربہ ناکامیاب رہا اور لوگوں نے اس میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔ غیر سرکاری صدر اپنے فرائض کے ادا کرنے میں ناکام رہے کئی مقامات پر نو سب جلیاں بند کر دی گئیں۔ ۱۸۹۲ء میں مائیکو جیمس فورڈ سکیم کے رائج ہونے پر لوکل سلف گورنمنٹ کی اہمیت لوگوں کے ذہن نشین ہوئی اسے وزراء کے ماتحت کر کے محکمہ منتقلہ میں شامل کیا گیا اور وزراء کو کونسلوں کا جوابدہ قرار دیا گیا۔ حق انتخاب میں توسیع کی گئی۔ بورڈوں کے اختیارات بڑھا دیئے گئے اور اب دوبارہ کوشش کی جا رہی ہے کہ صدر غیر سرکاری اشخاص ہوں یہ مقامی بورڈ اپنے اپنے رقبوں میں تعلیم، حفظان صحت، سڑکوں اور آب پاشی کے ذمہ دار ہیں اور لوگوں میں احساس شہریت پیدا کر رہے ہیں۔ یہ تو بڑے بڑے شہروں کی بابت مختصر ذکر ہے لیکن سرکار دولت ہار نے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں ٹاؤن کمیٹیاں بنا کر صفائی اور صحت کا انتظام لوگوں کے اپنے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اس کا رقبہ اٹھارہ لاکھ مربع میل یا ایک ارب ۱۶ ۱/۲ ایکڑ ہے۔ یہ رقبہ سلطنت جرمنی سے اتنا گنا جاپان سے گیارہ گنا اور برطانیہ سے پندرہ گنا ہے۔ اور اگر براعظم یورپ کے رقبہ میں سے روس کا رقبہ نکال دیا جائے تو وہ ہندوستان کے رقبہ ہی کے برابر ہے۔ ہندوستان میں ۶ لاکھ ۸۸ ہزار گاؤں اور صرف ۲۳۱۶ شہر ہیں۔ ہندوستان میں چھ سو چھوٹی بڑی دیہی ریاستیں بھی ہیں۔ کل دنیا کی آبادی ۱۷۰

کرڑے اور ہندوستان کی آبادی ۳۲ کروڑ ہے یعنی دنیا کی کل آبادی کا ۱/۵ حصہ ہندوستان میں رہتا ہے۔
اور ہندوستان کی کل آبادی کا ۱/۹ حصہ گاؤں میں اور صرف ۱/۵ حصہ شہروں میں رہتا ہے۔

رورل کمیونٹی کونسل

اب ہندوستانیوں کو صحیح معنوں میں طرز تمدن سکھانے کی غرض سے گاؤں میں اصلاحات کا پھیلانا ضروری ہے۔ اس مطلب کے لئے ہر ضلع میں رورل کمیونٹی کونسل بنادی گئی ہے جن کی شاخیں ہر تحصیل میں بھی جاری کی دی ہیں ان کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایک گاؤں میں لوگوں کی توجہ تعلیم، حفظانِ صحت اور دیگر فوائدِ بہبودی کی طرف مبذول کی جائے تاکہ وہ ہر ممکن طریقہ سے اپنی سیاسی، ذہنی، اخلاقی اور سوشل زندگی کو بہتر بناسکیں۔ مسٹر برہمن اودانگی اہلہ محترمہ نے جو کام ضلع گورگانوہ میں دیہات سدھار کے متعلق کیا ہے اس تھوڑے سے وقت میں اس کا مکمل ذکر کرنا ناممکن ہے لیکن ان کی کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم گاؤں میں رہتے ہوئے بھی اپنی مشکلات کے سمجھنے اودان کے دُور کرنے سے غافل ہیں حالانکہ ایک انگریز چارٹیڈ مشکلات کا صحیح حل بتانے کیلئے ہر وقت تیار رہے اور اس کوشش میں ہے کہ ہم ہندوستانی اپنی حالت کو سدھار کر ایک صاف ستھرے اور متحمل فرض شناس شہری بن جائیں۔

مسٹر برہمن نے اپنی کتاب (THE REMAKING OF VILLAGE INDIA) میں دیہاتیوں کی بُری رسومات کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے ضلع گورگانوہ میں اپنے لائق اور محنتی عملہ کی مدد سے ان تمام ریتوں کو دُور کرنے کی غرض سے جو ذرائع استعمال کئے ہیں ان سب کا مفصل ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے۔

گاؤں کی بُری رسومات

اس علاقے میں یہ ایک اچھی رسم ہے کہ گوبر کے اُپے نہیں بنائے جاتے اور عورتوں کا قیمتی وقت بے فائدہ ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ گوبر کو کھیتوں میں ڈال کر کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن نہایت انوس سے ذکر کرنا پڑتا ہے کہ خدا کی محبت دی ہوئی اور انڈیا ضروری دو چیزوں یعنی ہوا اور پانی کا جائز استعمال نہیں کیا جاتا اور نہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ بہت کم گھر ایسے ہیں جن کے ہر ایک کمرہ میں ہوائی آمد و رفت کا مکمل انتظام ہو۔ عام زمینداروں کے گھروں کی بنیاد ایسی ہوتی ہے کہ گھر کا ایک ہی دروازہ ہے اور کوئی سوراخ یا روشندان اس میں نہیں ہے۔ گھر کے ارد گرد چار دیواری نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کو ہر ایک موسم میں اندر ہی رہنا اور سونا پڑتا ہے اور یہ بھی ناقص رواج دیکھنے میں آیا ہے کہ گرمیوں کے موسم میں بھی رات کے وقت

سوفے سے پیشتر دروازوں کو مکمل طور پر بند کر لیا جاتا ہے علاوہ ازیں عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ عورتیں ناک کو جو خدا نے ہوا کو جسم کے اندر داخل ہونے کا دروازہ بنایا ہے سونے چاندی کے زیوروں سے بند کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں اور چہرے کی خوبصورتی اس میں سمجھتی ہیں کہ تھنوں کو مکمل طور پر بند کر دیا جائے تاکہ سانس بھی ٹھیک لیا جاسکے اور اس پر مڑو یہ کہ گھونگٹ نکال کر تازہ ہوا کو بالکل جواب دیدیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس خوشگوار علاقہ میں جہاں ہر وقت تازہ پانی اور ہوا میسر ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر آبادی کے باوجود بھی اس قدر تپ دق کا مرض روز بروز ترقی کر رہا ہے جس کی شہادت ہسپتال کے جبرٹروں سے بخوبی مل سکتی ہے۔

۲۔ پانی کے ذخیروں اور چشمیوں کو صاف نہ رکھنے سے ان میں میل کمپل جمع ہو جاتی ہے اور مضر صحت جراثیم کو کافی خوراک ملنے سے ان کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے موسم برسات کے بعد گاؤں میں عموماً ملیریا وغیرہ کی بیماری پھیل جاتی ہے اور گھروں میں خوشی و آرام کی بجائے سرج و تکلیف کا دور دورہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ قدرتی نہیں بلکہ ہماری اپنی غفلت اور لاپرواہی ہے۔

۳۔ عموماً گھروں میں پاخانہ اور غسل خانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اس لئے عورتیں اور بچے گھروں کے ارد گرد دھڑاڑوں میں چھپ کر رفع حاجت کرتے ہیں جس کی بدبو سے گھروں میں بیماری پھیل جاتی ہے بچوں کی صحت کو نقصان پہنچتا ہے مثلاً آنکھوں کا دکھنا۔ اسہال و پیش وغیرہ۔

۴۔ علاوہ ازیں بیماری کا مناسب علاج نہیں کیا جاتا بلکہ جاوٹونے کے ذریعے سے بیماری بیماری کو اور بڑھا دیا جاتا ہے اور بیماری کے زیادہ بڑھ جانے پر نیم مکیموں کا علاج کر اگر مریض کو قریب لڑک کر دیا جاتا ہے پھر ڈاکٹری علاج کو بدنام کرنے کی غرض سے ہسپتال میں لا کر رسا دکھانے کی غرض سے ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع کیا جاتا ہے ابھی کچھ افادہ نہیں ہونے پاتا کہ ڈاکٹر صاحب سے بابوسی کی باتیں کر کے مریض کو واپس گھر لے جاتے ہیں۔

۵۔ بچوں کی ولادت کے وقت جو غفلت اور لاپرواہی کی جاتی ہے اس کا بیان ہی نہیں ہو سکتا۔ زچہ اور بچہ کو ایک کو ٹھٹھی میں بند کر دیا جاتا ہے ان کی صفائی اور خوراک کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا تازہ ہوا کو فٹنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ ان حالات میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ بچہ اور زچہ کی صحت قائم رہ سکے۔

تعلیمی حالت

۶۔ مختلف ممالک میں مدارس میں تعلیم پانے والے طلباء اور ملک کی کل آبادی کا تناسب مندرجہ

ذیل ہے:-

جاپان = $\frac{1}{4}$ ۳۸ فیصدی	برطانیہ = ۲۹ فیصدی
ڈنمارک = $\frac{1}{4}$ ۳۵	فرانس = ۲۸
جرمنی = $\frac{1}{4}$ ۲۹	امریکہ = $\frac{1}{4}$ ۲۷
	ہندوستان = $\frac{1}{4}$ ۲۴

پچاسے ملک میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ لیکن معوبہ بھر میں یہ ضلع باقی تمام اصنام کی نسبت تعلیمی حالات کے لحاظ سے بہت پیچھے ہے یہاں سرکار دولت مدار کے اس قدر روپیہ خرچ کرنے کے باوجود بھی تعلیم سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ بہت سے ایسے بچے ہیں جنہوں نے کسی سکول کا فائدہ بھی نہیں دیکھا اس جدوجہد کے زمانے میں جبکہ تمام ملک اس کوشش میں ہیں کہ ان کے سو فیصدی بچے تعلیم یافتہ ہوں یہاں حالت ہی اس کے عکس ہے۔ بچوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنے کی بجائے انہیں تعلیم سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ اس تحصیل میں اس علاقہ کے باشندوں کی فوجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مہربان گورنمنٹ نے ہائی سکول قائم کیا ہے ساتھ ہی زمینداروں کے لڑکوں سے نصف فیس لی جاتی ہے۔ پھر بھی آپ خیال فرمائیں کہ کتنے فیصدی بچے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کا تو یہاں کسی کو خیال ہی نہیں شاید ساری تحصیل میں ایک یا دو گول سکول چھوٹے۔ اور ان میں بھی لڑکیوں کی بہت کم تعداد دیکھنے میں آتی ہے۔

والدین کا فرض

والدین سمجھتے ہیں کہ ان کا فرض صرف لڑکی کی شادی کر دینا ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ شادی سے پہلے دیکھ لیں کہ آیا ان کی لڑکیاں خانہ داری کے بوجھ کے برداشت کرنے کے قابل ہیں یا نہیں؟ اور آیا وہ لڑکا جس کے ساتھ لڑکی کی شادی ہوگی اس بوجھ کو سنبھال سکتا ہے یا نہیں؟ اور اپنے فرض کو پورے طور پر سمجھتا ہے یا نہیں؟ گڈے اور گڑباز کی شادی سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور عمر رسیدہ مرد کے ساتھ کم سن لڑکی کو ملائیک دینے سے سوائے مصیبت کے اور کچھ دیکھنے میں نہیں آتا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان برائیوں کو دور کرنا اور دور کرنا کس کا فرض ہے؟ کیا گاؤں کے بے علم اور جاہل باشندے جو رواج کے غلام ہیں ان کا فرض ہے یا تعلیم یافتہ فرقہ کا جو اپنا اور دوسروں کا بھلا بُرا سمجھ سکتا ہے؟ مہربان گورنمنٹ نے اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ اس ملک سے بڑی رسومات دور کرنا ایک ضروری فرض ہے اپنی رعایا کے ہر ایک بشر کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنے فالتو وقت کا اپنے ان پڑھ بھائیوں کو راہ راست پر لانے کے لئے اپنی زندہ مثال یا نصیحت سے پورا فائدہ اٹھائے نہ کہ ان کو گمراہ کر کے اندھیرے

میں چھینک دے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پریذیڈنٹ صاحب بہادر اس بات پر اکثر زور دیا کرتے ہیں کہ ہر ایک ذیل میں رورل کمیٹیاں بن جائیں جو تحصیل کمیٹی کے ممبران کے تجربات اور نصائح سے فائدہ اٹھا کر ہر ایک گاؤں میں ہر ایک فرد بشر کی طبیعت کا سبیلان برائی سے ہٹا کر نیک اور مفید کاموں کی طرف لگائیں یہ معمولی کام نہیں اور نہ ہی ایک دن میں ہو سکتا ہے۔ مکان کا بنانا اور پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنا مشکل ہے لیکن مکان کا گرانا اور پہاڑی سے اترنا آسان ہے اسی طرح ان نیک کاموں کے واسطے لگاتار کوشش کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ہمارا اپنا کام ہے۔ جب تک ہم اپنے کاموں کو سبھی پوری طرح نہیں کر سکتے۔ تو دوسروں کے مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے کیا فائدہ؟

اخیر میں میں کہہ سکتا ہوں کہ ہر ایک ممبر ضرور کسی نہ کسی نیک کام میں دلچسپی لے اور اپنے مفید تجربات سے دوسروں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔

بائسداور سومات بد

- ۱۔ گھر میں تازہ ہوا کے آنے اور گندی ہوا کے خارج ہونے کا مکمل انتظام ہونا چاہیئے۔ ہر ایک کمرہ میں کھڑکیاں اور روشندان رکھے جائیں۔ تازہ ہوا کا خوف جو جاہل لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا ہے باہر نکال دیا جائے۔ اور مضر صحت زیورات کا ترک کر دینا لازمی امر ہے۔
- ۲۔ لوگوں کی توجہ باولیوں کو صاف ستھرا رکھنے کی طرف مبذول کرائی جائے اور ذیلدار اور مدر کے استاد اصحاب کو پانی کے ذخیروں کے صاف رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ پینے کے پانی کا چشمہ علیحدہ ہونا چاہیئے۔ اور لوگوں کو وہاں نہانے اور کپڑے دھونے سے منع کر دینا چاہیئے۔
- ۳۔ لوگوں کو ہدایت کی جائے کہ بیماری کی حالت میں فوراً نزدیک کے ہسپتال میں جا کر باقاعدہ علاج کرانا چاہیئے۔ مریض کا جس طرح باقاعدہ اور خاطر خواہ علاج ہسپتال میں ہو سکتا ہے گھر پر نہیں ہو سکتا اگر حکیم سے ہی علاج کرنا منظور ہو تو لائق حکیم اور وید کی تلاش کرنا ضروری ہے نیم حکیم اور جادو ٹوٹے کرنے والوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔
- ۴۔ بچہ کی ولادت کے وقت ہسپتال کی دایہ کو بلا لینا چاہیئے۔ یا دایوں کی ٹریننگ کا مناسب انتظام کیا جائے۔ تاکہ ہر جگہ مناسب طور پر بچہ کی پیدائش کے وقت زچہ اور بچہ کا خاطر خواہ خیال رکھا جائے۔

۵۔ بچوں کو نزدیک کے سکول میں سیکر تعلیم سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور کوشش کرنی چاہیئے

کہ علاقہ کے سو فیصدی بچے سکولوں میں بیٹھ کر لکھنا اور پڑھنا سیکھ جائیں۔ سکول کا وقت ضرورت کے مطابق تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ شادی کے بائے میں شارما ایکٹ پر عمل درآمد کیا جائے۔ اسی سے ہماری بہت سی سوشل برائیوں کا انسداد ہو سکتا ہے۔

۷۔ گاؤں کے باہر بہت دو۔ فاصلہ پر دفع حاجت۔ سے فارغ ہونا چاہئے۔ اور پانا خانہ کو مٹی یا ریت سے ڈھانپ دیا جائے جس گاؤں میں خاک روپ نہ ہوں اور عورتیں گھروں سے باہر نہیں جاسکتیں انہیں چاہئے کہ گھر کے نزدیک کھیٹ میں ایک خندق کھود کر اس کے ارد گرد ایک غارنی پردہ لگوالیں اور گھر میں اصول بتا دیں کہ دفع حاجت کے بعد پانا خانہ کو مٹی یا ریت سے ڈھانپ دیا جائے۔ ایک خندق کے بحر جانے پر دوسری خندق کھود لی جائے۔ اور اسی پردہ کو طہاں سے اٹھا کر نئی خندق کے ارد گرد لگا لیا جائے۔ اگر ہر ایک گھر میں ایسا انتظام ہو جائے تو مکانات اور گاؤں کا گرد و نواح صاف ستھرا رہ سکتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور اس پر چند مال خرچ بھی نہیں ہوتا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان باتوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

نمونے کے گاؤں کی ضرورت

انگلستان اور یورپ میں امیر لوگ فرصت کے دنوں میں سیر و تفریح اور کچھ دنوں کے قیام کے لئے دیہات میں چلے جاتے ہیں۔ آب و ہوا کی تبدیلی اور قدرتی مناظر سے فائدہ اٹھا کر پھر اپنے کاروبار کے لئے شہروں میں آ جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں گاؤں کے باشندے بھی فراغت ملنے پر تبدیلی آب و ہوا کے لئے کسی دوسرے مبدائی شہر یا متبرک جگہ یا پہاڑی بستی ہی کا رخ کرتے ہیں۔ کیونکہ گاؤں میں کوئی تفریح طبع کا سامان نہیں ملتا۔ سوائے شگستہ جھونپڑوں۔ گندے مکانات۔ گرد و نواح میں بکھرے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور جہالت پسند اور لہنی گری ہوئی حالت پر ناز کرنے والے لوگوں کے اور کچھ دیکھنے میں نہیں آتا۔ نہ وہاں کوئی باغیچہ نہ اعلیٰ درجہ کا سکول نہ لائبریری اور نہ کوئی کلب نہ فراخ خانہ و شفا خانہ نہ بیمار خانہ نہ کوئی بینک نہ زر امتی فارم اور نہ کسی خاص دستکاری کا شغل ہے غرضیکہ کوئی بھی ایسی چیز دیکھنے میں نہیں آتی جس سے ایک تعلیم یافتہ آدمی دل لگا کر کچھ دن گاؤں میں قیام کر سکے یعنی خاص وجہ ہے کہ ہر ایک خواندہ آدمی چاہتا ہے کہ گاؤں کی بجائے کسی شہر میں ہی مکان بنالگ کر رہے۔ اس رو کو روکنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ لوگوں کی طبیعت کے میلان کو گاؤں کے سدھار کی طرف لگایا جائے

اور ایسی اصلاحات رائج کی جائیں جن سے ہمارے گاؤں بھی انگلستان کے گاؤں کی طرح صحت افزا اور دلکش بن جائیں تاکہ تعلیم یافتہ اور متمول لوگ بھی ان میں باہرام اپنی فرصت کا وقت گزاریں۔
 اخیر میں استدعا کی جاتی ہے کہ آج کل کے امن و عین اور ترقی کے زمانہ میں ہر ایک آدمی کو بہترین کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے گاؤں میں مذکورہ بالا مفید باتوں کو رائج کرے تاکہ یہ تمام مفید باتیں عملی جامہ پہن کر تمام ملک اور قوم کے لئے بہبودی و ترقی کا باعث ہوں اور ملک میں رنج و غصہ کی بجائے شادمانی اور خوشحالی کا دور دورہ ہو اور دنیا کی مذہب و شائستہ قوموں کے ساتھ ساتھ ہم بھی ترقی پر گامزن ہوں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

نہ اے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
 نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

نمخانہ ریاض

وعدہ کبھی سچا کوئی کرتا ہی نہیں ہے
 دامن کی شکن دم سے پینی ہے بلایں
 دامن سے قوم کے سینوں کے چرخ ہی اچھے
 سچ لکھے اُسکو ترے عہدِ ستم میں
 جو اُنکی طاقت نہیں کھتے ہیں نفس سے
 اک ختم۔ نہ کہ سوا اہل جاتی ہو جس سے
 کیا چیر بیدار بادہ کشا! موسم گل بھی
 اپنے ستم و جور اسے لاکھ کھاؤ
 آلودہ تہمت ہو دم کیا رنگِ خناسے
 الجھن کبھی مٹی نہیں یہ بول ہی کہ یارب!
 مٹ ہی کے اے آہ بلائے تو ان کو

نکھر اٹھا جب تک نہ کوئی بام پر آوے
 ہلک شوقِ شام نکھرتا ہی نہیں ہے

کلامِ نفس

(از جناب مہاراجہ ہریش چندر سنگھ جی، نئی دہلی، ۱۹۳۱ء)

ارضِ حرم میں سنتے ہیں بے قادت آب کی ساقی وہاں بھی نہر بہا دے شراب کی
ساقی لگا فے برف میں بوتل شراب کی بے چین کر رہی ہے تپش آفتاب کی
ڈورے نہیں ہیں آپ کی آنکھوں میں سرخ دامن میں خورکے ہیں یہ شاخیں گلاب کی
رہمت نے بڑے میرے گناہوں کو لے لیا کیا دم بخود کھڑی رہی میزبانِ حساب کی
بے خال رخ سے مارِ وشن کی آبِ تاب عزت بڑھائی دزہ نے کیا آفتاب کی
ساقی کی آرزو میں جو انجسار ہوں ابرِ مرہ سے ہوتی ہو بارش شراب کی
نہایت جو بادہ خواروں کی یوں ہو تو لطفائے دل کی جگہ نبل میں ہو بوتل شراب کی
دیرانے کرم کا جو آنے کا جو شش پر بہتی پریں گی حشر میں فردی حساب کی
کیا مل گئی ہے خاک میں موتی سی آبرو مٹی خراب ہو گئی چشم پر آب کی
بے دخت رزے چوری چھپے ہم کو ساز باز یہ بھی ہے اک انگلیاں یہ شباب کی

خمنائے جلیں کا یہ فیض ہے نفس

ٹپکی ہیں ابرِ کلکے بوندیں شراب کی

شہر آگرہ

جہانگیر کے عہد میں

(از جناب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے پتی ایچ ڈی)

اکبر اور جہانگیر کے عہد سلطنت میں یورپین سیاح اور تاجر کثرت سے ہندوستان آتے تھے اور یہاں کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں انگریزوں، ہولینڈیوں اور ولنڈیوں کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ انہی یورپیوں میں ایک شخص فرانسسکو پلیرٹ ہالینڈ کا رہنے والا آگرے میں ایک تجارتی کوٹھی کا منجر تھا۔ یہ شخص جہانگیر کے زمانے میں ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آیا اور تقریباً آٹھ برس آگرے میں مقیم رہا۔ ایک مختصر سی کتاب میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس نے اپنے زمانہ قیام کے تجارتی حالات کی رپورٹ لکھی ہے۔ اسی میں ایک باب شہر آگرہ پر بھی ہے اور گو وہ مختصر ہے تاہم چونکہ ایک یورپین کے قلم سے ایک اپنی آنکھوں دیکھی چیز کا بیان ہے لہذا تاریخی نکتہ نظر سے اس کا مطالعہ فائدہ دہندہ بھی سے خالی نہ ہوگا۔ ہم خاص اس باب کے مطالب کو فائدہ عام کی غرض سے یہاں پر دہراتے ہیں۔

شہر آگرہ ۲۸، ۴۵ عرض البلد پر واقع ہے، وسعت میں یہ شہر بجد بڑا ہے لیکن عمارات اکثر کمزور ہیں اور شہر کے گرو فیصل نہیں ہے، بازار اور مکانات بھی کسی باقاعدہ ترتیب سے نہیں بنے ہیں۔ اس میں شگ نہیں کہ بہت سے امرا اور شہزادوں کے عالی شان محل جا بجا موجود ہیں لیکن وہ اکثر گوشوں اور گلیوں میں پوشیدہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہر آگرے کی ترقی آٹا فائنا ہوئی۔ پہلے وہ علاقہ بیانہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اکبر نے ۱۵۶۶ء میں اسے اپنی رہائش کے لئے پسند کیا اور جہانگیر کے کنلے اس نے ایک عالی شان قلعہ تعمیر کرایا۔ جہانگیر کے پاس بہت ہی اور چوڑائی میں تقریباً نصف میل ہے۔ باغات کی شادابی کی وجہ سے شہر ایک شاہی چستان معلوم ہوتا ہے۔ بہر شخص اپنے لئے کوئی قطعہ زمین جو اسے پسند ہو یا اس کی ضروریات کے لئے موزون ہو خرید سکتا ہے۔ اسی وجہ سے شہر میں بہت بڑے بڑے قابل دید بازار نہیں ہیں، جیسا کہ لاہور، برہان پور، احمد آباد یا دوسرے شہروں میں ہیں۔ شہر میں آبادی بہت گنجان ہے اور ہندو مسلمان امیر اور غریب سب ملے جگہ رہتے ہیں۔ اگر کہیں بادشاہ محضر (جہانگیر) بھی اپنے والد اکبر کی طرح اپنی قیامگاہ یہیں رکھتا تو شہر آگرہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا لیکن اسے بھی شہر کی روز افزوں ترقی کا یہ حال ہے کہ جو دروانے اکبر نے شہر کی حفاظت کی خاطر تعمیر کرائے تھے یعنی ماری یاداری دروازہ، چار سودروازہ، نیم دروازہ، پتو دروازہ اور ٹوری دروازہ وغیرہ وہ اب شہر کے وسط میں

آگئے ہیں اور ان کے باہر جوئی عمارتیں بنی ہیں وہ شہر کے اندر ولی سقبے سے تین گنا جگہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔
شہر کا عرض اس کے طول سے بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص نے دریا کے کنارے پر مکان
بنوانے کی کوشش کی ہے اور بالخصوص امرا کے پیش بہا اور عالی شان علات تو سب دریا کے کنارے پر ہیں جس کی
وجہ سے وہاں کا منظر بچہ خوشگما ہو گیا ہے، یہ عمارتیں دریا کے کنارے کناسے چھ کوں تک چلی گئی ہیں، ہم ان میں
سے بڑے بڑے علات کے نام ترتیب وار بتلاتے ہیں:-

شمال کی طرف سے شروع کر کے (دریا کے دہنے کنارے پر) پہلے بہادر خاں کا محل ہے، بہادر خاں قلعہ امیر گڑھ
کا حاکم تھا جو برہان پور سے پانچ سو کے فاصلے پر ہے، اس کے بعد راجہ بھونج کا محل ہے جو رائے تن موجودہ
گورنر برہان پور کا باپ تھا۔ رائے تن پنہجھڑاری منصب رکھتا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم خاں (دس ہزاری) کا
محل ہے، پھر رستم خاں قندھاری (پنہجھڑاری) کا، پھر راجہ کشن داس (دس ہزاری) کا، پھر اعتقاد خاں (پنہجھڑاری) کا
جو آصف خاں کا سب سے چھوٹا بھائی ہے، پھر شہزادہ خانم (جہانگیر کی بہن) کا جو مظفر خاں شاہ گجرات سے
بیابا ہی تھی، اس کے بعد جہانگیر کی ماں کا، اس کے بعد خواجہ محمد طاہر (؟) دو ہزاری کا، پھر خواجہ شیخ کا جو پہلے سلطان
خرتم کا داروغہ مطیع تھا، اس کے بعد وزیر خاں پنہجھڑاری کا، اس کے بعد شیخ پورہ (یا سنگھ پورہ) ایک بہت وسیع
چار دیواری ہے جس میں شاہ ماضی (اکبر) کی سیکیات رہتی ہیں۔ پھر اعتبار خاں خواجہ سرا کے علات ہیں جو اکبر
کی وفات کے وقت آگرے کا گورنر تھا، اس کے بعد باقر خاں سہ ہزاری کا محل ہے پھر مرزا ابو سعید ہزار و
پانصدی کا، پھر آصف خاں (ہشت ہزاری) کا جو ان تمام علات میں سب سے شاندار اور بیش قیمت ہے پھر
اعتقاد الدولہ پنہجھڑاری کا، پھر خواجہ عبد (ابو؟) الحسن پنہجھڑاری کا، پھر قادی سلطان بیگم (جہانگیر کی بہن) کا،

اس سے آگے شاہ برج (قلعہ آگرہ) شروع ہوتا ہے جس کی دیواریں سورج پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور بلندی میں تقریباً
اٹھارہ گز ہیں۔ قلعہ کا گھیر دو کوس کے برابر ہے عمارت کی شکل اور بیش قیمتی کے لحاظ سے وہ دنیا بھر کی بہترین عمارتوں
سے سبقت لے گیا ہے۔ اس کا جائے وقوع ایک اوسط درجے کی بلند زمین پر ہے اور ہر سمت سے اس کا منظر
خوشگما ہے لیکن بالخصوص دریا کی جانب کا رخ نہایت بڑھ عظمت ہے اس طرف اس کی عمارت پتھر کی جالیوں سے
مزیں ہے اور کھر کیوں پر سنہری کام کیا گیا ہے۔ بادشاہ جب ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھتا تھا تو انہی کھر کیوں
میں اگر بیٹھتا تھا۔ قلعے کے اندر ننھوڑے فاصلے پر شاہی مسلمان ہے جو نہایت قیمتی سفید سنگ مرمر کا بنا ہے۔
اس کے اندر نشست کی چوکیاں زمین سے اونچی بنائی گئی ہیں۔ ان کے اوپر گنبد بنے ہیں جن کے باہر کی جانب
سونا منٹھا ہوا ہے۔ ان گنبدوں کا منظر دُور سے اور نزدیک سے شانہ جہاد و جلال پر دلالت کرتا ہے۔ اس

لے لیکن تاریخ میں قادی سلطان بیگم اکبر کی بیٹی کا نام نہیں ملتا

سے پرے نورجہاں بیگم محل ہے۔ قلعے کی چار دیواری کے اندر کی سب جگہ شاہی محلات سے پُر ہے اور کہیں کوئی جگہ خالی نہیں۔ انہیں محلات میں مریم مکانی دجہانگیر کی والدہ کا بھی محل ہے۔ تین محل خاص بادشاہ کے ہیں جن میں سے ایک کا نام اتوار ہے۔ ایک کا منگل اور ایک کا سنچر، ان میں سے جو محل جس دن کے نام پر ہے اس دن کو بادشاہ اُس محل میں سوتا ہے۔ ایک پانچواں محل بنگالی محل کے نام سے موسوم ہے اس میں مختلف ممالک اور اقوام کی خواتین رہتی ہیں۔ قلعہ اپنی چار دیواری کے اندر ایک شہر کی مانند ہے جس میں بازار ہیں، دکانیں ہیں اور قلعے سے اس کی کوئی مشابہت معلوم نہیں ہوتی لیکن جب اسے باہر سے دیکھا جائے تو وہ ناقابلِ تغیر نظر آتا ہے۔

قلعے سے گزر کر آگے نکلتے ہیں یہ ایک بہت بڑی منڈی ہے جہاں صبح کے وقت گھوڑے، اونٹ، بیل، خیمے، سوتی کپڑے اور بہت سی دوسری اشیاء فروخت ہوتی ہیں، اس سے آگے بعض اور امراء کے مکان ہیں۔ جن میں خانِ اعظم کے بیٹے مرزا عبداللہ (دس ہزاری) کا مکان ہے، پھر آغا نور دس ہزاری کا جو شاہی افواج کا سپہ سالار ہے۔ پھر جہان خاں (دو ہزاری) کا۔ پھر مرزا خرم پسر خانِ اعظم (دو ہزاری) کا۔ پھر مصابت خاں ہشت ہزاری کا۔ پھر خانِ عالم (پنچ ہزاری) کا۔ پھر راجہ بھاسنگھ (دس ہزاری) کا۔ پھر راجہ مان سنگھ (انجھائی زچہ ہزاری) کا۔ پھر راجہ ماوہو سنگھ (دو ہزاری) کا۔

دریا کے دوسرے کنارے پر شہر سکندریہ ہے جس کی عمارتیں بہت خوبصورت ہیں اور بہت بار و فقا ہے۔ اس میں زیادہ آبادی دکاندار نہیں کی ہے۔ پورب سے اور بھوٹان کے پہاڑی علاقے سے جتنا تجارتی مال آگرے میں آتا ہے وہ سکندریہ میں سے گزرتا ہے اس میں سوتی مال بنگال سے آتا ہے اور ریشم پٹنہ سے، اس کے علاوہ منبل رومی گہنا زنگار، بادیاں، سوٹھ اور ہزار ہا قسم کی دواؤں اور جڑی بوٹیاں ہیں جن کی تفصیل احاطہ مبیان سے باہر ہے۔ یہاں نورجہاں بیگم نے ایک سرٹائے تعمیر کرائی ہے۔ اُس کی طرف سے یہاں سرکاری عہدہ دار تین ہیں جو ہر قسم کے تجارتی مال پر محصول وصول کرتے ہیں۔ محصول ادا کرنے کے بعد سارا مال کشتیوں پر لاؤ کر اگر وہ روانہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا غلہ، گھی اور دیگر مشیائے خوردنی پورب سے آگرے میں آتی ہیں۔ اگر یہ سارا مال باہر سے نہ آئے۔ تو آگرے کے لوگوں کو خوراک بہم نہ پہنچ سکے اور شاید وہ ناقوں سے ہلاک ہو جائیں۔ اس تمام مال کے در آمد کی وجہ سے سکندریہ میں آمد و رفت بکثرت رہتی ہے۔ یہ شہر طول میں دو کوس تک چلا گیا ہے لیکن اس کا عرض کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ اس میں بہت سے خوشنما باغ ہیں جن میں سے ایک باغ سلطان پرویز کا ہے ایک نورجہاں بیگم کا اور ایک عطاء اللہ کا جو آصف خاں اور نورجہاں کا والد تھا۔ وہ یہیں مدفون ہے اور اس کا مقبرہ آجکل زیرِ تعمیر ہے۔ اس پر ساٹھ سے تین لاکھ روپے خرچ آچکا ہے اور مکمل ہونے تک تخمیناً دس لاکھ کا خرچ اس پر اور ہوگا۔ سوویلیغ اور ہیں جو خود لے یہ سکندریہ نہیں ہے جہاں اکبر کا مقبرہ ہے۔

بادشاہ کے ہیں۔ ایک کا نام چارباغ ہے اور دوسرا موتی محل۔ بہت سے اور بھی ہیں جن کے گرد خوبصورت چار دیواریاں اور عالی شان دروازے بنے ہوئے ہیں اور باہر سے یہ باغات قلعے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے شہر بہت باذیب ہے۔ ہندوستان کے امرا اپنی عظمت و شان میں ہٹلے ہاں کے امرا سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ باغات جیسے جی اُن کی تفریح گاہیں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد وہ انہیں میں دفن ہوتے ہیں اور یہاں وفات وہ اپنے شاندار مقبرے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرا لیتے ہیں جن کی عمارت عموماً بارغ کے عین وسط میں ہوتی ہے۔ اس قسم کے مقبروں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کو بالتفصیل بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

* گلستان سخن *

یہ بتقدیر ہے کہ برابر محبت میں ہوں آپ کوئی شکایت نہ شکو مجھ کو
مرے ساتی کے تصور نے نہ بکھینچیں اب تو قطرہ بھی نظر آتا ہے دریا مجھ کو

داؤد قادی

ڈوبا ہوا ہوں یا دینِ موش میں گم فراق میں مستِ مخیاں کی آپ کو کچھ خبر نہیں
شعلہ شمع طور نے پروئے جو تھے اٹھا دئے سوختہ جمال کی آپ کو کچھ خبر نہیں
گردِ شہنشاہِ گنبدِ نقشِ حیاتِ موسیٰ موت کی درواں کی آپ کو کچھ خبر نہیں
زلفِ سیاہ کے وصف میں موتی پر موشگانیاں کھینچتی ہر کھالِ بال کی آپ کو کچھ خبر نہیں

داقت جنیل

تعلیم خرافیہ میں کھلے میدان میں کام کرنے و سیر و سیاحت کرنے کی اہمیت

اجتہاد لائے صاحب لالہ سوہن لال بی اے۔ بی ٹی۔ پی ای ایس سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

خرافیہ مشاہد کا علم ہے۔ مقامی خرافاتی حالات جن کو ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس پر خرافیہ تعلیم مبنی ہے۔ اگر مینیا و کمزور ہو۔ تو عمارت مستقل اور مضبوط نہیں بن سکتی۔ ہم دوسرے ملکوں کا خرافیہ صرف اپنے کرد و نواح کے تجزیے کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جتنا ہم اپنے خرافیہ سے زیادہ واقف ہونگے۔ اتنا ہی ہم دوسرے مقامات کا خرافیہ سمجھیں گے۔

لاہور کے سکولوں کا معائنہ کرتے وقت میں نے اکثر طلباء پوچھا ہے۔ کہ لاہور کے نقشہ پر فیروز پور والی سڑک دکھلائیں۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن جب میں نے ان سے پوچھا کہ اپنے سکول سے فیروز پور کو جانے والی سڑک دکھلائیں۔ تو کوئی لڑکا نہیں دکھا سکا۔ اگر طلباء نقشہ سے اس سڑک سے نہ دکھلائیں۔ تو نقشہ کا کیا فائدہ؟ وجہ یہ ہے کہ لڑکوں کو اصلی سڑک دکھا۔ نہ سے پہلے ان کو چھپا ہوا نقشہ دکھلایا جاتا ہے۔ جب تک کہ ہم اصلی نہیں کہنت۔ سڑکیں۔ دریا۔ عمارات اور سکول سے ان کا محل وقوع نہ دکھائیں لڑکے نقشہ کا صحیح مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مقامی خرافیہ پر اہمیت دینے سے ہم لڑکوں کو نقشہ سمجھنے کے قابل بنادیتے۔ طلباء مقامی خرافہ کا مطالعہ کرنے سے خرافہ کے اصول سمجھ سکتے ہیں۔

بنائات اور آب و ہوا کا انسان کے پیشوں پر اثر طلباء ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ جب تک کہ اس کا اثر اپنے گرد و نواح میں نہ دیکھ لیں۔ ان کو مختلف قسم کی مٹی اور ان فصلوں کا جو اس مٹی میں پیدا ہوتی ہیں درست تصور نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ ایسی مٹی خود نہ دیکھ لیں۔ زبان رٹ لینے سے کہ گزرم کے لئے چکنی زرخیز مٹی اور آس کے لئے کالی مٹی کی ضرورت ہے۔ کچھ فائدہ نہیں جب تک کہ ایسی مٹی کو دیکھنے کا موقع نہ ملے۔ لڑکوں کو موسموں کی تبدیلی کے اسباب ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ جب تک کہ عودی چھڑی کے سایہ کی مدد سے یہ خود معلوم نہ کریں۔ کہ دپہر کے وقت سورج ہمیشہ ایک ہی بلندی پر نہیں رہتا۔ کبھی یہ آسمان میں بہت

اوپنچا پوسٹ اور کبھی بہت نیچا۔

تعلیم کا منشا زندگی کے لئے تیار کرنا اور عمدہ شہری بنانا ہے۔ جغرافیہ اس مقصد کے حصول میں باقی مضامین سے زیادہ مدد دیتا ہے۔ پرائمری سکولوں میں سیاست مڈن (Middlen) پڑھانے اور اس طرح طلباء میں نیک شہری بننے کی بنیاد ڈالنے کے لئے مقامی جغرافیہ خاص ذریعہ ہے۔ گرد و زواح کے کھیتوں میں جا کر اُستاد و سڑکوں، پلوں ریلوں، نہروں اور پانی کے تالابوں کی اہمیت طلباء کے دل پر نقش کر سکتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی معدوم کر دیا جائے۔ تو تمام قوم کو کتنا نقصان ہوگا۔ (اس سے طلباء کو بتایا جائے کہ) اُن کو کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہئے۔ جس سے ان کسی قسم کا نقصان ہو۔ بلکہ ان کے قائم رکھنے میں کوشاں رہنا چاہئے۔ سینے اکثر طلباء کو دیکھا ہے کہ پانی کے پمپ کو استعمال کرنے کے بعد کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اُستاد اپنے طلباء کی توجہ اس پانی کی مقدار کی طرف مبذول کریں۔ جو اس طرح ضائع جاتا ہے۔ اور اگر تمام پمپ کھلے چھوڑ دیئے جائیں۔ تو کس قدر نقصان ہوگا۔ اور اُن کے فالوین کو پانی حاصل کرنے میں کس قدر زیادہ روپیہ ادا کرنا پڑیگا۔ اگر طلباء اس بات کو محسوس کریں تو پمپ کو کبھی کھلا نہ چھوڑیں گے۔ اگر گاؤں میں کوئی چشمہ یا کواں ہو۔ تو اُستاد سیر کے دوران میں طلباء پر اسے صاف رکھنے کی ضرورت نقش کر سکتا ہے۔ اگر اُن کی ذرا سی غفلت سے پانی میں کچھ جراثیم داخل ہو جائیں تو ہیضہ یا دوسری بیماریاں پھیل جائیں گی اور تمام لوگوں کو بہت نقصان ہوگا۔

مقامی جغرافیہ پڑھتے وقت طلباء بعض نتائج خود اخذ کر لیتے ہیں۔ اس طرح اُن میں خود اعتمادی اور معمولی حالت میں درست کام کر لینے کی عادیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اُسندہ زندگی میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔

مختصر مقامی جغرافیہ کی تعلیم اور کھلے میدان کی سیر مندرجہ ذیل وجوہات سے لازمی ہے۔

(۱) یہ بنیاد ہے جس پر جغرافیہ کا محل بنایا جاتا ہے۔

(۲) یہ مختلف قسم کے نقشہ جات سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جو اُسندہ زندگی میں مفید ہوتے ہیں۔

(۳) یہ جغرافیہ کے اصول سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

(۴) یہ طلباء کو سائنس سمجھنے میں اور چھ شہری بننے کی تربیت دیتی ہے۔

(۵) یہ طلباء میں خود اعتمادی کا وصف پیدا کرتی ہے۔

مقامی جغرافیہ کی تعلیم سب جماعتوں میں ہونی چاہئے۔ ابتدا میں یہ طلباء کو جغرافیہ کا صحیح تصور قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اُن کی کلاسوں میں یہ اور بھی لازمی ہو جاتی ہے۔ ہائی کلاسوں میں جانے تک طالب علم دُنیا کے جغرافیہ کی کوئی کوئی باتیں پڑھ چکتا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ کہاں تک قدرتی وسائل مثلاً مٹی، معدنیات پانی کی طاقت۔ جنگلات وغیرہ یورپ و امریکہ کے ملکوں میں کام میں لائے گئے ہیں۔ اب اسے معلوم ہو جائیگا کہ

کون سے قدرتی وسائل اس کے اپنے ملک میں موجود ہیں۔ اور یہاں تک اُن کو کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اگر طالب علم خود بخود سوچنا شروع کر دے تو آئندہ زندگی کے کام کے لئے ایک اچھی بنیاد قائم ہو جاتی ہے۔

جغرافیہ پڑھاتے وقت کھلے میدان کا کام (۱) سکول کے احاطہ میں (۲) سکول کے نواح میں (۳) اور (۴) دور کی جگہوں میں ہو سکتا ہے۔

ایسے کام کا وقت۔ یہ کام کچھ تو سکول کے وقت میں کچھ بعد ازاں۔ یا آدمی چھٹی یا کسی تعطیل کے دن ہو سکتا ہے۔

۱۔ انفرادی طور پر یہ کام اکثر تعطیل کے دن ہی ہو سکتا ہے۔

۲۔ میدان کا کام جو سکول کے احاطہ میں ہو سکتا ہے (۱) بارش کے بعد کھیل کے میدان کا مشاہدہ اگر ریت کا ایک چمکڑا میدان کے ایک کونہ میں ڈال دیا جائے۔ تو بارش کا اثر زیادہ نمایاں ہو گا۔

طلبا کی توجہ ان امور ات کی طرف مبذول کرائی جائے۔ کہ (۱) پانی اونچی جگہ سے نشیب میں بہتا ہے۔

(ب) دریا۔ اس کا دایاں کنارہ۔ بیاباں کنارہ۔ محاذ۔ فاصل آب۔ طاس آب کا تصور۔

(ج) بارش کا پانی زمین پر بہتے وقت اپنے ساتھ مٹی بہائے جاتا ہے۔

(۲) ان گڑھوں کا مشاہدہ جن میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ جب پانی خشک ہو جاتا ہے تو مٹی کے تین جزو (بجری۔ ریت۔ مٹی) صاف طور پر دکھائے جاسکتے ہیں۔ بجری سب سے بھاری ہونے کے سبب سب سے پہلے نیچے بیٹھتی ہے۔ بعد ریت اور اخیر میں نرم مٹی۔ مٹی کے دوسرے اجزا پانی اور نباتی مادہ ہیں۔ جو کوئی سا ٹکڑہ زمین کھودنے سے بہ آسانی دکھائے جاسکتے ہیں۔ جس مٹی میں ریت کی مقدار زیادہ ہو ریتلی مٹی کہلاتی ہے۔ اور جس میں نرم مٹی زیادہ ہو۔ چکنی مٹی۔ اور جس مٹی میں نباتی مادہ زیادہ ہو اسے (humus) کہتے ہیں اور یہ عموماً کائے رنگ کی ہوتی ہے۔

(۳) ہموار زمین پر جہاں سورج تمام دن چمکتا ہے۔ عمودی چھڑی کے سایہ کا مشاہدہ۔

سایہ کی سمت اور لمبائی میں مختلف تبدیلیاں مشاہدہ کرائی جائیں۔ ان کی مدد سے ہم چار جانب (شمال مشرق۔ جنوب مغرب) نصف اتہار۔ سورج کا روزانہ سفر۔ مقامی اور سینٹرل ٹائمز (وقت کا فرق) مختلف تاریخوں میں دوپہر کے وقت سورج کی بلندی۔ مختلف ہمینوں میں سورج کے طلوع و غروب کی ٹھیک جگہ وغیرہ پڑھا سکتے ہیں۔ اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ یہ صرف جزو اُدرست ہے۔ سورج سال میں صرف دو دن عین مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ اور عین مغرب میں غروب ہوتا ہے۔

(۴) قطبی ستارہ کا مشاہدہ۔ شمالی نصف کرہ میں یہ ہمیں ٹھیک شمال اور کسی مقام کو غرض اہلہ معلوم کرتے

میں مدد دیتا ہے۔

(۵) موسم کی معمولی تبدیلیوں کا مشاہدہ۔ زیادہ سے زیادہ (maximum) اور کم از کم (minimum) درجہ حرارت۔ گیلے اور خشک بلب (globe) والے تھرمیا میٹر پر درجہ حرارت پڑھنا۔ ہوا کا دباؤ۔ ہوا کی سمت اور بارش کا روزانہ بغور مشاہدہ کرنا چاہئے۔ اور ان کو کتاب میں درج کرتے رہنا چاہئے۔ اگر طلباء ان باتوں کا مشاہدہ سارا سال نہ کر سکیں۔ تو کم از کم جنوری و جولائی کے مہینوں میں تو ضرور کرنا چاہئے۔ ان کی مدد سے ہم روزانہ۔ ماہانہ و سالانہ اوسط درجہ حرارت اور ہوا کا دباؤ پڑھا سکتے ہیں۔ اور درجہ حرارت دہوا کے دباؤ میں تعلق۔ بارش اور درجہ حرارت میں تعلق۔ بارش پر ہواؤں کا اثر طلباء کے ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ اپنے نگاہوں یا بشر کی آب دہوا کے متعلق درست تصور ہونے سے طلباء مقابلہ و تناسب سے دوسرے ملکوں کی آب دہوا بھی سمجھ سکتے ہیں۔ گرم۔ سرد۔ بارش۔ خشک۔ نمض مقابلہ کی اصطلاحات (Relative Humidity) ہیں۔ ان کا مطلب صرف کسی مقام کی آب دہوا دیکھنے سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ اس قسم کا عملی کام کئے بغیر آب دہوا کے متعلق طلباء کے تصورات بہت سطحی رہتے ہیں۔

سکول کے نواح میں باہر کا کام

(الف) زمین کی مختلف قسم کی سطح اور اس کی خصوصیات کوؤں۔ سڑکوں۔ نہروں۔ دریا۔ ریلوے لائن مشہور عمارات وغیرہ کا محل وقوع اور ان کا چھپے ہوئے نقشہ سے مقابلہ کرنا۔ تاکہ طلباء نقشہ کا مطلب سمجھنے کے لائق ہو سکیں۔ (ب) دریا کے کام کا مشاہدہ۔ جہاں تک ممکن ہو سکے۔ دریا کو سب سے اونچی جگہ سے مشاہدہ کرو۔ اور بتاؤ کہ (۱) اس کی گزرگاہ ہمیشہ ٹیڑھی ہوتی ہے۔ کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔

(۲) کس طرح ایک کنارہ (پانی سے) ٹوٹ رہا ہے اور مقابلہ کا کنارہ نئی مٹی سے بن رہا ہے۔

(۳) ہر جگہ دریا کی رفتار یکساں نہیں۔

(۴) کس طرح لوگ دریا پر آمد و رفت کرتے ہیں؟

(۵) کہاں پر دریا میں آبشار ہیں یا رفتار تیز ہے اور کیوں؟

ان امور کا مشاہدہ نواح میں رہنے والے لوگوں کے پیشوں پر ہوتا ہے۔ اسے اچھی طرح واضح کرو

شمالی ہندوستان کے دریاؤں کے متعلق (پڑھاتے وقت) طلباء کی توجہ مندرجہ ذیل سوالات پوچھنے کی طرف نگائی جائے۔

(۱) کیا یہ دریا سارا سال بہتا ہے یا صرف ایک موسم میں۔

- (۲) اگر یہ سارا سال بہتا ہے تو کیا پانی کی مقدار سال بھر یکساں رہتی ہے۔
 (۳) اس میں کب طینی آتی ہے۔ طینی کے بعد کتا دلوں پر کیا رہ جاتا ہے۔
 (۴) دریا سے کون کون سے فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔
 (۵) اور کون سے فوائد تم تجویز کرتے ہو۔

(ج) موسلا دھار بارش کے بعد دکھاؤ کہ بارش کا پانی ہوا زمین کی نسبت ڈھلان زمین کو زیادہ بہا کر لے جاتا ہے اور یہ بے گیارہ زمین سے زیادہ مٹی بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ نسبت اس زمین کے جہاں گھاس یا درخت اگے ہوں۔ یہ بھی واضح کرو کہ یہ بات پہاڑ کے دامن میں رہنے والے لوگوں کی زندگی پر بہت اثر ڈالتی ہے۔
 مویشیاں اور گجرات کے ضلعوں میں برسات کے موسم میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ندی نالے پہاڑ کی ڈھلوانوں پر سے تیزی بہتے آتے ہیں۔ یہ نالے مٹی بہا کر لے جاتے ہیں اور بہت سارے قصبہ بنجر بنا دیتے ہیں اور ان زمین کے مالکوں کو غریب کر دیتے ہیں۔ اگر پہاڑ کی ان ڈھلوانوں پر گھاس اگائی جائے تو یہ نالے کوئی نقصان نہیں کر سکتے اس لئے دیہاتی لوگوں کے لئے یہ لازمی ہے کہ گھاس کو جڑوں تک کھائے جانے سے محفوظ رکھیں۔ انہیں اپنے مویشی اور بھیروں کو اس رقبہ پر نہ چرنے دینا چاہئے۔ بلکہ گھاس کو درختی سے کاٹ کر مویشیوں کے لئے بطور چارو استعمال کرنا چاہئے۔ ایسا کرنے سے گھاس کی جڑیں قائم رہتی ہیں۔ اور اگر بھیڑ بکریوں کو اس رقبہ پر چرنے دیا جائے۔ تو وہ گھاس کو جڑوں تک کھا جاتی ہیں۔

(د) نواح کے کھیتوں میں فصلوں کا مشاہدہ۔ ایک ہی کھیت کو کم از کم تین بار دیکھا جائے۔ تمام مشہور فصلوں کے پونے اور کاٹنے کے اوقات۔ وسائل آبپاشی اور کھاد اندازی اور مٹی کی قسمیں نوٹ کرنا ضروری ہے۔ کونسی فصلیں سیراب شدہ رقبوں میں پائی جاتی ہیں اور کیوں کن فصلوں میں کھاد ڈالا جاتا ہے۔ کیا (ایک کھیت میں) مختلف فصلیں بدل کر پائی جاتی ہیں۔ کھیتوں پر کون سے جانور رکھے جاتے ہیں۔ کھیتوں سے منڈی تک فصلیں کس طرح لائی جاتی ہیں۔ پیداوار بڑھانے اور فصل اعلیٰ قسم کی اگانے کے لئے کونسی تجاویز پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ چند سوالات ہیں جو طلباء جب وہ کھیتوں میں جائیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ اس سے ان کو ہندوستان اور دنیائے مختلف حصوں میں مختلف قسم کی ضروری فصلیں اگانے کی وجہ سمجھنے میں مدد ملے گی۔ جو پرندے ان کھیتوں میں آتے رہتے ہوں۔ انکا بھی مشاہدہ کیا جائے اور ان پرندوں کی فہرست بتائی جائے جو کسانوں کے لئے مفید اور مضر ہیں۔ مفید پرندوں کو ہلاک نہ کیا جائے۔ کیونکہ وہ ان کیڑوں کو کھا جاتے ہیں۔ جو کسانوں کی فصلوں کو تباہ کرتے ہیں۔

(س) نواح کے درختوں کا مشاہدہ۔ مندرجہ ذیل امور ات کا بغور مطالعہ کیا جائے

(۱) ہر ایک درخت کی جگہ کہ آیا وہ پانی سے دُور ہے یا نزدیک (۲) بتوں کی خاصیتیں کہ کیا وہ چھوٹے ہیں۔ بوٹے ہیں یا لمبے اور چوڑے۔ نوکدار یا باریک ہیں (۳) انکی چھال موٹی ہے یا پتلی (۴) جڑیں لمبی ہیں یا چھوٹی (۵) کب اٹکنے پتے جھڑ جاتے ہیں اور کب نئے پتے اُگتے ہیں (۶) درخت کے ہر ایک حصہ سے کیا کام لیا جاتا ہے (۷) ان جنوں سے مزید فوائد حاصل کرنے کے لئے کونسی تجاویز پیش کی جاسکتی ہیں (۸) کون کونسی صنعت کا ان جنوں پر انحصار ہے۔ ان مشاہدات سے جنگلات کا مختلف جگہوں پر ہونا اور ان کے خاص فوائد سمجھنے میں مدد ملے گی۔

(س) مشینوں اور کارخانوں کا مشاہدہ۔ اگر نواح میں کوئی مشین ہو۔ مثلاً کپاس بیلنے کی۔ یا گنے بیلنے کی یا آٹا پیسنے کی وغیرہ تو اس کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں دریافت کی جائیں۔

(۱) اس طاقت سے کام لیا جاتا ہے (بھاپ۔ تیل یا مویشی) (۲) کونسا کچا سامان استعمال ہوتا ہے اور وہ کہاں سے لایا جاتا ہے (۳) کونسی اشیا کارخانہ میں تیار ہوتی ہیں۔ وہ کہاں بھیجی جاتی ہیں اور کیوں؟ (۴) اس خاص جگہ میں وہ مشین لگائے جانے کے کیا وجوہات ہیں۔

(ط) مال گدام اور ریلوے سٹیشن۔ بچوں کو مختلف اطراف سے آنے والی لائنوں کا مشاہدہ کرایا جائے۔ کہ یہ کن کن شہروں سے آتی ہیں۔ وہ شہر کیوں شہور ہو گئے ہیں۔ مال گدام میں نیچے یہ دیکھیں کہ کونسی اشیا یہاں باہر سے آتی ہیں اور کونسی یہاں سے باہر بھیجی جاتی ہیں۔ اور معلوم کریں کہ کن کن شہروں سے وہ اشیا منگوائی جاتی ہیں۔ اور کن شہروں کو اشیا بھیجی جاتی ہیں۔ اور وہ ان باتوں کی وجوہات بھی معلوم کریں۔

(ع) طلباء مختلف چوٹگی خانوں پر کھڑے کئے جائیں۔ تاکہ وہ نوٹ کر سکیں۔ کہ کونسا مال شہر میں آتا ہے اور کونسا مال باہر جاتا ہے۔ تب (طلباء) اس یادداشت پر جماعت میں بحث کی جائے۔ طلباء سے اپنے شہر کے ایک چھوٹے حصے کا مکمل معائنہ کرایا جائے (کہ وہاں پر کس قسم کا مال ہے یا کام ہو رہا ہے) اور ان سے اس کام کی رپورٹ لی جائے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں کمرس تعطیلات شروع ہونے سے پہلے طلباء کو ان کے اپنے گاؤں یا شہر کا جغرافیائی مطالعہ کرنے کے لئے چند سوالات دیئے جاتے ہیں اور طلباء ان سوالوں کی روشنی میں جغرافیائی معائنہ کر لیتے ہیں۔ چند طلباء اس بارہ میں حقیقت میں بہت ہی مفید رپورٹ تیار کرتے ہیں۔

(ف) اگر طلباء ریلوے سفر کا خرچ برداشت کر سکیں۔ تو ان کو کسی پہاڑی مقام۔ نہر کے منبع (Source) یا بندرگاہ یا صوبہ کا دارالخلافہ وغیرہ دیکھنے کے لئے لے جانا چاہئے۔ ایسی جگہوں پر جانا نہایت ہی سبق آموز ہے۔ اور جانے پر وہاں کے مختلف نظاروں۔ لوگوں کے پیشوں۔ انکی عادات و چال چلن کو دیکھا جائے اور ان پر بحث کی جائے۔ مقامی میلوں۔ عجائب گھر اور جرینا گھر کو بھی دیکھنے جانا چاہئے۔ ان تمام مقامات کو دیکھتے وقت چند نکات کا احتیاط سے خیال رکھا جائے

(۱) ہر ایک مقام پر جانے سے پہلے خاص طور پر تیاری کی جائے۔ پہلے استاد خود اس جگہ کو دیکھنے جائے اور پختہ سے فیصلہ کرے کہ کونسی ایشیا قابل دیدیں۔ اور ان کے متعلق پوری واقفیت ہم پہنچا کر فیصلہ کرے کہ طلباء کو کون سے سوالات یا مشقیں بتائی جائیں۔ اور اس کے متعلق استاد کے لئے اس صلیح کا جس میں سکول واقع ہے۔ واقفیت نامہ (Gazette) مطابقت کرنا لازمی ہے۔

(۲) طلباء کو پیشتر سے معلوم ہونا چاہئے کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ اور ان کو خاص خاص باتوں کا خلاصہ لکھتے جانا چاہئے۔ (۳) اس جگہ کا نقشہ ہر ایک طالب علم کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ تاکہ اس جگہ کو دیکھنے کے بعد اس کے متعلق استاد ان کو سبق پڑھ سکے۔ اور تعلیم اور مشاہدہ میں تعلق قائم کر سکے۔ پھر مزید مطالعہ کی باتیں بتائی جائیں۔ (۴) کسی حالت میں ایک استاد کے پاس بیٹے سے زیادہ طالب علم نہ ہوں۔ اگر درست طور پر یہ کام کیا جائے تو یہ باہر کا کام طلباء کو نہ صرف اصولوں کو درست سمجھنے کے قابل بنائے گا۔ بلکہ یہ (۱) سکول کے کام اور سکول کے باہر کی باتوں میں تعلق پیدا کریگا (۲) کام کو درست اور اصلی حالت میں رکھیں گے۔ (۳) لوگوں کو خوبصورت اور مفید اشیاء کی وقعت معلوم کرنے کا شوق دلائیگا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں پچھلے سال طلباء مندرجہ ذیل مقامات کو دیکھنے گئے۔

(۱) دریلے راوی کے نواح میں کھیت (۲) جہانگیر کا مقبرہ (۳) قلعہ (۴) ریلوے ورکشاپ (۵) جلوس بیرونہ کا کارخانہ (۶) فیروز پور Head works پرستیج سے نئی نہروں کے نکلنے کی جگہ (۷) کھجور کی ٹمک کی کانیں (۸) دہلی (۹) درہ خیبر (۱۰) ٹیکسلا (۱۱) پنجہ صاحب (۱۲) ولہ میں سنٹ کا کارخانہ (۱۳) لکڑی ان مقامات کی سیاحت کے مکمل حالات پنجاب جیوگرافیکل ایسوسی ایشن کے عنوان سے پنجاب جیوگرافیکل جرنل (رسالہ) میں چھپ چکے ہیں۔ ہر دفعہ طلباء کو چھپے ہوئے پمفلٹ دیئے گئے۔ جن میں قابل دید چیزوں کے متعلق موٹی موٹی باتیں درج تھیں۔ مجھے صرف اتنا افسوس ہے کہ ان تمام مقامات کی سیاحت میں تاخیر و جواز فیہ کے تمام طلباء حصہ نہیں لیا ہے۔ بعض طلباء کو نصف ریلوے کرایہ ادا کرنے کا مقدور نہیں تھا۔ گزشتہ دسہرہ کی تعطیلات میں پنجاب جیوگرافیکل ایسوسی ایشن نے لاہور سے آگرہ اور بمبئی تک کا انتظام کیا۔ سفر کا خرچ یہ ہے۔

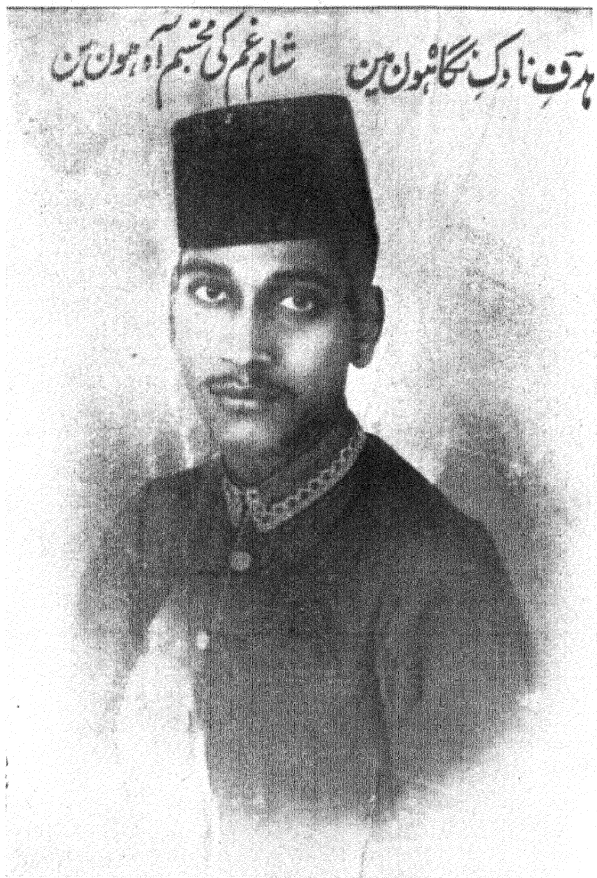
تیسرے درجہ میں ریل کے سفر کا خرچ ۶ روپے۔ دوسرے درجہ میں ریل کے سفر کا خرچ ۱۸ روپے جغرافیہ پڑھانے والے معلموں کے لئے بندرگاہ۔ پانی روکنے کی فصیل (break water) جہاز ٹھہرنے کی جگہ۔ روشنی کا مینار۔ گھاٹ۔ اسباب اٹھانے کی مشین (Crane) تیل کا گدام۔ کوئلے کا گدام۔ جہاز چوٹی خانہ۔ مال گدام floating crane مدوجزر وغیرہ کا چشم دید علم نہایت لازمی ہے۔ وہ بندرگاہ۔



حضرت عشرت رحمانی رام لاری
ادیتور "الہدای" دہلی



مہتمم صدر شہر ماہو کیڈس



حضرت ہدفِ اجاہادی لکھنؤی

فطرت کی محفل

(حضرت ہدف اجتہاد دی)

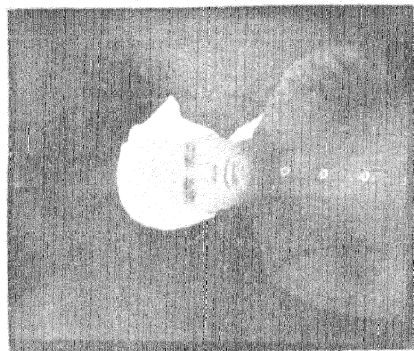
ہدف اب شہر میں رہنے سے دل اکتا گیا اپنا
جو قسمت سے ملے کشمیر کا اک پُر فضا جنگل
جہاں ہم جنس کا سایہ نہ دکھلائی دے کو سو تک
جدھر چاہا اُدھر پہنچے جہاں چاہا وہاں بیٹھے
پھاڑوں کا ہودا من آبشاریں جس میں جاری ہو
بھلائے میرے دل سے بے نظامی فرشِ قالین کو
ہو بے ترتیبیوں سے سارے جنگل کی چمن بندی
کسی جا پر کھلے ہوں چاندنی کے پھول جنگل میں
دلغ اُس بن میں پھولوں کی مہک سے مست ہوتا
چراغوں کے عوض میں جگمگائیں رات کو جگنو
ہو شب کو رقص طافوں کا اس فطرت کی محفل میں
ان انسانوں کی بستی سے کہیں مل جائے چمکار
تو پھر گزرا کرے دلچسپیوں میں اپنا دن سارا
بس اک آزاد مخلوق خدا کا ساتھ ہوا اپنا
نہ کوئی روکنے والا نہ کوئی ٹوکنے والا
مکان ہو جھاڑیوں کا اور بھپسا ہو فرشِ سبز کا
گلابوں کی ہونچکھڑیوں کا سبزہ زرخیز کا ایسا
کہیں تختہ ہو بیلے کا کہیں تختہ چنبیلی کا
کہیں جوبھی کے پھولوں سے بھرا ہو دامن صبرا
لبھاتی ہو ہوا انکھیلیاں کر کر کے دل میرا
جھلجھل چاند اور تاروں کی کرے لطف کو دونا
کلیلوں سے کریں پامال دن کو ہنسیاں سبزا

چمکتی ہو کہیں بجلی کہیں ہوں ابر کے لگے
چمکتے پھرتے ہوں ہر سو پرندے سخن جنگل میں
کبھی تو پنی کہاں سے اُنکی جنگل گونج اُٹھتا ہو
نہ سمجھیں غیہ مجھ کو ایسے کچھ مانوس ہو جائیں
کوئی بیٹھا ہوا نورا پر تو کوئی میرے شانہ پر
جو پانی آریا جمیل میں بہہ کر پہاڑوں سے
گرا کرتا رہے اس طرح پانی آبشاروں سے
وہ محویت ہو مجھ پر بھول بیٹھیوں اپنی ہستی کو
اگر ہو اور کوئی بھی تو بس اُن کا تصور ہو

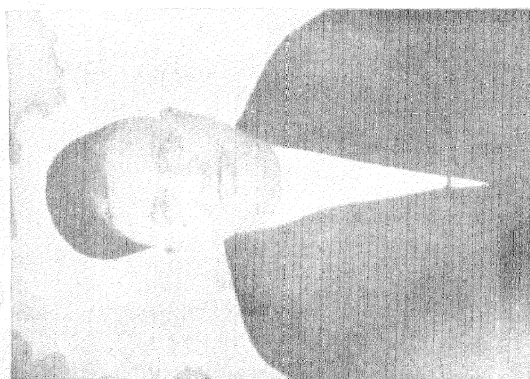
پھواریں ہوں کہیں پر اور کہیں پانی کا ہوجھالا
پیشوں کا کہیں غل ہو کہیں ہوشور کوئل کا
ترانوں سے کبھی کوئل کے بڑھتا ہوجنوں میرا
مرے چاروں طرف ہر وقت جھرمٹ رہتا ہوا اُن کا
کبھی اس کا سنوں نغمہ کبھی اُس کا سنوں گانا
تو بہنے کی صدا سے ساز کی آواز ہو پیدا
کہ میں سمجھ کروں کوئی بجا یا کرتا ہے باجا
نہ کچھ گرمی کی ہو پروا نہ کچھ سردی کی ہو پروا
اور اک تھپہ پہ میں ڈل کے کنا سے بیٹھا ہوتا

قلم ہوتا تھا میں کا غدر پر آنکھیں دل سے باتیں ہوں

”مصور چاند سی تصویر کو کیونکر بناتے ہیں“



امیر دائی دُرانی



رازی بہادر بھٹت شو نرائی شمیم
ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب



بخشی ہمدانی صاحب چہرہ نورمل سکول کسکہ

سیام

رائے بہادر پرنٹ شوژائن صاحب شیم ایڈوکیٹ ہائی کورٹ لاہور

سیامی قوم جزیرہ نما انڈوچائنا (INDOCHINE) میں ایک طاقت ور قوم واقع ہوئی ہے۔ انہوں نے شروع زمانہ میں برما۔ چنگو۔ آتام اور ملائیا کی سلطنتوں میں سے بہت سے حصے فتح کئے۔ لاؤس کی سلطنت کو زیر کیا جو آج جنگ کے ارد گرد تھی۔ اور لیا نگ پر ابانگ کو بھی اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا۔ اپنا دار الخلافہ دریائے منام کے کنارے آج تھا نام قائم کیا۔

اٹھارویں صدی کے اخیر میں برما والوں نے ایک زبردست مہم تیار کی اور سیامی سلطنت پر حملہ آور ہوئے۔ آج تھا دار الخلافہ کو تباہ کر دیا۔ شاہی خاندان کا خاتمہ کر دیا سیامی قوم میں سے اس کے بعد ایک حوصلہ والا شخص پیدا ہوا جس نے ۱۶ میل سمندر سے دور شمال کی جانب فوج کشی کر کے ایک دار الخلافہ مقام ہنگ کاک قائم کیا اور سیامی قوم کو آباد کر لیا۔ ۱۸۲۷ء میں ایک خاصہ پیدا ہو گیا اُس نے تخت و تاج چھین لیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں شاہ حال کا دادا تاجپوش ہوا جس کا نام شہزادہ مالکتھٹ تھا یہ سیام کے لئے برکت ثابت ہوئی۔ تاجپوشی سے پہلے یہ شہزادہ ایک بدبخت و بددعا میں تاجپوش اور سائنس کا مطالعہ کرتا رہا اور انگریزی زبان سیکھتا رہا تھا جس دن سے وہ تخت پر بیٹھا اپنے ملک اور رعایا کی بہبودی میں مصروف ہوا۔ اس نے یورپین سلطنتوں کے ساتھ عہد نامے کئے۔ نوجوان شہزادوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ موجودہ شاہ کا باپ چولان کارن ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوا۔ ۱۵ سال کی عمر میں اپنے باپ کے مرنے پر وہ ۱۸۷۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا باپ سوچ گر بن کر نہایت سرگرمی سے دیکھتا دیکھتا علیل ہو گیا تھا اور اسی دگر میں مرا۔

خاندان سرتی ونگی متونی شاہ کی امداد میں شامل ہوا اور ترقی اور خوش انتظامی کا دور شروع ہو گیا حقیقت یہ ہے کہ موجودہ شاہ کے باپ کو ایک امریکن مصلح نے نہ صرف انگریزی میں تعلیم دی بلکہ اُس میں اینگلو سیکسن (ANGLO SAXON) قوم کی جو افریدی اور خود جو سگی کے تتبع کی روح اس میں پھونک دی تھی۔ شاہ مرحوم ہنرمند تھا فن لکڑی بازی میں ماہر تھا۔ گھوڑے کا کمال سوار تھا۔ موسیقی میں مہارت رکھتا تھا۔ شاعر تھا اور تھیل (DRAFNE) کا مصنف تھا۔ اپنے بھائیوں اور بیٹیوں کو اُس نے سیر و سیاحت کی جانب راغب کیا تاکہ جو علم انہیں حاصل ہو ریاست کی خوش انتظامی میں اس سے امداد ملے ۱۸۸۷ء میں جوانی کی عمر میں اس شاہ نے ہندوستان کی سی سیاحت کی۔ آؤ بھگت شایان شان معجانب لارڈ متیو ہوئی۔ اس گورنر جنرل نے اُس کے ساتھ پندرہ اوقات کا سلوک کیا۔

۱۸۹۱ء تک ادنیٰ EDANBRAM) کا ڈاکٹر پیٹرگون دار الخلافہ بنگلہ کاک میں رہائش رکھتا رہا اور شاہ مرحوم کے شہزادوں کی تعلیم کے لئے وہ تالین اور شیر خاص رہا۔ انتظام سلطنت کے پریزن میں اصلاح کی گئی چنانچہ نئی سرکس بنائی گئیں اور میٹھا رکانات اور تعمیرات سیامی حسن عمارت اور یوین مضبوطی کے مرکب بنائی گئیں۔ پولیس کا سلسلہ بھی قائم کیا گیا۔ جرمن کارپر دازوں کی مدد سے ڈاک کا سلسلہ نرمیم ہو کر اصلاحی طریق پر قائم کیا گیا حکومت سیام پوسٹل یونین (POSTAL UNION) میں داخل ہو گئی۔

بنک کی پچائش کی گئی انگریز قوم کے معلم ہوائے گئے سیامی دوشیگان کی تعلیم انگریزی قانونوں کے سپرد ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت بینک کاک میں سات آٹھ فرسٹ کلاس انگریزی مدرسے ہیں۔

سیامی مذہب کے ساتھ رواداری مرعی ہے۔ شاہ مرحوم عیسائیوں کی حمایت کرتا تھا جو علم طب اور تعلیم کے دیگر شعبوں کے پڑھانے میں کوشاں تھے۔

شاہ مرحوم مصلحت خارجی میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ لندن میں سفارت قائم ہوئی اور شاہ کا سوتیلایا بیٹا شہزادہ دیوانگ سنگی سیامی فارن آفس کے چارج میں رہا۔

شاہ مرحوم اپنی ریاست میں ہمیشہ دورہ کرتا تھا۔ فوج کو اس نے آہستہ کیا اور اس وقت (سال ۱۹۱۱ء) میں فوج کی تعداد ۲۶۰۰۰ ہے۔ کوپن ہیگن (COPENHAGEN) سے کو دور رچیلو (RVCHULO) بلوایا گیا اس نے بحری صیغہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور بحری طاقت کو قائم کیا۔

مجلس انتظامیہ میں محکمہ جات کے انسپرا ۱۸۹۱ء میں شامل کئے گئے۔ ۱۸۹۵ء میں کونسل اصناف قوانین قائم ہوئی جس میں وزرا اور آٹھ شہزادے اور سب ممبر نامزدگان سرکار شامل ہیں۔

۱۸۹۳ء میں شاہ مرحوم کا شامت اعمال سے فرانس سے تنازعہ پیدا ہو گیا ان دنوں شاہ عارضی طور پر فرانس ضروری سے قدرے علیحدہ ہو کر استراحت کرتا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ۱۰- اپریل کو دس فرانسسی جہاز دریائے متام میں موجود ہو گئے۔ انہوں نے کینام پر حملہ کر دیا چنتا بون پر قبضہ کر لیا۔ دار الخلافہ پر گولہ باری کی دھمکی دی گئی سیام کو آخر صلح گزراں پڑی پچاس ہزار مرلے میل کا تہہ نذر کیا گیا۔ اور مصیبت یہ پڑی کہ ولیم بعد وقت دو سال بعد فوت ہو گیا۔ اور شاہ حال ولیم بعد نامزد ہوا۔ اب آگے سٹے۔ انگریز اور فرینچ قوموں کی رقابت کا پتہ ملتا ہے ۱۸۹۵ء میں فرانس اور انگلینڈ میں طے ہو گیا کہ متام کی وادی آزاد ریگی۔ آخر ۱۹۰۴ء میں چنتا بن سیام کو واپس دیا گیا مگر کراٹ کی بندرگاہ فرینچ کے پاس رہی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ میکوہری اور کسمر کے صوبے فرینچ رہے تین سال بعد بتم مایک۔ سیام ریب اور الگ کو رجو کمبودیا کی سرحد پر ہوا، فرانس کے حوالے کر دئے گئے۔ اس کے عوض میں کراٹ کی بندرگاہ سیام کو واپس ملی۔ ایک اور حق سیام کو عطا فرمایا گیا کہ فرانسسی جرم سیاسی عدالتوں میں قابل تحقیقات قرار پائے۔

اب برٹش گورنمنٹ کی کیفیت سنئے۔ انہوں نے بھی منظور کر لیا۔ کہ انگریز قوم کے مجرموں کے مقدمات سیاسی عدالتیں سُن سکیں۔ اس کا معاوضہ یہ ملا کہ ملٹی ریاست کھٹن ترن گاؤ۔ کیدہ سپرٹس اس کے ہمسایہ جزائر برطانیہ کے حوالے ہوئے۔

اڈیٹر بدھست ریویور (BUDHUST RAYU) ۱۹۱۱ء نظر اڑہے کہ گوکچ حصے ریاست کے ہاتھ سے نکل نکل گئے مگر جو صوبے بہت اچھے تھے وہ سیام کے پاس رہے۔ اس وقت اس ریاست کا رقبہ دو لاکھ مربع میل ہے۔ اور ۱۹۱۱ء میں آبادی سات لاکھ کے قریب تھی۔ شاہ مرحوم نے اخیر عمر میں روم۔ وینا۔ پیرس۔ کوپن ہیگن اور ٹرانکٹلم کی سیاحت کی۔ بارٹانی انگلینڈ گیا۔ ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کا مہمان رہا۔ اس کے شہزادوں نے جن میں شاہ حال بھی شامل ہے انگلینڈ۔ جرمنی۔ فرانس اور روس میں تعلیم پائی ہے۔ شاہ حال ۱۲ سال کی عمر میں انگلینڈ تعلیم کے لئے بھیجا گیا تھا۔ سنید ہرسٹ (SANDHARST) کے فوجی مدرسہ میں رہا۔ پوسٹم (POSTDAM) میں کیدٹ (CADET) رہا۔ اور الڈرشاٹ (ALDERSHOT) کے درہم لائٹ انفیٹری (DURHAM LIGHT INFERY) میں فوجی کام سیکھتا رہا۔ ایک سال اسکورڈیونیورسٹی میں بھی رہا۔

شاہ مرحوم ساری عمر بدھ بھگوان کی تعلیم کا پیرو رہا اور اُس کے مت کے اہولوں پر عقیدت رکھتا رہا۔ وہ ہر سال بودھی منامات مقدس کی یا تر کیا کرتا تھا۔ تعلیم کے مرکزوں کی امداد اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ پالی ٹیکسٹ سوسائٹی کو اس نے مالی امداد دی۔ پالی بدھی کتب مقدس اس نے سیامی حروف میں شائع کیں۔ القصہ ساری دنیا میں سیام ہی ایک واحد بودھی سلطنت ہے۔ شاہ مرحوم کے طفیل سیام اس وقت ایک مہذب اور ترقی یافتہ آزاد سلطنت ہے۔

ہم ۱۹۱۱ء کا حال لکھ رہے ہیں جس کو اب بیٹس سال کے قریب ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں سیام نے اور زیادہ ترقی کر لی ہے۔ شکر ہے کہ سکھامنی گوتم بدھا کا نام لیوا کوئی شاہ تو ہے۔

گلستانِ سخن

فیخِ کرم نہیں کچھ اپنے واسطے یارب
کہ ذاتِ پاک کا تیری ظہور ہم سے ہوا

کہاں سے لائیں محبت میں صبرِ وعظا
کہ دل جو دور ہوا یہ بھی دور ہم سے ہوا

کلیں ہی کیلئے سب وہ بے حجابی تھی
نہ سامنا کبھی اک فنِ حضور ہم سے ہوا

اس ابتداء محبت میں حُسن کی یہ کشش
جدا ابھی سے دلِ ناصبور ہم سے ہوا

ریاست اڈکور کے دلچسپ حالات

یہ نہایت سرسبز و شاداب علاقہ جو راونگور کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوستان کے اتر میں جنوب میں واقع ہے۔ خط استوا کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے اس کی پیداوار تقریباً وہی ہے۔ جسے منطقہ حارہ کی پیداوار کہا جاتا ہے۔ ناریل۔ تارو۔ انجلی۔ سیاح مرچ اور کیلے کے درخت قطار در قطار سیلوں تک چلے جاتے ہیں۔ خوبصورت سبزہ زار اور اشجار میوہ دار کی کثرت اس قدر ہے۔ کہ یہ علاقہ گلستان ہند دی گارڈن آف انڈیا کے نام سے مشہور ہے۔ اس سرسبز خط کے بصارت افروز مناظر صرف دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان چند خاص باتیں یہی ہیں جن کا مختصر ذکر ناظرین رہنمائے تعلیم کے لئے لطف سے خالی نہ ہوگا۔ یہ علاقہ ایک ایسی ریاست ہے۔ آریہ قوم کی آمد سے پہلے جو بادشاہ یہاں عنان حکومت ہاتھ میں رکھتے تھے۔ انہیں کی اولاد آج تک یہاں برسر حکومت ہے یہ راجے آریہ نسل سے نہیں ہیں۔ آریہ قوم نے جہاں ہندوستان کے دوسرے قدیمی باشندوں کو شودروں میں شمار کیا۔ ان راجاؤں کو بھی اسی گروہ میں شامل سمجھا۔ البتہ برہمنوں نے ان راجاؤں کو اپنا حلقہ مگوش بنانے کے لئے تلمذان کا دستور جاری کر دیا۔ اس لئے وہاں کے راجاؤں کو تلمذان کے ذریعے ہندو دھرم کے حلقے میں لے آتے ہیں۔ اور پھر وہ شودر یا چھوت نہیں سمجھے جاتے۔

طرز زندگی

روایت ہے۔ کہ یہ لوگ پہلے بالکل ننگے رہتے تھے۔ یہاں کے برہمن بھی ننگے تھے لیکن جب سے اس سرکار انگریزی کی عملداری ہوئی سزائے جرمانہ وغیرہ کا خوف دلا کر ان کی عربابی کو ڈھانپا گیا۔ مگر اب تک اس عربابی کی یادگاریں ان کے ہاں سالانہ تیوہار منایا جاتا ہے۔ اس تیوہار کے روز راجا اپنے امرا و وزراء اور راجا و عمائد کو ہمراہ لے کر ساحل بحر پر جاتا ہے اور یہ سب لوگ بالکل برہمن تن ہو کر وہاں غسل کرتے ہیں۔ اس روز کسی انگریز کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اب بھی یہ حالت ہے۔ کہ عوام الناس مردوں یا عورتوں کو نہ دیکھ سکتے اور نہ دیکھوڑا سا کپڑا لپیٹ لیتے ہیں۔ باقی جسم بالکل برہمن ہوتا ہے۔ اور تمام کاروبار اسی حالت میں کرتے رہتے ہیں۔

تراؤنڈم اس ریاست کا دارالحکومت ہے۔ عیسائی مشنریوں نے وہاں جا کر لڑکیوں کو یہ سکھایا کہ اپنے سینے کو کپڑے سے ضرور ڈھانپ لیا کریں مگر دنیا میں نیک کوششوں کا انجام ہمیشہ اچھا نہیں ہوا کرتا۔ اکثر دنیا بھی ہوتا ہے کہ سبھی بارگاہی ہو جاتی ہے۔ وہاں کے باشندوں نے اس کو بھی مداخلت بجا قرار دیا اور ہنگامہ برپا کر دیا۔ عیسائی مشنریوں پر یہ بتان تراشا گیا کہ یہ لوگ ہماری آزادی میں غل انداز ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ فساد آخروں ہو گیا۔ اس کے بعد لڑکوں کے سکولوں میں بھی جس کم جاری ہوا۔ کہ ملل سکول کے لڑکے ایک کرتہ زیب تن کر کے

سکول میں آیا کریں اور جب بائی کلاس میں تعلیم پڑھے ہوں۔ تو ایک کوٹ پہنا کریں۔ اس طرح آہستہ آہستہ تعلیم یافتہ لوگوں میں لباس پہننے کا رواج شروع ہوا۔

اس علاقہ میں نہ سرکوٹھی یا پگڑی سے ڈھلپننے کا دستور ہے اور نہ پاؤں میں جوتا پہننے کا رواج ہے غریب سے لیکر امیر بلکہ راجا تک ننگے سر در ننگے پاؤں نظر آئیں گے۔ البتہ شاہی خاندان کی مستورات اور بیگمات ایک چھتری اپنے سر پر تانے لگتی ہیں اور اس امتیازی نشان سے ان کا رتبہ معلوم ہو جاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہاں پلنگ اور چارپائی وغیرہ برسونے کا دستور بھی نہیں عموماً سب لوگ چٹائی پر سوتے اور آرام کرتے ہیں۔ یہ چٹائی جو اس غرض کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ وہاں سیٹل پائی کے نام سے معروف ہے۔ مختلف قیمت کی ہوتی ہے۔ امیر و غریب اپنی حسب حیثیت چٹائی خرید کر استعمال میں لاتے ہیں۔ قدرت نے اس ملک کو آب و ہوا کچھ ایسی عطا کی ہے کہ اوپر سننے کے لئے زیادہ کپڑے تنے کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی۔ آب و ہوا اگرچہ گرم ہے۔ لیکن سانپ بچھو اور دوسرے زہریلے حشرات الارض یہاں بالکل نہیں پائے جاتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پاؤں کو جوتا پہننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اور نہ فرش زمین پر سو رہنے میں کوئی خطرہ ہے۔

طرز معاشرت ایک نہایت عجیب بات جو اس علاقہ کو ہندوستان کے دوسرے حصص سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ یہاں ایک عورت ایک ہی وقت میں کئی شوہر رکھ سکتی ہے۔ اولاد باپ سے منسوب نہیں ہوتی۔ بلکہ عورت سے منسوب ہوتی ہے۔ جائداد کی مالک بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ برہمنوں میں یہ دستور ہے کہ سب سے بڑا لڑکا تو برہمن لڑکی سے شادی کرتا ہے لیکن دوسرے لڑکے شودر عورتوں سے۔ یہاں بھی دو ذاتیں پائی جاتی ہیں۔ برہمن اور شودر۔

پیداوار کیلے اور ناریل یہاں بڑی بہتات سے ہوتے ہیں۔ روٹی یا تو کیلے کی بنلتے ہیں۔ یا چاولوں کی۔ گندم کی روٹی کا رواج نادر الوجود ہے۔ چونکہ بارشیں سال بھر ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے چاول نہایت کثرت سے ہوتے ہیں۔ چاولوں کی تین تین فصلیں سال میں اٹھائی جاتی ہیں۔ ناریل کی یہاں بارہ فصلیں ہوتی ہیں۔ اور کیلے تو بارہ مہینے یہاں ملتے ہیں۔ جو نہایت شیریں۔ لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ ارزاں اس قدر کہ غریب امیر سب ان کو کھا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے گھر عموماً بہت صاف اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ ہر ایک گھر کے ساتھ ایک خانہ بارغ بھی ہوتا ہے جس سے ان کی نفاست پسندی اور خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے۔

عورت ہو یا مرد۔ سب کے سر پر لمبے لمبے بال ہوتے ہیں۔ اس لئے مرد اور عورت میں ماہ الامتیاز بہت کم عورت کا سینہ ہے۔ جو اس کے عورت ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ ان لمبے لمبے بالوں کو یہ لوگ نہ تو گوندھتے ہیں اور نہ سکھوں

کی طرح جُوڑا بناتے ہیں۔ یہ بال ہر وقت بکھلے رہتے ہیں۔ یہاں سے چل کر جوں جوں شمالی علاقوں کی طرف آتے جائیں سر کے بال کم مقدار میں ہوتے جاتے ہیں اور پورب میں آکر صرف ایک چوٹی رہ جاتی ہے۔
اس ملک میں جو مندر سب سے قدیم ہیں۔ وہ مشیو جی کے مندر ہیں۔ ان میں شودروں کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایسی ایسی بوتلمونی و گونا گونی پائی جاتی ہے کہ کسی دوسرے ملک میں اتنا اختلاف و تنوع نہیں دکھائی دیتا۔

پادری جے علی بخش۔ لاہور

جذباتِ عتیق

افسردہ پاکے اپنے دل دا غدار کو سمجھا کیا خزاں میں ہمیشہ بہار کو
یہ جانکر کہ شتم ہوں اک گل غدار کا گل گر گئی صبا مری شمع مزار کو
ساقی! نگاہِ مست اک بار دیکھ لے کافی ہے بس ہی مے دفعِ خمار کو
بہر ثبوت سوز و دروں اے پیامبر ہمراہ نامہ رکھ دے دلِ بقیہ کو
ظالم خزاں نے لطفِ چمن کھو یا تمام کہہ دے صبا سے لائے منا کر بہار کو
مانوس شامِ غم کی تہ تار کیوں سے دل رہنے دو چچہ سارِ غم ہمارے مزار کو
مجھ زند بادہ خوار سے قدر سکی لوچھے کیا جانے شیخِ رحمت پروردگار کو

تیور پکارتے ہیں کہ ہشیارے عتیق

وہ آسے ہیں آموئے دل کے شکار کو

شعاعِ حیات آبادی

عبدالمجید

فرب منزل مقصود

(بابو منوہر لال صاحب طالب بی۔ اے۔ ڈائرن ایل ایل بی۔ چکوال)

کشمیر منظر کی شان میں عرفی کے بے مثال قصیدہ کی تقلید نامکن۔ سفر نامہ شمیم کے رنگ و بو اور طرز نگارش کا انعکاس محال۔ پیسہ بٹور، سیاحوں کی رہنمائے کشمیر، کی خشکیات ناپسند۔ اُن آنکھوں و لمبی باتیں سید سے سائے الفاظ میں بیان کرنا مرغوب ہے۔

راولپنڈی کے ریوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی موٹروں کی فوج نظر پڑے گی۔ چلو کوہ مری کشمیر! از کوہ مری کی سواری! کشمیر جانے والا چلو! کار۔ بابو جی! کی صداؤں پر درحیاب نہ دیکھے سنا ان سنا ایک کر دیجئے۔ ٹانگوں میں بیٹھے اور شہر والے اڈے سے سواری کا انتظام کیجئے۔ اس میں آپ کو فائدہ رہیگا۔ سنی سنانی نہیں کہتے تجربہ کی بنا پر کہتے ہیں۔ آگے آپ مانیں نہ مانیں، آپ کی مرضی۔

کراہیہ پر بہت چمک چکا ہوا۔ آخر دم بٹھرے۔ کار ہو گئی۔ شہر والے اڈے کی نفل میں پھل منڈی ہے کشمیر میں آم نہیں ہوتا۔ پنجاب سے جاتا ہے اور بہت ہنسکا بکتا ہے۔ سیب، ناشپاتی، انگور، بگمگوٹھے، بادام، اخروٹ اور آلو بخارا وہاں کا ہی میوہ ہے۔ یہاں سے خریدنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ راستے میں کھانے کے لئے ضرورت ہو تو لے لیجئے۔ مٹھائی بھی لے لیں تو اچھا رہیگا۔ رستہ میں کام آئیگی۔ راشن رسد لے کر موٹر میں جمع کیا۔ بیٹھے اور موٹر چل دی۔

مڑی روڈ پر موٹر فرمائے پھرتی چلی جاتی ہے۔ اہل سائی کھیتیاں، گرد پوش درخت جو موٹروں کی گرد و پاشی کی مٹہ بپتی تصویر ہیں، کسانوں کی جھونپڑیاں اور مویشی پیچھے کو دوڑے جاتے ہیں۔ آپ کی موٹر زلف کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر سانپ کی طرح مڑتی، دوڑتی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ مری کی سخت چڑھائی جو گھوڑوں کا دم توڑ دیتی ہے اس کی طاقت پر کوئی اثر نہیں کر سکتی۔ سفید سڑک کا سانپ پہاڑ کی پیٹھ پر بل کھاتا ہوا چڑھتا جاتا ہے۔ ہم بھی اُس کی لکیر کو پیٹتے ہوئے اُس کے تعاقب میں ہیں۔ مری کے دلکش مناظر، چیل کے اونچے اونچے درخت اُن کے پیچھے کھیلنے ہوئے پری پیکر نچے، دلکش پہاڑ، غیر مانوس چٹانیں اُن کے سایہ میں محور از و نیاز نو جوان عاشق اور حسین معشوقہ، محبوب کا محبوب کتا جو آغوش محبت سے نکل کر ہماری برق رفتار سواری کا ناکام تعاقب کرتا ہے، ہم کو روک نہیں سکتے۔ مری ریلواری کا مشہور کارخانہ شمیم مشتاق تماشا کو پیغام دعوت دیتا ہے مگر ہم محنت نشان کشمیر

کے مشتاق دیدیں۔ ہستان یار پر سجدہ کرنے کی بیتیابی رفتار ڈھیلی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم مری کو جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی، حسرت آمیز شوق سے دیکھتے ہوئے بھاگے جلتے ہیں۔ کوہ مری سے کوہار کے پُل تک غضب کی آڑائی ہے جو موٹر کی بریکوں اور شوخ کی لیاقت کی کسوٹی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ یہاں تک بخیریت پہنچ گئے۔ ٹول دول کا جھگڑا طے ہوا اور چلے پُل کے اُس پار پہنچے تو ریاست کی حدود میں آ گئے۔ دریائے جہلم کا نظارہ دل کو مسحور کئے لیتا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان نیچے بہت نیچے دریائے جہلم جھاگ اُچھالتا دوڑا جا رہا ہے۔ اس فلک بوس بند یوں سے آنے والے کے لئے اس قدر پستی شاید ناقابل برداشت ہے۔ جسمی اس طرح چیں چیں اور کھٹ باہن ہو رہا ہے۔ پہاڑ کی پیچیدہ پریوٹر میں دوڑتے ہوئے مسافر اس نظارہ سے محظوظا ہوتے ہیں۔ ہوا کریں۔ اُن کی بندی اُس کی پستی ہے۔ ہاں شہرت اور طاقت کی بندیوں پر ممکن انسان دوسروں کی پستی اور بے بسی کو موجب فرحت سمجھتا ہے مگر یہ بھول جاتا ہے کہ اُن کی پستی ہی اُس کی بندی کا باعث ہے۔

ریاست کی حدود میں پہنچتے ہی سڑک کے سانپ نے اوپر کا رُخ کیا۔ اس کی پیٹھ اور زیادہ ڈھلوان ہو گئی اور اُس پر چڑھنا مشکل تر ہو گیا۔ مگر ہماری رفتار یا بادیا موٹر کی برق رفتاری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دریائے جہلم سانپ کی طرح مل کھاتا ہوا اُدھر سے آ رہا ہے جادو ہر دم دوڑے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سڑک اور دریائے جہلم دو روپلی سانپ ہیں جو ساتھ ساتھ گویا بند ی اور پستی پر مخالف سمتوں میں دوڑے جاتے ہیں۔ خدا جانے کب سے!

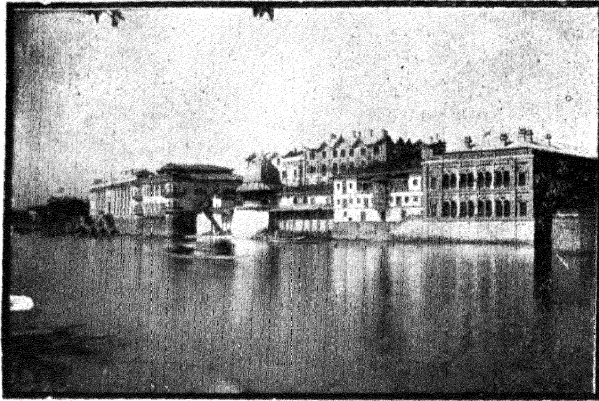
دو میل کے پُل سے تھوڑا نیچے کاغان کا نالہ کش لنگا اپنا برفانی پانی دریائے جہلم کے شیر گرم پانی میں ملا رہا ہے یہ سرد و معتدل طبعیتوں کا اتحاد دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سر فلک سبز پوش پہاڑ اس ٹاپ کے ازلی شاہد ہیں دو دونوں نے یک زبان ہو کر کہا ہے

من تو شدم، تو من شدی من تن شدم، تو جاں شدی
تکس نہ گوید بعد ازین من دیگر م تو دیگر ی

اور دنیا جانتی ہے کہ یہ برسوں کے پھڑکے ایسے ملے کہ دوئی کا نام نہ رہا۔ تمام دنیا اس "یک قالب دو جاں" کو دریائے جہلم کے ہی نالم سے پکارتی ہے۔

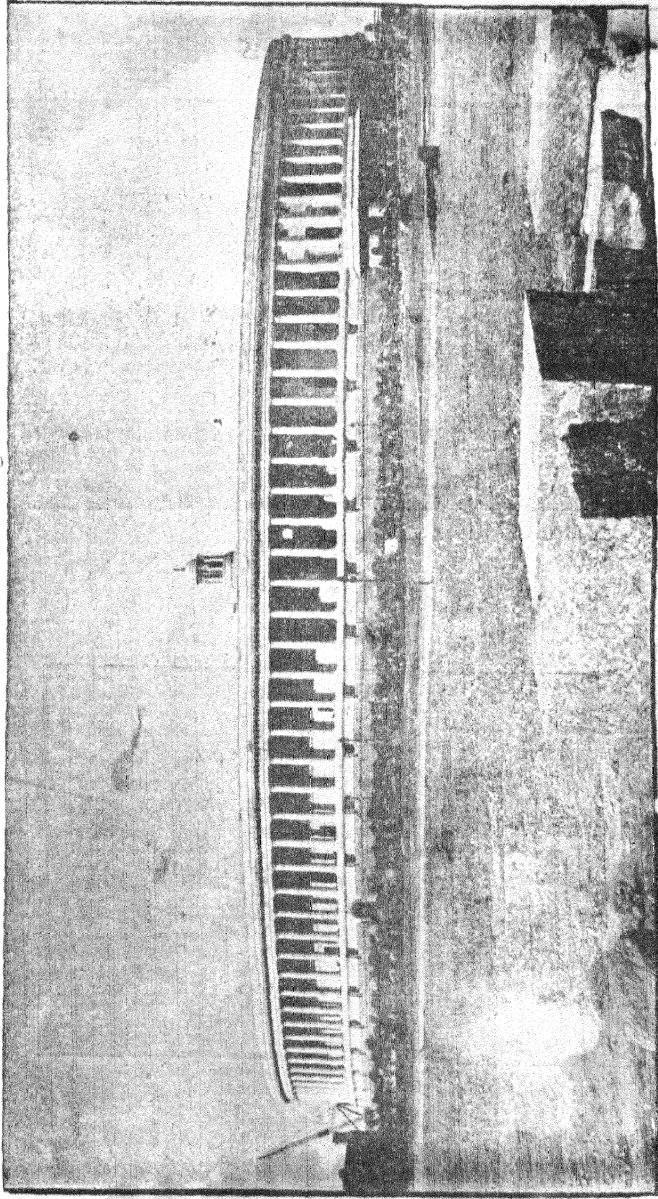
بارہ مولا تک پہاڑوں کے درمیان کم دبیش ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ سڑک اور دریا ساتھ ساتھ چلتے ہیں بہرہ پوش پہاڑ، جن کی فلک بوس چوٹیوں پر سبز زردی والے پہرہ دار کھڑے ہیں، بڑی بڑی غلی چٹانیں جن سے پانی کے موتی نکلتے ہیں۔ غریب الوطن مسافر کو دولت کیفت سے مالا مال کرنے کے لئے کمر بستہ کھڑے ہیں۔ یہ

کشمیر کے دو مناظر



ایک سیاح کے کیمپ سے

ابجدی ہال



نئی دہلی کی ایک حصہ جس پر کروڑوں روپے صرف ہو چکے ہیں

جسم دروغ کو طبعِ نفع نہ نصیب ہوئی۔ اچھا بلی کے پاڑوں کی سرسبزی اور ان کے دامن میں باغ جن میں مچھلیوں کی افزائش نسل کے لئے مالا ب ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخر کان کمال تک آنکھوں کا کام کرینگے؟

اُف! امرنا تھجی کی یا ترا تو نہ ہو سکی۔ شوشی قسمت نے یہاں بھی پھیچا نہ چھوڑا۔ اجلا نصیب کشمیر کی ہری بھری دیوڑیوں میں، نقری چٹھوں، سبجالی دریاؤں اور فلکِ رفعتِ پاڑوں کو پھانڈ کر آپہنچا۔ یا تری لوگ دوپڑا ڈنکل گئے۔

پھر انہیں کیسے مل سکیں گے؟ قہر و رویش، برجان و رویش۔ مگر انوس ہمارے ساتھ آپ بھی ڈوبے۔

آپ کو بھی امرنا تھجی کی زیارت نہ نصیب ہوئی تھی، نہ ہوئی۔ مگر ایک خیال ہے اگر پورا ہو گیا تو ممکن ہے اس چوک کی کچھ تلافی ہو جائے۔ اسلام آباد پچھلے قسمت آزمائی کرینگے۔

لیجئے صاحب! آپ کی قسمت نے یاوری کی کشتی کا کرایہ ہو گیا۔ پانچ مسافر وہاں بیٹھے ہیں تین ہم ہیں۔ ایک کی گنجائش رہی۔ کوئی خدا کا بندہ آجائیکا۔ کھانا وانا سرشام کھا لیجئے۔ آج پورنا شیشی ہے۔ ماہِ کامل کے طلوع ہوتے ہی کشتی ٹکڑھا لگی۔ اگر کاڈا کشمیری مال خریدنا ہو تو خرید لیجئے سری نگر سے سستا ملے گا۔ انتنت ناگ کے چٹھہ میں اشتان کریں پھر پانی کے کنائے پتھروں پر بیٹھ کر کچھ کھاپی لیں۔ شام کا کھانا کشتی میں کھا لیجئے۔ ماہِ کامل کی ضیا پاشی، دریا کا سکون، فضا کی کیفیت کھانے کا مزاد و گنا کر دیگی۔

بعض حضرات کو ملا تیز موقع و محل اپنی پوزیشن قائم رکھنے کا خیال دامنگیر رہتا ہے۔ ان کے دماغ پر مونداری کا بھوت مسلط ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا ان کی پوزیشن کی ہر وقت نگراں ہتی ہے شاید وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا کے پاس اس کے علاوہ اور کام بھی ہے؟ وہ جہاں بھی جاتے ہیں بحسٹریٹ، رنج، بیرسٹر، وکیل، پنڈت، مولوی، حاکم اور ناجر ہی بنے رہتے ہیں۔ وہ مسٹر، بایو، چودہری، شیخ کی کبلی اتارنا نہیں جانتے۔ ان کا کاروباری خول اس درجہ سخت اور پکدار ہو جاتا ہے کہ انہیں پھر سے انسان بننا نامکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوتا ہے اگر آپ اپنا کام کاج، شہر گھر چھوڑ کر قدرت کی گود میں آتے ہیں اس سے فیضیاب ہونا چاہتے ہیں تو رسمی نقاب کو اٹھا دیں۔ شاہد قدرت سے فطرت ہی ہمکنار ہو سکتی ہے تو فطرت کو قدرت سے بے حجابانہ ہم آغوش ہونے دیں۔ یہ سمجھ لیں کشتی میں پانچ انسان بیٹھے ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں۔ کیا ہم ایک رات بھی انسانوں میں بسر نہیں کر سکتے کم سے کم بطور تجربہ ہی سہی۔ آج کی رات ان آدمیوں میں جو محض آدمی ہیں بسر کرینگے۔

چودھویں کے چاند کی لطیف چاندنی فضا کو مہتابی بنا چکی ہے۔ ماہِ کامل آئینہ دریا میں اپنے رُخ منور کا عکس دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے۔ اُس کی روپلی کرنیں سطحِ آب پر کھیل رہی ہیں۔ حباب دریا اس حُسنِ لطیف کو اپنے ہوائی گنبد میں قید کرنا ہی منتہائے ہستی سمجھ ہوئے ہے۔ اس پُر نور اور خاموش فضا میں ہماری کشتی دیا کے بساؤ پر جا رہی ہے۔ طالع کا لڑکا کشمیری زبان میں ایک مہنگائی گاتا ہے۔ ہم اس کو

سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مگر نضا اس سے گونج اٹھتی ہے۔ صبا اُسے سمجھتی ہے۔ یہ رُوح کی آواز ہے۔ ہماری رُوح اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اُس کی آواز کا زیر و بم دل کی گمراہی میں اُتر جاتا ہے۔ دل شرابِ کیف سے محمور ہو کر اپنی ہستی، پوزیشن، و معناری سے بے نیاز ہو جاتا ہے اُسے دنیا اور مافیسا کی خبر نہیں رہتی۔ ملاحوں اور ان کے بچوں کے دہقانہ چہرے اِس ماحول میں بلا کے دکش معلوم ہوتے ہیں۔ حُسن بے پردہ ایک دہجد کا عالم طاری کر دیتا ہے۔

دریا کے دولوں کناروں پر کشتی کے کھیت ہیں۔ ملاح کشتی کو کنارے لگا کر کچھ بٹھے توڑتا ہے۔ کشتی میں لا کر بٹھے بھونے جاتے ہیں پھر وہ اپنے بال بچوں میں بھٹہ برابر بانٹ دیتا ہے۔ ملاح کا لڑکا جس کی عمر نیکل گیارہ برس کی ہوگی میرا ”دوست“ بن گیا ہے وہ اپنے حصّہ میں سے ایک بھڑا مجھے دینے پر مُصر ہے۔ اس کشتی کے ادھ بٹھے بٹھے کی لذت کوئی مجھ سے پوچھے۔ دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ ایک انسان نے ایک انسان کو دیا تھا۔ فطرت نے فطرت کو پہچان لیا۔ یہ اُس کا ثبوت تھا۔

چودھویں کے چاند کی چاندنی میں تمام رات کشتی کی آغوش اور دریا کی شغاف سطح پر چالیں میل کا فاصلہ طے کرنے کی یہ یاد آئیں۔ دل میں تصویرِ جاناں کی طرح محفوظ رہے گی۔ تمام رات نوحہ کے دریا میں بادِ کیف سے مسحور رہنے کی خوشی دل میں رہ کر دل کو دل بنائے رہے گی۔ سچ ہے حُسن دائمی خوشی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ آہ! اُس کو معلوم ہے کہ اس سفر یا اس رات کے ختم ہونے کی دل میں کیا کیا دعائیں مانگی گئی تھیں۔ آہ! وہ حالت ”جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا“ کی حالت سے بھی کہیں بہتر و برتر تھی۔ مگر دعا کے ساتھ اُتر کو صند ہے دعا قبول نہ ہوئی۔ صبح صادق نے اپنا رنگ جمایا۔ چاند کی روشنی پھیلکی پڑنا شروع ہو گئی۔ تارے سطحِ آب پر جھلکاؤں نے لگے۔ یہ عالم بھی کچھ کم کیف پرور اور رُوح افروز نہ تھا۔ مگر سفر کے ختم ہونے کا خوف اور خطرہ مَحَر مبدل یقین ہونے لگا۔ آہ! اب تو شرابِ کیف کا اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔ ادھر جہلم کے پانی سے ”کرنوں والے“ نے سز نکالا ادھر ہماری کشتی سری نگر کے گھاٹ پر آ گئی۔ ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ اب اُترنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ لیکن

آہ! فریبِ منزلِ مقصود!

ہندوستان قدیم کی خوفناک رسم ”ستی“

ایک مضمون مضمون

(از شیخ محمد اسماعیل صاحب سکرٹری اور ٹریل پبلک لائبریری پانی پت)

ہندوستان میں نہایت قدیم سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جب بیوی کا شوہر مر جاتا تھا تو بیوہ اپنے مردہ شوہر کے ساتھ چیتا میں بیٹھ کر زندہ جلا دی جا یا کرتی تھی۔ یہ خوفناک رسم اس قدر قدیم زمانہ سے یہاں رائج تھی کہ تاریخ اس کا ٹھیک زمانہ اور اُس کی ابتدا بتانے سے قاصر ہے کہ کب اور کس زمانہ میں اور کیوں اس رسم کی بنا پڑی اور سب سے اول کونسی عورت اس کی بھینٹ چڑھی۔ اس رسم کا نام ستی تھا۔ اور جو عورت ہنسی خوشی ستی ہو جا یا کرتی تھی اُس کا خاندان نہایت معزز اور باوقار گنا جاتا تھا۔ اُس کی تعریفیں بھی تھیں اور اُس کی مثالیں دی جا یا کرتی تھیں اور جو عورت ستی ہونے سے انکار کرتی یا چیتا میں سے نکل کر کسی طرح بھاگ جاتی وہ ہمیشہ سوسائٹی میں ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ اس رسم کی قدامت کا اس سے پتہ لگائیے کہ تاریخ قدیم کے اوراق پر جنگ مابھارت سے بھی پہلے اس کے نقوش اور موجودگی کے آثار نظر آتے ہیں چنانچہ ہندو کلاسیکل ڈکشنری مصنف دیوی سہاسے میں ”مادری“ کا جو راجہ پانڈو کی دوسری رانی تھی تذکرہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ راجہ کے انتقال کے بعد اُس کی لاش کے ساتھ ستی ہو گئی (صفحہ ۲۴۲)۔ بھائی پرمان کی کتاب تاریخ پنجاب کے صفحہ ۱۱۴ میں بھی اس واقعہ کو دہرایا گیا ہے۔

چاہے یہ رسم شوہر فلن سے اتنا ہی محبت کے باعث پڑی ہو۔ چاہے لوگ زبردستی بیوہ کو جلا داتے ہوں چاہے عورتیں شرمائشی ستی ہو جاتی ہوں۔ اور رسم و عادات کے مطابق انکار نہ کر سکتی ہوں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ رسم ستی نہایت وحشیانہ اور بے رحمانہ۔

جب مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو اس عجیب و غریب رسم کو دیکھ کر وہ کانپ اُٹھے اور حیران رہ گئے۔ ان کے نزدیک یہ انتہا سے زیادہ قبیح فعل تھا۔ یہ مسلمان بادشاہ اس کے قطعی افساد پر تیار ہوئے مگر خود غرض اور جاہل برہمنوں نے اُن کو بتایا کہ یہ رسم نہیں بلکہ مذہبی حکم ہے۔ اور اس کا روکنا فساد اور جھگڑے کا موجب ہو گا۔ چونکہ مسلمان

اس بات سے ہندوستان میں نہایت احترام کرتے تھے کہ ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات اور دینی رسوم میں رکاوٹ ڈالیں۔ اس لئے مجبور ہو کر خاموش ہو رہے۔ مگر حکم دے دیا گیا کہ کوئی عورت بادشاہ یا علاقہ کے حاکم اعلیٰ کی اجازت کے بغیر ہرگز ہرگز سنی نہ کی جائے ورنہ سنی کرنے والوں۔ اس میں شریک ہونے والوں اور اُس میں اعانت کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی۔ اور گورنروں کے نام خفیہ احکامات جاری کر دیئے گئے کہ حتی الامکان اجانت دینے میں توقف کیا کریں۔ اور جس طرح بنے عورت کو سمجھا بھجا کر سنی ہونے سے باز رکھا کریں۔ چنانچہ مشہور سبیلح ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے مطالعہ سے ہم اے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو قطیف کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ اور جس نے دو ایک سستیوں کا حال اپنا چشمہ یاد لکھا ہے۔

ڈاکٹر بریئر ایک فرانسیسی سبیلح جو شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں سنی کا بہت لمبا بیان لکھتا ہوا رقمطراز ہے :-

”آجکل پہلے کی نسبت سنی کی تعداد کم ہو گئی ہے کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرمانروا ہیں اس دشتیانہ رسم کے نیست و نابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ اور اگرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر کیا ہوا نہیں ہے کیونکہ ان کی پالیسی کا ایک جز یہ ہے کہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کمیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کی مذہبی رسوم کے سجا لانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں۔ لیکن تاہم سنی کی رسم کو بعض ایچ بیچ کے طریقوں سے روکتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی عورت بغیر اجازت اپنے صوبہ کے حاکم کے سنی نہیں ہو سکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا جب تک کہ قطعی طور پر اس امر کا یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنے ارادہ سے ہرگز باز نہ آئے گی۔ صوبہ دار بودہ کو بحث مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے وعید کرتا ہے اور اگر اُس کی فمائش اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا بھی کرتا ہے کہ اپنی محل سرا میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں مگر باوجود ان سب امور کے سنی کی تعداد اب بھی بہت ہے خصوصاً ان راجاؤں کے علاقوں اور عسکریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار متعین نہیں ہے“

(سفرنامہ ڈاکٹر بریئر جلد دوم صفحہ ۱۷۰)

مگر اورنگ زیب نے جرات سے کام لے کر اس رسم کے قطعی طور پر امتناع کے احکامات صادر کر دیئے چنانچہ متہجینی جی بی۔ اے وکیل اپنے ایک مضمون میں جو اخبار رہنما مراد آباد کے ۸ فروری ۱۹۲۳ء کے پرچہ میں شائع ہوا ہے لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنے صوبوں کے گورنروں کو جس احکامات لکھے کہ جیسے تھے ان میں سے دسواں حکم یہی تھا کہ آئندہ سے رسم سنی قطعی طور پر ہر جگہ بند کر دی جائے۔ چنانچہ دسمبر ۱۶۶۳ء سے اس

پر غلط راہ شروع ہو گیا۔

اورنگ زیب کی وفات تک تو اس حکم پر عمل ہوتا رہا۔ مگر اس کی وفات کے بعد چونکہ اس کے جانشین لائق قابل اور طاقتور نہ تھے لہذا یہ رسم پھر جاری ہو گئی اور دہلی کے بادشاہ اپنے خانگی اور سیاسی جھگڑوں اور لٹاؤتوں میں مبتلا رہنے کے باعث اس کے انسداد کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ اور اس طرح یہ رسم پھر عام طور پر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

جب ہندوستان کی قسمت تقدیر نے انگریزوں کے حوالے کی تو انہوں نے بھی شروع شروع میں بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اور کسی تدبیر سے صلح و نرمی کے ساتھ یہ رسم دُور ہو جائے۔ مگر ان سے بھی برہمنوں نے وہی بات کہی جو مسلمانوں سے کہی تھی کہ یہ مذہبی معاملہ ہے اس میں دخل دینا مناسب نہیں ورنہ بڑا فساد ہوگا۔ مجبوراً ایٹ انڈیا کمپنی چُپ رہی۔ ۱۸۱۲ء میں کمپنی نے اپنے مجسٹریٹوں کے نام سستی کے متعلق وہی احکامات جاری کئے۔ جو مسلمان اپنے ابتدائی زمانہ میں کر چکے تھے۔ اور حکم دیدیا گیا کہ مجسٹریٹ سستی ہوتے وقت خود اطمینان کر لیا کرے کہ آیا عورت کی سستی میں ہندو شاستروں کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی اور کہ آیا عورت اپنی مرضی سے سستی ہو رہی ہے یا جبراً۔ اگر ایسا ہو تو روکیں۔ اسی اثنا میں متعدد مرتبہ پارلیمنٹ انگلستان میں اس رسم کے خلاف سرگرم مباحثے ہوتے رہے مگر چونکہ برہمن اسے مذہبی رسم بتاتے تھے اس لئے کسی کو جرأت نہ پڑی کہ ہندو کی اس رسم کے انسداد کی طرف عملی قدم اٹھاتا۔

یہ تدبیریں اور مباحثے ہو ہی رہے تھے کہ خود ہندوؤں میں سے ایک نامور شخص اس رسم کے انسداد کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ راجا رام موہن رائے تھا جو عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور انگریزی کا زبردست فاضل اور برہمو سماج کا بانی ہوا ہے۔ اُس نے اس رسم کے انسداد کے متعلق ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا۔ بیسیوں پمفلٹ اور اشتہارات اس کے خلاف شائع کئے۔ کتابیں لکھیں۔ سباحثات کئے جن میں زبردست دلائل کے ساتھ اس امر کو ثابت کیا کہ دھرم شاستریں ہرگز سستی کا حکم نہیں۔ اور یہ رسم نہایت ظالمانہ۔ وحشیانہ اور زمانہ جاہلیت کی یادگار ہے۔ اور جس قدر جلد یہ مٹ جائے اتنا ہی دنیا کو امن ملے گا۔ اُس نے گورنمنٹ کو بھی متعدد رزلویٹوں اور میموریل بھیجے اور کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ اس فاضل شخص کی تحریروں سے متاثر ہو کر کمپنی کو بھی یقین آگیا کہ دھرم شاستروں میں اس کے متعلق کوئی حکم موجود نہیں۔ اور لارڈ ولیم بینٹک نے جو اُس وقت گورنر جنرل تھے جنرل اور ملکی عہدہ داروں سے مشورہ کے بعد ۱۴ دسمبر ۱۸۲۹ء کو حکم نافذ کر دیا کہ سستی سے تمام برٹش انڈیا میں رسم سستی قطعی طور پر بند کر دی گئی۔ اس طرح راجا رام موہن رائے کی بدولت یہ رسم ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے موقوف ہو گئی۔

ہم سنی کا ایک دردناک نظارہ بھی شریک اشاعت کر رہے ہیں جس سے اس دردناک رسم کی بولناکی کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک عورت کس طرح آگ کے شعلوں میں نہا رہی ہے۔ دیکھ کر سگدل آدھی کا بھی دل کانپ جائے۔ حیرت ہے اُن بہادر عورتوں پر جو خوشی خوشی ہو جاتی تھیں اور زبان سے اُف نہ کرتی تھیں۔ راجہ رام موہن رائے جن کے سر اس کے اسداد کا سہرا ہے اور لارڈ ولیم بینٹنک جنہوں نے اس کے اقتناع کا حکم جاری کیا۔ دونوں کی تصاویر بھی ہم مضمون میں دے رہے ہیں۔



راجہ رام موہن رائے



لارڈ ولیم بینٹنک



سنی کا خوفناک نظارہ

مزارِ سعدیؒ

(ارجمتِ خواجه فیم شجاع منغی۔ بی ایس سی آنرز ایم ایس سی ایم آر ایس ایف ایس ای کلج بہاولپور)
 شہر شیراز سے سعدی کا مزار کوئی تین میل کے فاصلے پر شمال مشرقی کونے میں واقع ہے۔ دو تین کچھ میٹر کی بلندی پر جاتی ہیں۔ مگر گاڑیوں کی آمد و رفت بہت ہے۔ راستے میں وہی برساتی نالہ پڑتا ہے جس کو رودخانہ کہتے ہیں۔ مزارِ سعدی کو سعدیہ کہتے ہیں اور اس گاؤں کو جو اس کے قریب ہے اسی رعایت سے سعدیہ یا دہ سعدی کہتے ہیں۔ مزار کے گرد دور فاصلے پر پھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ خشک بے برگ و گیاہ۔ جن کے دامن میں انگور کی وسیع کاشت سیلوں تک ہوتی ہے۔ ان کو پانی آسمان سے خدا ہی بھیجتا ہے اور بس۔ انگور اچھے ہوتے ہیں۔ ایک بھدی سی شکل کی چار دیواری ہے جس کی دیوار کوئی دس فٹ بلند ہے۔ اس میں دو دروازے ہیں ایک تو مزار کے رخ کے سامنے جو کافی بڑا ہے اور لوہے کی موٹی سیخوں سے جالی دار بنایا گیا ہے۔ اوپر کی محراب کا باقی ماندہ حصہ بھی جالی بنا کر بھر دیا گیا ہے۔ دوسرا پہلو کا دروازہ جو آپ سعدی کے سامنے موجود ہے اس میں لکڑی کے طاق لگے ہیں۔ احاطے کی انتہائی لمبائی ۳۲ فٹ اور چوڑائی ۲۰ فٹ کے قریب ہے۔ (قدم سے ناپ کر)۔

مستوں کے لحاظ سے احاطہ اور مزار کے کونے کے سامنے کا بایاں اور پیچھے کا دایاں مشرق مغرب کی سمت میں واقع ہیں۔ تاہم جو قریب تر ہے۔ ہم اسی کو مشرقی دیوار قرار دے سکتے ہیں یعنی داخل ہونے کا بڑا دروازہ اس لحاظ سے جنوب کی طرف آتا ہے اور مزار کا رخ جنوبی جانب واقع ہے۔ مزار کی پشت شمالی دیوار کہلائی۔ اس تمام چار دیواری میں کوئی قبر نہیں۔ باہر اس کے فواح میں بھی کوئی قبر نہیں۔ اگر داخلی بڑے دروازے میں سے داخل ہوں۔ تو سامنے پھولوں کی چار لمبی کھاریاں ہیں جن میں درخت بھی لگے ہوئے ہیں۔ کچھ نالہ بچ کے چھوٹے چھوٹے پودے ہیں پانچ بلند و بالا چیل کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ایک نہایت شاندار سرو کا درخت دائیں طرف کی کھاری میں لگا ہوا ہے۔ باقی احاطے کے بہت سے رقبے میں پھولوں کی کھاریاں موجود ہیں جو ترتیب سے لگائی گئی ہیں۔ کچھ چیلوں کے درخت ان کھاریوں میں اب لگائے گئے ہیں اور وہ ابھی ننڈیں چھوٹے ہیں۔

عمارت اس احاطے کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ دو منزلہ عمارت۔ لمبائی ۹ فٹ چوڑائی ۲۲ فٹ۔ سامنے اوپر نیچے لکڑی کے جالیدار بستے لگے ہوئے ہیں جو اوپر نیچے پھیلے ہیں۔ اس عمارت کو کوئی تین فٹ

کوٹھڑی میں سعدی کا مزار ہے۔ بائیں طرف کے کونے کی کوٹھڑی میں شوریدہ کا مزار۔ شوریدہ ایک اندھا شاعر تھا۔ منتقی نام فصیح الملک کہلاتا تھا۔ مرثیہ موجودہ قوام نے اس کی اپنی خواہش کے مطابق یہاں مزار بنوا دیا۔ اسی کوٹھڑی میں اس کا عکس سر ہانے لٹک رہا ہے خط نستعلیق میں اُس کا اپنا پتا لکھا ہے۔ اسی کے شعرا سعدی کے مقبرے کے اندر دیواروں پر لگے ہوئے ہیں اور اُس کی اپنی قبر بھی۔ اُس کو فوت ہوئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا۔ یعنی چند سال۔ اُطاق مزار سعدی میں داخل ہونے کے دو دروازے ہیں۔ ایک تو باہر بالکل کونے میں چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا ہے۔ قفل لگا رہتا ہے۔ کھلوالینا آسان بات ہے۔ اس سامنے کے رُخ پر مزار کی تمام دیواروں پر لکڑی کے آئینہ دار بستے بنے ہوئے ہیں۔ جو اوپر نیچے پھسلتے ہیں۔ دروازہ بھی اوپر کو چڑھتا ہے۔ مگر آئینے نثار دیں۔ یعنی خلا ہے۔ ایک اور دروازہ جنوبی دیوار میں واقع ہے اس میں لکڑی کے طاق لگے ہیں۔

سعدی کی قبر کا نقوید سنگ باسی کا بنا ہوا ہے اور زمین سے کوئی ۲۰-۱۰ انچ بلند۔ پہلے ایک فراخ چوڑا چھ انچ اونچا بنا یا ہے۔ اسی قبر کا اس کا تئب آتا ہے کہ اُس کے کناروں سے چاروں پہلوؤں سے نو انچ کے قریب جگہ چھوڑ کر قبر کا نقوید کھڑا ہے جس کی اونچائی کوئی ۱۲-۱۰ انچ ہوگی۔ اس چوڑے کے کنارے پر دھات کا بنا ہوا موٹی جالی کا کتہہ لکھڑا ہے کج محکم کرنے کے لئے لکڑی کا حاشیہ اور ایک مرکزی تختی لگی ہے۔ اس لکڑی کا رنگ فیروزہ ہے۔ یہ کتہہ کوئی پانچ فٹ بلند ہوگا۔ اوپر سے کھلا ہوا۔ نقوید کے اوپر یہ لکھا ہے :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انت الباقی وصلُّ شئیْ ہالک

کریم السعایا جمیل الشیم	نبی البرایا شفیع الالم
شفیع الوری خواجہ بھٹ	امام الوری صدر دیوان حشر
امام رسل پیشوائے سبیل	امین خدا مہبط جبرئیل
شفیع مطاع نبی کریم	قسیم جمیم نسیم و سیم
نمائند بصیباں کسے درگرو	کہ دار چینیں سید پیشرو
پرفست پسندیدہ گویم ترا	علیک الصلوٰۃ نبی لوری
درو ملک بروان تو باد	برآں تو و پیر و ان تو باد
خصوصاً شنشاد لعل ہوا	علی ولی صاحب ذوالفقا
خلم باجی بنی منطلہ	کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ

اگر طاقم رد کنی در تبول
خدایت شاکفت و تجمل کرد
ترا عز و لولاک نکلیں بس است
بود اہل عالم ز وصعت لال

من دست و امان آل بول

چہ صفت کند سعد بنی ناتمام

علیک الصلوٰۃ و علیک السلام

بچے فرشتہ پریندگی بنی ہوئی درسی بھی ہے جس میں نیلے سوت سے نقش بنے ہوئے ہیں۔ اس دری پر لکھا ہے کہ یہ دری شیخ سعدی کے مزار کے لئے وقف ہے اور کسی کو اجازت نہیں کہ یہاں سے اُس کو اٹھائے۔ اس طرح سے دوسرے مزاروں پر بھی جو اسی طرح کی دریاں ہیں ان کے اندر بُنائی میں یہ حرف لکھ دیئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں تو یہ لازم ہے کہ مقبرہ میں جاتے وقت آدمی جو ناکھول لے۔ مگر یہاں یہ رواج نہیں۔ جوتا پہنے آپ اُس دری کے اوپر گھوم سکتے ہیں۔ مزاروں پر صاحبِ قبر کی تصویر لگانے کا یہاں رواج ہے۔ مشرقی دیوار کے مرکز میں شیخ سعدی کی تصویر ایک چوکھٹے میں لگی ہے۔ یہ اس اہل کا عکس ہے جو لندن کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ یہ تصویر فرش سے کوئی ساڑھے تین فٹ کی بلندی پر پتھر کے ایک ٹکڑے پر رکھی ہے جس پر خط کوئی میں عربی کے حروف کندہ ہیں۔ یہ پتھر کا ٹکڑا اس تونید کا باقی ماندہ ٹکڑا ہے جو ایک ناظمِ شریعت نے تروا دیا تھا۔ اس تصویر کے دونوں طرف دو اور چوکھٹے ہیں جن میں آئینے لگے ہوئے ہیں۔ یہ ناظمِ شریعت شیعہ تھے۔ اور سعدی کو مٹتی سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے قبر کو پائمال کر دیا۔ اور تونید کے ٹکڑے کر دیئے۔ مگر دشمن چوکند چو مہرباں باشد دوست“ وہ ناظمِ شریعت مرے اور دنیا کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ سعدی کا مقبرہ پھر سے نیا بن گیا۔

اس کو ٹھڑی کی جنوبی دیوار میں یعنی جو داخلی دروازے کے سامنے ہے تمام لکڑی کے چوکھٹے بنائے ہیں جیسے کہ شیشے لگانے کے لئے کھڑکی میں بناتے ہیں مگر شیشے نہ ارد ہیں۔ اسی پہلو میں دائیں طرف عمارت کے کونے میں بھی ایک دروازہ ہے۔ باقی تین دیواریں اینٹ کی بنی ہوئی ہیں۔ مغربی دیوار میں ایک دروازہ ہے۔ ان تینوں دیواروں کے اوپر کوئی آٹھ فٹ کی بلندی پر اشعار کی دو سطریں تینوں پہلوؤں میں برابر چلی گئی ہیں۔ ہنری مائل سنگ مرمر میں سیاہی سے لکھا ہوا ہے۔ اوپر بچہ حاشیہ آئینے کے ٹکڑوں کا بنایا ہے۔ یہ اشعار شوریدہ کے ہیں اور ان میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے قوام ملک جہانِ کرم صیب اللہ نے ان کو نئے سرے سے درست

کرایا اور مرست کیا۔

اس کمرے کی لمبائی ۸ فٹ اور چوڑائی بھی اتنی ہی ہوگی چھت سے ایک مٹی کے تیل کا ۱۴ لائن کا لمپ لٹک رہا ہے کمرے کے اندر سفیدی کی گئی ہے چھت محراب دار ہے اور ڈاٹ کا منہ شمالاً جنوباً رکھ کر بنائی گئی ہے۔ اور نوک کا خط دکھائی دیتا ہے۔

احاطے کا داخلی دروازہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے اس کے دونوں طرف کونوں پر دو نوکدار برجیاں بنی ہوئی ہیں۔ تمام احاطے میں چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے ہیں۔ جن سے گرد نہیں اڑتی۔ جگہ بہت صاف ستھری اور عمدہ ہے۔ لوگ صبح شام تعزین کے لئے آتے ہیں۔ چار شنبہ تو اس کے لئے مخصوص ہے۔ بڑی بھڑبھاڑ ہوتی ہے۔

اس احاطے کے اندر ایک قنات اگر کھلتی ہے جس کو آپ سعدی یا چاہ سعدی کہتے ہیں۔ معنی نہ رہے کہ یہاں پہاڑ میں پانی سطح زمین کے بہت قریب ہے چونکہ پہاڑ کے سر پر برف پڑی رہتی ہے اور اس کے سم کے اندر پانی جمع رہتا ہے۔ اس لئے اس میں ایک سوراخ کرتے ہیں یعنی کواں سا کھودتے ہیں۔ پانی نکل آتا ہے اس پانی کو زمین کے اندر اندر نالی بنا کر نیچے لے جاتے ہیں۔ چونکہ پہاڑ کا پہلو اونچا ہے اس لئے پانی نیچے کو چلا جاتا ہے۔ یہ نالی کافی بڑی ہوتی ہے مگر کچی۔ اس میں اکثر مقامات پر سیدھا شگاف سطح زمین تک کر دیتے ہیں تاکہ ہوا روشنی وغیرہ آئے اور کام کرنے میں آسانی ہے۔ یہ پانی زمین کے نیچے بہتا چلا آتا ہے۔ اس کی دھلوان کو کم رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد اس پانی کی اونچائی زمین کی سطح کے برابر ہو جاتی ہے چونکہ زمین زیادہ دھلوان ہوتی ہے اس پانی کو کھیتی باڑی کے کام میں لاتے ہیں۔ اور اس سے فصل پیدا کرتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک قنات احاطہ سعدیہ میں کھلتی ہے۔ مگر یہ بھی سطح زمین سے نیچے ہے۔ شاید کوئی تیس فٹ کے قریب۔ کئی سیڑھیاں نیچے جانا پڑتا ہے جو پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ نیچے جاؤ تو ایک دائرہ کی شکل میں کوئی دھواں فٹ چوڑا حاشیہ لگا ہوا ہے۔ اندر کا قطر کم و بیش ۱۲ فٹ ہوگا۔ اس کے بیچ میں پانی کی نہر چلتی ہے۔ اس مقام کے مین اوپر زمین میں سیدھا شگاف کر کے اوپر ہوا کے اخراج کے لئے جالی کی ایک ٹوپی سی بنا دی ہے۔ اس قنات کا پانی نہایت ٹھنڈا اور مزیدار ہے۔ بیچ میں پھلیاں بھی ہیں۔ یہاں سے مرد عورتیں پانی بھرنے آتے ہیں۔ شہر کے جو لوگ عورتیں مرد یہاں آتے ہیں وہ نہلتے بھی ہیں۔

اس کو آب سعدی یا چاہ سعدی کہتے ہیں۔ اچھی خاصی ایک پانی کی نہر ہے۔ کوئی تین فٹ چوڑی ڈیڑھ فٹ گہری۔ صفات شگاف سفید میٹھا اور ٹھنڈا پانی۔ یہی پانی آگے کو بتا ہے تو مزار کی زیارت کے قریب کے کونے

ہر ایک کو اس بنادیا ہے۔ اُس میں سے دُول کے ذریعے پانی نکالتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ پانی زمین کے نیچے نیچے اگے جاتا ہے۔ اس کے زور سے دو تین پن پکیاں چلتی ہیں۔ وہ بھی زمین کے اندر کافی گہرائی پر واقع ہیں۔ ایک میں دھان صاف کئے جاتے ہیں۔ پھر یہ پانی باغوں میں جاتا ہے۔ کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔ لوگ اسی میں نہاتے ہیں۔ کپڑے دھوتے ہیں اور اسی کو پیتے ہیں۔

اتفاق کی بات اور خاقان دو جہان کی قدرت ہم نے پہلی دفعہ مزار سعدی کو اس روز دیکھا جب یہاں مرد و عورتوں اور بچوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ آدمی پر آدمی گرا پڑتا تھا۔ بیل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چہار شنبہ تو یہاں کے لئے مخصوص ہے اور ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ تو سال بھر کا ایک میل ہوتا ہے۔ اتفاق سے ہم بھی اُسی روز گئے۔ اعطاء سعدی تو لشکرِ بلخ کی طرح سے پڑتا تھا۔ اس کے باہر پانی پر بہت ہجوم تھا اور یہاں لے کر شہر کی طرف کوئی ڈیڑھ میل تک پانی کی نہر کے اوپر یعنی یہی پانی نیچے کو بہتا ہے، تمام عورتیں ہی عورتیں نظر آتی تھیں۔ عورتوں کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار ہوگی اور مردوں کی ایک ہزار۔ بس یہی سمجھ لو۔ کہ جس طرح سے گندم کے ایک انبار میں چند دانے جو کے غلطی سے مل جاتے ہیں۔ اس طرح سے کوئی مردانہ چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ سیاہ ریشم کے دل بادل نظر آتے تھے۔ کالی کالی گھٹائیں سفید سفید چہرے۔ مترنم آوازیں اور کبک درہ کی چال۔

سعدیہ سے شہر کی طرف آئیں تو غالباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے سے باغِ دل کشا کی دیوار شروع ہو جاتی ہے۔ گردِ تمام اونچی اور کچی دیوار ہے۔ دروازہ جنوب کی طرف صرف ایک ہے۔ بیچ میں دو منزلہ شاندار عمارت بنی ہوئی ہے۔ دُور سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ باغ بہت سرسبز ہے اور کافی بڑا ہے۔ ہر طرح کے پودے پھل پھول کے لگے پڑے ہیں۔

اقوالِ نسیم

لوگ شکایت کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی سچا دوست نہیں ملتا۔ ان کو چاہئے۔ کہ اس بات پر غور کریں آیا وہ بھی کسی کے سچے دوست ہیں۔ اہ کسی کے واسطے وہ بھی اپنی پیاری زندگی قربان کرنے کے لئے تیار ہیں؟

(ماخوذ)

پٹا کی سیر

(لالہ کوٹورام صاحب لے بی بی ٹی سینڈ مارٹر کونستٹائی سکول کھر وڑپکا)

مجھے تعطیلات گرما میں پچھلے چند سالوں میں کشمیر شملہ - کوئٹہ - کسولی - دہم پور وغیرہ پہاڑی مقامات کی سیر کی تھی۔ یہ سیر آدیوں کو تو خاص خاص حالت میں پہاڑ جانا ہی ہوتا ہے۔ مگر تندرست اور اوسط درجہ کے آدمیوں کے لئے بھی پہاڑ ایک نہایت صحت بخش اور مفید حیثیت رکھتے ہیں۔ عام لوگوں میں یہ ایک غلط خیال بیٹھا ہوا ہے کہ پہاڑوں کی سیر تو صرف امیروں کا چوچلا ہے۔ کسی زمانہ میں شاید یہ مثال صادق آسکتی ہو مگر آج کل تو یہ بالکل خلاف واقعات ہیں۔ موجودہ سائنس کی ترقی نے دنیا کے دور دراز دشوار گزار مقامات کو نزدیک تر کر دیا ہے۔ سڑکوں اور موٹروں کی چند سالہ ترقی اور ریلوے کی نئی لائنوں کی ایجاد سے اب غریب سے غریب آدمی بھی ان مقامات کی سیر سے لطف اٹھا سکتا ہے مگر ہم لوگوں میں اس بات کا کھانا ہے کہ ہمیں ان باتوں کا مذاق ہی نہیں ہے۔ یورپ کے مالک کو لیجئے وہاں لوگ جہاں دن رات اپنے دنیاوی مخصوص اور دھندوں میں بے حد مصروف رہتے ہیں وہاں وہ اپنی تفریح و آرام کا بھی خیال رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مالک کی اوسط عمر ہندوستان سے تقریباً دو گنی ہے۔ یہ بالکل سچا ہے کہ جہاں ہم لوگوں کو کمانا نہیں آتا وہاں لطف زندگی حاصل کرنا بھی نہیں آتا۔ یہاں کے دکاندار پیشہ ور۔ ملازم اور کاشتکار زندگی کا واحد مقصد یہی سمجھتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے ان کو کم تکلیف کرنی پڑے۔ پیٹ پالنے کے لئے خواہ کتنی مشقت برداشت کر لیں مگر صبح آرام و تفریح کی طرف ذرا بھی توجہ دینے کو تیار نہیں۔ ہفتہ میں ایت وار کی رخصت منانا تو ترقی یافتہ ممالک کا معمول ہے۔ یہ تعطیل ہندوستان میں ہوتی ہے مگر یہ صرف ملازموں کے لئے ہی ہے۔ دیگر حلقہ کے لوگ بالکل نہیں جانتے کہ تعطیل کیا بلا ہے اور اس کی غرض کیا ہے۔ البتہ تیاروں کے ہوتے پر کچھ نہ کچھ مذہب کے دائرہ اثر میں کر ہی لیتے ہیں۔ انفس تو یہ ہے کہ یہاں کے ملازم لوگ بھی تو ایت وار یا تعطیل کا جائز فائدہ نہیں اٹھاتے وہ اسے محض سونے میں گزار دینے یا گھر پر دفتری نوشت و خواندیں۔ برعکس اس کے ترقی یافتہ مالک کے لوگ باہر سیر کو نکل جاتے ہیں۔ ایت وار کا تو ذکر کیا ہے یہی تعطیلات میں بھی وہ گھر پر نہیں رہتے۔ ہمسدر کی سیر کو یا کسی باہر کے خوبصورت ملک مثلاً سویٹزرلینڈ وغیرہ میں نکل جاتے ہیں اور لطف اٹھا کر اپنی تھکان رن کرتے ہیں اور تعطیلوں کے بعد نازہ دماغ اور نئی طاقت لیکر کام میں لگ جاتے ہیں۔ ہم لوگ تعطیلوں کو

HOLIDAY TRAVEL میں نہیں مناتے۔ ہمارے لئے سیر و تفریح یا تا شاخص فضول خرچی اور عبادتِ باطن ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ آپ انگریزوں کو دیکھیں معمولی رخصتوں میں بھی کوئی سیر و سفر کو جا رہا ہے کوئی شکار کر رہا ہے کوئی دریا کی سیر اور پھلی پکڑنے میں مصروف ہے کوئی گھوڑ دوڑ اور پولو میں مشغول ہے کوئی بینڈ کیمرہ لیکر ادگرد کے نظاروں کی تصویریں لے رہا ہے کوئی اپنے بال بچوں کو ساتھ لئے دریا یا نہر کے کنارے سیر و تفریح میں مصروف ہے۔ خوبصورت نظاروں اور صحت بخش ہوا اور پھل پھول کے لئے پہاڑ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں جہاں کہ تو ریت نے ایسے ولفرائڈ لے مہیا نہ کئے ہوں۔ پھر ہماری بستی ہے کہ ہم ان سے فائدہ اٹھائیں۔

چشمہ آفتاب راجپگناہ

ناظرین نے کیشمیر ریشمڈ وغیرہ کے متعلق بہت سے مضامین مفصل پڑھے ہونگے اس لئے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سال میں کم از کم ایک بار ہر ایک وسط درجہ کا آدمی چند یوم ان مقامات پر جا کر لطف اٹھا سکتا ہے اس سے نہ صرف دماغ اور جسم میں نئی طاقت و فرحت آتی ہے اور کام کرنے کی دگنی طاقت پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ بھی کہ خوبصورت نظاروں و صحت بخش ہوا اور آب سرد و گرم کے چشموں۔ پہاڑوں کے جنگلوں اور سبزہ زاروں میں پھولوں اور پھل پھول کی کثرت سے قدرت خدا کی طرف دل کچھ جاتے ہے خواہ مخواہ کی تسانی اور پُر لطف جگہ میں بیٹھ کر اس کی عبادت کرنے اور قدرت کے سراہنے کو جی چاہتا ہے خاص صحت افزا مقامات کی زندگی ضرور منگی ہے مگر ایک عارضی مسافر و سیاح کیلئے تو کوئی تکلیف نہیں اگر حضرت سفر پیدل چلکر نظاروں سے دگنا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ ریل یا موٹر کا کر ایسی ایسا نہیں کہ معمولی آدمی برداشت نہ کر سکے سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کی سیر کا جو لطف اس کو پھوٹ سے اسلام آباد دانت ناگ آٹک پیدل سفر کرنے میں آیا وہ موٹر کے ذریعے مطلق نہیں آسکتا تھا۔ ان مقامات کی خوشگوار آب ہوا کے اثر سے معمولی آدمی پندرہ یا بیس میل روزانہ پیدل چلکر بالکل نہیں آسکتا جگہ جگہ پھاؤں اور کھانے پینے کا سامان مل جاتا ہے۔ موٹریں ہر وقت دوڑ رہی ہیں۔ دیہات کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ راستے میں دو دو میل پھول پھول سے متاثر ہو سکتا ہے۔ پچھلے دنوں میرا ایک دوست صرف بیس روپے میں کشمیر کی سیر کر کے آیا اکثر حضرت مسافر اس نے پیدل کا ٹاٹا ایک ہفتہ سری نگر رہا۔ مسافروں کیلئے ہر ایک جگہ سرائیں گور دوائے اور ساجد موجود ہیں امیروں کیلئے معمولی درجہ سے اعلیٰ درجہ کے ہوٹل موجود ہیں۔ بال بچوں کے ساتھ آدمی چائے نوکھٹا رہتی ہے معمولی مکان دس بارہ پچھلے کرایہ میں لیکر کھانے پینے کے اخراجات میں گھر میں کفایت ہو جاتی ہے البتہ پہاڑیں رہ کر جو آدمی سست رہتا ہے سروز مرہ صبح شام سیر و ورزش نہیں کرتا چشموں اور نظاروں کا لطف نہیں اٹھا تا عمدہ خوراک نہیں کھاتا وہ گھانٹے میں بہتا ہے اس کے لئے پہاڑیں آنا نا بار بار ہے۔ پہاڑ کا لطف تو اسی وقت ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ وقت کھلی ہو اور سیر و تفریح میں گزاریں حتیٰ کہ جو مریض بہت کمزور ہو چکے ہوں اور پل پھر نہ سکتے ہوں ان کے لئے پہاڑ مفید ہونے کی بجائے مضر ہیں

خارِ راہ

(بابو منور لال صاحب طالب بنی لے (آئرز) ایل ایل بی پھول)

(۱)

خارِ راہ کتا ہے مجھ سے کس لئے ہوا حُر؟ کیا تری دنیا میں کانٹوں کی جگہ کوئی نہیں
سر پہ شاہوں کے دھرا ہے دیکھ تو کانٹوں کا تاج وہ شہنشاہِ باغ و صحرا جن کے ہیں زیرِ رنگیں

(۲)

اس لئے کرتا ہے غافل مجھ سے شاید اجتناب تاکہ ہو جائے نہ داماںِ نصنع تار تار
پاؤں کو میں بڑھوں تو تو ہٹ لیتا ہے اور بڑھ جائے گا کیا ناداں ترا اس سے قفا

(۳)

مُن کے میں بولا کہ جو سمجھا ہو تو میں وہ نہیں اس لئے تیرے شکوک اور سو سے ہیں سب فضول
میری دنیا میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں مرے خارِ تنہا ہی مجھے حسرت کے پھول





حفظان
صحت



فہرست مضامین

صحت و طب

دکٹر شیا ماچرن صاحب دماغی کمزوری

پیارا اور برف

دکٹر شیا ماچرن صاحب دماغی کمزوری

لحنتِ جگر

(افسر الشعر اعلیٰ سکندر صاحب جگر مراد آبادی)

ہاں چلے دوڑیں ساقی منے کلفام چلے دن چلے رات چلے صبح چلے شام چلے
 کیسے بیمار غمِ عشق کا اب کام چلے پاؤں دکھنے لگے جب اُٹھ کے وہ دو کام چلے
 بھگتے سترری دایز پر سب آپ کچھ کسی کی نہ چلی جب ترے احکام چلے
 ٹگیا فرطِ ندامت سے زبیں میں بہت تن نالے جب دل سے کل کر طرفِ بام چلے
 بے دل کی حقیقت سے تو واقف ہی نہیں باندہ ذکرِ شیخ کہاں جامہٴ احرام چلے
 نہ کچھ پاس نہیں سفر بنے چواری کی قرض مل جائے کہیں سے تو مرا کام چلے
 پاؤں لٹکائے ہوئے قبر میں بیٹھے ہیں جگر
 دیر چلنے میں نہیں صبح چلے شام چلے

صحت طلب

(جناب لالہ موہن لعل صاحب ایم اے۔ بی ٹی میڈیاسٹرکوزرنٹ ٹی سکول فاضلکا)
عام طور پر عامۃ الناس بعض باتوں کو غیر ضروری تصور کر کے ان کی جانب کم توجہ دیتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسی اشیاء جو بادی النظر میں نہایت معمولی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر انہیں نظر عمیق سے دیکھا جائے۔ تو وہی اشیاء نہایت اہم ثابت ہو جاتی ہیں۔ بعینہ یہی حالت تندرستی کی ہے جس کی طرف لوگ بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کی قدر و قیمت کو محسوس نہیں کرتے حالانکہ اگر ہم اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ تو ہمارے طلباء اور عام بھائیوں کی جسمانی حالت اتنی کمزور نہ ہو جس قدر آج ہمیں دکھائی دیتی ہے ہم وہ توجہ صحت کی طرف نہیں کرتے جو ہمیں ضروری طور پر کرنی چاہئے۔ اس بے توجہی کا خیا زہ جو ملک بھگت ہمارے سب پر چلا ہے۔

ہمارے ملک میں بیماری اور موت نے گھر بنالیا ہے۔ صحت عامہ کا یہ حال ہے کہ یہاں ہر سال دس لاکھ آدمی صرف تپید کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض بعض شہروں میں فی ہزار ۸۰۰ بچے سال میں اپنے والدین اور لواحقین کو داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ ایک ہندوستانی کی اوسط عمر ۲۴ سال ہے۔ برعکس اس کے زیادہ مذہب اور شائستہ مالک کے باشندوں کی اوسط عمر ۴۵ سے ۵۵ سال تک ہے۔ ع میں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔

ڈاکٹری سائنس کے مطابق طلباء کی صحت کا یہ حال ہے کہ آیام طفلی میں۔ ۷ فیصدی طلباء کے دانت خراب ہو جاتے۔ پچاس فیصدی کی مینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ ستر فیصدی لگے کی شکایت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ غرض صحیح الجسم طلباء کی تعداد انگلیں پر گنی جاسکتی ہے۔ اس صورت میں ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے طلباء کی صحت ویسی طمانیت بخش نہیں جیسی کہ ہونی چاہئے۔ انسانی جسم ایک بے نظیر مشین ہے۔ اس کا ایک ایک پڑہ الیا بے بہا ہے کہ اگر خداخواستہ انہی جسم سے کٹ جائے۔ تو پھر ویسی انہی مطلق نہیں بن سکتی۔ دانت ٹوٹ جائے۔ تو دنیا کے تمام دندان ساز ویسا دانت ہرگز نہیں بنا سکتے۔ قیمتی سے کہیں آنکھ بچوٹ جائے۔ تو دنیا کے تمام چشم ساز و لکڑی قدتی آنکھ نہیں بنا سکتے۔ الغرض ہر ایک۔ دانت۔ زبان یعنی جسم کا ہر ایک عضو ایک نیا پڑہ ہے۔

ہمیں خداوند کریم کا بار بار شکر یہ ادا کرنا چاہئے۔ کہ ہمارے تمام اعضا و جسم صحیح و سالم ہیں۔ ہم آنکھوں سے قدرت کے عجیب و غریب مناظر کا نظارہ بنا کر حلقہ ہوتے ہیں۔ ادا کافوں سے قدرت کی دلغریب و دلکش راہنیں لکھیں کہ مسوہ ہوتے ہیں۔ اللہ انہی سے قدرت کی کوکلوں اور بوقلوں اشیاء کا ذائقہ چکھ کر شکر یہ بیکالانے میں سو مجبور ہوتے ہیں۔

جیم قدرت کی دی ہوئی پاک امانت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس امانت میں خیانت نہ ہونے دیں۔ ورنہ ہم کو تمام عمر پھٹانا ہوگا۔ مگر صبح پھر پچھتاے کیا ہو تو جب پڑیاں چگ گئیں گھیت۔

دراغور سے سوچیں کہ ہمیں جیم کیوں عطا ہوا۔ اور جیم کا خیال رکھنا کیوں ضروری ہے؟ اس کے جواب میں کسی نے کیا خوب کہا ہے "جان ہے تو جان ہے"۔ بغیر صحت کے دنیا کی تمام نعمتیں ناکارہ ہیں۔ تمام مناظر قدرت بے معنی ہیں۔ جہاں صحت نہ ہو تو سب جہاں اپنے کاروبار میں منہمک ہیں۔ طالب علم اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ عابد اپنی عبادت میں پورا نہیں کر سکتا۔ ملک کا دبر اپنے فرائض کی ادائیگی میں قاصر رہ جاتا ہے۔ غریب اپنی شکم پروری نہیں کر سکتا۔ ان مختصر تندستی کے بنیہ علی، اخلاقی، روحانی، مجبوس اور اقتصادی ترقی نامکن ہو جاتی ہے۔ سچ ہے تندستی ہزار نعمت ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی تمام نعمتیں بیچ ہیں۔

تندرستی ہزار نعمت ہے۔
تندرستی ہزار نعمت ہے۔

مدرس کو چاہئے کہ اول تو خود صحت کے اصولوں سے بخوبی واقف ہو اور ان پر عمل پیرا ہو۔ اور پھر طلباء پر ان اصولوں کی اہمیت واضح کرے۔ اس کے علاوہ اسے عام بیماریوں کی تشخیص اور علاج معالجے کے متعلق آگاہی حاصل کرنی چاہئے۔ دانت بنیائی، گلے وغیرہ کا معائنہ کرنا سیکھنا چاہئے۔ ہفتہ وار اپنی جماعت کے طلباء کی پوشاک، ناخن اور دانتوں کا ملاحظہ کرے۔ ہر ماہ ہی ان کے گلے اور آنکھ کا ملاحظہ کرنا لازمی سمجھے۔ نیز ان کی چھاتی کا ناپ اور وزن کا ریکارڈ رکھے۔ الغرض ہر ایک طالب علم کے متعلق جسم کی صفائی، بنیائی خرابی اور دانتوں وغیرہ کے متعلق مکمل ریکارڈ رکھے۔ اور ان کے والدین سے رابطہ اچھا پیدا کر کے ان تمام کمزوریوں کے قلع قمع کرنے میں ہمت نہ کوشاں رہے۔

کم از کم ہفتہ میں ایک دفعہ ضرور طلباء کو تندرستی کے متعلق ہدایات دینی چاہئیں۔ گاہ بگاہ جماعت میں کسی ڈاکٹر صاحب کا لیکچر کرانا چاہئے۔ اور کم از جماعت میں صحت کے متعلق سوئے سوئے اصول عملی حروف میں لکھوا کر لگانے چاہئیں۔ جو فوٹو کے طور پر دیئے جاتے ہیں کبھی کبھی نشانِ حق کے ذریعہ طلباء پر صحت کے اصول منقش کرے۔ نیز بڑی جماعتوں کے طلباء کی صحت کے ٹریچر میں دلچسپی بڑھائی جائے۔

مدرسین کی مشکلات اور اس کا حل۔

اگر استاد کم فرم صحت کی شکایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پڑھائی کا کام اتنا ہوتا ہے کہ کسی اور کام کے لئے وقت نہیں۔ کرائیں یا د رکھنا چاہئے۔ کہ تعلیم کا مقصد محض طلباء کو امتحان پاس کرانا نہیں۔ بلکہ ساتھ ہی ان کی اخلاقی اصلاح اور جہاں فلاح بھی مطلوب ہے۔ مزید برآں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اگر طلباء کی صحت عمدہ ہوگی۔ تو ان کا دل روشن ہوگا۔ اور زیادہ کام کر سکیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پڑھائی میں ترقی ہوگی۔ استاد کا کام ہر شے سے پیشتر تندرستی بخش ہوگا۔

اس اہم مضمون پر جس قدر غامد فرسائی کی جائے۔ کم ہے جغرافیہ حساب اور تاریخ کی تعلیم انتظار کر سکتی ہے۔ انگریزی اور اردو کی تعلیم بھی انتظار کر سکتی ہے۔ مگر خطاں صحت اور اصول تندرستی کی تعلیم کا انتظار نہیں کیا جاسکتا۔ جب مدرسے میں کوئی ایسا پہلی جماعت میں داخل ہو۔ تو پہلی تعلیم جو اسے دینی چاہئے۔ تندرستی کے متعلق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ مدرسے کو طالب علم کے دل پر نقش کر دینا چاہئے۔ کہ اس کا اولین فرض جسم کی نگہداشت ہے۔ دماغ اور چلن کی تربیت دوسرے درجہ پر ہے۔

آج کل یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ طلباء کو حساب۔ تاریخ۔ جغرافیہ میں خوب مہارت۔ انگریزی اور اردو زبان میں خوب یاقوت ہوتی ہے۔ بلکہ سکول کا کوئی مضمون نہیں جس پر عبور نہ ہو۔ مگر صحت کے اصولوں سے مطبق شناسائی نہیں ملتی طلباء کے لئے تاریخ جغرافیہ حساب اور انگریزی پڑھنا ضروری ہے۔ مگر تندرستی کے اصولوں کا جاننا بھی بے حد ضروری ہے۔ امتحان کے دوسرے طلباء و مضامین سکول کی طرف کافی سے بھی زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ مگر اس میں یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں تندرستی کا امتحان بھی دینا پڑے گا۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ حساب اور انگریزی کا امتحان تو کبھی کبھی دینا پڑتا ہے۔ مگر تندرستی کا امتحان روزانہ دینا ہو گا۔

ہدایات دربارہ خوراک

(نوٹ)۔ صرف نمونہ کے پارت ہیں۔ ہر طرح سے مدرسے صاحب عام اصول صحت۔ صفائی۔ آنکھوں۔ ورزش کے متعلق چارٹر تیار کر سکتے ہیں۔

(۱) عمدہ۔ سادہ۔ تازہ اور مقوی غذا کھاؤ۔ اور خوب چبا چبا کر، کیونکہ ایسا کرنے سے لعاب دہن جو غذا کے معضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ بہت مقدار میں پیدا ہوگا۔ اگر بغیر چبائے غذا جلدی جلدی نکل جاؤ گے۔ تو دانتوں کا کام معدے کو کرنا پڑے گا۔ اور معدہ کمزور ہو جائے گا۔

(۲) صبح اور شام کے کھانے کے درمیان کم از کم چھ گھنٹہ کا وقفہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ غذائیں گھنٹہ سے پانچ گھنٹہ تک کے اندر معضم ہوتی ہے۔

(۳) کھانے وقت اتنا پانی مت پیو۔ جو معدے سے خارج شدہ رس کو تحلیل کر کے اس کی طاقت میں کمی پیدا کر دے اور خوراک کو تپلا اور ناقابل معضم کر دے۔ غذا کے درمیان آدھ گلاس پانی کافی ہوگا۔

(۴) کھانے میں پابندی وقت کا خیال رکھو۔ بغیر بھوک اور بھوک سے زیادہ مت کھاؤ۔ ورنہ بد معنی کا شکار ہو جاؤ گے۔

(۵) کھانے کا کچھ صاف۔ ہوا دار اور روشن ہوا درہر قسم کی گندگی سے دور ہو۔ بہتر ہوگا اگر اس کمرے کے دروازے

اور کھڑکیاں جالی دار ہوں۔ تاکہ کھیاں اندر داخل ہو سکیں۔

(۶) پکے ہوئے پھلوں کے ریس جسم کے زہر کو خارج کرتے ہیں۔ واماخ اور معدہ کو تعویض دیتے ہیں۔ اور دلی کو رحت بخشتے ہیں۔ آم۔ انگور اور گنا جن کو بڑھاتے ہیں۔ سنگترہ اور انجیر خون کو صاف کرتے ہیں۔ موٹی تلی کے لئے۔ تربوز اور انار یرقان ۔ ۔ ۔ کے لئے مفید ہیں۔ لہذا سبزیات اور پکے ہوئے پھلوں کا استعمال صحت کے لئے مفید ہے +

(۷) کچے یا گلے سڑے پھلوں۔ لال مرچ۔ کھٹائی۔ تیل والی۔ باسی اور گرد آلودہ اشیاء سے پرہیز کرو۔

(۸) کھاتے وقت خم و غصہ اور تفکرات کو پاس مت بٹھکنے دو +

(۹) ڈاکٹر ڈیوی کی رائے میں ایک معمولی آدمی کے لئے غذا کی حسب ذیل مقدار ضروری ہے :-

- (۱) پروٹین یا پروٹین ۲ - چٹانک
(۲) چٹا ہٹ و چربی - ۱/۲ چٹانک
(۳) نمک - ایسا
(۴) چینی و میدہ - ۷ چٹانک

(۱۰) کھانے سے پہلے ہاتھ دھوؤ۔ اور کھانے کے بعد تھلین یا صاف پانی سے کلی کرو +

اشیاء خوردنی میں غذائیت کی مقدار

(نوٹ) تمام اقسام کی اشیاء کی غذائیت کی مقدار دینا مشکل ہے۔ صرف غذا رکے لئے مفید خوراک کی غذائیت

کی مقدار دیکھائی ہے +

نام غذا	پروٹین کی مقدار	چربی اور نمک کی مقدار	چربی اور نمک کی مقدار	پانی کی مقدار	پانی کی مقدار	پانی کی مقدار
دودھ گائے	۴۵۱	۳۵۹	۵۲۲	۰۱۸	۸۶۵۰	۱۴۲۰
بالائی	۴۶۰	۶۵۲۰	-	۰۲۴	۲۸۵۶	۶۹۲۴
چینی	۲۸۵۴	۳۱۲۱	-	۴۲۵	۳۶۳۰	۶۴۲۰
کھن	-	۸۶۲۴	-	۰۵۸	۱۲۵۶	۸۶۲۲
دالین	۲۵۵۱	۲۲۳	۵۵۲۸	۲۲۸	۱۰۵۲	۸۶۲۰
سبز چکاری	۱۲۴	۰۲۳	۸۲۶	۰۲۸	۸۶۲۶	۱۱۲۱
تازہ پھل	۱۲۰۱	۰۵۹	۱۶۵۰	۰۲۶	۸۱۲۴	۱۸۲۵
انارچ غلہ	۱۰۵۶	۲۲۳	۶۲۲۵	۲۲۱	۱۲۲۰	۸۶۲۵

ہاتے ہیں۔

صحت اور دولت کا مقابلہ

- (۱) صحت ہو تو دولت کمائی جاسکتی ہے مگر دولت سے صحت خریدی نہیں جاسکتی۔
- (۲) دولت سے عینک خرید سکتے ہیں۔ بینائی نہیں۔
- (۳) دولت سے نرم نرم توںکیں اور گدیے خرید کر سکتے ہیں۔ نیند نہیں۔
- (۴) دولت سے لذت اور مزے دار غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ بھوک نہیں۔
- (۵) دولت سے زیورات خرید سکتے ہیں۔ خوبصورتی نہیں۔
- (۶) دولت سے پیانو۔ مارمونیم اور ستار خرید سکتے ہیں۔ طاقت شنوائی نہیں۔
- (۷) دولت سے مغزیات اور مقویات خرید سکتے ہیں۔ جہانی طاقت نہیں۔

ہدایات در بارہ حفاظت دندان

- (۱) دن رات میں دو دفعہ مسواک ضرور کرو۔ ایک بار سونے سے پہلے۔ دوسری بار سونے کے بعد یعنی صبح سویرے سونے سے پہلے مسواک کرنا زیادہ ضروری ہے۔ تاکہ کھانے کے ریزے دانتوں میں اڑے نہ رہ جائیں۔ ورنہ وہ تمام رات سڑ کر دانتوں کو خراب کر دیں گے۔
- (۲) گاہے گاہے کرکے تیل اور نمک کا نمجن ملو۔ یا ٹھپکری کو پانی میں حل کر کے غرارے کرو۔ یا کوئلہ و نمک (بڑا حصہ) کپڑ چھن کر کے ملو۔ یا کھانے کا سوڈا اور نمک کا نمجن استعمال کرو۔
- (۳) روٹی موٹے آٹے کی بنی ہوئی گاجر۔ شلغم۔ مولی وغیرہ وغیرہ خوب چبا چبا کر کھاؤ۔ تاکہ دانتوں اور جیڑوں کی ورزش ہو۔
- (۴) دو دفعہ اور میوہ جات کا خوب استعمال کرو۔ کیونکہ ان میں غذا کے وہ اجزاء شامل ہیں جو دانتوں کو مضبوط کرتے ہیں۔

- (۵) پان اور میدے سے پرہیز کرو۔ یہ دانتوں کیلئے مضر ہیں۔
- (۶) صرف مالعات پر زندگی بسر کرنا نہ سیکھو۔ ورنہ دانتوں کی ورزش نہ ہوگی۔
- (۷) یاد رکھو۔ دانتوں سے اپنی قبر نہ کھودیں۔ خراب دانتوں کی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ درج ذیل کمزوری پیدہ ہوتی ہے۔ کمزوری اور آخر کار موت ہوتا ہے۔

چار اور برف

(جناب شیاماچرن صاحب دراما میڈیکل اوفیسر)

مندرجہ عنوان دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا رواج ہمارے ملک ہندوستان میں عام اور مضبوط ہو گیا ہے۔ جبکہ ان ممالک کے باشندگان کہ جن کو ان کی ضرورت ہے اور جن سے ہم نے ان کا استعمال نقل کیا ہے۔ خود یا ان کے اطباء ریکز بان ہو کر کہہ رہے ہیں۔ کہ یہ اشیاء مضر صحت ہیں۔

نہ صرف چائے بلکہ قہوہ (کافی) اور کوکو کا استعمال بھی نقصان دہ ہے۔ اگر تکان ہو جائے۔ تو ان کو پنی لیا جائے تکان دور ہو جائے گی۔ نیند آتی ہو تو ان کے استعمال سے وہ رنچ ہو جائے گی۔ اور شبانہ روز جاگے جائیے اکلنا کھانے کا موقع نہ ہو۔ ان میں سے ایک پنی لیجئے۔ اور دو تین یوم میٹاک غذا نہ کھائیے۔ نہ نہ مصالحین ہوگا۔ نہ کمزوری محسوس ہوگی۔ بلکہ ان کے پینے سے چستی اور پھرتی آجائے گی۔ بظاہر تو بڑے ہی فائدے ہیں۔

لیکن تکان کا باعث ہے جسم میں غذا کی ضرورت۔ اور اس کا حقیقی دفیعیہ ہے کہ غذا کھائی جائے۔ مگر چائے اور قہوہ غذا نہیں جسم کا بادشاہ دلع ہے۔ مادی اشیاء تک کو آرام کی ضرورت ہے۔ نہ کہ اشرف المخلوقات کے سب سے زیادہ ضروری عضو دماغ کو اسکے آرام دیندہ اسے محروم کیا جائے۔ اسی طرح غذا نہ کھانا اور وقت گزارے جانا کیونکر مفید ہو سکتا ہے۔ نیند کا نہ آنا اور بھوک کا نہ لگنا مرض ہیں۔ اور ان کی دوا کرنا پڑتی ہے۔ جب کہ ایسی ادویہ یا اشیاء استعمال کی جائیں کہ یہ مرض پیدا ہو جائیں۔ اور ہم اس طرف متوجہ نہ ہوں؟

البتہ یہ ضرور ہے کہ چائے کی نسبت قہوہ اور قہوہ کی نسبت کوکو کم مضر ہیں۔ مگر مضر سب ہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ باقی قسم کی ادویہ ہیں۔ نہ کہ اغذیہ۔ اور دوا اور غذا میں فرق یہ ہے کہ غذا تو جز و بدن بنتی ہے اور ہر روز کھائی جاتی ہے۔ مگر دوا جز و بدن نہیں بنتی۔ اور کسی جسمانی تکلیف (یعنی بیماری کے رنچ کر نیکے لئے کسی علاج کی ہدایت کے مطابق استعمال کی جاتی ہے۔ اسی طرح بہت سی اشیاء ہیں کہ موقع و محل پر ان کا استعمال موت یا مرض سے بچاتا ہے اور بلا موقع ان کا استعمال تکلیفیں استعمال کرنا صحت کو کھودیتا ہے۔ ہم انسان اشرف المخلوقات ہیں۔ اسلئے ہمیں لازم ہے کہ عقل سے کام لیں اور بغیر سوچے سمجھے کسی کام کو نہ کریں۔

سر دھانک کے علاوہ ہندوستان کے سر دھانکوں مثلاً پھاڑوں وغیرہ پر اگر کبھی کبھار چائے وغیرہ استعمال کریں۔ اور وہ بھی کسی طبیکیے بتانے پر تو کوئی ہرج نہیں۔ یا موسم سرما میں گا ہے مابے سردی رنچ کر نیکی غرض سے۔ نیز بھی جائز ہے لیکن ملک کے دیگر گرم حصوں میں اور خصوصاً موسم گرما میں چائے وغیرہ کا استعمال سخت مضر ہے اور ہر شخص اگر ذکر کرے گا۔ تو

تجربہ اس کو ضرور ظاہر کر دے گا۔ کہ یہ پیش بالکل نوحہ ہے کہ ”گرمیوں میں گرم چارہ نہایت ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔
اب رہا برف کا استعمال۔ جسے گرمیوں کے موسم میں تشنگی رنج کرنے کی غرض سے برتا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے
خواندہ بھائی اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ برف کی تاثیر گرم ہے۔ گویا وہ راست (یا بالفعل) اس کا اثر سرد ہے۔ اس
بنیاد پر موسم گرمیاں گرم شے کا استعمال ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔

میرے ایک دوست کھانا کھاتے وقت زیادتی کے ساتھ برف ڈال کر پیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کو موعہ
اہل عیال کے سو بھینچی کی شکایت ہو گئی۔ اور جب میری ہدایت کے مطابق انہوں نے برف کا استعمال (خاص کر
کھانے کے وقت) ترک کر دیا۔ تب جاکر وہ شکایت رفع ہوئی۔

فی زمانہ دانتوں اور سوڑوں کے امراض بہت دیکھے جاتے ہیں۔ خاص کر دانتوں پر زیادہ گرم اور زیادہ سرد
اشیاں چھونے سے اس قسم کا برا اثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تیز روشنی کے آنکھوں پر پڑنے سے بصارت کو ہوتا ہے۔ اب
 واضح ہو کہ چارہ بہت ہی گرم۔ اور برف اگر پانی میں ملائی جائے۔ تو نہایت سرد پنی جاتی ہے۔ بعض صاحبان خاص کر
بچے برف کی ڈیلیاں چایا کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی مضر ہے۔ اور اس کا اندا دیکھا جانا نہایت ضروری ہے۔

چارہ۔ قہوہ کو کوئی طرح برف بھی ایک دوا ہے۔ اور دماغی امراض اور تیز بخاروں میں حرارت کم کرنے اور سکون
پیدا کرنے یا جریان خون بند کرنے کیلئے برف نہایت عمدہ شے ہے۔ دوا ہے کوئی چیز؟ صرف وہ چیز کہ جس کے
خواص و فوائد سے ہم لوگ واقف ہیں۔ چنانچہ قدرت نے ہر شے حتمی کہ مٹی۔ راکھ۔ کوئلہ اور چھوٹی سے چھوٹی حقیر سے
حقیر چیز میں انسانی امراض کو دودھ کر نیک خاصیت عطا کی ہے +

(بقیہ صفحہ ۴۸۶)

کی کوشش کے ساتھ تعلیم نسواں کے پوتر کار پر ہمدانہ تبصرہ کیا جاتا ہے۔
ایجوکیشنل گزٹ یہ ماہوار تعلیمی جریدہ جالندھر سے سردار سردار سنگھ کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ پالیسیام
ہے۔ اپنی کوششوں میں ہمنائے تعلیم کا مد مقابل ہے۔

تعلیم و تربیت۔ مولوی فیروز الدین انیسٹریٹ سنز مالکان فیروز پرنٹنگ پریس سرکلر روڈ۔ لاہور کا ماہوار ادبی رسالہ ہے۔
پریم۔ بچوں کا بالتصویر بختہ دار اخبار مولانا تاجراد لالہ چرخو لال صاحب مانتھر کی ادارت میں میسرز عطر چند کپور انیسٹ
سنز، ہاجران کتب انارکلی لاہور کی طرف سے ملک کے نو ہنالوں کی تعلیمی دھچیوں کا موجب بنا ہوا ہے۔

ہمارے تعلیمی معاصر

رہنمائے تعلیم کی جو بی کے مبارک موقع پر بمبادی ۷۷ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے، ہم نے اپنی تمام تعلیمی مبصر اہل قلم و جرائد کے نام دعوتی خطوط ارسال کئے تھے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ بعض اصحاب کثرتِ نصیحت کی وجہ سے اس علمی و ادبی لائحہ کے لطف سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔ لیکن اس نمبر کی ہمہ گیری اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم پنجاب کی تعلیمی صحافت کے متعلق حسبِ گنجائش روشنی ڈالنے کا فرض ادا کریں۔

پنجاب کے تعلیمی رسائل میں سب سے قدیم رسالہ آپ کا رہنمائے تعلیم ہے جس کا جولائی نمبر آپ کے ہاتھوں میں اس کی تاج سرگزشت کا مرتع ہے۔

روحانی - جو نصیبی رسائل کا ماہوار جریدہ ہے۔ یہ اعلیٰ تعلیمی صحافت کی سرگرمیوں کا دوسرا نقش ثانی ہے۔ اس کی بابت ڈی۔ ایس۔ پی۔ ایس۔ کے سوسائٹی لاہور کے ہاتھ میں ہے۔

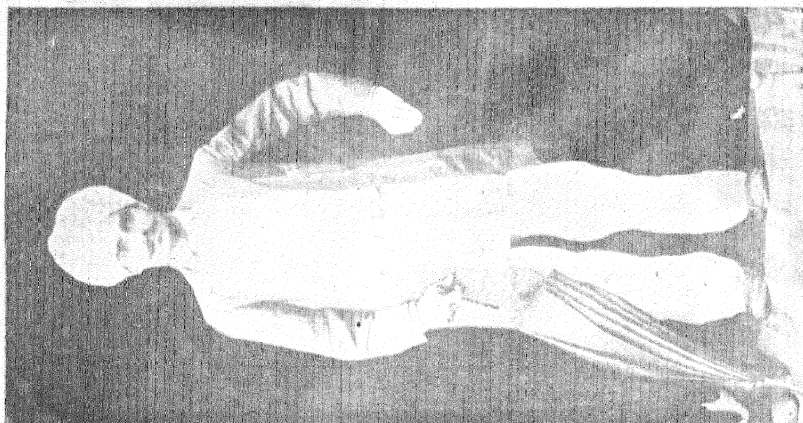
رفیقِ التعلیم اور گلِ رستہ - اصحابِ لالہ گھونامہ سہائے صاحبِ بی لے ہڈیاں ستر و پال سنگھ بائی سکول لاہور کے مرہونِ احسان ہیں۔ اعلیٰ رفیقِ التعلیم ہی پہلا رسالہ ہے جس میں تعلیمی شاہیر پنجاب کے نوٹ اور سوانح حیات شائع ہونے شروع ہوئے۔ گلدستہ بچوں کا ہفتہ وار اخبار ہے جس میں مغربی زبانوں کے تراجم کو شائع کیا جاتا ہے۔

چھوٹا بچوں کا سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار ہے جو مولوی سید ممتاز علی صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس میں قدیم الف لیلہ کے خلاف از عقل قصوں کو خوب چھتا جاتا ہے جس سے سلف کی تہذیب، مبالغہ آمیز قصے کہانیاں کا بس اتنا کر واقعیت اور حقیقت کا جامہ پہن کر مرغوب طبع ہو رہی ہے۔

نوناں - یہ پارسے نام کا ہفتہ وار بچوں کا اخبار ہزار داستان، کا توام بھائی تھا۔ ہزار داستان کی تو اب صرف داستان ہی باقی رہ گئی ہے لیکن نوناں اب بہت سی سرپرستیوں کے بعد منشی نور محمد صاحب خوشنویس کے زیرِ تہام چل رہا ہے۔

تعلیم - زیرِ ادارت منشی طالب علی صاحب پابند سابق ڈیڑھ رہنمائے تعلیم لاہور سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ جو اپنی پیمائش و حیثیت میں ایک کامیاب اخبار ہے۔

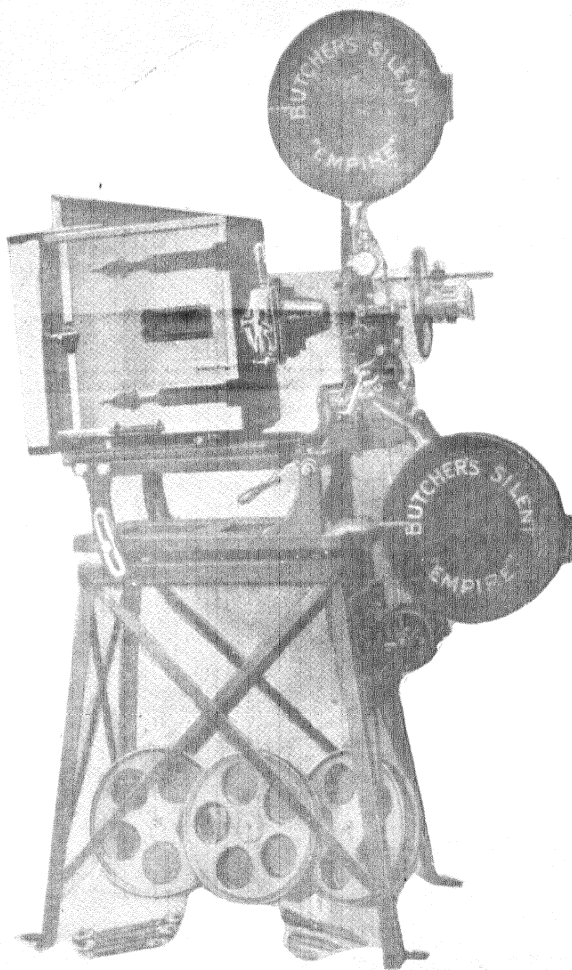
آمالیق - یہ ہفتہ وار تعلیمی اخبار زیرِ ادارت منشی فضل محمد خاں لاہور سے شائع ہوتا ہے جس میں یونیورسٹی کی تعلیمی کوششوں کی اشاعت کے علاوہ آزاد تعلیمی کوششوں کو بھی شائع کیا جاتا ہے اور استادوں اور والدین کو پاس پاس لانے



مولوی فضل الدین صاحب فیاض ہریواکویہ فیہ۔ اہم



لاہ ریم کش صاحب کھنڈہ فیہ۔ ا۔ (آئری) فیہ۔
اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس انبالہ۔



موجودہ سنی مشین

علمی مضامین

فہرست مضامین

لالہ بہاری مال صاحب سگل بی اے بی ٹی
ص ۴۸۸

لالہ دلہا خاں صاحب بی ایس سی بی ٹی
ص ۴۹۵

حضرت بیہی بی اے (آنر)
ص ۴۹۸

حضرت عشرت رحمانی رامپوری
ص ۵۰۴

لالہ گنشا داس صاحب بی اے بی ٹی
لکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور ص ۵۰۵

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر ننگ خیال
ص ۵۱۳

متحرک تصاویر

مسٹر کا پرکی کہانی اُسکی اپنی زبان

خوف

معلومات کا ایک ابتدائی وقت

لاسلکی کے معجزے

میں کون ہوں

متحرک تصاویر

(لالہ بہادی لال صاحب بی اے بی ٹی سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

متحرک تصاویر کا اصول

اگرچہ بارش زمین پر قطروں کی صورت میں ہوتی ہے۔ لیکن آسمان سے آتے ہوئے وہ اس طرح دکھائی دیتی ہے گویا پانی کی دھاریں جو وہی ہیں سلگتی ہوئی دیسلانی کو جب گھمایا جائے یا تیزی سے ہلایا جائے تو آگ کا ایک گھمراہ یا لکیر سی نظر آتی ہے۔ عام فہم والا انسان سمجھ سکتا ہے۔ کہ بارش کا قطر مایہ دیسلانی کا سلگتا ہوا سرا ایک ہی وقت میں دو جگہ پر نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن ظاہر طور پر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بارش کے قطرے پانی کی دھاروں کی شکل میں مایہ دیسلانی کا سلگتا ہوا سرا آگ کی ایک لکیر سی نظر آتی ہے۔ بہت کم اشخاص نے کبھی اس بات پر غور کیا ہوگا۔ کہ یہ ایسا کیوں ہو تاہم لیکن یہ تو شاید ہی کسی کو سوجھتا ہو۔ کہ جس قدر قی اصول پر یہ ایسا دکھائی دیتا ہے۔ اُسی اصول پر آج کل کے بڑے بڑے سینما کام کر رہے ہیں۔

اس عجبے کی وجہ قائمی نقش ہے۔ آنکھ روشنی کے لئے نہایت سریع الحس ہے۔ وہ ہر ایک چیز کو نہایت سرعت سے دیکھ سکتی ہے۔ یہاں تک کہ بجلی کی شرارہ جو سیکنڈ کے ۱۰۰۰ حصہ سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ وہ بھی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ اور اُس کا تصور اتنی ہی تیزی سے زائل نہیں ہوتا۔ تجربات سے معلوم کیا گیا ہے کہ کسی چیز کا تصور آنکھ پر ۱/۱۰ سے ۱/۱۰۰ سیکنڈ تک رہ سکتا ہے۔ اسلئے جب ہم بارش کو دیکھتے ہیں۔ تو اس سے پہلے کہ ایک قطرے کا تصور آنکھ سے زائل ہو دوسرا قطرہ سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ سب قطرے پانی کی ایک دھاری دکھائی دیتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ایک ہی چیز یا مختلف چیزوں کی کچھ حالتیں یکے بعد دیگرے آنکھ کے سامنے آتی جائیں اور ان کی رفتار ان کے تصور زائل ہونے کی رفتار سے بہت زیادہ ہو۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اگر وہ ایک ہی چیز کی مختلف حالتیں ہیں۔ تو اُس چیز کی ایک تصویر بہت دیر تک آنکھ کے سامنے رہے گی۔ اور وہ حرکت کرتی نظر آئے گی اور مختلف چیزوں کی شکلیں ہوں۔ اور وہ بھی ایک خاص ترتیب اور رفتار سے آنکھ کے سامنے سے گزریں۔ تو سب کی سب چلتی پھرتی مختلف حرکات کرتی نظر آئیں گی۔

مثلاً ایک آدمی بازار میں دوڑ رہا ہو۔ اور اس بات کی فلم تیار کی گئی ہو اور تیل ہو چکنے کے بعد ہم تماشاہ گاہ میں بیٹھے اُس کو دیکھ رہے ہیں۔ تو پہلے ہم دیکھینگے کہ آدمی نے ایک خاص جگہ سے دوڑنا شروع کیا ہے۔ دوسری تصویر میں بازار تو ویسے کا ویسا ہی نظر آئیگا۔ البتہ آدمی پہلے سے ذرا آگے ہوگا۔ اگلی تصویر میں بھی بازار ویسا ہی ہوگا۔ لیکن آدمی ذرا اور آگے پہنچ گیا ہوگا۔ اور ابھی یہ تصویر ہماری نظروں سے مٹنے نہ پائیگی کہ چوتھی تصویر میں بازار بدستور سابق اور آدمی ذرا اور آگے دکھائی دیگا۔ چونکہ تصاویر میں وقفہ بہت ہی کم ہے۔ اور وہ بہت جلد ایک دوسرے کے بعد ہماری نظروں سے گزر جاتی ہیں۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بازار کی تو وہی پہلی تصویر قائم ہے لیکن اس میں جو آدمی دوڑ رہا ہے۔ وہ بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گیا ہے۔ پس زندہ تصاویر کا یہی اصول ہے کہ ابھی ایک تصویر کا نقش آنکھوں سے مٹ نہیں ہونے پاتا کہ دوسری تصویر سامنے آجاتی ہے۔

متحرک تصاویر سازی پر سرسری نظر

اس میں کچھ شک نہیں کہ آجکل کی متحرک تصاویر کا وجود ۱۸۷۲ء اور اس کے بعد کی کوششوں اور تجربات کا نتیجہ ہے۔ لیکن ۱۸۷۲ء سے پہلے پہلے بھی کئی ایک کھلونے اسی اصول پر کام کرتے تھے جس پر آج کل کی متحرک تصاویر کام کرتی ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی نے ایک گتے کے گول ٹکڑے کی ایک طرف ایک پرندے کی شکل اور دوسری طرف پنجے کی شکل بنائی۔ اور اُس کے دونوں سروں پر دھاگہ باندھ کر زور سے گھمانے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا پرندہ پنجے کے اندر بند ہے۔ ۱۸۳۳ء میں پلیٹونامی ایک آدمی نے ایک گھلونہ تیار کیا۔ جس کا نام ”فینا کٹو سکوپ“ یعنی ”اصل کو نقل ظاہر کرنے والا“ رکھا۔ یہ ایک گتے یا دھات کا گول قرص تھا۔ اس کے کنارے کے ساتھ کسی جانور کی مختلف حالتوں کی کچھ شکلیں کھچی ہوئی تھیں۔ دونوں تصویروں کے درمیان چھوٹی سی جھری تھی۔ قرص کے مرکز میں ایک دھرا گذا کر اُسے ایک شیٹے کے سامنے گھمایا جاتا تھا۔ جھریوں میں دیکھنے سے شیٹے میں اُس چیز کی مختلف حالتوں کی تصویریں یکے بعد دیگرے نظر آتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ حرکت کر رہی ہیں۔

۱۸۶۶ء میں اسی اصول پر ایک اور آلہ ڈبلیو۔ جی۔ ہارن نے تیار کیا اس کا نام اس نے ”زندگی کا پتھر“ رکھا۔ یہ آلہ ایک سلنڈر کی شکل کا تھا۔ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند سوراخ بنائے گئے تھے۔ اور سلنڈر کی اندرونی سطح پر اُن سوراخوں کی درمیانی جگہوں پر کسی جانور کی چند تصویریں بنادی

گئی تھیں۔ جب اس آلے کو زور سے گھمایا جاتا تو سوراخوں میں سے اندرونی سطح پر بنی ہوئی تصویریں حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد سلنڈر کے اندر ہر ایک تصویر کے سامنے ایک ایک شبیہ لگایا گیا۔ اور سوراخوں میں دیکھنے سے تصویریں بکنبہ نظر آنے کی بجائے اُن کا عکس شبیوں میں نظر آتا تھا۔ اس قسم کی دوربینی ایک ایجادیں تھیں۔ لیکن وہ سب کی سب کی جانور کی چند ایک حرکتیں یا حالتیں ظاہر کر سکتی تھیں اور بار بار وہی تصویریں دیکھنے میں آتی تھیں اس لئے یہ محض کھلونے تھے۔

ہم اور لکھ چکے ہیں کہ موجودہ متحرک تصویر کے وجود کا آغاز ۱۸۲۷ء سے ہوا۔ اس سال کیلے فورنیا کے رہنے والے ایک شخص سسی ایڈوڈ سولے برخ نے ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے کی یکے بعد دیگرے چوبیس ۲۴ تصویریں اتاریں۔ اس نے چوبیس فوٹو گرافک کیمرے خریدے۔ اور اُن سب کو ایک سفید پردے کے مقابل ایک قطار میں ترتیب دیکر اُن کے مشٹروں کے ساتھ مضبوط تاکے باندھے۔ دوسری طرف تاکے سفید پردے سے بندھے تھے۔ اس کے بعد گھوڑے کو دوڑا کہ کیمروں کے سامنے سے گزرا گیا۔ جب گھوڑا دوڑتا ہوا آیا۔ تو تاکے اس کے پاؤں کے ساتھ ایک ایک کر ٹوٹتے جاتے تھے۔ تاکوں کے ٹوٹنے سے کیمروں کے مشٹر خود بخود کھلتے اور بند ہوتے جاتے تھے۔ اور اس طرح گھوڑے کی تصویر کیمرے کی پلیٹ پر اتر آتی تھی۔ سولے برخ کو اس کام میں کافی کامیابی ہوئی۔ اور وہ ایک مدت تک انہیں چوبیس کیمروں کے مختلف قسم کی تصویریں بنا بنا کر فوٹو گرافی کی مدد و سامان میں اضافہ کرتا رہا۔

اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں برس کے رہنے والے ڈاکٹر میری نے ایک نہایت عجیب آلتیار کیا جس کا نام "میری صاحب کاپسٹول تھا کیونکہ اس کی شکل بڑے پستول کی سی تھی لیکن جہاں پستول میں گولی ہوتی ہے اس آلے میں گولی کی بجائے فوٹو گرافی کا مصالحہ دار شیشے کا گول ٹکڑا تھا۔ اسے کسی طرف سے روشنی پہنچ نہیں سکتی تھی جب اس پستول کا رخ کسی چیز کی جانب کر کے گھوڑا دایا جاتا تو مصالحہ دار شیشے کا ٹکڑا اپنے مرکز کے گرد گھومنا شروع کر دیتا تھا۔ اور ہر تھوڑی دیر کے بعد ایک لمحہ کے لئے ٹھہر جاتا تھا اس طرح سے اس شیشے ڈاکٹر میری کے پستول میں شیشے کی پلیٹ استعمال کی جاتی تھی۔ مگر چونکہ یہ پلیٹ بھاری ہوتی تھی۔ اس لئے اس وقت کو حل کرنے کیلئے ڈاکٹر میری اور کئی دیگر اشخاص نے کوششیں کیں اور آخر کار ۱۸۸۷ء میں جارج ایسٹ بن نے سلولائیڈ کا فلم ایجاد کیا۔ اور یہ فلم شیشے کی پلیٹ کی جگہ کیمروں میں کام آنے لگا۔ فلم کے ایجاد نے متحرک تصویر کی دنیا میں ایک نئی جان ڈال دی۔ کیونکہ اس پر ایک ہی وقت میں بہت تصویریں اتاری جاسکتی تھیں۔ سب سے پہلے جس شخص نے فلم کے ایجاد کا فوری فائدہ اٹھایا۔ وہ امریکہ کا رہنے والا ٹامس ایڈیسن تھا۔ اس نے ۱۸۸۷ء میں سلولائیڈ فلم کو ایک سلنڈر کے گرد لپیٹ کر اس پر کئی ایک تصویریں اتاریں۔ ۱۸۹۲ء میں اُس نے ایک مشین تیار کی۔ جس کا نام "کامینٹو سگوب" رکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا آلہ تھا۔ اس میں ایک فلم پر

یہیں حرکت کی بارہ تصویریں اتاری جاتی تھیں۔

نہایت چھوٹی ٹھنڈی تصویریں کھینچی ہوئی تھیں۔ فلم کو کھلی کی روشنی پہنچتی تھی اور تصویریں دیکھنے والے کے سامنے سے ۴۶ فی سیکنڈ کی رفتار سے گذرتی تھیں۔ فلم کے ہر دوسروں پر سوراخ تھے۔ اور ایک دندانہ دار پہیہ کی مدد سے جس پر فلم چلتی تھی۔ تصویروں کی رفتار قائم رہتی تھی۔ آجکل کی فلمیں بہت کچھ اسی اصول پر کام کرتی ہیں۔ لیکن ایڈیٹس کی مشین کے ساتھ ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی متحرک تصویر کا نشانہ دیکھ سکتا تھا۔ ایڈیٹس کے بعد کئی ایک اور اس قسم کے آلے مختلف ناموں سے نکلے۔

پس اس سے ظاہر ہے۔ کہ ابتدا میں لوگوں کو حرکت کرتی ہوئی چیزوں کی تصویریں بنانے کا شوق تو ضرور پیدا ہوا۔ لیکن انہیں ان تصویروں کو ایک جگہ پر بہت سے لوگوں کو یکجا دکھانے کا خیال بالکل نہ آیا بلکہ اُس زمانے میں صرف ایسے آلے بنانے کی کوششیں ہوتی رہیں جن سے ایک ہی وقت میں ایک یا دو آدمی ان تصویروں کو دیکھ سکیں۔

ایک ہی وقت میں لوگوں کو یکجا سینما دکھانے کا خیال غالباً سب سے پہلے ۱۸۹۲ء میں ایک شخص مسی فرانسس جنکینسن کے دل میں پیدا ہوا۔ یہ شخص ان دنوں واشنگٹن کے کسی دفتر میں ملازم تھا۔ اور فرصت کے وقت متحرک تصویروں کے تجربے کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اُسے متحرک تصاویر کو پردے پر دکھانے میں کافی کامیابی ہوئی۔ شوق سے قسمت سے جس ہال میں وہ کام کیا کرتا تھا۔ اُس کو آگ لگ گئی۔ اس کے بعد جنکینسن نے ایک اور شخص مسی آرمیٹ کے ساتھ ملکر کام کرنا شروع کیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد دونوں نے تصاویر کو پردے پر دکھانے کی علیحدہ علیحدہ ایک مشین بنائی گو ان دنوں ایڈیٹس کی مشین ”کائینٹوسکوپ“ جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں بہت مقبول ہو رہی تھی۔ لیکن چونکہ جنکینسن اور آرمیٹ کی مشین سے بہت لوگ یکجا سینما دیکھ سکتے تھے۔ اس سے لوگوں نے ان کی مشین کو ایڈیٹس کی مشین پر ترجیح دی۔ یہ دیکھ کر ایڈیٹس آرمیٹ کو کچھ دے دلا کر اس بات پر رضامند کر لیا۔ کہ اس کی مشین جسے ”پرومیکٹر“ بھی کہا جاتا تھا۔ ایڈیٹس کے اپنے کارخانے میں تیار ہوا کرے۔ اس طرح سے آرمیٹ کا پرومیکٹر جو دراصل جنکینسن کی مشین کی..... نقل تھا۔ ایڈیٹس کے کارخانے میں بن کر ”ایڈیٹس وائٹا سکوپ“ کے نام سے مشہور ہو کر بازار میں فروخت ہونا شروع ہو گیا۔

۱۸۹۵ء میں لندن کے رہنے والے آر۔ ڈبلیو ہال نے بھی ایک مشین تیار کی۔ اور اُس کے ذریعے بیٹن ہال میں چلتی پھرتی تصویریں پردے پر دکھائیں۔ چونکہ ہال میں بہت شور و غل مچ رہا تھا۔ جسے سکروپولیس اس خیال سے کہ مبادا کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔ اندر لگئی۔ لیکن وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا۔ کہ لوگ متحرک تصویریں دیکھ کر خوشی کے مارے شور کر رہے تھے۔

۱۸۹۵ء میں ہی سٹرلوائے مری کی کمپنی نے ایک مشین تیار کی۔ جس کا نام انہوں نے ”ریمینٹو گراف“

رکھا۔ اسکے ذریعہ انہوں نے پیرس اور مارسلز میں متحرک تصاویر کے پُر لطف نظارے کپڑے کی سفید چادر پر دکھائے۔ سینیوگراف کے ایماوے نے تجارتی دنیا میں ایک نئی ہل چل مچادی۔ ۱۹۳۰ء میں متحرک تصاویر دکھانے کی مشینوں کے چھنے پیٹنٹ لئے گئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سینمائے لوگوں کیلئے تجارت کا ایک نیا ذریعہ پیدا کر دیا۔

آہستہ آہستہ یہ سب مشینیں ترقی کر گئیں۔ اور ان میں اور بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ موجودہ سینما مشین میں ایک لمپ کے ساتھ ایک آلہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے فلم چلتی ہے۔ فلم کے دونوں سروں پر سوراخ ہوتے ہیں۔ جو کہ دو دندانہ دار پہیوں میں لگے ہوتے ہیں۔ جب پہیے چلتے ہیں۔ تو اُن کے دندانوں کی مدد سے فلم جھٹکے کھاتی ہوئی چلتی ہے۔ جھٹکے کھانے سے یہ مطلب ہے۔ کہ ہر دو تصاویر کے درمیان ایک برائے نام وقفہ ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نہایت تیزی سے چلتی ہے۔ اسلئے ظاہر طور پر وہ ایسا کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ لیمپ کے منہ کے سامنے ایک قرص ہوتا ہے۔ جس میں سوراخ ہوتے ہیں اور وہ نہایت تیزی سے گھومتا ہے۔ اب اس کی رفتار اور پہیوں کی رفتار میں اس طرح تعلق ہوتا ہے کہ جس وقت فلم کی تصویر لیمپ کے منہ کے سامنے آتی ہے۔ قرص کا ایک سوراخ بھی عین اُسی وقت لیمپ کے منہ کے سامنے آ جاتا ہے اور طرح طرح کی تصویر کی روشنی تصویر پر ٹھہرنے دیتا ہے۔ اور تصویر ہو بہو نظر آتی ہے۔ جو نہی کہ فلم کا تصویر والا حصہ لیمپ کے منہ کے آگے سے ہٹتا ہے۔ قرص کا سوراخ بھی آگے ہو جاتا ہے۔ اور لیمپ کی روشنی فلم پر قوت نہیں پڑتی لیکن یہ سب لمحہ آنا فانا ہوتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ حرکت کا سلسلہ قائم رکھنے کیلئے ان تصاویر کا فیتہ اس قدر جلد چلایا جاتا ہے۔ اور تصاویر ایسی جلدی جلدی ایک دوسرے کے بعد سفید چادر پر آتی جاتی ہیں۔ کہ نیل منٹ سے کم عرصہ میں سولہ ہزار کے قریب تصاویر ہماری نظروں سے گزر جاتی ہیں

متحرک تصاویر کے چند شعبہ

متحرک تصاویر میں بسا اوقات ایسے حیرت انگیز واقعات اور کرتب دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ جب تک انسان ان کی اصل حقیقت سے آگاہ نہ ہو۔ یہ اندازہ لگانا بہت ہی مشکل ہوتا ہے کہ فلم بنانے والوں نے اس کا کیا انتظام کیا ہو گا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض مناظر دکھانے کیلئے کمپنیوں کو بے انتہار وسیع خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض کرتب دکھانے کیلئے ایکٹروں کی باقاعدہ مشق بہم پہنچانی پڑتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نہایت شاندار عمارتوں اور بظاہر بہت ہی مشکل کرتبوں کی تصاویر نہایت ہی معمولی طریقے سے حاصل کی جاتی ہیں۔

مثلاً بہت سے خطرناک مناظر کی تصویریں محض اُن کی سینری پردے پر پینٹ کر کے اتاری جاتی ہیں بڑے بڑے جہازوں کی تصویریں محض جہازوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونوں کو پانی میں تیرا کر اور پانی میں بجلی کی مدد سے لہروں پیدا کر کے کھینچی جاتی ہیں۔ کھلونا ڈگر گانے لگتا ہے۔ اس کی تصویر قریب سے لیکر دکھائی جاتی ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت بڑا جہاز بڑے طوفانی سمندریں موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ موٹروں کی دوڑ دکھانے کیلئے موٹروں کو محض کھڑا کیا جاتا ہے۔ اُن کے پیچھے سڑک کی سینری پینٹ کر کے پردے کو بہت تیزی سے کھینچا جاتا ہے جس سے وہ دولوں متحرک معلوم ہوتی ہیں۔ پردا بہت لمبا ہوتا ہے۔ اور جس رفتار سے کھینچا جائے۔ اُسی رفتار سے موٹریں دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ سمند کی تہ کے نیچے جو مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ اُن کی تصویریں فی الواقع سمندر میں نہیں لی جاتیں۔ پانی کا استعمال ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن کیمرو تو بذاتِ خود پانی کے باہر ہوتا ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے۔ کہ ایک بہت بڑا کمرہ تعمیر کیا جاتا ہے جس کی دیواریں نما منترشیٹ کی ہوتی ہیں۔ اس کمرے کو پانی سے بھر کر۔ فریش پرسی اور ریت بچھا کر۔ بھری پودے کھڑے کر کے اس کو بالکل سمندر کی تہ کے مشابہ کیا جاتا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر بہت سی تینیمپوں کی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور پھر اس کمرے میں ایکٹر کام کرتے ہیں اور اُن کی تصویریں اتاری جاتی ہیں۔ کشتیوں کا چلنا۔ آبدوز کشتیوں کا ڈوبنا سب کچھ اس کمرے میں دکھایا جاسکتا ہے۔ کمرے کے حجم کے مطابق کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور فوٹو گرافنگ کیمرے کی رفتار اور فاصلے کو کم و بیش کر کے چیزوں کی رفتار اور حجم کی ایسی تصویریں لی جاتی ہیں۔ کہ وہ اصلی نظر آئیں۔ اس طرح اور کبھی کئی قسم کے حادثوں میں ایکٹروں کی بجائے چھوٹی چھوٹی پتلیاں بنا کر اور اُن کو ایکٹروں سا لباس پہنا کر تصویریں اتاری جاتی ہیں۔

متحرک تصاویر کے تعلیمی فوائد

متحرک تصاویر یعنی سینما بحیثیت مجموعی انسانی زندگی پر بہت خوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ دل و دماغ کی تربیت۔ اخلاق کی بلندی۔ معلومات کی وسعت اور تفریح طبع کے لحاظ سے زمانہ حاضرہ کی یہ ایک اہم ترین مُنفید ثابت ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کے لئے سینما بے انتہا فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں سینما بہت کامیابی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ بعض صنعتی اور سائنٹیفک تجربے یا طریقے تصاویر متحرک کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ طلباء اپنی طریقوں یا تجربوں کو کتابوں میں پڑھ کر کما حقہ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب سارا اعلیٰ ان کی نظروں کے سامنے دکھایا جاتا ہے۔ تو اس کی تمام تفصیلات بہت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ مختلف سکولوں اور کالجوں کی بہت سی سرگرمیاں بذریعہ فلم دوسروں کو دکھائی جاتی

ہیں۔ جس سے اُن کے دل میں بھی ویسے شوق پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ عوام میں خصوصاً دیہات کی جاہل آبادی کے سامنے منفید خیالات اور معلومات کے پھیلائے میں سینما بڑا کام دیتا ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت کے طریقے۔ صفائی کے وسائل۔ نئے نئے زراعت کے طریقے سب بذریعہ سینما گاؤں کے لوگوں کو دکھا کر جو کام بڑے بڑے لکچروں سے نہیں نکلتا۔ وہ ایک فلم کی مدد سے باسانی انجام پا جاتا ہے۔

تصاویر متحرک تاریخ اور جیوگرافی کے مطالعہ میں کافی مدد دیتی ہیں۔ دنیا کی جو قدیم تہذیبیں اب بالکل فنا ہو چکی ہیں۔ فلموں کے ذریعہ اُن کا نقشہ پردہ تصویر پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح اور بھی سینما آموزناہی افسانے بذریعہ سینما دکھائے جاسکتے ہیں۔ تصاویر متحرک میں مختلف ملکوں کی خبریں بذریعہ فلم دکھائی جاتی ہیں۔ مختلف ملکوں کے رہنے والوں کے لباس۔ اوضاع و اطوار۔ رسوم و عادات کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے دنیا کے مشہور اور قابل دید مقامات جنہیں بہت سے لوگ عمر بھر نہیں دیکھ سکتے۔ پردہ تصویر پر گھر بیٹھے نظر آ جاتے ہیں۔ اس طرح جیوگرافی کا مطالعہ وسیع ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تصاویر متحرک اخلاقی تعلیم کیلئے بھی کسی طرح سے نقصان دہ نہیں ہیں۔ بشرطیکہ اُن تصویروں میں ایسے مناظر نہ ہوں۔ جو ہندوستانی طبائع میں آوارگی پیدا کرنے کا موجب ہو سکیں۔ کیونکہ عام طور پر جتنے بھی ڈرامے یا افسانے لکھے جاتے ہیں۔ اور انکی جنسی فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ اُن سب میں یہ اصول مد نظر رکھا جاتا ہے۔ کہ نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا عوض بُرا ہی دکھایا جائے۔ کمزور پر ظلم کرنے والا تباہ اور مظلوم کا ہمیشہ بول بالا ہوتا ہے۔ محنت اور جفا کشی ہمیشہ انسان کو بلند مرتبہ بناتی ہے۔ سستی اور کاہلی انسانی زندگی کو تباہ کرتی ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے والا انسان عیاش اور بد معاش انسانوں پر فضیلت لے جاتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ چند مستثنیات کے علاوہ سینما دیکھنے سے اخلاق پر خراب اثر نہیں پڑتا۔

سینما کی مقبولیت

آج سے پچیس تیس سال پہلے جب سینما کا آغاز ہوا بہت سے لوگوں کی یہ رائے تھی۔ کہ عوام اس کو زیادہ مدت پسند نہیں کریں گے۔ اور بہت جلد ان سے تھک جائیں گے۔ لیکن آج سینما سب سے زیادہ ہر دل عزیز و تفریح طبع ہے۔ امیر غریب۔ جاہل تعلیم یافتہ سب سے محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ تفریح روز بروز عام ہو رہی ہے۔ آج سے دس سال پہلے لندن میں صرف بیس بائیس تھیٹر تھے۔ جو متحرک تصاویر دکھاتے تھے۔ لیکن آج چھ سات سو سے بھی زیادہ ہیں۔ صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پچاس لاکھ کے

قریب روزِ شام تک دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن آج ہر بڑے شہر میں سندھ و سینما تھیٹر موجود ہیں۔ غرض متحرک تصاویر کے ایسا دینے دنیا کی راحت و تفریح اور تعلیم و تربیت میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ اور جو مقبولیت کہ انہیں عوام میں حاصل ہے۔ وہ گفتگو شامل ہو جائیگی وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ جائیگی امید ہے۔ اور اس فن میں ترقی کے عظیم الشان امکانات موجود ہیں۔

”مسٹر کاپر کی کہانی“ اس کی اپنی زبانی

میں جزیرہ سائپر س کا باشند ہوں اور اسی وجہ سے مجھے محبت آمیز لہجے میں کیو پر م بھی کہہ دیتے ہیں مجھے وینس و لونا اپنی خدمت میں ہر وقت آکھینے کی مانند رکھتے تھے۔ اس لئے میرے کوٹ پر یہ نشان ہر وقت ثبت ہوتا تھا۔ میری قوم ملک میگیں میں بھی آباد ہے۔ اکثر میری قوم کے لوگ اکیلے ہی رہتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ دیگر اقوام مثلاً گندھک۔ لوبا وغیرہ میں بھی ملکر رہنا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ باہمی محبت و پیار کی جگہ یہ اقوام میرے ساتھ ہمیشہ غداری کرتی ہیں۔ اور مجھے اپنی محنتوں میں ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

ناظرین میں کافی عرصہ سکھ کی نمیند سویا۔ لیکن میری ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ میں ایک سکاؤٹ کی مانند ہر وقت تیار اور کارآمد ہو کر خلقِ خدا کی مدد کروں۔ چنانچہ میرا دل ہر وقت تڑپتا رہتا تھا۔ لیکن نامعلوم کونسی مخالفت طاقت مجھے اٹھنے سے روکتی تھی۔ ہر ایک ملک ہر ایک جگہ یعنی انگلینڈ و روس۔ چین و جاپان۔ ہندوستان و کوستان۔ میدانِ وادی و دھولوان غرضیکہ ہر جگہ سویا۔ بلکہ یہاں تک کہ پرندوں کے پیروں میں بھی سویا۔ لیکن کہیں بھی آرام تو سکین نہ پایا۔ آخر یہاں تاملے میری سنی اور میری امداد کی اور حضرت انسان کے دل و دماغ میں وہ طاقت پیدا کی کہ میری امداد کو کمزور کر لیا۔ اور اس نے مجھے پتھروں کی قید سے کوٹ پیٹ کر پھرایا اور نمیند سے جگایا۔ لیکن جہاں کہیں میری قوم کے خیر خواہ میری جدائی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ لیکن حضرت انسان نے میرا امتحان کرنے

کے لئے کہ میں تاابد ساتھ دینے کے قابل ہوں یا نہیں مجھے مختلف قسم کے استقامت میں سے گزارا۔ بقلل بائیل گو میں نے استمان سے توبہ کی۔ لیکن میری پوری پوری چھان بین کی گئی۔ اور مجھے میرے ساتھیوں سمیت آگ میں ڈالا گیا۔ میں نہایت تیری ہائے واہلا چلائی۔ مگر کسی نے میری نہ سنی۔ بالآخر میں اپنے استمان میں کامیاب ہوا۔ اور میرے ساتھی ہوئی گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ گئے۔ اُن کے بھاگ جانے پر جب مجھے نکالا گیا۔ اور کچھ آرام دیا گیا۔ تو میں نے اپنے آپ کو گرمیوں میں گرم پانی سے غسل کئے ہوئے کی مانند صاف اور تھراپا یا میری طبیعت میں جولانی تھی۔ اور چہرہ اُس راجپوت کی مانند سرخ اور سیاہی مائل تھا۔ جس نے اپنی آن بان اور شان کے لئے ساری جوانی گرم راجپوتانہ کے صحرا میں گزاری ہو۔ سچ ہے۔ ع ”سرخ رو ہوتا ہے انسان سختیاں سہنے کے بعد۔“ اب مجھ میں اس قدر بہت ہے۔ کہ اگر آگ کے نزدیک جاؤں تو آگ کا رنگ سبز کر دیتا ہوں۔ اور یہ طاقت میں نے پر ماتا سے خاص طور پر حاصل کی ہے۔ میری ٹیڑھی اور بہادری نے حضرت انسان پر اس قدر اثر کیا کہ اُس نے مجھے اپنا ہمدم بنا لیا۔ اپنے ہر ایک کام میں لایا۔ یہاں تک کہ کھانا میں پکاؤں۔ برتن میں بناؤں۔ آرایش کا سامان میں کروں۔ جنگ ہو تو میں لڑوں غرضیکہ ہر ایک کام کی انجام دہی میں شامل ہوں۔ جیگر بعد میرا بھائی پیدا ہوا۔ رنگ تو اُس کا کالا تھا۔ اور ہوا اور پانی کی موجودگی میں میری طرح گھنٹوں میں ہل اور برسوں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن بوجہ افریقین (حبشی الاصل) ہونے کے زیادہ ممتنع اور جفاکش تھا۔ حضرت انسان میری دوستی تو ترک نہ کی۔ لیکن اُس کی ملاحت پر عاشق ہو کر اُس کو زیادہ منہ لگا لیا۔ میری شکایت پر جواب ملا۔ ع۔ ”سیرت کے ہم غلام ہیں۔ صورت ہوئی تو کیا۔“ اس کی فوقیت دیکھ کر میں جلاوت بہت لیکن کچھ پیش نہ جاسکتی تھی۔ آہزبے و وقوفانہ حسد کی جگہ میں نے رشک سے کام لیا۔ اور اپنے اوصاف بڑھانے شروع کئے اور اتنی ترقی کی کہ میں اپنے بھائی پر سبقت لے گیا۔ یہاں تک کہ آج کل حضرت انسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ میرا ہونا لازمی ہو گیا ہے۔

حضرت انسان نے قوت برقی سے وہ کام لئے ہیں۔ جن کو جنات اور جادو کی قوت نادرہ خیال کیا جاسکتا ہے۔ ہزار ہا سیلوں پر ایک جیتی جاگتی مورتی اپنا راگ اور ناچ دکھا کر غیر مالک کے لوگوں کے دلوں میں اپنے ملک کے رسم و رواج کا اثر ڈال سکتی ہے۔ آگ کا کام۔ روشنی کا کام۔ دھوپ کا کام۔ گھوڑے۔ مٹو۔ بیل۔ گاڑی۔ گائے اور گدھے کا کام غرضیکہ ہر ایک جانور کا کام اس برقی قوت سے انسان نے لے لیا ہے۔ بجلی کی گائیں اور بجلی کے سپاہی اپنا کام دکھا رہے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے ہی دم کی برکت ہے۔ اگر میں اپنی ٹانگ توڑ دوں۔ بازو اکھاڑ دوں۔ گردن مروڑ دوں یعنی میرے جسم کا کوئی بھی حصہ ٹوٹ جائے تو فوراً یہ سارے کام جو حضرت انسان اپنے لئے کر رہا ہے۔ بند ہو جائیں۔ مگر میرے ٹوٹے ہوئے اعضا کی مرہم پٹی ہوتے ہی کام فوراً

جل پڑتا ہے۔

بکلی کی رودمیرے جسم کو لپٹنے لے ایک نالی سمجھتی ہے اور نالی بھی ایسی دھولان کہ جس میں گری اور سیلی۔ چھوٹی اور پار نہنچی۔ میری قوم نے تمام دنیا پر ایسا حال پھیلایا ہے کہ چوبیس گھنٹے اور بارہ ماہ سورج اپنی روشنی اُس پر ڈالتا رہتا ہے۔ اور اس وصف سے میں سلطنت برطانیہ کا حریت ہوں۔

شہرستی کاربن ڈائی آکسائیڈ اپنے سر تاج جل بھگون پانی کو ساتھ لیکر میرے اوپر ایسا زہر اگھتی ہے۔ اور مجھے سانپ کی طرح ڈس کر اس طرح نیلا پیلا کر دیتی ہے۔ گویا میں نے اُس کی جاگ چھین لی ہے۔ مگر شکر ہے کہ میرا دوست انسان اپنی دوستی کا حق ادا کر کے اس ظالم کے رستے میں تار کول وغیرہ ڈال کر مجھے بچا لیتا ہے۔ میرے ایک دشمن سسٹر این ایچ۔ تھری (ایونیا) کو حضرت انسان نے ایسا قید کیلئے ہے۔ کہ بس قید کی کوٹھڑی میں ہی گرم اور سرد ہوتا رہتا ہے۔ سکوڑا اور پھلتا رہتا ہے۔ برف بنانے کی مشقت میں ہر وقت حضرت رہتا ہے۔ لیکن جب ڈراسی چھٹی پاتا ہے۔ تو اپنی بہن ہوا کو ساتھ لیکر میرا منہ نیلا کر جاتا ہے۔ لیکن شکر ہے کہ اس موذی کو رہائی ہی نہیں ملتی۔

میں سونے کے ساتھ لکڑی اُس کی طاقت کو بڑھا دیتا ہوں۔ چاندی سے ہلکے اُس کو جفا کش بنا دیتا ہوں۔ پتیل۔ جرسن سلور۔ کانسی وغیرہ میری ہی ذات سے مستور ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں رستم ہند نے اپنے داؤ پیچ سب کو سکھا دیے۔ لیکن بلی کی میاؤں کی کہ نہ سکھائی۔ یعنی حضرت انسان نے مجھے دوست و دشمن بنایا۔ لیکن بلی کی میاؤں سے ہمیشہ ڈرایا۔ ایسے شخص کی دوستی سے توبہ ہی بھلی جو اپنے بھائیوں کی ہڈیوں تک سے ناسفویں نکال لیتا ہے۔ اس کے پاس نائٹریک ایسڈ ایک ایسا ہتھیار ہے۔ جس سے مجھے فوراً تباہ و برباد کر کے کا پرنا کر دیتا ہے اور اپنے کاموں میں لے آتا ہے۔ اسی طرح جب مجھے سفیورک ایسڈ کے گرم تالاب میں ڈوتا ہے۔ تو میں بہت تنگ ہو کر غصہ سے سلفر ڈائی آکسائیڈ کے تنگ سے اُس پر مجبوراً وار کرتا ہوں۔ میرا غصہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ خود میری حیثیت مفقود ہو جاتی ہے۔ اور کا پرسلیفٹ بن کر بھی حضرت انسان کی دفا کا پھردم بھرتا ہوں۔ اس سے حضرت انسان ہزار ہا کام لیتا ہے۔ آنکھوں میں اُسے ڈالتا ہے۔ زخموں پر اسے لگاتا ہے۔

خوبصورت بننے کے لئے اپنے جامد عمامہ کو رنگتا ہے۔ لکڑی خراب ہونے سے بچاتا ہے۔ گند پانی صاف کرتا ہے۔ موذی جانوروں کو مارتا ہے۔ دوائی بنا تا ہے۔ بجلی تیار کرتا ہے۔ اور اس سے ہزار ہا کام لیتا ہے۔ غرضیکہ میری لاش کو بھی اس طرح کام میں لانا ہے۔ کہ غفل و دم رہ جاتی ہے۔ اور وہ کھادت صحیح ہو جاتی ہے کہ کہتے ہیں لاش کا لکھ اور مرے کا سولاکھ اس حالت میں بھی جب میرا کلا کلاٹا افریقی بھائی میری قبر پر فاتحہ پڑھے آتا ہے تو میں چالاک سے اس کو قبر میں لکڑی دنیا تک سنی خدمت کی ہوس کیلئے نظر بن کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ

مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جئے + جیتا ہے وہ جو مر گیا ہو قوم کے لئے

خوف

(ایک نفسیاتی بحث)

(حضرت بیسینی ایڈیٹر خالصستان کے قلم سے)

خوف ایک رنجیدہ جذبہ ہے۔ جو کسی آنے والے خطرے یا آفت کے علم سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ فطرت انسانی میں قدیم الایام سے موجود ہے۔ خوف اور تعجب دونوں جذبے ابتدائے آفرینش سے دوش بدوش چلے آتے ہیں۔

خوف کا بھاگ جانے کے خیال سے خاص نفع ہے۔ چوہا جب بلی کو دیکھتا ہے۔ تو خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے بھاگ جاتا ہے۔ اس کا بھل کے اندر گھس جانا اس امر کی تین دلیل ہے۔ کہ اُسے اپنے دشمن کی موجودگی کا احساس ہو گیا ہے۔ کسی جنس (نسل) کے قیام کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کہ اس کے افراد دشمنوں سے اپنی حفاظت کریں۔ اگرچہ ہر کسی بلی یا کتے کو دیکھ کر بھاگ نہ جائے۔ تو اس کی موت یقینی ہے۔ اور پھر اس کے لئے افزائش نسل کا کوئی موقعہ نہیں۔

خوف کے جسمانی اثرات عام طور پر ایسے ہوتے ہیں۔ جو خوفزدہ جاندار کو بھاگ جانے میں امداد دیتے ہیں مثلاً دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ شریانیں اور وریدیں سکڑ جاتی ہیں۔ جسم کا درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے۔ سانس مہدی جلدی آنے لگتا ہے۔ اور بعض اوقات تنفس کی آسانی کے لئے منہ کھل جاتا ہے۔ ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں۔ ٹھنڈا پسینہ آتا ہے۔ آواز بھڑا جاتی ہے۔ باضمہ کی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ جلد کانپنے لگتی ہے۔ آنکھیں بھیاں بکھل جاتی ہیں۔ پیشانی پر شکن پڑ جاتے ہیں۔ نچلا جھڑا صلاک جاتا ہے۔ بعض اوقات معدے میں درد ہونے لگتا ہے۔ اور آواز بالکل بند ہو جاتی ہے۔

مہذب انسان خوف کے اکثر جسمانی تاثرات پر قابو پالیتے ہیں۔ لیکن بچوں اور وحشی لوگوں میں یہ اثرات زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے پرندے کے شکاری پرندے سے ڈر جانے اور ایک طالب علم کے سکول ماسٹر سے خوف کھانے میں لازمی طور پر بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ اور وہ بھی درجہ کا۔ ورنہ جذبہ دونوں صورتوں میں برابر ہوتا ہے۔

خوف کے جسمانی اثرات بے شمار ہیں۔ پہلے بیان کر چکے ہیں۔ خوفزدہ جاندار کو بھلا گئے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن بعض صورتوں میں خوف اس قدر غالب آتا ہے کہ جاندار کے مرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

بھاگ جانے کے بعد چھپنے اور پناہ لینے کی صورت پیش آتی ہے۔ جس میں بالکل خاموشی کی ضرورت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حالات بالکل بدل جاتے ہیں۔ قلب کی حرکت بند ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ سانس رک جاتا ہے۔ اعضا ساکت ہو جاتے ہیں۔ بھاگنے یا بھاگنے کی تیاری میں تمام اعضا اکڑ جاتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ مرغوب جاندار بھاگے یا نہ۔ اعضا کی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ تھکاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔

انسان خوفزدہ ہو کر شاذ و نادر ہی بھاگتا ہے۔ اس تہذیب کے زمانے میں یہیں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم جسمانی طاقت کی مدد سے ان سے نہیں بچ سکتے۔ شہروں میں کبھی درندے ہمارا تعاقب نہیں کرتے۔ جو شخص جنگل میں شکار کھینچتا ہے۔ وہ بھی ٹانگوں کی نسبت اپنے ہتھیاروں پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ ہمیں بعض اوقات ٹرین یا موٹر کے راستے سے ہٹنا پڑتا ہے۔ کئی دفعہ دیوانے کتے سے ڈر کر بھاگنا پڑتا ہے۔ لیکن خوف کا مسئلہ ٹانگوں کے زور سے حل ہونے والا نہیں۔

تاہم خوف زدہ ہونے کی حالت میں ہماری جسمانی طاقتیں ہی کام کرتی ہیں۔ فرض کرو ایک شخص بینک سے کچھ روپیہ اس خیال سے چرا لیتا ہے کہ وہ اپنا کاروبار چلا کر روپیہ واپس کر دیگا۔ ایک دن اخبار کے مطالعہ سے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تمام سرمایہ تباہ ہو گیا ہے۔ غالباً اس موقع پر بھاگ جانا ہی اس کے حق میں مفید ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ فوراً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے۔ تاہم اس کے اعضا اس طرح کام کرنے لگتے ہیں۔ گویا وہ ایک شیر سے ڈر کر بھاگنے والا ہے۔ خوف کے یہ تمام مظاہرے خطرناک ہیں۔ کیونکہ اس کا دماغ مقتل ہو جائیگا۔ اور دیکھنے والے تاڑ جائینگے۔ کہ دال میں کالا ضرور ہے۔

خائن کو اس بات کا احساس ضروری ہے کہ وہ خطرے میں ہے۔ اور یہی خبر داری اس کے حق میں مفید ہے۔ ٹھٹھٹیاں بند کرنا۔ اور زور زور سے سانس لینا اور پسینہ کا آنا اس کے حق میں مفید نہیں ہو سکتے۔ بھاگنے اس کے اُسے چاہیے کہ آرام سے بیٹھے اور ٹھنڈے دل سے صورت حالات پر غور کرے۔ ممکن ہے وہ روپیہ اُدھر اُدھر سے اُدھر لے سکتا ہو۔ ممکن ہے وہ ڈائریکٹروں کو یقین دلا سکے کہ کسی اور ملازم نے خیانت کی ہے۔ شاید کسی غیر ملک کو بھاگ جانا ضروری ہو۔ یا اپنے جرم کا اقبال کر لینا۔

ایسی صورت حالات پر صرف وہی شخص قابو پاسکتا ہے۔ جس کے دل میں خوف بہت کم ہو۔ حیوانات بھی مختلف خطرات کا مختلف طریقوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی سے بچنے کے لئے اوپر لیتا

اعتیار کرتی ہے۔ اور کانٹے سے بچنے کے لئے اور طریقہ۔ اور جب خطرہ سے بچ کر نکل جاتی ہے۔ تو پھر مطلق اس کا خیال نہیں کرتی۔ یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے خطرات کے متعلق بھی سوچتا رہتا ہے اور اس کے نتائج کا خیال کر کے اپنی طبیعت کو پریشان نکلتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مہذب شخص کو مستقبل کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اور پیش آنیوالی مشکلات سے خبردار۔ مثلاً یہ کہ جاڑ آئیو الالہے۔ بڑھا پا آجائیکا۔ اعضا کمزور ہو جائینگے وغیرہ لیکن اس قسم کے خوف اس کے لئے باعث پریشانی نہیں ہونے چاہئیں۔ میرے ایک دوست کو بینک سے روپیہ قرض لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کی سالہ اچھی تھی اور وہ بغیر تکلیف کے جس قدر روپیہ چاہتا لے سکتا تھا۔ مگر اس کی جسمانی اور دماغی حالت کمزور تھی۔ ایجنٹ کے پاس جانے سے پہلے وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اُسے ڈر تھا کہ ایجنٹ روپیہ دینے سے انکار کر دیگا جب وہ بینک کے دفتر میں گیا۔ تو اس خوف کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ اس کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ اور اس کا دیوالہ نکل گیا۔

بعض اوقات ہم اپنے آپ کو بھی اس امر کا احساس دلانا نہیں چاہتے کہ ہم خوف زدہ ہیں۔ ہم سبھی بجاتے ہیں۔ مگر اموفون کا ریکارڈ سُننے لگ جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر انسان خوف سے آزاد ہوتا۔ لیکن کوئی سمجھدار انسان خوف سے آزاد نہیں۔ احمق اور دیوانے بے خوف ہوں تو ہوں لیکن بہادر سے بہادر اور دلیر سے دلیر آدمی کبھی کبھی خوف غالب آجاتا ہے۔ مگر وہ بجائے سوچنے کے اس امر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ بہادر سا ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ میدان جنگ میں جلتے ہی کلیہ گھٹنے لگتا ہے۔ جی بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ خوف طبیعت کے ساتھ مل جاتا ہے۔

اکثر خوف دلانے والی چیزیں ایسی ہیں۔ جو درحقیقت خطرناک نہیں ہوتیں۔ ایک دوست مذاق کے طور پر ہمیں نیچے سے پکڑ لے۔ اچانک شور کی آواز۔ بادل کی گرج۔ بجلی کی کڑک۔ اندھیرا اور تنہائی جو بچپن میں ڈرایا کرتے تھے۔ جوانی میں بھی وہی اثر دکھاتے ہیں۔ تعجب بعض اوقات خوف پیدا کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ بچے عام طور پر عجیب ہیئت کے انسان یا حیوان کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ اکثر خوف مابین بچوں کو سکھاتی ہیں۔ ان کی شوخی اور شرات کم کرنے کیلئے بچوں کو مختلف قسم کی دھمکیاں دیکھاتی ہیں۔ دیو یا۔ چڑیل آئی۔ سپاہی آیا۔ کوکو آئی معمولی دھمکیاں ہیں۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ جب وہ تین چار مہینے کا ہو جاتا ہے۔ تو غیر مانوس آوازیں سن کر گھبراتا ہے۔ اگر اس کو ہوا میں ملتی رکھیں۔ تو ڈرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے خوف شروع ہو جاتے ہیں۔ اجنبی لوگ۔ تنہائی۔ اندھیرا۔ آدمی۔ آگ۔ پانی وغیرہ وغیرہ خوف کا باعث ہوتے ہیں۔ گو یہ

تمام خوف اچھا اثر پیدا نہیں کرتے۔ تاہم بعض ایسے خطرے ہیں جن سے خوف دلانا بچے کے لئے ضروری ہے۔ اگر بچے کو نہ ڈرایا جائے۔ تو اس کا پانی میں کودنے یا کوٹھے سے گر جانے کا احتمال ہے۔ تجربہ بہترین معلم ہے جب بچے کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے۔ کہ ایک خاص طرز عمل تکلیف دہ نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ تو وہ فوراً باز آ جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہر ایک بچے کو خطرناک چیزوں کے متعلق واقفیت ہونی چاہیے۔ مگر انہیں اس طرح خوف زدہ نہیں بنادینا چاہیے۔ کہ وہ بڑے ہو کر بھی ان پر قابو پانے سے گریز کریں۔ بچے کو پانی سے ڈرانا چاہیے۔ مگر نہ اس قدر کہ وہ بڑا ہو کر تیرنا سیکھنے سے بھی احتراز کرے۔ چھوٹے بچوں کو بازوؤں کی بھیڑ میں گزرنے سے منع کر دینا چاہیے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نہ ہو۔ کہ وہ جوان ہو کر سڑک پر چلتا ہوا گاڑی سے ڈر جائے۔ عقول اور غیر معقول خوف میں تمیز پیدا کرنا مشکل ہے۔ اگر ایک شخص ایک مضبوط جہاز میں یورپ کو جاتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس کے دوست چند رائیں اضطراب اور پریشانی میں گذاریں۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ کوئی حادثہ ہو جائے۔ لیکن فرض کرو۔ جہاز تاریخ مقررہ پر نہیں پہنچا۔ اور نہ ہی کوئی اطلاق بندرگاہ پر آئی۔ اس مصوٰت میں پریشانی قدرتی ہے۔ اگر جہاز تاریخ مقررہ سے دو ہفتہ بعد تک بھی نہ پہنچے۔ اور یہ بھی معلوم نہ ہو۔ کہ کہاں ہے۔ تو ہم صبح طور پر فرض کر لیں گے۔ کہ کوئی مصیبت نازل ہوئی ہوگی۔ لیکن ہمارا خوف اور پریشانی ہمارے دوست کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

بعض بچوں کے سروں پر آپ نے نوٹس بورڈ دیکھے ہوں گے۔ جن پر یہ ہدایت ہوتی ہے کہ اتنے ٹن سے زیادہ وزن کی لاریاں اور چھکڑے پل پر سے نہ گذریں۔ گویا انسان متعلقہ کو یہ ڈر ہے۔ کہ اگر زیادہ وزن کی گاڑیاں گذرینگی تو پل کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے۔ ایک صبح الدماغ شخص جب کسی پل کے پاس آتا ہے۔ تو وہ بے خوف اوپر سے گذر جاتا ہے۔ مگر بعض ایسے وہی لوگ بھی ہیں۔ جو کبھی پل کے پار نہیں جاتے۔ اور اگر جلتے بھی ہیں۔ تو اوپر سے گذرتے ہوئے کانپتے ہیں۔ انہیں ہر وقت یہ خطرہ ہوتا ہے۔ کہ کہیں پل ٹوٹا ہو نہ ہو۔ کوئی تختہ اکھڑا ہو نہ ہو۔ کہیں وہ گر نہ جائیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگ ریلوے ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہوائی جہاز میں چڑھنے سے گھبراتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو خطرہ کو ایک خوشگوار چیز تصور کرتے ہیں۔ اور اپنی جان مصیبت میں ڈالنے سے نہیں گھبراتے۔

صبح الدماغ اشخاص بڑے بڑے خطرات سے بچتے ہیں۔ مگر معمولی خطروں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر ایک وہی شخص محض اسلئے لوگوں سے قطع تعلق کر کے گھر میں بیٹھ جائے۔ کہ اکثر بیماریاں وبائی ہوتی ہیں۔ جراثیم دوسرے سے لاحق ہو جاتی ہیں۔ تو ضروری نہیں کہ وہ محفوظ رہ سکے۔ ممکن ہے۔ نلوں کے پانی میں جراثیم ہوں۔ اگر وہ اپنے فلسفہ پر کاربند ہو۔ تو اپنے لئے علیحدہ کواں کھودے۔ لیکن ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ اس پانی میں بھی جراثیم

موجود ہوں۔ کیا وہ پانی پینا چھوڑ دیگا؟ شاید فلٹر کام دے سکے زیادہ پیے گا پانی ابا ل کر استعمال کرے۔ صبیح الدماغ شخص بھی اجزاء ذات فلٹر کیا ہوا۔ یا ابلا ہوا پانی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اسی صورت میں جب ہیلتھ انسر صاحب ہدایت کریں۔ کہ عام پانی استعمال نہ کیا جائے۔

پہلے زمانے میں ستیاج لوگ سفر کرنے سے پہلے دیوی دیوتاؤں کی منتیں مانا کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ خطرے سے محفوظ رہیں گے۔ فرض کیا ایک شخص سمندر میں سفر کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ بندرگاہ پر ٹھہر کر یہ دیکھ لے۔ کہ کس جہاز کی بناوٹ مضبوط اور انتظام اچھا ہے۔ تو اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ لیکن یورپ کے بعض ممالک میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو اگر امریکہ جائیں۔ تو ان کے پاؤں چومیں۔ مگر وہ محض اس خیال سے جہاز میں سوار نہیں ہونے کہ مبادا وہ بیمار ہو جائیں یا کوئی اور حادثہ پیش آجائے۔ اب ہم چند ایسے خوفوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو محض توہمات پر مبنی ہیں۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی مرد ایسی عورت سے شادی نہ کرے۔ جس کا نام اس کی ماں کے نام پر ہو۔ اور نہ ہی کوئی عورت ایسے مرد سے شادی کرے۔ جس کا نام اس کے باپ کے نام پر ہو۔ ورنہ ماں یا باپ کی موت یقینی ہے۔

زلزلے اور گرہن ہمیشہ موجب عذاب سمجھے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق اندھیرے سے ہے۔ اور اندھیرے میں ہر قسم کی مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔

آگ قدیم الایام سے خطرہ کا باعث سمجھی گئی ہے۔ افریقہ کے لوگ لوہار سے اس لئے ڈرتے ہیں۔ کہ وہ لوہا بگھلا سکتا ہے۔

امریکہ کے اصلی باشندے (ریڈ انڈین) گورے لوگوں کو دیوتا سمجھتے تھے۔ جب انہوں نے اہل یورپ کے سامان حرب کو دیکھا تو وہ سمجھے کہ جن اور پرپیاں ان کے قبضے میں ہیں۔ ازمنہ وسطی میں بڑے بڑے عالم حکیم جادوگر سمجھے جاتے تھے۔

ممالک متحدہ امریکہ میں آج بھی سیڑھی کے نیچے ٹھہرنا۔ آئینہ توڑنا۔ تیرہ مہانوں کو کھانے پر بلانا۔ ہٹل کے تیرہ نمبر کے کمرے میں ٹھہرنا۔ تیرہ تاریخ کو سفر کرنا اور جمعہ کے دن کوئی نیا کام شروع کرنا خطرناک سمجھے جاتے ہیں کیسی عجیب بات ہے۔ کہ اس قدر سمجھ دار اور عقل مند لوگ بھی اپنا وقت۔ روپیہ اور طاقت توہمات کی نذر کر رہے ہیں۔

اہل انگلستان کا عقیدہ ہے۔ کہ کوئے کا کائیں کائیں کرنا مصیبت لاتا ہے۔ اگر سانپ کسی کے سلسلے سے گزر جائے تو اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ضرور مر جائیگا۔ کئی ہمیں محض اسلئے ترک کر دی گئیں۔ کہ شگون اچھے

نہ تھے۔ چاند یا سورج کو گرہن لگ گیا۔ یا کوئی زلزلہ آگیا۔
 پُرانے لوگوں کا خیال تھا۔ کہ بجلی درحقیقت عذاب ہے جو گنہگار مردوں پر نازل ہوتا ہے۔ بادل کی گرج
 شیطان کی آواز ہے۔
 اہل یونان کا خیال تھا۔ کہ اگر بادل کی گرج دائیں طرف سے سنائی دے۔ تو نیک شگون ہے۔ لیکن اہل
 روم بائیں طرف کی گرج کو اچھا سمجھتے تھے۔ پرندوں کے اُڑنے سے خالیں لی جاتی تھیں۔
 موت سے تمام لوگ عام طور پر خائف ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ قبرستان کے پاس سے نہیں گزرتے۔
 کہیں موت کا ذکر ہو تو وہاں نہیں ٹھہرتے۔ کسی کے جنازے کے ساتھ نہیں جاتے۔
 کہا جاتا ہے۔ کہ خوف پر فتح حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ خدا پر پورا پورا بھروسہ ہو۔ اس میں شک
 نہیں کہ جو لوگ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور اس کی قدرت کے قائل ہیں۔ وہ دوسروں کی نسبت بہت کم غایف
 ہوتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ خدا ہر حالت میں ان کا مددگار ہے۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے۔ کہ
 خدا صرف انہی کی مدد کرتا ہے۔ جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ فقط

کار آمد باتیں

(۱) حلیم الطبع اور صفتی انسان کے لئے فتح و نصرت ہر وقت حاضر رہتی ہے۔

(۲) وعدے کا پورا کرنا انسان کے اعتبار کو بڑھاتا ہے۔

(۳) چھوٹے چھوٹے بڑے کاموں کو کبھی حقیر نہ سمجھو۔ کیونکہ ان سے بڑے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۴) بے اعتدالی اور بد پرہیزی سے بچنا چاہیے۔

(۵) بے وقوف کی زبان اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔

(۶) بہت سونے والا سست ہو جاتا ہے۔

(۷) دنیا میں بے وقوف زیادہ ہیں اور غفلت کم۔

(۸) بچھل سے بڑھ کر کوئی بُرا کام نہیں۔

(۹) نیکی وہ ہے جو ایک ہاتھ سے ہو اور دوسرے کو خیر بھی نہ ہو۔ نیکی کر دیا میں ڈال۔

(۱۰) اعتبار اسی کا اچھا ہے۔ جس کا تم کو تجربہ ہو جائے۔

(۱۱) اگر خرچ تمہاری آمدنی کے اندر نہیں تو یقیناً جلد تباہ ہو جاؤ گے۔

”معلومات“ کا ایک ابتدائی ورق

(حضرت عشرت رحمانی مدیر رسالہ ”نیرنگ بلی“)

موقر رسالہ ”رہنمائے تعلیم“ لاہور کے ”جولائی نمبر“ کا عظیم الشان اعلان ”وارنٹ“ کی طرح میرے سامنے ہے۔ گویا مکرمی سردار صاحب کا اصرار ”مضمون“ کی طلبی کا وارنٹ ہے جو نہایت سختی سے مضمون لکھنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔ اور میں علالت کے باعث معذور۔ تاہم مخلص احباب کی فرمائشیں جو گوارا احکام کی صورت میں صادر ہوتی ہیں، ان کی تعمیل نکرنا بھی ایک ناقابل معافی ”اخلاقی جرم“ ہے۔ جس کے ارتکاب سے میرا دل تو احتراز ہی کرتا ہے۔ علاوہ ازیں میں یہ بھی اندازہ کر رہا ہوں کہ ”جولائی نمبر“ کی تیاری غیر معمولی طور پر کیجا رہی ہے۔ سردار جگت سنگھ صاحب کا غیر معمولی شغف و انتہا کم بھی مجبور کرتا ہے کہ جس حد تک ہو سکے اس مبارک ترتیب میں ان کا ہاتھ بٹایا جائے کیونکہ ”تعلیمی دنیا“ پر سردار صاحب کے بہت کچھ احسانات ہیں اور اس سلسلہ میں ”رہنمائے تعلیم“ کے ذریعہ جو کامیاب ”جدوجہد“ انہوں نے جاری رکھی ہے۔ اُس کا صلہ آج انہیں ”جولائی نمبر“ کی صورت میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ موجودہ دور میں اردو رسالہ کے لئے اس ”منزل“ پر پہنچنا آسان نہیں حقیقت یہ ہے کہ ”بارادارات“ اٹھاتے اٹھاتے خزان ہوجاتا ہے؟ جب کہیں یہ یکٹن مدارج طے کر کے اس ”منزل“ میں رسائی ہوتی ہے۔

مبارک ہے ”رہنمائے تعلیم“ کہ دیانتداری اور کامیابی سے اپنے فرائض ادا کر کے آج ”جولائی نمبر“ شائع کرنے کے قابل ہو سکا۔ ان حالات میں سردار صاحب کی ”تعمیل“ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں لیکن حیوان ہوں کہ ”ادائیگی“ کی کیا شکل نکالوں۔ ایک علیل دماغ اس عظیم الشان ”جولائی نمبر“ میں شرکت کا کیا سامان کرے۔ بہر حال کچھ نہ کچھ پیش کرنا ضروری ہے۔ اپنی ایک نہایت ضروری اور مفید تالیف ”معلومات“ کے (تقریر) مرتبہ ترقی میری علالت سے پہلے) ابتدائی حصہ سے مختصر مضمون ”نذر“ کرتا ہوں۔ یہ کتاب نو عمر لڑکوں کو کیوں اور بچوں کیلئے مفید اور دلچسپ معلومات کا مجموعہ ہوگی۔ اس کے ہر باب کو عام فہم بنانے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ ذیل کے مضمون سے اس امر کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مختصر اقتباس ”جولائی نمبر“ میں پیش کر نیکے کے قابل ثابت ہوگا۔ اور ”تعلیمی دنیا“ میں خصوصاً پسند کیجا جائیگا۔ عشرت رحمانی

مختلف قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ اور ان کے مختلف قسم کے دماغ۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سوچنے اور غور کرنے کا مادہ کمپن ہی سے ہوتا ہے۔ جب قدر عمر بڑھتی جاتی ہے۔ اُس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ اپنے زمانہ کے ”عالی دماغ“ بن جاتے ہیں۔

بعض انسان ابتداء سے سوچنے کے عادی نہیں ہوتے۔ اور ایسے کاموں سے جن میں غور کرنا اور دماغ پر زور دینا پڑے شروع ہی سے جی چڑھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عیب ہوتا ہے کہ اگر بچے پر وائی سے اس عادت کو چھوڑنے کی کوشش نہیں کی تو ہمیشہ کے لئے ”بیکار“ اور سست بنا دیتی ہے۔ اور اس قسم کے لوگ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں کر سکتے جس سے وہ خود بڑائی اور بہتری حاصل کر سکیں۔ اور عزت دار اور مشہور بن سکیں۔ نہ تو ان کی زندگی مکملی خاص طور پر ان کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اور نہ ان کے بعد ان کی یاد داتی رہتی ہے ایسے لوگوں کو جن کے دماغ میں ابتداء سے سستی اور کھالی ہو اور سوچنے کو جی نہ چلے۔ انہیں چاہیئے کہ رزاق کی معمولی معمولی باتوں پر دماغ کو زور دیں۔ اور تھوڑی دیر ہر ایک چیز پر جو ان کے سامنے آئے ضرور غور کر لیا کریں کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ ”کیا ہے؟“ ”کس طرح بنی ہے؟“ ”کس کام کی ہے؟“ وغیرہ۔

اس تھوڑے تھوڑے غور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوچنے کی عادت ہوتی رہتی ہے۔ اور دماغ کے سستی دور ہو جاتی ہے۔

بعض گند ذہن اور سستی پسند لوگوں کا خیال ہے کہ دماغ زیادہ سوچنے اور غور کرنے سے کمزور جاتا ہے۔ یہ خیال اصلیت سے بالکل دور ہے۔ انسان کے جسم کا ہر حصہ چپ چاپ بغیر کام کئے بیٹھے رہنے سے سست اور معطل ہو جاتا ہے۔ اور اس سستی سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ محنت اور کام سے تمام بدن میں چمکرتی اور چستی آتی ہے۔

محنتی مزدور بہت کم کمزور ہوتے ہیں۔ اکثر تندرست اور ہٹے کٹے ہی دیکھے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ محنت سے کمزور نہیں ہوتے۔ ان کے ہاتھ پاؤں اور تمام بدن مزدوری اور کام سے مضبوط اور تندرست رہتا ہے۔ اسی طرح دماغ کی حالت بھی ہے۔ کہ غور کرنے سے قوت دار ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بہت زیادہ کام اور محنت کمزور کرتی ہے۔ لیکن یہ صورت ہر زیادتی میں ہے۔ کہ کثرت اور زیادتی ہر جگہ ہر کام کے لئے مُضر ہوتی ہے۔

اگر ہم دن رات محنت کرتے رہیں یا سوچتے رہیں کمزور اور بیمار ہو جائیں گے۔ مگر بالکل اسی طرح اگر ہم دن رات سست پڑے رہیں اور کوئی کام نہ کریں تب بھی کمزور ہوں گے۔ اس معلوم ہوتا ہے کہ حد سے زیادہ ہر کام اور ہر بات نقصان پہنچاتی ہے۔

ہمیں چاہیے کہ بچپن سے نشو و نما غور کر نیکی عادت ڈالیں۔ اور دماغ پر شروع سے ہی ہلکا ہلکا بوجھ دیں کہ جتنی عمر بڑھتی جائے اسی قدر دماغ کی قوت بھی بڑھتی جائے۔
بچوں کیلئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہر چیز پر ابتدا سے ہی غور کرنے اور سوچنے کے عادی ہوں کہ ان کے ذہن میں اس سے قوت آتی رہے۔

سوچنے کا طریقہ

کسی چیز کو سوچتے وقت سب سے پہلا خیال یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے دماغ میں ایک وقت میں صرف ایک ہی بات رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کچھ سوچتے ہوں تو فقط ایک ہی بات سوچیں کسی دوسری طرف دھیان نہ دیں۔ اس دماغ پر بھی زیادہ بوجھ نہیں پڑیگا۔ اور بہت جلد وہ بات سمجھ میں آجائیگی۔ اور مشکل سے مشکل مسئلہ آسانی سے حل ہو جائیگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائیگا۔ اور ایک ہی وقت میں دو باتوں کا خیال کریں تو دماغ بھی تھک جائیگا۔ اچھی طرح کوئی ایک بات بھی سمجھ میں نہ آئیگی۔ اور بہت جلد سوچنے کی طاقت بھی ختم ہو جائیگی۔ اور اس کے علاوہ طبیعت پر ایک پریشانی اور بوجھ سا ہو جائیگا۔

سوچنے کا وقت

دماغ بہت نازک چیز ہے۔ وقت بے وقت اس پر بوجھ ڈالنا بھی اچھا نہیں ہے۔ کھانا کھاتے ہی کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہ چاہئے۔ کیونکہ کھانے کا بوجھ معدے۔ دل اور دماغ پر ہوتا ہے۔ اس وقت دماغ کو آرام دینا ضروری ہے۔ اسی طرح ناشتہ سے پہلے بھی دماغ کو آرام دینا چاہئے۔ کہ معدہ جب بالکل خالی ہوتا ہے تو دماغ بھی اطمینان سے نہیں ہوتا۔ سب سے اچھا وقت دماغ سے کام لینے کا ناشتہ کے بعد ہے کہ معدہ دل اور دماغ اطمینان اور آرام سے ہوتے ہیں۔ نہ زیادہ بوجھ ہوتا ہے اور نہ خلوص۔ اس وقت تازہ تازہ دماغ میں قوت ہوتی ہے۔ کہ وہ اچھی طرح غور اور فکر کا بار برداشت کر سکے

غور و فکر کی ابتدا

بچوں کو چاہیے کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں سے سوچنا شروع کریں اور زیادہ دیر نہ دے دماغ پر نہ ڈالیں ہوتے ہوئے عادت بھی ہو جائیگی اور اسی طرح بڑے ہو کر بڑی بڑی باتیں ان کی سمجھ میں آنے لگیں گی۔
(مقتبس)

لاسکی کے معجزے

(جناب لالہ گنیش شامہ اس صاحب بی۔ اے بی۔ ٹی لکچرار سائنس ٹریننگ کالج لاہور)

تار کے ذریعے پیغام رسانی کے ایجاد نے جو نایبے غنائ کو جنٹے ہیں وہ بچہ بچہ جانتا ہے۔ سچ پوچھ تو کسی ملک میں تار کے ستونوں کا نظارنا اس ملک کی تمدنی ترقی کی ایک نشانی ہے۔ ہر ایک مہذب ملک میں سلع و معام میں سپاہیوں کے دستے کی مانند یہ ستون جگہ جگہ ریل کی سڑک کے ساتھ ساتھ دوشوار گزار گھاٹیوں گھنے جنگلوں اور اونچے پہاڑوں پر برلے تحفظ امن امان و خبر رسانی استادہ نظر آئینگے۔ لیکن اکثر طوفان اور سخت آمدنی جیسے ناگہانی آفتوں سے ان کے پاؤں اٹک رہے جانتے ہیں اور ایسی حالت میں ان کی وہی حیثیت ہوتی ہے جوڑائی میں ایک مردہ سپاہی کی۔ بحرا و قیاس میں برقی کیبل لگانے میں جن مشکلات کا سامنا ہوا اور بالآخر جس قوت اور جفاکشی سے یہ کام اختتام کو پہنچا وہ بہتوں کو معلوم ہوگا۔ لیکن جو حادثاتی محنت و جانفشانی و زور کثیر خرچ کر کے بحرا و قیاس کی کیبل چٹاؤں کے ٹکڑوں سمندر کی جانوروں کے حلقوں سے اتنا ہی محفوظ سمجھا جاسکتا ہے۔ جتنا کہ تار کا ستون طوفان اور آمدنی سے اور نہ معلوم کس وقت کیبل کے کٹ جانے سے تمام محنت و دم کے دم میں رائیگاں ہو جائے۔

یہ ہیں وہ حالات جن کے ماتحت یہ امن و امان بحرا و قیاس کی ٹھیکہ دار مدت مدید سے اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں لیکن عالمان سائنس کی ایسے ناقابل اعتقاد ٹھیکہ داروں پر جو نہ جانے کب اپنا کام چھوڑ بیٹھیں بھلا کب نسی ہو سکتی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ جب ہم اپنے دوستوں۔ رشتہ داروں سے بات چیت کرتے ہیں تو ہم تاروں کا استعمال نہیں کرتے پھر کیا وجہ ہے کہ دور و دراز بیٹھے ہوئے شخص سے گفتگو کرنے میں ہمیں تاروں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کیا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے بغیر تار کے ہی خبر رسانی ہو سکے۔ چنانچہ اس کے متعلق بڑی سرگرمی سے تحقیقاتیں شروع ہوئیں۔ اور اکثر نے محنت اور جانفشانی کی کہ دن رات ایک کر دیے۔ اور بعض بعض نے بہت زحمات اٹھائے۔ یہاں تک کہ کھانے پینے میں کمی کر کے جو روپیہ کپا دوڑائی تلاش میں صرف کر دیا۔ یہ تمام محنت آخر بھل لائی۔ اور اس سے اس درمیانی تار کو اڑا کر ہی چھوڑا۔

وائٹس یا لاسکی سائنس کے علم میں سے ایک خاص عجب ہے۔ اگرچہ اس کے ایجاد کا سہرا مار کوئی صاحب کے سر باندھا جاتا ہے لیکن دراصل اس ایجاد میں یورپ کے بہت سے باقی سائنس دانوں کا ہاتھ ہے۔ گو مار کوئی صاحب نے اس کی پہل پہل عملی یا سہ پہنایا۔ انھلستان کی کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ریاضی دان پروفیسر کلاک میکسول صاحب نے پہلے پہل جنرل غاہر کہ کہ روشنی قوت متناطیسی اور قوت برقی اس میں بہت کچھ مشابہ ہیں۔ اور جس طرح روشنی اتھیر میں توجہ پیدا ہونے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی ہے۔ اسی طرح قوت متناطیسی اور قوت برقی بھی اتھیر میں ارتعاش پیدا کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ

سکتی ہے۔ جرمنی کے پروفیسر ہرک ہرٹز صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے میکسول صاحب کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔ انہوں نے مشاعری میں نیا کھل کی لہروں کی ہستی و موجودگی تجربہ دکھلا دی۔ یہی نہیں بلکہ ان لہروں کی بہت سی خاصیتیں بھی معلوم کیں۔ اور یہی دکھلایا کہ یہ لہریں روشنی کی لہروں سے بہت باتوں میں مشابہ ہیں۔ مثلاً ان کی رفتار وہی ہے جو روشنی کی ہے یعنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ۔ ان میں اور روشنی کی لہروں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جہاں روشنی کی لہروں کی لمبائی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک کا فاصلہ (ایچ کے دس ہزاروں حصہ کے قریب ہوتی ہے۔ وہاں بجلی کی لہر کی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک کی لمبائی ایک میل کے دسویں حصہ سے لیکر دس میل تک ہو سکتی ہے۔

بجلی کی لہریں پیدا کرنے کے لئے ہرٹز صاحب نے ایک انڈکشن کوائل استعمال کیا جس کے دونوں قطب دو تیل کے لٹوؤں سے ملے ہوئے تھے۔ جب لٹوؤں کے درمیان برقی شرار پیدا ہوتا تھا تو بجلی کی لہریں پیدا ہو کر ہر چار اطراف میں دور دورہ لگتا شروع کر دیتی تھیں۔ لیکن ان لہروں کی موجودگی ثابت کرنے کے لئے ابھی کوئی آلہ تیار نہیں ہو سکا تھا۔ ہرٹز صاحب کو ایسا آلہ اتفاقاً ہی معلوم ہو گیا۔ صاحب بوضوح ایک دفعہ انڈکشن کوائل سے کچھ تجربات کرنے میں مشغول تھے کہ ان کو کسی ضروری کام کے لئے باہر جانا پڑا۔ کوائل کو شرارے پیدا کرتا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ واپسی پر ان کی نظر تار کے ایک حلقے پر پڑی۔ جو دروازے میں لٹک رہا تھا۔ اس حلقے کے دو دوسروں پر گولیاں لگی ہوئی تھیں اور یہ دونوں ایک دوسری سے کچھ فاصلے پر تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ جو بجلی انڈکشن کوائل سے شرارے بھٹکتا ہے۔ اس حلقے میں بھی گولیوں کے درمیان شرارے پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ دریافت تھی جس کے پیچھے سائنس دان مدت سے پڑے ہوئے تھے۔ اس آلے کے ایجاد سے وائرلیس ٹیلیگرافی کا ایجاد شروع ہوا۔ اس آلہ کا نام ہرٹز صاحب کا ڈی ٹیکٹر ہے۔ یہ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ آلہ اتنا نازک نہیں کہ بجلی کی لہروں کو کوائل سے بہت دور فاصلہ پر جانچنے کے قابل ہو چنانچہ جلد ہی کئی نازک آلے اس مطلب کے لئے ایجاد ہوئے۔ ان سب میں قابل ذکر وہ آلہ ہے جو مارکونی صاحب نے بنایا۔ اس کو مارکونی کا مہیرا کہتے ہیں۔ اس آلہ کی مدد سے مارکونی صاحب وائرلیس پیغام دور کے فاصلے پر سننے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے ہرٹز صاحب کے لہریں پہنچانے والے آلے میں بھی ایک ایذا دہی کی یعنی اس آلے کے دونوں لٹوؤں کو دو بہت بڑے نیگے تاروں سے ملا دیا۔ ایک تار کو بہت اونچا ہوا میں قائم کر دیا اور دوسرا ایک تانبے کے پتھرے کے ساتھ ملا کر زمین میں گاڑ دیا۔ اس طریقے سے بجلی کی لہریں بہت دور کے فاصلے پر پہنچائی جانے لگیں۔ اتنی تم کے دو تار جو حاصل کرنے والے مقام پر بھی لگا دیئے گئے اور کوہیر کے ساتھ مربوط کر دیئے گئے۔ ان تاروں کی لمبائی بعض وقت تین تین سو فٹ کے قریب ہوتی ہے۔ ان کو انگریزین ٹرانسمیٹنٹ کہتے ہیں۔ اس ایجاد نے بہت دور کے فاصلے پر بجے تار پیغام رسانی کو ممکن بنا دیا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں مارکونی صاحب نے بے تار کے ذریعہ پیغام رسانی کے ایک آلہ کا سب سے پہلا پیشٹ لیا اور ۱۸۹۹ء میں رودبار انگلستان کے اُس پار ساحل فرانس تک بے تار کا سلسلہ پیغام رسانی قائم ہو گیا۔

مکن ہے وائرلیس میں اس قدر صحت انگیز ترقی نہ ہوتی اگر پروفیسر ٹینگ صلب ایک انوکھا ایجاد نہ کرتے۔ انہوں نے

۱۹۱۹ء میں ایک آلہ بنایا جس نے وائرلیس ٹیلیفون یعنی بے تار دور دراز فاصلہ پر گفتگو کرنا ممکن بنا دیا۔ پہلے شرارے سے لہریں پیدا کرنے کے طریقے میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ یہ لہریں مسلسل نہ ہوتی تھیں۔ چہنچہ شرارہ پیدا ہوتا یہ لہریں جاری ہو جاتیں لیکن آگنا فائنا شرارے کے غائب ہو جانے سے لہروں کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا اور دوسرا شرارہ پیدا ہونے پر پھر لہریں پیدا ہو جاتیں۔ ٹیلینگ صاحب کا آلہ نہ صرف برقی لہروں کی ہستی کو بہت دور کے فاصلے پر محسوس کرنے میں مدد دینے لگا بلکہ مسلسل لہریں پیدا کرنے کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس آگے کا نام ٹریسٹاٹک ملو ہے۔ یہ آلہ کبلی کے کیپ کی مانند نظر آتا ہے۔ اوڈیکل کے کیپ کی مانند اس کے اندر ایک باریک فلزی تار ہوتا ہے۔ جس کو کبلی کی بیٹری سے بجلی کے کیپکے تار کی مانند روشن کیا جاتا ہے۔ اس آلہ کی مدد سے ۱۹۱۹ء میں تقریباً شتر میل کے فاصلہ پر بغیر تار گفتگو میں کامیابی ہوئی۔ لیکن اب تو اس طریقہ نے اس قدر ترقی کی ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں بغیر تار گفتگو کی جاسکتی ہے۔

۱۹۲۳ء میں امریکہ کی ایک کبلی کمپنی نے بے تار کے ٹیلیفون سے ایک اور کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے بے تار کے پیام رسانی کے آلہ کے سامنے گانے کی شین پر مختلف قسم کے ریکارڈ لگانے شروع کئے۔ رات بعد انہوں نے بینڈ باجہ اور راگ سنانے شروع کئے۔ جس جس نے اُن کو سنا۔ وہ بہت محفوظ ہوا۔ تو اُس کے دن گرجا گھر میں لوگوں کو بائبل سنانا جلانے لگی۔ ایک موقع پر ایک پادری نے ایک ہی وقت دو گرجا گھر میں اپدیش کیا۔ وہ ایک گرجے میں مائی کروفون کے سامنے بولنے لگا اور اس کی آواز الیکٹرک صوت کی مدد سے لوگوں نے دوسرے گرجے میں سنی۔ انگلینڈ میں تھیں مار کوئی کمپنی سی طرح لوگوں کو راگ وغیرہ سننے شروع کئے اور اس کمپنی کے پروگرام ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر ناروے سپین۔ اٹلی میں سنے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں انگلستان میں اس کام کے لئے ایک کمپنی بن گئی۔ اور اب تو انگلستان کے بڑے بڑے شہروں لندن۔ برمنگھم۔ مانچسٹر۔ رگبی وغیرہ میں اور دیگر ممالک میں بھی ایسی کمپنیاں بن گئی ہیں۔ جو شہر مشہور گویوں کے راگ۔ بینڈ باجہ۔ بڑے بڑے کچھاروں کے کچھ ڈیسے اور لطائف وغیرہ بذریعہ آلات بے تار ٹیلیفون ایک مرکزی مقام سے دوسرے مقامات پر بھیجی رہتی ہیں۔ ہر شخص جو اس مرکزی مقام سے بہت دور نہ ہو۔ ایک بہت معمولی کم قیمت آلہ استعمال کر کے گھر بیٹھا ان راگوں اور تقریروں کا لحظہ اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ یاتو روز صبح کے اخبار میں یا ہفتہ واری رسالے کی صورت میں یہ کمپنیاں اپنا پروگرام شائع کر دیتی ہیں۔ اور ہر دن مرد و بچہ بوڑھا اپنے کان سے ٹیلیفون لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ یا اونچا سننے والے ٹیلیفون کے سامنے آکر موجود ہوتا ہے۔ اور لذت مقررہ پر راگ۔ تقریر۔ بینڈ باجہ وغیرہ مستار رہتا ہے۔ اس طریقہ کو براڈ کاسٹنگ اور ان کمپنیوں کو براڈ کاسٹنگ کمپنیاں کہتے ہیں۔

راگ۔ بینڈ باجہ۔ لیکن سنانے کے علاوہ براڈ کاسٹنگ انسان کی بہبودی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک نوجوان لندن کے ہسپتال میں سخت بیمار ہو گیا۔ اس کی اپنی والدہ سے جو لندن سے دور کسی گاؤں میں رہتی تھی ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن وہ ٹیلیفون پر اس کے ساتھ بات چیت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی والدہ کے گھر میں یا اس پاس کوئی ٹیلیفون

نہیں تھا۔ تاہم اگر اس وقت تمام ہند ہو چکے تھے۔ براڈ کاسٹنگ کمپنی نے کمال ہندوئی سے اپنا پروگرام ہند کر کے اس کی ماں کو پیغام بھیجا۔ انہوں نے اس شخص کی ماں کا پورا پتہ پروگرام سننے والوں کو سنایا۔ اور ان سے درخواست کی۔ کہ جو کمپنی اس شخص کی ماں کے گاؤں یا گھر کے آس پاس ہو فوراً اس کو اطلاع کر دے کہ وہ ہسپتال میں آ کر اپنے لٹکے کو ملے۔ سینکڑوں سننے والوں کو یہ پیغام پہنچا جنہوں نے اس عورت کو اس کی اطلاع دی۔ اس عورت مذکور کو تین منٹ کے اندر اندر خبر مل گئی تین منٹ کے بعد اس عورت کو ہسپتال پہنچانے کیلئے اپنی موٹر کار میں پیش کیں۔ لیکن ایک شخص نے جو یہی یہ پیغام پایا فوراً موٹر لے کر اس عورت کو چھڑا کر نزدیک ایسے اسٹیشن چھوڑ آیا۔ اور وہ جہاں سے ڈاک گاڑی سے روانہ ہو کر رات کے بارہ بجے ہسپتال پہنچ گئی۔ اس طرح کسی پیغام اُن اشخاص کو جن کا پتہ کسی کو معلوم نہ ہو صرف ہوائیوں کی معرفت جن میں لوگ عموماً بڑے شہر میں ٹھہرتے ہیں پہنچائے جاتے ہیں۔

بے تار کے ٹیلیفون سے بحر شمالی کے سیاح لوگوں کی دلچسپی کے لئے بھی سامان مہیا کیا جاتا ہے خیال کرو اس سیاح کی خوشی کس قدر ہوگی جو خشکی سے اور انسان کی بستی سے ہزاروں میل دور سمندر میں ٹیلیفون کان سے لگا کر روزانہ نہ صرف اپنے ملک کی خبریں بلکہ راگ۔ بینڈ باجہ۔ اور مشہور لکچراروں کے لیکچر تک سُن سکتا ہے۔ براڈ کاسٹنگ کمپنیاں سننے والوں کو صحیح وقت کی بھی اطلاع پہنچاتی ہیں۔ اور سب سننے والے اپنی اپنی گھڑیاں درست کر لیتے ہیں۔ اور سمندر میں پلٹتے ہوئے جہاز کے انفر کوئی ٹھیک منت کا پتہ لگ جاتا ہے جس سے وہ طول بلد معلوم کر کے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ وہ کون سے سمندر میں سفر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں موسمی حالت کی رپورٹیں مثلاً ہوا کا رخ اور رفتار۔ بیرونی گرمی۔ طوفان۔ آئس برگ کی حرکات وغیرہ کی اطلاع بھی تیار کر کے سلسلہ پیغام رسانی سے جہازوں کو پہنچ جاتی ہیں۔ آج کل کوئی جہاز ساحل نہیں چھوڑ سکتا جب تک اس کے اندر ٹیلیس کا آلہ نہ ہو۔ اس آلہ نے جہازوں کی بے وقت مدد کرنے اور انہیں آفتوں سے بچانے کے لئے نہایت اہم خدمات سر انجام دی ہیں۔ چنانچہ ایک فدا ایک جہاز جس میں پانچ سو مسافر سوار تھے۔ وسط سمندر میں طوفان کے نوحے میں پھنس گیا۔ اور انفالٹا کو آگ بھی لگ گئی۔ اس نے فوراً بتا کر خطرے کا پیغام ہر جہاز پر اطراف میں بھیجا۔ شروع کیا۔ بارہ بجے جہازوں نے پیغام وصول کیا۔ اور فوراً ہی اس کی مدد کو دوڑے۔ لیکن طوفان کی وجہ سے اس کی کچھ امداد نہ کر سکے۔ فوراً ہی ایک بڑا جہاز جس پر تیل کا ذخیرہ تھا۔ آپہنچا۔ تیل سمندر میں ڈال دیا گیا۔ اور طوفان اور لہروں کی تیزی کم کر کے مسافروں کی جانیں بچا لی گئیں۔

اب تو ہوائی جہازوں میں بھی یہ آلات لگا دیئے گئے ہیں اس طرح زمین پر کے لوگ نہ صرف مسافروں کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔ بلکہ مسافروں کو موسمی حالات اور راستہ سے آگاہ کیا جاسکتا ہے بعض وقت ہوائی جہاز گہری دھند میں سینکر راستہ کو بیٹھتے ہیں۔ زمین سے لاسکی کے ذریعے ان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اس کی زمین تو ایک دفعہ ہوائی جہاز میں بیٹھ ہوئے ایک شخص نے زمین پر ایک عورت کو شادی کا پیغام بذریعہ لاسکی بھیجا تھا۔

ہندوستان میں وائرلس ٹیلیگرافی کے بہت سے سٹیشن لاہور۔ دہلی۔ الہ آباد۔ کلکتہ۔ پٹنہ۔ بھوپال وغیرہ شہروں میں

بنے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ گورنمنٹ نے براڈ کاسٹنگ بھی جاری کر رکھا ہے۔ پہلے یہ کام ایک کمپنی کرتی تھی۔ لیکن اب گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ فی الحال دو ٹینس میسز اور کلکتہ براڈ کاسٹ کرتے ہیں۔ سر ڈیوڈ ہسٹنسن سے جرور مشہور مشہور گزٹوں کے راگ۔ جینڈ باجے۔ ڈرامے اور تجارتی اسٹیج کے علاوہ سنسنائی جانتے ہیں۔ میسز اور کلکتہ کے رہنے والے بڑے خوش قسمت ہیں کہ ایک سترواٹھارہ روپے کے آلے ان تمام راگوں کا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ جو مقامات ان کی مقامات سے دور ہیں۔ مثلاً دہلی لاہور وغیرہ وہاں بھی لوگ بسنی کلکتہ میں ہوتے ہوئے راگ بخوبی سنتے ہیں کہ جس آلہ کی مدد سے اتنے دور پر سننا ممکن ہے۔ اس کی قیمت زیادہ ہے۔ میسز اور کلکتہ کے پروگرام پر بیسی کیا مختصر ہے اب تو لاہور میں بیٹھے ہوئے۔ ولایت کی خبریں۔ اٹلی کا بیٹڈ باجے۔ امریکہ کے اندر ہونے ہوئے ڈرامے۔ جاوا اور دبائینڈ کے درمیان ہوتی ہوئی گفتگو سنی جاسکتی ہے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم نے ہندوستانی گول مینز کانفرنس کے افتتاح کی رسم مبارک پر جو تقریر فرمائی تھی وہ بھی ہندوستان کے بہت حصوں میں صاف سنی گئی۔

امریکہ میں تو بعض ریلوے کمپنیوں نے اپنی اول درجہ کی گاڑیوں میں بھی یہ آلے لگا دیئے ہیں۔ اور سافر عطیہ ریل گاڑی میں کسی مرکزی مقام پر ہوتے ہوئے گانے یا ڈرامے کا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ کسی ٹریم کار کمپنی نے بھی ٹریم گاڑیوں میں یہ آلے لگا دیئے ہیں۔ پولیس اور فوجی حاسوسوں کے لئے ایسے آلے بن گئے ہیں جو آسانی سے ایک چھوٹے مکس میں بند کر کے لے جانے جاسکتے ہیں اور ان کے کام میں از حد مفید ثابت ہوئے ہیں۔ زمانہ آ رہا ہے کہ ہم اپنے دوستوں کے ساتھ جو ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوں۔ ایک جی ڈائریس کے آلہ کے ساتھ بات چیت کر سکیں گے۔

ہم میں سے بہتوں کو شاید یہ خیال ہو کہ جب دنیا کے اتنے شہروں میں براڈ کاسٹنگ کمپنیاں بنی ہوئی ہیں۔ تو ایک سنسنے والے آلے میں شاید گزرتی جاتی ہوگی۔ یہ بات نہیں۔ ہر ایک کمپنی کے آلے سے جو ہم سن سکتے ہیں ان کی لمبائی مختلف ہوتی ہے مثلاً لندن کی کمپنی کے آلے تلخوالی لہروں کی لمبائی ۳۶ میٹر ہے۔ اور ہندوستان میں بیسی کی ۳۰ اور کلکتہ کی ۳۵ میٹر ہے۔ جس جگہ کا پروگرام سننا ہو۔ سنسنے والا اپنے آلے کو اس جگہ کے آلے کی لہروں کی لمبائی کے مطابق ٹرن میں کر لیتا ہے۔ یہ بات ایک دو پرزے جو آلہ مذکور میں لگے ہوتے ہیں گھومانے اور بدسنے کی جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے صرف اس جگہ کا پروگرام سنائی دیکھا جہاں کے بھیجنے والے آلے کے ساتھ سنسنے والے کا آلہ ایک ٹرن میں ہے۔

اس چھوٹے سے مضمون میں ڈائریس کے حیران کن عجائبات کا مکمل اور مفصل بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ڈائریس کی مڈن دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ اور وقت آ رہا ہے جب وہ شہید سے دکھائیگی کہ الدین کے بسپ کو مات کر دے گی اس کا ایک بڑا سچوہ جو تقریباً پانچ کلو میٹر پر مبنج چلا ہے۔ عکسی تصاویر کو دور و دور از مقامات پر بغیر تار بھیجا ہے اب تک اخبارات کے نمائندے تصاویر کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہوائی جہازوں یا ڈاک گاڑیوں کے ذریعے بھیجا کرتے تھے لیکن اب اگر لندن میں کوئی بڑا کیمیا ہو رہا ہو تو اس کی تصویر کیمیل کے دوران ہی میں لیکر لندن سے نیویارک ڈائریس کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے اور وہاں کے

اخبارات میں دن کے دن چھپ سکتی ہے۔ اس طرح مغربی ممالک میں جہاں عورتوں کی پوشاک کے فیشن دن بدن بدلے جاتے رہتے ہیں ان کی تصاویر فوراً ایک ملک سے دوسرے ملک میں بذلیع بنے تار کے سلسلہ تصاویر بردسانی پہنچ دی جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا وہاں فرانس میں ایک فیشن معزز وجود میں آکر پڑنا بھی بھجاتا۔ امریکہ میں اس کی خبر بھی نہ پہنچتی اب اس طریق پر مشینوں کے پرزوں کی مشینیں موسمی حالات کے نقشے ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھیجے جاتے ہیں۔ تصویر بردسانی کا یہ طریق پولیس کا بڑا مددگار ثابت ہوا ہے۔ مجرموں کے چہروں کا کلیہ آگٹوٹے اور انگلیوں کے نشانات فوراً ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھیجے جاسکتے ہیں۔ اور مجرم کی گرفتاری آسان ہو جاتی ہے۔ فالوئی کاغذات۔ ضروری دستاویز۔ دستخط وغیرہ کی نقل بھیجے میں یہ طریق بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ بعض ملکوں مثلاً چین، جاپان کی زبان ایسی ہے کہ مومن کو ڈکے ڈیلے اس زبان میں پیغام بھیجنے ناممکن ہیں۔ پہلے ایسے پیغامات کا انگریزی ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ میں غلطی ہونے کا احتمال ہے بلکہ اس کی تصویر بردسانی کے طریق سے ضروری پیغامات کی ہونے پر نقل ان ممالک کو بھیجی جاسکتی ہے۔

حال میں سائینس دانوں نے وائرلیس میں بدھ نرتی کی ہو کہ دنیا کو انگشت بزدان کر دیا ہے۔ یعنی اب دور و دراز مقام سے بغیر تار بات چیت کرنے والے یا گانے والے شخص کی تصویر چادر پر دیکھنا بھی ممکن ہو رہا ہے۔ اس طریق کو ٹیلی وژن کہتے ہیں پہلے پہل جنوبی مشرقی ایشیاء میں لٹن کے ایک سائینس دان بیڑن نے رائل انسٹی ٹیوشن کے ممبروں کے سامنے ایک علمی طریق کی ایک عام نمائش کی۔ ۱۹۲۳ء میں امریکہ میں بھی ٹیلی وژن کا ایک علمی طریق ایجاد ہوا۔ اور اپریل ۱۹۲۳ء میں نیویارک میں لوگوں کو اس طریق سے ۲۵۰ میل واشنگٹن میں بیٹھے ہوئے سڑ پر اور اپنے کاغذات اٹھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ فروری ۱۹۲۳ء میں لٹن سے نیویارک میں انسانی شبیہ بغیر تار ہر صے پر ڈالی گئی۔ امریکہ میں اس طریق میں ایک نئی ایجاد یہ ہوئی کہ شخص اس آسے سے شبیہ بھیج رہا ہو وہ یہ دیکھ سکتا ہے کہ دور کے تصویر لینے والے مقام پر کبھی تصویر کبھی رہی ہے۔ اب تو بیڑ صاحب کو یہاں تک کامیابی ہوئی ہے کہ ایک شخص کی شبیہ جو اندھیرے میں بیٹھا تھا جو دور کے مقام پر اتر سکتی ہے جب بیڑ صاحب نے اس طریق کی نمائش کی تو ایک شخص کی جو اندھیرے میں بیٹھا تھا وہ بھی تصویر دوسرے مقام کے پر دے پر آگئی اور نہ صرف اس کے ہونٹ ہلنے ہوئے نظر آئے بلکہ جب اس نے سرگٹ جلا یا۔ تو وہ بھی صاف دکھائی دیا۔ یہ طریق دوران جنگ میں فوج کو بہت مفید ثابت ہو گا۔ کیونکہ اس کی مدد سے یہ ممکن ہو جائیگا کہ رات کے وقت دشمن کی حرکات کا دشمن کو پہنچانے بغیر بخوبی مشاہدہ کیا جاسکے۔ اسی طرح سمندری جہاز رانی اور ہوائی جہاز رانی میں بھی مفید ثابت ہو گا۔ لیکن تاحال ابھی احاطہ تجربہ کے اندر ہی ہے۔

جہاں ۱۸۱۵ء میں دشمن کی ہڈیوں پر حیت کی خبر کو ولایت پہنچنے میں گئے۔ ولایت میں گمشدگی کی ڈاک کے ذریعے دن اور کسٹریلیا پہنچے میں بھیجے گئے تھے۔ اب ولایت یا فرانس میں رہتے ہوئے میچ کی خبر بلکہ تصویر کو کسٹریلیا میں پہنچنے کے لئے صرف اتنا وقت درکار ہے جو جنگلیک شخص کو گھوڑے پر سوار ہونے میں لگتا ہے۔ یہی نہیں شاید وہ دن بھی آجائے جب یہ ممکن ہو جائیگا کہ ولایت میں ہونے والے کسی قیدیہ میں لگے والوں کی صورت کو آواز بلکہ ان کی تصویر برآمد ان کے گونا گوں رنگوں کے لباسوں کے دور کے مقام پر بھیج کر دیکھی جاسکے اور ننگا کے مقام پر تیار ہوتی ہوئی کبھی بغیر تار دور کے مقامات پہنچی جاسکے۔ ہوائی جہاز سے بغیر تار ہیڈ وچلانا اس کی حرکات و قیام میں

”میں کون ہوں؟“

میں عالم کے کاروبار کی بنیاد ہوں۔

میں تمام خوشحالیوں کا سرچشمہ ہوں۔

میں ذہین و طبع ہستیوں کا خلاق ہوں۔

میں وہ نمک ہوں۔ جو خان زندگی کو بامزہ بناتا ہے۔

میں غفلوں کا سہارا اور ناداروں کی پشت و پناہ ہوں۔

دولت مند جو مجھ سے روگردانی کرتے ہیں۔ زوال پاتے سکرور ہوتے اور قبل از وقت زندگی کو خیر باد کہتی ہیں۔

میں ایک قدیمی لعنت ہوں مگر ایک ایسی رحمت بھی کہ جس کے بغیر کوئی تندرست مرد یا عورت خوش و حزم

نہیں رہ سکتا۔

جو تو میں مجھ سے رشتہ جوڑتی ہیں۔ وہ ترقی کے میدان میں سرعت سے قدم بڑھاتی ہیں۔ اور جو مجھ سے منہ

موڑتی ہیں وہ جلدی فنا ہو جاتی ہیں۔

میں نے ہی آدمیوں کو ادنیٰ حالتوں سے اٹھا کر عروج و ارتقا کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔

میں ہر قابل و نوجوان کا رفیق و رہبر ہوں۔ اگر وہ میری قدر کرے تو کوئی انعام یا مرتبہ اس کی دسترس سے

باہر نہ ہوگا۔ اگر وہ میری ہشک کرے تو اس کا انجام قابل رشک نہ ہوگا۔

میں وہ زمین ہوں جو کامیابیوں کی بلندی پر لیجا تا ہے۔ بعض اوقات لوگ مجھے اپنا بد خواہ سمجھ کر مجھ پر لعنت

بھیجتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ میرے بغیر زندگی تلخ و دشوار اور بے مقصد ہو جائیگی۔

قبل اس کے کہ میں کسی کو اپنی برکتوں سے مالا مال کر دوں یا اپنے انعامات سے بہرہ ور بنا دوں ضروری ہے

کہ مجھ سے محبت کی جائے۔ یہ وقت مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن غفلت مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ یہ سب سروسامان

لوگ جو ہر حکم میں صدارت کی کرسیوں پر رونق افروز ہیں۔ میرے ہی رہین منت ہیں۔

دولت مند سے دولت مند والدین بھی اپنے نوجوان لڑکے کو وہ ترقی نہیں دلا سکتے۔ جو کسے میری بد دولت

حاصل ہو سکتی ہے۔ کروڑوں کی زندگی بلا واسطہ مجھ پر منحصر ہے اور بالواسطہ تمام لوگ میرے سپارے پر جیتے ہیں۔

میں تمام سرمایہ کا خلاق ہوں۔

دولت کیا ہے۔ مگر میری جمیع صورت۔

روٹی کے ہر ٹکڑے میں جو تنور سے گرم گرم نکلتا ہے۔ دیل کی ہر گاڑی میں جو زمین کے سینہ پر گرم خرام ہے جہاز کے ہر حصہ میں جو سمندر کی موجوں سے بے نیاز قلع منازل کر رہا ہے اور اخبار کے ہر پہرے میں جو مطبع سے نکلتا ہے۔ میری جلوہ گری ہے۔

بعض اوقات بلند ہمت جو اُمرد اپنی خواہش سے اور زبردست مظلوم اپنی مرضی کے خلاف مجھے زیادہ جرتے ہیں۔ لیکن اعتدال کے ساتھ اگر مجھ سے کام لیا جائے۔ تو خدمت انسان کیلئے میں سراسر اکسیر ہوں۔ طبقہ عوام میں جو میرے پیرو ہیں۔ روز بروز زیادہ طاقت حاصل کر رہے ہیں۔ اب وہ حکومتوں میں اقتدار پانے لگے ہیں۔ اور قدیم حکمران خاندانوں کو معزول کرنے کے درپے ہیں۔

میں جمہوریت کی ماں ہوں۔

تمام ترقیوں کا منبع ہوں۔

جو شخص میرا دشمن ہے کسی ترقی کے میدان میں دور نہ جاسکے گا۔

جو میرا دوست ہے۔ اور مجھ سے خوف نہیں کھاتا۔ اس کی ترقیوں کا اندازہ کون لگا سکتا ہے +

بتاؤ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟

میں کام ہوں؟

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر ننگ خیال لاہور

کار آمد باتیں

(۱) جو سمجھتا ہے میں غفلت ہوں۔ وہ بیوقوف ہے۔

(۲) روپے کو عزیز نہ رکھو گے۔ تو عزت کس طرح بڑھے گی؟

(۳) قسم کھانے کی عادت نہ ڈالو۔

(۴) حملے کا استہان عیبت میں ہو کر تا ہے۔

(۵) فقہ بڑی تکلیف سے فوج ہرنے والا دشمن ہے۔ اور اس کا بہتر علاج خاموشی ہے۔

(۶) اتفاق یا ہی کلید کامیابی ہے۔

(۷) کام چرواؤ رکابل آدمی ہمیشہ دکھی رہتا ہے۔

رامائن کے تئیں پردے

تیسواں پردہ

چتا

(از حضرت طائب الہ آبادی)

بیٹھے گدھی پر جب ویدیشن خوش ہو گئے سارے دورِ شمن
 لچمن سیتا کے پاس آنے احوال پتی کے سب سنائے
 سیتا بے تاب ہو رہی تھیں چپکے چپکے وہ رو رہی تھیں
 من میں کتنی تھیں کیا ہے کارن پر بھونے نہیں دیئے جو درشن
 لچمن نے کہا یہ مسکرا کر آئے جو نہیں یہاں برادر
 بابا کو بچن وہ دے چکے تھے دشر تھ کو ورن وہ دے چکے تھے
 بیتیں گے نہ چودہ سال جب تک بستی میں نہ جائیں گے وہ تب تک
 چلے ہے آپ کو بلایا بیٹھے ہیں بنے ہوئے تمتا
 سیتا نے کیا یہ من کے اشنان لاکھا بھی جسایا کھا کے اکپا

جوڑا بدلا انہوں نے بھاری
 افشاں ماتھے پہ خوب چُن لی
 خوشبو سے بس گئیں سراپا
 پہنے جو طرح طرح کے زیور
 برسوں سے چھٹی تھیں ام جی سے
 دل میں تصویر تھی پتی کی
 تھی ساتھ میں ایک پالکی بھی
 پیدل ہی وہ آئیں بے خطر پاس
 جب رام کی پڑ گئیں نگاہیں
 بجلی سی چمک گئی فضا میں
 دونوں تصویر آرزو تھے
 آنکھوں آنکھوں میں گفتگو تھی
 دونوں کے دماغ تھے محو
 دونوں مدہوش ہو رہے تھے
 سیتا نے کیا جو جھک کے پر نام
 بولے مری جان تم ہو سیتا
 پہنی مقیش دار ساری
 چوٹی ناگن کی شکل بُن لی
 بدھی سے کس گئیں سراپا
 چوتھی کی دامن بنیں بکھر کر
 منے کو چلی تھیں وہ پتی سے
 من میں تنویر تھی پتی کی
 پہلو میں کھڑی تھی نالکی بھی
 تھا شوق و ادب کا اس قدر پاس
 سیتا سے لڑ گئیں نگاہیں
 خوشبو سی مہک گئی ہوا میں
 دو آئینے تھے جو روبرو تھے
 نظروں نظروں میں جستجو تھی
 دونوں کو سکون تھا میسر
 دونوں نے نوش ہو رہے تھے
 بے ساختہ مٹ کر اٹھے رام
 دل کا ارمان تم ہو سیتا

عیسوں سے بری ہو بادشاہ ہو
 عصمت کی دلیل لائیں گے لوگ
 لیکن دنیا کو چپ کرادو
 ورنہ موقع جو پائیں گے لوگ
 شک میں کجنت جب پڑیں گے
 کر لوگی اگر آگن پر چھپا
 دیوی کو ہوا نہ کچھ بھی انکار
 پھمن نے منگائیں لکڑیاں خوب
 لابی چوڑی چیتا بنائی
 پیدا ہوئے جنت جنتہ شعلے
 تیار ہوئی چیتا جو جل کر
 کچھ اور بھی ہو گئیں وہ سرور
 نل نیل ڈرے تو کانپے سگریو
 بھولی ہوں کبھی جو رام جی کو
 کی ہو گر غنیر سے محبت
 آئی ہو اگر وفائیں لغزش
 ہر گن سے بھری ہو پار ساہو
 قسمیں عفت کی کھائیں گے لوگ
 تم آگ میں کود کر دکھا دو
 بھوٹی پتی اڑائیں گے لوگ
 تہمت وہ آئے دن جڑیں گے
 ہو جائے گا بند منہ عدوکا
 سیتا ہونیں مسکرا کے تیار
 گھیرے میں سبائیں لکڑیاں خوب
 پھر آگ جو ڈھیر میں لگانی
 اٹھنے لگے رفتہ رفتہ شعلے
 سیتا نہ ہوئیں ذرا بھی مضطر
 الفت میں پتی کی ہمتیں وہ مخمور
 دیوی نے کہا کہ ہے آگن دیو
 بسری ہوں اگر کبھی پتی کو
 یا ہو گئی ہو کسی سے الفت
 عصمت میں اگر ہوئی ہو لرزش

یہ آگ مجھے ہلاک کر دے پاپن کو جلا کے خاک کر دے
 جیتے جی لوٹ کر نہ آؤں دھرتی پھٹ جائے میں سماؤں
 یہ کہہ کے ہوئیں چپتا میں نخل جتنے تھے سبکے ہل گئے دل
 غائب شعلوں میں ہو گئیں وہ سب کی نظروں سے کھو گئیں وہ
 اتنے میں ہوئی چپتا وہ گلشن گلزار بسا وہ ڈھاک کا بن
 شعلے جتنے تھے سرد تھے سب گیندے کی شکل زرد تھے سب
 تھی اس کی ہر پیاری پیاری کلیوں سے بھری تھی کیاری کیاری
 تئیں بیچ میں اس چمن کے سینا تھنا نام لبوں پہ رام جی کا

کندن کی طرح نہ کہتی ہیں
 سون کی طرح نہ کہتی ہیں
 صندل کی طرح نہ کہتی ہیں
 طوطی کی طرح نہ کہتی ہیں
 موتی کی طرح نہ کہتی ہیں
 نیساں کی طرح نہ کہتی ہیں

بہنتی ہوئی باہر آئیں دیوی بیٹھیں جو بسل میں رام جی کی
 آکاش پر آئے سارے دیوتا دونوں پہ ہوئی گلوں کی برشا



فہرست مضامین

رائے صاحب لالہ مدن گوپال بی اے پی ای ایس
ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل سکول لاہور ۵۲۵

لالہ ہریرام صاحب ہیڈ ماسٹر انڈسٹریل سکول
فیروز پور ۵۲۳

لالہ بھگند اس صاحب بی اے پی ای ایس
اسسٹنٹ انسپکٹر زراعت پنجاب ۵۲۸

پنڈت بال مکند صاحب عرش میانی
سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ انڈسٹریل سکول لدھیانہ ۵۲۵

نصابِ تعلیم اور اُس میں ترقی

ملک سے بیرونی کاری و درکار کا حل

پنجاب کے ورکنگ ٹیل سکولوں میں
زراعت کی تعلیم

ہنری فورڈ

نصائحِ تسلیم

اس میں ترقی

(از جناب رائے صاحب اللہ مدن گوپال جباہی 'اے پی' 'ای' ایس)

ہمارے ملک کے کالج اور یونیورسٹیاں عام طور پر سرکاری دفاتر کے لئے کلرک تیار کرنے کی مشینیں ہیں۔ یونیورسٹی کے نصاب پر اگر غور کیا جائے۔ تو واضح ہو گا کہ قریب قریب وہی مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو مالکِ غیر میں۔ حالانکہ ہر ملک کی تعلیم، اسکی طرز معاشرت، اسکی پیداوار اور آب و ہوا وغیرہ کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ اور ان اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ جو اس کے لئے مفید ہوں۔ ہجرتی سے ہماری یونیورسٹیاں ان اصولوں سے کسی حد تک گری ہوئی ہیں۔ اسی لئے آئے دن نصاب پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔

چونکہ تعلیم دفتری کاروائی چلانے کی غرض سے دی جاتی ہے۔ اس لئے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اکثر نوجوان تقاضاں روزگار میں مارے مارے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اخباروں میں ضرورت کے کاموں کا خاص طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اگر کہیں خالی اسامی کا نوٹس دیکھ پاتے ہیں۔ تو جھٹ ٹکٹ خرید عرضی روانہ کر دی۔ غرضیکہ ہر اسامی پر سینکڑوں درخواستیں پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک شخص کا انتخاب ہوا۔ اور باقی کو جواب ملا۔ اسی طرح اکثر حصہ تعلیم نوجوانوں کا ٹھوکریں اور دھکے کھاتا ہوا ملازمت سرکار سے مایوس ہو کر بچ دیوار کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مگر تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر حالتوں میں ماں باپ کا اندوختہ ضائع کر بیٹھا ہے۔

دالین جب اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے مددوں میں بھیجتے ہیں۔ تو ان کے دل میں بھی یہی خیال ہوتا ہے۔ کہ ہم اپنی اولاد کو کسی بڑے عہدے پر سرفراز دیکھیں گے۔ انہوں نے تعلیم کا مقصد صرف حصولِ ملازمت ہی سمجھا ہے۔ یہ کبھی نہیں سوچا۔ کہ تعلیم لامحدود ہے اور ملازمتیں محدود۔ پھر لامحدود کا محدود کے اندر کیسے گنہ ہو سکتا ہے۔ فی زمانہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ موجودہ تعلیم عام طور پر نہ تو روٹ گارہی تیار کر سکتی ہے۔ نہ اس کے ذریعے اعلیٰ ملازمت مل سکتی ہے۔ نہ کمیتی بڑی میں مدد ملتی ہے۔ اور نہ ہی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ اس قابل رہتا ہے۔ کہ

صنعت و حرفت کی طرف متوجہ ہو۔ ایک سائنس کا گریجویٹ جس نے فزیکل کیمسٹری یا مٹی وغیرہ کی بڑی بڑی کتابیں پڑھی ہوں۔ کالج کی لیبارٹری میں تجربے کئے ہوں۔ اپنی زمین کی کاشت میں اپنے قلمی کوس کی بدولت کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا۔ نہ ہی پیداوار کو بڑھا سکتا ہے۔ بل چلانا تو درکنار بل کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتا ہے لوگوں کا میدان صرف کتابیں رٹ کر امتحان پاس کرنا ہے اور کسی حد تک ہونا بھی چاہئے۔ مگر یہ خیال ضرور ہے۔ کہ ہر بچہ کالج کی تعلیم کے لائق نہیں ہو سکتا۔ قابلیت کے لحاظ سے افراد الگ الگ ہیں۔ ان میں خوبیاں اور نقائص جدا جدا اس لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے صرف وہی بچے چاہئیں جو اس کے اہل ہوں۔ اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اندھا دھند ہر بچے کو کالج میں لے کر آتا ہے۔ بلکہ سوسائٹی کا نقصان۔ عوام کا زیاں۔ مال و نقد کا ضائع کرنا اور دوسرے خریدنا۔

گورنمنٹ عالیہ نے بیکاری کے دیا کو امنڈتا ہوا دیکھ کر ایک کمیٹی مقرر کی۔ کہ وہ اس کی وجوہات دریافت کر کے رپورٹ کرے۔ کہ بیکاری کیوں بڑھ رہی ہو سکتی ہے۔ کمیٹی نے خیال ظاہر کیا۔ کہ دستکاری کو فروغ دیا جانا ضروری ہے تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ اس سے دلچسپی لے۔ اور کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرے۔ اگرچہ صوبہ میں کئی دستکاری مدارس موجود ہیں۔ مگر اعلیٰ تعلیم کی درگاہ نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگ ابھی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے سوئی کے بند جن بھی اس کی ترقی میں سدراہ ہیں۔ یہ کسی حد تک غلط تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اگر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کے لئے کوئی نہ کوئی دستکاری چاہنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر تربیت مکمل نہیں ہوتی مشہور مصنف رکن لکھتا ہے۔ کہ صنعت و حرفت قوت متحدہ اور قوت فیصلہ کو ترقی دینے کا قدرتی اور عمدہ ذریعہ ہے صرف اس کی بدولت ہی دماغی کام کرنے والوں اور کارگروں میں تمیز ہو سکتی ہے۔ اگر سب آدمی صنعت و حرفت کی طرف متوجہ ہوں۔ تو بے عزتی کا خیال دلوں سے نابود ہو جائے گا۔ لوگ نصیحت کرتا ہے۔ کہ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی دستکاری ضرور سیکھنی چاہئے۔ ولایت کے ہر مدرس میں کوئی نہ کوئی ہنر سکھایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز بچے موبی رستوں میں موبلی کارگروں کے ساتھ شہر میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض تو ایسی محنت سے کام کرتے ہیں۔ کہ اپنے سال بھر کا خرچ کما کر کالج یا سکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور ہمارے بچے گرمی گرمی پکارتے ہوئے بیکار بیٹھے نظر آتے ہیں۔

تعلیم کے نقائص کو دور کرنے کے لئے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ نصاب کی کتابیں ہندوستانی واقعات سے پُر ہوں۔ جن میں بڑے بڑے بزرگوں اور ادیبوں کے حالات نمایاں ہوں تعلیم انٹرنش تک ماہری زبان میں ہو تاکہ عام فہم ہونے کے سبب کافی ترقی ہو سکے۔ علم الاشیا میں ملکی پیداوار کو خاص درجہ دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اعلیٰ جامعات میں بوٹنی کے کورس میں امریکی کے درختوں اور پھولوں کا حال تو پڑھایا جائے اور ہندوستان میں پیدا ہونے والے سبب ناشپاتی، آڑو۔ امرود اور دوسرے پھول پھولوں سے واقفیت حاصل نہ ہو سکے

سائنس میں کارل کا وزن مخصوص نہانے۔ ترازو پکڑنا سکھانے کے بعد کوئی مفید اور پرمیٹیکل کام بھی سکھایا جائے۔ جو طلباء کو روزمرہ کی ضروریات کے پورا کرنے میں مدد دے سکے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ایم اے پاس کرنے کے بعد اتنی واقفیت بھی نہیں ہوتی۔ کہ سائیکل کا سپوک بازار سے خرید کر پیہ میں لگایا جاسکے۔ میز کرسی کی مرمت تو درکنار دیوار میں کھونٹی لگانے کے لئے کاریگر کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔

پرمیٹیکل کام میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ جماعتوں میں ڈیزائن پڑو دیا جائے۔ مانی کلاسز میں طلباء کو اس قابل ہونا چاہئے کہ اپنی روزمرہ کی استعمال کی چیزیں مثلاً سائیکل۔ موٹر سائیکل۔ منگوشین وغیرہ میں معمولی مرمت کر سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ معمولی معمولی کاموں کے لئے ناخواندہ لوہاروں کا دست نگر ہونا پڑے۔ ڈیزائن کی تعلیم عموماً دی ہی نہیں جاتی۔ یورپ سے آئے دن آواز آتی ہے کہ جرمنی نے فلاں قسم کا طیارہ بنایا ہے۔ انجینڈ نے موٹر کار میں فلاں فلاں اصلاح کی ہے۔ موٹر بیل، زیلمین، ٹرانس پورٹ کے کئی قسم کے سامان جاری کئے ہیں۔ مگر کوئی ہندوستانی نظر نہیں آیا۔ جس نے باپ دادا کے زمانے کے پرانے پھلڑے میں ایسی ترقی کر دکھائی ہو کہ اس میں دو بیل کی جگہ ایک بیل کام دے سکے۔ یا اس کا بوجھ کم ہو جائے۔ یہ صرف دستکاری سے گریز کرنے کا نتیجہ ہے۔ یورپ میں اول سے آخر تک دستکاری اور تعلیم کو ملایا گیا ہے۔ پہلی جماعت سے نہیں بلکہ دین برس کے بچے کو بھی فروبل کے کھلونے کھیلنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ اور گھر کی تعلیم کے علاوہ مدرسہ کی تعلیم شروع سے ہی بچوں کے دلوں میں دستکاری کی روح بھونکنا شروع کرتی ہے۔ کھیلوں کھیلوں میں ہی گنڈ مٹی، تیلیاں، گتے وغیرہ سے دستکاری کی شرک پر ڈالا جاتا ہے۔ مدرسوں کو لائق۔ فرض شناس اور دل و جان سے کام کرنے کے عادی ہوجانے کی وجہ سے۔ ادا نے تعلیم ختم کرنے کے بعد ہی۔۔۔ معلوم ہوجاتا ہے کہ بچے کا رجحان کس طرف ہے۔ اور اسی طرف آسانی سے اسکو ڈالا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بیکاری کی جڑ تعلیمی نقصان کی غیر موزونیت اور دستکاری سے گریز ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ادا نے جماعتوں سے لے کر مانی کلاسز تک ہر مدرسہ میں دستکاری لازمی ہو۔ یعنی درجہ بدرجہ کنڈگارٹن۔ ایجوکیشنل ہیڈروک اور دستکاری تک پہنچے دستکار کے خاص مدارس کھولنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مانی تعلیم بہترین تجویز ہے۔ مدرسہ چھوڑنے کے بعد حسب رجحان لڑکا کالج میں وقت کا زیادہ تر حصہ معمولی مضامین کے مطالعہ میں گزارے۔ یا دستکاری میں ترقی کرے۔ کالج میں معمولی مضامین کے ساتھ ساتھ ذرا امت۔ انجینئرنگ۔ ڈاکٹری۔ ڈیزائن وغیرہ وغیرہ حسب رجحان ضرورت سکھائے جائیں۔ گویا تعلیم اور دستکاری شروع سے اخیر تک ملے ہوئے ہوں۔ علیحدہ علیحدہ ٹریننگ کالج میڈیکل کالج۔ لاکج۔ انجینئرنگ کالج بنانے کی ضرورت نہیں۔ ابتدائی تعلیم میں عام طور پر مشینوں کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ صرف معمولی اوزاروں سے کام سکھایا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ درجہ ہوں میں مشینوں کا ہونا نہایت

ضروری ہے۔

اس طریقہ سے ہر شہری باعزت زندگی بسر کر کے ملک اور قوم کا خیر اندیش فرزند بن سکتا ہے۔

ملک سے بیروزگاری دور کرنے کا حل

(انرجیا لالہ ہریرام صاحب میڈیٹا سٹرگورنمنٹ انڈسٹریل سکول فیروزپور شہر)

تعلیم کے فوائد کسی تشریح کے محتاج نہیں تعلیم کے بغیر قومیت کی تاسیس اور ترقی محال ہے۔ دنیا میں صرف وہی اقوام بام ترقی پر جلوہ افروز ہوئیں۔ جنہوں نے علم حاصل کرنے میں پوری سعی و کوشش سے کام لیا۔ اور آئندہ بھی انہیں لوگوں کی اولاد کو سبقت یجائیگی۔ جو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر علم و عقل کے میدان میں اپنے حریفوں سے بازی بے جانا اپنا فرض جانے لگی۔ ان نظائر کے خیال پر تمام اقوام عالم کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق بلکہ جنون پیدا ہو گیا۔ ہمارے ملک میں بھی محکمہ تعلیم ہندوستان کے ارباب بست و کشاد نے اشاعت تعلیم کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول کی۔ اور بہترین اہل دماغ کو اس فہم کا لائحہ عمل و سکیم مرتب کرنے پر مامور کیا۔ جس سے تعلیم کے نشر و اشاعت میں سہولت و کامیابی ہو۔ اور ہر خاص و عام فوائد تعلیم سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان تمام مساعی جمیلہ کے باوجود اہل ہند تعلیم سے وہ فوائد حاصل نہ کر سکے۔ جن سے دیگر متمکن اقوام بہرہ ور ہوئی تھیں۔ دیگر ممالک میں تعلیم کے بعد راحت و آرام کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بد قسمت اور بد نصیب ملک میں تعلیم سے فایز ہونے کے بعد ناکام۔ تلخ اور دردناک زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں سے ہر سال بے شمار نوجوان انٹرنیشنل۔ ایف اے۔ بی اے اور ایم اے پاس کر کے نکلتے ہیں۔ مگر ان تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ملک کی مفید شخصیتوں اور کارکن ہستیاں کی تعداد میں اضافہ ہوتا تو درکنار اٹا ملک کے بیکاروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس ملک کا تعلیم یافتہ اور شائستہ طبقہ حصول ملازمت کو مقصد ادنیٰ سمجھتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی کام کی طرف ان کا میلان نہیں۔ بقول مولانا حالیؒ

کرتے ہیں قصہ تجارت تو گرہ میں نہیں دام دستکاری کو سمجھتے ہیں کہ ہے کارِ عوام

نہیں بل جوتے میں راحت و آرام کا نام * بنتے پھرتے ہیں اسی واسطے اک اک کے غلام
 اگر ہر ایک آدمی تعلیم اس غرض سے حاصل کرے۔ کہ وہ اسے حاصل کرنے کے بعد اپنا اور اپنے بال بچوں کا
 پیٹ پال سکے۔ تو پھر مسئلہ بے روزگاری قطعاً حل ہو جائے۔ دیکھئے چیز ایک غریب گھرانے میں تو لدہ بکر
 اپنی محنت، سرگرمی اور کیر کڑ کی مضبوطی کے باعث ریکسٹناٹے متحدہ امریکہ کا پریزیڈنٹ بنا۔ جیمز جیمز آٹھ
 ماہ کی عمر کا ہی تھا۔ کہ اس کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور ایسا کوئی سرپرست اور مربی نہ تھا۔ جو اس کے تعلیمی
 اخراجات کا متحمل ہوتا۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں اُسے سخت مشکلات کا سامنا ہوا۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ گوارہ
 بمشکل جیتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لئے اُس نے نصف یوم کی رخصت اور
 تعطیلات کے ایام میں کچھ کام کر کے روپیہ کمانے کی تجویز سوچی۔ ایک دن وہ دو دو تھوڑے بڑھئی کی دکان پر
 کام کی تلاش میں گیا۔ بڑھئی نے کہا میں تمہاری مدد کر دوں گا۔ مگر جیمز نے جواب دیا میں آپ سے خیرات نہیں مانگتا
 جس قدر کام کروں۔ آپ اس کام سے مجھ کو کم اجرت دے دینا۔ لڑکے کی اس قد دیلیری کو دیکھ کر بڑھئی نے
 اس کو تختے صاف کرنے کے لئے اجرت پر دیئے۔ جن کو وہ ایام رخصت میں صاف کرتا تھا۔ اس طریق سے
 اس کی آمدنی اس قدر ہونے لگی کہ وہ کالج کی تعلیم کسی کامرہون منت ہو سکیے بغیر حاصل کر سکا۔
 کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ہندوستان میں غریب گھر کے کا بجٹ بھی اپنے ہاتھ سے کام کرنا کسر
 سمجھتے ہیں۔ اور روٹی کمانے کی رسائوں کے نسخہ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیونکہ جس شے پر کچھ رقم
 خرچ نہ ہو اور محنت و مشیاب ہو جائے۔ اس چیز کی قدر نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک مرتبہ کسی فقیر نے اپنے ایک
 مرید کو پارس پتھر ایک لوہے کی ڈبیہ میں بند کر کے دیا۔ اور کہا جاؤ جس شے کو سونا بنا ہو۔ اس پر پارس
 رگڑ دینا۔ وہ سونا بن جائے گی۔ مگر چونکہ مرید کو دستکاری کی کوئی قدر نہ تھی۔ نیز اسے پتھر حاصل کرنے پر بھی کسی
 خرچ کا زریعہ ہونا نہ پڑا تھا۔ اس لئے اُس نے پارس پتھر کو ایک معمولی شے خیال کر کے مکان کے ایک کونے پر
 میں رکھ دیا۔ جب دو تین سال کے بعد پھر فقیر کا اس جگہ سے گزر ہوا۔ تو اُن کو خیال آیا کہ ہمارا مرید بڑا امیر بن گیا
 ہو گا۔ چلا اس سے ملاقات کر چلیں۔ جب اس کے مکان پر پہنچے تو اس کو سابقہ حالت میں ہی پایا۔ فقیر صاحب
 نے پوچھا کہ ہم نے تمہیں پارس دیا تھا مگر تم ابھی اسی غریبانہ حالت میں ہو۔ اس نے جواب دیا۔ مجھ کو آپ کی بات
 کا اعتبار نہیں تھا۔ کیونکہ جب یہ لوہے کی ڈبیہ ہی جس میں پارس بند ہے۔ سونے کی نہیں ہوتی۔ تو اور کسی لوہے
 کی شے پر رگڑنے سے وہ کس طرح ہو سکتی ہے۔ فقیر صاحب نے وہ ڈبیہ ناراض ہو کر واپس لے لی۔ اور کہا
 چونکہ تمہیں یہ محنت ملی تھی۔ اس لئے تم بے اس کی قدر نہیں کی۔ جب فقیر نے ڈبیہ واپس لے کر پارس پتھر
 کو جو کہ کاغذ میں لپیٹا ہوا تھا۔ نکال کر لوہے کی ڈبیہ پر رگڑا اور وہ فوراً سونے کی ہو گئی۔ تو مرید صاحب

کی آنکھیں کھلیں۔ اور اُس نے بہت کوشش کی۔ کہ پاس کا پتھر مل جائے۔ مگر فقیر نے ایک نہ سنی اور وہاں سے پاس لیکر یہ کہتے ہوئے غائب ہو گئے کہ اب یہ کسی طرح بھی نہ مل سکے گا۔

مذکورہ بالا مثال سے صاف روشن ہے کہ جو شے مفت دستیاب ہو جائے اس کی قدر نہیں ہوا کرتی۔ نیز ہر ایک صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے۔ کہ بعض وقت معمولی شے معلوم نہ ہونے سے تمام کام ٹکنا پڑتا ہے۔

آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ گراموفون کے ریکارڈ بنانے والے نے جب ریکارڈ ایجاد کیا۔ اور بے حد کوشش کے بعد بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ تو موجودہ اخبارات میں اشتہار شائع کیا کہ میں نے گراموفون کا ریکارڈ ایجاد کر لیا ہے۔ اگر کوئی صاحب میرے ریکارڈ میں آواز پیدا کر دیگا۔ تو اس کو پچاس ہزار روپے انعام دیئے جائیں گے۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے جو تقریباً نوے سال کا ہو گا۔ اپنے بچپن کے زمانہ میں ایک تعلیمی ماہوار رسالہ میں ایک دستکاری کا مضمون اس امر پر چھاپا تھا۔ کہ سریش کس طرح آواز پیدا کرتی ہے۔ جب اس کی نظر گراموفون کے ریکارڈ کے موجودہ کے اس اشتہار پر پڑی۔ وہ فوراً اس کے پاس شیشی میں حل شدہ سریش لیکر پہنچا۔ اور فرمایا کہ میرے اس حل شدہ مصلح کو استعمال کر کے دیکھیں۔ امید ہے اس سے آپ کے ریکارڈ میں آواز پیدا ہو جائے گی۔ جب اس کو ریکارڈ پر برش سے لگا یا گیا۔ اور خشک ہو جانے پر ریکارڈ کو مشین پر چڑھا کر استعمال کیا گیا۔ اس نے فوراً آواز دیدی۔ اسی وقت ریکارڈ کے موجودہ نے اس ضعیف العزم کو دس ہزار روپے دیئے وہ اس کثیر رقم کی خوشی میں پھولے نہ سمایا۔ اور کب اٹھا یہ تو بالکل معمولی شے یعنی سریش ہے اور آپ نے مجھ کو دس ہزار روپے دیدیئے۔

ناظرین کرلہ! ذرا غور فرمائیے کہ قدر دان نے معمولی شے کے معلوم کرنے پر دس ہزار روپے خرچ کر کے اس آدمی کو بھی خوش کر دیا۔ جس نے ایسے رسالہ کے مضمون کو معمولی شے کی قدر کر کے اپنے ذہن میں جگہ دی تھی۔ اور اپنی عقلندی سے خود بھی چالیس ہزار روپے بچا لئے اور پھر ریکارڈ کو مکمل کر کے لاکھوں روپے دیگر ممالک سے بھی وصول کر لئے۔ یہ ہے معمولی چیز کی قدر۔

مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر آپ بزرگوار بھی ان سمراتی نغوں کی جراتم الحروف اور دیگر اصحاب کی طرف سے گاہے ماہے رسالہ رہنمائے تعلیم میں نکتے رہتے ہیں۔ قدر کریں تو میں چالیس روپے ماہوار کمالینا کوئی بڑی بات نہیں جس کی خاطر بی، لے پاس کر کے محض دستکاری سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ملازمت کی خاطر در بدر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔

معمولی ۱۰×۸ انچ کا شیٹ صرف پانچ پیسے میں ملتا ہے اگر اس پر معمولی لاگت سے سلور نائیرٹ۔ ٹائٹریٹ

آف سوڈا اور ایوینیا کا سیلوشن تیار کر کے چاندی کا پانی چڑھا لیا جائے۔ تو یہ منہ دیکھنے والا سیشہ بن جاتا ہے جس کی قیمت ایک روپیہ ہوتی ہے۔ اس طرح سے تھوڑی سی لاگت سے منہ اور کپڑے دھونے کا صابن تیار ہو سکتا ہے۔ چاندی سونے وغیرہ کے گھٹ کرنے کا سامان صرف ایک دو روپے کے خرچ میں تیار ہو سکتا ہے ڈرائی اور دیگر قسم کی میٹریوں کا تیار کرنا۔ شہتوت کی شاخوں اور بید کے پھلکوں سے مختلف قسم کی ٹوکریاں بنانا۔ گندم کی ناڑ سے ٹوکریاں بننا۔ دریاں اور نوار وغیرہ تیار کرنا۔ اسی کے تیل۔ رال اور سندس وغیرہ سے لکڑی پر رنگنے والا روغن۔ سپرٹ اور لاکھ وغیرہ سے پالش بنانا۔ ٹائیڈر دکلورک ایڈ اور نیٹے تھوختے وغیرہ سے شیشوں پر نام اور لوہے پتیل پر انگریز کرنے کا کام۔ برتنوں پر نقلی اور گھٹ کرنا۔ معمولی کھڑیا مٹی اور سریش سے چھاپ تیار کرنا۔ معمولی مشین کے ذریعہ بٹن اور جراب وغیرہ بنانا۔ سنہری لیس تیار کرنا۔ کپڑوں پر پھول کاڑھنے اور چھاپنے کا کام۔ غرض اسی طرح کی کوئی دستکاری کا کام کر کے روٹی کے سوال کو حل کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ بالا دستکاریوں کے متعلق بہت سے نسخے بالتفصیل رہنمائے تعلیم کے گزشتہ رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

اب معمولی شیشے پر پانی چڑھانے کا نسخہ درج کیا جاتا ہے۔ اگر آپ اس کی قدر اس انگریز کی طرح کریں۔ جس نے صرف اس بات کے معلوم کرنے پر کہ لاکھ کا اعلیٰ رنگ کرنے کے لئے کونسی لاکھ استعمال کرنی چاہئے دو صد روپے خرچ کر کے صرف یہ معلوم کیا کہ صرف وہ لاکھ اعلیٰ رنگ تیار کرنے کے لئے استعمال کرنی چاہئے جو بھادوں کے عینے میں اکٹھی کرائی جائے۔ تو آپ دسرات بھی رسالہ رہنمائے تعلیم کے مطالعہ سے ذیل کے نسخہ پر عمل کر کے روٹی کے سوال کو حل کر سکتے ہیں۔

معمولی شیشے پر پانی چڑھانے کا نسخہ

احتیاط۔ جس شیشے پر پانی چڑھانا ہو۔ اس کو پہلے پانی سے بہت اچھی طرح صاف کرنے کے بعد نائٹریک ایسڈ سے صاف کر کے پھر پانی سے دھولیں۔ بعد ازاں ٹن کھورائڈ کو روٹی کے کالے کے ساتھ لگا کر صاف شدہ شیشے پر خوب عین۔ تاکہ شیشے کی سطح بالکل صاف ہو جائے۔ مگر اس بات کا خاص خیال رکھیں۔ کہ شیشے کی صاف سطح سے انکلی وغیرہ نہ چوڑنے پائے۔ بعد ازاں شیشے کو دھوپ میں آدھ گھنٹہ کے لئے ہموار جگہ پر رکھا رہنے دیں۔

سالیوشن نمبر ۱۔ اگرین سلوڈائٹ کو ایک اونس مقطر پانی میں کسی چینی کی پیالی میں حل کریں۔ اس میں قطرہ قطرہ کر کے ایوینیا لاتے جائیں۔ جب تک کہ در در سے ماوے حل نہ ہو جائیں۔

سالیوشن نمبر ۲۔ اگرین سلوڈائٹ کو ایک اونس مقطر پانی میں حل کر کے پھر اس سالیوشن کو جلدی سے ابلتے ہوئے۔ اگرین پوٹاش نائٹریٹ آف سوڈا اور ام اونس مقطر پانی میں ڈال دیا جائے پھٹنا

ہونے پر فلتز کر لیں۔

ترکیب۔ جب دھوپ میں صاف کردہ شیشے کو جس پر چاندی کا پانی چڑھانا مقصود ہے۔ ہموار جگہ رکھے نصف گھنٹہ گزر جائے۔ تو تیار کردہ سالییشن نمبر ۱، ۲ کو کسی اور صاف شیشی میں حسب ضرورت شیشے کی لمبائی و چوڑائی کے مطابق یکساں مقدار میں ملا کر خوب مل کر کے فوراً اسی وقت قطرہ قطرہ کر کے شیشے کے عین درمیان اس طرح سے گرائیں کہ چاندی کا پانی شیشے کی تمام سطح پر خوب پھیل جائے مگر نیچے نہ گرنے پائے۔ بعد ازاں نصف گھنٹہ تک شیشے کو اسی جگہ بغیر ہلائے جلائے دھوپ میں رہنے دیں۔ تاکہ پانی خشک ہو کر شیشے پر چاندی چڑھ جائے۔ پھر شیشے کو پانی کے بہاؤ سے دھو دیا جائے۔ مگر ماتھ سے ہرگز نہ ملیں۔ بعد ازاں اندھیرے میں خشک کر کے سنکروف اور روغن ملا کر برش سے لگا کر دھوپ میں رکھ دیں۔ تاکہ روغن خشک ہو جائے۔

نوٹ خاص۔ ہر ایک عمل کو احتیاط اور استقلال کے ساتھ کریں۔ تاکہ مفید اور اعلیٰ نتائج حاصل ہونے پر آپ کے اپنی کامیابی پر مسرت حاصل ہو۔ یاد رہے ”مشق انسان کو مکمل بناتی ہے“

محبت

اے بلصیب آدم کے بیٹے! تو کیوں رہا ہو؟ تجھے بتایا گیا ہے کہ تو وحشی ہے، ظالم ہے، خو خوار ہو۔ تو نے اپنی بھائی کا گلا کاٹ ڈالا اور اس کے گھر میں آگ لگا دی! تو گمراہ ہو۔ تجھے تیرے ازل دشمن شیطان نے ورغلا یا ہے! تجھے سکھایا گیا ہے کہ تو عشق کے لئے پیدا ہوا تیری زندگی انسان ہے۔ تیرا مقصد محبت ہے۔ تیرا اہم خدا ہو۔ یہ تیرا استاد کوئی انبی تھا۔ یا اسکی ماں ہی ماں تھی باپ کوئی تھا ہی نہیں۔

تجھے شیطان نے ورغلا یا؟ خواب! اس تیز دھاڑنے والے شیر کو کس نے ورغلا یا کہ سیاہ آنکھوں والی ہرنی کے بچے کا گلا گھونٹے۔ اس تیز پنجوں والے شاہین کو کس نے ورغلا یا کہ بوز کا سینہ چیرے۔

تو عشق کے لئے پیدا ہوا؟ تیری زندگی انسان ہے۔ تیرا مقصد محبت ہے۔ تیری رہنما محبت ہے۔ جھوٹ، محبت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہو کہ تو اپنے بھائی کا گلا کاٹ سکے۔ محبت صرف اس لئے کی گئی ہے کہ شیر ہرنی کے بچے کو پھاڑ سکے۔ محبت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے۔ کہ شاہین کو بوز کو چمک سکے۔

تیری ماں کو تیرے بھائی سے محبت تھی۔ اسکا کیا شہر تھا؟ ہرنی کو اپنے بچے کو محبت تھی اسکا انجام کیا ہو؟ بوز تیری کو اپنے بچے سے محبت تھی۔ اسکا کیا حال ہے؟

(ماخوذ)

محبت، محبت و محبت ہو۔ محبت ظلم ہے۔ محبت خو خوار ہی ہے۔

پنجاب کے وزیکلر مڈل سس

میں زراعت کی تعلیم

(جناب لہ پچھند اس صاحب بی، اے پی، اے، ایس اسسٹنٹ انسپکٹر زراعت پنجاب)

تعلیم اگر صحیح طور پر دی جائے۔ تو اس کا اثر طلباء کی ذہنی اور اخلاقی ترقی تک ہی محدود نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ اس سے ان کی اقتصادی اور تمدنی ترقی بھی ہونی چاہئے۔ پنجاب میں جو طریقہ تعلیم اس وقت تک رائج رہا ہے اس نے اس مقصد کو صرف محدود حد تک ہی پورا کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ طلبہ کی ذہنی ترقی کو نہایت دینے میں بہت کچھ کوشش کی گئی ہے۔ اور وہ کامیاب بھی ہوئی ہے۔ مگر زندگی کے اقتصادی پہلو کو وہ ان تعلیم میں بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آج کل تعلیم یافتہ گروہ میں جو تمدنی اور اقتصادی تفاوت اور اس سے پیدا شدہ خواہیاں نظر آرہی ہیں۔ اس کی ذمہ داری زیادہ تر اسی پرانے طریقہ تعلیم پر ہے۔ اس طریقہ نے ہمارے صوبہ کی دولت کی ایزادی میں چندال مدد نہیں دی۔ البتہ اس کا اثر یہ ضرور ہوا ہے کہ موجودہ دولت بہت سے ہاتھوں کی بجائے چند ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ یعنی شہروں اور قصبوں میں جو چند امیر تھے۔ وہ امارت میں بڑھ رہے گئے۔ اور عام لوگ بالخصوص کاشتکار طبقہ افلاس میں ترقی کرتا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارا صوبہ اس وقت اقتصادی نقطہ نگاہ سے مصیبت میں گرفتار ہے۔

درسی تعلیم صرف کتابوں تک ہی محدود رہی ہے۔ اور ایسے عملی مضامین جن کا تعلق عام پیشوں سے ہے۔ نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں بے شمار کلرک۔ چند دھلاہ اور گنتی کے مدبّر پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد جنہوں نے اپنی بہت سے لکیر کے فقیر نہ ہو کر ملک میں نام پایا ہو۔ نہایت قلیل ہے۔ ہر جگہ کل ہزاروں انٹرٹینس اور ایف۔ اے پاس اور سٹیکڑوں گریجویٹ بے کاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ جو انہی تعلیم سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اور اپنے والدین کی گاڑ سے پسینہ کی کمائی کے ضائع ہو جانے پر گریہ کنائیں ہیں جس سے انہوں نے یہ تعلیم حاصل کی۔ بے شک آبائی پیسے موجود ہیں جنہیں یہ لوگ اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے سکولوں کی تعلیم نے طلباء کے جسم اور طبائع ان پیشوں کے بالکل ناقابل بنا دیئے ہیں۔ سکول کی تمام فضا طلباء میں

اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا شوق پیدا کرنے کے لئے ناموافق ہے۔ احاطہ سکول میں طالب علموں کا ان حالات میں نسبتاً زیادہ وقت گزارنا جوانی کے خانگی حالات سے بالکل مختلف ہوں۔ انہیں اپنے آبائی پیشے سے بے اعتنا کرنے کے لئے کافی ہے۔ بجائے اس کے کہ لڑکا اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھا کر اپنے آبائی پیشے کو ترقی دے یہیں اکثر یہ اندوہناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ لڑکے اپنے آبائی پیشے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر والدین مجبور کریں۔ تو وہ ان کی اطاعت سے سر پھیر لیتے ہیں۔

اگر یہ حالات بدستور قائم رہتے دیتے جاتے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ ملک کی تباہی اور گورنمنٹ کے لئے باعث تشویش ہوتا۔ اس لئے موجودہ طریقہ تعلیم میں تبدیلی لازمی ٹھہری۔ بنابرین گورنمنٹ نے منابت دانائی سے جنگ عظیم کے بعد جس قدر جلد ہو سکا۔ مائٹری سکولوں اور رینیکر ٹل سکولوں میں زراعت کی عملی تعلیم کا انتظام کیا اور اسی طرح پرائمری اور فوڈل سکولوں میں باغبانی اور مطالعہ قدرت کو جاری کیا۔ ممکن ہے کہ اور تبدیلیاں بھی بنیں ضروری سمجھا جائے۔ عمل میں لائی جائیں۔ مگر زراعت کا حق فائق تھا۔ کہ گورنمنٹ اس کی طرف توجہ مبذول کرتی۔ کیونکہ زراعت ہی ہمارے صوبہ کی سب سے بڑی حرفت اور تہذیباً ۹۰ فی صدی لوگ اسی طرح پر گزارہ کرتے ہیں۔

گورنمنٹ آف انڈیا کی کوشش

اس اصلاح کی طرف پہلے پہل توجہ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے ہوئی۔ جس نے کہ ۱۹۰۹ء میں شملہ میں اس سوال پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس نے یہ تجویز منظور کی۔ کہ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہر ضلع میں ایک یا ایک سے زیادہ ذراعتی ٹل سکول ہوں۔ جن میں زراعت کی تعلیم کا پورا پورا انتظام ہو۔ اور عملی پہلو کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے۔ ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا نے ۱۹۱۸-۱۹ء میں تیس لاکھ روپیہ کی منظوری ذراعتی اور صنعتی تعلیم کے لئے دی۔ اور اس میں سے ۲۵ لاکھ روپیہ صرف ذراعتی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔

پنجاب گورنمنٹ کی کوشش

پنجاب گورنمنٹ نے شملہ کی کانفرنس کی سفارشات پر غور کرنے کیلئے دو دفعہ کانفرنس منعقد کی۔ اور یہ طے پایا کہ چونکہ اس قسم کے ذراعتی اور صنعتی ٹل سکول جن کی گورنمنٹ آف انڈیا نے سفارش کی ہے۔ پنجاب کیلئے موزوں

نہیں۔ اس لئے مڈل سکولوں سے ہی زراعتی تعلیم کے پھیلانے کا کام لیا جائے۔ اور یہ قرار پایا کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہر سکول میں ٹرینڈ اسٹاڈ اور ایک قطعہ زمین جو کم سے کم تین ایکڑ ہو۔ بیل۔ آلات اور دیگر ضروری سامان مہیا کیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ ہوا کہ پرائمری سکولوں میں زراعتی تعلیم کی بجائے مطالعہ قدرت جاری کیا جائے۔ اور مڈل سکولوں میں مطالعہ قدرت اور باغبانی کی تعلیم دی جائے۔

ہائی سکولوں کے متعلق یہ سفارش کی گئی کہ زراعتی تعلیم کا بندوبست ایسے شہری سکولوں میں کیا جائے جہاں کہ دو یا دو سے زیادہ ہائی سکول ہوں۔ تاکہ طلباء دیگر مضامین اپنے اپنے سکولوں میں پڑھیں۔ اور زراعت کیلئے ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک ہی استاد کے ماتحت تعلیم حاصل کریں۔ اور اس زراعتی درسگاہ کا تمام خرچ گورنمنٹ کے ذمے ہو۔

محکمہ تعلیم پنجاب کی کاروائی

ان فیصلہ جات کو عمل میں لانے کیلئے پہلا کام جو محکمہ تعلیم پنجاب نے کیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۱۸ء میں زراعتی کالج لائل پور میں ایک کلاس چند منتخب افسانہ دہی ٹرینڈ اساتذہ کے لئے کھولی گئی۔ جو اس وقت تک برابر جاری ہے۔ اور ہر سال بیس سے زیادہ طلباء تیار کر کے باہر بھیجتی ہے۔

وزیکلر مڈل سکول کی چار جماعتوں کے لئے زراعت کا نصاب تیار کیا گیا۔ اور بعد ازاں پنجاب ٹیکٹ بک کمیٹی نے زراعتی تعلیم کے لئے چار دہی کتب بھی تیار کروائیں۔

کاشت کی عملی تعلیم کے لئے ہر سکول میں مندرجہ ذیل سامان کی فہرست لازمی سمجھی گئی۔

(۱) سکول کے نزدیک قابل کاشت زمین کا ایکڑ جو کم سے کم تین ایکڑ رقبہ میں ہو۔

(۲) ایک یا دو جوڑی بیل

(۳) آلات کٹا درزی۔ دیسی اور اصلاح شدہ

(۴) ایک عمارت جو جس میں بیل، آلات کٹا درزی اور دیگر ضروری سامان کے علاوہ فارم کے چوکیدار کی ٹائٹل کی بھی گنجائش ہو۔

گورنمنٹ نے بحساب ۳۵۰۰ روپیہ فی سکول ابتدائی اخراجات کے لئے منظور کیا۔ اور یہ سمجھ لیا گیا کہ بعد کے اخراجات جن میں استاد کا دس روپیہ ماہوار الاؤنس بھی شامل ہوگا۔ وہ مقامی بورڈ ادا کرے گا۔ جن کے ماتحت وہ سکول ہوں۔

مالی مشکلات کا اثر

اس سکیم کے جاری ہونے کے متھوڑا عرصہ بعد صوبے کو مالی مشکلات کا سامنا ہوا۔ جن کی وجہ سے اکثر دسترس بورڈوں نے اساتذہ کے الاؤنس اور فام کے دیگر اخراجات کا برداشت کرنا اپنی طاقت سے باہر خیال کیا اور انہوں نے فوراً اس سکیم کے خلاف اپنی آراء کے اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اور بھی کئی دقتیں تجربہ میں آئیں جن میں بڑی یہ تھی کہ منظور شدہ نرخ میں یعنی ۲۵۰ روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے زمین کا میسر آنا بہت مشکل ہو گیا۔ اور اسی طرح آبپاشی کے لئے پانی حاصل کرنے کی دقتیں بھی پیش آئیں۔ لیکن باوجود ان تمام مشکلات کے پہلے پارساوں میں تسلی بخش ترقی ہوئی۔ اگرچہ ترقی کی رفتار سست تھی۔ یعنی ۱۹۲۳ء کے آخر میں ۴۴ درمیکٹر مل سکول ٹرنڈ اساتذہ کی نگرانی میں زراعت کی تعلیم دے رہے تھے۔

ایک نیا سرکل

ستمبر ۱۹۲۳ء میں ڈیپارٹمنٹ نے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو مالی مشکلات کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ اپنی پالیسی میں تبدیلی کا اعلان کیا۔ ایک نیا سرکل جاری کیا گیا جس کی بڑی بڑی دفعات مندرجہ ذیل ہیں:-
(۱) چونکہ مین ایکڑ زمین والے فاموں کیلئے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے ان کی تعداد محدود ہونی چاہئے۔

(ب) اگرورنٹ ایک باقاعدہ کامیاب فام کے مالی نقصان کے پورا کرنے کے لئے تاریخ اجرا سے ۵ سال تک ۱۰۰ سو روپیہ سالانہ تک امداد دے گی۔

(ج) چونکہ بڑے فام زیادہ تعداد میں جاری کرنے مشکل ہیں۔ اس لئے ان کی بجائے سکولوں میں چھوٹے چھوٹے باغچے جن کا رقبہ نصف ایکڑ سے زیادہ نہ ہو۔ جاری کئے جائیں۔

(د) اگرورنٹ ایسے باغیچوں کے ابتدائی اخراجات کے لئے ۳۰۰ روپیہ فی قطعہ بطور امداد دے گی۔ اور مالی نقصان کی صورت میں ہر قطعہ کے لئے کام شروع ہونے کی تاریخ سے پانچ سال تک تیس روپے سالانہ تک امداد دے گی۔

(ه) اگرورنٹ زراعتی استاد کا ۱۰ روپیہ ماہوار الاؤنس برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔ خواہ وہ استاد فام کا انتظام کر رہا ہو یا سکول کے باغیچے کا۔

موجودہ حالت

اس سرکل کا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ سکولوں میں زراعتی تعلیم کی ترقی ہونے لگی۔ ۱۹۲۳-۲۴ء کے تعلیمی سال کے

اختتام پر زراعت کے تعلیم دینے والے سکولوں کی تعداد ۴۴۴ سے ۶۰ ہو گئی۔ اور اس وقت ایسے سکولوں کی تعداد ۴۴۴ ہے۔ جن میں سے ۷۲ ایسے ہیں۔ جن کے ساتھ ۳ ایکڑ یا اس سے زیادہ کے فارم ہیں۔ اور اسی قدر سکول ایسے ہیں۔ جن کے ساتھ باغیچے ہیں۔

فارم یا باغیچے

ڈسٹرکٹ بورڈ اور اس سکیم کے نکتہ چینیوں کی خواہشات کو پورا کرنے کی خاطر کچھ عرصہ سے کامیابی کے ساتھ یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ سکول فارم اپنے خرچ کو جہاں تک ممکن ہو۔ خود پورا کریں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ ایک تو یہ دقت ہے کہ تین ایکڑ کا فارم اقتصادی نکتہ نگاہ سے کچھ دقیق نہیں۔ اور دوسرے یہ تجربہ میں آیا ہے۔ کہ اگر اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو اس کا اثر دیگر تعلیمی مقاصد کے حصول پر بُرا پڑتا ہے۔

زراعتی فارم زراعت کی عملی تعلیم کے لئے واقعی بہت مفید ہیں۔ ایک تو ان سے زمینداروں کے بچے یکے لیتے ہیں۔ کہ کاشتکاری میں سائنس کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ملک کو کس قدر فائدہ کی امید ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے زمینداروں کے اس غلط عقیدے کی کہ "زراعت میں کوئی نئی بات سیکھنے کے قابل نہیں" اصلاح ہو رہی ہے۔ سکول فارموں سے یہ توقع نہ رکھی جائے کہ وہ مقامی یا گرد و نواح کے زمینداروں کو کاشتکاری کے جملہ اصول واضح طور پر پیش کر سکیں۔ اور نہ ہی ان درگاہوں کا یہ مقصد ہے۔ مگر پھر بھی یہ امر موجب مسرت ہے۔ کہ بعض کامیاب سکول فارم مقامی زمینداروں کے لئے نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ اور یہ خیال زور پکڑ رہا ہے کہ اگر ان سکول فارموں کی عمدہ طریق پر غور و پرداخت کی جائے اور ضروری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ تو یہ صرف طلبائے سکول کے لئے ہی نہیں بلکہ گرد و نواح کے کانوں کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

پنجاب کی سکیم

گزشتہ ۱۱ سال میں ہمارے صوبے نے زراعتی تعلیم کی خاطر ۲۱۰ سکولوں میں جو انتظام کیا گیا ہے اسکی مختصر سی تفصیل مندرجہ بالا سطروں میں دی گئی ہے۔ ہمارے صوبے میں سکیم غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئی ہے۔ اور یہ کامیابی دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں بہت نمایاں ہے۔ دوسرے صوبہ جات نے گورنمنٹ آف انڈیا کی سفارشات کو عمل میں لانے کے لئے جو زراعتی مڈل سکول کھولے تھے۔ وہ اتنے مفید ثابت نہیں ہوئے۔ ہندوستان کی بورڈ آف ایگریکلچر نے عرصہ ہوا یہ رائے "پوسا" (پوسا) کے مقام پر ظاہر کی تھی

کہ پنجاب میں جو سکیم رائج ہے۔ وہ دینیکر مل سکولوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔ اور اس مانے کی پھکی کاغذت اس بات سے بھی ملتا ہے۔ کہ یہی سکیم بنگال میں بھی اس خاص و فنی سفارش سے جو کہ ۱۹۲۸ء میں اس سکیم کے مطالبہ کی غرض سے پنجاب آیا تھا۔ جاری کر دی گئی ہے۔ اور رائل کمیشن آف ایجوکیشن نے بھی اپنی ۱۹۲۸ء کی رپورٹ میں اس سکیم کو پسند فرمایا۔ اور دیگر صوبہ جات میں زراعتی مل سکولوں کی جگہ اس سکیم کو جاری کرنے کی سفارش کی۔ پھر یہی جو شہادت اس سکیم کے متعلق بعض لوگوں کے دلوں میں رہ گئے تھے۔ وہ سال گزشتہ میں اس کمیٹی نے جو زراعتی تعلیم کے متعلق وزیر تعلیم پنجاب نے مقرر کی تھی۔ بالکل ود کر دیئے۔ کیونکہ کمیٹی کے ممبروں نے اس کے متعلق اپنی رپورٹ میں پوری تسلی کا اظہار کیا ہے۔

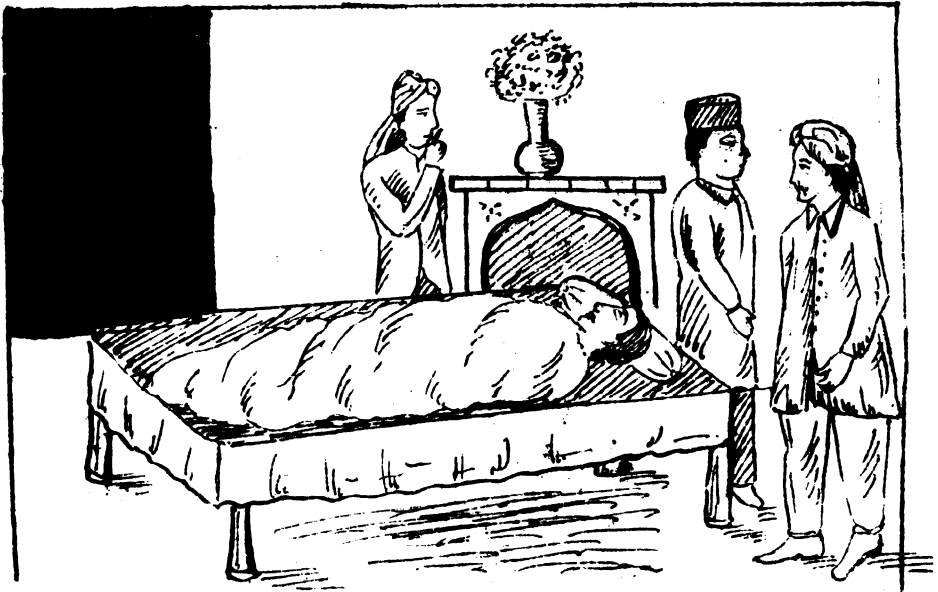
نتیجہ

جہاں تک کہ سکیم کا تعلق ہے۔ ہمیں ان بڑی بڑی باتوں کی رائے صائب کے اظہار کے بعد جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے مفید برحقے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن انہیں اس سکیم کو حسب دلخواہ سرعت سے سکولوں میں رائج کرنے میں دیر کا سوال ملتا ہے۔ ہاں یہ امر موجب مسرت ہے کہ بعض سودہ حال و ترقی یافتہ دسترس بورڈوں نے صوبے کی گورنمنٹ کی طرف سے امداد کا انتظار کے بغیر اپنے اپنے علاقوں میں سکول فارم اور باغیچوں کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس سے بہت بڑی حد تک اس سکیم کی ہر دفعہ زری اور اس کے مفید ہونے کا پتہ چلتا ہو اس کے علاوہ ان فارموں کے کام میں زمینداروں کی دل چسپی میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ بھی بہت دل خوش کن ہے۔ کیونکہ اس سے ان فارموں کا عملی طور پر مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ سکول کے طلباء نے بھی طبیعتی باڑی کے کام میں دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ اور اساتذہ نے بھی ہر جگہ زراعت کے عملی کام میں دوستانہ ہمدردی دکھانی شروع کر دی ہے۔

نارمل سکولوں میں عملی باغبانی نے بہت ترقی کی ہے۔ اور امید ہے کہ دیہات میں زراعت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ اسی طرح لوئر مل اور پرائمری سکولوں میں جو باغبانی کی طرف تبدیلیج توجہ کیا جا رہی ہے۔ یہ بھی بہت امید افزا ہے۔ اور ہر عقلمند آدمی کا فرض ہے کہ اس کی حمایت کرے۔ مل اور نارمل سکولوں میں باغبانی اور زراعت کی تعلیم کا ایک عمدہ اثر تمام سکولوں پر یہ بھی ہوا ہے کہ طلبہ اپنے اپنے سکولوں کی سجاوٹ اور احاطہ سکول کے آراستہ کرنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اور اس بارے میں گزشتہ پانچ سال میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ ان تمام اہل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر زراعت کے کام کو سکولوں میں ترقی دی جائے۔ تو اس سے نہایت اہم نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ امر گورنمنٹ اور عوام کی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

موجودہ حالت میں یہ بتانا کہ سکولوں میں زراعت کی تعلیم نے طلباء میں کس حد تک زراعت کا پیشہ اختیار کرنے کی خواہش پیدا کر دی ہے۔ دشوار ہے۔ کیونکہ ایک تو صحیح اور قابل اعتبار اعداد و شمار مہیا نہیں ہو سکتے۔ جن سے یہ معلوم ہو سکے۔ کہ طلباء سکول چھوڑنے کے بعد کون کون سے مشاغل اختیار کرتے ہیں۔ دوسرے زراعت کا کام سکولوں میں ابھی کافی عرصہ تک جاری نہیں رہا ہے۔ جس سے طلباء کے اندر اس پیشہ کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ ہمارے ملک میں اس وقت تک لوگوں میں پیشہ کا انتخاب غور و فکر کے بعد نہیں کیا جاتا بلکہ ایک ہی حد تک اتفاقیہ امر ہے۔ تاہم یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے۔ کہ اگر سکولوں میں زراعت کی تعلیم صحیح طریق پر جاری رکھی جائے۔ تو دیہاتی طلباء کے دلوں پر ضرور اس کا اثر ہوگا۔ بلکہ موجودہ حالات میں بھی اس امر کی کافی تہادیت موجود ہے کہ کہیں کہیں بعض طلبہ نے سکول کی تعلیم چھوڑنے پر سکول فائدہ کے زیر اثر ہو کر اپنے اپنے گھروں میں سبزیات کا کرنے کا کام شروع کیا ہے۔ جس سے انہوں نے کافی مالی فائدہ اٹھایا ہے۔

غرضیکہ اس ضمن میں کامیابی سکولوں میں نہایت یقینی ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ اس بارے میں کافی سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ صرف ایسے ہی خواہوں کی ضرورت ہے۔ جو کاشتکاروں کے دلی بہرہ دہوں۔



سرمائے تیر کے آہستہ بولو * ابھی دُہا روتے روتے سو گیا ہے

ہنری فورڈ

(پینٹ بال ملکنڈ عرش ملیبانی سکیڈ ماسٹر گورنمنٹ انڈسٹریل سکول لدھیانہ)

سٹر ہنری فورڈ دنیا کی ان ممتاز ہستیوں میں ایک برگزیدہ ہستی ہیں۔ جنہوں نے ایک غیر معروف گھرانے میں پیدا ہو کر حیرت انگیز ترقی کی۔ آپ ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء کو ڈارن (امریکہ) کی ایک غلام میں پیدا ہوئے۔ عام طور پر یہ روایت ہے کہ آپ کے والدین بہت مفلس تھے۔ اور آپ کے بچپن کا زمانہ بہت ناداری اور تلخ دستی کی حالت میں گذر رہا لیکن سٹر فورڈ خود اپنی کتاب ”میری زندگی اور سفر نامہ“ میں لکھتے ہیں کہ واقعی آپ کے والدین بہت دولت مند نہیں تھے۔ لیکن زیادہ غلس بھی نہیں تھے۔ وہ قابل فخر گھر میں سٹر فورڈ پیدا ہوئے۔ آج تک کھڑا ہے۔ اور وہ گھر اور فارم ان کی موجودہ جائداد کا ایک حصہ ہے۔

ابھی ان کی عمر صرف بارہ سال ہی کی تھی۔ کہ انہوں نے ایک دن روڈ انجن دیکھا جو سڑک پر بڑی مشینوں کے کھینچنے کا کام دیتا تھا۔ اس انجن کو دیکھ کر ان کے دماغ میں ایک امنگ پیدا ہوئی۔ اور وہ اس کے چموتے چموتے ٹونے بنانے میں ہنمک ہو گئے۔ اس وقت سے آج تک ان کی تمام ترقیوں میں اسی شعبہ انجیناوات میں صرف ہو رہی ہیں کہ سڑک پر چلنے والا انجن بنایا جائے۔ دوسری عجیب چیز جو انہوں نے اسی سال دیکھی۔ وہ ایک گھڑی تھی۔ اسے دیکھنے

کے بعد آپ بالعموم ٹوٹی ہوئی گھڑیوں کو جوڑنے کی کوشش اور مشق کرتے۔ تیرہ سال کی عمر میں آپ نے پہلی دفعہ یہ کامیابی حاصل کی۔ کہ ایک ٹوٹی ہوئی گھڑی کو باقاعدہ وقت دینے والی گھڑی بنا لیا۔ پندرہ سال کی عمر میں آپ گھڑیوں کے متعلق ہر قسم کی مرمت کر سکتے تھے۔ باوجود اس کے کہ انہیں اعلیٰ قسم کے اورلڈ میسٹر نہ تھے۔ اتنی کامیابی حاصل کر لینا معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ ہے۔ کہ مختلف چیزوں کو لیکر دعائی تحقیق کرنے ہیں ایک عظیم الشان کامیابی پنہاں ہے۔ اور ایک کاریگر کے لئے کوئی ضرورت نہیں کہ وہ کتابوں سے کسی چیز کو حاصل کرے شین ہی اس کی کتابیں ہیں۔ ان کے والد ان کے اس شوق کے حق میں نہ تھے۔ لیکن پھر بھی یہ شوق پڑھتا ہی گیا۔ اور انہیں دینی اس سے روک نہیں سکا۔ سترہ سال کی عمر میں سکول سے فارغ التحصیل ہوتے ہی آپ ڈرامنگ انجن ورکس بن بطور اپرینٹس کام کرنے لگے۔ تین سال کی مقررہ سیداد سے پہلے ہی آپ نے اپرینٹس کا کام ختم کر لیا۔ انہیں نوں میں آپ نے گھڑیوں کی ایک دوکان میں مرمت کا کام شروع کر دیا۔ اور دن رات اس فخر محنت سے کام کیا۔ کہ جس اوقات ایک دن رات میں تین تین سو کے قریب گھڑیاں ان کے پاس مرمت کیئے آجاتیں اس کام میں شبانہ وز کام کر کے یکایک انہیں خیال پیدا ہوا۔ کہ اس کام سے میں جی نوع انسان کی کوئی خاص خدمت ادا نہیں

کر سکتا۔ خدمتِ خلق کا خیال لے کر انہوں نے اپنے پہلے شوق کو گھوڑوں کے بیغیر چلنے والی گاڑی بنائی جانے۔ نشوونما دینی شروع کی۔ کافی غور و خوض اور تجربات کے بعد آپ ایک سیٹیم کار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یہ خیال کہ کھلی گاڑیوں کے لئے سیٹیم کی طاقت کا استعمال مناسب نہیں۔ انہیں مزید غور و خوض کے لئے آکسٹار ہائیڈرینک ہوٹس کمپنی جس کے ساتھ مل کر آپ نے یہ کام شروع کیا تھا۔ اسی وجہ سے چھوڑ دی۔ اپریٹس کے زمانے کی یاد اور گاڑہ لٹریچر کے پڑھنے سے گیل کزن کے متعلق خیالات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۸۵ء کے قریب انہوں نے ایک آٹو انجن کی مرمت کی۔ حالانکہ یہ کام انہوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن شوق اور سوچنے کی قوت نے مل جل کر انہیں اس میں بھی کامیاب کر دیا۔ اس سے اس انجن کے متعلق انہیں واقفیت ہو گئی۔ اسی طرح مختلف تجربات کرتے کرتے ۱۸۹۲ء میں آپ اس قابل ہوئے کہ اپنا پہلا موٹر بنانے کا فخر حاصل کر سکیں۔ یہ موٹر ڈبل سلنڈر تھا۔ اور اس میں صرف دو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ دراصل ۱۸۹۳ء کے موسم بہار میں یہ موٹر ان کی حسبِ خواہش چلنے لگا۔ اس موٹر کی ساخت موجودہ موٹروں سے بہت مختلف تھی۔ اور اس میں چند خامیاں بھی تھیں۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۶ء کے درمیان انہوں نے اس موٹر سے تقریباً ایک ہزار میل سفر طے کیا۔ لوگ بالعموم اس موٹر کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جہاں کہیں میں یہ موٹر لے کر ٹھہرتا۔ لوگوں کا ہجوم اور ان کے عجیب عجیب سوالات مجھے بہت تنگ کرتے۔ اور اگر کہیں میں نیچے اتر آتا۔ تو ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی کہ میری جگہ بیٹھ کر اسے چلانے کی کوشش کرے۔ ان کی ایسی خواہش سے مجھے بے اختیار سنبھائی آتی تھی۔ چونکہ اب انہوں نے کافی تجربہ حاصل کر لیا تھا اسلئے

اس موٹر کو ایک شخص کے ہاتھ جوئے خریدنے کا بہت خواہش مند تھا۔ ۲۰۰ ڈالروں میں فروخت کر دیا اس کے بعد انہوں نے اور تجربات شروع کئے۔ اور موٹر کار میں مزید اصلاحات کا سلسلہ جاری کیا۔ آپ نے مختلف قسم کے ڈھانچے تیار کئے جن کے نام موٹر اے۔ بی۔ کے۔ این۔ آر۔ ٹی وغیرہ ہیں۔ موڈل K موٹر سب سے زیادہ مقبول تھا۔ اور یہ چھ سلنڈر رکھتا تھا۔ این۔ اور آر میں سب سے کم طاقت تھی۔ موڈل بی کا وزن ۱۲۵۰ پونڈ تھا۔ این۔ اور آر سب سے ہلکی تھیں۔ ان کا وزن ۱۰۵۰ پونڈ تھا۔ ۱۹۰۲ء میں فرڈ موٹر کار کا وزن ۱۷۰۰ پونڈ تھا۔

آخروں کو موٹر کمپنی بنائی گئی۔ اس کمپنی کی عمر ابھی پانچ ہی سال کی تھی کہ ان کی فیکٹری ۶۵ ۲۶ ایکڑ زمین میں پھیل گئی۔ کلکرنے والوں کی اوسط تعداد ۹۰۸ تھی۔ اور انہوں نے ۶۱۸۱ موٹر بنائے۔ ۱۹۱۷ء میں انہوں نے ۱۰۶۰ موٹر بنائے۔ سفری موٹر کا کم قیمت ۸۵۰ ڈالر تھی۔ ہر سال قیمت گھٹتی گئی۔ اور موٹر کار کی اصلاح بھی ہوتی گئی۔ ذیل کے اعداد و شمار ان کے کام کی حیرت انگیز ترقی کو ظاہر کرتے ہیں۔

بنائے گئے موٹر کی تعداد

قیمت فی موٹر کار

سال

۱۸۶۶ء

۸۵۰ ڈالر

۱۹۰۹-۱۰

۱۹۱۰-۱۱	۷۵۰	حاکم	۳۳۵۲۸
۱۹۱۱-۱۲	۶۹۰	"	۷۸۴۴۰
۱۹۱۲-۱۳	۶۰۰	"	۱۶۸۲۲۰
۱۹۱۳-۱۴	۵۵۰	"	۲۲۸۳۰۷
۱۹۱۴-۱۵	۴۹۰	"	۳۰۸۲۱۳
۱۹۱۵-۱۶	۴۴۰	"	۵۳۳۹۲۱
۱۹۱۶-۱۷	۳۶۰	"	۷۸۵۴۳۲
۱۹۱۷-۱۸	۴۵۰	"	۷۰۶۵۸۴
۱۹۱۸-۱۹	۵۲۵	"	۵۳۳۷۰۶
۱۹۱۹-۲۰	۵۷۵ سے ۴۴۰ تک		۹۹۶۶۶۰
۱۹۲۰-۲۱	۴۴۰ سے ۳۵۵ تک		۱۲۵۰۰۰۰

۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء کا مقابلہ کریں۔ توفیکر ٹری ۲۶۵ ایکڑ کی بجائے ۳۲ ایکڑ تک پھیل چکی تھی۔ مگر کام کرنے والوں کی تعداد ۱۹۱۰ء سے ۱۱۰۴۱۰ ہوئی۔ موثر بھی تقریباً ۶۰۰ کی بجائے ۷۵۰۰ بنائے گئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کام کرنے والوں کی تعداد میں کام کے تناسب سے بہت تھوڑی زیادتی کرنی پڑی۔ یہ بات محض کام کی عمل اور باقاعدہ نگہداشت۔ آسان سے آسان طریقوں سے کام کرنے کی کوشش اور مکمل ضبط و نظام پر منحصر ہے۔ ایک دفعہ ان کا یہ اشتہار نکلا۔ جس میں انہوں نے اول اول ہی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ایک ایسا موٹر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں جسے عام لوگ استعمال کر سکیں گے اور وہ قابل ترین کاریگروں کی زیر نگرانی بنیگا۔ جس پر اچھے سے اچھا سامان صرف کیا جائیگا۔ اور جس کی قیمت بھی کم سے کم ہوگی۔ تو لوگوں نے عام طور پر اسے خام خیالی ٹھہرایا۔ باخبر حلقوں میں ہر روز یہ سوال پیدا ہوتا کہ فورڈ ٹیکسی کب دیوالیہ ہوگی۔ لیکن مسٹر فورڈ لکھتے ہیں کہ ان باتوں میں کوئی مضرت تھی کہ اس کمپنی میں ایک آدمی کا ماغ کام نہیں کر رہا۔ بلکہ ایک فطرتی اصول کام کر رہا ہے۔ جس کا نام ضبط اور نظام ہے۔ ان کے کام کرنے والوں کو پہلی ہدایت یہ ہے کہ وہ صرف وہی کام کریں۔ جو انہیں کہا جائے۔ ہر ایک پرزہ اور ہر ایک حصہ ایک دوسرے پر استغناء انحصار رکھتا ہے۔ کہ کام کرنے والوں کو اگر ان کی مرضی کے مطابق کام کرنے کی اجازت دینا چاہئے تو سارا کھیل بگڑ جائے۔ اسی ضبط اور نظام کے نہ ہونے سے خود کام کرنے والوں کا نقصان ہے۔ جب کام بگڑ جائیگا اور نقصان کے آثار پیدا ہونگے۔ تو قدرتنا اس کا اثر ان کی تنخواہوں پر بھی پڑے گا۔

مسٹر فورڈ کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ کوئی کام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کا تجویز

کندہ - کارندہ اور خریدار میں اس سے فائدہ نہ اٹھائیں

استعداد ایجاد و اختراع کر چکنے کے بعد کج تنگ مسٹر فورڈ کا خیال ہے کہ دنیا میں ابھی ترقی کا بہت وسیع میدان ہے۔ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک کسان جس قدر طاقت صرف کرتا ہے۔ اس کا محض پانچ فیصدی حصہ اس کے فائدے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور باقی طاقت ضائع جاتی ہے۔ تو وہ سوچتے ہیں کہ ابھی بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے۔ ایک کسان پانی کا ایک گھڑا لیکر ہر روز زہیہ چھٹا کبے۔ لیکن وہ اس روزانہ ضائع ہونے والی طاقت کا تدارک ایک ٹکا لگا کر نہیں کرتا۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ ٹکے کی قیمت اس مجموعی طاقت کے سائیکل بھی نہیں۔ طاقت اور حرکت دونوں اپنی قیمت دینے بغیر ضائع ہو رہی ہیں۔ دنیا بھر کے انجنوں اور مشینوں میں آج بھی اتنی طاقت کام نہیں کر رہی۔ جتنی صرف زمینیں ہل چلانے میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہ باتیں محسوس کر کے مسٹر فورڈ کہتے ہیں کہ ابھی میدان بہت وسیع ہے۔ بشرطیکہ خدمت خلق کا جذبہ دل میں ہو۔

ان کے زمین اصول جن کو یہ خواہتی کامیابی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ مفصلہ ذیل ہیں۔

۱۔ مستقبل کے خطرات سے بے پروائی اور ماضی پر فخر کرنا چاہیے۔ جو شخص مستقبل اور اس کی ناکامیوں سے ڈرتا ہے۔ وہ اپنی سرگرمیوں کو محدود کر دیتا ہے۔ ناکامیابی نئے سہارے سے سوچ سمجھ کر کام کرنے کا ایک موقع ہے۔ دیانتدارانہ ناکامی میں کوئی شرم نہیں۔ بلکہ ناکام ہونے سے ڈرنے میں شرم ہے۔ ماضی اس وجہ سے فائدہ بخش ہے کہ وہ ترقی کے لئے راستہ اور ذرائع تجویز کرتا ہے۔

۲۔ دوسروں سے مقابلہ کرنے کی خواہش سے بے نیاز رہنا چاہیے۔ ہر شخص اپنے اپنے کام کے لئے موزوں ترین شخص ہے یہ ایک مجرا نہ نمل ہے۔ کسی کے ہاتھوں سے کسی کا کام چھین لیا جائے۔ یا پیچھے کی کوشش کی جائے۔ مجرا نہ اسلے کہ ذاتی نفع کی غرض سے ہوا ہے۔ ایک ہم جنس کو نقصان پہنچانے اور غلطی کی بجائے طاقت سے حکومت کرنے کے مترادف ہے۔ ۳۔ منافع سے پہلے خدمت گزاری کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگرچہ منافع کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اسلے منافع کی خواہش رکھنا کوئی غلطی نہیں۔ اچھی طرح چلایا ہوا کام خود بخود منافع دیکھا۔ منافع خدمت خلق کا صلہ ہونا چاہیے۔

۴۔ کم قیمت پر خریدنا اور زیادہ پر بیچنا یا ایک غلط اصول ہے۔ واجب سے واجب قیمت پر سامان خرید کر اس پر تھوڑی سے تھوڑی قیمت کا اضافہ کرنا اور اسے کارآمد بنا کر بیچنا حکمت ہے۔ روپیہ بٹرنے کے باقی تمام طریقے کلام کر گزرتے ہیں۔ ان اصولوں پر کاربند رہ کر مسٹر فورڈ نے اپنی تجارت کو کس طرح فروغ دیا۔ کیسی آئندہ اشاعت کے لئے اٹھا

رکتا ہوں۔





عالم با عمل و فاضل اجل بھائی صاحب بھائی ویر ستھ آنہ امر تہر کی شہرہ آفاق کتاب گورو نانک
چنگل سے یہ بلاک صاحب موصوف کے ہزارے عنایت ایک دفعہ چھاپنے کے لئے دیا ہے جس سے ہم ناظرین
مدللہ کی ضیافت طبع کے لئے شائع کرتے ہیں اور معجزہ بھائی صاحب کا شکر یہ ۱۵۱ کرتے ہیں

گلِ صدرِ رنگ

(سید دل محمد صاحب فضا نشی فاضل جالندھری)

یوں رنگ لائیں داغِ جگر بن کے اپنے پھول
شرمندہ رشک سے ہیں بہت یا سمن کے پھول
یہ آہ سرد ہے کہ نسیم بہار ہے
دکھیں وہ آ کے سیرِ دلِ داغِ دار کی
نسبت نہیں انہیں رخِ رنگینِ یار سے
تارے رکھے ہیں عارضِ رنگیں کے شوق میں
پونچھے جو اس نے دستِ خنائی سے میرے اشک
بے چین کر گئی تبیں رنگینیِ خیال
گلگشت میں ہوا سے ادھر اٹھ گئی نقاب
دنیا کی ہے فضا گلِ رخسارِ یار سے
آیا ہے سیرِ باغِ کو یہ کون رشکِ گل

یارِ بہارِ تازہ میں جیسے چمن کے پھول
دامن میں آج کس نے چنے نارون کے پھول
یہ داغ ہیں کہ باغِ دلِ پُرِ حن کے پھول
کیا کیا بہار پر ہیں ہمارے چمن کے پھول
دل کیا مرا نہال ہو کے کر چمن کے پھول
پھولے نہیں سماتے ہیں چرخِ کمن کے پھول
لالے کے پھول بن گئے سب ترن کے پھول
یاد آ گئے سفر میں یکا یک وطن کے پھول
شراب گئے چمن میں ادھر یا سمن کے پھول
ہونگے نہ باغِ خلد میں بھی اس چمن کے پھول
کیوں فرشِ راہ بن گئے بچھ کر چمن کے پھول

ہے بلبلوں میں شہبازِ آگنی فضا

پھولے سمائیں گے نہ چمن میں چمن کے پھول

کلامِ باسط

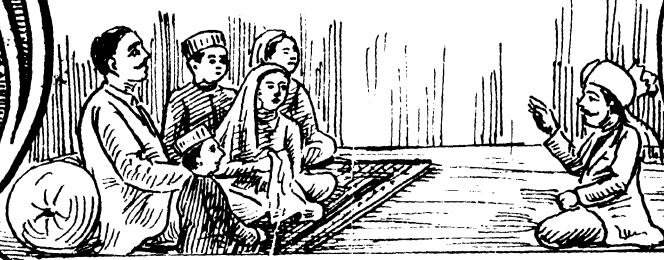
(باسط باسط صاحبِ ہوانی)

رہ الفت میں مٹ جائے اگر نام و نشان اپنا گزر ہو منزلِ جاں تک مکاں ہوا مکاں اپنا
 عروج اتنا تو ہو بعدِ فنا لے آسماں اپنا کہ پلٹے تیرے دامن سے غبارِ ناتواں اپنا
 دکھا سکتی نہیں منہ باغ میں فصلِ خزاں اپنا جمائے ہے کچھ ایسا رنگ اکے باغباں اپنا
 اگر پردہ دوئی ڈالے نہ رہتی درمیاں اپنا تو میرے امتحاں کو وہ سمجھتے امتحاں اپنا
 اُدھر بنیاب وہ ہوتے، تڑپتا دل یہاں اپنا مگر ایسی کہاں قسمت نصیب ایسا کہاں اپنا
 کیا یوں رازِ دل ہم نے اشاروں میں بیاں اپنا کہ جیسے حالِ کتنا ہے بمشکل بے زباں اپنا
 یہی اب دیکھنا باقی رہا ہسم ناتواؤں کو کہ پیچھے ساتھ دے آکر غبارِ کاررواں اپنا
 زبانِ حال سے محفل میں سب کچھ کہہ دیا آسہ چھپاتی شمعِ محفل کس طرح سوزِ نہاں اپنا
 وہی اک اُستانِ عشق ہم دہراتے رہتے ہیں بدلتا رہتا ہے کچھ کچھ مگر رنگِ بیاں اپنا
 قدم رکھے جو کوئی منزلِ دشوارِ الفت میں تو دل کے امتحاں کے ساتھ کو لے امتحاں اپنا

چھری گردن پر رکھے رو رہے ہیں آج مقتل میں

وہی جو کل ہنسی سمجھتے تھے باسط امتحاں اپنا

افسانے



فہرست مضامین

- تحریک نشی پریم چند صاحب بی اے .. ۵۴۲
- بھروسہ مسٹر مدن شرما .. ۵۵۲
- تمنا مسٹر رام سنگھ صاحب بی اے بی ٹی .. ۵۶۳
- دس عبرت مسعود جہاں شرف قرشی لکھنوی .. ۵۷۳
- سجدہ شکر شیخ محمد عالم الحق صاحب بریلیا پوری .. ۵۸۴
- مرجان خاتم محترمہ ملقبیں جلال صاحبہ بریلیوی .. ۵۹۳

تحریک

(۱)

میری کلاس میں سورج پر کاش سے زیادہ شریر لڑکا نہ تھا۔ بلکہ یوں کہو کہ اپنی ملازمت کے دس سالوں میں مجھے ایسے نامیوس طالب علم سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ فتنہ انگیزی میں اسکی جان بستی تھی۔ مدرسوں کو بنانے اور پڑھانے، سرگرم طلباء کو ذلیل کرنے اور لڑانے میں اسے مزہ آتا تھا۔ ایسی ہی سازشیں کرتا۔ ایسے ایسے پھندے ڈالتا۔ ایسی ایسی بندشیں کرتا کہ عقل دنگ ہو جاتی تھی۔ گردہ بندی میں اسے خدا داد ملکہ تھا۔ خدائی فوجداروں کی ایک فوج بنائی تھی اور اس کے زور سے سکول پر حکومت کرتا تھا۔ پرنسپل کا حکم ٹل جائے مگر کیا بچل کہ کوئی اس کے حکم سے سر مو احراف کر سکے۔ جینا محال کر دیتا تھا۔ سکول کے چٹری اور ادولی اس سے خمر خمر کا پیتے تھے۔ انسپٹر کا معائنہ ہونیوالا تھا۔ پرنسپل صاحب نے حکم دیا کہ لڑکے معین وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے آجائیں۔ منشا یہ تھا کہ لڑکوں کو معائنہ کے متعلق کچھ ضروری ہدایتیں کر دیں۔ مگر دس بج گئے۔ انسپٹر صاحب اگرچہ کچھ اور مدرسہ میں ایک لڑکا بھی نہیں! گیدہ۔ بچے خود بخود سب لڑکے اس طرح نکل پڑے۔ جیسے کوئی پتھر کھول دیا گیا ہو انسپٹر صاحب نے کیفیت میں لکھا: ”سپلن بہت خراب ہے“ پرنسپل صاحب کی کرکری ہوئی۔ مدرسہ میں بدنام ہوئے۔ ادویہ ساری شرارت سورج پر کاش کی تھی۔ مگر ہر چند تحقیقات کی گئی۔ سورج پر کاش کا کسی نے نام نہ نہ کیا۔ مجھے اپنی تنظیم پر غور تھا۔ ٹرننگ کالج میں اس صیغہ میں نے امتیاز حاصل کیا تھا۔ گریباں میری ساری تعلیمی قابلیت میں رنگ سا لگ گیا تھا۔ کچھ عقل ہی نہ کام کرتی کہ اس شیطان کو کیسے راہ راست پلاؤں۔ کئی بار مدرسوں کی میننگ ہوئی۔ پر یہ عقدہ نہ حل ہوا۔

نئے اصول تعلیم کے مطابق میں جو استاد کا قائل نہ تھا۔ پر بیاں ہم اس طرز عمل سے محض اسلئے محترز تھے کہ کہیں علاج مرض سے بدتر نہ ہو جائے۔ سورج پر کاش کو سکول سے نکال دیے کی تجویز بھی کی گئی۔ پر اسے شکست کا اعتراف سمجھ کر ہم اس پر عمل کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ میں بائیس سند یافتہ ترمودہ کار مدرس ایک بدعاش بارہ تیرہ سال کے لڑکے کی اصلاح نہ کر سکیں۔ یہ خیال حدودِ جہنم کا تھا۔ یوں تو سارا سکول اس سے بیزار تھا۔ مگر سب سے زیادہ پریشان میں تھا۔ کیونکہ وہ میرے درجہ کا طالب علم تھا۔ اور اسکی شرارتوں کا غمیانہ زیادہ تر مجھے اٹھانا پڑتا تھا۔ اسکول آتا تو یہ اندیشہ لگا رہتا کہ دیکھیں آج کیا ٹکوفہ کھتا ہے۔ ایک دن اپنی میز کی دراز کھولی۔ تو اس میں سے ایک بڑا سا میڈل نکل پڑا۔ میں چونک کر پیچھے ہٹا۔ تو گرتے گرتے بچا۔ کلاس میں ایک شہرہ پاسبو گیا۔ ”مگر قہر و دلش بر جان و دلش“ سورج پر کاش کی طرف غضبناک معذہ کی نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ سارا کھنڈہ پند و نصیحت میں گزر گیا۔ اور وہ بدعاش

سرہکاٹے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ نیچے کی جماعتوں سے پاس ہو کر کیونکر میرے درجہ تک آیا تھا اس میں ابتدائی درجوں کی یاد بھی نہ تھی۔ اسی وقت تک آپنا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر سال پاس ہوتا چلا آتا ہے پاس کیونکر ہوتا تھا۔ خدا ہی جانتے۔

ایک دن میں نے حصہ سے کہا "تم اس درجہ سے عمر بھر پاس نہیں ہو سکتے۔"

سورج پرکاش نے پراطمینان اور لا پرواہی سے کہا "آپ میرے پاس ہونے کی فکر نہ کریں۔ میں ہمیشہ پاس ہوتا رہا ہوں ادا اب کے بھی پاس ہو گا۔"

غیر ممکن!

غیر ممکن، ممکن ہو جائیگا،

میں استعجاب سے اس کا سنہ دیکھنے لگا۔ ذہن سے ذہن لڑا کبھی اپنی کامیابی کا دعویٰ اتنے استحکام کے ساتھ نہ کر سکتا تھا۔ تو خیال آیا۔ یہ استحقاق پرچے اڑا لیتا ہو گا۔ محنتوں کے ٹوکروں یا لڑکوں سے بلکہ کچھ لالچ دے کر پرچے نقل کر لیتا ہو گا۔ میں نے حمد کیا۔ اے کہیں اسکی ایک بھی جال نہ پٹنے دو گنا۔ دیکھوں کتنے دن اس درجہ میں پڑا رہتا ہو آپ گھبرا کر نکل بھاگیگا۔

سالانہ امتحان کے موقع پر میں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ مگر جب سورج پرکاش کی کاپی دیکھی۔ تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے دو پرچے تھے۔ دونوں ہی میں اس کے نمبر درجہ میں سب سے زیادہ تھے۔ اور محنتوں کے پچھے شاید اتنے اچھے نہ کئے تھے۔ مگر پاس سب پرچوں میں تھا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ میرے کسی پرچے کا کوئی سوال بھی حل نہیں کر سکتا۔ میں اسے ثابت کر سکتا تھا۔ مگر اس کے جوابی پرچوں کو کیا کرتا۔ تحریر میں اتنا فرق نہ تھا۔ جو کوئی مشبہ پیدا کر سکتا۔ امتحان میں اکثر لڑکوں کی تحریر محبت کے باعث کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی جاتی ہے۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا۔ وہ بھی پکڑا گئے۔ مگر انہیں بھی دیدہ و دانستہ کھٹی گھٹی پڑی۔ میں شاید معمول سے زیادہ مایوس طبیعت ہوں۔ اور مدرسوں کو میں سورج پرکاش کے بارے میں ذرا بھی متردد نہ پاتا تھا۔ گویا ایسے لڑکوں کا سکول میں آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر میرے لئے وہ ایک میحان انگیز ممتہ تھا۔ اگر اسکے اطوار ہی رہے تو ایک دن یا تو یہ جیل میں ہو گا۔ یا جیل کے سہیل

(۲)

اُسی سال میرا تبادلہ ہو گیا۔ حالانکہ یہاں کی آب و ہوا مجھے موافق تھی۔ پرنسپل اور دوسرے ماسٹروں سے یاراد ہو گیا تھا۔ اور ہر ایک قسم کی چیز امداد ملتی۔ مگر میں اپنے تبادلہ سے خوش ہوا۔ کیونکہ سورج پرکاش سے میری گولڈ میڈل ہو جائے گی۔ لڑکے کچھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ ان کی طرف سے مجھے رخصتی دعوت دی گئی۔ اور سب کے سب مجھے اسٹیج تک پہنچانے آئے اس وقت بھی لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں بھی اپنے آنسوؤں کو

نہ روک سکا۔ اتفاق سے اُسی وقت میری نگاہ سورج پر کاش پر پڑی۔ جو سب سے پیچھے کچھ نادوم کھڑا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کراچی انکھوں میں بھی آنسو بھرا ہوا تھا۔ میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ اس سے چلتے چلائے دو چار باتیں کر لوں۔ شاید وہ بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے پیش قدمی کی۔ اور نہ اُس نے۔ حالانکہ مجھے بہت دنوں تک اس کا افسوس رہا۔ اس کا حجاب قابلِ معافی تھا۔ اس نے مجھے ناراضگی کے بے شمار موقع دیئے تھے۔ میرا احترام ناقابلِ عفو تھا۔ ممکن تھا اس وقت اور مذمت کے عالم میں میری دو چار غلوں کی باتیں اسکے دل پر اثر کر جاتیں۔ مگر انہی کھوئے ہوئے موقعوں کا نام تو زندگی ہے۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلی۔ لڑکے کئی قدم اس کے ساتھ دوڑے۔ میں کھڑکی کے باہر سر نہکالے کھڑا تھا۔ کچھ دیر تک مجھے اُنکے ہلنے ہوئے رویاں نظر آئے۔ پھر وہ صوفیوں کی طرح مٹ گئیں۔ مگر ایک ننھی سی سورت اب بھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے قیاس کیا وہ سورج پر کاش ہے۔ اس وقت میرا دل کسی میناب قیدی کی طرح نفرت کدورت اور مغائرت کی بندشوں کو ٹوڑ توڑ کر اس سے گلے ملنے کے لئے تڑپ اُٹھا۔

نئے مقام کی نئی دلچسپیوں اور نئی مصروفیتوں نے مجھے بہت جلد اپنی جانب مائل کر لیا۔ تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا۔ پچھلے دنوں کی یاد ایک حسرت بن کر رہ گئی۔ جس میں درد اور لذت تو تھی۔ مگر تحریک عمل نہیں۔ ذکی کا کوئی خط آیا۔ میں نے کوئی خط لکھا۔ شاید دنیا کا یہی دستور ہے۔ برسات کے بعد برسات کی ہریالی کتنے دنوں قائم رہتی ہے۔ عارضی محبتوں کا یہی انجام ہے۔ خیر۔ اتفاق سے مجھے انگلینڈ میں تکمیلِ تعلیم کا ایک موقع ملا۔ آگیا۔ وٹیفلا۔ انگلینڈ پہنچا۔ وہاں تین سال لگ گئے۔ وہاں سے لوٹا تو اپنے وطن سے بہت دور ایک کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔ یہ فرسٹ میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ خواب میں بھی میرے خیال نے اتنی بلند پروازی نہ کی تھی۔ مگر حوص رفعت اب کسی بلند تر شاخ پر اپنا آشیانہ بنانا چاہتا تھا۔ وزیرِ تعلیم سے ربط ضبط پیدا کی۔ یا راز پڑھا۔ میں نے بھی ان کے بنگلہ سے متصل بنگلہ لیا۔ منسٹر صاحب میرے کمرے میں۔ ان کی شان میں کوئی بے ادبی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ وزیرِ تعلیم ہو کر تعلیم کے اصولی امور سے واقف نہ تھے۔ گھوڑے پر سوار وہ تھے پر عرفان میرے ماتھے میں تھی۔ اور یہ کھلا ہوا راز تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے سیاسی مخالفین سے میری مخالفت ہو گئی۔ مجھ پر جاوے جا ملے کئے جانے لگے۔ میں غلوں کے ساتھ صلاح و فلاح کی جو تجویز پیش کرتا۔ اسکی مخالفت کی جاتی۔ میں اصولاً جبری اصلاح کا مخالف ہوں۔ میرا خیال ہے۔ کہ ہر ایک انسان کو ان معاملات میں زیادہ و زیادہ آزادی ہونی چاہئے۔ جن کا تعلق اسکی ذات سے ہے۔ بہت ممکن ہے میں غلطیوں میں لیکن میں جبری تعلیم کا قائل نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یورپ میں اس کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں نہیں۔ مادیت مغربی تہذیب کی روح ہے۔ وہاں کسی کام کی تحریک مالی فائدہ کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ ضروریات زندگی زیادہ ہیں اسلئے کشش حیات بھی زیادہ دل کشن۔ والدین ضرورتوں کے غلام ہو کر بچوں کو جلد سے جلد سب معاش پر مجبور کرتے ہیں۔ بچے اس کے کہ وہ شراب ترک کر کے ایک ٹلنگ روز کی بچت کر لیں۔ وہ اپنے کہن بچے کو ایک ٹلنگ کی مزدوری

کرنے کے لئے مجبور کریں گے۔ ہندوستان میں زندگی غیر مساوی کی تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہم اس وقت تک اپنے بچوں پر زوری نہیں کرتے۔ جب تک کہ حالات ہمیں مجبور کر دیں۔ ہم بھوکے رہیں گے، تنگے رہیں گے۔ مگر ٹکوں سے مزدوری نہ کرائیں گے۔ تاوقتیکہ فائدہ کسی کی نوبت نہ پہنچے۔ غریب سے غریب اور پنا سے پنا ہندوستانی مزدور بھی تعلیم کی برکات کا قائل ہے اس کے دل میں یہی تنہا ہے کہ میرا بچہ چار حرف پڑھ جائے۔ اسے نہیں کہ اسے کوئی رتبہ حاصل ہوگا۔ بلکہ محض اس لئے کہ علم انسان فی خصلت کا ایک زیور ہے۔ تعلیم کے فوائد اُسے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ یہ علم ہونے پر بھی اپنے بچے کو مدد سے نہیں بھیجتا۔ تو سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی مجبوری حاصل ہے ایسی حالت میں قانوناً اُسے مجبور کرنا میری نگاہ میں قرین انصاف نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اُس کے فرائض پوری کو تشویق سے بیدار کر دیں۔ اس کے علاوہ میرے خیال میں ابھی تعلیم کے وہ عناصر ملک میں ناکافی ہیں۔ جن سے تعلیم کی فضیلت ہے۔ نیم تعلیم یافتہ فائدہ کش مددگار آپ یہ امید نہیں کر سکتے۔ کہ وہ کوئی اُنچا معیار پیش نظر رکھ سکیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا۔ کہ چار پانچ سال میں لڑکا حرف شناس ہو جائیگا۔ میں اسے کوہ گدن دکاہ برآوردن کے مصداق سمجھتا ہوں۔ سن شور میں یہ مرحلہ ایک نمینہ میں آسانی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ میں تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں ہم جتنا ایک جبینہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ اتنا چھ سات سال کی عمر میں تین سال ہی بھی نہیں پڑھ سکتے۔ پھر خواہ مخواہ بچوں کو مدد سے میں قید کرنے سے فائدہ یوں چاہے اُسے ردیاں ملتیں مگر تازہ ہوا تو ملتی۔ فطرت سے تجربات تو حاصل کرتا۔ مدد سے میں بند کرنے تو اُسے تنہا اور جسمانی دونوں ترقیوں سے ہی محروم کر دیتے ہیں۔ اس لئے جب صوبہ کی کونسل میں جبری تعلیم کی تجویز پیش ہوئی۔ تو میری تحریک سے منسٹر صاحب نے اُسکی مخالفت کی۔ گورنمنٹ تو مخالفت پر پہلے ہی سے آمادہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بل متروک ہو گیا۔ پھر کیا تھا۔ منسٹر صاحب کی ادیسری وہ دے دے شروع ہوئی کہ الامان ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ذاتیات پر حملے کئے جانے لگے۔ میں محض ضعیف تھا۔ اس لئے نہ لکھی پر گرا۔ مجھے ملک کا بدخواہ۔ ترقی کا دشمن۔ قومی غدار اور گورنمنٹ کا گداگر بنا گیا۔ کئی اخباروں میں آبروریز کارٹون بھی نکلے۔ میرے کالج میں ذرا سی بھی کوئی بات ترقی تو کونسل میں اُس پر سوالوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ میں نے ایک چپراسی کو برخواست کیا۔ ممبر اصحاب پہنچے جھاڑو میرے پیچھے پڑ گئے۔ اعتراضات کا تاقا بندھ گیا۔ یہاں تک کہ منسٹر کو مجبور ہو کر اُس چپراسی کو بحال کرنا پڑا۔ میں یہ تو بین بردار نہ کر سکا۔ شاید کوئی بھی نہ کر سکتا۔ منسٹر صاحب سے مجھے شکایت نہیں۔ وہ مجبور تھے۔ ان حالات میں کام کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ تحمل اور ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے۔ مجھے اپنے کالج کی اندرونی تنظیم کا بھی اختیار نہیں! فلاں کیوں امتحان میں نہیں بھیجا گیا؟ فلاں کے عوض فلاں کو کیوں وظیفہ نہیں دیا گیا؟ فلاں پر وفسیر کو فلاں کلاس کیوں نہیں دیا گیا؟ اس طرح کے کمپنی، مہمل اور چھرا اعتراضات نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا اس نئی چوٹ نے لسمہ بھی الگ کر دیا۔ میں نے استعفا دیدیا۔ مخالفین کو یہ صبر کہاں کہ وہ مجھے عزت کے ساتھ چلا جانے دیتے۔ میری برطرفی کا فیصلہ کیا گیا۔

مجھے منسٹر صاحب سے اتنی اسید ضرور تھی کہ وہ کم سے کم اس معاملہ میں الفاف ادا حق سے کام لیں گے۔ مگر انہوں نے حق کی بجائے مصلحت کو مقدم سمجھا اور مجھے کئی سال کی مخلصانہ رفاقت کا صلہ یہ ملا کہ میری برطرفی کا نوٹس آپہنچا! دُنیا کا ایسا تلخ تجربہ اب تک مجھے نہ ہوا تھا۔ تقدیر بھی کچھ برگشتہ تھی۔ اُسی دوران میں بیوی کا انتقال ہو گیا۔ آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ شام کو دریا کنارے سیر کرنے گیا ہوا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ سکند تھی۔ لوتا تو اُن کی لاش ملی۔ شاید قلب کی حرکت بند ہو گئی تھی۔ اس سانحہ نے مکر توڑ دی۔ ماں کے فیض اور اثر سے بڑے بڑے انسان سرفراز ہوئے ہیں۔ میں جو کچھ ہوا بیوی کے فیض اور اثر سے ہوا۔ وہ میری تقدیر کا سمار تھی۔ کتنی بند حوصلہ تھی! کتنی آہنی جہت! کتنا ملکوتی ایثار! اُس شیریں بین تلخی کا نام بھی نہ تھا۔ مجھے یاد سنیں آتا۔ کہ میں نے اُسے کبھی چین نہیں دیکھا ہو۔ ہمیشہ ہر حالت میں صابر اور خوش الحنی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ترقی کی ایک تحریک باطن اسکے ایک ایک قطرہ خون میں بھری ہوئی تھی۔ مایوس ہونا تو محتاجی ہی نہ تھی۔ میں کئی بار سخت بیمار پڑا ہوں۔ معالجوں پر بھی مایوسی کا غلبہ ہو گیا پر اس کے سکون و اطمینان میں شہرہ بھر می تزلزل نہ ہوا۔ اُسے اعتقاد تھا میں اپنے شوہر کی حیات میں مر گئی۔ اور وہی ہوا۔ میں زندگی میں اُسی کے سہارے اب تک کھڑا تھا۔ جب وہ سہارا ہی نہ رہا۔ تو زندگی کہاں رہتی۔ کھانے اور سونے کا نام زندگی نہیں ہے۔ زندگی نام ہے ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی لگن کا۔ وہ لگن غائب ہو گئی۔ میں نے دُنیا سے منہ موڑ لیا۔ اور گوشہ گنہاں میں زندگی کے دن پورے کرنے کا ارادہ کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہو گیا۔ چاروں طرف اُدبے اُدبے اُدبے ٹیلے تھے۔ ایک طرف لنگاہا تھی۔ میں نے دیا کئے کنارے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا۔ اور اس میں رہنے لگا۔

(۴)

مگر اہل دُنیا بیاں بھی مجھے حق کرنے کے لئے کبھی کبھی پہنچ جاتے تھے۔ کسی کو کوٹھی میہوریل لکھنا ہوتا۔ تو میرے پاپا کبھی کبھی اخباروں کے نامہ نگار اور پبلشروں کے بحیث بھی سر پرور ہو جاتے تھے۔ اُن کے پاس خاطر سے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑتا تھا۔ بستی کے لئے میں نے ایک چھوٹا سا مددہ کھول لیا تھا۔ ایک درخت کے نیچے گاؤں کے لڑکوں کو جمع کر کے کچھ پڑھایا کرتا تھا۔ اُس کا کیاں اتنا شرہ ہوا کہ اُس پاس کے مواضع کے نوجوان بھی آنے لگے ایک روز میں اپنی کلاس کو پڑھا رہا تھا۔ کہ موٹر آ کر رکی۔ حلقہ کا سب انسپٹر۔ تحصیلدار گھوڑوں پر سوار تھے دوڑے چلے آتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ اس ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ میں اس وقت محض ایک کمرہ دار و دعوتی پہنچے ہوئے تھا۔ اس بہتیت میں ایک حاکم سے ملتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ مگر کیڑے منگائے کا موقع نہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اپنی موٹر سے اتر پڑے۔ اور میری طرف بڑھے۔ میں نے جھپٹے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے بدلے میرے پیروں کی طرف جھکے۔ اور اُن پر سر رکھ دیا۔ میں تجھ ایسا سٹ پٹا گیا۔ کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں انگریزی اچھی لکھتا ہوں۔ ولایت ہو آیا ہوں۔ فلسفہ میں بھی اچھا دخل ہے۔ تعزیر

بھی خوب کر لیتا ہوں۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی تقدیس کے قابل نہیں۔ وہ درجہ تو عادت اور کامل کو ہی حاصل ہے اگر میں برہمن ہوتا تو بھی ایک بات سنی۔ حالانکہ ایک سویلین کا کسی برہمن کے پیروں پر سر رکھنا خیال میں بھی نہیں آتا۔ میں بھی اسی حیرت میں پڑا ہوا تھا کہ اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا "آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں؟" اب میں نے اس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ صورت مانوس معلوم ہوئی۔ اسے ضرور پہیں دیکھا ہے۔

دفتہ حافظہ کی آنکھیں مل گئیں۔ بولا "آپ کا نام سورج پرکاش تو نہیں ہے؟" جی ہاں! میں آپ کا وہی نالائق شاگرد ہوں، مگر آپ نے خوب پہچانا! مجھے امید نہ تھی۔" میں سلسلہ عین اس اسکول میں تھا۔ بارہ تیرہ سال ہو گئے!

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا "ماسٹر لڑکوں کو بھول جاتے ہیں۔ لڑکے انہیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں"

میں نے اسی مذاق کے انداز سے جواب دیا۔ تم ایسے لڑکوں کو بھولنا مشکل ہے۔" سورج پرکاش۔ انہیں غلطوں کی معافی مانگنے حاضر ہوا ہوں۔ میں ہمیشہ آپ کا سراغ لگاتا رہتا تھا۔ جب آپ انگلینڈ تباہی نے آپ کے لئے مبارکباد لکھی۔ مگر اسے بھیجنے کی بہت تاخیر تھی۔ جب آپ رنسل ہوئے۔ اُس وقت میں انگلینڈ جانے کو تیار تھا۔ ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔ وہاں میں آپ کے مصنفین اخباروں میں پڑھتا رہتا تھا۔ جب کوئی تو معلوم ہوا کہ آپ نے استعفا دیدیا اور آپ دیہات میں چلے گئے ہیں۔ اس ضلع میں آئے مجھے ایک سال سے زیادہ ہوا مگر اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ آپ اس دیہات میں پڑے ہوئے ہیں۔ آج باتوں ہی باتوں میں کئی مینڈا نے آپ کا ذکر کیا۔ آپ کا نام تو اُسے معلوم نہ تھا۔ مگر اس نے جو صلیب بیان کیا اس سے مجھے معاً آپ کا خیال آیا۔ ڈاکخانہ میں دریافت کیا تو آپ کے نام کی بھی تصدیق ہو گئی۔ دوڑا چلا آ رہا ہوں۔ آپ تو بالکل تارک الدنیا ہو گئے۔ اس کو یہ میں آپ کی طبیعت کیسے لگتی ہے۔ ابھی تو آپ کی عمر ۲۴ سال سے زیادہ نہ ہو گئی۔ بان پرست کا زمانہ تو ۶۰ کے بعد آتا ہے؟

میں نہیں کہہ سکتا کہ سورج پرکاش کا عروج دیکھ کر مجھے کتنی استعجاب میز مسرت حاصل ہوئی۔ اگر وہ میرا بیٹا ہوتا۔ تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی۔ میں اُسے اپنے جھونپڑے میں لایا۔ اور اس سے چند لفظوں میں اپنی رام کمانی کہہ سنائی۔

سورج پرکاش نے کہا "تو یہ کہئے کہ آپ اپنے ہی ایک بھائی کی بیوہ خانی کا شکار ہوئے۔ میرا بھائی تو ابھی بہت ہی مختصر ہے۔ مگر اتنے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہم لوگ ابھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور اپنے قول کو نبھانا نہیں جانتے۔ جہاں کیئے وہاں خود غرضی۔ ماسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو پوچھو مگر یہی انسانیت اور ہمدردی کا تقاضا تھا؟"

میں نے جواب دیا بھئی ان کی کوئی خطائیں ممکن ہے اس حالت میں میں بھی وہی کرتا جو انہوں نے کیا۔ مجھے اپنی ہوس پروری کی سزا ملگئی۔ اور اس کے لئے میں اُنکا مشکوہ ہوں۔ تصنع نہیں ہیں دل سے کہتا ہوں۔ کہ یہاں مجھے متناہک اور اطمینان ہے۔ اتنا بھی نہ تھا۔ اس گوشہ قناعت میں مجھے حقایق زندگی کا وہ علم ہوا۔ جو ثروت اور جاہ کی دوڑ میں کسی طرح ممکن نہ تھا۔ فلسفہ اور تاریخ کے دفتر چاٹ کر اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی خوشہ چینی کر کے بھی میں اپنی خود پروری کا ازالہ نہ کر سکا بلکہ میری مرض روز بروز زیادہ سنگین ہونا جانا تھا۔ آپ زینوں پر پاؤں رکھے بغیر سقفت کی لمبائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ ثروت کی دوڑ میں دوسرے انسانوں کی زندگیاں ہی زینوں کا کام دیتی ہیں۔ آپ انہیں کچلے بغیر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں انسانیت۔ شرافت اور ہمدردی کا ذکر ہی کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت میں دندوں کے بیچ میں تھا۔ اور میری ساری قوتیں اپنی حفاظت کرنے میں صرف ہو جاتی تھیں۔ یہاں میں اپنے چاروں طرف غلوں اور سادگی دیکھتا ہوں۔ میرے پاس جو لوگ آتے ہیں۔ کوئی کمینہ غرض لیکر نہیں آتے اور نہ میری خدمات میں صلہ یا تالاش کی متا ہے۔ میں بھی کسی کے پاس جانا ہوں۔ تو کوئی غرض لے کر نہیں جاتا۔ مجھے یہاں کے درو دیوار اور برگ و بار میں بھی خلوص کی جھلک نظر آتی ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے سورج پر کاش کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ مگر شرارت آمیز تہنم کی جگہ پیشانی کا رنگ تھا۔ مجھ سے قناعت کا سبق لینے وہ میرے پاس نہ آیا تھا۔ شاید یہ دکھانے آیا تھا کہ آپ نے جسے اتنا حقیر سمجھا تھا وہ اب اس درجہ پر ہے۔ وہ مجھ سے اپنے سخی جہل کی داد چاہتا تھا۔ مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایک صاحب ثروت کے درو ثروت و جاہ کی مذمت زبیا نہیں۔ میں نے فوراً سلسلہ تقریر بدل کر کہا۔ مگر تم اپنا حال تو کہو۔ تمہاری یہ کیا پلٹ کیوں ہوئی۔ تمہاری شرارتوں کو یاد کرتا ہوں۔ تو اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا ایک یہ انقلاب کیسے ہوا؟ کسی فقیر کی دعا کے سوا اور تو کوئی طانت یہ معجزہ نہ دکھا سکتی تھی۔“

سورج پر کاش نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کی دعا تھی“

”دعا تو نہیں، بد دعا ہو سکتی تھی“

”ابھی اس حد تک دینا سے بیزار نہیں ہوا ہوں“

آخر میرے بار بار اصرار کرنے پر سورج پر کاش نے اپنا قصہ کننا شروع کیا۔

”آپ کے چلے آنے کے کئی روز بعد میرا ماموں زاد بھائی سکول میں داخل ہوا۔ اسکی عمر آٹھ نو سال ہے۔ زائدہ تھی۔ پرنسپل صاحب اسے ہوسٹل میں نہ لیتے تھے۔ اور نہ ماموں صاحب اس کے رہنے کا کوئی دوسرا انتظام کر سکتے تھے۔ انہیں اس پریشانی میں دیکھ کر میں نے پرنسپل صاحب سے کہا۔ اسے میرے کمرے میں ٹھہرا دیجئے۔ پرنسپل اسپر راضی نہ ہوئے کہنے لگے یہ قاعدہ کے خلاف ہے۔ میں بھلا ان کی حکومت کب برداشت کر سکتا تھا

میں نے اسی دن ہوش چھوڑ دیا۔ اور اپنے ماموں زاد بھائی کو لیکر ایک دوسرے مکان میں رہنے لگا۔ زائد خراج کا بار ۔۔ ماموں صاحب نے لیا۔ لڑکے کا نام ہو بن تھا۔ اسکی ماں کئی سال پہلے ہی مر چکی تھی۔ اتنا دہلا پتلا کمزور اور غریب لڑکا تھا کہ پہلے ہی دن سے مجھے اسپر رحم آنے لگا۔ کبھی کبھی سر میں درد ہوتا کبھی بخار آتا۔ آٹے دن کوئی نہ کوئی شکایت ہوتی رہتی تھی۔ سر شام سو جاتا اور اُسے کھانا کھلانے کیلئے مجھے اسکی مفتیں کرنی پڑتیں۔ دن چڑھے تک سویا کرتا۔ اور جب تک میں گود میں اٹھا کر بٹھانہ دیتا اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ رات کو چونک پڑتا۔ اپنی چارپائی سے اٹھ کر میری چارپائی پر آ جاتا۔ اور میرے گلے سے پٹ کر سوتا۔ مجھے اُس پر کبھی غصہ نہ آتا۔ کہہ نہیں سکتا۔ کیوں مجھے اُس سے اتنا انس ہو گیا۔ میں جو نو بجے سو کر اٹھا کرتا تھا۔ تڑکے اٹھ بیٹھتا۔ اور اُسکے لئے دودھ گرم کرتا۔ پھر اُسے اٹھا کر ہاتھ منہ دھلاتا۔ اور اسکی صحت کا خیال کر کے ساتھ سیر کرانے لیجاتا۔ میں جو کبھی کتاب لیکر نہ بیٹھتا تھا اُسے گھنٹوں پڑھایا کرتا۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا اتنا احساس کیونکر ہو گیا۔ اس کا اب تک مجھے تعجب ہے۔ اُسے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی تو میری جان نافع میں سما جاتی تھی ڈاکٹر کے پاس دوڑتا۔ دوائیں لاتا۔ اور مہین کی خوشامدیں کر کے اُسے دوا پلاتا۔ ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی تھی۔ کہ کوئی بات اسکی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ اس غریب کا یہاں میرے سوا دوسرا کون ہے؟ ماموں صاحب اسے میرے جرد سے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بچا بے مال لڑکا ہے۔ میرے بد معاش دوستوں میں کوئی اُسے چڑاتا یا چھیڑتا۔ تو میری تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ کئی لڑکے تو مجھے بوٹھی دایہ لکھ کر چراتے تھے۔ پر میں ہنسنے لگتا تھا۔ میں اُسکے سامنے کوئی بیہودہ حرکت نہ کرتا۔ ایک بھنی ناشتہ لفظ منہ سے نہ نکالتا۔ یہ خیال رہتا تھا کہ میری دیکھا دیکھی یہ بھی خراب ہو جائیگا میں اُسکے سامنے اس طرح رہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنا نمونہ سمجھے۔ اور اس کے لئے لازمی تھا۔ کہ پہلی میں اپنی اصلاح کر دوں۔ وہ نو بجے سو کر اٹھا۔ وہ بارہ بجے تک مٹر گشت کرنا۔ وہ نئی نئی شراوتوں کے منصوبے باندھنا۔ وہ ماسٹرڈن کی آنکھ بچا کر کھول سے اڑ جانا۔ آپ ہی آپ جاتا رہا۔ صحت اور اخلاق کے آئین کا پینڈیشن تھا۔ پر اب مجھے بڑھکراؤ کا پابند دوسرا نہ تھا۔ میں ایشور کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مگر اب پکا خدا پرست ہو گیا تھا۔ وہ بڑی سادگی سے پوچھتا۔ ”پر مانتا سب جگہ رہتے ہیں تو میرے پاس بھی رہتے ہوں گے۔“ اس سوال کا مذاق اڑانا میرے لئے غیر ممکن تھا۔ میں کہتا۔ ”ہاں پر مانتا مہتمم رہا ہے سبکے پاس رہتے ہیں۔ اور ہماری حفاظت کرتے ہیں۔“ اس کا چہرہ نورانی سرت سے چمک اٹھتا تھا۔ شاید وہ پرمانا کے دوجو کو محسوس کرنے لگتا تھا۔ ماسٹر صاحب! یقین مانیے، سال بھر میں ہی مہین کچھ سے کچھ ہو گیا۔ وہ منجھی غریب صورت، کاہل، بیخبر لڑکا اب۔ تو نا، نشگتہ، رُو، چاقی و چیت اور لباش ہو گیا۔ ماموں صاحب دوبارہ آئے تو اسے دیکھ کر حیرت میں آ گئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر پوئے۔ ”بیٹا تم نے اسے جلا لیا۔ درنہیں تو مایوس ہو چکا تھا۔ اس کا صلہ تمہیں ایشور دیں گے۔ اسکی ماں جنت میں میٹھی ہوئی مہین دعائیں دے رہی ہے۔“

سورج پر کاش کی آنکھیں اس وقت بھی ابگوں ہو گئی تھیں۔

میں نے پوچھا 'مومن بھی تمہیں بہت پیاد کرتا ہو گا؟'

صبح پر کاش کی ابگوں آنکھوں میں ایک حسرتناک سترت جلوہ افروز ہوئی۔ بولا "جناب وہ مجھے ایک منٹ کے لئے بھی نہ چھوڑتا تھا۔ میرے ساتھ کھانا، میرے ساتھ بیٹھتا، میرے ساتھ سوتا، میں ہی اُس کا سب کچھ تھا۔ فہمکن! آج وہ اس دُنیا میں نہیں ہے۔ مگر میں اسے ہمیشہ زندہ محسوس کرتا ہوں۔ میں جو کچھ ہوں اسی کا بنایا ہوا ہوں۔

اگر وہ فرشتہ غیب کی طرح میرا رہنما نہ ہو جاتا تو شاید آج میں کسی جیل میں پڑا ہوتا۔ ایک دن میں نے کہو یا تھا۔ اگر تم روزِ نہانہ لیا کرو گے تو میں تم سے نہ بولوں گا۔" نہانے سے وہ نہ جانے کیوں جی چراتا تھا۔ میری اس دھمکی کا یہ اثر ہوا کہ وہ روزانہ علی الصبح نہانے لگا کھیتی ہی سردی کیوں نہ ہو۔ کتنی ہی ٹھنڈی ہو اچلے۔ لیکن وہ نہانے میں غفلت نہ کرتا۔ دیکھتا رہتا تھا۔ کہ میں کس بات سے خوش ہوتا ہوں۔ ایک روز میں چند اجاب کے ساتھ تھیر دیکھنے چلا گیا۔ تاکہ لکڑیاں تھکے کہ تم کھانا کھا کر سو رہنا۔ تین بجے رات کو لوٹا تو دیکھا وہ بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا "تم سوئے نہیں؟" بولا "نہیں آئی۔" اُسن سے میں نے تھیر جانے کا نام نہ لیا۔ بچوں میں سدکی

جو ایک بھوک ہوتی ہے، دودھ اور مٹھائی اور کھلونوں سے بھی زیادہ مرغوب۔ جو اُن کی گود کے سامنے دنیا کی کسی چیز کی ہستی کو خیال میں نہیں لاتی۔ مومن میں اس بھوک نے کبھی سیری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ ہارڈل سے ٹکرانے والی سارس کی صلیک طرح وہ ہمیشہ اسکی ایک ایک رگ میں گونجا کرتی تھی۔ جیسے زمین پر پھیلی ہوئی تار کوئی سہارا پاتے ہی۔۔۔۔۔ اس سے چمٹ جاتی ہے۔ وہی حال مومن کا۔۔۔۔۔ تھا۔ وہ مجھ سے ایسا چمٹ گیا تھا۔ کہ اُس کی

نازک پیلوں نے مجھ پر بندشوں کا کام کیا۔ اور مجھے استوار کر دیا۔ اُسکی وفات کا قصہ نہایت دردناک ہے۔ میرے دل پر اُس کا غم اسوقت بھی تازہ ہے۔ اور مجھ میں اتنا مضبوط نہیں کہ میں اس کا ذکر کروں۔ وہ میرے ساتھ تین سال رہا۔ شاید غیب سے میری ہدایت کے لئے جو مشعل عطا ہوا تھا۔ وہ مقصد پورا ہو جانے کے بعد مجھ سے چھین لیا گیا۔ اُس ننھے سے دل میں کیا کیا اسان بھرے ہوئے تھے۔ بی اے پاس کرنا، ایم اے پاس کرنا۔ وظیفہ پانا، ولایت جانا۔ دہاں سے سول سروس کا امتحان پاس کر کے لوٹنا۔ یہی اُسکی زندگی کے خواب تھے۔ جو مرگئے بے گناہ نے پریشان کر دیئے۔

گریوں کی تحلیل تھی۔ دو تعطیلوں میں مومن میرے ساتھ رہا تھا۔ ماموں صاحب کے اصرار کرنے پر بھی مگر نہ گیا۔ تیسری تعطیل میں میری کلچر پڑی نے کشمیر کی سیاحت کا فیصلہ کیا۔ اور مجھے اس کا کپتان بنایا۔ کشمیر کی سیر کی تائنات سے تھی۔ اس موقع کو ضمیمہ سمجھا۔ مومن کو ماموں صاحب کے پاس بھیج کر میں کشمیر چلا گیا۔ دو مہینہ کے بعد لوٹا تو معلوم ہوا مومن بیمار ہے۔ کشمیر میں مجھے بار بار مومن کی یاد آتی تھی۔ اور جی چاہتا تھا لوٹ

جاؤں۔ مجھے اس سے اتنی محبت ہے۔ اس کا اندازہ مجھے کشمیر جا کر ہوا۔ مگر احباب سے بچھا پھڑانا مشکل تھا اس بیماری کی خبر پاتے ہی میں اس کے پاس گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے زرد اور چمرے پر مسرت کی تانگی کی جھلک پڑی۔ میں دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ وہ دور نظری اور چمرے پر وہ دھماکتی تھی۔ جو مثلاً قاتی ہوئی موت کی خبر دیتی تھی۔ میں نے لڑکھرائی ہوئی آواز سے پوچھا، یہ تمہاری کیا حالت ہے مومن! دوہی مہینہ میں یہ نوبت پہنچ گئی!

مومن نے معصوم متہم کے ساتھ کہا، آپ کشمیر کی سیر کرنے گئے تھے، میں آسمان کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔ مگر اس قصہ غم کو بیان کر کے میں رونے اور رونا نالائقیں چاہتا۔ میرے چلے جانے کے بعد مومن اس طرح پڑھنے لگا جیسے تپا کر رہا ہو۔ اسے یہ ضبط پیدا ہو گیا کہ سال بھر کا کورس دو مہینہ میں ختم کر دے۔ اور جب مجھ سے ملاقات ہو۔ تو اپنی کارگزاری کی داد وصول کرے۔ اس اشتیاق نے محبت کی صورت اختیار کر لی۔ میں کس طرح اس کی پیٹھ ٹھونکوں تھا۔ شاباشی دوں تھا۔ اپنے دوستوں سے اس کی تعریف کروں گا۔ یہ خیالات اپنی ساری طفلانہ سرگرمی اور انہماک کے ساتھ اس پر غالب آ گئے۔ مومن صاحب کو دفتر کے کام سے اتنی فرصت کہاں کہ اس کی تفریح کی فکر کریں۔ شاید اُسے ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے دیکھ کر دل میں وہ خوش ہوتے تھے۔ ایسا کون باپ ہے جو لڑکے کے شوقِ طلب میں مغل ہو؟ مومن کو کھینچنے دیکھ کر وہ ضرور ڈانٹتے، کتاب لیکر کیوں نہیں بیٹھتے، پڑھتے دیکھ کر بھلا کیا کہتے کسی باپ نے کبھی لڑکے کو پڑھنے کیلئے نہیں ڈانٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مومن کی نازک صحت یہ ریا منتِ شادہ برداشت نہ کر سکی۔ اُسے ہلکا بخار آنے لگا۔ مگر اس حالت میں بھی اس نے پڑھنا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ اُدھ کی پیمپ لگیاں بری ہو گئیں۔ مگر اس وقت بھی جب بخار کچھ ہلکا ہو جاتا۔ تو وہ کتابیں دیکھنے لگتا تھا۔ اکثر بخار کے عالم میں بھی نوکر دوں سے پوچھتا، ”بھیا کا خط آیا؟“ وہ کب آئیں گے؟“ اس وقت اس کے سوا اُسے کوئی اور دوسری تہا نہ تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری سیر کشمیر اتنی فتنگی پڑے گی۔ تو اس کا نام بھی نہ لیتا۔ میں نے اسے سنبھالنے کی حتی الامکان بڑی کوشش کی۔ مگر بخار ٹائیفاؤڈ تھا۔ اس کی جان لیکر ہی اُترا۔ پہلی بار میں نے موت کی صورت دیکھی اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کی زندگی کے خواب ایک جان سے پیارے عزیز کی وصیت بن کر مجھے تحریکِ عمل کرنے لگے۔ اور یہ اُسی کا اثر ہے۔ کہ آج آپ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ مومن نے زندگی کا جو خیالی معیار قائم کیا تھا۔ انہیں لڑکے کے مجھے یہ مسرت ہوتی ہے کہ شاید اسکی معصوم مجھ دیکھ کر خوش ہوتی ہو یہی تحریک تھی جسے ایم اے اور مول سروس کی آغوش میں مجھ کا بیٹا بنایا۔ صد میں آج بھی وہی نالائقی گنگا ادھی سوج پر کاش ہوں جسکی موت سے بھی آپ میزار تھے۔“

اسد کی میر کی بار سوج پر کاش سے لپکا ہوں۔ وہ جیس گھٹلوں میں جاتا ہے تو مجھے بے بغیر نہیں جاتا۔ مومن اب بھی سکے دل و دماغ میں سا بڑا ہو۔ انسانی فطرت کا یہ ایک یا سہ ہے۔ جسے میں جب تک نہیں سمجھ سکا۔

(پریم چند)

بھروسہ

جناب مدن شرمہ صاحب

شام کا وقت تھا۔ پتھو لوہار کھانا پکانے میں مصروف تھا۔ چولھے میں آگ جل رہی تھی۔ اور وہ سر نیچا کٹے چادلوں کو دھو رہا تھا۔ بیٹا درو سے کراہ رہا تھا۔ بخارا در کھانسی کے پیہم حملوں نے چہرے کی رنگت آنکھوں کی چمک اور اس کی روح پرور اداؤں کو نکل لیا تھا۔ ناتوان کل جو صرف ہڈیوں کا مجموعہ تھی۔ وہاں اس کا ننھا دل تڑپ رہا تھا۔ مگر پتھو کو اس کا کوئی خیال کوئی خوف نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے کام میں ہمہ تن محو تھا۔ کہ یکا یک ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ پتھو کی آنکھیں فرط مسرت سے چمکنے لگیں۔ جیسے کوئی گم شدہ چیز مل گئی ہو۔ مسکرا کر بولا۔ ”ایسے مسٹر حیدر! کلکتہ سے کب آئے؟“

گوئی ایک گھنٹہ ہوا ہو گا۔“

”وہاں دن کیسے گزرتے تھے؟“

کچھ نہ پوچھو۔ مسٹر حیدر نے ایک آہ کھینچ کر کہا۔ ”آپ کی محبت کے آگے وہاں کی سب لچپیاں اندھیں۔ جب بچپن کے وہ نشاط انگیز دن مجھے اپنی پُر زور کشش سے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ تو میں دنیائے تصور میں تمہارے گلے میں بائیں ڈال کر رہ جاتا تھا۔“

کیسا پاکیزہ خیال ہے۔ محبت کے رس میں شرابور۔ پتھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو یہاں بھی حالت دگرگوں تھی۔ تمہاری مفارقت میں راتوں کی بیند حرام ہو گئی۔ اگر عالم رویا میں تمہارا خوبصورت بسم اور عالم بیداری میں تمہارا فوٹو مجھے نہ ملتا۔ تو یقیناً تمہیں یہاں اُٹو بولتے سنائی دیتے۔ میرے اس خیال میں تصنع نہیں۔ بناوٹ نہیں۔ بلکہ اس میں حقیقت ہے۔ عقیدت ہے اور اس کے لوازمات ہیں۔

مسٹر حیدر کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ دل میں آگ تھی۔ اور بھر دل سے پریم جھلکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آہستہ سے کہا۔ ”یہ سچ ہے۔ مگر وہ چار پائی پر کون ہے؟“

پتھو نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا لڑکا۔“

”اسے کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں صرف بخار ہے۔“

”اور اس کی والدہ؟“

”وہ مر چکی ہے۔“

بیٹا بیمار ہے۔ اور تمہیں لذیذ کھانوں کی پڑی ہوئی ہے۔ جیسے وہ تمہارا کچھ بھی نہیں۔ پٹھو! اس نعمت کے مقابلہ میں تو ہم دنیا کی تمام دولت بیچ سمجھتے ہیں۔ مگر میں حیران ہوں۔ کہ تمہارے دل و دماغ میں یہ تبدیلی جس میں مہر و الفت کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ آکھال سے گئی؟ پٹھو نے آٹے میں گھی ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم اس خیال کو جانے ہی دو۔“ مسٹر حیدر نے اپنے چہرے پر اس طرح دیکھا۔ جیسے کسی نے پریم کی چوٹی سے گرا دینے کی کوشش کی ہو تاہم دزدیدہ نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولے کیوں؟

”اس لئے کہ تم اسے سن نہ سکو گے۔“

”میں اس کی شنوائی کے لئے روح کی تمام قوتیں صرف کر دوں گا۔“

مسٹر حیدر! میں پھر کہتا ہوں کہ یہ کہانی بڑی پُر درد۔ الم ناک اور ڈراؤنی ہے۔ دنیا اسے سن کر اس کی حقیقت سے مخوف ہو سکتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ تم بھی اسے غلط قرار دیدو۔ مگر میں دثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ جو واقعات مجھے پیش آئے۔ وہ سرتاپا درست ہیں۔ ان میں لافانی اور دروغ کو دخل نہیں۔

یہ ٹھیک ہے۔ مگر آپ کو اسے بہت جلد شروع کر دینا چاہئے۔ حیدر نے اس انداز سے کہا جیسے معمولی سی تاخیر سے اس کی آرزوؤں کا خون ہو جائے گا۔“

تو سنو پٹھو نے کہنا شروع کیا۔

(۲)

تم کلکتہ پہنچے۔ تو میری نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ جیسے کوئی عزیز مر گیا ہو۔ میں چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ دل میں امید تھی۔ باہر ماس اور مایوسی۔ اس وقت میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر رہا تھا۔ بے بسی اور حسرت کی زندہ تصویر بن کر۔ جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہ ملتا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ کہ اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ مگر اپنے جھونپڑے اور تمہارے والدین کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرے حوصلے پست ہو جاتے تھے۔ وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اور سمجھتے تھے۔

یہ ہمارے نخل آرزو کا پھل ہے۔ اس پر اپنی جان تک قربان کر دینے والا۔ یہ سن کر میری عقیدت اور بھی گہری ہو جاتی تھی۔ یکایک میرے دل میں ایک خیال نے چٹکی لی۔ اپنا کام شروع کر دو۔ ”غم غلط کرنے کا یہ ایک واحد ذریعہ تھا۔ مگر اس کی ابتدا میں روپے کی ضرورت تھی۔ اور میرے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی۔ میں سرینچا کٹے اپنے تاریک مستقبل اور افلاس کی بھیا تک تصاویر کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا۔ کہ اب کیا ہوگا؟ کہ سرزمین یاس میں امید نے یکایک سہرا اٹھایا۔ تمہارے والد ردپوں کی ایک تھیلی لٹے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر میرا چہرہ تشگفتہ ہو گیا۔ جس طرح دشمن کے دام فریب میں پھنسے ہوئے انسان کا دل اپنے معاون کو دیکھ کر مسرت سے کاٹنے لگتا ہے۔ اور اس کی گئی ہوئی طاقت واپس آ جاتی ہے۔ اسی طرح میں بھی خوشی سے اچھل پڑا۔ انہوں نے تھیلی میرے ہاتھوں میں دے کر کہا۔ بیٹا گھبراؤ نہیں۔ خدا کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دو۔ اس فقرہ میں کتنا اخلاص۔ کتنا پریم اور کتنی عقیدت تھی۔ آج اس کے خیال سے ہی دل و دماغ پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ آخر میں نے ان ردپوں سے اپنا کام شروع کر دیا۔ سوچتا تھا کہ کامیابی کس طرح نصیب ہوگی۔ مگر تمہارے والدین کی انتہائی کوششوں نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ کام چل نکلا۔ اور وسیع پیمانے پر۔ اب میں ردپوں میں کھلتا تھا۔ اس طرح دامن حرص و راز ہو گیا ہر یہ بات نہ تھی۔ خیرات اور دان سے مجھے ادنیٰ مناسبت ہے۔ جس دقت اکرم میری ان حرکتوں کو دیکھتے۔ تو خوش ہو کر کہتے۔ بیٹا انسان کا یہی فرض مقدم ہے۔ جس میں یہ جذبہ موجود نہیں۔ وہ حیوان سے بھی بدتر ہے۔ اسی جذبہ کو دیکھ کر خدا کا ابرکرم جوش میں آتا ہے۔ بیٹا! عنقریب تم اس کے فیض سے مالا مال ہو جاؤ گے۔ اور تمہارا شمار رنیا کی برگزیدہ ہستیوں میں ہونے لگیگا۔ تو میرے دل کی لگی ہوئی آگ اور بھی مشتعل ہو جاتی تھی جس طرح جلتی آگ میں ایندھن ڈالا جائے۔ تو وہ اور بھی تیز ہو جاتی ہے +

(۳۷)

چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ کہ ایک اجنبی میرے کمرہ میں داخل ہوا۔ میں اچھل پڑا۔ اس کی تجسس نگاہیں بڑی بے صبری سے چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ یہ خیال کتنا پاکیزہ اور پُر مسرت تھا۔ اور کس قدر جلد بھر دل میں تلاطم برپا کر دینے والا۔ مسٹر حیدر! اسے میں ہی جانتا ہوں۔ ”خیر میں نے جلدی سے سوپے کا ایک گرم اور لال ٹکڑا اٹھایا۔ اور آہرن پر رکھ کر ہتھوڑے کی ایک ضرب اپنی پوری قوت سے اس پر لگائی۔ لوہا لوہے کی خبر لے

رہا تھا کہ اتنے میں اجنبی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”السلام علیکم“
میں نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب میں کہا۔ ”علیکم السلام“
”کئے خیریت تو ہے۔“

میں نے استقلال آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ ”خدا کا شکر ہے۔“
کام تو اچھا رہا ہے نہ؟ اس نے پھر سوال کیا۔

جی ہاں۔ یہ اس کی مہربانی ہے۔
خوب جی لگا کر کام کر دو۔ یہ کہتے کہتے اس نے ایک کانغذ میں لپٹی ہوئی چیز میرے ہاتھ
پر رکھ دی۔

میں نے حیران ہو کر کہا۔ یہ کیا ہے؟
”کچھ نہیں صرف اپنی فرزندگی میں لینے کا سرٹیفکیٹ۔“
مسٹر حیدر میں اس وقت اس قدر خوش تھا۔ جیسے کسی کو دولت کو نین مل گئی ہو۔ اور اس
کے ایک ماہ بعد میرے گوشہ تنہائی میں میرا رفیق زندگی داخل ہوا۔ اور ہم دو نو شباب
کی ہولی کھیلنے لگے +

(۴)

ہاں شباب کی ہولی۔ لوگ مرکز بہشت دیکھتے ہیں۔ میں وہاں زندہ پہنچ چکا تھا۔ گر بہشت
بہشت سے کم نہیں۔ اگر بیوی کو خاوند اور خاوند کو بیوی مل جائے۔ میرا دامن اس نعمت
سے معمور تھا۔ وہ حسین تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں چشم آہو کو شرماتی تھیں۔ اور یہاں تک
ہی نہیں۔ اس کے چہرے پر چاند کی چاندنی پھولوں کی رنگت اور صبح کی تازگی تھی مسٹر حیدر
اگر آج وہ زندہ ہوتی۔ تو تم دیکھتے کہ وہ کیسی حسین اور کس قدر باحیا تھی۔ آہ..... اب وہ
شمع حسن گل ہو چکی ہے۔ اور پروانہ اس کی مفارقت پر بے طرح تڑپ رہا ہے۔

مفضل شباب میں رقص کرتے ہوئے سچے ماہ گذر گئے۔ اور ہمیں معلوم تک نہ ہوا۔ خوشی کی
گھڑیاں آتی ہیں۔ اور فی الفور گذر جاتی ہیں۔ کہ یکا یک عائشہ نے منہ بنا کر کہا۔ ”مجھے میکے مسجد“
الفاظ معمولی تھے۔ میں انہیں سن کر تڑپنے لگا۔ جیسے کسی نے بلندی سے گرا دیا ہو۔ اس کی
مفارقت پر میری دنیا ٹھٹھکی ہو جائیگی۔ اس خیال سے میں اور بھی تڑپنے لگا۔ حیدر
میں نے آج تک اس کے کسی ایما کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ مگر آج اسے ٹالنے کی تدابیر

سوچ رہا تھا۔ سرزمین یاس میں کامیابی کی جھلک دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ جیسے شجر امید یاس کی گرجتی ہوئی لہروں میں سما گیا ہو۔ تاہم میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کب؟ ابھی۔“
ابھی تو بارہ بجے ہیں۔ زمین آگ بن رہی ہے۔ ہوا کے تیز اور تباہی آور جھونکے اپنے پورے جوہن پر۔ لوگ خوف سے گھروں میں بیٹھے ہوئے تڑپ رہے ہیں۔ گرمی خون کو پسینہ کی شکل میں تبدیل کر رہی ہے۔ اور تم اسی وقت باہر جانا چاہتی ہو۔ فاصلہ دور نہیں۔ شام تک تمہیں وہاں پہنچا دیا جائیگا۔
میرا منتر چل گیا۔ وہ اب رضا مند تھی۔ اور میں..... مسکراتے ہوئے کسی دوسری دنیا کی طرف بھاگ رہا تھا +

(۵)

ظلمت شب آفاق پر چھا گئی۔ اور شام کے خوبصورت ستارے ملکہ شب کے تاج پر ایک برے ہیرے کی طرح چمکنے لگے۔ مٹا چاند نے افق سے سر نکال کر دنیا کی طرف دیکھا رات کی اتھاہ تاریکی اپنے لشکر جہاد کو لئے ہوئے بڑی تیزی سے بھاگنے لگی۔ پتہ نہیں کس دیس کو کس مقام کو ہم دونوں چل رہے تھے۔ اوپر آسمان تھا۔ نیچے زمین۔ مسٹر حیدر! وہ سماں بڑا دلکش اور بڑا خوبصورت تھا۔ میں قدرت کے روح پرور اور انبساط انگیز مناظر کو دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ ادورہ میرے پیچھے آرہی تھی۔ یکایک میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عائشہ غائب تھی۔ میری روح فنا ہو گئی۔ اور پیشانی پر پسینے کے قطرے آگئے۔ طائر دل اس طرح تڑپنے لگا۔ جیسے کسی نے سینے میں نشتر چھو دیا ہو۔ میں نے اپنے روح کی پوری قوت سے گھبراہٹ اور خوف سے لرزتی ہوئی زبان سے گرج کر کہا۔ عائشہ!

آواز فضا میں گھرا میں گونجنے لگی۔ اور ایک لمحہ بعد اپنے ساتھ جواب لائی۔ ”آرہی ہوں پریم۔“ میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ جیسے سر سے بوجھ اتر گیا ہو۔ اب وہ میرے پاس تھی۔ اور میں اس کے منہ کی طرف جھکے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ اگر کوئی تکلیف ہے تو تمہیں اٹھا لوں۔

اس نے انتہائے درد سے پیشانی پر ہل ڈال کر جواب دیا۔ تکلیف تو کوئی نہیں۔ ذرا بیٹھ میں دروہے۔ یہ کتے کتے وہ پھر چلنے لگی۔ اور میں..... دل میں ایک اٹختے ہوئے خیال کو دیکھتے دیکھتے رہ گیا۔ ہم پھر چلنے لگے۔ حیدر! دو مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ میں کوشش کرتا تھا۔ کہ

آہستہ چلوں۔ مگر رفتا رہر لمحہ بڑھتی ہی گئی۔ لوگ کاہلی سے بھاگتے ہیں۔ میں اسے تلاش کر رہا تھا۔ ناچار میں ریت کے بلند تو دھبوں کے درمیان بیٹھ کر عائشہ کا انتظار کرنے لگا۔

(۶)

وہ آرہی تھی۔ کس قدر آہستہ۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ تبدیلی میرے لئے سوہان روح تھی۔ ببل کی طرح چمکنے والی اور اپنے قہقروں سے سارا مکان سر پر اٹھالینے والی عائشہ کی حالت اس قدر تبدیلی ہو جائیگی۔ اس کا مجھے خیال نہ تھا۔ خدا خدا کر کے وہ میرے پاس پہنچی۔ اور دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ مسٹر حیدر! میں تڑپنے لگا۔ میرے پُر بہار چمن پر خزاں نے دھاوا بول دیا۔ وہ چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ اور میں اسے ہوش میں لانے کے لئے اپنی انتہائی کوششیں صرف کر رہا تھا۔ مگر بے سود۔ طاثر روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو چکا تھا۔ میں نے یابوس ہو کر ایک چیخ ماری۔ اور رونے لگا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ میں اپنے چاروں طرف شب تار کی اتھاہ تاریکی اور اس کی خوفناک اور ڈراؤنی آوازیں سن کر ادبھی رونے لگا۔ کدھر جاؤں۔ کوئی ٹہنی کوئی مہربان نظر نہیں آتا۔ مسٹر حیدر! میں نے پاگلوں کی مانند دنیا سے تصور میں تمہیں آواز دی۔ مگر تم وہاں نہیں تھے۔ جسم تھا۔ مگر ولنے والی اور میری خاطر اپنی ایک ایک قربان کر دینے والی چیز عنقا تھی۔ پھر کتنا۔ جس کے ساتھ میں نے شباب کی بہاریں لوٹیں۔ جس نے میرے لئے اپنے عزیز ترین وقت کا ایک ایک لمحہ قربان کر دیا۔ اسے تنہا چھوڑ کر گاؤں چلا جاؤں۔ یہ ہو نہیں سکتا۔“

ایک ایک یاس اور خوف کی سرزمین میں امید کا ایک منور خیال دکھائی دیا۔ خدا کا نام ہو۔ اور اسے حفیضِ مرتد کی نذر کر دو۔ تمہیں تکلیف نہ ہوگی۔ اور نہ ہی کسی سامان کی ضرورت۔ بادامی رنگ کی ریت کے ذرات خود ہی جگہ جھوڑ دیں گے۔

میں نے خدا کا نام لیکر اپنا کام شروع کر دیا۔ اور اپنے محبوب..... رقت کے جوش نے پٹھو کی قوت گویائی کو سلب کر دیا۔ اور مسٹر حیدر نے روتے ہوئے اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈالیں!

(۷)

ہاں مسٹر حیدر! پٹھو نے اپنی اشک آلود آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے کہا۔ میں عائشہ کے گھر پہنچا۔ تو وہ مجھے تنہا دیکھ کر دمگ رہ گئے۔ چہرہ انسان کے دل کا آئینہ ہے۔ اس وسیع سمندر میں جس قدر لہریں اٹھتی ہیں۔ ان کی عکسی تصویر وہاں فی الفور دکھائی دے جاتی ہے۔ انہوں نے

میرے مرجھائے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ”تم تو اوداس معلوم ہوتے ہو۔“
 مصیبت کے وقت ہمدردی کا ایک لفظ سن کر انسان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔
 میں بھی رونے لگا۔ یہ مصیبت تو دنیا کی جملہ مصائب کا سر تلج تھی۔ وہ بھی رونے لگے۔ انہیں
 مجھ سے بڑھ کر کون عزت تھا۔ تاہم انہوں نے مستقل مزاجی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ تم تو رونے
 لگے۔ بات کیا ہے؟ کھول کر بیان کہوں نہیں کر دیتے۔ میں نے انتہائے اضطراب سے رک
 رک کر کہا۔ عانتہ..... مر..... گئی..... ہے۔

کہاں؟

”راستے میں۔“

کیا کوئی بیمار تھی۔ اصغر نے متحیرانہ انداز سے کہا۔

میں نے جواب دیا۔ نہیں۔ دوران سفر میں اس نے مجھ سے کہا۔ کہہ پر تیم! میرے پیٹ میں
 درد ہو رہا ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ تو آؤ تمہیں اٹھاؤں۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ گویا اس
 طرح اس کی عقیدت کو ایک زبردست ٹھیس لگ جائیگی۔ پھر میں نے یہ سمجھ کر کہ آنے والے وقت میں
 تو ابھی دو ماہ اور درکار ہیں۔ اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ آخر وہ میرے پاس پہنچتے ہی.....
 گر گئی۔

مسٹر حیدر! یہ سن کر وہ مسکرانے لگے۔ اور میں ان کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔ یہ تبدیلی
 خلاف توقع تھی۔ پیارا بچہ مرجھائے۔ اور انہیں احساس تک نہ ہو۔ اس وقت مجھے ان کے سنگدل
 ہونے کا شبہ ہوا۔ کہ اتنے میں بوڑھے اصغر آنکھوں سے چشمہ اتار کر بولے۔ بیٹا قدرت کو یہی منظور
 تھا۔ فکر کرنا لا حاصل ہے۔ اب ہم ایک ماہ کے بعد اس کی ہمشیرہ کے ساتھ تمہاری شادی کریں گے۔
 میں ان کے اس حوصلہ۔ ایثار اور آہنی استقلال کو دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگا۔ جیسے
 بچے کو کوئی خوش رنگ چیز ملے آجائے۔ ان کے توکل نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور
 میرا دل فرط مسرت سے کانپ رہا تھا۔ جیسے کیلے کا خوش رنگ پٹا ہوا کی لہروں میں تھر تھرنے
 لگتا ہے +

(۸)

شادی ہو گئی۔ اور میری آمد و رفت پھر اسی راستہ سے ہونے لگی۔ مگر جب میں اسی مقام پر
 پہنچتا تھا۔ تو میرا دل حیرت اور خوف سے کانپنے لگتا تھا۔ اور میرے حوصلے پست ہو جاتے

تھے۔ جیسے سامنے فرشتہ اجل نظر آ رہا ہو۔ رات کا وقت تھا۔ اور میں عائشہ کی قبر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ کہ دفعۃً مجھے اس کے گرد کوئی چیز اپنی پوری قوت سے گھومتی ہوئی نظر آئی۔ انتہائے خوف سے مجھے زمین اور آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور گھبرا کر اُلٹے پاؤں چلنے لگا۔ جیسے آدمی کسی خطرناک جانور کو سامنے دیکھ کر آگے نہیں جاسکتا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ کسی جانور کا بچہ ہے۔ اور اس کا جسم چھوٹے ٹھچوٹے سیاہ بالوں سے محفوظ۔ میں واپس گھر چلا آیا۔ اور دوسرے دن آفتاب کی پہلی شعاع کیساتھ میں وہاں پہنچا۔ اور قبر کے نزدیک اپنے لئے ایک محفوظ جگہ بنانے لگا۔ یہاں بیٹھ کر میں بڑے اطمینان سے اُسے گرفتار کر سکوں گا۔ اس خیال سے میں دیوانہ وار جھوم رہا تھا۔ وہی وقت تھا۔ وہی چاندنی رات تھی۔ جو ایک نغمہ خاموش کی طرح کل کائنات پر چھائی ہوئی تھی۔ اور میں اس جانور کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کہ دفعۃً وہ جانور قبر سے باہر نکل کر بڑی سرعت سے اس کے گرد گھومنے لگا۔ گویا طواف کر رہا ہے۔ مجھے اس وقت اس کی آواز اس قدر خوفناک اور ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ کہ میں اپنے تئیں محفوظ سمجھتا ہوا بھی خوف سے کانپ رہا تھا۔ یکایک میں نے اچھل کر اسے پکڑ لیا۔ پتہ نہیں اس وقت میرے دل و دماغ میں حوصلہ اور توانائی کے جذبات کہاں سے آ گئے۔

مسٹر حیدر! سچ جانتا اس چھوٹے سے جانور نے مجھ جیسے توانا اور قوی سیکل انسان کو اپنی پوری قوت سے کھینچنا شروع کیا۔ اور جلدی جلدی قبر کے منہ کی طرف لے جانے لگا۔ اگر میں اپنی گردنت کو ڈھیل کر تا ہوں۔ تو اسے حملہ کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اور برعکس صورت میں مجھے ہر پ کر جائیگا۔ میں گھبرا گیا۔ اور میرے استقلال کی مضبوط دیواریں کا پینے لگیں۔ کہ معاف نہ ہو ہوا میں کسی چیز کے گوجھنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس آواز کی طرف منہ کر کے گرج کر کہا۔ اگر کوئی ہے تو مجھے آکر بچائے۔ ایک خوفناک اور خطرناک جانور مجھے قبر میں کشاں کشاں۔۔۔ لے جا رہا ہے۔ مسٹر حیدر! غالباً یہ آواز سیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں سے نکل رہی تھی۔ اور اس وقت چند قدم کے فاصلے پر سنائی دے رہی تھی۔ میری اس فریاد کو سن کر دہقان نے اپنی بھٹی اور مکروہ آواز سے گرج کر کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں آ رہا ہوں۔

چند ہی لمحوں کے بعد اس نے میرے نزدیک پہنچ کر ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ ”کیا ہے؟“
”بعد میں معلوم ہو جائیگا۔ پہلے اسے باہر کھینچ لو۔ ہم دو نو اپنی پوری قوت سے کھینچنے لگے۔“

(۹)

صبح صادق کا وقت تھا۔ اور ہم دونوں قبر سے مٹی نکال رہے تھے۔ کریکا یکا یک مجھے عائشہ کے پاؤں دکھائی دیئے۔ نوجوان نے تحیر سے کہا۔

اوہ..... یہ تو قبر ہے۔ جس کا کھودنا آئینِ شرع کے خلاف ہے۔

”ہوگا۔ مگر میں اپنے بچہ کو پھر موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتا۔“
”کس طرح؟ اس نے حیران ہو کر کہا۔“

”میں نے ساری کہانی بیان کر دی۔“ مسٹر حیدر! جسے دیکھ کر میں غوف سے کانپ رہا تھا۔ اور جس کے زبردست حملے کے خیال نے مجھے دوسروں کی مدد کا محتاج کر دیا تھا۔ وہ میرا تخت جگر نور چشم تھا۔ معاً عائشہ میرے سامنے کھڑی ہو کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے مضبوط رسی سے بندھے ہوئے عزیز کو فوراً آزاد کر دیا۔ یہ میرے گناہ کا کفارہ تھا۔ اور میں نے نوجوان سے التجا آمیز انداز سے کہا۔ نوجوان! ”ابھی ایک کام باقی ہے۔“ کیا؟ ”قبر کو پھر کھودنا شروع کرو۔“

مسٹر حیدر! یقین جاننا۔ ہم نے وہ دیکھا۔ جس کا خیال دنیا والوں کو خواب میں بھی نہیں آ سکتا عائشہ کی دائیں طرف بالکل مُردہ تھی اور بائیں طرف بالکل تندرست۔ اس نے اپنی بائیں آنکھ سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت انتہائے پریم سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میں نے ضبط کر کے کہا۔ عائشہ! اس نے جواب میں اپنی آنکھ بند کر لی۔ اور میں نے جلدی سے اس کے سینہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گرم تھا۔ چند لمحوں کے بعد میری محبوبہ..... میری آرزوں کا مرکز عائشہ بچے کو سپرد کرتے ہوئے پھر بڑے اطمینان سے سو گئی۔ میں بچے کو لٹے ہوئے گھر پہنچا۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بھلا مسٹر حیدر!

جس نے اس کی قبر میں رکھشاکی۔ دودھ دیا۔ اور اس کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے مُردہ عائشہ کے جسم میں زندگی کی روح پھونک دی۔ کیا وہ اسے تندرست نہ کرے گا؟ اس کے مقابلہ میں تو دنیا کے تمام علاج اور تمام دوائیاں ہیچ ہیں۔ مسٹر حیدر کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی لمبی انگلی داتوں تلے دبائی۔ اور زور سے گرج کر کہا۔

”عالم امکان میں ہر شے کا امکان ہے۔“

اس کے چند ہی دن بعد وہ بچہ پھر اپنے ہجولیوں سے کھیل رہا تھا۔ اور پٹھو اور حیدر جو ش

مسرت سے دیوانہ وار جھوم رہے تھے +

نیرنگِ حیات

(از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش ایم اے ایم او ایل بکچر اگرونٹ کالج پسرور)

بے غلش کب گلشنِ عالم بن سکں مرا خار سے گل کی طرح اُجھار باداں مرا
 رگئی حاصل کو میرے موج سیلابِ فنا برق کی صورت کو تختہ گیارہ من مرا
 جوش پر ہیں شوخیاں بازیچہٴ اطفال کی کھیلتا پھرتا ہے لڑکوں میں ابھی بچپن مرا
 عہد کیا ٹوٹا وفا کا کھل گئے دستِ جہاں کر دیا چاکِ جگر نے چاکِ پیراں مرا
 بزمِ دشمن میں نہ کیوں اب فوراً تازہ گل بھولے دامن کسی نے لوٹ کر گلشن مرا
 بختِ خفہ کو جگانا تھا مگر فتنے اُٹھے شورِ محشر بن گیا میرے لئے شیون مرا
 پھر ہاتھوں ہر نگاہ پر وہ در کے ساتھ تھا گردشِ چشمِ تاشائی میں ہے مسکن مرا

خون کا دعویٰ کریں گی حسرتیں روزِ جزا
 کیا ہو گر زنگینِ نکل آئے تپشِ دامن مرا

افکار عالیہ

(افکار سخن عالی جناب آرون صاحب انصاف رئیس رنگون گرو قدیم تاج اشعار حضرت نوح ماریومی ملا جالشین حضرت داغ دہلوی)

کیوں رہیں رسم وفا و عشق سے بریگانہ ہم
زندگی اپنی بسر کرتے رہے شانہ ہم
آپ میں ممت از عالم آپ میں جان پہاں
ایسے گھر کے واسطے حسن ادب بھی شرط ہے
ہے زیادہ تر قناعت سے طبیعت کو لگاؤ
پڑ رہی ہے اس کے دم سے زندگی پر روشنی
امثال گاہ و فنا میں سرخ روشنی مل گئی
لب پہ نام اللہ کا ہے دل میں ہے تصویر یا
جو رہی ہے دیر کیوں اے ساتی نے کش نواز
جرم ہائے عشق کو تسلیم کرتے ہیں مگر
حسرتوں کو نوہ و زاری سے ہر دم کام ہے
اُس کی قدرت اسکی رحمت کی ہے یہ ادنیٰ دلیل

پھول تم ہو ہم میں بلبل - شمع تم - پروانہ ہم
زینت کاشانہ وہ تھے مالک کاشانہ ہم
آپ کے درپر کریں گے جبرہ شکرانہ ہم
پرندہ کے بزم اللہ ہو گئے داخل بُت خانہ ہم
زندگی اپنی بسر کرتے ہیں درویشانہ ہم
روح کو اپنی سمجھتے ہیں پسرخ خانہ ہم
تیرے قابل ہو گئے اے بہت مردانہ ہم
ہر گھڑی کرتے ہیں سیکھ و بُت خانہ ہم
گر رہیں انتظار گردش پیمانہ ہم
یثیت رکھتے نہیں جوئے سکیں جُرمانہ ہم
اپنے دل کو کیوں سمجھیں شل ماتم خانہ ہم
روز اپنے بخت کا پاتے ہیں آب و دانہ ہم

کیوں نہ ہو انصاف اپنی صاف ستھری ہر غزل
دیکھتے ہیں نوح کے دیوان کھوزانہ ہم

تمنا

(از جناب سردار رام سنگھ صاحب بی۔ اے۔ آنرز "بی ٹی")

آپ کا نام؟ محمد منیر -
ولد؟ سرین سنگھ -

ہیں؟ ہاں!
یہ کیونکر؟ اسی طرح -

تو آپ پہلے سکھ تھے؟ نہیں -
یا آپ کے والد اسلام کو چھوڑ کر سکھ مذہب کے ہم آغوش ہوئے -
ہرگز نہیں -

یہ تو عجیب معمہ ہے!

نہیں - یہ حقیقت ہے -

لیکن اس الجھن کا حل تو میری عقل سے بعید ہے - کیا اس میں کوئی راز مضمر ہے؟
نہیں باطن روزِ روشن کی طرح صاف ہے - صرف آپ کا نقطہ خیال محدود ہے -

بیٹا مسلمان! والد سکھ! یہ عجیب نوعیت کا رشتہ ہے - میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا -
آج آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا - اور کانوں سے سنا -

لیکن یقین کرنا محال ہے - کیا آپ کو اپنی والدہ محترمہ کے اسم شریف کے بتانے میں تو
کوئی عذر نہیں ہے؟

نہیں ان کا نام چمپا دتی ہے -

اور تعجب خیز ہے!

آپ کے بھائی؟ چار -

ان کے نام؟

ہر دیال سنگھ - گوپال سنگھ - مدن پال سنگھ -

چوتھا؟ میں آپ -

کوئی بہن؟

دو - ستونت کو ر اور منیر بیگم -

یعنی ایک بہن اور ایک بھائی مسلمان - اور باقی سکھ -

ہاں -

ماں باپ بھی سکھ؟

ٹھیک -

تو پھر یہ کسی بیسویں صدی کے غیر معمولی مذہب گھرانے کا دستور العمل ہو گا؟

مسٹر منیر اور مرزا سعید گاڑی میں بیٹھے یہ باتیں کر رہے تھے کہ گاڑی نے دسل دیا۔ منیر نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تو سٹیشن نزدیک تھا۔ سلسلہ کلام کو منقطع کرتے ہوئے دو دن اپنے اسباب کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں اسٹیشن آگیا۔ منیر اور سعید دونوں شوق سے مصافحہ کرنے لگے۔ سعید نے اپنا تعارفی کارڈ پیش کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا۔ آپ سے مل کر نہایت مسرت ہوئی ہے۔ امید ہے کہ جب کبھی ڈلموزی آنے کا آپ کو اتفاق ہو۔ تو احقر کو میزبانی کا شرف حاصل کرنے کا موقع دیکھیں گے۔ اور یہ تفصیل اس معممہ کا بھی کرکھینے گا۔ منیر نے مسکراتے ہوئے سعید کا شکریہ ادا کیا۔ اور پُر اخلاق طریقہ سے اپنا تعارفی نکٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ گاڑی کا تعارف کوئی دیر پا نہیں ہوتا۔ لیکن کم از کم آپ کے اہل میرے مابین یہ خیال باطل ثابت ہوا ہے۔ اس کی وجہ کچھ حد تک میری پُر اسرار سہتی ہے۔ جو آپ کے نزدیک معممہ ہے۔ لیکن اس کا بالمشترج ذکر اب بے محل ہے۔ ہاں! اگر زندگی نے وفا کی۔ تو عرض کرونگا "لو خدا حافظ" یہ کہتے ہوئے دونوں دُور ت جدا ہو گئے۔ اور منیر نے ہوٹل کی راہ لی +

(۲)

شام کا وقت تھا۔ آسمان پر مکمل تاریکی نے ابھی سکہ نہیں جمایا تھا۔ مندروں سے ناقوس اور گھنٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ بازار میں چل پھل تھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ گھروں کو جا رہے تھے۔ گاڑی کا ہنسہ کسی پرندے کی پُر درد بلند آواز کا بونہ تک پہنچتی تھی۔ شاید وہ رستہ بھول گیا تھا۔ یا اپنے ہجو لیوں سے الگ رہنے کے سبب روزگار سے اپنی بے بسی کی شکایت کر رہا تھا۔ یہ کوئی بڑا شہر نہ تھا۔ کہ رات کو ہوٹل میں رونق ہو۔ منیر چپکے سے ہی اپنے کمرے

جسے باہر نکل کر پاس کی سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ کہ اتنے میں اس کے بالمقابل ایک فقیر سوٹے کے سرے کو دونو ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی تمام قوت سے اس پر جھک گیا۔ جیسے کسی کو اپنے تھکے ہوئے جسم کو آرام دینے کے لئے موقعہ ہاتھ لگ گیا۔ بغیر کسی رسمی تعارف کے اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کو منیر کی آنکھوں میں گاڑ کر کہنے لگا: "بیٹا آپ کا نام؟"

منیر نے غور سے فقیر کو دیکھا۔ سر سے پاؤں تک اس کا حلیہ آنکھوں میں بٹھائے ہوئے لکنت کے انداز میں کہا۔ میرا نام!

منیر کے دل میں کچھ خوف طاری ہو گیا۔ ایک اجنبی فقیر سے ناگہاں دو چار ہونا اور پھر بغیر کسی تعارف کے اس کا نام پوچھنا منیر کے نزدیک تعجب خیز تھا۔ وہ کوئی لالچی گنوار فقیر نہ تھا۔ کہ دیکھتے ہی بمبیک مانگنے لگے۔ یہ عمر رسیدہ درویش تھا۔ برف ایسے سفید سر کے بال شافوں پر ہوا میں اس طرح خم کھا رہے تھے کہ گویا دو بڑے سانپ پرواز کر رہے ہیں۔ لمبی ڈاڑھی۔ سیاہ آہو کی مانند موٹی آنکھیں۔ کھدوری آواز۔ وراز قد۔ یہ تمام ایسی باتیں تھیں جو اسے بارعب و موقر بنانے میں مدد دے رہی تھیں۔ اس کے بشرہ سے متانت اور چہرہ سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ کوئی بشر اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ کوئی معمولی فقیر ہے۔

ہاں۔ اتنے میں منیر کو اپنے متزلزل جذبات پر قابو پالنے کا موقع مل گیا۔ اور چونک کر بولا۔ میرا نام؟ میرا نام محمد منیر۔

فقیر۔ محمد منیر! محمد۔ منیر!

فقیر نے دوبار اس کے نام کا اعادہ کرتے ہوئے پیٹھ موڑ لی۔ اور آنکھ کی جھپک میں وہاں سے اوجھل ہو گیا۔ اور منیر مبہوت اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ جس طرح کوئی ناقابل شخص یا ایک کسی راہزن کے مال و متاع لوٹ لینے پر بے بسی کی حالت میں خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔

(۳)

شو میٹے طالع نے منیر اور اس کی بہن منیر بیگم سے ماں کا شفقت آگین ہاتھ عالم فاضل میں ہی اٹھالیا تھا۔ اور یہ دونو بلکتے رہ گئے تھے۔ منیر کے باپ کو ان کی ماں سے بچہ محبت تھی۔ بیوی کی ناگہانی اور بیوقت موت نے خاوند کو دیوانہ بنا دیا۔ شب و روز گریہ و زاری میں بسر ہونے لگی۔ ایک روز صبح کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے ٹھنڈی

ہو چل رہی تھی۔ درخت و جد میں آکر جھوم رہے تھے۔ کیسا سہانا سماں تھا۔ گاہے گاہے موروں کی گوناس کے لطف کو دو بالا کر دیتی تھی۔ گویا قدرت اپنے جو بن کی متوالی ہو رہی تھی۔ ایسی حالت میں صرف منیر کا ایک والد تھا۔ کہ کمرے میں خاموش اپنی بیوی کی یاد میں ناز و قطار رو رہا تھا۔ قدرت کی نیزنگیاں اس کے سامنے ایک ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ گویا تمام عالم ماتم کہہ بن رہا تھا۔ منیر اور اس کی بہن کھیلنے کو چپکے سے باہر نکل گئے۔ ان کے ہاتھوں میں کھلونے تھے۔ منیر بیگم کے پاس اٹی کی بنی ہوئی گڑیا تھی۔ منیر کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ دو نو کھیلنے کو دتے سٹیشن پر جانکے۔ دیکھا تو گاڑی آنے کو تھی۔ ہنستے اچھلتے کمرہ کے اندر جا پہنچے۔ آنکھ چرا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سٹیشن چھوٹا تھا۔ گاڑی نے لمحہ بھر ٹھہر کر وصل دیا۔ اور یہ دو نو ننھے بہن بھائی شوق سے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھنے لگے۔ لیکن ابھی تین چار سٹیشن گاڑی آگے نہیں گئی تھی۔ کہ ان کو نیند نے اپنی آغوش میں لپیٹا اور دو نو بہن بھائی ایک دوسرے سے لپٹ کر یوں سو گئے۔ کہ اٹی انہیں گویا بستہ پر لٹائے ہوئے اور آپ کام دھندے کو باہر چلی گئی ہے۔ آخر جنکشن کا سٹیشن آیا۔ لوگوں نے ڈبہ کو یکے بعد دیگرے خالی کر دیا۔ ماؤں نے اپنے سوتے ہوئے بچوں کو پیار سے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ مگر منیر اور اس کی بہن گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے۔ کون تھا۔ جوان کا ماتھا چومتا۔ آخر ایک سپاہی نے جو گاڑی کے ٹھہرنے پر ہر ایک ڈبہ کو حریف آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ دو بچوں کو لیٹے ہوئے دیکھا۔ ایک سر بڑھیا بھاگی بھاگی سواریوں کے تعاقب میں جاتی ہوئی چلا رہی تھی۔ کسی کے بچے رہ گئے۔ مگر زن و مرد گاڑی کے بدلنے کی دھن میں اس قدر تیز جا رہے تھے۔ کہ بڑھیا کی تھرائی ہوئی کمزور آواز کسی نے نہ سنی۔ پولیس مین نے بچوں کو جگایا۔ بچے سپاہی کو دیکھ کر رونے لگے۔ وہ اس قدر کم سن تھے۔ کہ اپنا نام بھی صاف طور پر نہیں بتا سکتے تھے۔ تمام سٹیشن پر جھوم جمع ہو گیا۔ پولیس نے بچوں کو اپنی حراست میں لیا۔ حسن اتفاق سے سردار سرین سنگھ اور ان کی بیوی سٹیشن پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ ایسے متاثر ہوئے۔ کہ پولیس کے پاس جا کر بچوں کو اپنی تفویض میں لینے کی درخواست لکھ دی۔ اور وعدہ کیا۔ کہ ان کے ولی یا سرپرست ملنے پر ان کے حوالے کرنے میں انہیں کوئی عذر نہ ہوگا۔

سرین سنگھ کی عورت چمپاوتی نے انہیں بغل میں لیا۔ اور پیار سے گود میں بٹھا کر ماتھا چوما اور شفقت کا ہاتھ سر پر پھیرا۔ بچوں نے ہچکیاں لینی شروع کیں۔ اور تعجب سے اس کے منہ کی

طرف ملک کی لگا کر دیکھنے لگے۔

سرین سنگھ نے اپنے وعدہ کو اس طرح نبھایا کہ دنیا دیکھ کر حیران ہے۔ بچوں کو حقیقی بچوں کی مانند پالا تعلیم سے بہرہ اندوز کیا۔ منیر کو اسلامیہ مدرسہ میں داخل کیا۔ اور منیر بیگم کی تعلیم و تربیت کے لئے مسلمان استانی مقرر کی۔ منیر اور منیر بیگم انہوں نے ہی ان کے نام رکھے۔ دونوں سرین سنگھ کے بچوں سے اس طرح کھیلنے کودتے گویا ایک ہی ماں کے بچے ہیں۔ کوئی تفاوت نہ تھا۔ تمام کالیاں یکساں تھیں۔ منیر بیگم منظور حسن اسپیکٹر زراعت سے بیاہی گئی۔ منیر اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل کر دیا گیا۔ منیر بیگم کے بیاہ پر ایسی خوشی کا اظہار ہوا۔ جیسے سگی لڑکی کی شادی کی تقریب پر ہوتا ہے۔

(۴۷)

ادھر تو بیوی کی ناگمانی اور بے وقت موت نے محمد قاسم کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور اب رہی سہی خوشی کی جھلک مکمل تاریکی میں بدل گئی۔ جس طرح بادلوں سے گھرا ہوا مہتاب تھوڑی ہی دیر بعد تاریکی میں جا چھپتا ہے۔ اور زمین آسمان پر یکا یک تاریکی ہی تاریکی چھا جاتی ہے۔ ابھی ایک صدمہ جانکاہ سے محمد قاسم کی پیٹھ سیدھی نہ ہوئی تھی کہ ایک اور صدمے نے اس کا کلیجہ شق کر دیا۔

قاسم نے پریشان ہو کر قرب وجوار کے دیہات میں بچوں کی تلاش میں خاک چھان ڈالی۔ مگر وہ نہ ملنے تھے۔ اور نہ ملے۔ اور پڑوسیوں نے بھی ازراہ ہمدردی جستجو میں مدد دی۔ مگر بے نیل مرام قاسم زندہ درگور ایسی زندگی کو موت سے ہزار درجہ بہتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک بار سنکھیا بھی کھائی۔ مگر لواحقین نے وقت پر پہنچ کر مدد کی۔ اسے زندہ رہنے میں معیبت تھی۔ مگر جانے میں نجات موت کی تاریک و بھیاں شکل اس کے لئے پُر لطف و مسرت اندوز تھی۔ جیسے اماؤس کی سیاہ رات میں چاند کی کرنوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح قاسم کی یاس انگیز زندگی میں خوشی کی جھلک کے نمودار ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ جینا دو بھر ہو گیا۔ آہ و بکا میں روز و شب بسر ہوتے آخر احباب کے سمجھانے سمجھانے پر قرآن کی تلاوت پر راغب ہوا۔ مگر زخمی دل کو سکوت کہاں؟ اضطرابی و بے قرار رہی بدستور۔ بیٹھے بیٹھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ دکھی آدمی کا ایک ایک چل صدیوں کے برابر گزرتا ہے۔ قاسم کی قابل رحم حالت کو دیکھ کر کون ایسا فرد بشر ہوگا جس نے آٹھ آٹھ آنسو نہ بہائے ہوں۔ آخر ایک بار قاسم کی طبیعت میں بھاری تبدیلی کا ظہور ہوا۔

پہلے تو آنکھیں شک سے پر آشوب رہا کرتی تھیں۔ مگر اب پتھر اگئیں۔ گویا کبھی اشکبار ہی نہ ہوئی تھیں۔ زبان پر نہ لگے تھا۔ نہ بین۔ خاموش۔ جیسے جنگل میں آزاد ہرنی یکا یک کاسی زخم لگنے سے خاموش گر پڑتی ہے۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دشتناک انداز سے ہر سو دیکھتی ہے۔ کہ یہ کیا ہو گیا۔ اس جنگ کی کفرت ٹوٹ پڑنے پر قاسم کا کلیجہ دہل گیا۔ گویا کسی نے سلگتا ہوا انگارہ رکھ دیا۔ سکوت کا یہ عالم کہ کسی سے بات کرنا بھی دو بھر تھا۔ آخر ایک روز لوگوں نے قاسم کو فقیرانہ لباس میں اپنے وطن کو درو بھرے دل سے خیر یاد کہتے ہوئے سنا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں عصا تھا۔ گلے میں لمبا کرتا۔ اور زبان حال سے نہایت ہی رقت انگیز لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

درو دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہیں خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
گاؤں کے مرد و عورت سکتے کے عالم میں تھے۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ جیسے چشمہ سے پانی۔ قاسم کی دشتناک شکل یاس کی مجسم تصویر تھی۔

دوسرے روز قاسم کو گاؤں سے دور کہیں جنگل میں "ایک تکیہ" کے قریب ٹوٹی چھوٹی جھونپڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے دیکھا۔ وہ کسی سے نہیں بولتا تھا۔ ہاں ہر ایک راہ رو سے اس کا نام پوچھ لیتا تھا۔ اس کے بعد ہزار کوشش کرنے پر بھی اپنی زبان نہ کھولتا تھا۔ کبھی کبھار شہر والوں بنوں اور جنگلوں میں پھرتا۔ لیکن جب کسی سے دوچار ہونے کا اتفاق ہوتا۔ تو بلا تعارف اس سے نام پوچھتا۔ کوئی کہتا "قاسم باؤا ہے" کوئی کہتا "مرض جنوں اس پر سوار ہے" لیکن کسی نے اس کو دست نگر نہ ہوتے نہیں دیکھا۔ اسے زرویم سے نفرت تھی۔ روپیہ پیسہ دینے پر بھی نہیں لیتا تھا۔ کھانا کوئی کھلا دے تو کھا لیتا۔ مگر وہ بھی اتنا کہ جس سے اس کی شکل سے شکم پری ہو +

(۵)

ستمبر کے مہینے میں دیوانی عدالتیں ہفتہ عشرہ کے لئے بند ہوتی ہیں۔ محمد منیر نے اب کے بار ڈھوڑی جانے کی ٹھانی۔ اور سعید کو شرف میزبانی عطا کر کے وعدہ ایفا کیا۔ سعید منیر کو دیکھ کر پھولے نہ سمایا۔ گاڑی کا تعارف بڑھتے بڑھتے حقیقی دوستی میں بدل گیا۔ لیکن سعید کے گوشہ دل میں منیر کی پراسرار ہستی کا راز چٹکیاں لے رہا تھا۔ آخر منیر نے ایک رات دسترخوان پر اپنے میزبان کو اپنی رام کہانی سنائی۔ منیر کی آنکھوں میں شکرانہ کے آنسو چمکتے تھے۔ سعید کا چہرہ سن کر سرخ ہو رہا تھا۔ آخر صلاح یہ ٹھہری۔ کہ منیر اپنے والد کی ڈھونڈ بھال کرے۔

اس سے قبل سرین سنگھ کی پدرانہ شفقت اور چمپاوتی کی حقیقی محبت نے بہن بھائی کے دل میں یہ خیال ہی پیدا نہ ہوئے دیا تھا۔ کہ ان سے اپنی سرگذشت پوچھیں۔ اور نہ سرین سنگھ اور اس کی عورت نے انہیں اپنی اصلی داستان سنا کر ان کے دل کو ٹھیس پہنچانا مناسب خیال کیا۔ گویا ان کی ہستی بظاہر مینہ اخفائیں تھی۔ مگر انہوں نے لوگوں سے اور شہر کے آدمیوں سے سنا تھا۔ کہ وہ سردار کو سٹیشن پر بلکتے ملتے تھے۔ شاید یہ ان تئیموں کی دعا کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ سردار کا ستارہ اقبال روز افزوں ترقی پر ہے۔

منیر نے ڈھوڑی سے واپس آکر اپنے باپ کی تلاش کرنی شروع کر دی۔ پہلے اس اسٹیشن کی کوٹوالی کے کاغذات کو دیکھا۔ جہاں انہیں سردار نے اپنی تفویض میں لیا تھا۔ اور پھر وہاں سے قرب و جوار کے دیہات سے پتہ لگانا شروع کیا۔ کہ کسی کا لڑکا و لڑکی چھوٹی ہی عمر میں گھر سے نکل گئے ہیں۔ آخر پھر تھے پھر اتنے ایک ضعیف العمر سے سامنا ہوا۔ وہ صرف یہ بتلا سکا۔ کہ عرصہ قریباً پچیس سال کا ہوا میں نے سنا تھا۔ کہ ایک آدمی کی بیوی کی وفات کے بعد اس کے دو نور نظر کہیں اوجھل ہو گئے۔ کوئی کہتا دشمن نے جائیداد پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کوئی کہتا کسی بے اولاد نے اولاد کی خاطر انہیں اٹھا لیا ہے۔ لیکن پتہ نہ چلا۔ اور باوجود کوشش نہ چلا۔ منیر کو اپنی کوششوں کے بار آور ہونے کی امید بندھ گئی۔ اگلے دیہات میں ایک نیکمرود نے ”چپ سائیں“ سے اس کے متعلق برکت حاصل کرنے کی سفارش کی۔ شاید اس کی دعا بارگاہ عالی میں منظور ہو۔ اور کامیابی نصیب ہو۔

منیر جو اس سے پہلے درویشوں کی دعاؤں پر اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ اس آدمی کے کہنے سننے پر سائیں کے دیدار کو روانہ ہوا۔ سائیں گاؤں سے باہر کافی فاصلے پر درخت کے جھنڈ میں گھاس پھوس کی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ فرش خاک پر سوتا تھا۔ گرمی و سردی میں صرف کپلی ہی اڑھتا تھا۔ جھونپڑے کا کوئی دروازہ نہ تھا۔ اس میں ایک مٹی کا لونا جو اس قدر گرد آلود تھا۔ کہ خدا جانے کیوں اور کب لایا گیا تھا۔

منیر نے ایک بوڑھے آدمی کو جھونپڑی میں سائیں کے پاس بیٹھے دیکھا۔ سائیں لیٹا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسے تکلیف ہے۔ اور وہ اضطراب کی شدت سے تڑپ رہا ہے۔ اور زور سے کہ رہا ہے۔ ”میرا چہنا صرف ایک مقصد کے حصول کے لئے مخصوص تھا۔ اور میں اپنی قوت ارادی کے زور سے خیال کرتا تھا۔ کہ میں خواہ کتنا ہی عمر رسیدہ کیوں نہ ہو جاؤں۔ اسے حاصل کر کے ہی بارگاہ عالی میں حاضر ہوں گا۔ مگر اب آب و دانہ ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ قلب میں درد ہے۔“

بوڑھے نے لرزتے ہوئے ہاتھ سائیں کے سینہ پر رکھ کر کہا ”میں حکیم کو لاتا ہوں“ سائیں نے بے پروائی سے پیٹھ موڑ کر کہا۔

”لوگوں کو کیا معلوم میں کون ہوں۔ اور کونسی تمنا اس عرصہ طویل میں میرے دل پر قابض رہی ہے۔ پچیس برس ہوئے میں نے اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا۔ آج پر و بس میں اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر رہا ہوں۔

سائیں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ذرا زوردار لہجہ میں کہا ”میری بیوی مر گئی خدا اسے جنت نصیب کرے۔ پیچھے لڑکی ولڑکا پھوڑ گئی۔ بچے کہیں گھر سے نکل گئے۔ اور پھر واپس نہ آئے۔ دنیا میرے لئے تاریک ہو گئی۔ گھر گھاٹ ترک کیا۔ اور خدا کی راہ لی۔ باوجود پیسم عبادت و ریاضت کے بچوں کا خیال میرے سر سے نہ گیا۔ پر نہ گیا۔ خدا جانے وہ کس مصیبت میں ہیں۔ میری تمنا“

یہ کہتے ہوئے سائیں نے ایک لمبی سانس لی۔ اور آنکھوں کو کھولا۔ منیر کا سر اس کے پاؤں پر تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ جیسے چشمہ سے پانی۔ پاؤں کو اشکوں سے دھو ڈالا۔ اور رقت انگیز لہجہ میں کہا۔

”وہ میں ہوں آپ کا بیٹا جو چھو ٹی ... عمر میں“

سائیں نے فوراً اٹھ کر کہا ”تمہارا نام“

خدا جانے کیا نام تھا۔

سائیں نے غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

تم ہو بشیر!

منیر نے روتے ہوئے سر نہیچا کیا۔ اور کہا ”ابا“

سائیں نے جھپٹ کر منیر کو زور سے چھاتی سے لگا لیا۔ اور گود میں بٹھا کر کہا۔

بیٹا بشیر!

یہ کہتے ہوئے وہ سجدہ میں گرا۔ اور پھر اسی حالت میں خدا کی درگاہ میں داخل ہوا۔ ہر چند منیر نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ ہوا۔ اور اُسی حالت میں دفن ہوا۔

غزل

(از جناب سید منظور حسن صاحب فقیر رامپوری)

اُس سے حسرت کی نہیں جاتی مفت میں جان دی نہیں جاتی
جس کے نالوں سے تم پریشاں تھے آج بات اُس سے کی نہیں جاتی
جان سے بھی یہاں تو عذر نہیں آپ کی دشمنی نہیں جاتی
کیا کیا اُن سے رازِ عشق کہا ہائے دیوانگی نہیں جاتی
دیکھتے ہو ہمارے زخمِ جگر کوئی تدبیر کی نہیں جاتی
کیا زمانے کو ہو گیا یارب ایک کروٹ بھی لی نہیں جاتی

فوق کیا عجبِ حسنِ جاناں ہے

سامنے بات کی نہیں جاتی

نسیم صبح

(مسٹر کنول مین اختر ادیب فاضل)

جاں بخش کس قدر ہے تو اے موسم بہار آتے ہیں چار سمت نظر سبز کو بہار
لب ہائے جو پہ رقص نوازی شاخسار صحنِ چمن میں جلوہ طرازی لالہ زار
عیسے نفس ہے جنبشِ باد بہار کیا!

پڑ مردہ گل کے واسطے ہے تازہ کار کیا!

شاخِ شجر پہ بیٹھے کے مدحت سرائے گل ہیں محو غمہ سنجی ناز و ادائے گل
اے نسیم صبح نے جب پردہ ہائے گل بے ساختہ زبان سے نکلا کہ ہائے گل
گلشن کمال صنعت پروردگار ہے

حسن و جمالِ دورت کا آئینہ دار ہے

پڑتی ہے جس شجر پر نظر سبز پوش ہر بلبل نوا طراز ہے اور عیشِ کوش ہے
شوقِ نمونہ مستیِ ساعہ کا جوش ہے گلِ کیفِ انبساط ہے مجسمِ ہوش ہے

مسرور اس کی دید سے قلبِ عزیز ہے آج

صحنِ چمن نمونہ خلدِ بریں ہے آج

بادِ بہار اہلِ نفس تک اگر گشتی بر چھی سی عندلیب کے دل میں اتر گئی
بے موتِ جبرِ لالہ و گل میں وہ مر گئی ننھی سی جان جس یہ قیامت گزر گئی

جھونکا نسیم کا اُسے پیکِ قضا ہوا

صیاد پوچھتا ہے ہر اک سے کیا ہوا

درس عبرت

(از جناب موصوٰر جذبات اشرف قریشی صاحب لکھنؤی)

”وہ بلدہٴ لطافت و نزہت جس کو لکھنؤ کہتے ہیں۔ اگرچہ اپنی ساری شادابیاں
امتداد زمانہ کے ہاتھوں کھو چکا ہے۔ تاہم وہ ایک شے جس کا نام ذوق سلیم ہے
آج بھی یہاں اڑاں ہے۔

اسی زمین کی لطافت بارگود میں ہماری رشیدہ پٹی۔ برطھی اور اسی فضا میں جہاں
نزاکت ذوق اور لطافت حسن کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس نے اپنی آخری سانسیں
توڑیں۔

لاریب کہ ”درس عبرت“ کے عنوان سے ایک ایسی پُرورد لیکن حقیقی داستان
لکھی گئی ہے۔ جس سے ہر قلب متاثر ہو سکتا ہے۔ اور اس لئے اس داستان
عبرت کو صرف قوت تخیل کی کارفرمائی نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ بڑی محبتوں کے نتائج و
اثرات کا آئینہ خیال کرنا چاہئے۔ کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے
اس کے لئے اس میں بہت کچھ سامان بصیرت پنہاں ہے۔ میں نے اس میں صنف
مظلوم کے مصائب و آلام پر اپنا دل دکھا کر ایک ایسے منظر فرمیں کی جھلک دکھائی
ہے۔ جس سے ہماری جمیعت کو درس لینے کی ضرورت ہے۔
اور یہی مہراد عا ہے۔“

اشرف قریشی

(۱)

رشیدہ۔ بوریہ پر بیٹھی بولی پچھنے پر لانے کپڑوں کی مرست میں مصروف ہے۔ اس کا سن زیادہ
سے زیادہ بیس کیس سال کا ہو گا۔ لیکن مصیبتوں کی بھرمار اور فاقہ کشی کی سختیوں نے اس کے سین چہرہ کو
پھول کی طرح مرجھا کر اس کے حسن ملائک فریب کو بالکل ماند کر دیا ہے۔ جس طرح بیج کا کھلا ہوا گلاب
جلال کے دقت پڑ مردہ نظر آتا ہے۔ بعینہ اسی طرح اس کا خوبصورت چہرہ کثرتِ آلام سے کھلایا ہوا

ہے۔ اس کے سامنے ہی زمین پر دو ڈیرھ برس کا بچہ کھیل رہا ہے۔ رمضان کا مبارک مہینہ ختم ہو چکا ہے۔ آج آخری روزہ ہے۔ مسلمانوں کے گھروں میں عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سویاں خریدی جا رہی ہیں۔ درزی کے یہاں سے جوئے جوڑے سل کر آئے ہیں۔ انہیں دیکھا جا رہا ہے۔ ان کے عیب و ہنر پر نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں۔ جن غریبوں کو اتنی مقدرت نہیں کہ نئے کپڑے بنواسکیں۔ انہوں نے پُرانے کپڑوں کی مرمت کر کے دھلوالیا ہے۔ غم نصیب رشیدہ بھی انہیں لوگوں میں ہے جنہیں نفیس پوشاک۔ مرغ غذا میں تو ایک طرف۔ سترپوشی کو ایک چیتھڑا اور پیٹ کی دوزخ بھرنے کو کھڑا رہی بھی نہیں جڑتا۔

رشیدہ حبیز میں تو سب ہی کچھ لائی تھی۔ برتن۔ باسن۔ کپڑے لٹے۔ گھنا زیور اس کی نانی نے دل کھول کر دیا تھا۔ لیکن میاں جھمن کی عیاشیوں نے غریب کے پاس جھنجھی کوڑی بھی نہ چھوڑی۔ پہلے ظروف ستی و چینی پر ہاتھ صاف ہوا۔ پھر کپڑوں۔ لتوں کی نوبت آئی۔ رہا زیور جسے فردخت کر کے کچھ تو غریب رشیدہ نے گھر کا خرچ چلایا۔ جو کچھ باقی رہا۔ وہ جھمن نے قمار خانے میں ہار دیا۔

رشیدہ بیگم۔ شوہر پرست۔ غفت مآب اور نیک خاتون تھی۔ اس نے کبھی میاں کی بدعتوانیوں پر نکتہ چینی نہیں کی۔ وہ نہایت صبر و خاموشی سے اپنے میکے کا اثاثہ تباہ و برباد ہوتے دیکھا کی۔ اگر کبھی ڈرتے ڈرتے دلی زبان سے کچھ کہا بھی۔ تو جھمن نے برا فروختہ ہو کر سخت جواب دیا۔ وہ بیچاری میاں کے کڑوے تیور دیکھ کر ڈر گئی۔ اور پھر کوئی فقرہ منہ سے نہ نکالا۔

رشیدہ کو خود اپنا تو کچھ خیال نہ تھا۔ دو دو تین تین وقت بغیر کھائے ہوئے صرف پانی پی پی کر خدا کا شکر بجالاتی۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ اس کی گود میں شیر غور بچہ تھا۔ جو دودھ نہ ہونے کی وجہ سے بچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔

رشیدہ نے معصوم کی حالت دیکھ کر ایک روز خاندان سے کہا ————— ”تم میری سب چیزیں لیگئے۔ لیکن میں نے کبھی اُف نہ کی۔ اب بیزبان بچہ کا پھر کتنا نہیں دیکھا جاتا۔ میں تم سے ابھی ابھی غذا میں کھانے کو نہیں مانگتی۔ سترپوشی کے لئے نفیس پوشاکیں نہیں طلب کرتی۔ بلکہ ایک پیسے کے چنے مانگتی ہوں۔ اس بے زبان بچے پر ترس کھا کر ہر روز شام کو تھوڑے سے چنے لادیا کرو۔“

سخت دل جھمن نے اس کی عاجزی کی مطلق پروا نہ کی۔ اور تیور بدل کر کہا —————

”میں تمہاری دو چار بالیاں زبردستی نہیں لیگیا۔ تم نے اپنی خوشی و مرضی سے دی تھیں۔ جس کا ذمہ دار میں نہیں ہو سکتا۔ رہا روٹی کپڑا وہ میں اپنے ہی لئے فراہم نہیں کر سکتا۔ تو تمہارے

واسطے کہاں سے لاؤں۔ خدا نے تم کو دو ہاتھ دیئے ہیں۔ دو پیر دیئے ہیں۔ ان سے کام لو۔ کماؤ کماؤ! اس جواب سے رشیدہ کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ اسے میاں کی طرف سے یاس ہو گئی۔ اتنی بے دردی پر بھی اس نے جھمن کی شکایت نہیں کی۔ بلکہ پاس پڑوس کی عورتوں سے یہ لکھرا لکھرا دیکھی خواہاں ہوئی۔ کہ آج کل وہ بے روزگار ہو رہے ہیں۔ کہیں لڑکری نہیں لگتی۔ اس لئے چاہتی ہوں کہ آپ لوگ اپنے اوز پچوں کے جو کپڑے سلوائیں۔ وہ مجھ ہی کو عنایت کر دیں۔ کہ اس کی اجرت سے اپنے معصوم بچہ کی پرورش کر سکوں۔“

(۲)

اس دن سے آج کی گھڑی تک رشیدہ سلائی کے پیسوں پر بسر اوقات کرتی ہے۔ آٹھویں دسویں دن جھمن آتے ہیں۔ اور جو رقم رشیدہ پیٹ کاٹ کر جمع کرتی ہے لے جاتے ہیں۔ عید سر پر آگئی۔ غم نصیب رشیدہ اپنے پیارے بچے کے لئے ایک کرتہ بھی نہ بنا سکی۔ اس نے ردو کر ایک پرانے کمرے کی مرمت کی۔ پڑوس کی عورتوں نے اپنے بچوں کے لئے ریشمی ملبوس تیار کرائے تھے۔ ان کی کتیں جو محض بیکار تھیں۔ اور اپنی خوشی سے رشیدہ کو بخش دی تھیں۔ ان کتوں کو جوڑ جوڑ کر کتے میں گوٹ لگا دی۔ ایک گرہ جالی کا ٹکڑا بچھی سے نکال کر ٹوپی سی۔ اور یوں بچے کے واسطے عید کا جوڑا تیار کر لیا۔

عید کے دن رشیدہ منہ اندھیرے اٹھ کر نہائی۔ کپڑوں میں پیوند لگا کر رکھے تھے۔ انہیں نکال کر ہنا ایک بی بی نے اپنے شلو کہ اس ہن منگوائے تھے۔ اور اس کی اجرت میں دو پیسے دیئے تھے۔ رشیدہ نے انہیں پیسوں کا پڑوس کی ایک عورت سے تیل منگوا یا۔ بالوں میں ڈالا۔ کنگھی کی۔ باقی جو بچا۔ وہ بچہ کے سر میں ڈال دیا۔ اور پرانے کپڑوں کو بڑی حسرت و آرزو سے چن کی مرمت کی تھی پہنا کر گویا دوٹھا بنا دیا۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر چوٹے میں آگ ڈالی۔ سلائی کا جو روپیہ ملا تھا۔ اس کی بنس پہلے ہی منگوالی تھی۔ گویا عید کے واسطے خاص اہتمام کیا تھا۔ زلفن جو اس کے حال پر نہایت مہربان تھی۔ اس سے پاؤ بھر گشت منگوا یا تھا۔ جسے دھو کر چوٹے پر چڑھا دیا۔ مٹی کے کونڈے میں اٹا نکال گوندھ رہی تھی۔ کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔

شائد وہ آگئے۔ جس طرح عید کا چاند دیکھ کر روزہ داروں کے سینے میں دل اچھلنے لگتا ہے۔ نیک نہاد رشیدہ

کا کلیجہ دھڑ دھڑ کر سنے لگا۔ زرد زرد زعفرانی رخساروں پر تازگی نمودار ہو گئی۔ اس نے اسی طرح بھرے ہاتھوں سے جا کر کنڈی کھولی۔ اور بنیبرات کٹے پچھلے پاؤں واپس آئی۔

ہنوز اپنی بگم پر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ میاں جھمن بغل میں کپڑوں کی لپچی دبائے ہوئے ایک ہاتھ میں بسین کا دو نا دوسرے میں تیل کی شیشی لئے ہوئے داخل ہوئے۔ اور بیوی کی طرف دیکھ کر بولے "ٹھکے میں پانی ہے یا نہیں؟"

رشیدرہ "تھا تو لیکن مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ تم آؤ گے؟ ورنہ خرچ نہ کرتی۔"

جھمن "دیور بدل کر" مجھے کیا معلوم تھا تم آؤ گے؟ کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟

رشیدرہ - (آنکھوں میں آنسو بھر کر) نہیں، نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے جو تم نے سمجھا حقیقت میں یہ تمہارا گھر ہے۔ اور میں تمہاری کنیز ہوں۔ لیکن آج کل خدا جانے کیوں؟ تم ناراض رہتے ہو۔ جو ایک ایک اٹھوارے عورت نہیں دکھائی دیتی۔

جھمن "کچھ سوچ کر" خیر ہوگا۔ مجھے گھڑا اٹھا دو۔ مجھے سے پانی بھر لاؤں۔"

جھمن نے ہٹا کر کپڑے بدلے۔ اور محنت کے چند لوگوں کے ساتھ عید گاہ نماز کے واسطے چلے گئے۔

(۳)

جھمن کے والد ہمایوں میرزا لکھنؤ کے وثیقہ داروں میں سے تھے۔ ان کا شمار اعلیٰ طبقہ میں کیا

جاتا تھا۔ اللہ کا دیا ہوا سب ہی کچھ موجود تھا۔ کسی بات کی کمی نہ تھی۔ زندگی نہایت آرام سے گزرتی تھی۔ جھمن ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ رئیسوں کے بیٹوں کی جس طرح پرورش ہوتی ہے۔ اسی طرح جھمن نے

بھی بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی۔ جب کبھی اس کو معمولی شکایت بھی ہوتی۔ تو ہمایوں مرزا کا مکان اچھا خاصہ ماتم کہہ بن جاتا۔ سینکڑوں دعا میں مانگی جاتیں۔ مرادیں منتیں مانی جاتیں بغیر

کھلائے جاتے۔ غرضیکہ جب تک وہ اچھا نہ ہوتا۔ اس کے والدین کو کسی طرح چین آتا۔ جب اس کو دایہ باہر لیجاتی۔ تو ماں امام ضامن باندھتیں۔ نظریں اتارتیں۔ اور جب وہ گھر واپس آتا۔ تو صد دیا جاتا اور خیرات کی جاتی۔

جھمن جب پورے دس برس کے ہوئے تو ان کی بسم اللہ کی گنتی۔ اور پاس ہی کے ایکے لوی

کی سپردگی میں دیدیا گیا۔ خدا خدا کر کے ایک برس میں بغدادی قاعدہ ختم کیا۔ ہمایوں مرزا منگولی

تعلیم کے بہت دلدادہ تھے۔ ان کو ارمان تھا۔ کہ میرا جھمن بیرسٹر ہو۔ چنانچہ بارہویں برس

انگریزی اسکول میں نام درج کرا دیا۔ اور میاں جھمن نے بجائے ابجد کے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی

کی مشق شروع کر دی۔

ایک سال شہر میں سخت وبا پھیلی تھی۔ بیگم ہمایوں بھی اس میں مبتلا ہو گئیں یونانی اور ڈاکٹری علاج ہوئے۔ ہمایوں مرزا نے ہر امکائی کوشش کی۔ مگر ان کو کسی طرح صحت نہ ہوئی۔ اور صرف بارہ گھنٹے علیل رہ کر راہی ملک بقا ہوئیں۔

ہمایوں مرزا کے لئے یہ صدمہ بہت ہی جانکاه تھا۔ ہر وقت غمزدہ رہتے تھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ اور اکثر تنہائی میں ڈاڑھیں مار مار کر رو دیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو بھی دق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے ان کی تفریح اور دلچسپی کے لئے بہت کچھ سامان تجویز کئے۔ لوگوں نے عقد ثانی کی ترغیب دی۔ لیکن مرزا نے کسی طرح منظور نہ کیا۔

مرزا نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے سامنے ہی جھبمن کا عقد بہت ہی دھوم سے اس کے ماہنامی رشتہ داروں میں رشیدہ کے ساتھ کر دیا۔ اس وقت جھبمن انٹرنس پاس کر چکا تھا۔ شادی کے کچھ دنوں بعد ہمایوں مرزا نے بھی ایک روز قلب کی حرکت بند ہو جانے سے دفا پائی۔ اس وقت جھبمن ایف اے میں تعلیم پارہا تھا۔ مرزا کے بعد اس کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ اس وجہ سے تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے گھر میں بیٹھ رہا۔

(۴)

لاڈ اور ناجائز محبت کو تربیت کے ساتھ وہی نسبت ہے۔ جو آگ کو پھونس سے یا طوفان کو کشتی سے۔ ماں باپ کبھی یہ نہیں چاہتے۔ کہ ان کی اولاد خدا خواستہ بد اطوار ہو۔ مگر مد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت جسے ناجائز ہی کہنا مناسب ہوگا۔ اولاد کی عادت اس زمانہ سے بگاڑنی شروع کرتی ہے۔ جس کو نا سمجھ والدین اس کی بُری سی حرکت کو بھی بچپن کی نادانی سمجھ کر مال دیتے ہیں۔ اور کچھ خیال نہیں کرتے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ پانچ برس کی عادت پچاس برس تک نہیں جاتی۔ صحیح اور بالکل صحیح ہے۔ نامی گرامی فلاسفر ہربرٹ اسپنسر بھی اپنی تصنیف ریجوکیشن میں لکھتا ہے کہ بچوں کی تربیت کا زمانہ بارہ سال کی عمر تک ہے۔

جھبمن مرزا صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ جس قدر بھی محبت ہوتی کم تھی۔ مرزا صاحب اور ان کی بیگم نے انہیں پالا۔ اور بڑی منتوں مرادوں سے پالا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ لاڈلے جھبمن باپ کے کمرے کے بعد ہی اتنی تعلیم پراکتفا کر بیٹھے۔ اور کبھی ڈگری لینے کا خیال بھی پیدا نہ ہوا۔ تعلیم کا سلسلہ چھوٹا۔ طبیعت اچاٹ ہوئی۔ کتب بینی بھی چھوڑ دی۔ اب سوئے فضا لیا ت

بیگاری اور بیوہ مشاغل کے دوسرا کام نہ رہا۔ جوانی کے دن۔ بیگاری اور آزادی۔ بُری صحبتِ شرمنگہ
دلچسپیاں۔ خدا کے فضل سے دولت کی کمی نہ تھی۔ جو شوق لگا۔ دن و نورات چو گنا ہی ہوتا گیا کھٹی
پوچھنے والا نہ رہا۔ جس کا ڈر ہوتا۔ اُدھر دپیہ موجود صلاح کا بھی پاک ہی تھے۔ اب میاں جھمن ایسے
پیٹ بھر کر بگڑے کہ الامان و الحفیظ! میلوں کی سیر۔ باغوں کی چہل قدمی۔ کوٹھوں کی تاک جھانک
تھیٹروں کی حاضر باشی اور لال پری کا شغل —————

غرضیکہ کوئی جگہ تھی۔ جہاں وہ نہ گئے۔ اور کوئی حرکت تھی۔ جو انہوں نے نہ کی۔ شادی توخیر
باپ کی حیات ہی میں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے کچھ دنوں بڑے پاؤ چو پچلے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ سب
کچھ ندارد۔ اب تو میاں جھمن پوچھتے بھی نہیں۔ کہ رشیدہ مرنے لے! بدیتی۔ آٹھ آٹھ دن گھر میں صورت
نہیں دکھلائی دیتی +

(۵)

ان تمام عیاشیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جھمن نے ساری دولت تھوڑے ہی عرصہ میں تباہ کر ڈالی۔
اپنی تمام جائیداد تلف کرنے کے بعد بھی اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ آخر کار تمام رشیدہ کا اثاثہ بھی
بیچ کھایا۔ اور وثیقہ بھی فروخت ہو گیا۔

اب رشیدہ کی بے صداقت صرف سلائی پر رہ گئی۔ اور جھمن آٹھوں پر ادھر ادھر مارا مارا پھرا کرتا
جب کہیں سے کچھ ہاتھ لگ جاتا۔ تو تھوڑے دنوں میں جو اکیلے ڈالتا۔ اگر کچھ جیت لیتا۔ تو دو چار روز
عیاشی میں صرف کرتا ورنہ وہی کوپہ گردی۔ آٹھویں دسویں جب رشیدہ کے پاس آتا۔ تو بانوں کی چٹاری
سنے جو کچھ ہاتھ لگتا۔ لے کے چلتا بنتا۔

غریب رشیدہ ایک ہفتہ سے بخار میں مبتلا ہے۔ آج اس کی باری کا دن تھا۔ جاڑا رہ کر بیڑھنا
تھا۔ ہڈی ہڈی میں درد بخار میں بہہ رہی تھی۔ لیکن کوئی ایسا نہ تھا۔ جو بوند پانی بھی دیتا۔ جھمن
نے۔ کسے دن سے آج تک نہ دے۔ ان کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ ان کی غیر محدود دلچسپیاں نہ ختم ہوتی
تھیں نہ ہوئیں۔

اتفاق سے آج ان کی بھی صورت دکھائی دی۔ گھر میں گسے تو عجب شان سے۔ آنکھیں سرخ
گریبان چاک۔ بدن کھلے۔ ننگے سر۔ ٹوپی ہاتھ میں۔ جھٹکے کھاتے۔ لڑکھڑانے سیدھے پٹنگ پٹنگ
پڑے۔ اور گرے تو ایسے گرے کہ تن بدن کا ہوش نہیں۔ ہاتھ پیر کی خبر نہیں۔ لیکن بھی نہ اتاری۔ بلکہ
بھی نہ کھولا۔ پہنے ہی پہنے ڈھیر ہو گئے۔

رشیدہ بیمار اور قابل رحم رشیدہ دن بھر تکلیف اٹھاتے اٹھاتے گھنٹہ دو گھنٹہ سے غافل ہو گئی تھی۔ میاں جحمن کے آنے کی آہٹ پاتے ہی اٹھ بیٹھی۔ اور بخار میں جلتی۔ بھانپیں نکلتی دیوا کے سہارے ڈنگاتی۔ چپکولے کھاتی۔ پلنگ کے پاس پہنچی۔ اور پٹی کے نیچے دو لونہ ہاتھوں سے سر کو پکڑ کر بیٹھ گئی۔ لائق جحمن غریب رشیدہ کو دیکھتے ہی بولے تو یہ بولے۔ ”بہت جلدی آئیں! مجھے آئے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے۔ مگر بیگم صاحبہ کا مزاج ہی عجیب نہیں ہوتا۔ جب دیکھو بخار ہے۔ کسی طرح نخرے ہی نہیں جاتے۔ ہر وقت ہائے گھر کو ہسپتال بنا رکھا ہے۔“

رشیدہ نے سوائے خاموشی کے کچھ جواب نہ دیا۔ اپنے ہاتھوں کو سر پر سے ہٹا لیا طبیعت کو سنبھالا۔ اور نہایت نرمی کے ساتھ پوچھنے لگی۔ ”تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ آج تو پھر کچھ اوداس ہو رہا ہے۔“

جحمن: ”اوداس ہو رہا ہے۔ تو تمہاری بلا سے۔ اور جان پہ بن رہی ہے تو تمہاری پیزار سے تم تو اپنے بچا کو منائے پڑی رہو۔“

رشیدہ: ”جس وقت تم آئے ہو اسی وقت تو آگئی ہوں۔ اکیلی تھی۔ ذرا لیٹ گئی۔ اگر تم ناراض ہوتے ہو۔ تو تمہارے پیچھے بھی نہیں لیٹا کروں گی۔ تم بتاؤ تو سہی کہ تمہارا مزاج کیسا ہے؟“ جحمن: ”ہے کس طرح۔ تمہارے منہ پر آنکھیں ہو تب۔ تو دیکھ لیتیں۔ سر ہے کہ پھنسا جا رہا ہے۔ بیٹھا تک نہیں جاتا۔“

رشیدہ: ”لوٹ کھولتے ہوئے (میں ابھی سرد ہائے دیتی ہوں۔ تم لیٹے رہو۔ میں خود ہی بوٹ اتار لوں گی۔“

رشیدہ کم سن نہ تھی۔ کہ وہ مصائب موجودہ و گذشتہ اور توقعات آئندہ کے فلسفہ کو نہ سمجھتی۔ اس نے سمجھا۔ کہ ”اب اپنی حرکتوں سے شاید توبہ نہ کر لی ہو اور میرے غمزہ دل پر جو بیشمار مصدات کے نشان ہیں۔ اب ان کا شمار ہو گا۔ اور گن گن کر تلانی مافات ہو گی۔“ مگر ایسا نہ ہوا۔

ایک مدت کے بعد یہ دن نصیب ہوتا ہے۔ کہ رشیدہ سرد رہے۔ پھولی نہیں سماتی۔ محبوب شوہر کے سرد ہانے کی خدمت۔۔۔۔۔ اُسکے سپرد ہوئی ہے۔ اور وہ یقین کئے ہوئے ہے۔ کہ میرے جذبات محبت کو پڑھیں گے۔ میرے محسوسات روح کی تکمیل کریں گے۔ وہ بیٹھیں گے۔ اور میرے شوق پہنہا کا جائزہ لیں گے۔

میرے ارمانوں کو توبہ سے نہیں گے میری ادنیٰ ادنیٰ آرزو کو بھی دیکھیں گے اور پورا کریں گے۔

اور وہ سمجھیں گے۔ کہ میرے اور اراق زندگی۔ محبت۔ شوق اور وفا سے ملو ہیں۔ یعنی میری حیات پر سوائے جھمن اور محبت کے کچھ نہیں لکھا ہے۔ ” ————— مگر آہ ایسا نہ ہوا۔ ”

رشیدہ۔ فرشتہ صفت۔ نیک خصلت۔ پاک طینت۔ رشیدہ۔ جسے اس وقت بھی خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ تو ۱۰۲ ڈگری کا بخار ہے۔ اور جس نے غذا کے نام صبح سے قسم بھی نہیں کھائی ہے۔ نہایت استقلال کے ساتھ بوٹ اور جرابیں اتار کر دھشی جھمن کا سر دبانے لگی۔ پاؤ گھنٹے کے بعد میاں جھمن تیوری پر بل ڈال کر بولے۔ ” رہنے دو۔ میرا سر نہ دباؤ۔ تمہارے ہاتھ تو دوزخ کا کندہ بن رہے ہیں آرام آنے کے بدلے میرا سارا سر جل اٹھا۔ ”

رشیدہ۔ ” نہایت منت اور سماجت کے لہجے میں) اچھا تو میں اپنا ہاتھ ٹھنڈے پانی میں بگلولوں۔ ”

جھمن۔ ” (غصہ سے) جی نہیں۔ معاف کیجئے! میرا پیچھا چھوڑ دو! بدتمیز۔ ” ————— کیں کی۔ ” ————— !!

خدا جانے اس فقرے میں کیسے نشتر پوشیدہ تھے۔ کہ برسوں کا غم۔ مدتوں کا بخار آنکھوں کی راہ سے خون ہو کر بننے لگا۔ وہ اب فرط گریہ سے بیتاب تھی۔ اس کی ہچکی داخو اہانہ انداز سے مضطرب تھی۔ اس کے آنسوؤں کی فرادانی اس کے گہرے غم و الم کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کی مظلوم ادائے استرحام درد سے معمور تھی۔ اس کا معصوم قیافہ بیکیسی اور محرومی کا آئینہ تھا۔ اس کے آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جذبات کی خستگی کی دو تصویریں تھیں۔

(۶)

جھمن کی مغرور اور مجتنب اداؤں اور غم نصیب رشیدہ کی معصومیت بھری التجاؤں کا ایک دلخراش سین ہے۔ جو درس عبرت کے عنوان سے قلمبند کیا گیا ہے۔

آج بھی دنیا باوجود اپنے اوعائے تہذیب و مدنیت کے ٹھیک ٹھیک گذشتہ عہد و مہشت اور ہیمنیت کا نمونہ ہے۔ کسی زمانہ میں عورت اگر احترام کے قابل نہ تھی۔ اگر اسے اعتماد و محبت کا سزاوار نہ سمجھا جاسکتا تھا۔ اور اگر وہ دلہنگی کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک خندہ زہر آلود اور قلعہ استہزاء سے زیادہ قدر و قیمت نہ رکھتی تھی۔ تو آپ دیکھ لیں کہ آج بھی باوصف اس کے کہ دنیا دعوائے عورت نفس اور شرف مساوات پیش کر رہی ہے۔ اس جنس محترم کا معیار شخصیت کچھ زیادہ بلند نہیں ہوا۔ وہ تو پہلے بھی مظلوم تھی۔ اور اب بھی ہے۔ پہلے بھی تمہاری ہیمنیت کا شکار تھی اور اب بھی تمہاری ہیمنس

کی اسیر ہے۔ اس کے جمال شرافت کو اگر پہلے مجروح کیا گیا تھا۔ تو آج بھی وہی سلوک اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کی اویہیت اور دیوبیت سے کل اگر تمسخر کیا جاتا تھا۔ تو آج فرمائیے۔ اس کی عفت و شعریت کی تضحیک سے کون چوکتا ہے۔ اگر پہلے اس کے ساتھ گستاخیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ اگر زمانہ مہاریک میں اس کی حقیقت سے بے ادبیاں کی جاتی تھیں۔ تو لہذا بتائیے۔ کہ اس شرمناک برتاؤ سے آج کس کو شرم آتی ہے۔ تعجب ہے کہ دنیا جس قدر روشنی۔ تہذیب اور مدنیت کی علم بردار بنی۔ اس قدر اس کی روح تاریک۔ اس کی خصلت آوارہ اور اس کی شعریت گم ہوتی گئی؟ ————— شادی بیاہ کیا چیز ہے؟ دو ہستیوں کے اشتراک کامل۔ دو دلوں کے اتحاد خالص کا نام نکاح ہے۔ اور یہ وہ مقدس عہد ہے۔ جس کو نوع انسان۔ ولی مسرت و شوق سے انجام دیتی ہے۔ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ ہم اس کو کسی نام سے کیوں نہ تعبیر کریں۔ یہ محبوبا مشترک اک روحی عہد و پیمان کی شکل سے ہو۔ یا عقد اور نکاح کے نام سے۔ اصل میں سچی شادی اور حقیقی نکاح تو دلوں کے ملاپ اور اتحاد کا نام ہے۔ ایسا اتحاد جس میں جھگڑے کا خیال بھی نہ پیدا ہو۔ اور ایسا ملاپ جس کی تفریق صرف موت کر سکے۔ یہ اتحاد ایک ایسا اتحاد ہوتا ہے۔ جس میں گل پیریزیں واحد نظر آتی ہیں۔ سارے اغراض مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ تمام امتیازاتھ جاتے ہیں۔ اور زمانہ حال دائمی مسرتوں سے معمور نظر آتا ہے۔ اور ساری کائنات روشنی اور نکمت کا رنگین ملبوس پہن لیتی ہے۔ جب دو وجود اس طرح محبت کریں جب دو ہستیاں مل کر اس طرح آپس میں ایک ہو جائیں۔ تو فی الحقیقت ایسی دو دلوں کا یہی حقیقی اتحاد اور نکاح ہے۔ تلافی۔ پادری۔ مجسٹریٹ یا دوسرے گواہوں اور تقریب خواہوں کے سامنے گو اس اتحاد کا اعلان کسی وجہ سے ضروری ہو۔ مگر زیادہ ضرورت اس اتحاد کی ہے۔ جس میں ردھیں مشترک اور محبتیں متحد۔ دلوں کا اشتراک اہائے اس اتحاد کی خوشی نہ پوچھئے۔ وہ دو سبھیں ہیں۔ جو شام سے ایک ساتھ ملنے کی متوقع ہیں۔ وہ دونوں ہیں۔ جن کی صبح تمنا ایک ہی ہے۔

پھر حیف ہے اس اتحاد پر۔ جس کی بنا محبت پر نہ ہو۔ تا سلف اس عہد پر جس کی بنیاد اخلاص پر قائم نہ ہو۔

کیا ایسا نکاح مذہبی فرض و ذمہ داری سے سبکدوش کر دیتا ہے۔ کیا اس قسم کا حقیقت سے دور اتحاد۔ اخلاق کی خوبیوں اور محاسن میں داخل ہے۔ ایسا بیاہ کیا۔ نیکی کا کوئی بہترین طریق ہے۔ ایسا اشتراک جنسی کیا سو سائٹی کے امن و حفاظت کے لئے کوئی مفید نتیجہ پیدا کرے گا۔

بہت کم لوگ ہیں۔ جنہیں۔ ماؤں۔ بہنوں اور بچیوں کی تکالیف کا حقیقی علم ہو۔ ایسی بیشمار بیبیاں ہیں۔ جو رشیدہ کی طرح اپنے خاندان کی بوشک شوکی چرچراہٹ سے خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ ایسی بہت سی معصوم روہیں ہیں۔ جو اشتراک جنسی کا ایک سہل ترین نتیجہ ہیں۔ اور بہت سے ایسے بچے ہیں۔ جو اپنے باپ کو آتے ہوئے دیکھ کر ڈر کے مارے کوئے ڈھونڈھنے لگتے ہیں۔

بہت تھوڑے لوگ ہیں۔ جو ان طباہیوں کی تعداد و شدت سے واقف ہوں۔ جو ہر روز ان معصوم رخصتوں۔ ان بوسہ گاہ شرافت گالوں پر پڑتے ہیں۔ جن کی لطافت و رنگینی سے کائنات روح کا ذرہ ذرہ رنگین ہے۔ کتنے ہیں وہ لوگ جو ان خوفناک راتوں کا علم رکھتے ہوں۔ جن میں مسکین روہیں۔ رشیدہ کی طرح ذلت و حقارت کی ٹھوکریں کھایا کرتی ہیں۔

سو سائٹی ایسے گھرانوں اور ایسے انسانوں سے کیا فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ قوم کس طرح مہذب اور ترقی یافتہ ہو سکتی ہے۔ جہاں بے رحم اور خود غرض لوگ زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ اور اپنے اندر اخلاق و انصاف کی کوئی روح موجود نہیں رکھتے۔

سنو! اے خود غرض اور بے رحم انسانو!! تم بچوں کی فیاض ماؤں اور علم و محبت کی تصویر بیبیوں سے لطف و انصاف سے پیش آؤ۔ عورت تمہارے سامنے اپنا تمام مال و متاع رکھتی ہے۔ وہ تمہارے حضور اپنا انبساط روح۔ اپنی انگلیں اور اپنی شعریت۔ اپنی محبت اور اپنا جذبات سے معمور دل پیش کر دیتی ہے۔ تمہارا سلوک اس کے ساتھ۔ رحم۔ اخلاق۔ مسادات۔ محبت اور وفا کا ہی ہونا چاہئے۔ محبت کا اشتراک روح کے لئے حقیقی اتحاد ہے کسی تہذیب۔ کہاں کی معاشرہ کدہر کا ارتقا اور کیسا مغرب۔ تم اپنی راحت تلاش کرو۔ کہ راحت نام ہے۔ صرف عورتوں کی حقیقی عزت کرنے کا۔

محبت والوں کے گھر۔ اچھے انتظام اور عمدہ حلیقہ کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔ ایسے گھر کے چولہے کی ایک ایک اینٹ تہذیب و تمدن کی کامل نشانی اور مکمل بنیاد ہے۔ یہاں برکتوں کا نزد دل ہے۔ یہاں برکتوں کا سایہ ہے۔ یہاں محبتیں جھولاجھولتی ہیں۔ ایسے مکان۔ ایسے گھر۔ ایسے خوشگوار تعلقات و رتقا و قومیت کا زینہ ہیں۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تو تم خدا کے خلاف جنگ کر رہے ہو۔ اور قومیت کو برباد۔ اس لئے جب تم دوسروں کی حفاظت اور سختی سے نگرانی کر رہے ہو۔ اور اپنے آپ کو احتساب سے بالاتر سمجھتے ہو۔ تو تم کچھ اچھے انسان نہیں ہو۔ اور صرف ایثار اور قربانی کا نام لیکر تم خدا کو خوش نہیں کر سکتے۔ جب

تک تہلدا اعلیٰ بھی قول کا موئید نہ ہو۔ خوب سمجھ لو اور اچھی طرح سن رکھو کہ انسانیت کا یہ نصف بہترین جمیل حصہ جس کو عورت کہتے ہیں ارتقائے انسانی کا منبع ہے، یہ انسانوں کی ماں ہے، اسی ایک لفظ کی عظمت پر دنیا بھر کے بنی نوع انسان کی رنج و غشی، فزاعنت و راحت، علم و دولت، عزت و خواریت اور صداقت کا انحصار ہے، یہ محبت کی قربان گاہ پر اپنی حیات رہن کھتی ہے تاکہ دوسروں میں اعتماد و روح پیدا ہو، اس کی نذر اگر نہ کی، اس کی عزت سے اگر انحراف کیا تو خوب یاد رکھنا کہ ایک نہ ایک دن تم بھی تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

ڈر برسی بلا ہے



سجدہ شکر

(جناب شیخ محمد انعام الحق صاحب ہوشیار پوری)

(۱)

والدہ کے انتقال کے بعد چند روز کے اندر ہی میری زندگی میں ایک زبردست انقلاب آگیا۔ مستقبل کے متعلق دل خوش کن اور حوصلہ افزا ارادے حسرت و یاس سے بدل گئے۔ کل تک میں اپنے ہم جماعتوں اور دوستوں کے نزدیک ایک قابل رشک خوش قسمت نوجوان تھا۔ لیکن والدہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ایک بکیس و غم فغیب انسان رہ گیا۔ مجھے والدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ ان کے انتقال کا صدمہ بھی بہت زیادہ ہوا لیکن اس انقلاب کی بڑی وجہ اس صدمہ کی بجائے قبلہ والد صاحب کے طرز عمل کی غیر متوقع تبدیلی تھی۔

میں انٹرنس کا امتحان مقامی اسلامیہ ہائی سکول سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخل ہو گیا۔ قبلہ والد صاحب اور والدہ مرحومہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے انجینیری کی تعلیم کیلئے ولایت بھیج دیا جائے۔ کالج کی دو سال کی تعلیم کے بعد میں نے امتحان دیا۔ اور سی میں فارغ ہو کر گھر چلا گیا۔ پرچہ بہت اچھے ہو گئے تھے۔ پروفیسروں۔ دوستوں اور خاندان کے صاحبزادوں کی میری کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اسلئے ولایت کی روانگی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ طامس لگ اور دوسری جہاز ران کمپنیوں کے قواعد و شرائط منگوائے گئے۔ ضروری اشیا جمع ہونے لگیں۔ اپنی برادری میں انگلستان کا عزم کرنا لامیں پہلا نوجوان تھا۔ اسلئے سارے شہر میں خوب چرچا ہو گیا۔ رشتہ دار عورتوں نے مذاق سے کہنا شروع کر دیا ”کہیں ولایت سے میم نہ لے آنا ورنہ ہم دونوں کو گھر میں نہ گھسنے دینگے“ محمد کی مسجد کے مولوی صاحب جن سے میں نے بچپن میں قرآن شریف پڑھا تھا جب موقع ملتا ولایت میں مذہبی احکام پر کار بند رہنے کی تاکید کرتے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں ”میرے والدین، ہمشیرہ، رشتہ دار اور دوست خوش ہو رہے تھے۔ لیکن قسمت اس مسرت پر ہنس رہی تھی۔ مصائب میرا انتظار کر رہے تھے۔“

(۲)

جون کا مہینہ تھا کہ یکایک شہر میں مہینہ پھوٹ پڑا۔ ہمارے محلے میں بھی ایک دو کیس ہو گئے۔ ایک روز میں شام کے وقت ٹینس کھیل کر باہر سے آیا تو معلوم ہوا کہ اس موذی مرض نے میری پیاری والدہ پر بھی حملہ کر دیا ہے۔

اور حالت نازک ہے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ رسول سر جن قبلہ والد صاحب کے دوست تھے انہوں نے ہر چند کوشش کی رات کو وہ اور لیڈی ڈاکٹر دونوں ہمارے مکان پر ہی رہے۔ لیکن آہ موت کا کوئی علاج نہیں۔ صبح سویرے طلوع آفتاب کے ساتھ مرحومہ کی شمع حیات گل ہو گئی اوسیرے اور میری بہن کے مستقبل پر دکھوں اور مصیبتوں کی بھینٹ تاریکی جھاگئی۔ نزع سے تھوڑی دیر پہلے مرحومہ نے قبلہ والد صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر شکریاں آنکھوں سے التماس کی ”میرے بچوں کو اچھی طرح رکھنا..... لڑکی کا رش نہ کیسی اچھی جگہ کرنا“ صرف استدر کہہ کر ان کی آواز رقت و ضعف سے دب گئی اس کے چند منٹ بعد وہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئیں قبلہ والد صاحب نے والدہ مرحومہ کے سامنے مجھے اور میری بہن کو سینے سے لگا کر عہد کیا کہ ان دونوں کو ہمیشہ جان سے عزیز رکھوں گا اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ لیکن بعد کے واقعات نے بتایا کہ والد نے ہمیں قبلہ والد صاحب کو سونپنے کی بجائے حادثہ چرخ کے حملے کا تھا۔

والدہ کے انتقال کے تیسرے چوتھے روز ہی قبیلہ والد صاحب کی دوسری شادی کے متعلق پراسرار سرپرستی پر سلسلہ جنباتی شروع ہو گئی۔ چہلم کے ایک ہفتہ کے بعد انہوں نے نکاح کر لیا۔ اور ہماری سوتیلی والدہ آئیں۔ اکثر رشتہ داروں، محلہ والوں اور قبیلہ والد صاحب کے دوستوں نے بہت بڑا سنایا۔ ہم دونوں بہن بھائی چوہن تھے اُن کی عمر بھی پچاس سال کے قریب تھی اور پھر پہلی بیوی کے انتقال کے چند روز بعد ہی نکاح کر لینا اُن کے نزدیک ناقابل معافی عیبت تھی۔ مگر میرے خیال میں یہ کوئی زیادہ قابل اعتراض بات نہ تھی۔ پہلی بیوی کی اولاد کی موجودگی میں شادی کر لینا کوئی عیب نہیں لیکن شادی کے بعد مٹا قبیلہ والد صاحب کے طرز عمل میں جو تفسیر ہوا وہ ضرور قابل افسوس اور موجب حیرت ہے۔

(۲)

میری دستکوالدہ کس خاندان سے تھیں؟ ان کے والدین نے شادی کے قبل قلم صاحب سے کوئی کوئی شرائط لکھوائیں؟ والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد اس قدر جلد شادی ہو جانے کی کیا وجہ تھی؟ میں ان خاکی امور کو بیان کرنا نہیں چاہتا۔ قصہ مختصر یہ کہ شادی ہو گئی اور قبلہ والد صاحب نے ہم دونوں بہن بھائیوں کو گیم بے اعتنائی برتنی شروع کر دی۔ چند روز میں انہوں نے مجھے تنہائی میں بلا کر صاف کہہ دیا "اب تم جو ان ہو میں تھیں آئندہ تعلیم نہیں دلا سکتا اور کسی قسم کی امداد کی توقع بھی مجھ سے نہ رکھو۔ اب تم کھانے کمانیکے قابل ہو سکو اور اپنی خوراک لباس اور رہائش کا حوزہ اٹھام کرو" ناظرین قبلہ والد صاحب کے اس حکم کو پڑھ کر حیران ہونگے جس وقت انہوں نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے مجھے بھی اپنے کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا یہ سن کر میں دیر تک سوچنے کے عالم میں کھڑا رہا قبلہ والد صاحب یہ کہہ کر زمانہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں میرا جانا سوتیلی والدہ کے آنے کے روز ہی بند ہو چکا تھا۔ دنہ شاید وہاں جا کر

انکی خدمت میں کچھ عرض کرتا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد میں دینر تک عالم تنہائی میں کھڑا رہتا اور اپنی تائیدہ زندگی کے متعلق غور کرتا رہا لیکن میرے اندکارتے دبے ہوئے دماغ نے کسی نتیجہ پر پہنچنے سے انکار کر دیا۔

آہ میں تو ولایت جانیکی تیاریاں کر رہا تھا۔ میرے حالات سے بے خبر دوست خطوط کے ذریعہ روانگی کی تاریخ دریافت کر رہے تھے لیکن یہاں کچھ اور ہوا تھا۔ قبلہ والد صاحب کا یہ حکم سن کر میں دن رات متفکر رہنے لگا۔ میرے سامنے ایک تاریک اور پُر مصائب مستقبل تھا۔ کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ آئندہ کے لئے میرا ذریعہ معاش کیا ہوگا؟ یہ سوالات ہر وقت میرے زیر غور رہنے لگے۔ اسی طرح دس گیارہ روز گزر گئے اس عرصہ میں مجھے کئی بار اشارتاً اور صاف الفاظ میں چلے جانے کو کہا گیا۔ ان ایام میں میرے اور میری بہن کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ یہ بڑی ہی المناک داستان ہے۔ اس میں ناظرین کے مطلب کی صرف یہ بات ہے کہ آخر ہم دونوں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے لئے اس گھر میں آہ اس گھر میں جہاں پیدا ہوئے اچلے بڑھے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن آخر جہاں تو کہاں جاؤں؟ ہنرمیال کے رشتوں میں صرف ایک دائم المریض بیوہ خالہ زندہ تھیں جن کی آمدنی پہلے ہی معدوم تھی دوسرے قریبی رشتہ داروں میں البتہ اور دو تین صاحب حیثیت آدمی تھے لیکن وہ سب سب سلسلہ ملازمت و دور دراز مقامات پر مقیم تھے۔ علاوہ ازیں قبلہ والد صاحب کے مراسم بھی ان سے اچھے نہ تھے اسلئے ان کو شروع سے ہی ہم سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ایک روز ایک نہایت ہی رنجورہ ناقصہ ہواجم دونوں بہن بھائیوں کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ ہم نے اللہ کا نام لیکر قبلہ والد صاحب کی مقبوضی کی ان کو اور اپنے عہدی مکان کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھتے اشکبار آنکھوں سے صرف تن کے کپڑوں کو لیکر اسی بیوہ خالہ کے مکان میں اٹھ آئے۔ قبلہ والد صاحب ہمیری ناکستہ ہمشیرہ کو بھیجنے کیلئے تیار نہ تھے۔ لیکن میری سوتیلی والدہ کی بیچیں خواہش تھی۔ آخر انہوں نے معمولی اپیں و پیش کے بعد اجازت دیدی۔

دو روز رنج و غم میں غرق رہنے اور قسمت کو کونہ سمجھنے کے بعد آخر میں نے فیصلہ کیا۔ کہ مجھے اس طوفان مصائب میں خودنوں کی طرح روکنے کی بجائے مردوں کی طرح ثابت قدم رہ کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ میرے دوستوں نے مجھے طرح طرح کے مشورے دیئے۔ بعض محلے والوں نے قانونی چارہ جوئی کہنے کو کہا اس کے لئے ہر طرح کی امداد دینے کا بھی یقین دلایا لیکن میں نے اپنے لئے یہی پسند کیا کہ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح تمام ہونے والے رنجورہ واقعات کو بھول جاؤں اور لاہور جا کر اپنے لئے کوئی ذریعہ معاش تلاش کروں۔ بعض دوستوں نے میری مالی مدد بھی کرنی چاہی لیکن میں نے شکر یہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ ان میں سے دو تین نے مجھ سے کچھ روپے قرض لئے ہوتے تھے۔ البتہ وہ ضرور واپس لے لے۔ اپنے ہاتھ میں ہونے کی ایک انگشتری تھی اس کو فروخت کیا۔ اپنے اور ہمشیرہ کے معمولی کپڑے بدلے۔ ہمدردی سامان سفر خرید کیا اور چند روپے ہمشیرہ کے خرچ کے لئے خالہ کو دیئے اور اللہ کا نام لے کر لاہور کو روانہ ہو گیا۔

(۴)

لاہور پہنچ کر میرے دل کی کیا کیفیت تھی یہ الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ یہاں مجھے احباب الوداع کہنے کی تیاریوں میں مصروف تھے لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ خوش قسمتی نے خود مجھے الوداع کہہ دیا ہے اب میں ایک کامیاب انجینئر بننے کی بجائے فاقہ کش بے روزگار تھا۔ لاہور پہنچ کر ایک بے تکلف دوست کے ہاں قیام کیا انہیں میرے کچھ حالات معلوم تھے۔ باقی خود بتائے۔ ایک ایف۔ ایس۔ سی پاس کرے تو کیا کرے لیکن میرے ادبی مذاق نے اس نازک وقت میں میری مدد کی۔ غور و فکر کے بعد یہ طے ہوا کہ کسی اخبار یا رسالے میں ملازمت تلاش کی جائے کیونکہ مضمون نگاری کا مجھے سکول کے زمانے کا شوق تھا۔ کالج کی سبکدہی کے علاوہ بعض بلند پایہ ادبی رسائل و اخبارات میں میرے مضامین بارہا شائع ہو چکے تھے۔ ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ اس دوست کے بھائی اور کالج کے دو پروفیسر کی کوشش و ستارشش سے جلد ہی ایک اُردو روزنامہ میں مترجم کی جگہ مل گئی خدا کا شکر کر کے کام شروع کر دیا۔

ملازمت کے بعد میں نے دوست کے مکان پر قیام مناسب نہ سمجھا حالانکہ ان کا اور اُن کے بھائی کا اصرار یہی تھا۔ بھائی دروازہ کے باہر شہر سے ذرا دور ایک بلڈنگ میں چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ کھانے کا انتظام بھی وہیں ہو گیا۔ بلڈنگ خاصی بڑی تھی چالیس کے قریب کمرے ہونگے۔ جن میں کچھ ملازم پیشہ باقی کالجوں کے طالب علم رہتے تھے۔ کافی رونق تھی لیکن میں پریشان اور اداس ہی رہتا۔ اب میں طالب علموں کی بے فکر زندگی پر رشک کرتا تھا۔ حالانکہ کچھ روز پیشتر خود اُن کے لئے باعث رشک تھا۔ کل تک میں ایک امیر زادہ تھا لیکن آج ایک مصیبت زدہ غلس۔ میں افلاس کو ایک جرم کی طرح چھپاتا تھا۔ سولے ایک دیکھو تمام دوستوں کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ اپنے ٹھکانے کا پتہ بھی کسی کو حتی الامکان نہ دیتا پاس کی بلڈنگ میں میرے دو ہم جماعت رہتے تھے اُن سے بھی ذرا آنکھ بچا کر آتا تھا۔ خوشحالی کے بعد افلاس ایک بہت بڑا عذاب ہے۔ البتہ بلڈنگ میں میری تھوڑی بہت بے تکلفی ایک بی۔ اے کے طالب علم ریاض سے ہو گئی تھی۔ یہ ضلع لدھیانہ ایک معزز و متمول خاندان کا نہایت ہی صلح و خیران تھا۔ ادبی مذاق بھی رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے تمام حالات اس کو معلوم ہو گئے وہ اکثر میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا کرتا تھا۔ اس کی والدہ بھی سونپلی تھی لیکن باوجود اس کے والد کا طرز عمل بہت قابلِ تہنیت تھا وہ اس کی طرح سے خیال رکھتے۔ ایک بار ریاض معمولی لہو پر غلیل ہو گیا کسی طرح اُن کو بھی خبر ہو گئی فوراً لاہور آ گئے۔ مجھے اکثر ریاض کے والد کے طرز کو دیکھ کر قیادہ والد صاحب کی بے اعتنائی کا خیال آ جاتا۔ میں نے کئی بار ریاض کو اُس کی خوش قسمتی پر مبارک باد بھی دی۔ جس کے جواب میں وہ ہمیشہ مسکرا کر خاموش ہو جاتا۔

اگر لاہور پہنچ کر ریاض سے واقفیت نہ ہوتی تو میری زندگی ناقابلِ برداشت طور پر غمناک ہو جاتی۔

(۵)

اسی طرح تین چار مہینے گزر گئے۔ مالک اخبار میرے کام سے بہت خوش تھا۔ تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ میں اپنے اخراجات کیلئے بینک میں روپیہ رکھ لیتا۔ باقی ہمیشہ کے لئے خالہ کو بیچ دیتا وہ ان میں سے صرف چند روپے صرف کرتیں باقی رقم انہوں نے ہمیشہ کے جہیز کیلئے جمع کرنی شروع کر دی تھی۔ کیونکہ ان کو قبلہ والد صاحب کے کسی قسم کی امید نہ تھی ملازمت کے علاوہ میں نے بی۔ اے کے امتحان کی تیاری بھی شروع کر دی تھی ریاض اور میں اکٹھے مطالعہ کرتے۔ مگر آہ قدرت کو میرا اطمینان منظور نہ تھا۔ ایک روز جب میں دفتر سے گھر آنے لگا تو خالہ کا "تار ملا کہ تمہاری ہمیشہ پر سوسے ڈبل نوئیہ سے بیمار ہے حالت نازک ہے فوراً چلے آؤ۔ تار پڑھ کر میرے جوش حواس جانے رہے۔ جھٹ پٹ منیجر سے ملکر رخصت کا انتظام کیا۔ گاڑی کا وقت قریب تھا۔ بھاگا بھاگا گھر آیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ ریاض بھی اپنے وطن چلا گیا ہے اس کو ایک مرضی خط آیا تھا۔ میں نے کبیل اور کرایہ لے کر اسٹیشن کا رخ کیا اور ہزار وقت گاڑی پر سوار ہو سکا۔

رات کے دس بجے کے قریب گاڑی منزل مقصود پہنچی۔ ابھی میں خالہ کے مکان کی گلی کی ٹکڑ پر تھا کہ نالودہ شیون کی آواز سنی۔ مکان کے اندر جا کر دیکھا تو میری پیاری لیکن بد نصیب بہن میرا انتظار کرنے کرتے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ صبح کو اُسے سپرد خاک کر دیا۔ مجھے اس کی موت کا رنج بے اندازہ تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ صدمہ قبلہ والد صاحب کے طرز عمل کا تھا۔ تین چار روز وہ بیمار رہی لیکن انہوں نے بار بار کی اطلاع کے باوجود خبر نہ لی۔ جب معلوم ہوا کہ حالت نازک ہے تو چپکے سے دہلی کو روانہ ہو گئے۔ اور وہ مرتے دم تک انہیں یاد کرتی رہی۔ ایسا کرنے کے لئے قبلہ والد صاحب کو کس نے مجبور کیا؟ میرے خیال میں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں؟ والدہ صاحبہ بھی عیادت و تعزیت کیلئے "عشرین" نہ لائیں۔

اب میں ہر لحاظ سے لٹ چکا تھا۔ میرے لئے وطن ٹھہرنا ناممکن تھا۔ چھٹے روز ہی لاہور واپس آ گیا۔ اس صدمہ نے مجھے کام کرنے کے ناقابل کر دیا۔ گھر سے ہی پندرہ روز کی درخاست رخصت لکھ کر دفتر بھیجی اور دن رات دروازے بند کر کے اپنے کمرے میں لیٹا رہتا۔ اب میرے خیالات کچھ عجیب ہو گئے تھے۔ میں خدا کو ایک ایسی اندھی طاقت سمجھنے لگا تھا۔ جو کسی قاعدے اور اصول کی پابند نہیں۔ میرا خیال تھا کہ دنیا میں رحم، انصاف اور محبت کی ایسے الفاظ سے زیادہ وقت نہیں جو کسی شرمندہ معنی نہیں ہوتے۔ اور نظام کائنات چغیت روحیں اور ظالم طاقتیں قابض ہیں۔ میں نے ان ایام میں ایک زبردست مصنفین بھی لکھا جس میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ بیوی کے انتقال پر اولاد کی موجودگی میں دوسری شادی قانوناً ناجائز ہے۔ دینی چاہئے یا کم از کم قانوناً پہلی بیوی کی اولاد کی پشت اور حقوق کی حفاظت کا تسلی بخش انتظام ہونا چاہیئے۔ غرضیکہ میری حالت رنج و غم کی شدت کی وجہ سے

دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔

مجھے لاہور پہنچے کئی روز ہو چکے تھے۔ لیکن ریاض اب تک واپس نہ آیا تھا۔ آخڑہ کافی انتظار کے بعد مجھے ساتویں دن شام کے وقت لاہور پہنچ گیا۔ میں نے ہمیشہ کے انتقال کی اطلاع وطن سے ہی اس کے گھر کے پتہ پر دیدی تھی۔ اس لئے کہتے ہی نہایت ہمدردانہ طریق پر اظہار افسوس کیا۔ تسلی دی۔ گرم پانی منگو کر میرا ہاتھ منہ دھلایا۔ کپڑے تبدیل کر لئے اور اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ اور بیٹک پاس بیٹھا رہا اس کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ریاض کو زکام ہو رہا تھا میں نے وجہ سے پوچھی تو اُس نے کہا ”یہ نہیں سردی سے ہو گیا ہے“ اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ میں نے زکام اور سرفاس کی وجہ بھی۔ جب میں نے سوال کیا کہ گھر کیوں گئے تھے اور اتنی دیر سے واپس کیوں آئے؟ تو اس نے صرف اتنا کہا کہ ایک ضروری کام تھا میں اپنی پریشانی کی وجہ سے تفصیل نہ پوچھی۔

ریاض کے جانیے بعد میں کمرہ بند کر کے چار پائی پر لیٹ گیا لیکن نیند کہاں۔ رات کے بارہ بجے کے قریب مجھے سخت پیاس محسوس ہوئی۔ صراحی خالی تھی۔ گلاس لے کر صحن میں پپ سے پانی لینے گیا تو غلاف معمول ریاض کے کمرے میں روشنی دیکھی حالانکہ وہ ہمیشہ دس بجے کے بعد ضرور سو جایا کرتا تھا۔ پانی پنی کر جب اُس کے کمرے کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ کوڑھی اچھی طرح بند نہیں۔ جب کمرے کے اندر داخل ہوا تو عجیب منظر دیکھا۔ ریاض کرسی پر بیٹھا زار و قطار رو رہا تھا۔ میز پر دو خط لکھ کر رکھے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک سفید سفوف کی پڑیا تھی میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بار بار دریافت کرنے پر اُس نے کہا ”تم بہت بے وقت آئے اگر نہ آتے تو اچھا ہوتا“ یہ کہہ کر دو نو خط جو اُس نے ابھی لکھ کر میز پر رکھے تھے۔ میرے ہاتھ میں دیدیئے۔ جن کو پڑھ کر میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے فوراً سفید سفوف کی پڑیا ریاض کے ہاتھ سے چھین کر ضایع کر دی۔ اُس کو بمشکل چپ کرایا۔ اس کے بعد اور بہت سی باتیں ہوئیں۔

میں ریاض کو ایک خوش قسمت اور زند دل نوجوان سمجھتا تھا کیونکہ باوجود دوسری شادی کر لینے کے اُس کے والد کا طرز نسل بہت ہی قابل تعریف تھا۔ ریاض بظاہر کبھی بھی افسردہ نظر نہ آیا اور اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر طرح سے خوش ہے۔ اپنی اور اس کی حالت کا موازنہ ہی میری پریشانی کی بڑی وجہ تھی۔ لیکن میں غلطی پر تھا آج مجھے حقیقت معلوم ہو گئی۔ ریاض نے بہت ہی دکھ بھرے لہجے میں اپنے گھر کے حالات بتائے جو انتہائی دردناک تھے۔ میں ان کو یہاں لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کی سوتیلی والدہ نے اُس کی بہن کو زہر دے کر مروا ڈالا تھا۔ ریاض کے گھر جانے کی یہی وجہ تھی۔ وہاں جا کر اُس کو جو حالات پیش آئے وہ بالکل ناگفتہ بہ ہیں۔ اب وہ خود کشی کیلئے تیار تھا۔ سفید سفوف پسا ہوا سسکا گیا تھا۔ ان دو خطوں میں ایک میرے نام تھا اور دوسرا

رباعیات

(از جناب شیخ سراج نراق حبیب دہلوی)

(۱)
سر نہ چھوٹا کہ سربسری سچا
اور خوش نختی و اجنبی سچا
طاعت چاہے نہ دلتی میں تیر
کہ نہ بھی پسند حق پسندی سچا

(۲)
مفسر کس غنمی بنائے اور زشت
شہاں کس لعل اور گہر بدست
تو نے نہ پر آئے تو استار سچا
تو جانے چھوٹے چھوٹے سچا

(۳)
بندوں پوری بن رہ نوازی کچی
بچاروں کے حق میں چاہے نوازی کچی
تو کہو نہیں دوست اور دشمن میں تیر
یارب تیری بنیاد نوازی کچی

(۴)
جن جنک پیش کیا کہم چھوٹا ہوگا
حق چاہے لگا جس سے بے پروا ہوگا
حاکم اپنا خدا کے کر دے اسے حق
چھوٹا کہم تیرے سے بھی بڑا ہوگا

ارشاداتِ عالیہ

(اثر ناصحہ کتب خانہ ہانیہ ری)

دامن میں تار ہے نگریاں ہیں تار ہے
لے لے کے ایک تارِ نفس ہو وہ خاز
فرصت کہاں جو کبھی نہ گیسل آرزو
بر لختِ حیات ہوا پر سوار ہے
میری نور او عشق میں مٹی ہوئی خراب
اُن کو قدم بھی ناک پر کھنے سے عار ہے
اک گرد باد جانے لگا ارٹس کو
کیا اعتبارِ بہتی بے اعتبار ہے
تصویرِ اضطراب ہے اشکوں میں مرتعش
آئینہ ساز گری بے اختیار ہے
بھردی میں میرے دل پر تھوڑے بجلیا
ہر ذرہ حسن یار کا آئینہ دار ہے
دنیا میں حسرت کا فی فطرت کہاں نہیں
بر دل فریب خوردہ رنگ بہار ہے
پھر بنس ہے میں زخمِ جگر پارہ ساز ہے
پھر اس چمن میں آدِ فصل بہار ہے
نذر فریب و عداوت و ابھونی حیات
کچھ حدِ آوازش میں دوار ہے
پامالی مزار کا کیوں کھراوا ہو سُکر
ہر ذرہ مزارِ چرخِ مزار ہے

کوکبِ نشاطِ خندہ بیمار ہے بشتا!

افسردہ کچھ خزاں سے بھی اپنی بہار ہے

مرجان خانم

اصحاب ڈراما

مرجان خانم ایک حسین پاکدامن مغنیہ
فہمیدہ اندھے کمزوروں کا محافظ
سہیلیاں

سلطان ماروں رشید
ابراہیم خانم ڈاکو
خداام

پہلا منظر

مرجان خانم کا حسین و دل آویز مکان، سبز باغ، چاروں کونوں پر سفید شفات آباد، فوارے چھوٹے ہوئے ہیں۔ وسط میں مرمر کا مربع چوترا ہے۔ ہر طرف برقم کے حین و سبک پھول منبر فروش ہیں، ہلکی ہلکی چاندنی فرش مرمر پر لہرا رہی ہے۔ وسط فرش میں بہترین و بیش قیمت قالینوں پر سامان ساز و نمونہ آراستہ ہے۔ سبز مخمیں تکیوں کے سہارے حسین مرجان خانم نیم قد ہے۔ قریب ہی گنگا جمنی گلدان میں پھولوں کا ایک بڑا گلہ مستہ رکھا ہے۔ مرجان خانم کی باریک انگلیوں میں گلاب کا ایک ہلکا بادامی پھول ہے۔ جسے وہ لہجہ نزاکت بار بار سوگھتی جاتی ہے۔

دو تین کنیزیں دست بستہ حاضر ہیں۔ تین چار سہیلیاں کچھ فاصلہ پر ساز سانسے رکھے بیٹھی ہیں۔
مرجان خانم (سہیلیوں سے) "شمع خانم! آخرا اس نواب ابراہیم کا کیا علاج کیا جائے۔ یہ تو بری طرح سے پیچھے پڑا ہے۔"
شمع خانم: "بیکم! مجھے تو یقین ہے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"
مرجان خانم: "بظاہر تو کوئی خاص برائی سوائے (اس قسم کے) اور نظر نہیں آتی۔ اچھا خاصا عزت دار، دوبارہ شاہی کا ایک رکن ہے۔ شہر میں سب لوگ اس کی شان و شوکت و امانت سے متحیر ہیں۔ باایں ہمد میرا دل اسے قبل نہیں کرتا۔ اور بغیر عقد تو خدا نہ کرے کہ میں اس کے محل میں داخل ہوں؟"

(دو کنیزیں دڑکڑاتی ہیں)

"ملکہ! دو سا فرمائے ہیں۔ کچھ دیر آرام کے خواستگار ہیں۔"

مرجان خانم: "ان کو یہاں لے آؤ؟"

[مسافر گھٹتے ہیں۔ ایک خوش شکل نوجوان ہے۔ دوسرا کچھ سن رسیدہ۔ آداب و مزاج پُرسی کے بعد
مرجان بعد ازاں جگہ دیتی ہے۔ کینز نینگیشتیں میں کچھ سامان اکل و شرب لادیش کرتی ہیں]
ایک کینز آکر انصواری نواب ابرار تشریف لائے ہیں :
(مسافر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

مرجان " بلا لاؤ "

(نواب ابرار بعد شان و شوکت و لباس خاص و مجموع چدا جواب دلا زمین تشریف لاتے ہیں)
مرجان مسافروں سے ملاقات کراتی ہے۔ سب مل کر گانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ مرجان گانا شروع کرتی ہے
سب جھومنے لگتے ہیں۔

دوسرا منظر

رات کا خاموش وقت۔ سلطان محمد بن مرشد۔ مکلف خواب گاہ۔ کافری شخوں کی عطر فروش ہلکی ہلکی منہ روشنی
میں خلیفہ پر تکلف بستر پر دراز ہیں۔ وزیر جعفر ایک گنگا مینی کرسی پر رونق افروز ہیں۔
جعفر " غلام صرف اس غرض سے حاضر ہوا ہے۔ کہ چند یوم سے حضور کی طبیعت کچھ مکدر نظر آتی ہے اچھڑکی سبب؟
خلیفہ " کیا بیان کروں ! جس دن سے مرجان خانم کا گانا سنا ہے۔ طبیعت خود بخود اس کی جانب راغب ہے۔
صرف یہ خیال دامن گیر ہے کہ مرجان ایک گانے والی عورت ہے۔
جعفر " نہیں خداوند نعمت ! مرجان نواب بغداد کی پہلی پاکدامن مخنیہ ہے۔ میری ناقص رائے میں اگر حضور اس کا
گانا سن لیا کریں تو کیا ہرج ہے۔ اس کی آمد و رفت ہوگی۔ تو اس کے افعال سے واقفیت ہو جائیگی۔
خلیفہ " بے شک یہ رائے مناسب ہے۔ کل سے وہ دربار میں نظر آیا کرے۔
(جعفر اجازت لیکر رخصت ہوتے ہیں)

تیسرا منظر

نواب ابرار کا مصفا محل۔ ایک وسیع مکلف کمرے میں نواب ابرار رونق افروز ہیں۔ جھلاتی روشنی میں چاروں
طرف کچھ احباب جلوہ گر ہیں۔
ابرار " افسوس کیا کہوں۔ روز دربار شاہی میں بیٹا بیٹیا مرجان خانم کا بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا دیکھتا ہوں۔
معلوم اس کی رسائی کس طرح دفع ہو گئی۔ ذل بدن اس کے اوصاف پسندیدہ کی جانب شاہی چشم کرم

بڑھتی جا رہی ہے اور مردان کے چشم و ابرو سے بھی نلکا ہرے گمہء غلیضہ کے عقد میں ایک دن آنے والی ہے۔ اب تو مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی؟

قاسم (ایک دوست) آپ کو صرف یہی معلوم ہے۔ میں کل ہی وزیرِ صحت سے کل حال معلوم کر چکا ہوں۔ آخر کار بادشاہ نے انکی پاکدامنی اور شرافت پر صا و کر کے ہیں۔ سے عقد کا ارادہ کر ہی لیا۔ دونوں میں چھاپا دینا مضبوط ہو گیا ہے بہت جلد مرجان شاہی عقد میں آنے والی ہے۔

ابراہیم (از نو پیٹ کر) اُف! یہ کیا غضب ہو گیا! اب کیا گیا جائے؟ (دو دوستوں سے) تم دو کو کسی طرح مرجان خانم کو آج ہی گرفتار کر لاؤ۔ یہاں آکر دیکھوں گا۔ کہ کس طرح شاہی حرم کا نام لگی۔ دوست ایک زبان ہو کر آئیے بھی کوئی بات ہے۔ آج ہی بیٹھے!

(سب رخصت ہوتے ہیں)

پوچھا منظر

ایک آراستہ کمرہ۔

عبدشان و شوکت نواب ابراہیم ایک جگہ گاتی مسہری پر بیٹھے ہیں۔ مرجان خانم فرش پر سر جھکا کر بیٹھی ہے اس کے جسم سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ گل رخسار زخموں سے چھو نظر آتے ہیں۔ لباس ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔

نقاہت سے نظر نہیں اٹھتی۔ آنکھوں میں استقلال کی چمک آنسوؤں میں تابانی پیدا کر رہی ہے۔

ابراہیم "مرجان! کامل ایک ماہ گزر گیا۔ میں تجھ کو ہر طرح سمجھا چکا۔ دو ہفتے تو نے میرے محل کا آرام و آسائش دیکھ لیا۔ اب دو ہفتے سے تو زندان کی معیتیں، کوڑوں کی ضربیں اور فاقہ کی سختیاں جھگرت رہی ہے۔ غرض ہر طرح تو نے میرے جاہ و جلال کا امتحان لے لیا۔ تجھ کو معلوم ہو گیا کہ تو ابراہیم زبردست ڈاکو کے ہاتھ میں ہے جس کے ہاتھ میں تیرے لئے بہشت و دوزخ دونوں موجود ہیں۔ بس اب فیصلہ کا آخری دن ہے۔ غمگین آج بھی تو انکار ہی کری گی۔ تو تیرا خاتمہ ایک ایسا ہولناک خاتمہ ہو گا۔ جس کے خیال سے بھی درجِ لڑتی ہے۔ تمہارے ہمارے معیتوں اور تحفوں کی انتہا نے اب تیرا دماغ درست کر دیا ہو گا۔ اور تو میرے حکم پہ عمل درآمد کے لئے بالکل تیار ہو گی۔"

مرجان اسرٹھا کر اس طرح کہ آنسو اس کے گلابی رخساروں پر شبنم کے قطرے بنے ہوئے تھے (ابراہیم اسے بے رحم کتے! خدا کے جلال سے ڈر، آہ! جس طرح تو نے مجھے غریب دیکھ کر کیا ہے۔ وہ خدا دیکھ رہا ہے میں نے تیری جاہ و شہرت، دولت و ثروت پر شوکر مار دی۔ میں نے ہر قسم کے ظلم، جفا بعدِ مسرت برداشتہ

کے۔ ایک عورت، کمزور عورت کو تو نے دلوں دقت آہنی سلاخوں سے زخمی کیا۔ اور وہ خدا کے فضل سے ثابت قدم ہے۔ مگر یاد رکھ! کہ خدا کے یہاں انصاف ہے۔ ایک دن ایسا کہ میری عصمت کی فتح ادیری نفس پرستی خاک میں مل جائے گی۔ یہ نشان دشوکت، یہ جاہ و جلال خدا نے چاہا۔ تو سب خاکستر ہو گائیں بھی آج آخری بار کہہ رہی ہوں۔ کہ میں موت کے لئے بخوشی تیار ہوں۔ خلیفہ کے نام پر جان دید و گئی۔ اور ہرگز راہ و فنا سے ایک قدم نہ ہٹاؤ گی۔

ابرار (غمت سے گرج کر) بہتر ہے۔ ذلیل بازاری عورت! اپنی سرزوری کی سزا بھگت (زور سے) کوئی ہے؟
”فہمید کو فوراً حاضر کرو!“

(فہمید اور خادم حاضر ہوتے ہیں)
ابرار (مرجان کو ٹھوکرے گرا کر) ”فہمید! اس ذلیل عورت کو لیا کر اندھے کنوئیں میں الٹا لٹا دو، مطلق اسکی گریہ زاری پر نظر نہ ڈالو۔ اہمیتیں چار روزیں اسکی لاشیں سڑ جائے تو ہمارے حضوین لاؤ۔ ہم بذات خود اسے جنگلی دھندوں کو کھلا کر دل خوش کرینگے۔“
(فہمید مرجان کو گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے)

پانچواں منظر

خلیفہ کی خواہجہ۔
خلیفہ بستر پر اداس لیٹے ہیں۔ کنیزانِ ادب دست بستہ ہیں۔
خلیفہ (عالم خیال میں) ”مرجان خام! تجھ سے ایسی یوفائی کی امید نہ تھی۔ تو نے میرے سیدھے دل کو بڑا دھوکا دیا۔ مجھے طرح اپنا گردیدہ بنا کر اس طرح غائب ہو گئی۔ بے شک ایک گانوالی عورت سے ادکیا امید ہو سکتی تھی۔ مگر افسوس! اتنا عرصہ کیوں میری نظروں پر پردہ پڑا رہا۔ آخر اس کے متعلق میں نے کوئی بُری افواہ کیوں نہ سنی، اس طبیعت کو کیا کروں ہر چند اس کا خیال اسکی بے وفائی کا مال، دل سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر طبیعت نہیں رکتی۔ قلب پر سخت صدمہ ہے۔۔۔۔۔“ (دیگرہ) (نیند آ جاتی ہے)

چھٹا منظر

ایک بھیانک وحشت ناک جنگل میں اندھا کنواں ایک گہرے مہیب سیاہ غار سے زیادہ خوفناک نظر آ رہا ہے۔ رات کی مہبت سیاہی جنگلی پرندوں کی چیخ و پکار، عجب بولناک عالم ہے۔ فہمید ایک شیر کی کھال میں لٹا ہوا اپرو دے رہا ہے۔ کنوئیں سے

غناک آواز گانے کی آہی ہے !

”اے خدا! تیری قدرت زبردست اور طاقت بے مثل ہے۔ یہ تو میرے حال زار کی اطلاع غلیفہ تک پہنچا دے
 رحم الرحمن! تو جانتا ہے کہ میں نے اس عرصہ میں کتنی سختیاں اٹھائی ہیں۔ اس اندھے کونٹوں میں جہاں ماتھ کو ماتھ نظر نہیں
 آتا۔ میں ایک آہنی زنجیر میں لٹکی ٹھک رہی ہوں۔ مگر غلیفہ! ماتھے وہ مجھے ایک عصمت فروش عورت سمجھ رہا ہوگا اچکارا
 اے حافظہ فمید! اگر تو میری مدد کرے۔ تو انشا، اللہ تیرے لئے بہت بہتری ہوگی!“

فمید (چٹک کر) ”ائیں! ائیں! ائیں! ائیں! مصیبت زدہ عورت! مجھ سے ایسی درخواست نہ کر۔ تجھے ابرار کے جلال و جبریت کا
 علم نہیں ہے۔ وہ مجھے مرکز بھی چین نہ لینے دیگا۔“

مرجان ”اچھا تو صرف پانچ منٹ کے لئے مجھ کو باہر نکال کر مجھ سے گفتگو کر لے۔ اگر تجھے اطمینان ہو جائے۔ تو فمید! منہ
 میں اس کونٹوں میں واپس آ جاؤ گی!“

فمید (سوچ کر) ”خیر! میں تجھ سے بات کرنے کو تیار ہوں۔“ ”آہنی زنجیر اور کی طرف کو کھینچ کر مرجان کو نکالتا ہے۔ مرجان کڑی
 سے بیہوش ہو جاتی ہے۔ فمید پانی چھڑک کر ہوش میں لاتا ہے۔ دونوں سرگوشیوں میں بات چیت کرتے ہیں (

فمید (بلند آواز سے) ”اڑکی! اس جگل کے چاروں طرف دو ہزار ڈاکوؤں کا مسلح پہرہ ہے میں تجھے کسی طرح یہاں سے نکال
 نہیں کر سکتا۔ وہ سب ایک آن میں ہم دونوں کا خون پنی جائینگے۔ تو یہ سمجھ رہی ہے کہ تو صرف میری حفاظت میں ہو
 ابرار ایسا احمق نہیں ہے۔“

مرجان (سوچ کر) ”اچھا تو ایک ریچھ کا شکار کھیل اد مجھے اس کی پوسٹین میں چھپا دے۔ میں آسانی ہزاروں ڈاکوؤں کے بیچ
 میں گھل جاؤ گی۔“

فمید (حیران ہو کر) ”خوب! یہ مناسب ترکیب ہے۔ میرے پاس کھال موجود ہے۔ میں ابھی تجھ کو دیتا ہوں۔“ (کھال لا کر
 دیتا ہے)

ساتواں منظر

دربار شاہی۔

غلیفہ تخت سلطنت پر بعد جبروت متمکن ہے۔ حاضرین بادب اپنی اپنی نشست پر موجود ہیں۔ غلیفہ کا چہرہ احساس ہو
 ابرار کی آنکھوں میں ہمت کی چمک ہے۔

چوہدار (حاضر ہو کر) ”حضور والا! ایک تماشہ گراہی ریچھنی“ کو لے کر حاضر ہوا ہے۔ اور عرضگار ہے۔ کہ حضور چند لمحوں
 کو بچم خود تماشہ ملاحظہ فرمائیں۔“

خلیفہ (اشارہ اردو سے) بلاؤ

(تاشہ گرامر حاضر ہوتا ہے۔ ایک سیاہ ریچھنی پاؤں میں گھونگر دپنے ہمارا آتی ہے۔)
اجازت پا کر تاشہ گریچھنی کا اشارہ کرتا ہے۔ ریچھنی رقص شروع کرتی ہے۔ رقص کی عجب کیفیت، اُندت و دلکشی
حاضرین کو مجبورت کر دیتی ہے۔ خود خلیفہ سکتے کے عالم میں ہے
خلیفہ ”سبحان اللہ کیا کمال ہے! اسے تاشہ گرا! تجھ کو آفرین ہے، کہ تو نے ایک حیوان کو انسان سے زیادہ تعلیم دی،
واہ! واہ!“

تاشہ گرا۔ حضور! اب اس باکمال حیوان کی سپہ گری بھی ملاحظہ ہو!

[ایک تلوار خود لیتا ہے۔ ایک ریچھنی کو دیتا ہے۔ دونوں ہوا میں رٹتے ہیں۔ تاشا ٹی حیرت میں آتے ہیں
تاشہ گریٹھ جاتا ہے۔ صرف ریچھنی بے نظیر کر تلب تلوار کے دکھاتی ہے۔ تلوار سے تاشہ کرتے ہوئے
اچانک ایک زبردست دارا بار کی جانب کرتی ہے۔ تلوار کی نوک ابرار کے سینہ میں پیوست ہو جاتی
ہے۔ ابرار ہائے کر کے کرسی سے گرتا ہے۔ دربار میں غل پڑ جاتا ہے۔ لوگ ریچھنی کو کپڑے دوڑتے
ہیں۔ ریچھنی جسم کو ایک حرکت دیتی ہے۔ پوستین سے مرجان خام نکلتی ہے]

سب (حیرت سے) ایں مرجان خام!

ابرار (لڑکھاتی آواز میں) ہائیں مرجان خام! یہ دو ہزار ڈاکوئل کے بیچ سے زندہ کس طرح نکل آئی!
مرجان دوڑ کر بادشاہ کے قدموں پر گرتی ہے۔ اور پھر ٹھیکسی نگاہوں سے ابرار کو مخاطب کر کے کہتی ہے :-
”ابرار! آج وہ دن ہے۔ کہ تجھ کو تیری فرعونیت کا نیچہ دیکھنا پڑا۔ تیرے وہ لفظ، تو ایک کمزوریں
ناچیر شے ہے۔ اور میرے ساتھی دو ہزار ڈاکوئل۔ آج تیرے سامنے آ رہے ہیں۔ تو وہ جلاؤ ڈاکوئل
جس نے ایک نازک کمزور اور کم مایہ عورت کی عصمت کا امتحان لیا۔ تو نے کس دھوکہ سے مجھے اسیر کر لیا۔
کس کس طرح اپنے رنگین تصور و زریں محلات کے سبز باغ دکھائے۔ بیش بہا بہترین میرے اونیسیس و
نایاب موتی میرے قدموں پر نثار کئے۔ گو میں خدا کے فضل سے تیرے دام میں نہ آئی۔ آخر وہ وقت آ گیا۔
کہ تو ظلم و زیادتی پر کمربستہ تھا۔ تو نے کیا کچھ ظلم نہ کئے۔ کوڑوں کی مار۔ بیدوں کی ضرب۔ آہنی زنجیروں کی
سختیوں سے میرے برہنہ ٹو سے خون ٹپکایا۔ میں ہنتوں جھوکی پاسی، ایک قطرہ آب و ایک دانہ گندم
کو تر پتی ہی۔ گو تیرا کنا نہ مانا۔ آخر وہ دن آ گیا۔ کہ تو نے مجھے مہیب سیاہ، جھانک کنوئیں میں الٹا لٹا دیا
میرا دم بدن دن میں آنچھول کی پکلوں میں آکر ٹمک گیا۔ تو دلاں مچ گیا۔ اور ایک دفعہ پھر اپنے محلات کے عیش و
عشرت کا نقشہ لکھ دیا۔ گر شکریہ کہیں ثابت قدم رہی۔ تیرا حکم تھا کہ میں جب ایک سرٹھی ہوئی لاش نہ برائیوں

سے نکالی جاؤں۔ تو خجکی دندے میرے مجھ کا دسترخوان چیں!!
 فمید کی مرانی سے میں کنوئیں سے نکلی۔ اس سے ریچھ کی پستین حاصل کی۔ اور ایک ریچھ کی شکل
 میں تیرے دہزار ڈاکوؤں کی آنکھوں میں خاک جھونک دی۔

ابرا! یہ ایک عورت پرستھی کا نتیجہ ہے۔ یہ خدا سے منحرف ہونے کا انجام ہے۔ کہ آج تو اس کیسی میں میرے
 سامنے دم توڑ رہا ہے۔ یہ اس ظلم کا بدلہ ہے جو تو نے ایک شریف دل عورت کی عصمت پر توڑا۔ ابرا! تو سمجھتا
 تھا کہ ایک مظلوم عورت کی آہ کوئی اثر نہیں کھلائے گی مگر

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از دین حق بہر استقبال مے آید

مرجان خانم کی تقریر ختم ہو گئی۔ دربار میں جوش حیرت سے سکوت کا عالم ہے۔

خلیفہ (ابرا کی تڑپتی ہوئی لاش سے) افسوس ہے ابرا تیری نفس پرستی پر اور آفرین ہے مرجان خانم کی محبت و عصمت پر
 ابرا منفعل کچھ جھکا لیتا ہے۔ تڑپ تو پاکر چند ساعت میں دم توڑ دیتا ہے۔ مرجان دوبارہ بادشاہ کے قدموں پر گر گئی ہے
 بادشاہ بعد محبت اشکار تخت پر برابر بٹھالیتا ہے (پردہ گر جاتا ہے)

(بلیقش جمال بریلوی)

(بقیہ خند)

سوری، پروفیسر کالج اور فزندا رحمہ اللہ اور دھورام صاحب اس کام کے کریو اے میں۔
 دی سٹوڈنٹس اون ایجنسی۔ پرنسپل ٹرن میرز رام لال سوری اینڈ سنز لاہور۔ کالجوں کے کوریسوں کی کامیاب فرم ہے
 اب دیکھ لیں نصاب کی طرف بڑی سرعت سے رجوع کر رہی ہے۔

پنجاب سکول سپلائی ڈپو۔ لائبریری سیریز کے ایک کامیاب پبلشر ہیں۔ اب نصابی اشاعتوں کی طرف بھی توجہ دے رہے

ہیں۔ مولوی ممتاز علی اینڈ سنز۔ پھول پچوں کی لائبریری کے جنم دینے والے اور پنجاب کے بچوں کی کتابوں کے واحد
 پبلشر ہیں۔

مولوی فیروز الدین اینڈ سنز۔ اردو گلوب کے مخترع اور تعلیمی نقشہ جات کے مجدد مولوی فیروز الدین اپنی شہادہ روز محنتوں
 سے اس وقت فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور کے مالک اور صوبہ ممبئی کی تعلیمی کتب کی چھپائی کے اجارہ دار ہیں۔ گورنمنٹ اڈو
 گزٹ پنجاب بھی انہیں کے پریس میں چھپتا ہے۔ اردو تعلیمی کتابوں کے ادبی سیریز بھی انہوں نے شائع کئے ہیں۔

لالہ آسمارا ام اینڈ سنز۔ انارکلی میں کالجوں کی کتابوں کے سلسلہ میں خاص طور پر نامی ہیں۔ بعض کتب انگریزی و ریاضی
 متعلقہ مدارس کے پبلشرز ہیں۔

ہمارے تعلیمی پیشرز

اگر تعلیم و تعلم کا یہ دعا ہے کہ ہم اپنی روحانی طاقتوں کو سمٹ سٹا کر اس طرح راہ راست پر لائیں کہ جس سے ہماری زندگی کامیاب ہو۔ تو یقیناً کاروباری زندگی ایک ایسی امتحان کن صفت ہے۔ کہ جس میں داخل ہونے سے ہی ہم اپنی قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے مندرجہ ذیل تعلیمی پیشرز اپنی کامیابی کے لحاظ سے ہمارے روبرو روشنی کا مینار ہیں۔ جنہوں نے اپنی علمی زندگی کی جدوجہد میں کششوں کے قلعے کو فتح کر کے اس پر کامیابی کا جھنڈا لہرایا۔

رائی صاحب منشی گلاب سنگھ انیڈسنسز لاہور۔ وہ ابتدائی تعلیمی فرم ہے۔ جس کا آغاز محکمہ تعلیم کے ساتھ ہی ہوا۔ کوٹ اڈو کے مدرس اور جغرافیہ پنجاب و ہند کے معتمد منشی گلاب سنگھ اس کامیاب کاروبار کے بانی تھے۔ جن کی کمرٹ نے کاروبار کے پٹارے کو اس استقلال کے ساتھ اٹھایا۔ کہ آج ان کا نام اپنی مارکیٹ میں گیارہ روزگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کل اس فرم کا کاروبار ان کے برنخودار پوتے لالہ سہن محل صاحب کے ہاتھ میں ہے۔

میسرز عطر چند گپور انیڈسنسز لاہور۔ یہ دوسری فرم ہے۔ جسے لالہ عطر چند صاحب مرحوم سٹور کیپر محکمہ کمرٹیٹ کے فرزند لالہ اشرف اس کی قیمت کے پانے نے جنم دیا ہے۔ اس فرم کی بنیادوں میں بانی فرم کے بھائی لالہ گلاب چند گپور اور وکان کے رکن اعظم لالہ ٹھاکر داس انند (جو آج کل ٹھاکر داس انند انیڈسنسز انند ول سورجی روادہ لاہور کے نام سے اپنا تعلیمی کتابوں کا کام الگ کر رہے ہیں) کی ان تھک کو شمشوں کی بھرتی بھرتی ہوئی ہے۔ اب لالہ رام جویا صاحب کپور فرزند بانی فرم ہذا اس کاروبار کے کامیاب رہنماؤں میں سے ہیں۔

میسرز گلاب چند گپور انیڈسنسز لاہور۔ جو پہلے میسز عطر چند کپور کے حصہ دار تھے۔ آپ گنٹ روڈ پر اپنا الگ کاروبار کر رہے ہیں۔ نئے اردو کورسوں کے پیشرز ہیں۔

پنجاب پرنٹنگ ورکس لاہور۔ مرحوم نپت چند اس سابق سائنس ماسٹر اس فرم کے بانی تھے۔ یہ فرم لاگت مین انیڈسنسز اور مین پریس کی واحد ایجنٹ ہے۔ کچھ عرصہ سے دیکھ کر تعلیمی کتابوں کی اشاعت بھی کر رہے ہیں۔ آج کل اس فرم ان کے فرزند مسٹر پرمانند کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔

میکلن انیڈسنسز۔ یہ دہاتی فرم پنجاب کے سکولوں کے بہت سے انگریزی کورسوں کی پیشرز ہے۔ پنجاب میں اس کے نمائندے لالہ مولراج صاحب بی لے۔ بی ٹی ایک ہر دل عزیز اور قابل کاروباری ثابت ہوئے ہیں۔

پنجاب کتاب گھر کا کاروبار موہن لال روڈ لاہور پر وسیع پیمانہ پر چل رہا ہے۔ لالہ امین چند برادر اصغر لالہ مرچند



آغا کر سیدہ دال ساکھ صاحب در نشست
ادب فاضل



ابوالفضل راز جالندوزي



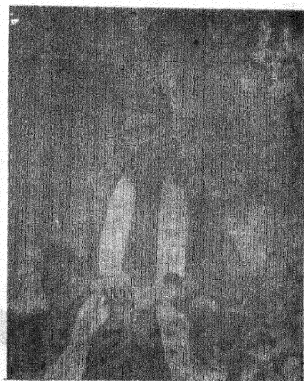
منشي سکهو دو پر شاد صاحب هادي
بسم الله ابادي



ضياء الملک صلاو دوزي



جناب خواجه محمد ارف صاحب
عشوت لکھنوي



از مصدر فطرت جناب
خواجہ حسن نظامي صاحب دهلوي

